اسلام اور
دورِ حاضر کے شُبہات و مُغالطے

از

جسٹس (ر) حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم
نائب رئیس جامعہ دارالعلوم کراچی

جمع و ترتیب
مفتی عمر انور
اُستاذ جامعہ علومِ اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی

اسلام اور

دورِ حاضر کے شبہات و مغالطے

اسلام اور
دورِ حاضر کے شبہات و مغالطے

از

جسٹس (ر) حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب مدظلہم

نائب رئیس جامعہ دارالعلوم کراچی

جمع و ترتیب

محمد عمر انور

جامعۃ العلوم الاسلامیۃ

علامہ محمد یوسف بنوری ٹاؤن کراچی
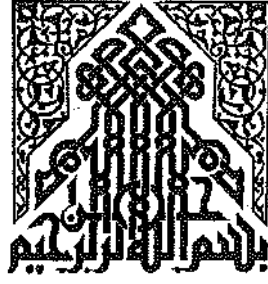
ZAM ZAM PUBLISHERS

Bookseller & Exporters

www.zamzampublishers.com.pk

MUFTI MUHAMMAD TAQI USMANI
Vice President Jamia Darul-Uloom Karachi - Pakistan

المفتي محمد تقي العثماني
نائب رئیس جامعہ دارالعلوم کراتشي - پاکستان

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ وکفی وسلام علی عبادہ الذین اصطفی

اما بعد:

بندے کی تالیفات اور خطبات سے مختلف موضوعات پر متعدد حضرات نے کئی مجموعے مرتب کرکے شائع کیے ہیں۔ زیر نظر کتاب بھی اسی قسم کا ایک مجموعہ ہے جو عزیزم مولانا محمد عمر انور صاحب سلمہ اللہ تعالی نے ایک اچھوتے انداز میں مرتب فرمایا ہے۔ اور اس کا موضوع وہ شبہات اور غلط فہمیاں ہیں جو عام طور سے دین سے متعلق لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں، ان میں وہ شکوک وشبہات بھی ہیں جو دین کے کسی حکم سے متعلق ہیں، اور وہ غلط فہمیاں بھی ہیں جو دین کے نام سے لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں، اور وہ اعتراضات بھی ہیں جو دینی حلقوں پر عموماً کیے جاتے ہیں۔

فاضل مرتب نے ان شبہات اور مغالطوں کے بارے میں بندے کی متعدد تالیفات اور خطبات سے مضامین محنت سے تلاش کیے، اور انہیں حسن ترتیب کے ساتھ عنوانات کے تحت جمع کردیا۔ ان مضامین کے بارے میں کچھ کہنا میرا منصب نہیں، لیکن یہ میرے ہی مضامین ہیں لیکن جس جذبے اور محنت سے انکو مرتب شکل میں جمع کیا گیا ہے، وہ فاضل مرتب سلمہ کے ذوق کا آئینہ دار ہے۔ اگر ان مضامین میں کوئی بات نفع بخش ہے، تو وہ اللہ تبارک وتعالی کی توفیق سے ہے۔ اور اگر

کوئی بات غلط ہے، تو وہ میری غلطی ہے۔ لیکن امید ہے کہ ان شاء اللہ
یہ مجموعہ بہت سے مسائلات میں شکوک کو اپنے دل سے نکالنے میں
معاون ہوگا۔

اللہ تعالیٰ عزیز موصوف کے علم وعمل اور خدمات دینیہ میں
برکت عطا فرمائیں۔ اور انہیں حسن توفیق سے نوازیں اور ان کی
اس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرف قبول عطا فرمائیں۔ آمین

والسلام

بندہ

۸-۱۲-۱۴۳۵ھ

حرفِ آغاز

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الحمد للہ و کفی و سلام علی عبادہ الذین اصطفٰی ، أمّا بعد:

بندے کی تالیفات اور خطبات سے مختلف موضوعات پر متعدد حضرات نے کئی مجموعے مرتب کر کے شائع کیے ہیں، زیرِ نظر کتاب بھی اِسی قسم کا ایک مجموعہ ہے جو عزیزم مولانا محمد عمر اَنور صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ نے ایک اَچھوتے انداز میں مرتب فرمایا ہے، اور اِس کا موضوع وہ شبہات اور غلط فہمیاں ہیں جو دین سے متعلق عام طور سے لوگوں کے ذہنوں میں پائی جاتی ہیں، اِن میں وہ شکوک وشبہات بھی ہیں جو دین کے کسی حکم سے متعلق ہیں، اور وہ غلط فہمیاں بھی ہیں جو دین کے نام سے لوگوں میں پھیلی ہوئی ہیں، اور وہ اِعتراضات بھی ہیں جو دینی حلقوں پر عموماً کیے جاتے ہیں۔

فاضل مرتب نے اِن شبہات اور مغالطوں کے بارے میں بندے کی متعدد تالیفات اور خطبات سے مضامین محنت سے تلاش کیے اور اُنہیں حسنِ ترتیب کے ساتھ عنوانات کے تحت جمع کر دیا، اِن مضامین کے بارے میں کچھ کہنا میرا منصب نہیں کہ یہ میرے ہی مضامین ہیں، لیکن جس جذبے اور محنت سے اِن کو مرتب شکل میں جمع کیا گیا ہے، وہ فاضل مرتب سلمہ کے ذوق کا آئینہ دار ہے۔

اگر اِن مضامین میں کوئی بات نفع بخش ہے تو وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی توفیق سے ہے، اور اگر کوئی بات غلط ہے تو وہ میری غلطی ہے، لیکن اُمید ہے کہ اِن شاء اللہ یہ مجموعہ بہت سے معاملات میں شکوک کے کانٹے دل سے نکالنے میں معاون ہوگا۔

اللہ تبارک وتعالیٰ عزیز موصوف کے علم وعمل اور خدماتِ دینیہ میں برکت عطا فرمائیں، اُنہیں حسنِ توفیق سے نوازیں اور اُن کی اِس خدمت کو اپنی بارگاہ میں شرفِ قبول عطا فرمائیں، آمین۔

والسلام

بندہ

محمد تقی عثمانی

١٢ - ٨ - ١٤٣٥ھ

عرضِ مرتب

یہ محض اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم اور والدِ محترم حضرت مولانا محمد انور بدخشانی مدظلہ کا علمی ذوق وشوق ہے کہ جب سے ہوش سنبھالا کتابوں کو ہمیشہ اپنے اِرد گرد پایا، اور جب مطالعہ کا کچھ شعور بیدار ہوا تو ابتدائی کتابوں میں ہی جسٹس (ر) حضرت مولانا مفتی محمد تقی عثمانی صاحب زیدہ مجدہ کا معروف ومشہور سفرنامہ ''جہانِ دیدہ'' پڑھنے کا شرف حاصل ہوا، حضرت مفتی صاحب زید مجدہ کی ذات گرامی کسی تعارف کی محتاج نہیں، آپ کی دوسری کتاب جو بہت شوق سے پڑھی اور بار بار پڑھی وہ وفیاتی سوانحی خاکوں پر مشتمل ''نقوشِ رفتگاں'' تھی، اُس کے بعد ہمیشہ یہ انتظار لگا رہتا کہ آپ کی کوئی نئی تحریر یا نئی کتاب آئے اور اُسے فوراً سے پیش تر حاصل کر کے پڑھا جائے، یہ آپ کی تحریر سے واقفیت کی ابتدا تھی۔

بچپن میں چھٹی کے دن جب کبھی نانا حضرت مولانا نور اَحمد صاحب رحمہ اللہ (ناظم اَوّل جامعہ دارالعلوم کراچی) کے ہاں جانا ہوتا تو جمعہ کی نماز نعمان مسجد لسبیلہ چوک کراچی میں ادا کرتے، اُن دنوں نعمان مسجد میں جمعہ حضرت مفتی صاحب زید مجدہ پڑھایا کرتے تھے، چنانچہ پہلی مرتبہ یہیں آپ کا بیان سننے کا موقع ملا، اُس زمانے میں ہر جمعہ کے دن بعد نماز عصر مسجد البیت المکرم گلشن اقبال کراچی میں بھی آپ کا اِصلاحی بیان ہوا کرتا تھا، تشنگان علوم ومعرفت دور دور سے بیان سننے کے لیے آتے اور سیراب ہو کر جاتے، کبھی کبھار بندہ کو وہاں بھی شرکت اور استفادہ کی سعادت حاصل ہو جاتی، آپ کے یہی اصلاحی بیانات بعد میں ''اِصلاحی خطبات'' کے نام سے شائع ہونا شروع ہوئے جو اَب اٹھارہ جلدوں پر مشتمل ہیں، تخصص کے سال (۲۰۰۴ء میں) پہلی مرتبہ بندہ کو جمعہ پڑھانے کی سعادت ملی تو ''اِصلاحی خطبات'' سے خطاب جمعہ کی تیاری کی، اُس کے بعد جب کبھی جمعہ پڑھانے کی توفیق ملتی تو ''اِصلاحی خطبات'' سے خطاب جمعہ کی تیاری آسان ہو جاتی، نیز آپ کے خطبات سے ہمیشہ خود ذاتی طور پر سب سے زیادہ فائدہ محسوس کیا۔

۲۰۰۷ء میں مادرِ علمی جامعہ علوم اسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن اور اَساتذہ کرام زید مجدہم کی طرف سے جامع مسجد قبا گلشن اِقبال کراچی میں اِمامت وخطابت کی ذمہ داری بندہ کے سپرد کی گئی، دروس وخطبات کی تیاری کے لیے دیگر کتب کے ساتھ ساتھ حضرت مفتی صاحب زید مجدہ کی تالیفات وخطبات کا زیادہ اِنہماک

سے مطالعہ واستفادہ کیا، حضرت کی تحریر وخطبات کی خصوصیات میں سے ایک یہ بھی ہے کہ آپ کی تحریر ووعظ کا مرکزی مقصد اسلام اور اسلامی نظام زندگی سے متعلق اُن غلط فہمیوں، مغالطوں اور شبہات کو پر حکمت انداز سے دور کرنا بھی ہوتا جو اکثر وبیشتر لوگوں کے ذہنوں میں پائے جاتے ہیں، پڑھنے اور سننے والے کو یوں محسوس ہوتا ہے کہ:

دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

چنانچہ مطالعہ کے دوران جہاں کہیں ایسا مضمون ملتا جس میں حضرت مفتی صاحب زید مجدہ نے دین اسلام، دینی احکام، اور دینی حلقوں سے متعلق شبہات ومغالطے دور فرمائے ہیں بندہ اُن کو کمپوز کرتا رہا، یہاں تک کہ ایک مجموعہ کی شکل اختیار کر گیا، اِس کے بعد دل میں خیال آیا کہ یہ مجموعہ اگر شائع ہو جائے تو سب کے لیے نافع اور مفید ہوگا، ابتدائی مسودہ تیار ہونے کے بعد جب حضرت کی خدمت میں پیش کیا تو الحمد للہ آپ نے اسے پسند فرمایا اور طباعت کی اجازت بھی عنایت فرمائی، اَب یہ مجموعہ آپ کے سامنے ہے۔

واضح رہے کہ یہ مجموعہ حضرت کی تالیفات وخطبات میں بکھرے ہوئے مضامین کا مجموعہ ہے، راقم نے موضوع سے متعلق اِن مضامین کو جمع کر کے عنوانات کا اضافہ کیا اور ساتھ ہی متعلقہ مضمون کا حوالہ بھی درج کر دیا، پیش نظر کتاب کی جمع وترتیب میں درج ذیل کتب سے استفادہ کیا گیا:

① مقدمہ آسان ترجمہ قرآن ② علوم القرآن ③ ذکر وفکر
④ فقہی مقالات ⑤ اِصلاحی خطبات ۱۸ جلد ⑥ اِصلاحی مجالس ۶ جلد
⑦ اِسلام اور سیاسی نظریات ⑧ تقلید کی شرعی حیثیت ⑨ خطبات عثمانی ۳ جلد

اس کتاب کا پس منظر تو بیان کر دیا، لیکن جہاں تک اس کے مضامین کا تعلق ہے اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا سورج کو چراغ دکھانے کے مرادف ہے، کتاب کی طوالت کے پیش نظر بہت سے مضامین شامل کرنے سے رہ گئے جسے اِن شاء اللہ آئندہ منظر عام پر لایا جائے گا۔

اُستاذ محترم حضرت مولانا سید سلیمان یوسف بنوری مدظلہ کا شکر گذار ہوں کہ انہوں نے اِس مجموعہ کی تیاری میں اپنی توجہات، سرپرستی اور مفید مشوروں کے ساتھ ساتھ اس کا نام بھی تجویز فرمایا۔

دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ حضرت مفتی صاحب زید مجدہ کی زندگی میں برکت عطا فرمائے، اُن کا سایہ تادیر ہم پر قائم رکھے، اور اِس مجموعہ کو اپنی بارگاہ میں شرف قبولیت سے نوازے، آمین۔

محمد عمر أنور
جامعہ علوم اِسلامیہ علامہ بنوری ٹاؤن کراچی
شب نصف شعبان ۱۴۳۵ھ

فہرست مضامین

ایمان و عقیدہ

قرآن و حدیث

دین اِسلام

اِسلام اور انسانی حقوق

اسلامی تحریکات

سیاست و حکومت

استفسارات

اجتہاد

تقلید

علماء و دینی مدارس

اخلاقیات

تزکیہ و تصوف

عملیات و تعویذات

خواب اور تعبیر

اصلاح معاشرہ

نماز

حاجت و استخارہ

وسوسہ اور خیالات

روزہ و رمضان

زکوۃ

حج عمرہ و عیدین

قربانی

دعا و مناجات

گناہ اور توبہ

سنت و بدعت

شب معراج ، شب براءت و عاشوراء

آزادی و حقوق نسواں

حجاب و پردہ

نکاح و شادی

طلاق

لباس

امانت و خیانت

معیشت و تجارت

امر بالمعروف و نہی عن المنکر

خور و نوش

فتنہ

متفرقات

ایمان و عقیدہ

اگر انسان کی تخلیق کا مقصد صرف عبادت ہی ہے تو کیا عبادت کے لیے فرشتے کافی نہیں تھے؟

بعض لوگوں کو خاص کرنئی روشنی کے لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اگر انسان کی تخلیق کا مقصد صرف عبادت تھا تو اس کام کے لیے انسان کو پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ یہ کام تو فرشتے پہلے سے بہت اچھی طرح انجام دے رہے تھے اور وہ اللہ کی عبادت تسبیح اور تقدیس میں لگے ہوئے تھے، یہی وجہ ہے کہ جب اللہ تعالی نے حضرت آدم علیہ السلام کوتخلیق فرمانے کا ارادہ کیا اور فرشتوں کو بتایا کہ میں اس طرح کا ایک انسان پیدا کرنے والا ہوں تو فرشتوں نے بے ساختہ یہ کہا کہ آپ ایک ایسے انسان کو پیدا کررہے ہیں جو زمین میں فساد مچائے گا اور خون ریزی کرے گا، عبادت تسبیح وتقدیس تو ہم انجام دے رہے ہیں، اسی طرح آج بھی اعتراض کرنے والے یہ اعتراض کررہے ہیں کہ اگر انسان کی تخلیق کا مقصد صرف عبادت ہوتا تو اس کے لیے انسان کو پیدا کرنے کی ضرورت نہیں تھی یہ کام تو فرشتے پہلے ہی انجام دے رہے تھے۔

بیشک اللہ تعالی کے فرشتے اللہ تعالی کی عبادت کررہے تھے لیکن ان کی عبادت بالکل مختلف نوعیت کی تھی، اور انسان کے سپرد جو عبادت کی گئی وہ بالکل مختلف نوعیت کی تھی، اس لیے کہ فرشتے جو عبادت کررہے تھے ان کے مزاج میں اس کے خلاف کرنے کا امکان ہی نہیں تھا، وہ اگر چاہیں کہ عبادت نہ کریں تو ان کے اندر عبادت چھوڑنے کی صلاحیت نہیں، اللہ تعالی نے ان کے اندر سے گناہ کرنے کا امکان ہی ختم فرمادیا اور نہ انہیں بھوک لگتی ہے نہ ان کو پیاس لگتی ہے اور نہ ان کے اندر شہوانی تقاضہ پیدا ہوتا ہے، حتی کہ ان کے دل میں گناہ کا وسوسہ بھی نہیں گذرتا، گناہ کی خواہش اور گناہ پر اقدام تو دور کی بات ہے، اس لیے اللہ تعالی نے ان کی عبادت پر کوئی اجر وثواب بھی نہیں رکھا، کیونکہ اگر فرشتے گناہ نہیں کررہے ہیں تو اس میں ان کا کوئی کمال نہیں اور جب کوئی کمال نہیں تو پھر جنت والا اجر وثواب بھی مرتب نہیں ہوگا۔

مثلا ایک شخص بینائی سے محروم ہے، جس کی وجہ سے ساری عمر اس نے نہ کبھی فلم دیکھی، نہ کبھی ٹی وی دیکھا اور نہ کبھی غیر محرم پر نگاہ ڈالی، بتایئے کہ ان گناہوں کے نہ کرنے میں اس کا کیا کمال ظاہر ہوا؟ اس لیے کہ

اس کے اندر ان گناہوں کے کرنے کی صلاحیت ہی نہیں، لیکن ایک دوسرا شخص جس کی بینائی بالکل ٹھیک ہے، جو چیز چاہے دیکھ سکتا ہے، لیکن دیکھنے کی صلاحیت موجود ہونے کے باوجود جب کسی غیر محرم کی طرف دیکھنے کا تقاضہ دل میں پیدا ہوتا ہے تو وہ فوراً صرف اللہ تعالیٰ کے خوف سے نگاہ نیچے کر لیتا ہے، اب بظاہر دونوں گناہوں سے بچ رہے ہیں لیکن دونوں میں زمین و آسمان کا فرق ہے، پہلا شخص بھی گناہ سے بچ رہا ہے اور دوسرا شخص بھی گناہ سے بچ رہا ہے، لیکن پہلے شخص کا گناہ سے بچنا کوئی کمال نہیں اور دوسرے شخص کا گناہ سے بچنا کمال ہے، لہذا اگر ملائکہ صبح سے شام تک کھانا نہ کھائیں تو یہ کوئی کمال نہیں، اس لیے کہ انہیں بھوک ہی نہیں لگتی اور انہیں کھانے کی حاجت ہی نہیں، لہذا ان کے نہ کھانے پر کوئی اجر وثواب بھی نہیں، لیکن انسان ان تمام حاجتوں کو لے کر پیدا ہوا ہے، لہذا کوئی انسان کتنے ہی بڑے سے بڑے مقام پر پہنچ جائے، حتی کہ سب سے اعلیٰ مقام یعنی نبوت پر پہنچ جائے تب بھی وہ کھانے پینے سے مستغنی نہیں ہو سکتا، چنانچہ کفار نے انبیاء پر یہی اعتراض کیا کہ:﴿ما لهذا الرسول يأكل الطعام ويمشي في الأسواق﴾ [الفرقان]

یعنی یہ رسول کیسے ہیں جو کھانا بھی کھاتے ہیں اور بازاروں میں چلتے پھرتے ہیں، تو کھانے کا تقاضہ انبیاء کے ساتھ بھی لگا ہوا ہے، اب اگر انسان کو بھوک لگ رہی ہے لیکن اللہ کے حکم کی وجہ سے کھانا نہیں کھا رہا ہے تو یہ کمال کی بات ہے، اس لیے اللہ تعالیٰ نے فرشتوں سے فرمایا کہ میں ایک ایسی مخلوق پیدا کر رہا ہوں جس کو بھوک بھی لگے گی، پیاس بھی لگے گی اور اس کے اندر شہوانی تقاضے بھی پیدا ہوں گے اور گناہ کرنے کے داعیے بھی ان کے اندر پیدا ہوں گے، لیکن جب گناہ کا داعیہ پیدا ہوگا، اس وقت وہ مجھے یاد کر لے گا اور مجھے یاد کر کے اپنے نفس کو اس گناہ سے بچا لے گا، اس کی یہ عبادت اور گناہ سے بچنا ہمارے ہاں قدر و قیمت رکھتا ہے اور جس کا اجر وثواب اور بدلہ دینے کے لیے ہم نے ایسی جنت تیار کر رکھی ہے جس کی صفت "عرضها السماوات والأرض" ہے اس لیے کہ اس کے دل میں داعیہ اور تقاضہ ہو رہا ہے اور خواہشات پیدا ہو رہی ہیں اور گناہ کے محرکات سامنے آ رہے ہیں، لیکن یہ انسان ہمارے خوف اور ہماری عظمت کے تصور سے اپنی آنکھ کو گناہ سے بچا لیتا ہے، اپنے کان کو گناہ سے بچا لیتا ہے، اپنی زبان کو گناہ سے بچا لیتا ہے، اور گناہوں کی طرف اٹھتے ہوئے قدموں کو روک لیتا ہے، تا کہ میرا اللہ مجھ سے ناراض نہ ہو جائے، یہ عبادت فرشتوں کے بس میں نہیں تھی اور اس عبادت کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱، ص ۱۱۹]

یعنی اگرچہ عبادت کے لیے پیدا کیے گئے تھے لیکن وہ اس طرح پیدا کیے گئے تھے کہ خلقتاً عبادت کرنے پر مجبور تھے، اس لیے کہ ان کی فطرت میں صرف عبادت کا مادہ رکھا گیا تھا، عبادت کے علاوہ گناہ اور معصیت اور نافرمانی کا مادہ رکھا ہی نہیں گیا تھا، لیکن حضرت انسان اس طرح پیدا کیے گئے کہ ان کے اندر نافرمانی کا مادہ بھی رکھا گیا، گناہ کا مادہ بھی رکھا گیا، اور پھر حکم دیا کہ عبادت کرو، اس لیے فرشتوں کے لیے عبادت کرنا آسان تھا لیکن انسان کے اندر خواہشات ہیں، جذبات ہیں، محرکات ہیں اور ضروریات ہیں اور

گناہوں کے دواعی ہیں، اور پھر یہ حکم دیا گیا کہ گناہوں کے ان دواعی سے بچتے ہوئے اور ان جذبات کو کنٹرول کرتے ہوئے اور گناہوں کی خواہشات کو کچلتے ہوئے اللہ تعالی کی عبادت کرو۔

انسان کو اس عبادت کے لیے اسی لیے پیدا فرمایا تاکہ یہ دیکھیں کہ یہ انسان جس کے اندر ہم نے مختلف قسم کے داعیے اور خواہشات رکھی ہیں، ہم نے اس کے اندر گناہوں کے جذبات اور ان کا شوق رکھا ہے، ان تمام چیزوں کے باوجود یہ انسان ہماری طرف آتا ہے اور ہمیں یاد کرتا ہے یا یہ گناہوں کے داعیے کی طرف جاتا ہے اور ان جذبات کو اپنے اوپر غالب کر لیتا ہے اس مقصد کے لیے انسان کو پیدا کیا گیا۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۶۵، ۷۰]

انسانیت پیغمبر اور نبی کی محتاج کیوں ہے؟

﴿لقد کان لکم فی رسول اللہ اسوۃ حسنۃ لمن کان یرجوا اللہ والیوم الاخر وذکر اللہ کثیرا﴾ [الاحزاب:۲۱]

یعنی ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو تمہارے پاس بہترین نمونہ بنا کر بھیجا ہے تاکہ تم ان کی نقل اتارو اور اس شخص کے لیے بھیجا ہے جو اللہ پر ایمان رکھتا ہو اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور اللہ کو کثرت سے یاد کرتا ہو۔

سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ نمونے کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے کہ اللہ تعالی نے اپنی کتاب نازل فرما دی تھی، ہم اس کو پڑھ کر اس کے احکام پر عمل کر لیتے؟ بات در اصل یہ ہے کہ نمونے بھیجنے کی ضرورت اس لیے پیش آئی کہ انسان کی فطرت اور جبلت یہ ہے کہ صرف کتاب اس کی اصلاح کے لیے کافی اور اس کو کوئی فن، کوئی علم و ہنر سکھانے کے لیے کافی نہیں ہوتا، بلکہ انسان کو سکھانے کے لیے کسی مربی کے عملی نمونے کی ضرورت ہوتی ہے، جب تک نمونہ سامنے نہیں ہوگا، اس وقت تک محض کتاب پڑھنے سے کوئی علم اور کوئی فن نہیں آئے گا، یہ چیز اللہ تعالی نے اس کی فطرت میں داخل فرمائی ہے۔

ایک انسان اگر یہ سوچے کہ میڈیکل سائنس پر کتابیں لکھی ہوئیں ہیں، میں ان کتابوں کو پڑھ کر دوسروں کا علاج شروع کر دوں، وہ پڑھنا بھی جانتا ہے، سمجھ دار بھی ہے، ذہین بھی ہے اور اس نے کتابیں پڑھ کر علاج شروع کر دیا تو وہ سوائے قبرستان آباد کرنے کے کوئی اور خدمت انجام نہیں دے گا۔

چنانچہ دنیا بھر کا قانون یہ ہے کہ اگر کسی شخص نے ایم بی بی ایس کی ڈگری حاصل کر لی، اس کو اس وقت تک عام پریکٹس کرنے کی اجازت نہیں جب تک وہ ایک مدت تک ہاؤس جاب نہ کرے اور جب تک کسی ہسپتال میں کسی ماہر ڈاکٹر کی نگرانی میں عملی نمونہ نہیں دیکھے گا اس وقت تک صحیح ڈاکٹری نہیں کر سکتا اس لیے کہ اس نے اب تک بہت سی چیزوں کو صرف کتاب میں پڑھا ہے، ابھی اس کے عملی نمونے اس کے سامنے نہیں آئے، اب مرض (کتابی تفصیل کے ساتھ) اس کی عملی صورت مریض کی شکل میں دیکھ کر اسے صحیح معنی

میں علاج کرنا آئے گا، اس کے بعد اس کو عام پریکٹس کی اجازت دے دی جائے گی، کھانے پکانے کی کتابیں بازار میں چھپی ہوئی موجود ہیں اوران میں ہر چیز کی ترکیب لکھی ہوئی ہے کہ بریانی اس طرح بنتی ہے، پلاؤ اس طرح بنتا ہے، کباب اس طرح بنتے ہیں، قورمہ اس طرح بنتا ہے، اب ایک آدمی ہے جس نے آج تک کبھی کھانا نہیں بنایا، کتاب سامنے رکھ کر اور اس میں ترکیب پڑھ کر قورمہ بنالے، خدا جانے وہ کیا چیز تیار کرے گا، ہاں اگر کسی استاذ اور جاننے والے نے اس کو سامنے بٹھا کر بتا دیا کہ دیکھو قورمہ اس طرح بنتا ہے اور اس کی عملی تربیت دے دی پھر وہ شاندار طریقے سے بنالے گا۔

معلوم ہوا کہ اللہ تعالی نے انسان کی فطرت یہ رکھی ہے کہ جب تک کسی مربی کا عملی نمونہ اس کے سامنے نہ ہو، اس وقت تک وہ صحیح راستے پر صحیح طریقے پر نہیں آسکتا، اور کوئی علم وفن صحیح طور پر نہیں سیکھ سکتا، اس واسطے اللہ تعالی نے انبیاء علیہم السلام کا جو سلسلہ جاری فرمایا وہ درحقیقت اسی مقصد کو بتانے کے لیے تھا کہ ہم نے کتاب تو بھیج دی لیکن تنہا کتاب تمہاری رہنمائی کے لیے کافی نہیں ہوگی، جب تک اس کتاب پر عمل کرنے کے لیے نمونہ تمہارے سامنے نہ ہو، اس لیے قرآن کریم یہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اس غرض کے لیے بھیجا ہے کہ تو یہ دیکھو کہ یہ قرآن کریم تو ہماری تعلیمات ہیں اور یہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ہماری تعلیمات پر عمل کرنے کا نمونہ ہیں۔

جب تقدیر میں سب کچھ لکھ دیا گیا ھے تو عمل کا کیا فائدہ ؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ جب تقدیر میں لکھ دیا گیا ہے کہ کون شخص جنتی ہے اور کون سا شخص جہنمی ہے تو اب عمل کرنے سے کیا فائدہ؟ ہوگا تو وہی جو تقدیر میں لکھا ہے۔

خوب سمجھ لیجیے! کہ اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ تم وہی عمل کرو گے جو تقدیر میں لکھا ہے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ تقدیر میں وہی بات لکھی ہے جو تم لوگ اپنے اختیار سے کرو گے، اس لیے کہ تقدیر تو علم الہی کا نام ہے، اور اللہ تعالی کو پہلے سے پتہ تھا کہ تم اپنے اختیار سے کیا کچھ کرنے والے ہو، لہذا وہ سب اللہ تعالی نے لوح محفوظ میں لکھ دیا، لیکن تمہارا جنت میں جانا یا جہنم میں جانا درحقیقت تمہارے اختیاری اعمال ہی کی بنیاد پر ہوگا، یہ بات نہیں ہے کہ انسان عمل وہی کرے گا جو تقدیر میں لکھا ہے، بلکہ تقدیر میں وہی لکھ دیا گیا ہے جو انسان اپنے اختیار سے عمل کرے گا، اللہ تعالی نے انسان کو اختیار دیا ہے اور اس اختیار کے مطابق انسان عمل کرتا رہتا ہے، اب یہ سوچنا کہ تقدیر میں تو سب لکھ دیا گیا ہے، لہذا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جاؤ، یہ درست نہیں ہے، چنانچہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حدیث بیان فرمائی تو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے پوچھ لیا کہ: ففیما العمل یا رسول اللہ ﷺ ؟

جب یہ فیصلہ ہو چکا کہ فلاں شخص جنتی اور فلاں شخص جہنمی، تو پھر عمل کرنے سے کیا فائدہ؟ سرکار دو

عالم ﷺ نے فرمایا: اعملوا فکل میسر لما خلق له

یعنی عمل کرتے رہو، اس لیے کہ ہر انسان کو وہی کام کرنا ہوگا جس کے لیے وہ پیدا کیا گیا تھا، لہٰذا تم اپنے اختیار کو کام میں لاکر عمل کرتے رہو۔ [اصلاحی خطبات، ج ۸، ص ۱۶۷]

جب تقدیر میں سب کچھ لکھا ہوا ہے تو تدبیر کی کیا ضرورت؟

اور یہ تقدیر عجیب وغریب عقیدہ ہے جو اللہ تعالی نے ہر صاحب ایمان کو عطا فرمایا ہے، اس عقیدہ کو صحیح طور پر نہ سمجھنے کی وجہ سے لوگ طرح طرح کی غلطیوں میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ کسی واقعہ کے پیش آنے سے پہلے تقدیر کا عقیدہ کسی انسان کو بے عملی پر آمادہ نہ کرے، مثلاً ایک انسان تقدیر کا بہانہ کر کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور یہ کہے کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ ہو کر رہے گا، میں کچھ نہیں کرتا، یہ عمل حضور اقدس ﷺ کی تعلیم کے خلاف ہے، بلکہ حکم یہ ہے کہ جس چیز کے حاصل کرنے کی جو تدبیر ہے، اس کو اختیار کرو، اس کے اختیار کرنے میں کوئی کسر نہ چھوڑو۔

دوسری بات یہ ہے کہ تقدیر کے عقیدے پر عمل کسی واقعہ کے پیش آنے کے بعد شروع ہوتا ہے، مثلاً کوئی واقعہ پیش آچکا، تو ایک مومن کا کام یہ ہے کہ وہ یہ سوچے کہ میں نے جو تدبیریں اختیار کرنی تھیں وہ کرلیں، اور اب جو واقعہ ہماری تدبیر کے خلاف پیش آیا، وہ اللہ تعالی کا فیصلہ ہے ہم اس پر راضی ہیں، لہٰذا واقعہ پیش آچکنے کے بعد اس پر بہت زیادہ پریشانی، بہت زیادہ حسرت اور تکلیف کا اظہار کرنا اور یہ کہنا کہ فلاں تدبیر اختیار کر لیتا تو یوں ہو جاتا، یہ بات عقیدہ تقدیر کے خلاف ہے، ان دو انتہاؤں کے درمیان اللہ تعالی نے ہمیں راہ اعتدال یہ بتادی کہ جب تک تقدیر پیش نہیں آئی، اس وقت تک تمہارا فرض ہے کہ اپنی سی پوری کوشش کرلو، اور احتیاطی تدابیر بھی اختیار کرلو، اس لیے کہ ہمیں یہ نہیں معلوم کہ تقدیر میں کیا لکھا ہے؟

[اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۲۰۷]

تقدیر کا صحیح مفہوم اور حقیقت؟

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ ایک مرتبہ شام کے دورے پر تشریف لے جارہے تھے، راستے میں آپ کو اطلاع ملی کہ شام کے علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑی ہے، یہ اتنا سخت طاعون تھا کہ انسان بیٹھے بیٹھے چند گھنٹوں میں ختم ہو جاتا تھا، اس طاعون میں ہزارہا صحابہ کرام شہید ہوئے ہیں، آج بھی اردن میں حضرت عبیدہ بن جراح رضی اللہ عنہ کے مزار کے پاس پورا قبرستان ان صحابہ کرام کی قبروں سے بھرا ہوا ہے جو اس طاعون میں شہید ہوئے، بہرحال! حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کہ وہاں جائیں یا نہ جائیں اور واپس چلے جائیں، اس وقت حضرت عبدالرحمن بن عوف رضی اللہ عنہ نے ایک حدیث سنائی کہ حضور اقدس ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا ہے کہ اگر کسی علاقے میں طاعون کی وبا پھوٹ پڑے تو جو لوگ اس علاقے سے باہر ہیں وہ اس علاقے کے

اندر داخل نہ ہوں اور جو لوگ اس علاقے میں مقیم ہیں وہ وہاں سے نہ بھاگیں، یہ حدیث سن کر حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا کہ اس حدیث میں آپ کا صاف صاف ارشاد ہے کہ ایسے علاقے میں داخل نہیں ہونا چاہیے، لہٰذا آپ نے وہاں جانے کا ارادہ ملتوی کر دیا، اس وقت ایک صحابی غالبا حضرت ابوعبیدہ بن جراحؓ تھے انہوں نے حضرت فاروق اعظمؓ سے فرمایا: أتفر من قدر الله؟

کیا آپ اللہ کی تقدیر سے بھاگ رہے ہیں؟ یعنی اگر اللہ تعالیٰ نے اس طاعون کے ذریعہ موت کا آنا لکھ دیا ہے تو وہ موت آ کر رہے گی، اور اگر تقدیر میں موت نہیں لکھی تو جانا اور نہ جانا برابر ہے، جواب میں حضرت فاروق اعظمؓ نے فرمایا: لو غيرك قالها يا ابا عبيدة!

اے ابوعبیدہ! اگر آپ کے علاوہ کوئی شخص یہ بات کہتا تو میں اس کو معذور سمجھتا، لیکن آپ تو پوری حقیقت سے آگاہ ہیں آپ یہ کیسے کہہ رہے ہیں کہ تقدیر سے بھاگ رہا ہوں، پھر فرمایا کہ:

نعم نفر من قدر الله الى قدر الله

ہاں! ہم اللہ کی تقدیر سے اللہ کی تقدیر کی طرف بھاگ رہے ہیں۔

مطلب یہ تھا کہ جب تک واقعہ پیش نہیں آیا، اس وقت تک ہمیں احتیاطی تدابیر اختیار کرنے کا حکم ہے، اور ان احتیاطی تدابیر کو اختیار کرنا عقیدہ تقدیر کے خلاف نہیں، بلکہ عقیدہ تقدیر کے اندر داخل ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حکم فرمایا ہے کہ احتیاطی تدابیر اختیار کرو، چنانچہ اس حکم پر عمل کرتے ہوئے واپس جا رہے ہیں، لیکن اس کے باوجود اگر تقدیر میں ہمارے لیے طاعون کی بیماری میں مبتلا ہونا لکھا ہے تو اس کو ہم ٹال نہیں سکتے، لیکن اپنی سی تدبیر ہمیں پوری کرنی چاہیے۔

یہ ہے ایک مومن کا عقیدہ کہ اپنی طرف سے تدبیر پوری کی، لیکن تدبیر کرنے کے بعد معاملہ اللہ تعالیٰ کے حوالے کر دیا اور یہ کہہ دیا کہ یا اللہ! ہمارے ہاتھ میں جو تدبیر تھی وہ تو ہم نے اختیار کر لی، اب معاملہ آپ کے اختیار میں ہے، آپ کا جو فیصلہ ہوگا، ہم اس پر راضی رہیں گے، ہمیں اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا، لہٰذا واقعہ کے پیش آنے سے پہلے عقیدہ تقدیر کسی کو بے عملی پر آمادہ نہ کرے، جیسے بعض لوگ عقیدہ تقدیر کو بے عملی کا بہانہ بنا لیتے ہیں اور یہ کہتے ہیں کہ جو تقدیر میں لکھا ہے وہ تو ہو کر رہے گا، لہٰذا ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائیں، کام کیوں کریں؟ یہ درست نہیں، کیونکہ اسلام کی تعلیم یہ ہے کہ اپنی تدبیر کرتے رہو، ہاتھ پاؤں ہلاتے رہو، لیکن ساری تدابیر اختیار کرنے کے بعد اگر واقعہ اپنی مرضی کے خلاف پیش آ جائے تو اس پر راضی رہو لیکن اگر تم اپنی رضامندی کا اظہار نہ کرو، بلکہ یہ کہہ دو کہ یہ فیصلہ تو بہت غلط ہوا، بہت برا ہوا، تو اس کا نتیجہ سوائے پریشانی میں اضافے کے کچھ نہیں ہوگا، اس لیے کہ جو واقعہ پیش آ چکا ہے، وہ بدل نہیں سکتا، اور آخر کار تمہیں سر تسلیم خم کرنا ہی پڑے گا، اس لیے پہلے دن ہی اس کو تسلیم کر لینا چاہیے کہ جو اللہ تعالیٰ کا فیصلہ ہے ہم اس پر راضی ہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۲۰۸]

اللہ کے تمام کام قابل تعریف کیونکر ہیں؟

اس جملے میں دعوی تو یہ کیا گیا ہے کہ تمام تعریفیں اللہ کی ہیں، یعنی اللہ تبارک وتعالی کا ہر کام قابل تعریف ہے، تو کبھی کبھی انسان کے دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ کائنات میں بہت سے واقعات ہمیں ایسے نظر آتے ہیں جو دیکھنے میں اچھے نہیں لگتے، جن کی بظاہر تعریف نہیں کی جاتی، جن کو دیکھ کر صدمہ ہوتا ہے، جن کو دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے، مثلاً کسی انسان کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے، کسی انسان کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، کسی کو ناحق قتل کیا جا رہا ہے، کسی کے اوپر ڈاکے ڈالے جا رہے ہیں، یہ سارے کام بھی تو اسی کائنات میں ہو رہے ہیں، اور ان میں سے کوئی کام ایسا نہیں جس کی تعریف کی جاسکے، تو پھر یہ کہنا کہ اللہ کے تمام کام قابل تعریف ہیں یہ کیسے درست ہوا؟ جب کہ بہت سارے کام کائنات میں ہمیں ایسے نظر آتے ہیں جو قابل تعریف نہیں ہیں، جن کے اندر کوئی نہ کوئی تکلیف کا پہلو ہوتا ہے، کوئی منفی پہلو ہوتا ہے، جس کے بارے میں دل میں یہ خیالات اور اعتراضات اور شک وشبہات پیدا ہوتے ہیں، درحقیقت ''رب العالمین'' کے لفظ میں اس سوال کا بھی جواب ہے، وہ یہ ہے کہ یہ جو تم کسی واقعہ سے رنجیدہ ہوتے ہو، جس سے تمہیں تکلیف پہنچتی ہے، یا غم ہوتا ہے تو تم اپنی چھوٹی سی عقل کے دائرے میں رہ کر سوچ رہے ہو، اور اس چھوٹی سے محدود عقل کے دائرے میں رہ کر تم کسی بات کے بارے میں یہ فیصلہ کرتے ہو کہ یہ ناگوار ہے، یہ اچھی نہیں، یہ تکلیف دہ ہے، اس میں غم ہے، اس میں صدمہ ہے، یہ تم اپنی چھوٹی سی عقل میں رہ کر سوچتے ہو، لیکن باری تعالی جو پوری کائنات کا خالق ہے، جو پوری کائنات کا نظام چلا رہا ہے، جو ساری کائنات کو پال پوس رہا ہے، اس کی نگاہ میں ہے کہ کس لمحہ کونسا کام اس کائنات کی مصلحت کے مطابق ہے، اور کونسا کام مصلحت کے مطابق نہیں ہے، تمہاری چھوٹی سی عقل میں اس کی مصلحت نہیں آسکتی۔

اس کی مثال یوں سمجھو کہ اگر ایک بچہ کے کوئی پھوڑا نکل آیا ہے اور کوئی ڈاکٹر اس کا آپریشن کر کے اس پھوڑے کو نکال رہا ہے اور بچہ چیخ رہا ہے، اور چلا رہا ہے، تم اس کے چیخنے اور پکارنے کو دیکھ کر یہ سمجھو گے کہ اس کے ساتھ زیادتی ہو رہی ہے، اور اس کے ساتھ ظلم ہو رہا ہے، یہ بچہ رو رہا ہے، اور چلا رہا ہے، اور ڈاکٹر ہے کہ اس کے اوپر نشتر چلا رہا ہے، لیکن اگر ذرا سی عقل سے کام لوگے تو پتہ چلے گا کہ اس کے ساتھ جو عمل کیا جا رہا ہے یہ درحقیقت اس کے لیے فائدہ مند ہے، یہی اس کے حق میں مفید ہے، اس کی خیر خواہی کا تقاضہ بھی یہی ہے، اس کی مصلحت کا تقاضہ بھی یہی ہے، یہ تو ایک چھوٹی سی مثال میں نے دے دی، لیکن جس کے سامنے پوری کائنات کا نظام ہے، وہ وہی جانتا ہے کہ کس لمحہ کون سی بات اس کائنات کی مصلحت کے مطابق ہے، وہ رب العالمین ہے، لہذا جو فیصلہ کرتا ہے اس کا فیصلہ برحق ہے، اس کا فیصلہ مصلحت کے عین مطابق ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۷، ص ۲۷۵]

کونسی پریشانی رحمت ہے اور کونسی عذاب ؟

جب انسان کسی پریشانی میں ہو، یا کسی بیماری یا تکلیف میں ہو، یا افلاس اور تنگ دستی میں ہو، یا قرض کی پریشانی یا بے روزگاری کی پریشانی میں ہو، یا گھر کی طرف سے پریشانی ہو، اس قسم کی جتنی پریشانیاں جو انسان کو دنیا میں پیش آتی ہیں یہ دو قسم کی ہوتی ہیں:

پہلی قسم کی پریشانیاں وہ ہیں جو اللہ تعالی کی طرف سے قہر اور عذاب ہوتا ہے، گناہوں کی اصل سزا تو انسان کو آخرت میں ملنی ہے، لیکن بعض اوقات اللہ تعالی انسان کو دنیا میں بھی عذاب کا مزہ چکھا دیتے ہیں، جیسے قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿ ولنذيقنهم من العذاب الأدنى دون العذاب الأكبر لعلهم يرجعون ﴾

یعنی آخرت میں جو بڑا عذاب آنے والا ہے، ہم اس سے پہلے دنیا میں بھی تھوڑا سا عذاب چکھا دیتے ہیں، تا کہ یہ لوگ اپنی بداعمالیوں سے باز آجائیں۔

اور دوسری قسم کی تکالیف اور پریشانیاں وہ ہوتی ہیں جن کے ذریعہ بندے کے درجات بلند کرنے ہوتے ہیں اور اس کے درجات کی بلندی اور اس کو اجر وثواب دینے کے لیے اس کو تکلیفیں دی جاتی ہیں۔

لیکن دونوں قسم کی پریشانیوں اور تکالیف میں فرق کس طرح کریں گے کہ یہ پہلی قسم کی پریشانی ہے یا دوسری قسم کی پریشانی ہے؟ ان دونوں قسموں کی پریشانیوں اور تکالیف کی علامات الگ الگ ہیں، وہ یہ کہ اگر انسان ان تکالیف کے اندر اللہ تعالی کی طرف رجوع کرنا چھوڑ دے اور اس تکلیف کے نتیجے میں وہ اللہ تعالی کی تقدیر کا شکوہ کرنے لگے، مثلاً یہ کہنے لگے کہ (نعوذ باللہ) اس تکلیف اور پریشانی کے لیے میں ہی رہ گیا تھا، میرے اوپر یہ تکلیف کیوں آرہی ہے؟ یہ پریشانی مجھے کیوں دی جارہی ہے؟ وغیرہ اور اللہ تعالی کی طرف سے دیے ہوئے احکام چھوڑ دے، مثلاً پہلے نماز پڑھتا تھا، اب تکلیف کی وجہ سے نماز پڑھنا چھوڑ دیا، یا پہلے ذکر واذکار کے معمولات کا پابند تھا، اب وہ معمولات چھوڑ دیے اور اس تکلیف کو دور کرنے کے لیے دوسرے ظاہری اسباب تو اختیار کر رہا ہے لیکن اللہ تعالی سے توبہ واستغفار نہیں کرتا، دعا نہیں کرتا، یہ اس بات کی علامات ہیں کہ جو تکلیف اس پر آئی ہے یہ اللہ تعالی کی طرف سے اس انسان پر قہر اور عذاب ہے اور سزا ہے، اللہ تعالی ہر مؤمن کو اس سے محفوظ رکھے، آمین۔

اور اگر تکالیف آنے کے باوجود اللہ تعالی کی طرف رجوع کر رہا ہے اور دعا کر رہا ہے کہ یا اللہ! میں کمزور ہوں، اس تکلیف کو برداشت نہیں کرسکتا، یا اللہ! مجھے اس تکلیف سے اپنی رحمت سے نجات دے دیجیے، اور دل کے اندر اس تکلیف پر شکوہ نہیں ہے، وہ اس تکلیف کا احساس تو کر رہا ہے، رو بھی رہا ہے، رنج اور غم کا اظہار بھی کر رہا ہے، لیکن اللہ تعالی کی تقدیر پر شکوہ نہیں کر رہا ہے بلکہ اس تکلیف میں وہ پہلے سے زیادہ اللہ تعالی کی طرف رجوع کر رہا ہے، پہلے سے زیادہ نمازیں پڑھ رہا ہے، پہلے سے زیادہ اللہ تعالی سے

دعائیں مانگ رہا ہے، تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ یہ تکلیف اللہ تعالی کی طرف سے بطور ترقی درجات ہے اور یہ تکالیف اس کے لیے اجر و ثواب کا باعث ہیں، اور یہ تکلیف بھی اس کے لیے رحمت ہے، اور یہ اس انسان کے ساتھ اللہ کی محبت کی دلیل اور علامت ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۷، ص۱۰۸]

اللہ کے نیک بندوں پر ہی آزمائش اور پریشانی کیوں آتی ہے؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب کسی کو دوسرے سے محبت ہوتی ہے تو محبت میں تو اس کو آرام پہنچایا جاتا ہے، راحت دی جاتی ہے، تو جب اللہ تعالی کو اس بندے سے محبت ہے تو اس بندے کو آرام پہنچانا چاہیے، پھر اللہ تعالی اس کو تکلیف کیوں دے رہے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اس دنیا میں کوئی انسان ایسا نہیں ہے جو کبھی نہ کبھی کوئی نہ کوئی تکلیف نہ پہنچے، کوئی نہ کوئی صدمہ اور پریشانی نہ ہو، چاہے وہ بڑے سے بڑا نبی اور پیغمبر ہو، ولی اور صوفی ہو، یا بادشاہ ہو، یا سرمایہ دار ہو، ایسا نہیں ہوسکتا ہے کہ وہ دنیا میں تکلیف کے بغیر زندگی گذارے، اس لیے کہ یہ عالم یعنی دنیا اللہ تعالی نے ایسی بنائی ہے کہ اس میں غم اور خوشی، راحت اور تکلیف سب ساتھ ساتھ چلتے ہیں، خالص خوشی اور راحت کا مقام دنیا نہیں ہے، بلکہ وہ عالم جنت ہے، جس کے بارے میں فرمایا کہ لاخوف علیہم ولا ہم یحزنون، یعنی وہاں نہ کوئی خوف ہے اور نہ غم ہے، اصل خوشی اور راحت کا مقام تو وہ ہے، دنیا تو اللہ تعالی نے بنائی ایسی ہے کہ اس میں کبھی خوشی ہوگی اور کبھی غم ہوگا، کبھی سردی ہوگی، کبھی گرمی ہوگی، کبھی دھوپ ہوگی، کبھی چھاؤں ہوگی، کبھی ایک حالت ہوگی، کبھی دوسری حالت ہوگی، لہذا یہ ممکن نہیں کہ کوئی شخص اس دنیا میں بے غم ہو کر بیٹھ جائے۔

اس دنیا میں کوئی بھی شخص صدمے، غم اور تکلیف سے خالی ہو ہی نہیں سکتا، البتہ کسی کو کم تکلیف ہے، کسی کو زیادہ ہے، کسی کو کوئی تکلیف، کسی کو کوئی تکلیف، اللہ تعالی نے اس کائنات کا نظام ہی ایسا بنایا ہے کہ کسی کو کوئی دولت دے دی ہے اور کسی سے کوئی دولت لے لی ہے، کسی کو صحت کی دولت دے دی ہے، لیکن روپیہ پیسہ کی دولت سے محروم ہے، کسی کو روپیہ پیسہ کی دولت حاصل ہے تو صحت کی دولت سے محروم ہے، کسی کے گھر کے حالات اچھے ہیں لیکن معاشی حالات خراب ہیں، کسی کے معاشی حالات اچھے ہیں لیکن گھر کی طرف سے پریشانی ہے، غرض ہر شخص کا اپنا الگ حال ہے اور ہر شخص کسی نہ کسی تکلیف اور پریشانی میں گھرا ہوا ہے۔

ایک حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

إذا أحب الله عبدا صب عليه البلاء صبا

یعنی جب اللہ تعالی کسی بندے سے محبت فرماتے ہیں تو اس پر مختلف قسم کی آزمائشیں اور تکالیف بھیجتے ہیں، وہ آزمائشیں اور تکالیف اس پر بارش کی طرح برستی ہیں، بعض روایات میں آتا ہے کہ فرشتے پوچھتے ہیں کہ یا اللہ! یہ تو آپ کا محبوب بندہ ہے، نیک بندہ ہے آپ سے محبت کرنے والا ہے، تو پھر اس بندے پر اتنی

آزمائشیں اور تکالیف کیوں بھیجی جارہی ہیں؟

جواب میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اس بندے کو اسی حال میں رہنے دو، اس لیے کہ مجھے یہ بات پسند ہے کہ میں اس کی دعا کی اور اس کی گریہ وزاری اور آہ وبکا کی آواز سنوں، یہ حدیث اگرچہ سند کے اعتبار سے کمزور ہے لیکن اس معنی کی متعدد احادیث آئی ہیں، مثلاً ایک حدیث میں ہے کہ اللہ تعالیٰ فرشتوں سے فرماتے ہیں کہ میرے بندے کے پاس جاؤ اور اور اس کو آزمائش میں مبتلا کردو، اس لیے کہ میں اس کی آہ وبکا اور اس کی گریہ وزاری کی آواز سننا پسند کرتا ہوں، بات وہی ہے کہ دنیا میں تکالیف اور پریشانیاں تو آنی ہیں، تو اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ یہ میرا محبوب بندہ ہے، میں اس کے لیے تکلیف کو دائمی راحت کا ذریعہ بنانا چاہتا ہوں، اور تاکہ اس کا درجہ بلند ہوجائے، اور جب آخرت میں میرے پاس پہنچے تو گناہوں سے بالکل پاک وصاف ہوکر پہنچے اس لیے اپنے محبوب اور اپنے پیاروں کو تکالیف اور پریشانیاں عطا فرماتے ہیں۔

میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ بعض اوقات بڑے وجد کے انداز میں یہ شعر پڑھا کرتے تھے کہ:

ما پروردیم دشمن و ما می کشیم دوست
کس را چوں و چرا نہ رسد در قضاء ما

یعنی بعض اوقات ہم اپنے دشمن کو پالتے ہیں اور اس کو دنیا کے اندر ترقی دیتے ہیں، اور اپنے دوست کو تکلیف دیتے ہیں اور اس کو مارتے ہیں، ہماری قضا اور تقدیر میں کسی کو چوں وچرا کی مجال نہیں، اس لیے کہ ہماری حکمتوں کو کون سمجھ سکتا ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۷، ص۱۰۹، ۱۱۷]

کیا غریب پر اللہ تعالیٰ کو ترس نہیں آتا؟

آپ جب غریب اور تنگ دست فقیر کو دیکھتے ہیں تو اس پر بڑا ترس کھاتے ہیں کہ اس بیچارے کا بڑا برا حال ہے۔ اسکا مطلب یہ ہے کہ آپ کو تو ترس آرہا ہے اور اللہ تعالیٰ کو اس پر ترس نہیں آرہا ہے۔ ارے وہی تم سے زیادہ جانتا ہے جس نے یہ کارخانہ بنایا ہے کہ کس پرزے کے ساتھ کیا بات مناسب ہے۔ تم کیا؟ تمہارا دماغ کیا؟ تمہاری عقل کیا؟ تمہاری سمجھ وسوچ کیا؟ تمہیں کیا معلوم کہ کس پرزے کو کس کام میں لگایا ہوا ہے؟ اور اس سے کیا مطلوب ہے؟ کیا اس کا انجام ہونا ہے؟ یہ باتیں تو وہی علیم وخبیر جانتا ہے، وہ عالم بھی ہے اور حکیم بھی ہے، اس لئے وہی جانتا ہے کہ اس کے حق میں غریبی اور تنگدستی ہی مناسب ہے۔ اللہ تعالیٰ تم سے زیادہ رحیم ہیں، رحم کے نتیجہ میں اس کو زیادہ مال ودولت نہیں دی۔ [اصلاحی مجالس، ج۴، ص۲۵۱]

یہ آرزو اور خواہش کرنا کہ ” کاش ! ہم حضور ﷺ یا صحابہ کرام کے دور میں پیدا ہوتے “!

کبھی کبھی ہمارے دلوں میں یہ احمقانہ خیال آتا ہے کہ کاش! ہم بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں پیدا ہوئے ہوتے، اور اُس زمانے کی برکات حاصل کرتے، صحابہ کرام کے ساتھ ہوتے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت نصیب ہوتی، جہاد اور غزوات میں آپ کے ساتھ شریک ہوتے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہ اللہ جل شانہ کی مصلحت ہے کہ انہوں نے ہمیں اس دور میں پیدا نہیں کیا، اگر ہم اپنی موجودہ صلاحیت اور موجودہ ظرف کے ساتھ جو آج ہمارے اندر ہے، اس دور میں ہوتے تو شاید ابوجہل، ابولہب کی صف میں ہوتے، یہ تو صحابہ کرام کا ظرف تھا، اور ان کی استطاعت تھی کہ کہ انہوں نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا ایسے مشکل حالات میں ساتھ دیا، اللہ تعالی جس شخص کو جو سعادت عطا فرماتے ہیں اس کے ظرف کے مطابق عطا فرماتے ہیں، یہ تو صحابہ کرام کا ظرف تھا کہ انہوں نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت سے استفادہ بھی کیا اور اس کا حق بھی ادا کیا، وہ زمانہ بے شک بڑی سعادتوں کا زمانہ تھا لیکن ساتھ میں بڑے خطرے کا زمانہ بھی تھا، آج ہمارے پاس حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے جو ارشادات ہیں وہ واسطہ در واسطہ ہو کر ہم تک پہنچے ہیں، اس لیے علما کرام نے فرمایا کہ جو شخص خبر واحد سے ثابت شدہ بات کا انکار کردے اور یہ کہے کہ میں اس بات کو نہیں مانتا تو ایسا شخص سخت گناہ گار ہوگا لیکن کافر نہیں ہوگا، منافق نہیں ہوگا، اور اس زمانے میں اگر کسی شخص نے کوئی کلمہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے براہ راست سنا اور پھر اس کا انکار کیا تو انکار کرتے ہی کفر میں داخل ہو گیا، اور حضرات صحابہ کرام کو ایسی ایسی آزمائشیں پیش آئی ہیں کہ یہ انہی کا ظرف تھا کہ ان آزمائشوں کو جھیل گئے، خدا جانے اگر ہم ان کی جگہ ہوتے تو نہ جانے کس شمار میں ہوتے، اس ماحول میں جس طرح حضرت صدیق اکبرؓ، فاروق اعظمؓ، عثمان غنیؓ اور علی مرتضیؓ پیدا ہوئے اسی ماحول میں ابوجہل اور ابولہب بھی پیدا ہوئے، عبداللہ بن ابی اور دوسرے منافقین بھی پیدا ہوئے۔

ارے! یہ تو اللہ تعالی کی حکمت ہے اور وہی اپنی حکمت سے فیصلہ فرماتے ہیں اور اپنی حکمت سے ہمیں اِس دور میں پیدا فرمایا، اگر ہم اُس دور میں پیدا ہوجاتے تو خدا جانے کس اسفل السافلین میں ہوتے، اللہ تعالی بچائے، آمین، اس لیے کہ وہاں ایمان کا معاملہ اتنا نازک تھا کہ ذرا سی دیر میں انسان ادھر سے ادھر ہوجاتا تھا، صحابہ کرام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جس جاں نثاری کا معاملہ فرمایا وہ انہیں کا ظرف تھا اور اسی کے نتیجے میں وہ اس درجے تک پہنچے، اگر ہم جیسا آرام پسند اور عافیت پسند آدمی اس دور میں ہوتا تو خدا جانے کیا حشر بنتا، یہ تو اللہ تعالی کا بڑا فضل وکرم ہے کہ اس نے ہمیں اس انجام سے بچایا اور ایسے دور میں پیدا فرمایا جس میں ہمارے لیے بہت سی آسانیاں ہیں، اس لیے اللہ تعالی نے جس شخص کے حق میں جو چیز مقدر فرمائی ہے وہی چیز اس کے حق میں بہتر ہے، لہذا یہ تمنا کرنا کہ کاش ہم صحابہ کرام کے زمانے میں پیدا ہوتے یہ نادانی کی تمنا

ہے، اور معاذ اللہ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت پر اعتراض ہے، جس شخص کو اللہ تعالیٰ جتنی نعمت عطا فرماتے ہیں وہ اس کے ظرف کے مطابق عطا فرماتے ہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۱۷۵، ج ۸، ص ۷۸]

''اگر ایسا ہوجاتا اگر ویسا ہوجاتا'' لفظ ''اگر'' شیطانی عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے

فرمایا کہ:

''وإن أصابك شيئ فلا تقل لو أني فعلت لكان كذا وكذا ولكن قل قدر الله وما شاء فعل، فإنّ ''لو'' تفتح عمل الشيطان''

یعنی اگر دنیاوی زندگی میں تمہیں کوئی مصیبت اور تکلیف پہنچے تو یہ مت کہو کہ اگر یوں کر لیتا تو ایسا نہ ہوتا، اور اگر یوں کر لیتا تو ایسا ہوجاتا، یہ اگر مگر مت کہو، بلکہ یہ کہو کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر اور مشیت یہی تھی، جو اللہ نے چاہا وہ ہوگیا، اس لیے کہ یہ لفظ ''اگر'' شیطان کے عمل کا دروازہ کھول دیتا ہے، مثلاً کسی کے عزیز کا انتقال ہوجائے تو کہتا ہے کہ اگر فلاں ڈاکٹر سے علاج کرالیتا تو یہ بچ جاتا، یا مثلاً کسی کے ہاں چوری ہوگئی، یا ڈاکہ پڑ گیا تو یہ کہتا ہے کہ اگر فلاں طریقے سے حفاظت کر لیتا تو چوری نہ ہوتی وغیرہ، ایسی باتیں مت کہو، بلکہ یوں کہو کہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر میں ایسا ہی ہونا مقدر تھا، اس لیے ہوگیا، میں اگر ہزار تدبیر کر لیتا تب بھی ایسا ہی ہوتا۔

مقصد یہ ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کسی بات کا فیصلہ فرمادیں، اور اللہ تعالیٰ کے فیصلے مطابق کوئی واقعہ پیش آجائے تو اب اس کے بارے میں یہ کہنا کہ یہ نہ ہوتا تو اچھا تھا، یا یہ کہنا کہ ایسا ہوجاتا، یہ کہنا اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر راضی ہونے کے خلاف ہے، ایک مومن سے مطالبہ یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر اور اس کے فیصلے پر راضی رہے، اور اس تقدیر کے فیصلے پر اس کے دل میں شکایت پیدا نہ ہو، اور نہ دل میں اس کی برائی ہو، بلکہ دل وجان سے اس پر راضی رہے، ایک اور حدیث میں حضرت ابوالدرداءؓ فرماتے ہیں کہ:

''إذا قضى الله قضاءا أحب أن يرضى بقضاءه''

یعنی جب اللہ تعالیٰ کسی کام کے بارے میں فیصلہ فرمادیتے ہیں کہ یہ کام اس طرح انجام دیا جانا ہے ۔ تو اللہ تعالیٰ اس بات کو پسند فرماتے ہیں کہ میرا بندہ اس فیصلے پر راضی ہو اور اس فیصلے کو بے چوں چرا تسلیم کرے، یہ نہ کہے کہ یوں ہوتا تو اچھا تھا، فرض کریں کہ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا جو طبیعت کو ناگوار ہے اور وہ غم اور تکلیف کا واقعہ ہے، اب پیش آچکنے کے بعد یہ کہنا کہ اگر یوں کر لیتے تو یہ واقعہ پیش نہ آتا، ایسا کہنے سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا ہے، اس لیے کہ جو واقعہ پیش آیا، وہ تو پیش آنا ہی تھا، اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ اور اس کی تقدیر تھی، تم اگر ہزار تدبیر بھی کر لیتے، تب بھی وہ فیصلہ ٹلنے والا نہیں تھا، لہٰذا اب فضول یہ باتیں کرنا کہ ایسا کر لیتے تو ایسا ہوجاتا، یہ باتیں اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کے منافی ہیں، ایسی باتیں کرنا مومن کا

کام نہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۲۰۲، ۲۰۵]

کیا غم اور صدمہ کا اظہار رضا بالقضا کے منافی ہے؟

اب ایک بات اور سمجھ لینی چاہیے، وہ یہ کہ جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ اگر کوئی تکلیف دہ واقعہ پیش آئے، یا کوئی غم، یا صدمہ پیش آئے تو اس غم اور تکلیف پر رونا صبر کے منافی اور خلاف نہیں اور گناہ نہیں، اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ غم اور صدمہ کرنا اور اس کا اظہار کرنا جائز ہے، رونا بھی جائز ہے، اور دوسری طرف آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ اللہ کے فیصلے پر راضی رہنا چاہیے، یہ دونوں چیزیں کیسے جمع کریں کہ ایک طرف فیصلے پر راضی بھی ہو اور دوسری طرف غم اور صدمہ کا اظہار بھی کرنا جائز ہو؟

خوب سمجھ لینا چاہیے کہ غم اور صدمہ کا اظہار الگ چیز ہے اور اللہ کے فیصلے پر راضی ہونا الگ چیز ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا فیصلہ عین حکمت پر مبنی ہے، اور ہمیں اس کی حکمت معلوم نہیں، اور حکمت معلوم نہ ہونے کی وجہ سے دل کو تکلیف پہنچ رہی ہے، اس لیے غم اور صدمہ بھی ہے اور اس غم اور صدمہ کی وجہ سے ہم رو بھی رہے ہیں اور آنکھوں سے آنسو بھی جاری ہیں، لیکن ساتھ ساتھ یہ جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے جو فیصلہ کیا ہے وہ برحق ہے، حکمت پر مبنی ہے، لہٰذا رضا سے مراد رضا عقلی ہے، یعنی عقلی طور پر انسان یہ سمجھے کہ یہ فیصلہ صحیح ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۲۱۰]

کوئی کام "اتفاقی" نہیں ہوتا!

ویسے تو انسان کے ساتھ دن رات واقعات پیش آتے رہتے ہیں لیکن بعض اوقات انسان غفلت کی وجہ سے ان واقعات کو اتفاق کا نتیجہ سمجھتا ہے اور دوسروں سے کہتا ہے کہ "اتفاق سے ایسا ہو گیا"، مثلاً وہ کہتا ہے کہ میں گھر سے باہر نکلا تو اتفاق سے ایک آدمی مل گیا اور اس نے کہا کہ مجھے ایک ملازم کی تلاش ہے، میں نے کہا کہ میں فارغ ہوں، چنانچہ اس نے مجھے ملازم رکھ لیا، اس کا نام اس نے "اتفاق" رکھ دیا، حالانکہ اس کائنات میں کوئی کام اتفاق سے نہیں ہوتا، بلکہ یہ تو ایک حکیم مطلق کا کارخانہ حکمت ہے، اس کی منصوبہ بندی کے تحت سب کچھ انجام پا رہا ہے، یہ کوئی اتفاق نہیں کہ تم گھر سے نکلے اور تمہاری اس آدمی سے ملاقات ہو گئی، بلکہ وہ کسی کا بھیجا ہوا آیا تھا اور تم بھی کسی کے بھیجے ہوئے گئے تھے، دونوں کا آپس میں ملاپ ہو گیا اور بات بن گئی، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی حکمت ہے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ آج کل کی دنیا جس کو "اتفاق" کا نام دیتی ہے کہ اتفاقاً یہ کام اس طرح ہو گیا، یہ سب غلط ہے، اس لیے کہ اس کائنات میں کوئی کام اتفاقاً نہیں ہوتا بلکہ اس کائنات کا ہر کام اللہ تعالیٰ کی حکمت، مشیت اور نظم کے ماتحت ہوتا ہے،

جب کسی کام کی علت اور سبب ہماری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کام کن اسباب کی وجہ سے ہوا تو بس ہم کہہ دیتے ہیں کہ اتفاقاً یہ کام اس طرح ہوگیا، ارے! جو اس کائنات کا مالک اور خالق ہے وہی اس پورے نظام کو چلا رہا ہے اور ہر کام پورے مستحکم نظام کے تحت ہو رہا ہے، کوئی ذرہ اس کی مشیت کے بغیر ہل نہیں سکتا۔

البتہ بعض اوقات جب ہمیں کسی کام کا ظاہری سبب آنکھوں سے نظر نہیں آتا تو ہم اپنی حماقت سے کہہ دیتے ہیں کہ اتفاق سے ایسا ہوگیا، حقیقت میں اتفاق کوئی چیز نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کی بنائی ہوئی حکمت ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۳۳]

ایمان اور عقیدہ کے بارے میں طرح طرح کے وسوسے اور خیالات کا آنا

یہ سوسے جو انسان کے دل میں آتے ہیں، دو قسم کے ہوتے ہیں، ایک وسوسہ وہ ہوتا ہے جو اللہ بجائے ایمان وغیرہ سے متعلق آنے لگتا ہے، کوئی بھی انسان ایسا نہیں ہے، خواہ کتنا بھی بڑا مسلمان ہو، کتنا بڑا متقی پرہیز گار ہو، کبھی نہ کبھی اس کے دل میں کوئی خراب قسم کے وسوسے نہ آئے ہوں، دل میں شیطان وسوسے ڈالتا ہے کہ ہم ایمان تو لے آئے اللہ کے اوپر، اللہ کی وحدانیت پر، رسول اللہ ﷺ کی رسالت پر، مرنے کے بعد کی زندگی پر، آخرت پر، جنت پر، جہنم پر، لیکن کبھی کبھی شیطان یہ سوسے ڈالتا ہے کہ یہ باتیں صحیح بھی ہیں یا نہیں؟ اس قسم کے خیالات انسان کے دل میں ڈالتا ہے، یہ وسوسہ اگر زیادہ پیچھے پڑ جائے تو پھر انسان کو تباہی کی طرف لے جاتا ہے۔ [خطبات عثمانی، ج ۱، ص ۲۸۲]

جس شخص کا دین کی طرف اور اصلاح کی طرف دھیان ہی نہیں ہے، اور دن رات دنیاوی مشاغل میں منہمک ہے، فسق وفجور میں مبتلا ہے، ایسے شخص کو وسوسے نہیں آتے، وسوسے اس شخص کو آتے ہیں جو اللہ تعالیٰ کے راستے پر اور دین کے راستے پر چل پڑتا ہے، اس کو طرح طرح کے وسوسے آتے ہیں۔ ایسے وسوسے آتے ہیں کہ ان کی وجہ سے آدمی کو شبہ ہونے لگتا ہے کہ میرا ایمان بھی باقی رہا یا نہیں؟ کبھی اللہ تعالیٰ کے بارے میں وسوسے آئیں گے، کبھی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بارے میں وسوسے آئیں گے، کبھی قرآن کریم اور حدیث کے بارے میں وسوسے آئیں گے، اور کبھی شریعت کے احکام کے بارے میں وسوسے آئیں گے۔ اگر ایسے موقع پر انسان کی صحیح رہنمائی نہ ہو تو انسان گمراہی کے راستے پر پڑ جاتا ہے۔ العیاذ باللہ۔

ان ''وساوس'' کا علاج حضرت والا یہ بیان فرما رہے ہیں کہ ان کا علاج اس کے سوا کچھ نہیں کہ ان کی طرف توجہ نہ کی جائے۔ وساوس آتے ہیں تو آنے دو، کوئی پرواہ نہ کرو، اس طرف دھیان ہی نہ دو کہ دل میں کیا وسوسہ آرہا ہے اور کیا جارہا ہے۔

یہ بات یاد رکھیں کہ یہ ''وساوس'' خود ایمان کی علامت ہیں، حدیث شریف میں ہے کہ ایک صحابیؓ

نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ یارسول اللہ! بعض اوقات میرے دل میں ایسے وسوسے اور ایسے خیالات ہیں کہ ان خیالات کو زبان پر لانے کے مقابلے میں جل کر کوئلہ ہو جانا مجھے گوارہ ہے، اس لئے میں کیا کروں؟ سبحان اللہ! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کیا جواب دیا، فرمایا: "ذاك صريح الايمان"

[صحیح مسلم، کتاب الایمان، باب بیان الوسوسۃ فی الایمان]

یہ کھلی ایمان کی علامت ہے۔ یعنی ایسے وسوسوں کا اور ایسے خیالات کا آنا تو کھلے ایمان کی علامت ہے، مؤمن ہی کے دل میں ایسے وسوسے آسکتے ہیں، اور جو کافر ہو یا فسق و فجور میں مبتلا ہو، اس کو ایسے وسوسے نہیں آتے۔

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہ اسی حدیث کی تشریح کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ چور اسی گھر میں آتا ہے جہاں کچھ مال ہو، جہاں مال ہی نہ ہو وہاں چور کیوں جائے گا، جس گھر کے بارے میں معلوم ہو جائے کہ وہاں مال ہے، اسی گھر میں چور داخل ہوگا۔ لہٰذا دل میں یہ چور (شیطان) اس لئے آرہا ہے کہ اس کو معلوم ہے کہ اس دل میں کچھ ہے، اگر اس دل میں اللہ پر اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہ ہوتا تو اس چور کو آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی۔ لہٰذا جب وسوسے اور خیالات آئیں تو پہلے اس بات پر شکر ادا کرو کہ الحمدللہ ایمان موجود ہے، ورنہ یہ خیالات آتے ہی نہیں۔

اور ایمان کے موجود ہونے کی دلیل اس طرح ہے کہ جب آپ کے دل میں یہ خیالات آتے ہیں تو آپ کو پریشانی ہوتی ہے، اور ان خیالات کا آنا آپ کو برا معلوم ہوتا ہے، اگر دل میں ایمان نہ ہوتا تو پریشانی کیوں ہوتی، اگر ایمان نہ ہوتا تو دل میں ان خیالات کے آنے پر برا کیوں لگتا، ان خیالات سے تکلیف کیوں ہوتی، معلوم ہوا کہ دل میں ایمان ہے۔

ایمان اور عقیدے کے بارے میں وسوسے اور خیالات کیوں آتے ہیں؟

قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اس پریشانی کے موقع کے لئے ایک تسلی کا جملہ ارشاد فرمادیا، وہ یہ ہے کہ: ﴿انما النجوى من الشيطٰن ليحزن الذين آمنوا وليس بضارهم شيئاً الا باذن الله﴾

[المجادلۃ:۱۰]

یعنی شیطان کی طرف سے جو وسوسے آتے ہیں، یہ درحقیقت شیطان کی طرف سے سرگوشی ہے، تاکہ مؤمنوں کو اس سرگوشی کے ذریعہ غم میں مبتلا کرے۔ آگے اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ یہ سرگوشی کرنا مؤمنوں کو ذرہ برابر نقصان نہیں پہنچا سکتا مگر اللہ کے حکم سے۔ لہٰذا جب یہ وسوسے آکر پریشان کریں تو اس وقت یہ تصور کرو کہ یہ تو ایمان کی علامت ہیں۔ یہ شیطان اپنی سی کوشش کر رہا ہے، اس سے کہہ دو کہ چل تو بھی اپنی سی کوشش کر لے، ہم بھی اپنی سی کوشش کر رہے ہیں۔ لیکن اگر تم ان خیالات کی طرف متوجہ ہو گئے

اوران کی طرف التفات شروع کردیا کہ اس وسوسے کو دور کروں، تو پھر تم اس دھندے میں رہ جاؤ گے، آگے تمہاری ترقی نہیں ہو پائے گی، اور شیطان کا مقصد پورا ہو جائے گا۔

حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ ایک مثال کے ذریعے ان خیالات کے بارے میں سمجھا رہے ہیں، فرماتے ہیں کہ ان خیالات کی مثال ایسی ہے جیسے ایک شخص کو بادشاہ کے دربار سے بلاوا آیا کہ آج فلاں وقت تم دربار میں آنا، ہم تم کو ملاقات کا موقع بھی دیں گے اور تمہیں انعامات سے بھی نوازیں گے، اب یہ شخص تیار ہو کر بادشہ کے دربار کی طرف چل دیا، راستے میں ایک کتا دائیں طرف سے بھونک رہا ہے، ایک کتا بائیں طرف سے بھونک رہا ہے، اور اس وقت پر بادشاہ کے دربار میں پہنچنا ہے، بتایئے عقل کی بات کیا ہے؟ کیا وہ کتوں سے لڑنے بیٹھ جائے، ان کو بھونکنے سے روکے اور ان کا پیچھا کرے اور ان کو بھگائے اور ان کو گھر تک چھوڑ کر آئے، اگر وہ ان دھندوں میں لگ گیا تو پھر تو دربار میں پہنچنے کا وقت ہی نکل جائے گا، وقت پر نہیں پہنچ سکے گا۔ اس لئے عقل مندی کا تقاضہ یہ ہے کہ ان کتوں کو بھونکنے دو تم جہاں جا رہے ہو اور جس منزل تک پہنچنا چاہتے ہو، اس کی فکر کرو، ان کتوں کے بھونکنے کی فکر ہی مت کرو، اور اگر تم ان کتوں کے پیچھے پڑو گے تو دربار میں حاضری کا شرف کھو بیٹھو گے۔

اسی طرح تم یہ جو عبادات کر رہے ہو اور اللہ تعالیٰ کے حضور حاضر ہو رہے ہو، یہ عبادت اللہ تعالیٰ کے دربار میں باریابی ہے، اب باریابی کے وقت دل میں جو خیالات اور وسوسے آ رہے ہیں، دراصل یہ کتے بھونک رہے ہیں، اگر تم نے ان کی طرف التفات شروع کر دیا اور ان کو بھگانے کی فکر میں لگ گئے اور اپنا دھیان اس طرف لگا دیا تو پھر شیطان کا مقصد حاصل ہو جائے گا اور تم دربار کی باریابی سے محروم ہو جاؤ گے۔

اس لئے ان وساوس اور خیالات کا علاج ہی یہ ہے کہ ان کی طرف التفات ہی نہ کرو۔ اور التفات نہ کرنے کا مطلب یہ ہے کہ اس فکر میں مت پڑو کہ کیا وسوسہ آ رہا ہے اور کیا جا رہا ہے، کیا خیال آ رہا ہے اور کیا جا رہا ہے، بلکہ اپنے کام میں لگے رہو، مثلاً خیالات آ رہے ہیں اور تمہیں نماز پڑھنی ہے تو اپنی نماز میں لگ جاؤ۔ کسی دوسرے کام کا وقت ہے تو اس دوسرے کام میں لگ جاؤ اور ان خیالات کو اپنے اعمال پر اثر انداز نہ ہونے دو، یہ علاج ہے ان خیالات کا، اگر ان خیالات اور وساوس کی طرف تم لٹھ لے کر دوڑو گے تو یہ اس کا علاج نہیں۔

میرے والد صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ اگر کہیں اندھیرا ہو رہا ہو تو اس کا یہ علاج نہیں ہے کہ آدمی اس اندھیرے کے پیچھے لٹھ لے کر دوڑے کہ یہ اندھیرا بھاگ جائے، اس طرح کبھی بھی اندھیرا نہیں جائے گا، اندھیرے کا علاج یہ ہے کہ ایک چراغ جلا دو، جس جگہ پر اس چرغ کی روشنی پہنچے گی وہاں سے اندھیرا خود بخود بھاگ جائے گا، اور اس اندھیرے کی ظلمت کو دبخود دور ہو جائے گی۔ اسی طرح یہ شیطانی خیالات اور وساوس بھی اندھیرا ہیں، ان کے پیچھے لٹھ لے کر نہیں بھاگنا، بلکہ ان کا علاج یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے

ذکر کا چراغ جلاؤ، اللہ تعالیٰ کی عبادت اور طاعت کا چراغ جلاؤ اور ان کی طرف التفات نہ کرو، بس یہ وساوس اور خیالات خود دور ہو جائیں گے۔

اگر یہ خیالات بہت زیادہ آ رہے ہیں تو اس کے بارے میں حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ ان کو بھگانے کی فکر کرنا پھر بھی ٹھیک نہیں، اس لئے کہ ان کو جتنا بھگاؤ گے یہ اتنا ہی اور آئیں گے۔ اور ان کا علاج یہ ہے کہ اپنے آپ کو کسی اور کام میں لگا لو یا کسی اور خیال کی طرف اپنے آپ کو متوجہ کر لو۔ اس لئے کہ فلسفہ کا قاعدہ ہے کہ: "أَلنفس لا تتوجه الیٰ شیئین فی آنٍ واحدٍ"

یعنی انسان کا نفس ایک وقت میں دو چیزوں کی طرف متوجہ نہیں ہوا کرتا۔

لہٰذا اگر دل میں وسوسے آ رہے ہیں اور اس وقت تم نے اس کو دوسرے خیال میں مشغول کر دیا یا دوسرے کام میں مشغول کر دیا تو پہلا خیال اور وسوسہ خود بخود ختم ہو جائے گا۔

چنانچہ اس ملفوظ میں حضرت والا نے پہلا جملہ یہی ارشاد فرمایا کہ "وساوس کا علاج عدم التفات ہے اور بس"، یعنی اور کوئی علاج نہیں۔ لوگ کہتے ہیں کہ وساوس بہت آ رہے ہیں، کوئی وظیفہ بتا دو جس کے نتیجے میں وسوسے نہ آئیں۔ حضرت فرما رہے ہیں کہ اس کے لئے کوئی وظیفہ نہیں، کوئی علاج نہیں، بس یہی علاج ہے کہ ان کی طرف التفات نہ کرو۔ [اصلاحی مجالس، ج ۴، ص ۳۳ تا ۴۰]

مجھے ہی وسوسے کیوں آتے ہیں؟

بہت سے لوگوں کو یہ اشکال ہوتا ہے کہ فلاں شخص کو تو بالکل وسوسے نہیں آتے، وہ تو بہت اطمینان سے رہتا ہے اور اس کا تعلق فلاں شیخ سے ہے، یہ ان سے بیعت ہے، اور دوسری طرف میں ہوں کہ مجھے تو بہت سے وسوسے آتے ہیں، کیا میں ہی وسوسے کے لئے رہ گیا ہوں؟ مجھے ہی یہ وسوسے اور خیالات آتے ہیں، یاد رکھیئے! یہ سب بے صبری ہے، ارے تیرے لئے یہی مناسب تھا جو تیرے ساتھ ہو رہا ہے، اور اس کے لئے وہی مناسب تھا جو اس کے ساتھ ہو رہا ہے، یہ بھی ان کا کرم ہے اور وہ بھی ان کا کرم ہے۔ اس شخص کے لحسظ سے وہ کرم ہے اور تمہارے لحاظ سے یہ کرم ہے، اگر تو ان وساوس پر صبر کر لے تو اس کے بدلے میں اللہ تعالیٰ نے نہ معلوم کیا درجات تیرے لئے رکھے ہوئے ہیں۔

لہٰذا دوسروں کی طرف مت دیکھو کہ ان کو کیا مل رہا ہے، تمہیں جو کچھ مل رہا ہے، وہ تمہارے لئے ٹھیک ہے۔ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحی صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس مفہوم کا ایک شعر پڑھا کرتے تھے، فرمایا:

مجھ کو اس سے کیا غرض کس جام میں ہے کتنی مئے
میرے پیمانے میں لیکن حاصلِ میخانہ ہے

یعنی مجھے اس سے کیا غرض کہ کس کو کیا ملا ہوا ہے، جو اللہ تعالیٰ نے میرے پیمانہ میں مجھے عطا فرمایا

ہے، میرے لئے تو وہ سارے میخانے کا حاصل ہے۔

یاد رکھو! اس دنیا میں مکمل راحت کسی کو حاصل ہو ہی نہیں سکتی، چاہے وہ ایڑی چوٹی کا زور لگا لے، چاہے وہ بڑے سے بڑا بادشاہ ہو، بڑے سے بڑا امیر کبیر انسان ہو، اس لئے کہ یہ دنیا راحت کاملہ کی دنیا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کائنات میں تین عالم پیدا فرمائے ہیں، ایک عالم وہ ہے جس میں راحت ہی راحت ہے، جس میں تکلیف کا اور غم کا اور صدمہ کا نام و نشان نہیں ہوگا، وہ عالم جنت ہے۔ دوسرا عالم وہ ہے جس میں تکلیف ہی تکلیف ہے، غم ہی غم اور صدمہ ہی صدمہ ہے، جس میں راحت اور سکون کا نام و نشان نہیں ہے، وہ عالم جہنم ہے۔ اور یہ عالم دنیا جس میں ہم اور آپ گزر رہے ہیں،، اس میں راحت بھی ہے اور تکلیف بھی ہے، اس میں غم بھی اور خوشی بھی ہے، یہاں کی کوئی راحت خالص نہیں ہے، بلکہ ہر راحت کے ساتھ تکلیف کا کانٹا لگا ہوا ہے، یہاں کی کوئی خوشی خالص نہیں ہے، بلکہ ہر خوشی کے ساتھ غم کا کانٹا لگا ہوا ہے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ میں یہاں اس دنیا میں راحت ہی راحت حاصل کروں، مجھے کوئی صدمہ نہ پہنچے، کوئی تکلیف نہ پہنچے، تو ایسا کبھی نہیں ہوسکتا، بڑے سے بڑا سرمایہ دار ہو، بڑے سے بڑا حاکم ہو، بڑے سے بڑا دولت مند ہو، بڑے سے بڑا دانشور ہو، بڑے سے بڑا عالم ہو، بڑے سے بڑا ہنر مند ہو، اس کو لے آؤ اور اس سے پوچھو کہ کیا تمہیں کبھی بھی تکلیف نہیں پہنچی۔ وہ شخص کبھی یہ نہیں کہے گا کہ مجھے کبھی کوئی تکلیف نہیں پہنچی، کچھ نہ کچھ تکلیف ضرور پہنچی ہے۔

لہٰذا جب اس دنیا میں تکلیف پہنچنی ہی ہے تو اس تکلیف پر صبر کرلو، چاہے تو بے صبری کرلو، چاہو تو اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہوجاؤ اور یہ کہہ دو کہ جو تکلیف ان کی طرف سے پہنچ رہی ہے، میں اس پر راضی ہوں، تو اس کے نتیجے میں اتم اس بشارت کے مستحق ہوجاؤ گے جو اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی ہے کہ:

﴿انما یوفی الصّٰبرون اجرھم بغیر حساب﴾ [سورۃ الزمر: ۱۰]

بیشک صبر کرنے والوں کو بے شمار اجر ملے گا۔

لہٰذا اس دنیا میں جتنا سکون "رضاء بالقضا" یعنی اللہ کے فیصلے پر راضی ہونے کا ذریعہ حاصل ہوسکتا ہے، اتنا سکون کسی اور طریقے سے حاصل نہیں ہوسکتا۔

بہر حال! "رضاء بالقضا" سے بڑھ کر کوئی اور سکون کا راستہ نہیں، اب یا تو اس ذریعہ سے سکون حاصل کرلو یا عمر بھر راحت کے لئے تڑپتے رہو، وہ میسر نہیں آئے گی۔ خلاصہ یہ کہ اس ملفوظ میں حضرت والا نے فرمایا کہ اگر بالفرض وساوس کی طرف عدم التفات کے باوجود وسوسے ختم نہ ہوں، بلکہ پھر بھی مسلسل آتے رہیں تو اس سے مت گھبراؤ اور پریشان مت ہو، بلکہ ان وسوسوں کے آنے پر راضی ہوجاؤ، اور یہ سوچو کہ جب میرے اللہ نے میرے لئے یہ مقدر کردیا ہے تو میں اس پر خوش ہوں، البتہ ان وساوس کے تقاضوں پر عمل مت کرو۔ اللہ تعالیٰ مجھے اور آپ سب کو صحیح فہم عطا فرمائے اور ان پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔

[اصلاحی مجالس، ج ۴، ص ۴۳ تا ۴۸]

آپ ﷺ کی بعثت اور قیامت کس طرح قریب ہے ؟
”چودہ سو سال گذر گئے اب تک تو قیامت نہیں آئی“

نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ”بعثت أنا والساعة کھاتین و یقرن بین أصبعیه السبابة والوسطی“

یعنی میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں جیسے شہادت کی انگلی اور بیچ کی انگلی اور دونوں انگلیاں اٹھا کر آپ نے فرمایا کہ جس طرح ان دونوں انگلیوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں بلکہ دونوں ملی ہوئی ہیں، اسی طرح میں اور قیامت اس طرح بھیجے گئے ہیں کہ دونوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں، وہ قیامت بہت جلد آنے والی ہے۔

اب لوگوں کو اشکال ہوتا ہے کہ چودہ سو سال تو حضور اقدس ﷺ کو گذر گئے اب تک تو قیامت آئی نہیں، بات دراصل یہ ہے کہ ساری دنیا کی عمر کے لحاظ سے اگر دیکھو گے، اور جب سے دنیا پیدا ہوئی ہے اس کا لحاظ کر کے اگر دیکھو گے تو ہزار دو ہزار سال کی کوئی حیثیت نہیں ہوتی، اسی لیے آپ نے فرمایا کہ میرے اور قیامت کے درمیان کوئی زیادہ فاصلہ نہیں ہے، وہ قیامت بہت قریب آنے والی ہے۔

اور ساری دنیا کی جو مجموعی قیامت آنے والی ہے وہ خواہ کتنی ہی دور ہو، لیکن ہر انسان کی قیامت تو قریب ہے، کیونکہ: ”من مات فقد قامت قیامته“

یعنی جو مر گیا اور جس کو موت آ گئی، اس کی قیامت تو اسی دن قائم ہو گئی، اس واسطے جب قیامت آنے والی ہے، خواہ وہ مجموعی قیامت ہو یا انفرادی، اور اس کے بعد خدا جانے کیا معاملہ ہونے والا ہے، اس لیے میں تم کو ڈرا رہا ہوں کہ وہ وقت آنے سے پہلے تیاری کر لو، اور اس وقت کے آنے سے پہلے ہوشیار ہو جاؤ اور اپنے آپ کو عذاب جہنم اور عذاب قبر سے بچا لو۔ [اصلاحی خطبات ج ا ص ۲۱۳ تا ۲۱۵]

کیا نحوست کا کوئی خاص دن یا خاص وقت ہوتا ہے ؟

بات دراصل یہ ہے کہ ہم لوگ ایک عرصہ دراز تک ہندوستان میں ہندوؤں کے ساتھ رہے ہیں، ہندوؤں کی بہت سی باتیں ہمارے اندر بھی آ گئی ہیں، اور ہندوؤں کے ہاں تو ہم پرستی بہت ہے کہ فلاں دن سعد ہے، فلاں دن نحس ہے، فلاں دن منحوس ہے، فلاں دن برکت والا ہے، حقیقت میں کوئی دن منحوس نہیں ہوتا، سال کے ۳۶۵ دن سب اللہ تعالیٰ کے پیدا ہوئے ہیں، کسی دن کے اندر بھی ذات میں کوئی نحوست نہیں، کوئی بے برکتی نہیں، ہاں! بعض دنوں کو اللہ تعالیٰ نے اپنی طرف نسبت دے کر اس کی فضیلت بڑھا دی ہے، لہٰذا فضیلت والے دن تو بہت ہیں، مہینے بھی ہیں، دن بھی ہیں، ہفتے بھی ہیں، جن کی اللہ تعالیٰ نے فضیلت بیان فرمائی ہے، لیکن کسی دن کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے یہ نہیں فرمایا کہ یہ دن منحوس ہے، یا اس دن میں بے برکتی ہے۔

ہاں! بے برکتی اور نحوست جو پیدا ہوتی ہے، وہ ہمارے اعمال کی وجہ سے ہوتی ہے، جس دن ہمیں اللہ

تعالیٰ کی طرف رجوع کرنے کی توفیق ہوگئی، جس دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں حاضری کی توفیق ہوگئی، وہ دن ہمارے لئے مبارک دن ہے، اور خدانہ کرے جس دن ہم کسی معصیت میں مبتلا ہوگئے، کسی نافرمانی کا ارتکاب ہم نے کرلیا، وہ دن ہمارے لئے منحوس ہے، وہ دن اپنی ذات میں منحوس نہیں تھا، لیکن ہم نے اپنے عمل سے اس کے اندر نحوست پیدا کرلی، لہٰذا اللہ تعالیٰ کے تخلیق کئے ہوئے ایام میں کوئی دن منحوس نہیں، منحوس تو اللہ تعالیٰ کی نافرمانی ہے، گناہ ہے، معصیت ہے، منکرات ہے، یہ سب نحوست کی چیزیں ہیں، ہاں! جس دن اللہ تبارک وتعالیٰ ہمیں عبادت کی توفیق دے دیں، اور ہم اللہ تعالیٰ کی طرف رجوع کرلیں وہ برکت کا دن ہے۔

[خطبات عثمانی، ج ۳، ص ۱۶۲]

ماہ ذی قعدہ منحوس نہیں

ہمارے معاشرے میں ذی قعدہ کے مہینے کو جو منحوس سمجھا جاتا ہے اور اس کو ''خالی'' کا مہینہ کہا جاتا ہے، یعنی یہ مہینہ ہر برکت سے خالی ہے، چنانچہ اس ماہ میں نکاح اور شادی نہیں کرتے اور کوئی خوشی کی تقریب نہیں کرتے، یہ سب فضولیات اور توہم پرستی ہے، شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۴۸]

قرآن وحدیث

معنی سمجھے بغیر حفظِ قرآن اور تلاوت کا کیا فائدہ ؟

آج کل لوگوں میں پروپیگنڈا کیا گیا ہے کہ قرآن کریم کو طوطا مینا کی طرح رٹنے سے کیا فائدہ ؟ جب تک کہ انسان اس کے معنی اور مطلب نہ سمجھے اور جب تک اس کے مفہوم کا اس کو ادراک نہ ہو، یہ تو ایک نسخہ ہدایت ہے، اس کو سمجھ کر انسان پڑھے، اور اس پر عمل کرے تو فائدہ حاصل ہوگا، اسی طرح بچوں کو قرآن کریم رٹانے سے کیا حاصل ہے؟ (العیاذ باللہ)، یاد رکھیے! یہ شیطان کی طرف سے بہت بڑا دھوکہ اور فریب ہے جو مسلمانوں کے اندر پھیلایا جارہا ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جن مقاصد کے لیے بھیجا گیا، قرآن کریم نے ان کو متعدد مقامات پر بیان فرمایا، ان مقاصد میں دو چیزوں کو علیحدہ علیحدہ ذکر فرمایا، ایک طرف فرمایا:

﴿ یتلوا علیھم آیاتہ ﴾

اور دوسری طرف فرمایا: ﴿ و یعلمھم الکتاب و الحکمۃ ﴾

یعنی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس لیے تشریف لائے تا کہ کتاب اللہ کی آیات لوگوں کے سامنے تلاوت کریں، لہذا تلاوت کرنا ایک مستقل مقصد ہے اور ایک مستقل نیکی اور اجر کا کام ہے، چاہے سمجھ کر تلاوت کرے، یا بے سمجھے تلاوت کرے، اور یہ تلاوت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے ایک مقصد ہے جس کو سب سے پہلے ذکر فرمایا: ﴿ یتلوا علیھم آیاتہ ﴾

اور قرآن کریم کی تلاوت ایسی بے وقعت چیز نہیں کہ جس طرح چاہا تلاوت کرلیا، بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے صحابہ کرامؓ کو با قاعدہ تلاوت کرنے کا طریقہ سکھایا اور اس کی تعلیم دی کہ کس لفظ کو کس طرح ادا کرنا ہے، کس طرح زبان سے نکالنا ہے، اس کی بنیاد پر دو مستقل علوم وجود میں آئے جن کی نظیر دنیا کی کسی قوم میں نہیں ہے، ایک علم تجوید، دوسرا علم قرأت۔

بہر حال تلاوت بذات خود ایک مقصد ہے اور یہ کہنا کہ بغیر سمجھے صرف الفاظ کو پڑھنے سے کیا حاصل ؟ یہ شیطان کا دھوکہ ہے، یاد رکھیے! جب تک کسی شخص کو قرآن کریم سمجھے بغیر پڑھنا نہ آیا تو وہ شخص دوسری منزل پر قدم رکھ ہی نہیں سکتا، قرآن کریم سمجھے بغیر پڑھنا پہلی سیڑھی ہے، اس سیڑھی کو پار کرنے کے بعد دوسری سیڑھی

کا نمبر آتا ہے، اگر کسی شخص کو پہلی سیڑھی پار کرنے کی توفیق نہ ہوئی تو وہ دوسری سیڑھی تک کیسے پہنچے گا۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا کہ یہ قرآن ایسا نسخہ شفا ہے کہ جو شخص اس کو سمجھ کر اس پر عمل کرے، اس کے لیے تو باعث شفا ہے ہی، لیکن اگر کوئی شخص محض اس کی تلاوت کیا کرے، بغیر سمجھے بھی تو اس پر بھی اللہ تبارک وتعالیٰ نے اتنی نیکیاں لکھی ہیں کہ ایک ''الم'' کے پڑھنے پر تیس نیکیوں کا اضافہ ہو جاتا ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۲۴۹]

''کیا صرف قرآن ہمارے لیے کافی ہے؟ اب ہمیں کسی اور طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں''

ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ

یہاں ایک بہت بڑی غلط فہمی کا ازالہ فرما دیا، جو آج بھی بہت سے لوگوں کے دلوں میں پیدا ہو رہا ہے، وہ یہ کہ اللہ تعالیٰ کی کتاب قرآن مجید ہمارے لیے کافی ہے، ہمیں کسی انسان کی طرف دیکھنے کی ضرورت نہیں، ہمارے پاس کتاب قرآن مجید موجود ہے، اس کے ترجمے چھپے ہوئے موجود ہیں، ترجموں کے ذریعے قرآن کریم پڑھیں گے اور اس کے ذریعہ جو مطلب سمجھ میں آئے گا اس پر عمل کریں گے، ہمیں اس بات کی ضرورت نہیں ہے کہ نیک لوگ کیا کر رہے ہیں اور کس طرح عمل کی تلقین کر رہے ہیں، قرآن کریم فرماتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے، اگرچہ پورا قرآن ہی صراط مستقیم ہے، لیکن اس صراط مستقیم کو سمجھنے کے لیے ضروری ہے کہ ان لوگوں کا راستہ دیکھو جن پر اللہ نے اپنا انعام کیا، وہ بتائیں گے تمہیں کہ اللہ کی نازل کی ہوئی کتاب کا مطلب کیا ہے، اور اس پر کس طرح عمل کریں گے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے ابتدا ہی سے یہ سلسلہ جاری رکھا ہے۔

دو چیزیں ساتھ ساتھ اتاری ہیں، ایک تو اللہ نے کتاب اتاری، تورات آئی، انجیل آئی، زبور آئی، اور آخر میں قرآن مجید آیا، دوسرے پیغمبر بھیجے تبارک وتعالیٰ نے، کوئی کتاب بغیر پیغمبر کے نہیں آئی، کیوں؟ اس لیے تاکہ پیغمبر یہ بتائے کہ اس کتاب کا مطلب کیا ہے؟ اور اس پر عمل کرنے کا طریقہ کیا ہوتا ہے؟ اور لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم اس پیغمبر کی اتباع کرو، پیغمبر کے پیچھے چلو، پیغمبر کی ذات پر ایمان لاؤ اور اس کے طریقے پر عمل پیرا ہوں، دو چیزیں ساتھ ساتھ چلتی ہیں، کتاب اللہ اور رجال اللہ، اللہ کی کتاب اور اللہ کے رجال، دونوں کے امتزاج سے دین کی صحیح سمجھ پیدا ہوتی ہے، گمراہی جو پھیلی ہے، وہ اس طرح پھیلی ہے کہ کچھ لوگوں نے کتاب کو تو پکڑ لیا اور اللہ نے جو پیغمبر بھیجے تھے اور پیغمبروں کے ذریعے ہدایت کا اور صحبت کا جو سامان دیا تھا اس سے قطع نظر کر لی، ہم بس اللہ کی کتاب پڑھیں گے، ہمارے پاس اللہ کی کتاب موجود ہے، ہمیں نمونوں کی کیا ضرورت ہے، العیاذ باللہ العظیم، ارے! اگر نمونے کی ضرورت نہ ہوتی تو پیغمبروں کو بھیجنے کی ضرورت کیا تھی، مکہ کے کافر کہتے تھے قرآن ہمارے اوپر براہ راست کیوں نازل نہیں ہوا، اللہ تعالیٰ نے ایسا

نہیں کیا، کیونکہ انسانوں کی ہدایت کے لیے تنہا کتاب کافی نہیں ہوا کرتی، جب تک معلم و مربی اس کتاب کا موجود نہ ہو، یہ انسان کی فطرت ہے، دنیا کا کوئی بھی علم وفن آدمی صرف کتاب کے مطالعہ سے حاصل نہیں کر سکتا، جب تک اس کا مربی موجود نہ ہو۔ [خطبات عثمانی، ج۱، ص ۲۰۵]

کیا قرآن سمجھنے کے لیے صرف عربی زبان جان لینا کافی ہے؟

قرآن کریم کی تفسیر ایک انتہائی نازک اور مشکل کام ہے، جس کے لیے صرف عربی زبان جان لینا کافی نہیں، بلکہ تمام متعلقہ علوم میں مہارت ضروری ہے، چنانچہ علما نے لکھا ہے کہ مفسر قرآن کے لیے ضروری ہے کہ وہ عربی زبان کے نحو وصرف اور بلاغت وادب کے علاوہ علم حدیث، اصول فقہ وتفسیر اور عقائد وکلام کا وسیع وعمیق علم رکھتا ہو، کیونکہ جب تک ان علوم سے مناسبت نہ ہو، انسان قرآن کریم کی تفسیر میں کسی صحیح نتیجے تک نہیں پہنچ سکتا۔

افسوس ہے کہ کچھ عرصے سے مسلمانوں میں یہ خطرناک وبا چل پڑی ہے کہ بہت سے لوگوں نے صرف عربی پڑھ لینے کو تفسیر قرآن کے لیے کافی سمجھ رکھا ہے، چنانچہ جو شخص بھی معمولی عربی زبان پڑھ لیتا ہے وہ قرآن کریم کی تفسیر میں رائے زنی شروع کر دیتا ہے، بلکہ بعض اوقات ایسا بھی دیکھا گیا ہے کہ عربی زبان کی نہایت معمولی شد بد رکھنے والے لوگ، جنہیں عربی پر بھی مکمل عبور نہیں ہوتا، نہ صرف من مانے طریقے پر قرآن کریم کی تفسیر شروع کر دیتے ہیں بلکہ پرانے مفسرین کی غلطیاں نکالنے کے درپے ہو جاتے ہیں، یہاں تک کہ بعض ستم ظریف تو صرف ترجمے کا مطالعہ کر کے اپنے آپ کو قرآن کا عالم سمجھنے لگتے ہیں اور بڑے بڑے مفسرین پر تنقید کرنے سے نہیں چوکتے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ یہ انتہائی خطرناک طرز عمل ہے جو دین کے معاملے میں نہایت مہلک گمراہی کی طرف لے جاتا ہے، دنیوی علوم وفنون کے بارے میں ہر شخص اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ اگر کوئی شخص محض انگریزی زبان سیکھ کر میڈیکل سائنس کی کتابوں کا مطالعہ کر لے تو دنیا کا کوئی صاحب عقل اسے ڈاکٹر تسلیم نہیں کر سکتا اور نہ اپنی جان اس کے حوالے کر سکتا ہے، جب تک کہ اس نے کسی میڈیکل کالج میں باقاعدہ تعلیم وتربیت حاصل نہ کی ہو، اس لیے کہ ڈاکٹر بننے کے لیے صرف انگریزی سیکھ لینا کافی نہیں، بلکہ باقاعدہ ڈاکٹری کی تعلیم وتربیت حاصل کرنا ضروری ہے، اسی طرح کوئی انگریزی داں انجینئرنگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے انجینئر بننا چاہے تو دنیا کا کوئی بھی باخبر انسان اسے انجینئر تسلیم نہیں کر سکتا، اس لیے کہ یہ کام صرف انگریزی زبان سیکھنے سے نہیں آ سکتا، بلکہ اس کے لیے ماہر اساتذہ کے زیر تربیت رہ کر ان سے باقاعدہ اس فن کو سیکھنا ضروری ہے، جب ڈاکٹر اور انجینئر بننے کے لیے یہ کڑی شرائط ضروری ہیں تو آخر قرآن وحدیث کے معاملے میں صرف عربی زبان سیکھ لینا کافی کیسے ہو سکتا ہے؟ زندگی کے ہر شعبے میں ہر شخص اس اصول کو جانتا اور

اس پر عمل کرتا ہے کہ ہر علم وفن کے سیکھنے کا ایک خاص طریقہ اور اس کی مخصوص شرائط ہوتی ہیں جنہیں پورا کیے بغیر اس علم وفن میں اس کی رائے معتبر نہیں سمجھی جاتی تو آخر قرآن وسنت اتنے لاوارث کیسے ہوسکتے ہیں کہ ان کی تشریح وتفسیر کے لیے کسی علم وفن کے حاصل کرنے کی ضرورت نہ ہو اور اس کے معاملے میں جو شخص چاہے رائے زنی شروع کردے!!

اللہ تعالی نے خود فرمایا کہ "ہم نے قرآن کو آسان بنایا ہے" پھر علماء اسے مشکل کیوں کہتے ہیں ؟

بعض لوگ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے خود ارشاد فرمایا ہے:

﴿وَلَقَدْ يَسَّرْنَا الْقُرْاٰنَ لِلذِّكْرِ فَهَلْ مِنْ مُّدَّكِرٍ﴾

اور بلاشبہ ہم نے قرآن کریم کو نصیحت حاصل کرنے کے لیے آسان کردیا ہے۔

اور جب قرآن کریم ایک آسان کتاب ہے تو اس کی تشریح کے لیے کسی لمبے چوڑے علم وفن کی ضرورت نہیں، لیکن یہ استدلال ایک شدید مغالطہ ہے جو خود کم فہمی اور سطحیت پر مبنی ہے، واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کی آیات دو قسم کی ہیں:

۱ ایک تو وہ آیتیں ہیں جن میں عام نصیحت کی باتیں، سبق آموز واقعات اور عبرت وموعظت کے مضامین بیان کیے گئے ہیں، مثلاً دنیا کی ناپائیداری، جنت ودوزخ کے حالات، خوف خدا اور فکر آخرت پیدا کرنے والی باتیں اور زندگی کے دوسرے سیدھے سادے حقائق، اس قسم کی آیتیں بلاشبہ آسان ہیں اور جو شخص عربی زبان سے واقف ہو وہ انہیں سمجھ کر نصیحت حاصل کرسکتا ہے، مذکورہ بالا آیت میں اسی قسم کی تعلیمات کے بارے میں یہ کہا گیا ہے کہ ان کو ہم نے آسان کردیا ہے چنانچہ خود اس آیت میں لفظ "للذکر" (نصیحت کے واسطے) اس پر دلالت کررہا ہے۔

۲ اس کے برخلاف دوسری قسم کی آیتیں وہ ہیں جو احکام وقوانین، عقائد اور علمی مضامین پر مشتمل ہیں اس قسم کی آیتوں کا کما حقہ سمجھنا اور ان سے احکام ومسائل مستنبط کرنا ہر شخص کا کام نہیں جب تک اسلامی علوم میں بصیرت اور پختگی حاصل نہ ہو، یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کی مادری زبان اگرچہ عربی تھی اور عربی سمجھنے کے لیے انہیں کہیں تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت نہیں تھی لیکن وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن کریم کی تعلیم حاصل کرنے میں طویل مدتیں صرف کرتے تھے، علامہ سیوطیؒ نے امام ابوعبدالرحمن سلمیؒ سے نقل کیا ہے کہ جن حضرات صحابہ نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن کریم کی باقاعدہ تعلیم حاصل کی ہے، مثلاً حضرت عثمان بن عفانؓ اور عبداللہ بن مسعودؓ وغیرہ انہوں نے ہمیں بتایا کہ جب وہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے قرآن کریم کی دس

آیتیں سیکھتے تو اس وقت تک آگے نہیں بڑھتے تھے جب تک ان آیتوں کے متعلق تمام علمی اور عملی باتوں کا احاطہ نہ کرلیں وہ فرماتے تھے کہ:

فتعلمنا القرآن و العلم و العمل جمیعا [الاتقان، ج ۲ ص ۱۷۶]

ہم نے قرآن اور علم وعمل ساتھ ساتھ سیکھا ہے۔

چنانچہ مؤطا امام مالکؒ میں روایت ہے کہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ نے صرف سورہ بقرہ یاد کرنے میں پورے آٹھ سال صرف کیے اور مسند احمد میں حضرت انسؓ فرماتے ہیں کہ ہم میں سے جو شخص سورہ بقرہ اور سورہ آل عمران پڑھ لیتا ہماری نگاہوں میں اس کا مرتبہ بہت بلند ہو جاتا تھا۔

غور کرنے کی بات یہ ہے کہ یہ حضرات صحابہؓ جن کی مادری زبان عربی تھی، جو عربی کے شعر و ادب میں مہارت تامہ رکھتے تھے اور جن کو لمبے لمبے قصیدے معمولی توجہ سے ازبر ہو جایا کرتے تھے انہیں قرآن کریم کو یاد کرنے اور اس کے معانی سمجھنے کے لیے اتنی طویل مدت کی کیا ضرورت تھی کہ آٹھ آٹھ سال صرف ایک سورت پڑھنے میں خرچ ہو جائیں؟ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ قرآن کریم اور اس کے علوم کو سیکھنے کے لیے صرف عربی زبان کی مہارت کافی نہیں تھی، بلکہ اس کے لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت اور تعلیم سے فائدہ اٹھانا ضروری تھا، اب ظاہر ہے کہ جب صحابہ کرامؓ کو عربی زبان کی مہارت اور نزول وحی کا براہ راست مشاہدہ کرنے کے باوجود ''عالم قرآن'' بننے کے لیے باقاعدہ حضور سے تعلیم حاصل کرنے کی ضرورت تھی تو نزول قرآن کے سینکڑوں سال بعد عربی کی معمولی شد بد پیدا کرکے یا صرف ترجمے دیکھ کر مفسر قرآن بننے کا دعوی کتنی بڑی جسارت اور علم و دین کے ساتھ کیسا افسوسناک مذاق ہے؟ ایسے لوگوں کو جو اس جسارت کا ارتکاب کرتے ہیں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد اچھی طرح یاد رکھنا چاہیے کہ:

''من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ معقده فی النار''

جو شخص قرآن کے معاملے میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانا جہنم میں بنالے۔

اور: من تکلم فی القرآن برأیه فأصاب فقد أخطأ

جو شخص قرآن کے معاملے میں (محض) اپنی رائے سے گفتگو کرے اور اس میں کوئی صحیح بات بھی کہہ دے تب بھی اس نے غلطی کی۔ (ابوداود و نسائی از اتقان ج ۲ ص ۱۷۹)

[توضیح القرآن، آسان ترجمہ قرآن، ج ۱ ص ۳۲]

قرآن کریم کی تفسیر وتشریح پر صرف علماء کرام ہی کی اجارہ داری کیوں؟

بعض لوگ یہ اعتراض اٹھاتے ہیں کہ قرآن کریم تمام انسانوں کے لئے ایک ہدایت کی کتاب

ہے، لہٰذا ہر شخص کو اس سے اپنی سمجھ کے موافق فائدہ اٹھانے کا حق حاصل ہے، اور اس کی تشریح وتفسیر پر صرف علماء کی ''اجارہ داری'' قائم نہیں کی جاسکتی۔

لیکن یہ بھی انتہائی سطحی اور جذباتی اعتراض ہے جسے حقیقت پسندی اور معاملہ فہمی سے دور کا بھی واسطہ نہیں، قرآن کریم بلاشبہ تمام انسانوں کے لئے سرمایۂ ہدایت ہے، لیکن اس سے یہ کیسے لازم آ گیا کہ ہر اَن پڑھ جاہل بھی اس سے دقیق قانونی اور کلامی مسائل کا استنباط کرسکتا ہے، اور اس مقصد کے لئے کسی قسم کی صفاتِ اہلیت درکار نہیں ہیں، اس کی مثال یوں سمجھئے کہ کوئی ماہر قانون، فلسفی، یا ڈاکٹر اگر اپنے فن پر کوئی کتاب لکھتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس کا منشأ پوری انسانیت کو فائدہ پہنچانا ہی ہوتا ہے، اب اگر کوئی ایسا شخص جو ان علوم وفنون کے مبادی سے واقف نہیں ہے کھڑا ہو کر یہ اعتراض کرنے لگے کہ یہ کتابیں تو پوری انسانیت کے فائدے کے لئے لکھی گئی تھیں، ان پر ماہرین قانون، فلسفیوں اور ڈاکٹروں نے اپنی اجارہ داری کیوں قائم کرلی ہے؟ تو اسکی عقل پر ماتم کے سوا اور کیا کیا جاسکتا ہے؟ اگر کسی کتاب سے کماحقہٗ فائدہ اٹھانے کے لئے اہلیت کی کچھ صفات مقرر کرنا ''اجارہ داری'' قائم کرنے کی تعریف میں آتا ہے تو پھر دنیا کے کسی علم وہنر کو جاہلوں اور اناڑیوں کی دستبرد سے محفوظ نہیں رکھا جاسکتا، دراصل علم وفن کی ہر کتاب انسانیت کو فائدہ پہنچانے کے لئے ہوتی ہے، لیکن اس سے فائدہ اٹھانے کے دو ہی طریقے ہیں، یا تو انسان اس علم وفن کو باقاعدہ ماہر اساتذہ سے حاصل کرے، اور اس کے لئے جو محنت اور جتنا وقت درکار ہے اسے خرچ کرے، اور اگر وہ ایسا نہیں کرسکتا تو جن لوگوں نے اس علم وفن کو حاصل کرنے کے لئے اپنی عمریں کھپائی ہیں، ان میں سے جس پر زیادہ اعتماد ہو اس کی تشریح وتفسیر پر بھروسہ کرے، ان دو راستوں کے علاوہ جو شخص کوئی تیسرا راستہ اختیار کرے گا وہ اپنے اوپر بھی ظلم کرے گا اور متعلقہ علم وفن پر بھی، بالکل یہی معاملہ قرآن وسنت کا بھی ہے، کہ وہ بلاشبہ پوری انسانیت کے لئے دستورِ ہدایت ہیں، لیکن اس سے ہدایت حاصل کرنے کے بھی دو ہی طریقے ہیں، یا تو انسان ان علوم کو ماہر اساتذہ سے باقاعدہ حاصل کر کے ان میں پوری بصیرت پیدا کرے، یا پھر ان لوگوں کی تشریح وتفسیر پر اعتماد کرے جنہوں نے اپنی زندگیاں ان علوم کے لئے وقف کی ہیں، اس سو فیصد معقول اصول کو جس پر دنیا کے ہر علم وفن کے معاملے میں عمل کیا جاتا ہے ''اجارہ داری'' کا طعنہ دینا سوائے سطحی جذباتیت کے اور کیا ہے؟ کیا ساری دنیا میں صرف قرآن وسنت ہی (معاذ اللہ) ایسے لاوارث رہ گئے ہیں کہ ان سے مسائل مستنبط کرنے کے لئے اہلیت کی کوئی شرط درکار نہیں ہے؟ اور ان پر ہر کس وناکس مشقِ ستم کرسکتا ہے؟ [علوم القرآن، ص ۳۶۴]

عیسائیت میں بائبل کی تشریح کا حق صرف پوپ کو حاصل ہے یہ کیسے ممکن ہے کہ اسلام دینِ فطرت میں بھی قرآن کی تفسیر کا مکمل حق علماء کے ایک مخصوص طبقے کے حوالے کردیا جائے ؟

مذکورہ اعتراض ہی کو قدرے مختلف عنوان سے بعض لوگ اس طرح تعبیر کرتے ہیں کہ اسلام میں ''پاپائیت'' کی کوئی گنجائش نہیں ہے، یہ بات عیسائی مذہب کا خاصہ ہے کہ اس میں بائبل کی تشریح وتفسیر کا حق صرف پوپ کو حاصل ہوتا ہے، اور کسی دوسرے شخص کو اس سے مجالِ اختلاف نہیں ہوتی، اسلام نے پاپائیت کی جڑ کاٹی ہے، لہٰذا یہ کیسے ممکن ہے کہ اس دینِ فطرت میں بھی قرآن کریم کی تفسیر کا سارا حق علماء کے ایک مخصوص طبقے کے حوالے کردیا جائے؟

لیکن یہ اعتراض بھی پاپائیت اور علمائے اسلام دونوں کی بات کو غلط سمجھنے کا نتیجہ ہے، ''علماء'' کسی ایسے مخصوص طبقے یا گروہ کا نام نہیں ہے جس کی بنیاد رنگ ونسل، ذات پات، مال ودولت یا جاہ ومنصب کی کاص شرائط پر ہو، نہ علماء کسی ایسی لگی بندھی تنظیم کا نام ہے جس کا رکن بنے بغیر انسان عالم کہلانے کا مستحق نہ ہو، بلکہ علم وفضل اور سیرت وکردار کی کچھ مخصوص صفات کا حامل ہر شخص عالم دین ہے، خواہ وہ کسی خطے سے تعلق رکھتا ہو، کوئی زبان بولتا ہو، اور نسب کے اعتبار سے کسی بھی خاندان سے وابستہ ہو، اس لحاظ سے اسلام کے علماء اور عیسائیت کے پاپاؤں میں مندرجہ ذیل واضح فرق موجود ہیں:

① پاپائیت ایک ایسے پیچیدہ مذہبی نظام کا نام ہے جو ایک لگی بندھی عالمگیر تنظیم میں جکڑا ہوا ہے، اس میں بے شمار عہدے اور منصب ہیں، ان عہدوں اور مناصب پر فائز ہونے والوں کی تعداد مقرر ہے، ہر عہدہ ومنصب پر کسی شخص کا تقرر کچھ معین انسان کرتے ہیں، اور وہی اس کو فرائض واختیارات تفویض کرتے ہیں، کوئی شخص محض اپنی ذاتی اہلیت، علم وفضل یا سیرت وکردار کی بنیاد پر لازماً اس تنظیم میں کوئی عہدہ حاصل نہیں کرسکتا، جب تک کہ اس تنظیم کے اربابِ اقتدار اسے نامزد نہ کریں، اور جب تک وہ اس تنظیم میں کوئی عہدہ حاصل نہ کرے مذہبی معاملات میں اس کی ہر رائے قطعی غیر مؤثر ہے، خواہ وہ علم وفضل کے کتنے ہی بلند مقام پر فائز ہو، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مذہبی علوم میں اعلیٰ درجے کی مہارت حاصل کرلے تب بھی وہ دلائل کے زور سے چرچ کے مضبوط حصار کو نہیں توڑ سکتا، اور اگر یہ معین تنظیم اپنی کتب مقدسہ، اپنے پیغمبروں اور اپنے اسلاف سے بغاوت پر کمر باندھ لے تب بھی تنظیم سے باہر کے کسی عالم کو اس کے خلاف دَم مارنے کی گنجائش نہیں ہے۔

اس کے برخلاف ''علمائے اسلام'' کی کسی بھی زمانے میں اس نوعیت کی کوئی عالمگیر تنظیم نہیں رہی، جس میں داخلے کے بغیر مذہبی معاملات میں لب کشائی ممنوع ہو، جس کے عہدوں کا دائرہ اختیار خاص

ہو، اور جن میں تقرر کا فیصلہ کچھ مخصوص افراد کرتے ہیں، اس کے بجائے ہر وہ شخص جس نے ماہر اساتذہ کے زیر نگرانی قرآن وسنت اور متعلقہ علوم میں بصیرت اور اصلاح وتقویٰ پیدا کر لیا ہو، وہ ''عالم دین'' کہلانے کا مستحق ہو جاتا ہے، مذہبی معاملات میں اس کے فرائض واختیارات کا تعین معدودے چند انسانوں کا کوئی گروہ نہیں کرتا، بلکہ اس کے علم وتقویٰ کی بنیاد پر عام مقبولیت اس کا فیصلہ کرتی ہے، چرچ کے ارباب بست وکشاد اپنے عہدہ ومنصب کے زور پر اپنی بات منواتے ہیں، اور ایک مسلمان عالم اپنے علم وفضل اور سیرت وکردار کی قوت سے یہ مقام حاصل کرتا ہے، وہاں چرچ کے متشدد قوانین کسی شخص کو واجب الاتباع اور قابل تقلید قرار دیتے ہیں، اور یہاں اس معاملے میں اصل فیصلہ کن قوت امت کا اجتماعی ضمیر ہے، کلیسا کے عہدہ داروں کی ایک تعداد مقرر ہے، اس تعداد کے پورا ہو جانے کے بعد کوئی شخص کتنا ہی بڑا عالم ہو اپنے زمانے کے کلیسا کے کسی فیصلہ سے اختلاف نہیں کر سکتا، اس کے برعکس علمائے دین کوئی تعداد مقرر نہیں ہے، علم دین کی ضروری شرائط پوری کرنے کے بعد ہر شخص عالم دین کے حقوق حاصل کر سکتا ہے۔

② پھر کلیسائی نظام میں مذہب اور عقائد کی تشریح وتفسیر کے تمام اختیارات فرد واحد پر مرکوز ہو جاتے ہیں، جسے ''پوپ'' کہتے ہیں، اس پوپ کو مذہب کے کروڑوں پیروؤں میں سے کل ستر (۷۰) کارڈینل (Cradinals) منتخب کرتے ہیں، اس پوپ کے اختیارات یہ ہیں کہ وہ رئیس الحواریین (جناب پطرس) کا تنہا خلیفہ ہے، تمام مذہبی معاملات میں آخری اتھارٹی ہے، مذہب کی تشریح کے معاملے میں ہر مسیحی کے لئے واجب الاتباع ہے، اس کی زبان قانون کی حیثیت رکھتی ہے، اور کسی بڑے سے بڑے عالم کو اس سے اختلاف کا حق نہیں پہنچتا، ''انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا'' میں اس کے اختیارات کی تشریح ان الفاظ میں کی گئی ہے:

> ''لہذا پوپ عقائد ونظریات کے معاملہ میں مقتدر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے اسی استناد (Authority) اور اسی معصومیت (Infallibility) کا حامل ہے، جس طرح پورا کلیسا وہ قانون ساز اور جج کی حیثیت وہ تمام اختیارات رکھتا ہے جو پوری کلیسا کو حاصل ہیں۔۔۔۔۔۔۔۔۔ [انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا مقالہ ''پوپ'' ص:۲۲۲، ج:۱۸]

غور فرمایئے کہ پوری تاریخ اسلام میں آج تک کسی بھی عالم دین نے کبھی اس مطلق العنانی کا دعویٰ کیا ہے؟

③ پھر عیسائی عقائد کے مطابق ''پوپ'' نظریاتی مسائل کا اعلان کرتے ہوئے معصوم اور خطاؤں سے پاک ہوتا ہے، چنانچہ برٹانیکا میں ہے:

> ''لہذا پوپ کے دو خصوصی امتیازات ہیں، ایک یہ کہ جب وہ مقتدر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے عقائد کے بارے میں کوئی اعلان کرے تو وہ معصوم اور غلطیوں سے پاک ہوتا ہے، اور دوسرے یہ کہ وہ مذہب کے تمام پیروؤں پر حاکمانہ اختیار کامل (Jurisdiction

Sovereign) رکھتا ہے، یہ دونوں استحقاقات جن کا دعویٰ اور استعمال صدیوں سے پوپ کرتے آئے ہیں، ان کو جولائی ۱۸۷۰ء کی ویٹی کن کی کونسل میں واضح دستوری شکل بھی دے دی گئی ہے۔ [ایضاً ص: ۲۲۳، ج: ۱۸ مزید دیکھئے مقالہ معصومیت (Infallibility)]

اس کے برخلاف یہ تمام علمائے اسلام کا متفقہ عقیدہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے بعد کوئی فرد معصوم نہیں ہے، اور ہر ایک سے غلطی ہو سکتی ہے، چنانچہ علمائے اسلام پوری آزادی سے ایک دوسرے پر تنقید کرتے آئے ہیں، اور یہ سلسلہ عہد صحابہ سے اب تک جاری ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ کوئی مشہور سے مشہور عالم اگر قرآن وسنت کی تشریح میں کوئی غلطی کرے تو دوسرے علمائے امت اس کی گرفت کر کے امت کو اس کے نتائج بد سے محفوظ کر سکتے ہیں۔

④ پھر کلیسا میں جو ستر کارڈنیل پوپ کا انتخاب کرتے اور اس کو مشورے دیتے ہیں، ان کی نامزدگی خود پوپ صاحب تن تنہا کرتے ہیں، چنانچہ ''برٹانیکا'' میں ہے:

> ''کارڈنیلوں کی نامزدگی آج تن تنہا پوپ کا کام ہے، پوپ جن افراد کو خفیہ طور پر چنتا ہے، ان کے ناموں کی اشاعت سے یہ کام مکمل ہو جاتا ہے، اس کے لئے کسی اور ضابطے کی پابندی ضروری نہیں۔۔۔۔۔اسی طرح سیکرڈ کالج کی ووٹنگ یا منظوری کی بھی چنداں ضرورت نہیں''۔ [انسائیکلو پیڈیا برٹانیکا ص: ۸۵۵، ج: ۲ مقالہ ''کارڈنیل'']

اس کے علاوہ کلیسا کے یہ ارباب اقتدار جو مذہب کے سیاہ وسفید کے مالک ہوتے ہیں، ان کا تقرر محض اہلیت کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ مختلف خطوں میں مختلف علاقائی تعصّبات کارفرما ہوتے ہیں، ''برٹانیکا'' ہی کا ایک اور بیان ملاحظہ ہو:

> ''ریاستہائے متحدہ امریکہ میں کلیسا دنیا کی ہر قوم کے مختلف گروپوں سے مرکب ہوتا ہے، لیکن انگریزی بولنے والی اقوام اکثریت میں ہوتی ہیں، انیسویں صدی کے وسط تک آئرش اور جرمن اقوام کو سب سے زیادہ کوٹا حاصل تھا۔۔۔۔ان کے علاوہ مشرقی کیتھولک اقوام مثلاً یونانی، شامی، اور آرمینی ایک قابل لحاظ تناسب سے موجود ہیں''۔
>
> [ایضاً مقالہ ''رومن کیتھولک چرچ'' ص: ۴۲۱، ج: ۱۹]

اس مختصر سے تعارف کے بعد پاپائی نظام کا موازنہ علمائے اسلام سے کیجئے تو دونوں میں زمین وآسمان کا تفاوت ہے، علمائے اسلام کی نہ کوئی لگی بندھی تنظیم ہے، نہ کوئی فرد مذہبی معاملات میں حاکم اعلیٰ ہے، نہ کوئی شخص معصوم اور غلطیوں سے پاک ہونے کا دعویٰ دار ہے۔ نہ علماء کی کوئی مخصوص تعداد مقرر ہے، جس پر اضافہ نہ ہو سکتا ہو، نہ کوئی شخص دوسرے علماء کی تنقید سے بالاتر ہے، نہ عالم کے منصب پر فائز ہونے کے لئے کسی فرد واحد کی اجازت اور منظوری درکار ہے، نہ اس منصب کے لئے کسی رنگ ونسل

یا زبان ووطن کی کوئی قید ہے، بلکہ تاریخ اسلام میں اکثر سیاست عربوں کے پاس رہی، لیکن علماء عجمیوں بلکہ غلاموں کے خاندان سے پیدا ہوتے رہے، اور پورا عالم اسلام ان کے علم وفضل اور تقدس وتقویٰ کا لوہا مانتا رہا، لہذا جب یہ بات کہی جاتی ہے کہ قرآن وسنت کے علوم میں دخل اندازی کے لئے ان علوم میں بصیرت ومہارت درکار ہے تو اس پر ''پاپائیت'' کا الزام عائد کرنا حقیقت اور انصاف کے ساتھ ایک سنگین مذاق کے سوا کچھ نہیں، اس کے بجائے درحقیقت دینی علوم کی مثال دوسرے علوم کی سی ہے، جس طرح دنیا کے تمام علوم فنون کے بارے میں کسی شخص کی بات اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوسکتی جب تک اس نے اس متعلقہ علم کو ماہر اساتذہ سے حاصل کر کے ان کا عملی تجربہ نہ کیا ہو، اسی طرح قرآن وسنت کی تشریح وتفسیر میں کسی کی بات اس وقت تک قابل قبول نہیں ہوگی جب تک اس نے متعلقہ علوم کو باقاعدہ حاصل کر کے ماہر اساتذہ کے زیر نگرانی ان کا عملی تجربہ نہ کیا ہو، اگر اس بات کو کوئی شخص پاپائیت سے تعبیر کرتا ہے تو دنیا کا کوئی علم وفن اس ''پاپائیت'' سے خالی نہیں ہوسکتا۔ [علوم القرآن، ص ۳۶۵]

قرآن کریم کی اپنی رائے سے تفسیر کرنا
اور تفسیر بالرائے کی صورتیں

ایک حدیث میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا پاک ارشاد ہے:

من تکلم فی القرآن برأیه فاصاب فقداخطأ

''جو شخص قرآن کریم کے بارے میں اپنی رائے سے کچھ گفتگو کرے تو اگر صحیح بات بھی کہے تو اس نے غلطی کی''

علامہ ماوردیؒ فرماتے ہیں کہ بعض غلو پسند لوگوں نے اس حدیث سے یہ مطلب سمجھا کہ قرآن کریم کے بارے میں کوئی بات فکر ورائے کی بنیاد پر کہنا جائز نہیں، یہاں تک کہ اجتہاد کے ذریعہ قرآن کریم سے ایسے معانی بھی مستنبط نہیں کئے جاسکتے جو اصول شرعیہ کے مطابق ہوں، لیکن یہ خیال درست نہیں، کیونکہ خود قرآن کریم نے تدبر اور استنباط کو جابجا مستحسن قرار دیا ہے، اور اگر فکر وتدبر پر بالکل پابندی لگادی جائے تو قرآن وسنت سے شرعی احکام وقوانین مستنبط کرنے کا دروازہ ہی سرے سے بند ہوجائے گا، لہذا اس حدیث کا مطلب ہر قسم کی رائے پر پابندی لگانا نہیں ہے۔ [ماخوذ از الاتقان ج:۲ ص:۱۸۰، نوع:۷۸]

چنانچہ اس بات پر جمہور علماء متفق ہیں کہ خود قرآن وسنت کے دوسرے دلائل کی روشنی میں اس حدیث کا یہ منشا ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کریم کے معاملہ میں غور وفکر اور عقل ورائے کو بالکل استعمال نہیں کیا جاسکتا، بلکہ اس کا اصل منشا یہ ہے کہ قرآن کریم کی تفسیر کے لئے جو اصول اجماعی طور پر مسلم اور طے شدہ ہیں ان کو نظر انداز کر کے جو تفسیر محض رائے کی بنیاد پر کی جائے گی، وہ ناجائز ہوگی، اور اگر اس طرح تفسیر کے

معاملے میں دخل دے کر کوئی شخص اتفاقاً کسی صحیح نتیجے پر بھی پہنچ بھی جائے تو وہ خطا کار ہے، کیونکہ اس نے راستہ غلط اختیار کیا، اب اصول تفسیر کو نظر انداز کرنے کی بہت سی صورتیں ہو سکتی ہیں، مثلاً:

① جو شخص تفسیر قرآن کے بارے میں گفتگو کرنے کی اہلیت نہیں رکھتا، وہ محض اپنی رائے کے بل بوتے پر تفسیر شروع کر دے۔

② کسی آیت کی کوئی تفسیر صراحۃً آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم یا صحابہ وتابعین سے ثابت ہو اور وہ اسے نظر انداز کر کے محض اپنی عقل سے کوئی معنیٰ بیان کرنے لگے۔

③ جن آیات میں صحابہ وتابعین سے کوئی صریح تفسیر منقول نہیں، ان میں لغت اور زبان وادب کے اصولوں کو پامال کر کے کوئی تشریح بیان کرے۔

④ قرآن وسنت سے براہ راست احکام وقوانین مستنبط کرنے کے لئے اجتہاد کی اہلیت نہ رکھتا ہو، اور پھر اجتہاد شروع کر دے۔

⑤ قرآن کریم کی متشابہ آیات (جن کے بارے میں قرآن نے خود کہہ دیا ہے کہ ان کی سو فیصد صحیح مراد سوائے اللہ کے کوئی نہیں جانتا،) ان کی جزم ووثوق کے ساتھ کوئی تفسیر بیان کرے، اور اس پر مصر ہو،

⑥ قرآن کریم کی ایسی تفسیر بیان کرے جس سے اسلام کے دوسرے اجماعی طور پر مسلم اور طے شدہ عقائد یا احکام مجروح ہوتے ہوں۔

⑦ تفسیر کے معاملے میں جہاں عقل وفکر کا استعمال جائز ہے وہاں کسی قطعی دلیل کے بغیر اپنی ذاتی رائے کو یقینی طور پر درست اور دوسرے مجتہدین کی آراء کو یقینی طور سے باطل قرار دے۔

یہ تمام صورتیں اس تفسیر بالرأی کی ہیں جن سے مذکورہ بالا حدیث میں منع کیا گیا ہے، چنانچہ ایک دوسری حدیث میں ان تمام صورتوں کو اس مختصر جملے میں سمیٹ دیا گیا ہے:

من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعده من النار.

''جو شخص قرآن کریم کے معاملے میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے''۔

البتہ تفسیر کے اصولوں اور اسلام کے اجماعی طور پر طے شدہ ضوابط کی پابندی کرتے ہوئے اگر تفسیر میں کسی ایسی رائے کا اظہار کیا جائے جو قرآن وسنت کے خلاف نہ ہو، تو وہ اس حدیث کی وعید میں داخل نہیں ہے، البتہ اس قسم کا اظہار رائے بھی قرآن وسنت کے وسیع وعمیق علم اور اسلامی علوم میں مہارت کے بغیر ممکن نہیں، اور علماء نے اس کے لئے بھی کچھ کار آمد اصول مقرر فرمائے ہیں، جو اصول فقہ اور اصول تفسیر میں تفصیل سے بیان ہوئے ہیں، اور ان کا ایک نہایت مفید خلاصہ علامہ بدرالدین زرکشی نے اپنی کتاب ''البرہان فی علوم القرآن'' کی نوع ۴۱ر میں بالخصوص ''اقسام تفسیر کے زیر عنوان (صفحہ ۱۶۴ تا ۱۷۰) بیان فرمایا ہے، یہ پوری بحث نہایت قابل قدر ہے، لیکن چونکہ عربی زبان وعلوم کی مہارت کے بغیر اس سے فائدہ نہیں اٹھایا جاسکتا اس

لئے یہاں اس کا ترجمہ نقل کرنا بے فائدہ ہے، جو عربی داں حضرات چاہیں وہاں ملاحظہ فرما سکتے ہیں۔

[علوم القرآن، ص ۳۵۹]

تفسیر میں گمراہی کا پہلا سبب : نا اہلیت

علم تفسیر جہاں ایک انتہائی شرف وسعادت کی چیز ہے، وہاں اس کی نازک وادی میں قدم رکھنا بے حد خطرناک بھی ہے، کیونکہ اگر انسان کسی آیت کی غلط تشریح کر بیٹھے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی طرف ایک ایسی بات منسوب کر رہا ہے جو اللہ تعالیٰ نے نہیں کہی، اور ظاہر ہے کہ اس سے بڑی گمراہی کیا ہوسکتی ہے؟ جن لوگوں نے ضروری شرائط پوری کئے بغیر قرآن کریم کی تفسیر میں دخل اندازی کی ہے، وہ کافی محنت خرچ کرنے کے باوجود اس بدترین گمراہی میں مبتلا ہو گئے ہیں، اس لئے یہاں ایک نظر ان اسباب پر ڈال لینی بھی ضروری ہے جو انسان کو تفسیر قرآن کے معاملے میں گمراہی کی طرف لے جاتے ہیں۔

تفسیر قرآن میں گمراہی کا سب سے پہلا اور سب سے خطرناک سبب یہ ہے کہ انسان اپنی اہلیت وصلاحیت کو دیکھے بغیر قرآن کریم کے معاملے میں رائے زنی شروع کر دے، خاص طور پر ہمارے زمانے میں گمراہی کے اس سبب نے بری قیامت ڈھائی ہے، یہ غلط فہمی عام ہتی جارہی ہے کہ صرف عربی زبان پڑھ لینے کے بعد انسان قرآن مجید کا عالم ہو جاتا ہے، اور اس کے بعد جس طرح سمجھ میں آئے قرآن کریم کی تفسیر کرسکتا ہے، حالانکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ دنیا کا کوئی بھی علم وفن ایسا نہیں ہے جس میں محض زبان دانی کے بل پر مہارت پیدا ہوسکتی ہے، آج تک کبھی کسی ذی ہوش نے انگریزی زبان پر مکمل عبور رکھنے کے باوجود یہ دعویٰ نہیں کیا ہوگا کہ وہ ڈاکٹر ہو گیا ہے۔، اور میڈیکل سائنس کی کتابیں پڑھ کر دنیا پر مشق ستم کرسکتا ہے، اسی طرح کوئی شخص محض انجینیر نگ کی کتابوں کا مطالعہ کر کے انجینئر بننے کا دعویٰ نہیں کرسکتا اور نہ قانون کی اعلیٰ کتابیں دیکھ کر ماہر قانون کہلا سکتا ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا دعویٰ کرے تو یقینا ساری دنیا اسے احمق اور بے وقوف کہے گی، اس لئے کہ ہر شخص جانتا ہے کہ یہ تمام علوم وفنون محض زبان دانی اور نجی مطالعہ سے حاصل نہیں ہوتے، بلکہ ان کے لئے سالہا سال کی محنت درکار ہے، انھیں ماہر اساتذہ سے پڑھا جاتا ہے، اس کے لئے بڑی بڑی درسگاہوں میں کئی کئی امتحانات سے گزرنا ہوتا ہے، پھر کسی ماہر فن کے پاس رہ کر ان کا عملی تجربہ کرنا پڑتا ہے، تب کہیں انسان ان علوم کا مبتدی کہلانے کا مستحق ہوسکتا ہے۔

جب ان علوم وفنون کا یہ حال ہے تو تفسیر قرآن جیسا علم محض عربی زبان سیکھ لینے کی بناء پر آخر کیسے حاصل ہو جائے گا؟ آپ گزشتہ صفحات میں دیکھ چکے ہیں کہ علم تفسیر میں درک حاصل کرنے کے لئے کتنی وسیع معلومات درکار ہوتی ہیں، قرآن کریم عام کتابوں کی طرح کوئی ایسی مسلسل کتاب نہیں ہے جس میں ایک موضوع کی تمام باتیں ایک ہی جگہ لکھی ہوئی ہوں، بلکہ وہ دنیا کی تمام کتابوں کے برخلاف اپنا ایک جداگانہ اور ممتاز اسلوب رکھتا ہے، لہذا کسی آیت کو قرار واقعی طور پر سمجھنے کے لئے اول تو یہ ضروری ہے کہ اس آیت کی

مختلف قراءتوں، اس موضوع کی تمام دوسری آیات اور ان کے متعلقات پر پوری نگاہ ہو، پھر آپ پیچھے دیکھ چکے ہیں کہ بہت سی آیتیں کسی خاص واقعاتی پس منظر سے وابستہ ہوتی ہیں، جسے سبب نزول کہا جاتا ہے، اور جب تک سبب نزول کی مکمل تحقیق نہ ہو، اس کا پورا مفہوم نہیں سمجھا جاسکتا، نیز یہ حقیقت بھی آپ کے سامنے آچکی ہے کہ قرآن کریم بہت سے مجمل باتوں کی تشریح وتفسیر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات پر چھوڑ دیتا ہے۔ لہذا ہر آیت میں یہ دیکھنا ضروری ہوتا ہے کہ اس کی تفسیر میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی قولی یا عملی تعلیم موجود ہے یا نہیں؟ اور اگر موجود ہے تو وہ تنقید روایات کے مسلم اصولوں پر پوری اترتی ہے یا نہیں؟ نیز صحابہ کرامؓ نے جو نزول قرآن کے عینی شاہد تھے، اس آیت کا کیا مطلب سمجھا تھا، اگر اس بارے میں روایات کے بارے میں کوئی تعارض واختلاف ہے تو اسے کیونکر رفع کیا جاسکتا ہے؟

پھر عربی زبان ایک وسیع زبان ہے، جس میں ایک ایک لفظ کے کئی کئی معنی اور ایک ایک معنی کے لئے کئی کئی لفظ ہوتے ہیں، لہذا جب تک اس زمانے کے اہل عرب کے محاورات پر عبور نہ ہو کسی معنی کی تعیین بہت مشکل ہوتی ہے، اس کے علاوہ صرف الفاظ کے لغوی معنی جاننے سے کام نہیں چلتا، کیونکہ عربی میں نحوی ترکیبوں کے اختلاف سے معانی میں تبدیلی پیدا ہوجاتی ہے، اور یہ بات عربی لغت وادب پر مکمل عبور کے بغیر طے نہیں کی جاسکتی، کہ اس مقام پر کونسی ترکیب محاورات عرب کے زیادہ قریب ہے، اور سب سے آخر میں قرآن کریم اللہ تعالیٰ کا کلام ہے، اور اللہ تعالیٰ اپنے کلام کے اسرار ومعارف ایسے شخص پر نہیں کھولتا جو اس کی نافرمانیوں پر کمر بستہ ہو، لہذا تفسیر قرآن کے لئے اللہ کی بندگی، اس کے ساتھ تعلق خاص، طاعت وتقویٰ اور حق پرستی کے بے لاگ جذبے کی ضرورت ہے، اس تشریح سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ تفسیر قرآن کے لئے صرف عربی زبان کی معمولی واقفیت کام نہیں دے سکتی، بلکہ اس کے لئے علم اصولِ تفسیر، علم حدیث، اصول حدیث، اصول فقہ، علم فقہ، علم نحو، علم صرف، علم لغت، علم ادب اور علم بلاغت میں ماہرانہ بصیرت اور اور اس کے ساتھ طہارت وتقویٰ ضروری ہے، ان ضروری شرائط کے بغیر تفسیر کی وادی میں قدم رکھنا اپنے آپ کو گمراہی کے راستے پر ڈال دینے کے مرادف ہے، اور اسی طرف عمل کے بارے میں سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا تھا کہ: من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعدہ من النار

''جو شخص قرآن میں بغیر علم کے گفتگو کرے وہ اپنا ٹھکانہ جہنم میں بنالے''

[علوم القرآن، ص۳۵۹]

تفسیر میں گمراهی کا دوسرا سبب
قرآن کریم کو اپنے نظریات کے تابع بنانا

تفسیر قرآن کے سلسلے میں دوسری عظیم گمراہی یہ ہے کہ انسان اپنے ذہن میں پہلے سے کچھ نظریات متعین کرلے، اور پھر قرآن کریم کو ان نظریات کے تابع بنانے کی فکر کرے، جیسا کہ علامہ ابن تیمیہؒ نے

نشاندہی فرمائی ہے۔ [اصول التفسیر لابن تیمیہؒ، ص: ۲۳ مطبوعہ مکتبہ علمیہ لاہور]

قدیم زمانے سے باطل فرقوں، ظاہر پرستوں اور اپنے وقت کے فلسفے سے مرعوب لوگوں نے تفسیر قرآن میں یہی گمراہ کن طریقہ اختیار کیا ہے، اور الفاظ قرآنی کو توڑ موڑ کر اپنے نظریات کے مطابق بنانے کی کوشش کی ہے، حالانکہ یہ طرزِ عمل دنیا کے کسی بھی معاملہ میں حق وانصاف کے مطابق نہیں ہے، خاص طور سے قرآن کریم کے بارے میں یہ طریق کار اختیار کرنا اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس کے برابر کوئی ظلم نہیں ہوسکتا، قرآن کریم نے جگہ جگہ اپنے آپ کو ''ہدایت'' کی کتاب قرار دیا ہے، ''ہدایت'' کے معنی یہ ہیں کہ ''جس شخص کو منزل کا راستہ معلوم نہ ہو اسے راستہ دکھلانا'' لہذا قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے ناگزیر ہے کہ انسان اپنے آپ کو اس شخص کی طرح خالی الذہن رکھے، جسے اپنی منزل کا پتہ معلوم نہ ہو، اس کے بعد دل میں یہ اعتقاد پیدا کرے کہ قرآن کریم جو راستہ بتائے گا وہی میرے لئے صلاح وفلاح کا موجب ہوگا، خواہ اسے میری محدود عقل قبول کرے یا نہ کرے، اگر میری عقل ایسی ہی قابل اعتماد تھی کہ میں اس کے زور پر سب کچھ معلوم کرسکتا تھا تو پھر قرآن کریم کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت کیا تھی؟ اس اعتقاد کے ساتھ جب انسان قرآن کریم کی طرف رجوع کرے گا اور ان آداب وشرائط کو ملحوظ رکھے گا جو قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کے لئے ضروری ہیں تو اسے بلا شبہ ہدایت حاصل ہوگی، اور وہ منزل مراد کو پالے گا۔

اس کے برعکس اگر کسی شخص نے محض اپنی عقل کی بنیاد پر کچھ مخصوص نظریات اپنے ذہن میں پہلے سے بٹھالئے، اور پھر قرآن کریم کو ان مخصوص نظریات کی عینک سے پڑھنا شروع کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ کی اس مقدس کتاب کو ہدایت حاصل کرنے کے لئے نہیں بلکہ محض اپنے عقلی نظریات کی تائید حاصل کرنے کے لئے پڑھ رہا ہے، ظاہر ہے کہ جو شخص اپنی عقل پر اتنا بھروسہ کرتا ہو اور اپنی عقل کو قرآن کا خادم نہیں بلکہ (معاذ اللہ) قرآن کو اپنی عقل اور خواہشات کا خادم بنانا چاہتا ہو، قرآن کریم اسے ہدایت کی روشنی عطا کرنے سے بے نیاز ہے، ایسا شخص اللہ کی صحیح مراد تک پہنچنے کے بجائے اپنی گمراہی کی دَلدَل میں پھنستا چلا جاتا ہے، ایسے ہی لوگوں کے بارے میں قرآن کریم نے فرمایا ہے:

﴿يضل به كثيرا و يهدى به كثيرا﴾

''اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعے بہت سوں کو گمراہ کرتا ہے، اور بہت سوں کو ہدایت بخشتا ہے''۔

لہذا قرآن کریم سے ہدایت حاصل کرنے کا صحیح طریقہ یہ ہے کہ اپنے ذہن کو دوسرے نظریات سے خالی کر کے ایک طالب حق کی طرح قرآن کی طرف جوع کیا جائے، اور اس کی مراد سمجھنے کے لئے جن علوم کی ضرورت ہے، ان کو حاصل کر کے اس کی تفسیر معلوم کی جائے، اور اس طرح جو کچھ ثابت ہو اس پر ایک سچے مومن کی طرح ایمان رکھا جائے، اور جو شخص اتنی استطاعت نہ رکھتا ہو، یا اسے اپنے ذہن پر یہ اعتماد نہ ہو، اس کے لئے سیدھا راستہ یہ ہے کہ وہ خود ''تفسیر قرآن'' کی وادی میں قدم رکھنے کے بجائے ان لوگوں کی

تفسیر پر بھروسہ کرے، جنہوں نے اپنی عمریں اسی کام میں صرف کی ہیں، جن کی علمی بصیرت اور للّٰہیت وخدا ترسی پر اسے زیادہ اعتماد ہو۔ [علوم القرآن، ص ۳۷۱]

تفسیر میں گمراہی کا تیسرا سبب
زمانے کے افکار سے مرعوبیت

تفسیر قرآن کے سلسلے میں تیسری گمراہی یہ ہے کہ انسان اپنے وقت کے فلسفیانہ اور عقلی نظریات سے ذہنی طور پر مرعوب ہو کر قرآن کریم کی طرف رجوع کرے، اور تفسیر قرآن کے معاملے میں ان نظریات کو حق و باطل کا معیار قرار دے دے، یہ گمراہی دراصل دوسری گمراہی کے ذیل میں خود بخود آجاتی ہے، لیکن چونکہ ہمارے زمانے میں مغربی افکار سے مرعوبیت نے خاص طور سے بڑی قیامت ڈھائی ہے، اس لئے یہاں اس گمراہی کو مستقل طور ذکر کیا جا رہا ہے۔

تاریخ اسلام کے ہر دور میں ایسے افراد کی ایک جماعت موجود رہی ہے جو قرآن وسنت کے علوم میں پختگی پیدا کئے بغیر اپنے زمانے کے فلسفے کی طرف متوجہ ہوئے، اور وہ فلسفہ ان کے ذہنوں پر اس بری طرح مسلط ہو گیا کہ وہ اس کے بنائے ہوئے فکر و نظر کے دائروں سے باہر نکلنے کی صلاحیت سے ہی محروم ہو گئے، اس کے بعد جب انہوں نے قرآن کریم کی طرف رجوع کیا، اور اس کی بہت سی باتیں انھیں اپنے آئیڈیل فلسفے کے خلاف محسوس ہوئیں تو انہوں نے اس فلسفے کو جھٹلانے کے بجائے قرآن کریم میں تحریف وترمیم شروع کر دی اور اس کے الفاظ کو کھینچ تان کر اپنے فلسفیانہ افکار کے مطابق بنانا شروع کر دیا۔

جب مسلمانوں میں یونانی فلسفے کا چرچا ہوا، اور لوگوں نے قرآن وسنت کے علوم میں پختگی پیدا کئے بغیر اس فلسفے کو حاصل کرنا شروع کیا، تو یہی فتنہ پیش آیا اور بعض لوگ جو یونانی فلسفے سے بری طرح مرعوب ہو گئے تھے، قرآن کریم کو توڑ موڑ کر اس فلسفے کے مطابق بنانے کی کوشش میں لگ گئے، ان میں بہت سے لوگ مخلص بھی تھے، اور سچے دل سے یہ سمجھتے تھے کہ یونانی فلسفہ ناقابل تردید ہے، اور قرآن وسنت کی متوارث تفسیر اس کے لائے ہوئے فکری سیلاب کا مقابلہ نہیں کر سکے گی، اس لئے اس تفسیر کو بدل کر قرآن وسنت کی ایسی تشریح کرنی چاہئے جو یونانی فلسفے کے مطابق ہو، لیکن درحقیقت یہ قرآن وسنت اور اسلام کے ساتھ ایک نادان دوستی تھی، جس نے اسلام کی کوئی خدمت کرنے کے بجائے مسلمانوں میں نظریاتی انتشار برپا کیا، اور، معتزلہ اور جہمیہ جیسے بہت سے نئے فرقے پیدا کئے، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ پختہ کار علمائے دین جنہیں قرآن و سنت کے علوم میں رسوخ حاصل تھا، اور جو قرآن وسنت کے مقابلے میں وقت کے کسی چلے ہوئے نظام فکر سے مرعوب نہیں تھے، ان کی ایک بڑی جماعت کو دوسرے کام چھوڑ کر ایسے لوگوں کی تردید میں مصروف ہونا پڑا اور انہوں نے یونانی فلسفے کی فکری غلطیوں کی نشاندہی کر کے ایسے لوگوں کی مدلل اور مفصل تردید کی جو اس فلسفے

کے اثر سے قرآن وسنت میں معنوی تحریف کے مرتکب ہوئے تھے۔غرض ایک عرصے تک فکری مباحث اور تصنیف ومناظرہ کا بازار گرم رہا،اور فریقین کی طرف سے اپنے اپنے موقف کی تائید میں پورے کتب خانے تیار ہو گئے۔

پختہ کار عالم دین کا موقف یہ تھا کہ قرآن کریم کسی انسان کی نہیں اس خالق کائنات کی کتاب ہے جو اس دنیامیں اوراس میں ہونے والے واقعات کی رتی رتی سے باخبر ہے،اوراس دنیا کے بدلتے ہوئے حالات سے اس سے زیادہ کوئی باخبر نہیں ہوسکتا،لہذا قرآن کریم کی تعلیمات اوراس کے بیان کردہ حقائق سدا بہاراور نا قابل ترمیم ہیں،جن احکام وقوانین ونظریات پر زمانے کی تبدیلی اثرانداز ہوسکتی تھی ان کے بارے میں قرآن کریم نے خود کوئی معین بات کہنے کے بجائے ایسے جامع اصول بیان فرمادیئے ہیں جو ہر تبدیلی کے موقع پر کام آسکیں،اوران کی روشنی میں ہر بدلے ہوئے ماحول میں رہنمائی حاصل کی جا سکے،لیکن جو باتیں قرآن کریم نے وضاحت کے ساتھ بیان فرمادی ہیں،یا جن کی واضح تفسیر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے وہ زمانے کی تبدیلی سے بدلنے والی باتیں نہیں ہیں۔

فلسفہ اور سائنس کی تاریخ اس بات کی گواہ ہے کہ اس کے وہ بیشتر نظریات جو قطعی مشاہدہ پر مبنی نہیں ہیں،مختلف زمانوں میں بدلتے رہے ہیں،اورجس زمانے میں جو نظریہ رائج رہا وہ لوگوں کے ذہن وفکر پر اس بری طرح چھا گیا کہ لوگ اس کے خلاف کوئی بات سننے کے لئے تیار نہ رہے،لیکن جب زمانے کے کسی انقلاب نے اس نظریئے کی کایا پلٹی تو وہی نظریہ اتنا بدنام ہوا کہ اس کو منہ سے نکالنا بھی دقیانوسیت کی علامت بن گیا،اب اس کی جگہ کسی نئے نظریئے نے ذہنوں پر اپنا سکہ بٹھادیا،اوراس کی گھن گرج نے ہر مخالف رائے کا گلا گھونٹ دیا،پھر ایک عرصہ گزرنے پر یہ نیا نظریہ بھی اپنی آن کھو بیٹھا اور کسی تیسرے نظریئے نے اس کی جگہ لے لی،فکر انسانی کی تاریخ میں ہمیشہ یہی ہوتا ہے،اور جب تک حقیقت کی پیاس انسان کو قطعی مشاہدے تک نہیں پہنچادیتی،اس وقت یہی ہوتا رہے گا،اس کے برخلاف قرآن کریم نے جن حقائق کی طرف واضح رہنمائی عطا کی ہے وہ چونکہ ایسی ذات کے بیان کئے ہوئے ہیں جس کے سامنے یہ پوری کائنات اوراس میں ہونے والے حوادث ہاتھ کی ہتھیلی سے زیادہ واضح اور بے غبار ہیں،اس لئے فکر اور فلسفے کی اس آنکھ مچولی کو اس کے مقابلے میں پیش نہیں کیا جاسکتا،آپ زمانے کے جس نظریہ سے مرعوب ہو کر قرآن کریم کو اس کے سانچے میں ڈھالنے کی کوشش کریں گے ہوسکتا ہے کہ وہی نظریہ عہد جہالت کی یادگار ثابت ہو،اور آپ اسے زبان پر لاتے ہوئے بھی شرمانے لگیں۔

راسخ العلم اہل عقیدہ کا یہ طرز فکر تجربے سے بالکل سچا ثابت ہوا،آج فلسفہ اور سائنس کی ترقیات نے یونانی فلسفے کی دھجیاں بکھیر دی ہیں،اوراس کے نہ صرف بہت سے طبعی،عنصری اور فلکیاتی نظریات غلط قرار پاگئے بلکہ ان کی بنیاد پر مابعد الطبیعی (Metaphysical) نظریات کی جو عمارت اٹائی گئی تھی وہ بھی

زمین بوس ہوچکی ہے، جن لوگوں نے یونانی فلسفے کی چمک دمک سے خیرہ ہوکر قرآن وسنت کو موم کی ناک بنایا تھا، آج اگر وہ اندہ ہوتے تو یقیناً ان کی ندامت وشرمندگی کی کوئی انتہاء نہ رہتی۔

لیکن حیرت ہے کہ سطح پرستوں کا ایک گروہ تاریخ سے کوئی سبق لینے کے بجائے مغربی افکار سے متاثر ومرعوب ہوکر قرآن وسنت کی ایسی تفسیر گھڑنے کی فکر میں ہے جو مغرب کے چلتے ہوئے نظریات پر فٹ ہوسکے، یہ گروہ تفسیر کے تمام معقول ومعروف اصولوں کو توڑ کر صرف ایک اصول کی بنیاد پر قرآن کریم کے ساتھ مشق ستم میں مصروف ہے، اور وہ اصول یہ ہے کہ اللہ کے اس کلام کو کسی نہ کسی طرح کھینچ تان کر مغربی افکار کے مطابق بنادیا جائے، یہی لوگ کبھی یہ سوچنے کے لئے تیار نہیں ہوتے کہ جس کلام پر وہ تاویل وتحریف کی مشق کررہے ہیں وہ کس کا کلام ہے؟ جن نظریات کی خاطر وہ خدا کے کلام میں کھینچ تان کررہے ہیں وہ کتنے پائیدار ہیں؟

اور جب فکر انسانی کا قافلہ ان نظریات کو روند کر اور آگے بڑھے گا تو اس قسم کی تفسیروں اور تشریحات کا کیا حشر ہوگا؟ [علوم القرآن، ص ۳۷۲]

لہٰذا اگر قرآن کریم کو اپنے نظریات کا تابع بنانے کے بجائے اس سے واقعۃً رہنمائی حاصل کرنی ہے تو اسے رائج الوقت نظریات کی عینک سے پڑھنے کے بجائے اس طرح پڑھئے جس طرح سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم اور آپؐ کے اصحابؓ نے پڑھا تھا، اور اس کی تشریح وتفسیر کے وقت مروجہ افکار کے شور وغل سے متاثر ہونے کے بجائے وہ اصول استعمال کیجئے جو تفسیر کے فطری معقول اور واقعی اصول ہیں، ان اصولوں کے ذریعہ جو باتیں قرآن کریم سے واضح طور پر ثابت ہوجائے اسے جھینپ جھینپ کر اور شرما شرما کر نہیں، بلکہ پورے یقین وایمان اور خود اعتمادی کے ساتھ دنیا کے سامنے پیش کیجئے، اور زمانے کے مروجہ نظریات ہزار اس کے خلاف ہوں، یہ یقین رکھئے کہ حق وہی ہے جو قرآن کریم نے بیان کردیا، اگر انسانیت کی قسمت میں کوئی فلاح لکھی ہے تو وہ ہزار ٹھوکریں کھانے کے بعد اس کے بیان کئے ہوئے حقائق تک پہنچ کر رہے گی۔

[علوم القرآن، ص ۳۸۳]

تفسیر میں گمراہی کا چوتھا سبب
قرآن کریم کے موضوع کو غلط سمجھنا

تفسیر قرآن کے بارے میں چوتھی گمراہی یہ ہے کہ بعض لوگ قرآن کریم کے موضوع کو ٹھیک نہیں سمجھتے، اور اس میں وہ باتیں تلاش کرنے کی کوشش کرتے ہیں جو اس کے موضوع سے خارج ہیں، مثلاً بعض حضرات اس جستجو میں رہتے ہیں کہ قرآن کریم سے کائنات کے تمام سائنسی اور طبعی حقائق مستنبط کئے جائیں، اور سائنس کے مسلمات کو قرآن سے ثابت کیا جائے وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر قرآن سے سائنس کے یہ مسائل ثابت نہ ہوسکے، تو معاذ اللہ یہ قرآن کریم کا نقص ہوگا، چنانچہ وہ پورے خلوص کے ساتھ قرآنی آیات سے

سائنسی مسلمات ثابت کرنے کی فکر میں رہتے ہیں، اور بعض اوقات اس غرض کے لئے قرآنی الفاظ کو غلط معنی پہنا دیتے ہیں، حالانکہ واقعہ یہ ہے کہ قرآن کریم کا اصل موضوع سائنس نہیں ہے، اس میں اگر کہیں کائناتی حقائق کا ذکر آیا ہے، تو ضمنی طور سے آیا ہے، لہذا اگر اس میں کہیں کوئی سائنٹفک حقیقت واضح طور سے مل جائے تو اس پر بلاشبہ ایمان رکھنا چاہئے لیکن سائنس کا کوئی مسئلہ پہلے سے ذہن میں رکھ کر قرآن کریم سے اسے زبردستی نکالنے کی کوشش ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص طب کی کتاب میں قانون کے مسائل تلاش کرنے لگے۔

قرآن کریم نے اپنا موضوع اور مقصد نزول مبہم نہیں چھوڑا، بلکہ بیسیوں آیات میں یہ واضح کردیا ہے کہ اسے کیوں نازل کیا گیا ہے؟ مثال کے طور پر مندرجہ ذیل آیات پر غور فرمائیے:

﴿قد جاءکم من الله نور وکتاب مبین یهدی به الله من اتبع رضوانه سبل السلام و یخرجهم من الظلمٰت الی النور باذنه و یهدیهم الیٰ صراط مستقیم﴾ [المائدة:١٥،١٦]

''تمہارے پاس اللہ کی طرف سے ایک روشن چیز آئی ہے، اور کتاب واضح، کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو جو رضائے حق کے طالب ہوں، سلامتی کی راہیں بتلاتے ہیں، اور ان کو اپنی توفیق سے تاریکیوں سے نکال کر نور کی طرف لے آئے ہیں، اور ان کو صرط مستقیم کی ہدایت کرتے ہیں''۔

﴿یا اهل الکتٰب قد جاء کم رسولنا یبین لکم علیٰ فترةٍ من الرسل ان تقولوا ما جآءنا من بشیر و لا نذیر فقد جاءکم بشیر و نذیر﴾

[المائدة:١٩]

''اے اہل کتاب تمہارے پاس یہ ہمارے رسول آپہنچے ہیں جو تم کو صاف صاف بتلاتے ہیں، ایسے وقت میں کہ رسولوں کا سلسلہ (عرصہ سے) موقوف تھا، تاکہ تم یوں نہ کہنے لگو کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا نہ آیا، نہ ڈرانے والا، تو (اب) تمہارے پاس خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا آ گیا ہے''۔

﴿و انزلنا الیك الکتٰب بالحق مصدقاً لما بین یدیه من الکتٰب و مهیمناً علیه فاحکم بینهم بمآ انزل الله و لا تتبع اهواءهم عما جاءك من الحق لکلٍّ جعلنا منکم شرعةً ومنهاجاً و لوشآء الله لجعلکم امة واحدة ولٰکن لیبلوکم فی مآ اٰتاکم فاستبقوا الخیرات الی الله مرجعکم جمیعاً فینبئکم بما کنتم فیه تختلفون﴾ [المائدة:٤٨]

''ہم نے یہ کتاب آپ کے پاس بھیجی ہے، جو خود بھی صدق کے ساتھ موصوف ہے، اور اس سے پہلے جو (آسمانی) کتابیں ہیں، ان کو بھی تصدیق کرتی ہے، اور ان کتابوں کی محافظ ہے تو ان کے باہمی

معاملات میں اس بھیجی ہوئی کتاب کے موافق فیصلہ فرمایا کیجئے، اور یہ جو سچی کتاب آپ کو ملی ہے، اس سے دور ہوکر ان کی خواہشوں پر عملدر آمد نہ کیجئے، تم میں سے ہر ایک کے لیے ہم نے خاص شریعت اور خاص طریقہ تجویز کیا تھا، اور اللہ تعالیٰ کو منظور ہوتا تو تم سب کو ایک ہی امت میں کر دیتے، لیکن ایسا نہیں کیا، تاکہ جو دین تم کو دیا ہے اس میں تم سب کا امتحان فرمادیں، تو نیکیوں کی طرف دوڑو، تم سب کو خدا ہی کے پاس جانا ہے، پھر وہ تم سب کو جتلا دیگا جس میں تم اختلاف کیا کرتے تھے"۔

یہ محض چند مثالیں ہیں، اور اگر صرف انہی پر غور کرلیا جائے تو یہ واضح ہوجاتا ہے کہ قرآن کریم کا اصل مقصد انسان کو آخرت کی تیاری پر آمادہ کرنا اور اللہ تعالیٰ کی مرضی کے مطابق زندگی گزارنے کی تعلیم وترغیب ہے، اور جتنی باتیں اس میں تاریخی واقعات یا کائنات وآفاق سے متعلق آئی ہیں وہ سب اسی بنیادی موضوع کی تائید وتقویت کے لئے آئی ہیں، لہٰذا اگر اس میں سائنس کا کوئی مشہور مسئلہ موجود نہ ہو نہ یہ کوئی عیب کی بات ہے نہ تعجب کی، کیونکہ یہ اس کا موضوع ہی نہیں ہے، اسی طرح اگر ماضی یا مستقبل کا کوئی واقعہ قرآن مجید میں نہ ملے، تو یہ بھی کوئی اعتراض کی بات نہیں ہے، کیونکہ وہ تاریخ کی کتاب نہیں، بلکہ اس میں جستہ جستہ واقعات عبرت اور موعظت کے لئے بیان کئے گئے ہیں۔ [علوم القرآن، ص ۳۸۶ تا ۳۹۲]

قرآن کریم میں سائنس اور ٹیکنالوجی کیوں نہیں ؟

اس سے بعض ان غیر مسلموں کا اعتراض بھی دور ہوجاتا ہے، جو یہ کہتے ہیں کہ مغربی ممالک نے جن علوم وفنون کے ذریعے مادی ترقی کی ہے ان کے بارے میں قرآن نے کچھ کیوں نہیں بتایا؟ اور ان لوگوں کی غلط فہمی بھی دور ہوجاتی ہے، جو ان اعتراجات سے متاثر ہوکر اس فکر میں رہتے ہیں کہ قرآن کریم سے سائنس وغیرہ کا کوئی نہ کوئی مسئلہ کسی نہ کسی طرح ثابت کیا جائے، کیونکہ اس کوشش کی مثال ایسی ہے جیسے کوئی شخص قانون کی کسی کتاب پر یہ اعتراض کرنے لگے کہ اس میں ایٹم بم بنانے کا طریقہ کیوں مذکور نہیں؟ تو اس کے جواب میں کوئی دوسرا شخص قانونی الفاظ کو توڑ موڑ کر اس سے ایٹم کی تھیوری نکالنے کی کوشش کرنے لگے، ظاہر ہے کہ یہ اس اعتراض کا جواب نہیں، بلکہ ایک مذاق ہوگا، اسی طرح جو شخص قرآن کریم میں سائنس اور انجینئرنگ کے مسائل نہ ہونے پر معترض ہو، اس کا صحیح جواب یہ نہیں ہے کہ قرآنی الفاظ کو توڑ موڑ کر اس سے سائنس کے مسائل زبردستی نکالے جائیں، بلکہ اس کا صحیح جواب یہ ہے کہ قرآن کریم نہ سائنس یا انجینئرنگ کی کتاب ہے اور نہ مادی ترقی حاصل کرنے کے طریقے اس کا موضوع ہیں، چونکہ یہ ساری باتیں انسان اپنی عقل وفکر اور تجربات ومشاہدات کے ذریعے معلوم کرسکتا تھا، اس لئے اللہ تعالیٰ نے ان کو انسان کی اپنی محنت اور کاوش اور تحقیق وجستجو پر چھوڑ دیا، اور ان باتوں کو قرآن کریم کا موضوع بنایا جو محض انسانی عقل سے معلوم نہیں ہوسکتیں، بلکہ ان کے ادراک کے لئے وحی الٰہی کی رہنمائی ناگزیر ہے، یہی وجہ ہے کہ انسان سائنس

اور ٹیکنالوجی کے میدان میں عقل وفکر اور تجربات ومشاہدات کے ذریعہ موجودہ مقام تک پہنچ گیا، لیکن ایمان ویقین کی دولت، قلب وروح کی پاکیزگی، اعمال واخلاق کی تطہیر، اللہ کے ساتھ بندگی کا تعلق اور اخروی زندگی سنوارنے کا جذبہ جو وحی الٰہی کے بغیر حاصل نہیں ہوسکتا تھا، اور جسے قرآن کریم نے اپنا موضوع بنایا ہے وہ عقل وفکر کی اس حیرت انگیز تگ وتاز کے بعد بھی انسان کو نہ حاصل ہوسکا ہے، اور نہ اس وقت تک حاصل ہوسکتا ہے جب تک اس معاملے میں سچے دل سے قرآن کی رہنمائی حاصل نہ کی جائے، ہماری اس گزارش کا منشأ یہ ہرگز نہیں ہے کہ قرآن کریم سے سائنس کا کوئی مسئلہ اخذ کرنا علی الاطلاق جرم ہے، ہمیں یہ تسلیم ہے کہ قرآن کریم میں ضمنی طور سے سائنس کے بہت سے حقائق کا بیان آیا ہے، چنانچہ جہاں اس کی کسی آیت سے کوئی واضح سائنٹیفک بات معلوم ہورہی ہو اسے بیان کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ لیکن اس معاملے میں مندرجہ ذیل غلطیوں سے پرہیز لازمی ہے:

① سائنس کی جو بات قرآن کریم میں مذکور ہے وہ ضمناً مذکور ہے اس کا اصل مقصد ان حقائق کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا استحضار اور اس کے ذریعے ایمان میں پختگی پیدا کرنا ہے، لہٰذا اس بنیاد پر قرآن کریم کو سائنس کی کتاب سمجھنا یا بار آور کرنا بالکل غلط ہے۔

② جہاں سائنس کے کسی مسئلہ کی مکمل وضاحت موجود نہ ہو، وہاں خوامخواہ الفاظ اور سیاق وسباق کو توڑ موڑ کر سائنس کی کسی دریافت پر چسپاں کرنے کی کوشش کسی طرح درست نہیں، یہ بات ایک مثال سے واضح ہوگی:

جس وقت سائنس کی دنیا میں یہ نظریہ مشہور ہوا کہ زمین اپنی جگہ ساکن ہے اور دوسرے سیارے اس کے گرد حرکت کرتے ہیں تو بعض لوگوں نے اس نظریہ کو قرآن کریم سے ثابت کرنے کی کوشش کی اور قرآن کریم کی اس آیت سے استدلال کیا گیا: ﴿امن جعل الارض قراراً﴾

''یا وہ ذات لائق عبادت ہے جس نے زمین کو جائے قرار بنایا''

ان لوگوں کا کہنا تھا کہ ''جائے قرار'' کا لفظ یہ بتا رہا ہے کہ زمین اپنی جگہ ساکن ہے حالانکہ قرآن کریم کا مقصد تو یہ بیان کرنا تھا کہ یہ اللہ تعالیٰ کا بڑا انعام ہے کہ تم زمین پر ڈانوا ڈول رہنے کے بجائے اطمینان کے ساتھ رہتے ہو اور اس میں لیٹنے، بیٹھنے اور قرار حاصل کرنے کے لئے تمہیں کوئی تکلیف برداشت کرنی نہیں پڑتی، اب ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اس انعام کا زمین کی حرکت وسکون سے کوئی تعلق نہیں بلکہ زمین متحرک ہو یا ساکن یہ نعمت ہر صورت میں انسان کو حاصل ہے، اس لئے اس آیت سے زمین کو ساکن ثابت کرنا ایک خواہ مخواہ کی زبردستی ہے،

پھر جب سائنس نے زمین کے ساکن ہونے کے بجائے متحرک ہونے کا نظریہ پیش کیا تو بعض حضرات کو یہ نظریہ بھی قرآن سے ثابت کرنے کی فکر لاحق ہوئی، اور مندرجہ ذیل آیت کو حرکت زمین کی

تائید میں پیش کردیا:﴿ وتری الجبال تحسبها جامدة وهی تمر مر السحاب ﴾

''اورتم پہاڑوں کو دیکھ کر یہ گمان کرتے ہو کہ یہ جامد ہیں، اور یہ بادل کی طرح چل رہے ہوں گے''۔

ان حضرات نے یہاں ''تمر'' کا ترجمہ ''چل رہے ہوں گے'' کے بجائے ''چل رہی ہے'' کر کے یہ دعویٰ کیا کہ اس آیت مین زمین کی حرکت کا بیان ہے، کیونکہ پہاڑوں کے چلنے کا مطلب یہ ہے کہ زمین چل رہی ہے حالانکہ آیت کا سیاق وسباق (Context) صاف بتارہا ہے کہ یہ قیامت کے حالات کا بیان ہے ،اورآیت کا مقصد یہ ہے کہ قیامت کے دن یہ سارے پہاڑ جنہیں تم اپنی جگہ اٹل سمجھتے ہو فضا میں بادلوں کی طرح اڑتے پھریں گے،لیکن قرآن کریم سے سائنس کے سائل مستنبط کرنے کے شوق نے سیاق وسباق پر غور کرنے کا موقع ہی نہیں دیا۔

واقعہ یہ ہے کہ زمین کی حرکت اور سکون کے بارے مین قرآن کریم خاموش ہے اور پورے قرآن میں کہیں اس مسئلہ کا بیان نہیں ہے،اس لئے کہ یہ بات اس کے موضوع سے خارج ہے،نہ قرآن سے زمین کی حرکت چابت ہوتی ہے نہ سکون،لہذا سائنس کے دلائل کے لحاظ سے اس میں سے جو نظریہ بھی اختیار کیا جائے قرآن اس میں مزاحم نہیں ہوتا،اور نہ اس سے دین وایمان کو کوئی خطرہ لاحق ہوتا ہے،یہاں یہ واضح کردینا مناسب ہوگا کہ قرآن سے سائنٹفک مسائل مستنبط کرنے کی کوششیں بسا اوقات بڑے خلوص کے ساتھ کی جاتی ہیں،اور اس کا مسأ غیر مسلموں کو یہ بتانا ہوتا ہے کہ دیکھو! جو بات تم نے صدیوں کی محنت کے بعد معلوم کی ہے، وہ ہمارے قرآن میں پہلے موجود ہے،لیکن درحقیقت اگر یہ استنباط اصول تفسیر کو توڑ کر کیا گیا ہے تو یہ قرآن کے ساتھ نادان دوستی کے سوا کچھ نہیں،جس وقت لوگ قرآن سے زمین کا ساکن ہونا ثابت کرنا چاہ رہے تھے،وہ بزعم خود اسے قرآن کی خدمت تصور کرتے تھے،لیکن اگر ان کی یہ کوشش کامیاب ہوجاتی اور عالم گیر طور پر یہ مان لیا جاتا کہ قرآن زمین کے ساکن ہونے کا قائل ہے تو آج جب کہ زمین کو ساکن سمجھنا سائنس کے نقطۂ نظر سے کلمہ کفر کے مرادف ہوگیا ہے،قرآن کے ساتھ یہ نادان دوستی کیا نتائج پیدا کرتی؟لہذا سائنس کے بارے میں جو باتیں قطعی طور سے قرآن کریم میں موجود ہیں،انہیں تو قرآن کی طرف منسوب کیا جاسکتا ہے ،لیکن جن باتوں کی قطعی وضاحت قرآن نے نہیں کی،ان کو خواہ مخواہ اس کی طرف منسوب کرنا کل بھی غلط تھا آج بھی غلط ہے۔ [علوم القرآن،ص ۳۹۲]

''قرآن و حدیث میں ایٹم بم بنانے کا فارمولا کیوں نہیں؟''

یہیں سے ایک اور سوال کا جواب بھی ہوگیا جو اکثر ہمارے پڑھے لکھے طبقے کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے،وہ یہ کہ صاحب آج سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور ہے،ساری دنیا سائنس اور ٹیکنالوجی میں ترقی کررہی ہے لیکن ہمارا قرآن اور ہماری حدیث سائنس اور ٹیکنالوجی کے بارے میں کوئی فارمولا ہمیں نہیں بتاتا کہ کس

طرح ایٹم بم بنائیں؟ کس طرح ہائیڈروجن بم بنائیں؟ اس کا کوئی فارمولا نہ تو قرآن کریم میں ملتا ہے اور نہ حدیث رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں ملتا ہے، اس کی وجہ سے بعض لوگ احساس کمتری کا شکار ہوتے ہیں کہ صاحب! دنیا چاند اور مریخ پر پہنچ رہی ہے اور ہمارا قرآن ہمیں اس بارے میں کچھ نہیں بتاتا کہ چاند پر کیسے پہنچیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ ہمارا قرآن ہمیں یہ باتیں اس لیے نہیں بتاتا کہ وہ دائرہ عقل کا ہے، وہ تجربہ کا دائرہ ہے، وہ ذاتی محنت اور کوشش کا دائرہ ہے، اللہ تعالی نے اس کو انسان کے ذاتی تجربے، عقل اور کوشش پر چھوڑا ہے کہ جو شخص جتنی کوشش کرے گا اور عقل کو استعمال کرے گا، تجربہ کو استعمال کرے گا، اس میں آگے بڑھتا چلا جائے گا، قرآن آیا ہی اس جگہ پر ہے جہاں عقل کا دائرہ ختم ہو رہا تھا، عقل اس کا پوری طرح ادراک نہیں کرسکتی، ان چیزوں کا ہمیں قرآن کریم نے سبق پڑھایا ہے، ان چیزوں کے بارے میں ہمیں معلومات فراہم کی ہیں، لہذا اسلامائیزیشن آف لاز کا سارا فلسفہ یہ ہے کہ ہم اپنی پوری زندگی کو اس کے تابع بنائیں۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱، ص ۳۸]

قرآن و حدیث نے چاند پر جانے اور خلا کو فتح کرنے کا فارمولا کیوں نہیں بتایا؟

اور یہیں سے ایک اور بات کا جواب مل جاتا ہے، جو آج کل بڑی کثرت سے لوگوں کے ذہنوں میں پیدا ہوتا ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ قرآن کریم نے چاند پر جانے کا کوئی طریقہ نہیں بتایا، خلا کو فتح کرنے کا کوئی فارمولا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں بتایا، یہ سب قومیں اس قسم کے فارمولے حاصل کر کے کہاں سے کہاں پہنچ گئیں اور ہم قرآن بغل میں رکھنے کے باوجود پیچھے رہ گئے، تو قرآن اور سنت نے ہمیں یہ فارمولے کیوں نہیں بتلائے؟

جواب اس کا یہی ہے کہ اس لیے نہیں بتایا کہ وہ چیز عقل کے دائرے کی تھی، اپنی عقل سے اور اپنے تجربے اور اپنی محنت سے جتنا آگے بڑھو گے، اس کے اندر تمہیں انکشافات ہوتے چلے جائیں گے، وہ تمہارے عقل کے دائرے کی چیز، عقل اس کا ادراک کرسکتی تھی، اس واسطے اس کے لیے نبی بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی، اس لیے رسول بھیجنے کی ضرورت نہیں تھی، اس کے لیے کتاب نازل کرنے کی ضرورت نہیں تھی، لیکن کتاب اور رسول کی ضرورت وہاں تھی جہاں تمہاری عقل عاجز تھی، جیسے کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل والے آدمی کی عقل عاجز تھی کہ بنیادی حقوق اور آزادی تحریر وتقریر کے اوپر کیا پابندیاں ہونی چاہئیں، کیا نہیں ہونی چاہئیں، اس معاملے میں انسان کی عقل عاجز تھی، اس کے لیے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے۔

احادیث ہم تک کیسے پہنچیں ؟
اور سند حدیث کی خصوصیت و اہمیت

ہمارے مدارس دینیہ میں عام طور پر جو طریقہ رائج ہے، وہ یہ ہے کہ درس کے شروع میں حدیث کی عبارت پڑھنے سے پہلے طالب علم یہ پڑھتا ہے: ”بالسند المتصل منا إلى الإمام البخاري رحمه الله تعالى ، قال حدّثنا الخ“

اور بعد میں اختصار کے طور پر ”به قال حدّثنا“ کہنے پر اکتفا کرتا ہے، لیکن اس وقت چونکہ آخری حدیث پڑھی جارہی تھی تو طالب علم نے مناسب سمجھا کہ صرف اجمالی حوالہ کے بجائے ہم سے لے کر جناب رسول اللہ ﷺ تک جتنے واسطے ہیں، ان سب کا ذکر کر کے ان کے واسطے سے حدیث پڑھی جائے۔

بظاہر تو یہ معمولی بات نظر آتی ہے، لیکن اس کے پیچھے عظیم فلسفہ اور عظیم حکمت ہے جو ہمارے اور آپ کے لیے بہت بڑا سبق رکھتی ہے، پہلی بات یہ ہے کہ ابھی طالب علم نے جو سند پڑھی، اس سلسلہ سند میں میرے استاذ سے لے کر جناب نبی کریم ﷺ تک جتنے حضرات علما کرام گذرے ہیں جن کے ذریعہ یہ علم حدیث ہم تک پہنچا، ان سب کا نام لیا، یہاں تک کہ یہ سلسلہ جناب رسول اللہ ﷺ تک پہنچا، یہ چیز صرف اس امت محمدیہ علی صاحبہا والصلاۃ والسلام کو حاصل ہے جو اس روئے زمین پر کسی دوسرے مذہب اور ملت والے کو حاصل نہیں، کوئی بھی مذہب اور ملت والا یہ دعوی نہیں کر سکتا کہ اس کے مقتدی یا اس کے پیغمبر اور نبی کی باتیں ان تک اس طرح پہنچی ہیں کہ ان کے بارے میں خم ٹھونک کر اعتماد کے ساتھ یہ کہا جا سکے کہ یہ باتیں یقیناً ہمارے نبی نے کہی ہیں، یہ اعتماد نہ کسی یہودی کو حاصل ہے کہ وہ اپنی تورات کے بارے میں کہہ دے، نہ کسی نصرانی کو حاصل ہے کہ وہ اپنی انجیل کے بارے میں یہ بات کہہ دے، جب آسمانی کتابوں کا دعوی کرنے والے اپنی آسمانی کتابوں کے بارے میں یہ بات نہیں کہہ سکتے تو اپنے پیغمبر کی باتوں اور ان کی سنتوں کے بارے میں یہ بات کس طرح کہہ سکتے ہیں۔

آج اگر یہودی مذہب کے کسی بڑے سے بڑے عالم سے پوچھ لیا جائے کہ یہ تورات جس کو تم خدا کی کتاب اور آسمانی کتاب کہتے ہو، اس کا تمہارے پاس کیا ثبوت ہے؟ تمہارے پاس اس بات کی کیا دلیل ہے کہ یہ تورات وہ ہے جو اللہ تعالی نے حضرت موسی علیہ السلام پر نازل فرمائی تھی؟ اگر یہ سوال کیا جائے تو بغلیں جھانکنے کے علاوہ ان کے پاس کوئی راستہ نہیں ہوگا، یہی حال انجیلوں کا ہے، اور آج کل دنیا میں جو انجیلیں موجود ہیں یہ وہ نہیں ہیں جو حضرت عیسی علیہ السلام پر نازل ہوئی تھیں، بلکہ آپ کے حالات زندگی لوگوں نے جمع کیے اور ان کے بارے میں ان کا یہ دعوی ہے کہ یہ الہام کے ذریعے جمع کیے ہیں، لیکن موجودہ لوگوں کے پاس کیا ثبوت ہے کہ یہ کتابیں انہی لوگوں کی لکھی ہوئی ہیں؟ ان کے پاس کوئی ثبوت کوئی سند اور کوئی دلیل موجود نہیں۔

لیکن اس امت محمدیہ کو اللہ تعالی نے یہ اعزاز عطا فرمایا کہ آج جب ہم کسی حدیث کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بات ارشاد فرمائی، تو اطمینان قلب کے ساتھ یہ کہہ سکتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف اس کی نسبت درست ہے، اور آج اگر کوئی ہم سے پوچھے کہ یہ کیسے پتہ چلا کہ یہ بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمائی تھی تو ہم اس کے جواب میں وہ پوری سند پیش کر دیں گے جو ابھی طالب علم نے آپ کے سامنے پڑھی، اور پھر صرف اتنی بات نہیں کہ ہم سے لے کر جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک کے صرف نام محفوظ ہیں بلکہ آپ ان ناموں میں سے کسی نام پر انگلی رکھ کر پوچھ لیں کہ یہ آدمی کون تھا؟ یہ کس زمانہ میں پیدا ہوا تھا؟ کن اساتذہ سے اس نے تعلیم حاصل کی تھی؟ کیسا حافظہ اس کو اللہ تعالی نے عطا فرمایا تھا؟ اس کی ذہانت کی کیفیت کیا تھی؟ دیانت اور امانت کی کیفیت کیا تھی؟ اس کا سارا کچا چٹھا اور ایک ایک راوی کا سارا ریکارڈ کتابوں کے اندر محفوظ ہے۔

یہ صحیح بخاری آپ کے سامنے موجود ہے، اس کے کل ۱۱۲۸ صفحات ہیں، اس کے ہر صفحے پر کم از کم دس بارہ حدیثیں موجود ہیں، اور ہر حدیث کے شروع میں مختلف راویوں کے نام ہوتے ہیں، آپ ان میں سے کسی راوی کا انتخاب کریں اور پھر کسی عالم سے آپ پوچھ لیں کہ اس راوی کے حالات زندگی کیا ہیں؟ کتابوں کے اندر اس راوی کی ولادت سے لے کر وفات تک کے متعلقہ حالات سب مدون اور محفوظ ہیں، اس کے حالات زندگی کیوں محفوظ کیا گئے؟ اس لیے کہ اس نے جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث روایت کی تھی، لہذا اس کے بارے میں یہ معلوم کرنا ضروری ہے کہ اس کی روایت حدیث پر اعتماد کیا جائے یا نہ کیا جائے؟

پھر راویوں کے یہ حالات زندگی بھی صرف سنی سنائی باتوں کی بنیاد پر نہیں لکھے گئے، بلکہ ایک ایک راوی کے حالات کی جانچ پڑتال کے لیے اللہ جل شانہ نے ایسے عظیم علما جرح وتعدیل پیدا فرمائے جو ایک ایک راوی کی دکھتی ہوئی رگوں سے واقف تھے، حضرت مولانا انور شاہ کشمیری رحمہ اللہ کا یہ مقولہ میں نے اپنے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی زبان سے سنا فرمایا کرتے تھے کہ حافظ شمس الدین ذہبی رحمہ اللہ کو حدیث کے رجال کی پہچان کے سلسلے میں اللہ تعالی نے ایسا ملکہ عطا فرمایا تھا کہ اگر تمام راویان حدیث کو ایک میدان میں کھڑا کر دیا جائے اور پھر حافظ شمس الدین ذہبیؒ کو ایک ٹیلے پر کھڑا کر دیا جائے تو وہ ایک ایک راوی کی طرف انگلی اٹھا کر یہ بتا سکتے ہیں کہ یہ کون ہے اور حدیث میں اس کا کیا مقام ہے، ان ائمہ جرح وتعدیل کو اللہ تعالی نے ایسا اونچا مقام عطا فرمایا تھا، آج کے دور میں کہنے والے بہت آرام سے کہہ دیتے ہیں کہ ہمیں بھی اجتہاد کا حق ملنا چاہیے، کیونکہ ہم بھی قرآن وحدیث کے علم میں وہی مقام رکھتے ہیں جو پچھلے لوگوں کو عطا ہوا تھا، اور یہ لوگ "ھم رجال ونحن رجال" کا دعوی کرتے ہیں، لیکن بات دراصل یہ ہے کہ:

نہ ہر کہ سر بتراشد قلندری داند

ان حضرات علما کو اللہ تعالیٰ نے جو حافظہ، جو علم، جو تقویٰ، جو جدو جہد اور قربانی کا جذبہ عطا فرمایا تھا، اس کی کوئی اور توجیہ اس کے علاوہ نہیں ہو سکتی کہ اللہ تعالیٰ نے اسی خاص مقصد کے لیے ان کو پیدا فرمایا تھا کہ وہ اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ارشادات کی حفاظت فرمائیں۔

علامہ خطیب بغدادیؒ نے اپنی کتاب ''الکفایۃ'' میں جو اصول حدیث کی مشہور کتاب ہے، ایک محدث جو جرح وتعدیل کے امام تھے، ان کا یہ قول نقل کیا ہے کہ جب ہم کسی راوی حدیث کے حالات کی تحقیق کے لیے اس کے گاؤں اور اس کے محلے میں جایا کرتے تھے (جانا بھی اس طرح ہوتا تھا کہ جب یہ پتہ چلتا کہ فلاں شخص جو فلاں شہر میں رہتا ہے، وہ حدیث روایت کرتا ہے، اور وہ شہر سینکڑوں میل دور ہوتا تھا اور ہوائی جہاز کا زمانہ نہیں تھا کہ ہوائی جہاز میں ایک دو گھنٹے کے اندر دوسرے شہر پہنچ گئے، بلکہ اس زمانے میں اونٹوں پر ،گھوڑوں پر اور پیدل سفر ہوتے تھے، یہ سفر صرف اس بات کی تحقیق کے لیے کرتے کہ یہ معلوم کریں کہ جس راوی نے یہ حدیث روایت کی ہے وہ کس مقام کا ہے) تو اس کے وطن میں جا کر اس کے حالات کی چھان بین کرتے ،اب اس کے پڑوسیوں سے، اس کے ملنے جلنے والے دوستوں سے اور اس کے اعزہ سے پوچھ رہے ہیں کہ یہ آدمی کیسا ہے؟ یہ شخص معاملات میں کیسا ہے؟ اخلاق میں کیسا ہے؟ نماز روزے میں کیسا ہے؟ یہاں تک کہ جب ہم بہت زیادہ کھود کرید کرتے تھے تو بعض مرتبہ لوگ ہم سے یہ پوچھتے کہ کیا تم اپنی لڑکی کا رشتہ یہاں کرنا چاہتے ہو؟ اس وجہ سے تم ان کے حالات کی اتنی چھان بین کر رہے ہو؟ جواب میں ہم کہتے کہ بھائی کوئی رشتہ تو نہیں کرنا چاہتے ،لیکن انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ایک حدیث روایت کی ہے، لہٰذا ہمیں یہ تحقیق منظور ہے کہ آیا ان کی روایت کردہ حدیث کو معتبر مانیں یا نہ مانیں؟

اس طرح ایک ایک راوی کے حالات کی تحقیق کر کے یہ حضرات علما جرح وتعدیل فن ''اسماء الرجال'' کی کتابیں مدون کر گئے ہیں ہمارے جامعہ دارالعلوم کراچی کے کتب خانہ میں اسماء الرجال کا ایک پورا سیکشن علیحدہ ہے، جس میں ایک ایک کتاب تیس تیس جلدوں میں موجود ہے، جس میں حروف تہجی کی ترتیب سے روایان حدیث کے حالات درج ہیں، آپ بخاری شریف بلکہ صحاح ستہ اور حدیث کی کوئی بھی کتاب لیجیے اور اس کتاب کی کوئی بھی حدیث لیجیے اور اس حدیث کی سند میں سے کسی ایک راوی کا انتخاب کر لیجیے، اور پھر اسماء الرجال کتاب میں حروف تہجی کی ترتیب سے اس راوی کے حالات دیکھ لیجیے، یہ فن اسماء الرجال کی تدوین صرف اس امت محمدیہ کا اعزاز ہے، جب تک حدیث کی یہ کتابیں صحاح ستہ وغیرہ وجود میں نہیں آئی تھیں، اس وقت تک قاعدہ یہ تھا کہ جب کوئی شخص کوئی حدیث سناتا تو اس پر یہ لازم اور ضروری تھا کہ وہ تنہا حدیث نہ سنائے، بلکہ اس حدیث کی پوری سند بھی بیان کرے کہ یہ حدیث مجھے فلاں نے سنائی، اور فلاں کو فلاں نے سنائی، اور فلاں کو فلاں نے سنائی، پہلے پوری سند بیان کرتا، پھر حدیث سناتا، تب اس کی بیان کردہ حدیث قابل قبول ہوتی تھی ،اور سند کے بغیر کوئی شخص حدیث سناتا تو کوئی اس کی بات سننے کو بھی تیار نہیں ہوتا تھا۔

اللہ تعالی ان حضرات محدثین کے درجات بلند فرمائے، انہوں نے تمام حدیثیں ان کتابوں کی شکل میں جمع فرمادیں، لہذا اب ان کتابوں کے تواتر کے درجے تک پہنچ جانے کے بعد سند کی اتنی زیادہ تحقیق کی اور اس کو محفوظ کرنے کی ضرورت نہ رہی، کیونکہ اب تواتر سے یہ بات ثابت ہے کہ یہ کتاب امام بخاری رحمہ اللہ کی روایت کردہ ہے، لہذا اب ہر حدیث کے ساتھ پوری سند کا بیان کرنا ضروری نہیں، بلکہ اب حدیث بیان کرنے کے بعد "رواہ البخاری" کہہ دینا کافی ہوجاتا ہے، لیکن اس کے باوجود ہمارے بزرگوں نے یہ طریقہ باقی رکھا کہ اگرچہ ہر حدیث کے بیان کرتے وقت پوری لمبی سند بیان نہ کی جائے، لیکن روایت اور اجازت کے طور پر اس پوری سند کو محفوظ ضرور رکھا جائے، کیونکہ اگر ہر حدیث سے پہلے یہ طویل سند بیان کی جائے گی تو لوگوں کے لیے دشواری ہوجائے گی، لہذا اب اتنا کہہ دینا کافی ہے کہ اس حدیث کو امام بخاریؒ نے روایت کیا ہے، اور ہم سے لے کر امام بخاریؒ تک پوری سند ہمارے پاس محفوظ ہے جو آج عزیز طالب علم نے ہمارے سامنے پڑھی۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۱۴۲]

حدیث بیان کرنے میں احتیاط کیوں ضروری ہے؟

ایک تابعی ایک صحابی کے بارے میں بیان فرماتے ہیں کہ جب وہ صحابی ہمارے سامنے حضور اقدس ﷺ کی کوئی حدیث بیان فرماتے تو اس وقت ان کا چہرہ پیلا پڑ جاتا تھا، اور بعض اوقات ان پر کپکپی طاری ہوجاتی تھی، کہ کہیں کوئی بات بیان کرنے میں غلطی نہ ہوجائے، حتی کہ بعض صحابہ حدیث نقل کرنے کے بعد فرمایا کرتے کہ حضور اقدس ﷺ نے اس طرح کی، یا اس جیسی، یا اس قسم کی بات بیان فرمائی تھی، ہوسکتا ہے کہ میرے سے بیان کرنے میں کچھ الٹ پھیر ہوگیا ہو، یہ سب اس لیے کرتے تاکہ حضور اقدس ﷺ کی طرف کوئی بات غلط منسوب کرنے کا گناہ نہ ہو، اس سے ہمیں اور آپ کو یہ سبق ملتا ہے کہ ہم لوگ بسا اوقات تحقیق اور احتیاط کے بغیر احادیث بیان کرنی شروع کردیتے ہیں، ذرا سی کوئی بات کہیں سنی، فوراً ہم نے کہہ دیا کہ حدیث میں یوں آیا ہے، حالانکہ یہ دیکھیے کہ صحابہ کرام جنہوں نے براہ راست حضور اقدس ﷺ سے باتیں سنیں، وہ کتنی احتیاط کررہے ہیں، لیکن ہم اس میں احتیاط نہیں کرتے، اس لیے احادیث بیان کرنے میں ہمیشہ بہت احتیاط سے کام لینا چاہیے، جب تک ٹھیک ٹھیک الفاظ معلوم نہ ہوں، اس وقت تک اس کو حدیث کے طور پر بیان نہیں کرنا چاہیے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۶، ص ۶۷]

دین اسلام

دین اسلام کیا ھے ؟ کیا اسلام صرف عبادات کا نام ھے ؟

مشہور ہے کہ چند نابینا افراد کو زندگی میں پہلی بار ایک ہاتھی سے سابقہ پیش آیا، آنکھوں کی بینائی سے تو وہ سب محروم تھے، اس لئے ہر شخص نے ہاتھوں سے ٹٹول کر اس کا سراپا معلوم کرنا چاہا، چنانچہ کسی کا ہاتھ اس کی سونڈ پر پڑ گیا، کسی کا اس کے ہاتھ پر، کسی کا اس کے کان پر، جب لوگوں نے ان سے پوچھا کہ ہاتھی کیسا ہوتا ہے؟ تو پہلے شخص نے کہا کہ وہ مڑی ہوئی ربر کی طرح ہوتا ہے، دوسرے نے کہا نہیں، وہ لمبا لمبا ہوتا ہے، تیسرے نے کہا نہیں وہ تو ایک بڑے سے پتے کی طرح ہوتا ہے۔ غرض جس شخص نے ہاتھی کے جس حصے کو چھوا تھا، اسی کو مکمل ہاتھی سمجھ کر اس کی کیفیت بیان کردی، اور پورے ہاتھی کی حقیقت کسی کے ہاتھ نہ آئی۔

کچھ عرصے سے ہم اسلام کے ساتھ ایسا ہی سلوک کر رہے ہیں، جیسا ان نابیناؤں نے ہاتھی کے ساتھ کیا تھا، اسلام ایک مکمل دین ہے جس کی ہدایات وتعلیمات کو چھ بڑے شعبوں میں تقسیم کیا جاسکتا ہے، عقائد، عبادات، معاملات، معاشرت، سیاست اور اخلاق۔ ان چھ شعبوں میں سے ہر ایک کے متعلق تعلیمات دین کا لازمی حصہ ہیں، جسے نہ دین سے الگ کیا جاسکتا ہے، اور نہ صرف اسی کو مکمل دین کہا جاسکتا ہے، لیکن کچھ لوگوں نے دین کو صرف عقائد وعبادات کی حد تک محدود کر کے باقی شعبوں کو نظر انداز کر دیا، کسی نے معاملات سے متعلق اس کے احکامات کو دیکھ کر اسلام تو در حقیقت ایک فلاحی معیشت کا نظام ہے، کسی نے اس کی سیاسی تعلیمات کا مطالعہ کیا تو اس نے یہ سمجھ لیا کہ دین کا اصل مقصد سیاست ہے اور باقی سارے شعبے اس کے تابع ہیں، یا محض ثانوی حیثیت رکھتے ہیں۔

لیکن اس سلسلہ میں سب سے زیادہ پھیلی ہوئی غلط فہمی یہ ہے کہ دین صرف عقائد وعبادات کا نام ہے، اور زندگی کے دوسرے مسائل سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اس غلط فہمی کو ہوا دینے میں تین چیزوں نے بہت بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ہے، ایک تو عالم اسلام پر غیر مسلم طاقتوں کا سیاسی تسلط تھا، جس نے دین کا عمل دخل دفتروں، بازاروں اور معاشرے کے اجتماعی معاملات سے نکال کر اسے صرف مسجدوں، اور بعض جگہ دینی مدرسوں تک محدود کر دیا، اور جب زندگی کے دوسرے شعبوں میں اسلامی تعلیمات کا چلن نہ رہا تو رفتہ رفتہ یہ ذہن بنتا چلا گیا

کہ دین صرف نماز روزے کا نام ہے۔

دوسرا سبب وہ سیکولر ذہنیت ہے جس نے سامراج کے زیر اثر تعلیمی اداروں نے پروان چڑھایا، اس ذہنیت کے نزدیک دین ومذہب صرف انسان کی انفرادی زندگی کا ایک پرائیوٹ معاملہ ہے، اور اسے معیشت وسیاست اور معاشرت تک وسعت دینے کا مطلب گھڑی کی سوئی کو پیچھے لے جانے کے مرادف ہے۔

تیسرا سبب خود اپنے اپنے طرز عمل سے پیدا کیا، اور وہ یہ کہ دین سے وابستہ بہت سے افراد نے جتنی اہمیت عقائد وعبادات کو دی، اس کے مقابلے میں معاملات ومعاشرت اور اخلاق کو دسواں حصہ بھی اہمیت نہیں دی۔

بہرحال! ان تینوں اسباب کے مجموعے سے نتیجہ یہ نکلا کہ معاملات، معاشرت اور اخلاق سے متعلق اسلام کی تعلیمات بہت پیچھے چلی گئیں، اور ان سے ناواقفیت اتنی زیادہ ہوگئی کہ گویا وہ دین کا حصہ ہی نہیں رہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ عقائد وعبادات دین کا جزو اعظم ہیں، ان کی اہمیت کو کسی بھی طرح کم کرنا دین کا حلیہ بگاڑنے کے مرادف ہے، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے دین کی بنیاد جن پانچ چیزوں پر قرار دی ہے، ان میں سے ایک کا تعلق عقائد سے اور چار چیزوں کا تعلق عبادات سے ہے، اور جو لوگ عقائد وعبادات سے صرف نظر کرکے صرف اخلاق، معاشرت اور معاملات ہی کو سارا دین سمجھتے ہیں وہ دین کو محض ایک مادہ پرستانہ نظام میں تبدیل کرکے اس کا وہ سارا حسن چھین لیتے ہیں، جو دوسرے مادہ پرستانہ نظاموں کے مقابلے میں اس کا اصل طرہ امتیاز ہے، اور جس کے بغیر اخلاق، معاشرت اور معاملات بھی ایک بے روح جسم اور ایک بے بنیاد عمارت کی حیثیت اختیا کر جاتے ہیں۔

لیکن یہ بھی اپنی جگہ ناقابل انکار حقیقت ہے کہ دین کی تعلیمات عقائد وعبادات کی حد تک محدود نہیں ہیں، اور ایک مسلمان کی ذمہ داری صرف نماز روزہ ادا کرکے پوری نہیں ہوجاتی، خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ ''ایمان کے ستر سے زائد شعبے ہیں، جن میں اعلیٰ ترین شعبہ توحید کی شہادت ہے اور ادنیٰ ترین شعبہ راستہ سے گندگی دور کرنا ہے''۔ بلکہ معاملات، معاشرت اور اخلاق کا معاملہ اس لحاظ سے زیادہ سنگین ہے کہ ان کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اور یہ اصول مسلم ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے حقوق توبہ سے معاف کر دیتا ہے، لیکن حقوق العباد صرف توبہ واستغفار سے معاف نہیں ہوتے، ان کی معافی کی دو ہی صورتیں ہیں، یا تو حق دار کو اس کا حق پہنچایا جائے، یا وہ خوش دلی سے معافی دیدے، لہٰذا دین کے یہ شعبے خصوصی اہتمام کے متقاضی ہیں۔

پھر معاملات، معاشرت اور اخلاق کے ان تین شعبوں میں بھی سب سے زیادہ لاپرواہی معاشرت کے شعبے میں برتی جارہی ہے، معاشرتی برائیوں کا ایک سیلاب ہے جس نے ہمیں لپیٹ میں لیا ہوا ہے، اور اچھے خاصے، پڑھے لکھے تعلیم یافتہ بلکہ ایسے دین دار حضرات بھی جو دین سے اپنی وابستگی کے لئے مشہور سمجھے جاتے ہیں اس پہلو سے اتنے بے خبر ہیں کہ ان معاشرتی خرابیوں کو گناہ ہی نہیں سمجھتے۔ [ذکر وفکر، ص ۱۸]

کیا اسلامی احکام کے مطابق زندگی گذارنے کے لیے دنیا کو چھوڑنا پڑے گا؟

ایک جگہ دنیا کو خیر اور فضل بتایا گیا اور دوسرے مقام پر دنیا کو مردار کہا گیا ان دونوں باتوں میں تطبیق کس طرح ممکن ہے؟

آج ایک بہت بڑی غلط فہمی اچھے خاصے پڑھے لکھے لوگوں میں بھی کثرت کے ساتھ پائی جاتی ہے اور اس غلط فہمی کا مداوا اور اس کا ازالہ قرآن کریم کی اس آیت میں کیا گیا ہے، غلط فہمی یہ ہے کہ اگر کوئی شخص آج کی اس دنیا میں دین کے مطابق زندگی گذارنا چاہے، اور اسلام کے احکام پر عمل کرتے ہوئے اپنی زندگی بسر کرنا چاہے تو اسے دنیا چھوڑنی ہوگی، دنیا کا عیش وآرام، دنیا کی آسائش چھوڑنی ہوگی، اور دنیا کے مال واسباب کو ترک کیے بغیر اور اس سے قطع نظر کیے بغیر اس دنیا میں اسلام کے مطابق اور دین کے مطابق زندگی نہیں گذاری جاسکتی، اور اس غلط فہمی کا منشاء درحقیقت یہ ہے کہ ہمیں یہ بات معلوم نہیں ہے کہ اسلام نے دنیا کے بارے میں کیا تصور پیش کیا ہے؟ یہ دنیا کیا چیز ہے؟ دنیا کے مال واسباب اور اس کے عیش وآرام کی حقیقت کیا ہے؟ کس حد تک اسے اختیار کیا جاسکتا ہے؟ اور کس حد تک اس سے اجتناب ضروری ہے؟ یہ بات ذہنوں میں پوری طرح واضح نہیں ہے۔

ذہنوں میں تھوڑی سی الجھن اس لیے بھی پیدا ہوتی ہے کہ یہ جملے کثرت سے کانوں میں پڑتے رہتے ہیں کہ قرآن وحدیث میں دنیا کی مذمت کی گئی ہے، ایک روایت میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"الدنیا جیفة وطالبوھا کلاب"

کہ دنیا ایک مردار جانور کی طرح ہے اور اس کے پیچھے لگنے والے کتوں کی طرح ہیں، اس حدیث کو اگرچہ بعض نے لفظاً موضوع کہا ہے، لیکن ایک مقولے کے اعتبار سے اس کو صحیح تسلیم کیا گیا ہے، تو دنیا کو مردار قرار دیا گیا اور اس کے طلب گار کو کتے قرار دیا گیا، اسی طرح قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿وما الحیوة الدنیا إلا متاع الغرور﴾

یہ دنیا کی زندگی دھوکے کا سامان ہے۔

قرآن کریم میں ایک اور جگہ فرمایا: ﴿إنما أموالکم وأولادکم فتنة﴾

تمہارا مال اور تمہاری اولاد تمہارے لیے ایک فتنہ ہے، ایک آزمائش ہے۔

ایک طرف تو قرآن وحدیث کے یہ ارشادات ہمارے سامنے آتے ہیں، جس میں دنیا کی برائی بیان کی گئی ہے، اس یک طرفہ صورت حال کو دیکھ کر بعض اوقات دل میں یہ خیال پیدا ہوتا ہے کہ اگر مسلمان بننا ہے تو دنیا کو بالکل چھوڑنا ہوگا۔

لیکن دوسری طرف آپ نے یہ بھی سنا ہوگا کہ اللہ تعالی نے قرآن کریم میں مال کو بعض جگہ ''فضل اللہ'' قرار دیا، تجارت کے بارے میں فرمایا گیا کہ ''وابتغوا من فضل اللہ'' کہ تجارت کے ذریعے اللہ کے فضل کو تلاش کرنا ہے، چنانچہ سورہ جمعہ میں جہاں جمعہ کی نماز پڑھنے کا حکم دیا گیا ہے، اسی کے بعد آگے ارشاد فرمایا:

﴿فإذا قضيت الصلوة فانتشروا في الارض وابتغوا من فضل الله﴾

کہ جب جمعہ کی نماز ختم ہو جائے تو زمین میں پھیل جاؤ، اور اللہ کے فضل کو تلاش کرو، تو مال اور تجارت کو اللہ کا فضل قرار دیا، اسی طرح بعض جگہ قرآن کریم نے مال کو ''خیر'' یعنی بھلائی قرار دیا، اور یہ دعا تو ہم اور آپ سب پڑھتے رہتے ہیں کہ:

﴿ربنا أتنا في الدنيا حسنة وفي الآخرة حسنة وقنا عذاب النار﴾

اے اللہ! ہمیں دنیا میں بھی اچھائی عطا فرما اور آخرت میں بھی اچھائی عطا فرما۔

تو بعض اوقات ذہن میں یہ الجھن پیدا ہوتی ہے کہ ایک طرف تو اتنی برائی کی جارہی ہے کہ اس کو مردار کہا جارہا ہے، اس کے طلب گاروں کو کتا کہا جارہا ہے، اور دوسری طرف اس کو اللہ کا فضل قرار دیا جارہا ہے، خیر کہا جارہا ہے، اس کی اچھائی بیان کی جارہی ہے، تو ان میں سے کونسی بات صحیح ہے؟

واقعہ یوں ہے کہ قرآن وحدیث کو صحیح طریقے سے پڑھنے کے بعد جو صورت حال واضح ہوتی ہے، وہ یہ ہے کہ اللہ تبارک وتعالی اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہم سے یہ نہیں چاہتے کہ ہم دنیا کو چھوڑ کر بیٹھ جائیں، عیسائی مذہب میں تو اس وقت تک اللہ کا قرب حاصل نہیں ہوسکتا تھا جب تک انسان بیوی بچوں اور گھر بار اور کاروبار کو چھوڑ کر نہ بیٹھ جائے، لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے جو تعلیمات ہمیں عطا فرمائیں، اس میں یہ کہیں نہیں کہا کہ تم دنیا کو چھوڑ دو، کمائی نہ کرو، تجارت نہ کرو، مال حاصل نہ کرو، مکان نہ بناؤ، بیوی بچوں کے ساتھ ہنسو بولو نہیں، کھانا نہ کھاؤ، اس قسم کا کوئی حکم شریعت محمدیہ میں موجود نہیں، ہاں! یہ ضرور کہا ہے کہ یہ دنیا تمہاری آخری منزل نہیں، یہ تمہاری زندگی کا آخری مقصد نہیں، یہ سمجھنا ہی غلط ہے کہ ہماری جو کچھ کاروائی ہے وہ صرف اسی دنیا سے متعلق ہے، اس سے آگے ہمیں کچھ نہیں سوچنا ہے اور نہ کچھ کرنا ہے، بلکہ یہ کہا گیا ہے کہ یہ دنیا درحقیقت اس لیے ہے کہ تاکہ تم اس میں رہ کر اپنی آنے والی ابدی زندگی یعنی آخرت کی زندگی کے لیے کچھ تیاری کرلو، اور آخرت کو فراموش کیے بغیر اس دنیا کو اس طرح استعمال کرو کہ اس میں تمہاری دنیاوی ضروریات بھی پوری ہوں، اور ساتھ ساتھ آخرت کی جو زندگی آنے والی ہے اس کی بھلائی بھی تمہارے پیش نظر ہو۔

یہ تو ایک کھلی ہوئی حقیقت ہے کہ جس سے کوئی بد سے بدتر کافر بھی انکار نہیں کرسکتا کہ ہر انسان کو ایک دن مرنا ہے، موت آنی ہے، یہ وہ حقیقت ہے جس میں آج تک کوئی شخص انکار نہیں کرسکا، یہاں تک کہ لوگوں نے خدا کا انکار کردیا، لیکن موت کا منکر آج تک کوئی پیدا نہیں ہوا، کسی نے یہ نہیں کہا کہ مجھے موت نہیں آئے گی، میں ہمیشہ زندہ رہوں گا، اور اس میں کوئی اختلاف نہیں کہ کسی کو نہیں معلوم کہ کس کی موت کب آئے گی؟ بڑے

سے بڑا سائنس دان، بڑے سے بڑا ڈاکٹر، بڑے سے بڑا سرمایہ دار، بڑے سے بڑا فلسفی، وہ یہ نہیں بتا سکتا کہ میری موت کب آئے گی؟

اور تیسری بات یہ کہ مرنے کے بعد کیا ہونا ہے؟ آج تک کوئی سائنس، فلسفہ کوئی ایسا علم ایجاد نہیں ہوا جو انسان کو براہ راست یہ بتا سکے کہ مرنے کے بعد کیا حالات پیش آتے ہیں، آج مغرب کی دنیا یہ تو تسلیم کر رہی ہے کہ کچھ ایسے اندازے معلوم ہوتے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی کوئی زندگی ہے، اس نتیجے تک وہ پہنچ رہے ہیں، لیکن اس کے حالات کیا ہیں؟ اس میں انسان کا کیا حشر بنے گا؟ اس کی تفصیلات دنیا کوئی سائنس نہیں بتا سکی، جب یہ بات طے ہے کہ مرنا ہے، ہوسکتا ہے کہ کل ہی مر جائیں، اور یہ بھی طے ہے کہ مرنے کے بعد آنے والی زندگی کے حالات کا براہ راست مجھے علم نہیں، ہاں! ایک کلمہ ''لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ'' پر ایمان لایا ہوں، اور محمد رسول اللہ کے معنی یہ ہیں کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم وحی کے ذریعے جو بھی خبر لے کر آئے ہیں، وہ سچی بات ہے، اس میں جھوٹ کا کوئی امکان نہیں، اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہاری اصل زندگی وہ ہے جو مرنے کے بعد شروع ہونے والی ہے، اور یہ موجودہ زندگی ایک حد پر جا کر ختم ہوجائے گی، اور وہ زندگی کبھی ختم ہونے والی نہیں، بلکہ ابدی ہے، لامتناہی ہے، ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہے۔

تو اسلام کا پیغام یہ ہے کہ دنیا میں ضرور رہو، اور دنیا کی چیزوں سے ضرور فائدہ اٹھاؤ، دنیا سے لطف اندوز بھی ہو، لیکن ساتھ ساتھ اس دنیا کو آخری مشن اور آخری منزل نہ سمجھو، درحقیقت ایک مسلمان کے لیے یہ پیغام ہے کہ دنیا میں رہو، دنیا کو برتو، دنیا کو استعمال کرو، لیکن فرق صرف زاویہ نگاہ کا ہے، اگر تم دنیا کو اس لیے استعمال کر رہے ہو کہ یہ آخرت کی منزل کے لیے ایک سیڑھی ہے، تو یہ دنیا تمہارے لیے خیر ہے، اور یہ اللہ کا فضل ہے جس پر اللہ کا شکر ادا کرو، اور اگر دنیا کو اس نیت سے استعمال کر رہے ہو کہ یہی تمہاری آخری منزل ہے، اور بس اسی کی بھلائی بھلائی ہے، اور اس کی اچھائی اچھائی ہے، اور اس سے آگے کوئی چیز نہیں، تو پھر یہ دنیا تمہارے لیے ہلاکت کا سامان ہے۔

یہ دونوں باتیں اپنی جگہ صحیح ہیں کہ یہ دنیا مردار ہے، جب کہ اس کی محبت اور اس کا خیال دل و دماغ پر اس طرح چھا جائے کہ صبح سے لے کر شام تک دنیا کے سوا کوئی خیال نہ آئے، لیکن اگر اس دنیا کو اللہ تعالی کے لیے استعمال کر رہے ہو، تو پھر یہ دنیا بھی انسان کے لیے دنیا نہیں رہتی، بلکہ دین بن جاتی ہے اور اجر و ثواب کا ذریعہ بن جاتی ہے۔

اور دنیا کو دین بنانے کا طریقہ یہ ہے کہ مال کمانے میں حرام طریقوں سے بچو، اور تمہاری اس حاصل شدہ دولت پر جو فرائض عائد کیے گئے ہیں، خواہ زکوۃ کی شکل میں ہو، یا خیرات وصدقات کی شکل میں ہو، ان کو بجا لاؤ، اور جس طرح اللہ تعالی نے تمہارے ساتھ احسان کیا ہے تم دوسروں کے ساتھ احسان کرو، اگر انسان یہ اختیار کر لے اور جو نعمت انسان کو ملے اس پر اللہ تعالی کا شکر ادا کرے، تو دنیا کی ساری نعمتیں اور

دولتیں دین بن جائیں گی، اور وہ سب اجر بن جائیں گی، پھر کھانا کھائے گا تو بھی اجر ملے گا، اور پانی پیے گا تو بھی اجر ملے گا، تجارت کرے گا تو بھی اجر ملے گا، اور دنیا کی اور راحتیں اختیار کرے گا تو اس پر بھی اجر ملے گا، کیونکہ اس نے اس دنیا کو اپنا مقصد نہیں بنایا، بلکہ مقصد کے لیے ایک راستہ اور ایک ذریعہ قرار دیا ہے اور اس کے ذریعے وہ اپنی آخرت تلاش کر رہا ہے، حرام کاموں سے بچتا ہے، اور اپنے فرائض و واجبات کو ادا کرتا ہے تو ساری دنیا دین بن جاتی ہے، اور وہ دنیا اللہ تعالیٰ کا فضل بن جاتی ہے، اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس بات کی صحیح فہم بھی عطا فرمائے اور اس کے مطابق عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔ [اصلاحی خطبات، ج ۴، ۱۲۴ تا ۱۳۳]

کیا دین پر چلنا مشکل ہے ؟

بعض اوقات ان احادیث کو پڑھ پڑھ کر ہم جیسے کم ہمت لوگوں کے ذہن میں یہ خیال پیدا ہونے لگتا ہے کہ دین پر چلنا ہمارے بس کی بات نہیں، یہ حضرت ابوہریرہ، حضرت ابوبکر اور حضرت عمر اور اصحابِ صفہ رضوان اللہ علیہم اجمعین ہی نے دین پر عمل کر کے دکھایا، ہمارے بس میں تو یہ نہیں ہے کہ اتنے دن کی بھوک برداشت کر لیں، اور ایک چادر اوڑھ کر اپنی زندگی گذار لیں اور اپنے رہنے کی جھونپڑی بھی ہو تو اس کی مرمت نہ کریں، اور اگر مرمت کرنے لگیں تو اس وقت یہ خیال ہو کہ قیامت کا وقت قریب آنے والا ہے، خوب سمجھ لیجیے ! یہ واقعات سنانے کا یہ مقصد نہیں ہے کہ دل میں مایوسی پیدا ہو، بلکہ یہ واقعات سنانے کا منشا یہ ہے کہ حضور اقدس جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صحابہ کرام کے اندر یہ ذہنیت پیدا فرمائی جس کا اعلیٰ ترین معیار وہ تھا، لیکن یہ ضروری نہیں کہ ہر انسان اس اعلیٰ معیار پر پہنچنے کے بعد ہی نجات حاصل کر سکے گا، بلکہ ہر انسان کی طاقت اور استطاعت الگ الگ ہے، اور اللہ تعالیٰ نے کوئی حکم انسان کی طاقت اور استطاعت سے زیادہ نہیں دیا، کسی نے خوب کہا ہے:

دیتے ہیں ظرف قدح خوار دیکھ کر

یعنی جس شخص کا جتنا ظرف ہوتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کے ظرف کے مطابق اس کے ساتھ معاملہ فرماتے ہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۸، ص ۷۸]

دین اسلام کا مجھ سے کس وقت کیا مطالبہ ہے ؟اور اس مطالبے پر مجھے کس طرح عمل کرنا ہے ؟

صحابہ کرام کی قربانی کے واقعات سے متعلق اہم تشریح

حضرت عارفی رحمہ اللہ نے ایک عظیم بات ارشاد فرمائی، فرمایا کہ دیکھو! ''دین نام ہے وقت کے تقاضے پر عمل کرنے کا کہ اس وقت دین کا مجھ سے کیا مطالبہ ہے؟ اس مطالبے کو پورا کرنے کا نام دین اور اتباع ہے''، اپنا شوق پورا کرنے اور اپنی تجویز پر عمل کرنے کا نام دین نہیں، مثلاً یہ کہ میں نے اپنا ایک معمول بنالیا

ہے، اب چاہے دنیا ادھر سے ادھر ہو جائے اور وقت کا مطالبہ کچھ بھی ہو، لیکن میں اپنے معمول کو پورا کروں گا، یہ کوئی معقول بات نہیں۔

یہ بڑی اہم بات ہے، اور سمجھنے کی بات ہے، اس کو نہ سمجھنے کی وجہ سے دین کی تعبیر میں، دین کی تشریح میں، اور دین پر عمل کرنے میں بہت گھپلا واقع ہوتا ہے، وہ یہ کہ جب دل پر کسی خاص کام کی اہمیت سوار ہو جاتی ہے کہ یہ کام کرنا ہے، تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اگر وقت کا تقاضا کسی اور کام کے کرنے کا ہوتا ہے، تو اب اس شخص کو اس وقت کے تقاضے کی پرواہ نہیں ہوتی، مثلاً ایک مولانا صاحب ہیں، ان کو سبق پڑھانا ہے اور اس کے لیے مطالعہ کرنا ہے وغیرہ، ان کے کاموں کی اہمیت تو ان کے دل میں ہے، لیکن میرے گھر والوں کے بھی کچھ حقوق میرے ذمہ ہیں، اور مجھے کچھ وقت ان کو بھی دینا چاہیے، اس کی طرف مولانا صاحب کو دھیان نہیں، حالانکہ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ اس وقت کو آپ گھر والوں کے لیے استعمال کریں۔

اپنے اس طرز عمل کو صحیح ثابت کرنے کے لیے بعض مرتبہ لوگ بعض صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی قربانیوں کا حوالہ دیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب تک قربانی نہیں دیں گے اس وقت تک دین کا غلبہ نہیں ہوتا اور دین کے اندر اعلیٰ مقام حاصل نہیں ہوتا، اس کے بارے میں صحابہ کرام کی مثالیں موجود ہیں، جیسے حضرت حنظلہ رضی اللہ عنہ، آج ہی شادی ہوئی اور نئی بیوی گھر میں موجود ہے اور اگلے دن جہاد میں جانے کا اعلان ہو گیا تو ابھی یہ غسل جنابت بھی نہ کر پائے تھے کہ جہاد میں شامل ہو گئے، اب وقت کا تقاضا تو یہ لگتا ہے کہ ابھی گھر میں نئی بیوی آئی ہے، اس کے ساتھ کچھ وقت گذارا جائے، لیکن یہ صحابی اس بیوی کو چھوڑ کر جہاد میں چلے گئے۔

خوب سمجھ لیجیے! دو باتیں الگ الگ ہیں، جن کو صحابہ کرام کی مثالوں میں ہمیشہ مدنظر رکھنا چاہیے، ایک یہ کہ بعض اوقات حضرات صحابہ کرام ؓ نے اپنے گھر والوں کو ایسے موقع پر چھوڑا جب کہ گھر سے نکلنا فرض عین ہو گیا تھا، مثلاً دشمن حملہ آور ہو گیا اور نبی کریم ﷺ کی طرف سے نفیر عام آ گئی کہ ہر شخص جہاد میں نکل جائے، اب ہر شخص پر فرض عین ہے کہ وہ جہاد میں حصہ لے، اس صورت میں نہ والدین کی اجازت کی ضرورت ہے، نہ بیوی کی اجازت کی ضرورت ہے، یہاں تک فقہاء کرام فرماتے ہیں کہ ایسے موقع پر عورت اپنے شوہر کی اجازت کے بغیر نکل سکتی ہے، اور غلام اپنے آقا کی اجازت کے بغیر نکل سکتا ہے، یہ ایک غیر معمولی صورت حال ہے، جبکہ دشمن حملہ آور ہو گیا، اس وقت کا تقاضا ہی یہ تھا کہ جہاد میں جاتے، اب اس واقعہ کو اس بات پر چسپاں کرنا کسی طرح مناسب نہیں جہاں پر نکلنا فرض عین نہیں، اسی طرح اس واقعہ کی بنیاد پر یہ کہنا کہ قربانی کے بغیر کام نہیں چلے گا، یہ زیادتی ہے، کسی طرح بھی درست نہیں۔

دوسری طرف وہ مثالیں ہیں جن میں کسی صحابی نے اپنی ذات پر مشقت برداشت کر کے جہاد کیا، یا تبلیغ میں نکلے، دعوت میں نکلے، لیکن دوسرے کسی صاحب حق کا حق ضائع نہیں کیا۔

تیسری طرف بعض صحابہ کرام کے افعال ایسے ہیں جو بہت اعلیٰ درجے کے مقام کے ہیں، ہمیں بیشک اس بات کی کوشش تو کرنی چاہیے کہ اس مقام کا تھوڑا سا حصہ ہمیں بھی اللہ تعالیٰ عطا فرمادے، لیکن ہر آدمی پر فرض نہیں کہ اس سے مطالبہ کیا جائے کہ تم ایسا ضرور کرو، مثلاً حضرت ابوطلحہؓ ایک مرتبہ اپنے باغ میں نماز پڑھ رہے تھے، نماز کے دوران ایک پرندہ باغ کے اندر آ گیا، اور اب وہ پرندہ باغ سے نکلنا چاہتا تھا، مگر باغ کے گنجان ہونے کی وجہ سے اس کو باہر نکلنے کا راستہ نہیں ملتا تھا، اب نماز کے دوران ان کا خیال باغ کی طرف چلا گیا کہ میرا باغ کتنا گنجان ہے کہ اس میں پرندے کو داخل ہونے کے بعد اس کو باہر نکلنے کا راستہ نہیں مل رہا ہے، جب نماز ختم کی، تو انہوں نے سوچا کہ یہ تو بڑا غلط کام ہوا کہ نماز کے دوران میرا دل اپنے باغ کی وسعت کی طرف لگ گیا، جس کی وجہ سے نماز کی خشوع کا حق ادا نہ ہوا، اور اس باغ کی وجہ سے میرا دھیان بھٹکا، اس لیے میں اس باغ کو صدقہ کرتا ہوں۔

اب اگر یہ کہا جائے کہ جو کام حضرت ابوطلحہؓ نے کیا تھا، یہ کام ہر مسلمان پر فرض ہے، اگر ایک منٹ کے لیے بھی نماز میں دھیان کہیں اور جائے تو یہ گناہ ہے، اور جس چیز کی طرف دھیان گیا، اس چیز کو صدقہ کرنا واجب ہے، اگر اس واقعہ سے کوئی شخص یہ نتیجہ نکالے تو دین کی صحیح تشریح نہیں ہوگی، یہ تو ان کا اعلیٰ مقام تھا کہ انہوں نے ایک لمحہ کے لیے ذکر سے اور اللہ سے غافل ہونے پر اپنے لیے اتنی بڑی سزا مقرر فرمائی، لہذا یہ واقعہ لوگوں کو اس غرض کے لیے تو سنایا جائے کہ صحابہ کرام کے بلند مقام کو دیکھو کہ انہوں نے نماز میں خشوع ہونے کو کتنا اہم قرار دیا، جب وہ خشوع کو اتنا اہم سمجھتے تھے تو ہم بھی تو کچھ کریں، اس مقصد کے لیے تو یہ واقعہ بیان کرنا درست ہے، لیکن یہ واقعہ بیان کر کے یہ کہنا کہ ایسا کرنا ہر مسلمان پر فرض و واجب ہے، یہ کسی طرح بھی مناسب نہیں، اور یہ دین کی صحیح تشریح نہیں ہوگی۔

لہذا چاہے درس و تدریس ہو، چاہے وعظ و تبلیغ ہو، چاہے جہاد ہو، یہ سب کام وقت کے تقاضوں کے تابع ہیں، دیکھنا یہ ہے کہ اس وقت اللہ تبارک و تعالیٰ کی طرف سے کیا تقاضا ہے؟ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس وقت مجھ سے کیا مطالبہ ہے؟ غزوہ تبوک کا موقع ہے، ہر شخص آگے بڑھ کر جہاد میں حصہ لے رہا ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے صحابہ کرام کو ترغیب دی جا رہی ہے، یہ ترغیب سن کر حضرت علی رضی اللہ عنہ کے دل میں بھی جہاد میں جانے کا شوق پیدا ہو رہا ہے، لیکن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ تم جہاد میں مت جاؤ، بلکہ عورتوں اور بچوں کی دیکھ بھال کے لیے مدینہ منورہ میں رک جاؤ، اب حضرت علیؓ جو بہادری میں، شجاعت میں، جرأت میں، بہت سے صحابہ کرام سے زیادہ تھے، انہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے فرمایا کہ یا رسول اللہ! میں یہاں عورتوں اور بچوں کے پاس رہ جاؤں؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ کیا تم اس بات پر راضی نہیں ہو کہ تم میرے پیچھے مدینہ منورہ میں اس طرح رہو جیسے حضرت ہارون علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیچھے رہے، اس طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان کو مدینے میں رہنے کی ترغیب دی، اس لیے کہ ان کے

لیے وقت کا تقاضا یہ تھا کہ وہ مدینے میں رہ کر عورتوں اور بچوں کی دیکھ بھال کریں اور جہاد کو قربان کردیں۔

غزوہ بدر کا موقع ہے، وہ بدر جس کو قرآن کریم نے ''یوم الفرقان'' فرمایا، جس غزوہ میں شامل ہونے والا شخص بدری کہلایا، جن کے نام پڑھ کر لوگ دعائیں کرتے ہیں، حضرت عثمان غنیؓ حضور اقدس ﷺ کے داماد ہیں، وہ بھی اس غزوہ میں شریک ہونا چاہتے ہیں، لیکن ان کی بیوی جو حضور اقدس ﷺ کی صاحبزادی ہیں، وہ بیمار ہیں، حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ تم ان کی تیمارداری کے لیے رک جاؤ اور جہاد میں مت جاؤ، اب دیکھیے! حضور اقدس ﷺ نے حضرت عثمان غنیؓ کی بیوی کی تیمارداری کے لیے جہاد سے روک دیا اور غزوہ بدر جیسی عظیم فضیلت سے بظاہر ان کو محروم کردیا، لیکن حقیقت میں وہ محروم نہیں ہوئے، اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ان کو ''بدریین'' میں شمار فرمایا، اور مال غنیمت میں ان کا حصہ لگایا۔

بہرحال! عرض یہ کرنا تھا کہ یہ دین کا بڑا اہم نکتہ اور بڑا اہم باب ہے کہ کس وقت مجھ سے کیا مطالبہ ہے؟ اور اس مطالبے پر مجھے کس طرح عمل کرنا ہے؟ دین کی یہ فہم عام طور پر بزرگوں کی صحبت کے بغیر پیدا نہیں ہوتی، بلکہ آدمی اپنے دماغ سے اجتہاد ہی کرتا رہتا ہے کہ اس وقت مجھے دین کا یہ تقاضا معلوم ہو رہا ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۶، ص۷۵ تا ۸۵]

اسلامی تعلیمات کا دارومدار کیا صرف عقل پر ہے ؟

اسلام کی تعلیمات عقل وعشق کا ایک ایسا حسین آمیزہ ہیں کہ اگر ان میں سے کسی ایک عنصر کو بھی ختم کردیا جائے تو اس کا سارا حسن ختم ہو جاتا ہے۔ اگر عقائد وعبادات کا نظام عقل سے بالکلیہ آزاد ہو جائے تو کوئی توہم پرست یا دیومالائی مذہب وجود میں آجاتا ہے، اور اگر عقل کو وحی پر مبنی عقائد وعبادات سے آزاد کردیا جائے تو وہ کسی ایسے خشک سیکولر نظریے کو جنم دے کر رک جاتی ہے جو مادے کے اس پار دیکھنے کی صلاحیت سے محروم ہوتا ہے۔ نتیجہ دونوں صورتوں میں محرومی ہے، کہیں جسم کے جائز تقاضوں سے، کہیں روح کے حقیقی مطالبات سے۔ [ذکر وفکر، ص۳۱]

مسلم اقوام کی تنزلی اور غیر مسلم اقوام کی ترقی کی وجوہات کیا ہیں؟

خوب سمجھ لیجیے! یہ دنیا، اسباب کی دنیا ہے، اگر یہ باتیں غیر مسلموں نے حاصل کر کے ان پر عمل کرنا شروع کردیا تو اللہ تعالیٰ نے ان کو دنیا میں ترقی دے دی اگرچہ آخرت میں تو ان کا کوئی حصہ نہیں، لیکن معاشرت کے وہ آداب جو ہمیں محمد رسول اللہ ﷺ نے سکھائے تھے، ان آداب کو انہوں نے اختیار کرلیا، تو اللہ تعالیٰ نے ان کو ترقی دے دی، لہٰذا یہ اعتراض تو کردیا کہ ہم مسلمان ہیں، کلمہ پڑھتے ہیں، ایمان کا اقرار کرتے ہیں، اس کے باوجود دنیا میں ہم ذلیل وخوار ہو رہے ہیں، دوسرے لوگ غیر مسلم ہونے کے باوجود ترقی کر رہے ہیں، لیکن یہ

نہیں دیکھا کہ ان غیر مسلموں کا یہ حال ہے کہ وہ تجارت میں جھوٹ نہیں بولیں گے، امانت اور دیانت سے کام لیں گے، جس کے نتیجے میں اللہ تعالی نے ان کی تجارت چمکا دی، لیکن مسلمانوں نے ان چیزوں کو چھوڑ دیا، اور دین کو مسجد اور مدرسے تک محدود کر کے بیٹھ گیا، زندگی کی باقی چیزوں کو دین سے خارج کر دیا، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ اپنے دین سے بھی دور ہو گئے اور دنیا میں بھی ذلیل وخوار ہو گئے، حالانکہ حضور اقدس ﷺ نے یہ سب تعلیمات ہمیں عطا فرمائیں تا کہ ہم ان کو اپنی زندگی کے اندر اپنائیں اور ان کو دین کا حصہ سمجھیں۔

[اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۱۸۳]

حضور نبی کریم ﷺ کی سنتوں کی اتباع میں، آپ کی سنتوں کی تعمیل میں، ان حضرات صحابہ نے دنیا بھر میں اپنا لوہا منوایا، اور آج ہم پر یہ خوف مسلط ہے کہ اگر فلاں سنت پر عمل کر لیا تو لوگ کیا کہیں گے؟ اگر فلاں سنت پر عمل کر لیا تو دنیا والے مذاق اڑائیں گے، انگلینڈ مذاق اڑائے گا، فلاں ملک والے مذاق اڑائیں گے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری دنیا میں آج ذلیل ہو رہے ہیں، آج دنیا کی ایک تہائی آبادی مسلمانوں کی ہے، آج دنیا میں جتنے مسلمان ہیں، اتنے مسلمان اس سے پہلے اتنے مسلمان کبھی نہیں ہوئے، اور آج مسلمانوں کے پاس جتنے وسائل ہیں اتنے وسائل اس سے پہلے کبھی نہیں ہوئے، لیکن حضور نبی ﷺ نے فرما دیا تھا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ تمہاری تعداد تو بہت ہو گی لیکن تم ایسے ہو گے جیسے سیلاب میں بہتے ہوئے تنکے ہوتے ہیں، جن کا اپنا کوئی اختیار نہیں ہوتا، آج ہمارا یہ حال ہے، کہ اپنے دشمنوں کو راضی کرنے کے لیے اپنا سب کچھ قربان کر دیا، اپنے اخلاق چھوڑے، اپنے اعمال چھوڑے، اپنی سیرتیں چھوڑیں، اپنے کردار چھوڑے، اور اپنی صورت تک بدل ڈالی، سر سے لے کر پاؤں تک ان کی نقل اتار کر یہ دکھا دیا کہ ہم تمہارے غلام ہیں، لیکن وہ پھر بھی خوش نہیں ہیں، اور روزانہ پٹائی کرتے ہیں، کبھی اسرائیل پٹائی کر رہا ہے، کبھی کوئی دوسرا ملک پٹائی کر رہا ہے، لہذا ایک مسلمان جب حضور اقدس ﷺ کی سنت چھوڑ دے گا تو یاد رکھو اس کے لیے ذلت کے سوا کچھ نہیں ہے۔

ایک شاعر گذرے ہیں اسعد ملتانی مرحوم، انہوں نے بڑے اچھے حکیمانہ شعر کہے ہیں، فرماتے ہیں کہ:

کسی کا آستانہ اونچا ہے اتنا
کہ سر جھک کر بھی اونچا ہی رہے گا
ہنسے جانے سے جب تک تم ڈرو گے
زمانہ تم پر ہنستا ہی رہے گا

جب تک تم اس بات سے ڈرو گے کہ فلاں ہنسے گا، فلاں مذاق اڑائے گا، تو زمانہ ہنستا ہی رہے گا، اور دیکھ لو کہ ہنس رہا ہے، اور اگر تم نے نبی کریم سرور دو عالم ﷺ کے قدم مبارک پر اپنا سر رکھ دیا اور آپ کی

سنتوں کی اتباع کرلی تو پھر دیکھو کہ دنیا تمہاری کیسی عزت کرتی ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۲، ص ۱۶۸]

ایک زمانہ وہ تھا جب مسلمانوں کا یہ شیوہ تھا کہ تجارت بالکل صاف ستھری ہو، اس میں دیانت اور امانت ہو، دھوکہ اور فریب نہ ہو، آج مسلمانوں نے تو ان چیزوں کو چھوڑ دیا، اور انگریزوں اور امریکیوں اور دوسری مغربی اقوام نے ان چیزوں کو اپنی تجارت میں اختیار کرلیا، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ان کی تجارت کو فروغ ہورہا ہے، دنیا پر چھائے ہیں، میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ یاد رکھو! باطل کے اندر کبھی ابھرنے اور ترقی کرنے کی طاقت ہی نہیں، اس لیے کہ قرآن کریم کا صاف ارشاد ہے:

﴿إن الباطل كان زهوقا﴾

یعنی باطل تو مٹنے کے لیے آیا ہے لیکن اگر کبھی تمہیں یہ نظر آئے کہ کوئی باطل ترقی کررہا ہے، ابھر رہا ہے، تو سمجھ لو کہ کوئی حق چیز اس کے ساتھ لگ گئی ہے، اور اس حق چیز نے اس کو ابھار دیا ہے، لہٰذا یہ باطل لوگ جو خدا پر ایمان نہیں رکھتے، آخرت پر ایمان نہیں رکھتے، محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ایمان نہیں رکھتے، اس کا تقاضا تو یہ تھا کہ ان کو دنیا کے اندر بھی ذلیل ورسوا کردیا جاتا، لیکن کچھ حق چیزیں ان کے ساتھ لگ گئیں، وہ امانت اور دیانت جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں سکھائی تھی، وہ انہوں نے اختیار کرلی، اس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت کو ترقی عطا فرمائی، آج وہ پوری دنیا پر چھا گئے، اور ہم نے تھوڑے سے نفع کے خاطر امانت اور دیانت کو چھوڑ دیا، اور دھوکہ، فریب کو اختیار کرلیا، اور یہ نہ سوچا کہ یہ دھوکہ فریب آگے چل کر ہماری اپنی تجارت کو تباہ و برباد کردے گا۔

مسلمان کا ایک طرہ امتیاز یہ ہے کہ وہ تجارت میں کبھی دھوکہ اور فریب نہیں دیتا، ناپ تول میں کبھی کمی نہیں کرتا، کبھی ملاوٹ نہیں کرتا، امانت اور دیانت کو کبھی ہاتھ سے نہیں جانے دیتا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا کے سامنے ایسا ہی معاشرہ پیش کیا اور صحابہ کرام کی شکل میں ایسے ہی لوگ تیار کیے، جنہوں نے تجارت میں بڑے سے بڑے نقصان کو گوارہ کرلیا، لیکن دھوکہ اور فریب دینے کو گوارہ نہیں کیا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اللہ تعالیٰ نے ان کی تجارت بھی چمکائی اور ان کی سیاست بھی چمکائی، ان کا بول بالا کیا، اور انہوں نے دنیا سے اپنی طاقت اور قوت کا لوہا منوایا۔

آج ہمارا حال یہ ہے کہ عام مسلمان نہیں بلکہ وہ مسلمان جو پانچ وقت کی نماز پابندی سے ادا کرتے ہیں، لیکن جب وہ بازار میں جاتے ہیں تو سب احکام بھول جاتے ہیں، گویا کہ اللہ تعالیٰ کے احکام صرف مسجد تک کے لیے ہیں، بازار کے لیے نہیں، خدا کے لیے اس فرق کو ختم کریں، اور زندگی کے تمام شعبوں میں اسلام کے تمام احکامات کو بجالائیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۶، ص ۱۳۴]

”مولویوں نے چھوٹی چھوٹی باتوں میں قوم کو پھنسادیا اور ترقی کا راستہ روک دیا“

مغربی اقوام سنت پر عمل پیرا نہیں پھر کیوں ترقی یافتہ ہیں؟

آج سے کئی سال پہلے میں ہوائی جہاز میں سفر کر رہا ہے، میری ساتھ والی سیٹ پر ایک اور صاحب بیٹھے ہوئے تھے، سفر کے دوران اُن سے ذرا بے تکلفی بھی ہوگئی تھی، جب کھانا آیا تو ان صاحب نے حسب معمول دائیں ہاتھ سے چھری لی اور بائیں ہاتھ سے کھانا شروع کر دیا، میں نے ان سے کہا کہ ہم نے ہر چیز میں انگریز کی تقلید شروع کر رکھی ہے، اور نبی کریم ﷺ کی سنت یہ تھی کہ آپ دائیں ہاتھ سے کھاتے تھے ،اس لیے اگر آپ دائیں ہاتھ سے کھالیں تو آپ کا یہی عمل موجب ثواب بن جائے گا، وہ جواب میں کہنے لگے کہ اصل میں ہماری قوم اسی وجہ سے پیچھے رہ گئی ہے کہ وہ ان چھوٹی چھوٹی چیزں کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، ان مولویوں نے ان چیزوں کے اندر ہماری قوم کو پھنسا دیا اور ترقی کا راستہ روک دیا اور جو بڑے بڑے کام تھے ان میں ہم پیچھے رہ گئے۔

میں نے ان سے عرض کیا کہ ماشاء اللہ! آپ تو مدت دراز سے اس ترقی یافتہ طریقے سے کھا رہے ہیں، اس ترقی یافتہ طریقے سے کھانے سے آپ کو کتنی ترقی حاصل ہوئی؟ اور آپ کتنا آگے بڑھ گئے؟ اور کتنے لوگوں پر آپ کو فوقیت حاصل ہوگئی؟ اس پر وہ خاموش ہوگئے، پھر میں نے ان کو سمجھایا کہ مسلمانوں کی ترقی اور سربلندی تو نبی کریم ﷺ کے طریقوں پر عمل کرنے میں ہے، دوسرے طریقوں پر عمل کرنے میں نہیں، اگر مسلمان دوسرے طریقوں کو اختیار کرے گا تو وہ سربلند نہیں ہوسکتا، ان صاحب نے کہا کہ آپ نے عجیب بات کہی، ترقی سنتوں پر عمل کرنے میں ہے، یہ ساری مغربی قوتیں کتنی ترقی کر رہی ہیں حالانکہ وہ قومیں الٹے ہاتھ سے کھاتی ہیں، سارے کام سنت اور شریعت کے خلاف کرتی ہیں، گناہوں کے اندر بری طرح مبتلا ہیں، فسق و فجور کے کام کرتی ہیں، شرابیں پیتی ہیں، جوا کھیلتی ہیں، اس کے باوجود وہ قومیں ترقی کر رہی ہیں، اور پوری دنیا پر چھائی ہوئی ہیں، لہذا آپ جو یہ کہتے ہیں کہ سنتوں پر عمل کرنے سے ترقی ہوتی ہے، لیکن ہمیں تو نظر آ رہا ہے کہ سنتوں کے خلاف اور شریعت کے خلاف کام کرنے سے دنیا میں ترقی ہو رہی ہے۔

میں نے ان سے کہا کہ آپ نے یہ جو فرمایا کہ مغربی قومیں سنتوں کو چھوڑنے کے باوجود ترقی کر رہی ہیں، لہذا ہم بھی اسی طرح ترقی کر سکتے ہیں، اس پر میں نے ان کو ایک قصہ سنایا، وہ یہ کہ ایک گاؤں میں ایک شخص کھجور کے درخت پر چڑھ گیا، کسی طرح چڑھ تو گیا، لیکن درخت سے اترا نہیں جا رہا تھا، اب اس نے اوپر سے گاؤں والوں کو آواز دی کہ مجھے اتارو، اب لوگ جمع ہوگئے اور آپس میں مشورہ کیا کہ کس طرح اس کو درخت سے اتاریں؟ کسی کی سمجھ میں کوئی طریقہ نہیں آ رہا تھا، اس زمانے میں گاؤں کے اندر ایک بوجھ بجھکڑ ہوتا تھا، جو سب سے زیادہ عقل مند سمجھا جاتا تھا، گاؤں والے اس کے پاس پہنچے اور اسے جا کر سارا قصہ سنایا کہ اس

طرح ایک آدمی درخت پر چڑھ گیا ہے، اس کو کس طرح اتاریں؟ اس بوجھ بجھکڑ نے کہا کہ یہ تو کوئی مشکل نہیں، ایسا کرو کہ ایک رسّا لاؤ، اور جب رسّا لایا گیا تو اس نے کہا کہ اب رسّا اس شخص کی طرف پھینکو، اور اس شخص نے کہا کہ تم اس رسّے کو اپنی کمر سے مضبوطی سے باندھ لو، اس نے جب رسّا باندھ لیا تو اب لوگوں سے کہا کہ تم اس رسّے کو زور سے کھینچو، جب لوگوں نے رسّا کھینچا تو وہ شخص درخت سے نیچے گرا اور مر گیا، لوگوں نے اس بوجھ بجھکڑ سے کہا کہ آپ نے یہ کیسی ترکیب بتائی؟ یہ تو مر گیا، اس نے جواب دیا کہ معلوم نہیں کیوں مر گیا؟ شاید اس کی قضا ہی آ گئی تھی، اس لیے مر گیا، ورنہ میں نے اس طریقے سے بے شمار لوگوں کو کنویں سے نکالا ہے اور وہ صحیح سالم نکل آئے۔

اس بوجھ بجھکڑ نے کھجور کے درخت پر چڑھے شخص کو کنویں کے اندر گرے ہوئے شخص پر قیاس کیا، یہی قیاس یہاں بھی کیا جا رہا ہے، اور یہ کہا جا رہا ہے کہ چونکہ غیر مسلم قومیں فسق و فجور اور معصیت اور نافرمانی کے ذریعے ترقی کر رہی ہیں، اس طرح ہم بھی نافرمانی کے ساتھ ترقی کر جائیں گے، یہ قیاس درست نہیں، یاد رکھیں! جس قوم کا نام مسلمان ہے، اور جو کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ پر ایمان لائی ہے، وہ اگرچہ سر سے لے کر پاؤں تک ان مغربی اقوام کا طریقہ اپنا لیں اور اپنا سب کچھ بدل دیں تب بھی ساری زندگی کبھی ترقی نہیں کر سکتی، ہاں! اگر وہ ترقی کرنا چاہتی ہے تو ایک مرتبہ معاذ اللہ اسلام کے چولے کو اپنے جسم سے اتار دیں اور یہ کہہ دیں کہ ہم مسلمان نہیں ہیں، پھر ان کے طریقوں کو اختیار کر لیں، تو اللہ تعالیٰ انہیں بھی دنیا میں ترقی دیں گے، لیکن مسلمان کے لیے وہ ضابطہ اور قانون نہیں ہے جو کافروں کے لیے ہے، مسلمان کے لیے دنیا میں بھی ترقی کرنے کا اگر کوئی راستہ ہے تو صرف حضور اقدس ﷺ کی اتباع میں ہے، اس کے علاوہ مسلمانوں کی ترقی کا کوئی راستہ نہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہمارے دل و دماغ میں یہ بات بیٹھ گئی ہے کہ مغربی اقوام جو کام کر رہی ہیں وہ قابل تقلید ہے اور نبی کریم ﷺ کی سنت معاذ اللہ ایک معمولی سی چیز ہے اور قابل تقلید نہیں ہے، بلکہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہے، حالانکہ سوچنے کی بات ہے کہ اگر تم نے دائیں ہاتھ سے کھانا کھا لیا تو تمہاری ترقی میں کونسی رکاوٹ آ جائے گی، لیکن ہمارے دل و دماغ پر غلامی مسلط ہے، سرکار دو عالم ﷺ کی غلامی چھوڑ کر ان کی غلامی اختیار کر لی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ غلامی کے اندر جی رہے ہیں اور غلامی کے اندر مر رہے ہیں، اور اب اس غلامی سے نکلنا بھی چاہتے ہیں تو نکلا نہیں جاتا، نکلنے کا کوئی راستہ نظر نہیں آتا، اور سچی بات یہ ہے کہ اس وقت تک اس غلامی سے نہیں نکل سکتے اور اس دنیا میں عزت اور سربلندی حاصل نہیں کر سکتے جب تک ایک مرتبہ صحیح معنی میں حضور اقدس ﷺ کی غلامی قبول نہیں کر لیں گے اور سرکار دو عالم محمد مصطفی ﷺ کے نقش قدم پر نہیں چلیں گے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۱۸۱ تا ۱۸۴]

اسلام اور انسانی حقوق

کیا اِسلام اِنسانی حقوق (Human Rights) کی ضمانت نہیں دیتا؟

آج کی دنیا کا پروپیگنڈہ

سیرت طیبہ کے اس پہلو پر گفتگو کی جائے کہ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم انسانی حقوق کے لیے کیا رہنمائی اور ہدایت لے کر تشریف لائے اور اس موضوع کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اس وقت پوری دنیا میں اس پروپیگنڈہ کا بازار گرم ہے کہ اسلام کو عملی طور پر نافذ کرنے سے ہیومن رائٹس (Human Rights) مجروح ہوں گے، انسانی حقوق مجروح ہوں گے، اور یہ پبلسٹی کی جارہی ہے کہ گویا ہیومن رائٹس کا تصور پہلی بار مغرب کے ایوانوں سے بلند ہوا، اور سب سے پہلے انسان کو حقوق دینے والے یہ اہل مغرب ہیں اور محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی لائی ہوئی تعلیمات میں انسانی حقوق کا (معاذ اللہ) کوئی تصور موجود نہیں، آج اسی موضوع پر اپنی گفتگو کو محصور کرنے کی کوشش کروں گا، لیکن موضوع ذرا تھوڑا سا علمی نوعیت کا ہے اور ایسا موضوع ہے کہ اس میں ذرا زیادہ توجہ اور زیادہ حاضر دماغی کی ضرورت ہے، اس لیے آپ حضرات سے درخواست ہے کہ موضوع کی اہمیت کے پیش نظر اور اس کی نزاکت کو مدنظر رکھتے ہوئے براہ کرم توجہ کے ساتھ سماعت فرمائیں، شاید اللہ تبارک وتعالی ہمارے دل میں اس سلسلے میں کوئی صحیح بات ڈال دے۔

مروجہ انسانی حقوق کا خود ساختہ تصور

سوال یہ پیدا ہوتا ہے، جس کا جواب دینا منظور ہے، کہ آیا اسلام میں انسانی حقوق کا کوئی جامع تصور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی روشنی میں ہے یا نہیں؟ یہ سوال اس لیے پیدا ہوتا ہے کہ اس دور کا عجیب وغریب رجحان ہے کہ انسانی حقوق کا ایک تصور پہلے اپنی عقل، اپنی فکر، اپنی سوچ کی روشنی میں خود متعین کرلیا کہ یہ انسانی حقوق ہیں، یہ ہیومن رائٹس ہیں اور ان کا تحفظ ضروری ہے اور اپنی طرف سے خود ساختہ جو سانچہ انسانی حقوق کا ذہن میں بنایا اس کو ایک معیار حق قرار دے کر ہر چیز کو اس معیار پر پرکھنے اور جانچنے کی کوشش

کی جارہی ہے، پہلے سے خود متعین کرلیا کہ فلاں چیز انسانی حق ہے اور فلاں چیز انسانی حق نہیں ہے، اور یہ متعین کرنے کے بعد اب دیکھا جاتا ہے کہ آیا اسلام یہ حق دیتا ہے یا نہیں؟ محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حق دیا یا نہیں دیا؟ اگر دیا تو گویا ہم کسی درجہ میں اس کو ماننے کے لیے تیار ہیں، اگر نہیں دیا تو ہم ماننے کے لیے تیار نہیں ہیں، لیکن ان مفکرین اور دانش وروں سے اور ان فکر وعقل کے سورماؤں سے میں ایک سوال کرنا چاہتا ہوں کہ یہ آپ نے جو اپنے ذہن سے انسانی حقوق کے تصورات مرتب کیے، یہ آخر کس بنیاد پر کیے؟ یہ کس اساس پر کیے؟ یہ جو آپ نے یہ تصور کیا کہ انسانی حقوق کا ایک پہلو یہ ہے، ہر انسان کو یہ حق ضرور ملنا چاہیے، یہ آخر کس بنیاد پر آپ نے کہا کہ ملنا چاہیے؟

انسانی فکر کے تیار کردہ "انسانی حقوق" بدلتے چلے آئے ہیں

انسانیت کی تاریخ پر نظر دوڑا کر دیکھیے تو ابتدائے آفرینش سے لے کر آج تک انسان کے ذہن میں انسانی حقوق کے تصورات بدلتے چلے آئے ہیں، کسی دور میں انسان کے لیے ایک حق لازمی سمجھا جاتا تھا، دوسرے دور میں اس حق کو بے کار قرار دے دیا گیا، ایک خطے میں ایک حق قرار دیا گیا، دوسری جگہ اس حق کو ناحق قرار دے دیا گیا، تاریخ انسانیت پر نظر دوڑا کر دیکھیے تو آپ کو یہ نظر آئے گا کہ جس زمانے میں بھی انسانی فکر نے حقوق کے جو سانچے تیار کیے ان کا پروپیگنڈہ، ان کی پبلسٹی اس زور وشور کے ساتھ کی گئی کہ اس کے خلاف بولنے کو جرم قرار دے دیا گیا۔

حضور نبی کریم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم جس وقت دنیا میں تشریف لائے اس وقت انسانی حقوق کا ایک تصور تھا اور وہ تصور ساری دنیا کے اندر پھیلا ہوا تھا اور اسی تصور کو معیار حق قرار دیا جاتا تھا، ضروری قرار دیا جاتا تھا کہ یہ حق لازمی ہے، میں آپ کو ایک مثال دیتا ہوں کہ اس زمانے میں انسانی حقوق ہی کے حوالے سے یہ تصور تھا کہ جو شخص کسی کا غلام بن گیا تو غلام بننے کے بعد صرف جان و مال اور جسم ہی اس کا مملوک نہیں ہوتا تھا، بلکہ انسانی حقوق اور انسانی مفادات کے ہر تصور سے وہ عاری ہوجاتا تھا، آقا کا یہ بنیادی حق تھا کہ چاہے وہ اپنے غلام کی گردن میں طوق ڈالے اور اس کے پاؤں میں بیڑیاں پہنائے، یہ ایک تصور تھا، جنہوں نے اس کو جسٹی فائی (Justify) کرنے کے لیے اور اس کو مبنی بر انصاف قرار دینے کے لیے فلسفے پیش کیے تھے اور ان کا پورا لٹریچر آپ کو مل جائے گا، آپ کہیں گے کہ یہ دور کی بات ہے، چودہ سو سال پہلے کی بات ہے، لیکن ابھی ڈیڑھ سو سال پہلے کی بات لے لیجیے، جب جرمنی اور اٹلی میں فاشزم نے اور نازی ازم نے سر اٹھایا تھا، آج فاشزم اور نازی ازم کا نام گالی بن چکا اور دنیا بھر میں بدنام ہو چکا، لیکن آپ ان کے فلسفے کو اٹھا کر دیکھیے، جس بنیاد پر انہوں نے فاشزم کا تصور پیش کیا تھا اور نازی ازم کا تصور پیش کیا تھا، اس فلسفے کو خالص عقل کی بنیاد پر اگر آپ رد کرنا چاہیں تو آسان نہیں ہوگا، انہوں نے یہ تصور پیش کیا تھا کہ جو طاقت ور ہے اسی کا ہی یہ بنیادی حق

ہے کہ وہ کمزور پر حکومت کرے، اور یہ طاقت ور کے بنیادی حقوق میں شمار ہوتا ہے اور کمزور کے ذمہ واجب ہے کہ وہ طاقت کے آگے سر جھکائے، یہ تصور ابھی سوڈیڑھ سو سال پہلے کی بات ہے، تو انسانی افکار کی تاریخ میں انسانی حقوق کے تصورات یکساں نہیں رہے، بدلتے رہے، کسی دور میں ایک چیز کو حق قرار دیا گیا اور کسی دور میں کسی دوسری چیز کو حق قرار دیا گیا اور جس دور میں جس قسم کے حقوق کے سیٹ کو یہ کہا گیا کہ یہ انسانی حقوق کا حصہ ہے، اس کے خلاف بات کرنا زبان کھولنا ایک جرم قرار پایا، تو اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ آج ہیومن رائٹس کے بارے میں یہ کہا جا رہا ہے کہ ہیومن رائٹس کا تحفظ ضروری ہے، یہ کل کو تبدیل نہیں ہوں گے، کل کو ان کے درمیان انقلاب نہیں آئے گا اور کون سی بنیاد ہے جو اس بات کو درست قرار دے سکے؟

صحیح انسانی حقوق کا تعین

حضور نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا انسانی حقوق کے بارے میں سب سے بڑا کنٹری بیوشن (Contribution) یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی حقوق کے تعین کی صحیح بنیاد فراہم فرمائی، وہ اساس فراہم فرمائی جس کی بنیاد پر یہ فیصلہ کیا جا سکے کہ کون سے ہیومن رائٹس قابل تحفظ ہیں اور کون سے ہیومن رائٹس قابل تحفظ نہیں، اگر محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی اور آپ کی ہدایت کو اساس تسلیم نہ کیا جائے تو پھر اس دنیا میں کسی کے پاس کوئی بنیاد نہیں ہے جس کی بنیاد پر وہ کہہ سکے کہ فلاں انسانی حقوق لازماً قابل تحفظ ہیں۔

تحفظ انسانی حقوق کا علم بردار اِدارہ ایمنسٹی انٹرنیشنل اور آج کل کے سروے (رائے عامہ) کی دلچسپ حقیقت

میں آپ کو ایک لطیفے کی بات سناتا ہوں، کچھ عرصہ پہلے ایک دن میں مغرب کی نماز پڑھ کر گھر میں بیٹھا ہوا تھا تو باہر سے کوئی صاحب ملنے کے لیے آئے، کارڈ بھیجا تو دیکھا کہ اس کارڈ پر لکھا ہوا تھا کہ یہ ساری دنیا میں ایک مشہور ادارہ ہے جس کا نام ایمنسٹی انٹرنیشنل ہے، جو سارے انسانی بنیادی حقوق کے تحفظ کا علم بردار ہے، اس ادارے کے ایک ڈائریکٹر پیرس سے پاکستان آئے ہیں، اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں، خیر! میں نے اندر بلالیا، پہلے سے کوئی اپوئنٹ منٹ نہیں تھی، کوئی پہلے سے وقت نہیں لیا تھا، اچانک آگئے اور پاکستان کی وزارت خارجہ کے ایک ذمہ دار افسر بھی ان کے ساتھ تھے، آپ کو یہ معلوم ہے کہ ایمنسٹی انٹرنیشنل وہ ادارہ ہے جس کو انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے اور آزادی تقریر وتحریر کے لیے علم بردار ادارہ کہا جاتا ہے اور پاکستان میں جو بعض شرعی قوانین نافذ ہوئے یا مثلاً قادیانیوں کے سلسلے میں پابندیاں عائد کی گئیں تو ایمنسٹی انٹرنیشنل کی طرف سے اس پر اعتراضات واحتجاجات کا سلسلہ رہا، بہر حال! یہ صاحب تشریف لائے تو انہوں نے آکر مجھ سے کہا کہ میں آپ سے اس لیے ملنا چاہتا ہوں کہ میرے ادارے نے مجھے اس بات پر مقرر کیا ہے کہ میں آزادی تحریر وتقریر اور انسانی حقوق کے سلسلے میں ساؤتھ ایسٹ ایشیا کے ممالک میں رائے

عامہ کا سروے کروں، یعنی یہ معلوم کروں کہ جنوب مشرقی ایشیا کے مسلمان انسانی حقوق، آزادی تحریر وتقریر اور آزادی اظہار رائے کے بارے میں کیا خیالات رکھتے ہیں؟ اور وہ کس حد تک اس معاملہ میں ہم سے تعاون کرنے پر آمادہ ہیں؟ اس کا سروے کرنے کے لیے میں پیرس سے آیا ہوں اور اس سلسلے میں آپ سے انٹرویو کرنا چاہتا ہوں، ساتھ ہی انہوں نے معذرت بھی کی کہ چونکہ میرے پاس وقت کم تھا اس لیے میں پہلے سے وقت نہیں لے سکا، لیکن میں چاہتا ہوں کہ میرے چند سوالات کا آپ جواب دیں تاکہ اس کی بنیاد پر اپنی رپورٹ مرتب کرسکوں۔

میں نے ان صاحب سے پوچھا کہ آپ کب تشریف لائے؟ کہا کہ میں کل ہی پہنچا ہوں، میں نے کہا آئندہ کیا پروگرام ہے؟ فرمانے لگے کہ کل مجھے اسلام آباد جانا ہے، میں نے کہا اس کے بعد؟ کہا کہ اسلام آباد ایک یا دو دن ٹھہر کر پھر میں دہلی جاؤں گا، میں نے کہا کہ وہاں کتنے دن قیام فرمائیں گے؟ کہا دو دن، میں نے کہا پھر اس کے بعد؟ کہا کہ اس کے بعد مجھے ملائیشیا جانا ہے، تو میں نے کہا کل آپ کراچی تشریف لائے اور آج شام کو اس وقت میرے پاس تشریف لائے، کل صبح آپ اسلام آباد چلے جائیں گے، آج کا دن آپ نے کراچی میں گذارا، تو آپ نے کیا کراچی کی رائے عامہ کا سروے کرلیا؟ تو اس سوال پر وہ بہت سٹپٹائے، کہنے لگے اتنی دیر میں واقعی پورا سروے تو نہیں ہوسکتا تھا، لیکن اس مدت کے اندر میں نے کافی لوگوں سے ملاقات کی اور تھوڑا بہت اندازہ مجھے ہوگیا ہے، تو میں نے کہا کہ آپ نے کتنے لوگوں سے ملاقات کی؟ کہا کہ پانچ افراد سے میں ملاقات کرچکا ہوں، چھٹے آپ ہیں، میں نے کہا چھ افراد سے ملاقات کرنے کے بعد آپ نے کراچی کا سروے کرلیا، اب اس کے بعد کل اسلام آباد تشریف لے جائیں گے اور وہاں ایک دن قیام فرمائیں گے، چھ آدمیوں سے وہاں آپ کی ملاقات ہوگی، چھ آدمیوں سے ملاقات کے بعد اسلام آباد کی رائے عامہ کا سروے ہوجائے گا، اس کے بعد دو دن دہلی تشریف لے جائیں گے، دو دن دہلی کے اندر کچھ لوگوں سے ملاقات کریں گے تو وہاں کا سروے آپ کا ہوجائے گا، تو یہ بتایئے کہ یہ سروے کا کیا طریقہ ہے؟ تو وہ کہنے لگے آپ کی بات معقول ہے، واقعتاً جتنا وقت مجھے دینا چاہیے تھا اتنا میں دے نہیں پارہا، مگر میں کیا کروں کہ میرے پاس وقت کم تھا، میں نے کہا معاف فرمایے، اگر وقت کم تھا تو کس ڈاکٹر نے آپ کو مشورہ دیا تھا کہ آپ سروے کریں؟ اس لیے کہ اگر سروے کرنا تھا تو پھر ایسے آدمی کو کرنا چاہیے جس کے پاس وقت ہو، جو لوگوں کے پاس جاکر مل سکے، لوگوں سے بات کرسکے، اگر وقت کم تھا تو پھر سروے کی ذمہ داری لینے کی ضرورت کیا تھی؟ تو کہنے لگے کہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے، لیکن بس ہمیں اتنا ہی وقت دیا گیا تھا، اس لیے میں مجبور تھا، میں نے کہا معاف فرمایے، مجھے آپ کے اس سروے کی سنجیدگی پر شک ہے، میں اس سروے کو سنجیدہ نہیں سمجھتا، لہٰذا میں اس سروے کے اندر کوئی پارٹی بننے کے لیے تیار نہیں ہوں اور نہ آپ کے کسی سوال کا جواب دینے کے لیے تیار ہوں، اس لیے کہ آپ پانچ چھ آدمیوں سے گفتگو کرنے کے بعد یہ رپورٹ دیں گے

کہ وہاں پر رائے عامہ یہ ہے، اس رپورٹ کی کیا قدر و قیمت ہوسکتی ہے؟ لہذا میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دے سکتا، وہ بہت سٹپٹائے اور کہا کہ آپ کی بات ویسے ٹیکنکلی صحیح ہے، لیکن یہ کہ میں چونکہ آپ کے پاس ایک بات پوچھنے کے لیے آیا ہوں، تو میرے کچھ سوالوں کے جواب آپ ضرور دے دیں، میں نے کہا نہیں! میں آپ کے کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا، جب تک مجھے اس بات کا یقین نہ ہوجائے کہ آپ کا سروے واقعۃً علمی نوعیت کا ہے اور سنجیدہ ہے، اس وقت تک میں اس کے اندر کوئی پارٹی بننے کے لیے تیار نہیں ہوں، آپ مجھے معاف فرمائیں، میرے مہمان ہیں، میں آپ کی خاطر تواضع جو کرسکتا ہوں وہ کروں گا، باقی کسی سوال کا جواب نہیں دوں گا۔

کیا آزادی فکر کا نظریہ بالکل مطلق ہے ؟

میں نے کہا کہ اگر میری بات میں کوئی غیر معقولیت ہے تو مجھے سمجھا دیجیے کہ میرا موقف غلط ہے اور فلاں بنیاد پر غلط ہے، کہنے لگے بات تو آپ کی معقول ہے، لیکن میں آپ سے ویسے برادرانہ طور پر یہ چاہتا ہوں کہ آپ کچھ جواب دیں، میں نے کہا میں جواب نہیں دوں گا، البتہ آپ مجھے اجازت دیں تو میں آپ سے کچھ سوال کرنا چاہتا ہوں، کہنے لگے سوال تو میں کرنے کے لیے آیا تھا، لیکن آپ میرے سوال کا جواب نہیں دینا چاہتے تو ٹھیک، آپ سوال کرلیں، آپ کیا سوال کرنا چاہتے ہیں؟ میں نے کہا میں آپ سے اجازت طلب کر رہا ہوں، اگر آپ اجازت دیں گے تو سوال کرلوں گا، اگر اجازت نہیں دیں گے تو میں بھی سوال نہیں کروں گا اور ہم دونوں کی ملاقات ہوگئی، بات ختم ہوگئی۔

کہنے لگے نہیں! آپ سوال کرلیجیے، تو میں نے کہا میں سوال آپ سے یہ کرنا چاہتا ہوں کہ آپ آزادی اظہار رائے اور انسانی حقوق کا علم لے کر چلے ہیں، تو میں ایک بات آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ یہ آزادی اظہار رائے جس کی آپ تبلیغ کرنا چاہتے ہیں اور کر رہے ہیں ، یہ آزادی اظہار رائے Absolute یعنی مطلق ہے، اس پر کوئی قید، کوئی پابندی، کوئی شرط عائد نہیں ہوتی، یا یہ کہ آزادی اظہار رائے پر کچھ قیود و شرائط بھی عائد ہونی چاہئیں؟ کہنے لگے میں آپ کا مطلب نہیں سمجھا؟ تو میں نے کہا مطلب تو الفاظ سے واضح ہے۔

میں یہ آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ آپ جس آزادی اظہار رائے کی تبلیغ کرنا چاہتے ہیں، تو کیا وہ ایسی ہے کہ جس شخص کی جو رائے ہو اس کو برملا اظہار کرے، اس کی برملا تبلیغ کرے، برملا اس کی طرف دعوت دے اور اس پر کوئی روک ٹوک کوئی پابندی عائد نہ ہو، یہ مقصود ہے؟ اگر یہ مقصود ہے تو فرمایئے کہ ایک شخص یہ کہتا ہے کہ میری رائے یہ ہے کہ یہ دولت مند افراد نے بہت پیسے کمالیے اور غریب لوگ بھوکے مر رہے ہیں، لہذا ان دولت مندوں کے گھروں پر ڈاکہ ڈال کر اور ان کی دوکانوں کو لوٹ کر غریبوں کو پیسہ پہنچانا چاہیے، اگر کوئی

شخص دیانت دارانہ یہ رائے رکھتا اور اس کی تبلیغ کرے اور اس کا اظہار کرے، لوگوں کو دعوت دے کہ آیئے اور میرے ساتھ شامل ہو جایئے، اور یہ جتنے دولت مند لوگ ہیں، روزانہ ان پر ڈاکہ ڈالا کریں گے، ان کا مال لوٹ کر غریبوں میں تقسیم کیا کریں گے، تو آپ ایسی اظہار رائے کی آزادی کے حامی ہوں گے یا نہیں؟ اور اس کی اجازت دیں گے یا نہیں؟ کہنے لگے اس کی اجازت نہیں دی جائے گی کہ لوگوں کا مال لوٹ کر دوسروں میں تقسیم کر دیا جائے، تو میں نے کہا یہی میرا مطلب تھا کہ اگر اس کی اجازت نہیں دی جائے گی تو اس کا معنی یہ ہے کہ آزادی اظہار رائے اتنی Absolute اتنی مطلق نہیں ہے کہ اس پر کوئی قید، کوئی شرط، کوئی پابندی عائد نہ کی جا سکے، کچھ نہ کچھ قید شرط لگانی پڑے گی، کہنے لگے ہاں! کچھ نہ کچھ تو لگانی پڑے گی، تو میں نے کہا مجھے یہ بتایئے کہ وہ قید وشرط کس بنیاد پر لگائی جائے گی اور کون لگائے گا؟ کس بنیاد پر یہ طے کیا جائے کہ فلاں قسم کی رائے کا اظہار کرنا تو جائز ہے اور فلاں قسم کی رائے کا اظہار کرنا جائز نہیں ہے؟ فلاں قسم کی تبلیغ جائز ہے اور فلاں قسم کی تبلیغ جائز نہیں ہے؟ اس کا تعین کون کرے گا اور کس بنیاد پر کرے گا؟ اس سلسلے میں آپ کے ادارے نے کوئی علمی سروے کیا ہو اور علمی تحقیق کی ہو تو میں اس کو جاننا چاہتا ہوں، کہنے لگے کہ اس نقطہ نظر پر اس سے پہلے ہم نے غور نہیں کیا، تو میں نے عرض کیا کہ دیکھیے! آپ اتنے بڑے مشن کو لے کر چلے ہیں، پوری انسانیت کو آزادی اظہار رائے دلانے کے لیے، ان کو حقوق دلانے کے لیے چلے ہیں، لیکن آپ نے بنیادی سوال نہیں سوچا کہ آخر آزادی اظہار رائے کس بنیاد پر طے ہونی چاہیے؟ کیا اصول ہونے چاہئیں؟ کیا شرطیں اور کیا قیود ہونی چاہئیں؟ تو کہنے لگے کہ اچھا آپ ہی بتا دیجیے، تو میں نے کہا میں تو پہلے عرض کر چکا ہوں کہ میں کسی سوال کا جواب دینے بیٹھا ہی نہیں، میں تو آپ سے پوچھ رہا ہوں کہ آپ مجھے بتایئے کہ کیا قیود وشرائط ہونی چاہئیں اور کیا نہیں؟ میں نے تو آپ سے سوال کیا ہے کہ آپ کے نقطہ نظر سے اور آپ کے ادارے کے نقطہ نظر سے اس کا کیا جواب ہونا چاہیے؟

آزادی اظہار رائے کا دنیا کے پاس کوئی معیار نہیں!

کہنے لگے میرے علم میں ابھی تک ایسا فارمولا نہیں ہے، ایک فارمولا ذہن میں آتا ہے کہ ایسی آزادی اظہار رائے جس میں وائلنس (Voilence) ہو، جس میں دوسرے کے ساتھ تشدد ہو تو ایسی آزادی اظہار رائے نہیں ہونی چاہیے، میں نے کہا یہ تو آپ کے ذہن میں آیا کہ وائلنس کی پابندی بھی ہونی چاہیے، کسی اور کے ذہن میں کوئی اور بات بھی آسکتی ہے کہ فلاں قسم کی پابندی بھی ہونی چاہیے، یہ کون طے کرے گا اور کس بنیاد پر طے کرے گا کہ کس قسم کی اظہار رائے کی کھلی چھٹی ہونی چاہیے؟ کس قسم کی نہیں؟ اس کا کوئی فارمولا اور کوئی معیار ہونا چاہیے، کہنے لگے آپ سے گفتگو کے بعد یہ اہم سوال میرے ذہن میں آیا ہے اور میں اپنے ذمہ داروں تک اس کو پہنچاؤں گا اور اس کے بعد اس پر اگر کوئی لٹریچر ملا تو آپ کو بھیجوں گا، تو میں نے

کہا ان شاء اللہ میں منتظر رہوں گا کہ اگر آپ اس کے اوپر کوئی لٹریچر بھیج سکیں اور اس کا کوئی فلسفہ بتا سکیں تو میں ایک طالب علم کی حیثیت میں اس کا مشتاق ہوں، جب وہ چلنے لگے تو اس وقت میں نے ان سے کہا کہ میں سنجیدگی سے آپ سے کہہ رہا ہوں کہ اس مسئلے پر غور کیا جائے، اس کے بارے میں آپ اپنا نقطہ نظر بھیجیں، لیکن ایک بات میں آپ کو بتادوں کہ جتنے آپ کے نظریات اور فلسفے ہیں، ان سب کو مدنظر رکھ لیجیے، کوئی ایسا متفقہ فارمولا آپ پیش نہیں کرسکیں گے، جس پر ساری دنیا متفق ہو جائے کہ فلاں بنیاد پر اظہار رائے کی آزادی ہونی چاہیے اور فلاں بنیاد پر نہیں ہونی چاہیے، تو یہ میں آپ کو بتادیتا ہوں اور اگر پیش کرسکتیں تو میں منتظر ہوں، آج ڈیڑھ سال ہو گیا ہے لیکن کوئی جواب نہیں آیا۔

انسانی عقل محدود ھے

حقیقت یہ ہے کہ یہ مجمل نعرے کہ صاحب! ہیومن رائٹس ہونے چاہئیں، آزادی اظہار رائے ہونی چاہیے، تحریر وتقریر کی آزادی ہونی چاہیے، ان کی ایسی کوئی بنیاد جس پر ساری دنیا متفق ہوسکے یہ کسی کے پاس نہیں ہے اور نہ ہوسکتی ہے، کیوں؟ اس واسطے کہ جو کوئی بھی یہ بنیادیں طے کرے گا وہ اپنی سوچ اور اپنی عقل کی بنیاد پر کرے گا، اور کبھی دو انسانوں کی عقل یکساں نہیں ہوتیں، دو گروہوں کی عقلیں یکساں نہیں ہوتیں، دو زمانوں کی عقلیں یکساں نہیں ہوتیں، لہذا ان کے درمیان اختلاف رہا ہے، رہے گا اور اس اختلاف کو ختم کرنے کا کوئی راستہ نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ انسانی عقل اپنی ایک لمیٹیشن (Limitation) رکھتی ہے، اس کی حدود ہیں، اس سے آگے وہ تجاوز نہیں کرپاتی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا اس پوری انسانیت کے لیے سب سے بڑا احسان عظیم یہ ہے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ان تمام معاملات کو طے کرنے کی جو بنیاد فراہم کی ہے وہ یہ ہے کہ وہ ذات جس نے اس پوری کائنات کو پیدا کیا، وہ ذات جس نے انسانوں کو پیدا کیا، اسی سے پوچھو کہ کون سے انسانی حقوق قابل تحفظ ہیں اور کون سے انسانی حقوق قابل تحفظ نہیں؟ وہی بتا سکتا ہے، اس کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا۔

جو لوگ کہتے ہیں کہ پہلے ہمیں یہ بتاؤ کہ اسلام ہمیں کیا حقوق دیتا ہے؟ پھر ہم اسلام کو مانیں گے، میں نے کہا اسلام کو تمہاری ضرورت نہیں، اگر پہلے اپنے ذہن میں طے کرلیا کہ یہ حقوق جہاں ملیں گے وہاں جائیں گے، اور اس کے بعد پھر یہ حقوق چونکہ اسلام میں مل رہے ہیں اس واسطے میں جا رہا ہوں، تو یاد رکھو! اسلام کو تمہاری ضرورت نہیں، اسلام کا مفہوم یہ ہے کہ پہلے یہ اپنی عاجزی درماندگی اور شکستگی پیش کرو کہ ان مسائل کو حل کرنے میں ہماری عقل عاجز ہے اور ہماری سوچ عاجز ہے، ہمیں وہ بنیاد چاہیے جس کی بنیاد پر ہم مسائل کو حل کریں، جب آدمی اس نقطہ نظر سے اسلام کی طرف رجوع کرتا ہے تو پھر اسلام ہدایت ورہنمائی پیش کرتا ہے: ﴿هدى للمتقين﴾، یہ ہدایت متقین کے لیے ہے، متقین کے کیا معنی ہیں؟ متقین کے معنی یہ

ہیں کہ جس کے دل میں طلب ہو، یہ ہو کہ ہم اپنی عاجزی کا اقرار کرتے ہیں، درماندگی کا اعتراف کرتے ہیں، پھر اپنے مالک اور خالق کے سامنے رجوع کرتے ہیں کہ آپ ہمیں بتایئے کہ ہمارے لیے کیا راستہ ہے؟

لہذا یہ جو آج کی دنیا کے اندر ایک فیشن بن گیا کہ صاحب! پہلے یہ بتاؤ کہ ہیومن رائٹس کیا ملیں گے ؟ تب اسلام میں داخل ہوں گے، تو یہ طریقہ اسلام میں داخل ہونے کا نہیں ہے۔

سرکار دو عالم ﷺ نے جب اس امت کو اسلام پیغام دیا، دعوت دی تو آپ نے جتنے غیر مسلموں کو دعوت دی، کسی جگہ آپ نے یہ نہیں فرمایا کہ اسلام میں آجاؤ تمہیں فلاں فلاں حقوق مل جائیں گے ، بلکہ یہ فرمایا کہ میں تم کو اللہ جل جلالہ کی عبادت کی طرف دعوت دیتا ہوں، ''قولوا لا إله إلا الله تفلحون'' اے لوگوں! لا الہ الا اللہ کہہ دو، کامیاب ہو جاؤ گے، لہذا مادی منافع، مادی مصلحتوں اور مادی خواہشات کی خاطر اگر کوئی اسلام میں آنا چاہتا ہے تو وہ درحقیقت اخلاص کے ساتھ صحیح راستہ تلاش نہیں کر رہا ہے، لہذا پہلے وہ اپنی عاجزی کا اعتراف کرے کہ ہماری عقلیں ان مسائل کو حل کرنے سے عاجز ہیں۔

عقل اور حواس کا دائرہ کار

یاد رکھیے کہ یہ موضوع بڑا طویل ہے کہ عقل انسانی بے کار نہیں ہے، اللہ تعالی نے جو ہمیں عقل عطا فرمائی، یہ بڑی کار آمد چیز ہے، مگر یہ اس حد تک کار آمد ہے جب تک اس کو اس کی حدود میں استعمال کیا جائے اور حدود سے باہر اگر اس کو استعمال کرو گے تو وہ غلط جواب دینا شروع کر دے گی، اس کے بعد اللہ تبارک وتعالی نے ایک اور ذریعہ علم عطا فرمایا ہے، اس کا نام وحی الہی ہے، جہاں عقل جواب دے جاتی ہے اور کار آمد نہیں رہتی، وحی الہی اس جگہ پر آکر رہنمائی کرتی ہے۔

دیکھو! اللہ تبارک وتعالی نے ہمیں آنکھ دی، کان دیے، یہ زبان دی، آنکھ سے دیکھ کر ہم بہت سی چیزیں معلوم کرتے ہیں، کان سے سن کر بہت ساری چیزیں معلوم کرتے ہیں، زبان سے چکھ کر بہت ساری چیزیں معلوم کرتے ہیں، لیکن اللہ تعالی نے ہر ایک کا اپنا ایک فنکشن رکھا ہے، ہر ایک کا اپنا عمل ہے، اس حد تک وہ کام دیتا ہے، اس سے باہر نہیں دیتا، آنکھ دیکھ سکتی ہے، سن نہیں سکتی، کوئی شخص یہ چاہے کہ میں آنکھ سے سنوں تو وہ احمق ہے، کان سن سکتا ہے، دیکھ نہیں سکتا، کوئی شخص یہ چاہے کہ کان سے میں دیکھنے کا کام لوں تو وہ بے وقوف ہے، اس واسطے کہ یہ اس کام کے لیے نہیں بنایا گیا، اور ایک حد ایسی آتی ہے جہاں نہ آنکھ کام دیتی ہے، نہ کان کام دیتا ہے، نہ زبان کام دیتی ہے، اس موقع کے لیے اللہ تعالی نے عقل عطا فرمائی، وہاں عقل انسان کی رہنمائی کرتی ہے۔

کیا انسان کی رہنمائی کے لیے تنہا صرف عقل کافی نہیں؟

دیکھیے! یہ کرسی ہمارے سامنے رکھی ہے، آنکھ سے دیکھ کر معلوم کیا کہ اس کے ہینڈل زرد رنگ کے ہیں، ہاتھ سے چھو کر معلوم کیا کہ یہ چکنے ہیں، لیکن تیسرا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ یہ آیا خود بخود وجود میں آ گئی یا کسی نے اس کو بنایا؟ تو وہ بنانے والا میری آنکھوں کے سامنے نہیں ہے، اس واسطے میری آنکھ بھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتی، میرا ہاتھ بھی اس سوال کا جواب نہیں دے سکتا، اس موقع کے لیے اللہ تعالیٰ نے تیسری چیز عطا فرمائی جس کا نام عقل ہے، عقل سے میں نے سوچا کہ یہ جو ہینڈل ہے، یہ بڑے قاعدے کا بنا ہوا ہے، یہ خود سے وجود میں نہیں آ سکتا، کسی بنانے والے نے اس کو بنایا ہے، یہاں عقل نے میری رہنمائی کی ہے، لیکن ایک چوتھا سوال آگے چل کر پیدا ہوتا ہے کہ اس کرسی کو کس کام میں استعمال کرنا چاہیے؟ کس میں نہیں کرنا چاہیے؟ کہاں اس کو استعمال کرنے سے فائدہ ہوگا؟ کہاں نقصان ہوگا؟ اس سوال کو حل کرنے کے لیے عقل بھی ناکام ہو جاتی ہے، اس موقع پر اللہ تبارک وتعالیٰ نے ایک چوتھی چیز عطا فرمائی اور اس کا نام وحی الٰہی ہے، وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے وحی ہوتی ہے، وہ خیر اور شر کا فیصلہ کرتی ہے، وہ نفع اور نقصان کا فیصلہ کرتی ہے، جو بتاتی ہے کہ اس چیز میں خیر ہے، اس میں شر ہے، اس میں نفع ہے، اس میں نقصان ہے، وحی آتی ہی اس مقام پر ہے جہاں انسان کی عقل کی پرواز ختم ہو جاتی ہے، لہٰذا جب اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حکم آ جائے اور وہ اپنی عقل میں نہ آئے، سمجھ میں نہ آئے تو اس کی وجہ سے اس کو رد کرنا کہ صاحب! میری تو عقل میں نہیں آ رہا ، لہٰذا میں اس کو رد کرتا ہوں، تو یہ رَد در حقیقت اس عقل کی اور وحی الٰہی کی حقیقت ہی سے جہالت کا نتیجہ ہے، اگر سمجھ میں آتا تو وحی آنے کی ضرورت کیا تھی؟ وحی تو آئی ہی اس لیے کہ تم اپنی تنہا عقل کے ذریعہ اس مقام تک نہیں پہنچ سکتے تھے، اللہ تبارک وتعالیٰ نے وحی کے ذریعے سے تمہاری مدد فرمائی، اگر عقل سے خود بخود فیصلہ ہوتا تو اللہ تعالیٰ ایک حکم نازل کر دیتے بس کہ ہم نے تمہیں عقل دی ہے، عقل کے مطابق جو چیز اچھی لگے وہ کرو اور جو بری لگے اس سے بچ جاؤ، نہ کسی کتاب کی ضرورت، نہ کسی رسول کی ضرورت، نہ کسی پیغمبر کی ضرورت، نہ کسی مذہب اور دین کی ضرورت، لیکن جب اللہ نے اس عقل دینے کے باوجود اس پر اکتفا نہیں فرمایا، بلکہ رسول بھیجے، کتابیں اتاریں، وحی بھیجی، تو اس کے معنی یہ ہیں کہ تنہا عقل انسان کی رہنمائی کے لیے کافی نہیں تھی، آج کل لوگ کہتے ہیں کہ صاحب! ہمیں چونکہ اس کا فلسفہ سمجھ میں نہیں آیا، لہٰذا ہم نہیں مانتے تو وہ در حقیقت دین کی حقیقت سے ناواقف ہیں، حقیقت سے جاہل ہیں، سمجھ میں آ ہی نہیں سکتا۔

انسانی حقوق کا تحفظ کس طرح ہو؟

آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا کہ فلاں حق انسان کا ایسا ہے جس کا تحفظ ضروری ہے اور فلاں حق ہے جس کے تحفظ کی ضرورت نہیں ہے، اس لیے پہلے یہ سمجھ لو کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا انسانی حقوق کے سلسلے میں سب

سے بڑا کنٹری بیوشن یہ ہے کہ انسانی حقوق کے تعین کی بنیاد فراہم فرمائی کہ کونسا انسانی حق پابندی کے قابل ہے اور کونسا نہیں؟ یہ بات اگر سمجھ میں آ جائے تو اب دیکھیے کہ محمد نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کون سے حقوق انسان کو عطا فرمائے، کن حقوق کو ریکگنائز (Recognize) کیا، کن حقوق کا تعین فرمایا اور پھر اس کے اوپر عمل کر کے دکھایا، آج کی دنیا میں ریکگنائز کرنے والے تو بہت اور اس کا اعلان کرنے والے بہت، اس کے نعرے لگانے والے بہت، لیکن ان نعروں پر اور ان حقوق کے اوپر جب عمل کرنے کا سوال آ جائے تو وہی اعلان کرنے والے جو یہ کہتے ہیں کہ انسانی حقوق قابل تحفظ ہیں، جب ان کا اپنا معاملہ آ جاتا ہے، اپنے مفاد سے ٹکراؤ پیدا ہو جاتا ہے، تو دیکھیے! پھر انسانی حقوق کس طرح پامال ہوتے ہیں۔

آج کی دنیا کا حال

انسانی حقوق کا ایک تقاضا یہ ہے کہ اکثریت کی حکومت ہونی چاہیے، جمہوریت، سیکولر، ڈیموکریسی، آج امریکہ کی ایک کتاب دنیا بھر میں بہت مشہور ہو رہی ہے، ''دی اینڈ آف ہسٹری اینڈ دی لاسٹ مین'' (The end of history and the last man) آج کل کے سارے پڑھے لکھے لوگوں میں مقبول ہو رہی ہے، اس کا سارا فلسفہ یہ ہے کہ انسان کی ہسٹری کا خاتمہ جمہوریت کے اوپر ہو گیا اور اب انسانیت کے عروج اور فلاح کے لیے کوئی نیا نظریہ وجود میں نہیں آئے گا، یعنی ختم نبوت پر ہم اور آپ یقین رکھتے ہیں، اب یہ ''ختم نظریات'' ہو گیا، یہ کہ ڈیموکریسی کے بعد کوئی نظریہ انسانی فلاح کا وجود میں آنے والا نہیں ہے۔

ایک طرف تو یہ نعرہ ہے کہ اکثریت جو بات کہہ دے وہ حق ہے، اس کو قبول کرو، اس کی بات مانو، لیکن وہی اکثریت اگر الجزائر میں کامیاب ہو جاتی ہے اور انتخابات میں اکثریت حاصل کر لیتی ہے تو اس کے بعد جمہوریت باقی نہیں رہتی، پھر اس کا وجود جمہوریت کے لیے خطرہ بن جاتا ہے، تو نعرے لگا لینا اور بات ہے لیکن اس کے اوپر عمل کر کے دکھانا مشکل ہے۔

یہ نعرے لگا لینا بہت اچھی ہے کہ سب انسانوں کو ان کے حقوق ملنے چاہئیں، ان کو آزادی اظہار رائے ہونی چاہیے، لوگوں کو حق خود ارادی ملنا چاہیے، اور یہ سب کچھ صحیح، لیکن دوسری طرف لوگوں کا حق خود ارادی پامال کر کے ان کو جبر و تشدد کی چکی میں پیسا جا رہا ہے، ان کے بارے میں آواز اٹھاتے ہوئے زبان تھراتی ہے، اور وہی جمہوریت اور آزادی کے منادی کرنے والے ان کے خلاف کارروائیاں کرتے ہیں، تو بات صرف یہ نہیں ہے کہ زبان سے کہہ دیا جائے کہ انسانی حقوق کیا ہیں؟ بات یہ ہے کہ جو بات زبان سے کہو اس کو کر کے دکھاؤ، اور یہ کام کیا محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کہ آپ نے جو حق دیا اس پر عمل کر کے دکھایا۔

اسلام نے کیا انسانی حقوق دیے ؟

نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے انسانی حقوق بتائے بھی اور عمل کر کے بھی دکھایا، کیا حقوق بتائے؟ اب سنیئے!

اسلام میں جان کا تحفظ

انسانی حقوق میں سب سے پہلا حق انسان کی جان کا حق ہے، ہر انسان کی جان کا تحفظ انسان کا بنیادی حق ہے کہ کوئی اسکی جان پر دست درازی نہ کرے: ﴿لا تقتلوا النفس التی حرم اللہ إلا بالحق﴾ کسی بھی جان کے اوپر دست درازی نہیں کی جا سکتی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم دے دیا، اور کیا حکم دے دیا کہ جنگ میں جا رہے ہو، کفار سے مقابلہ ہے، دشمن سے مقابلہ ہے، اس حال میں بھی تمہیں کسی بچے پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں ہے، کسی عورت پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں، بوڑھے پر ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں، عین جہاد کے موقع پر بھی پابندی عائد کر دی گئی، یہ پابندی ایسی نہیں ہے کہ صرف زبانی جمع خرچ ہو، جیسا کہ میں نے ابھی بتایا کہ صاحب زبانی طور پر تو کہہ دیا اور تہس نہس کر دیا سارے بچوں کو بھی اور عورتوں کو بھی، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے جان نثار صحابہ کرامؓ نے اس پر عمل کر کے دکھایا، ان کا ہاتھ کسی بوڑھے پر، کسی عورت پر، کسی بچے پر نہیں اٹھا، یہ ہے جان کا تحفظ۔

اسلام میں مال کا تحفظ

مال کا تحفظ انسان کا دوسرا بنیادی حق ہے، فرمایا: ﴿لا تأکلوا أموالکم بینکم بالباطل﴾ باطل کے ساتھ ناحق طریقے سے کسی کا مال نہ کھاؤ، اس پر عمل کر کے کیسے دکھایا؟ یہ نہیں ہے کہ تاویل کر کے، توجیہ کر کے مال کھا گئے کہ جب تک اپنے مفادات وابستہ تھے اس وقت تک بڑی دیانت تھی، بڑی امانت تھی، لیکن جب معاملہ جنگ کا آ گیا، دشمنی ہو گئی، تو اب یہ ہے کہ صاحب تمہارے اکاؤنٹس منجمد کر دیے جائیں گے، تمہارے اکاؤنٹس فریز کر دیے جائیں گے، جب مقابلہ ہو گیا تو اس وقت میں حقوق انسانی غائب ہو گئے، اب مال کا تحفظ کوئی حقیقت نہیں رکھتا۔

بہر حال یہ بات کہ مال کا تحفظ ہو، محض کہہ دینے کی بات نہیں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے کر کے دکھایا، کافر کے مال کا تحفظ، دشمن کے مال کا تحفظ، جو معاہدے کے تحت ہو، یہ مال کا تحفظ ہوتا ہے۔

اسلام میں آبرو کا تحفظ

تیسرا انسان کا بنیادی حق یہ ہے کہ اس کی آبرو محفوظ ہو، آبرو کے تحفظ کا نعرہ لگانے والے بہت ہیں، لیکن یہ پہلی بار محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا کہ انسان کی آبرو کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ پیٹھ پیچھے اس کی برائی نہ کی جائے، غیبت نہ کی جائے، آج بنیادی حقوق کا نعرہ لگانے والے بہت، لیکن کوئی اس بات کا اہتمام

کرے کہ کسی کا پیٹھ پیچھے ذکر برائی سے نہ کیا جائے، غیبت کرنا بھی حرام، غیبت سننا بھی حرام، اور فرمایا کہ کسی انسان کا دل نہ توڑا جائے، یہ انسان کے لیے گناہ کبیرہ ہے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ افقہ الصحابہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ بیت اللہ شریف کا طواف فرمارہے ہیں، طواف کے دوران آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کعبہ سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا کہ اے بیت اللہ! تو کتنا مقدس ہے، کتنا معظم ہے، پھر عبداللہ بن مسعودؓ سے خطاب کر کے فرمایا کہ اے عبداللہ! یہ کعبۃ اللہ بڑا مقدس، بڑا اکرم ہے، لیکن اس کائنات میں ایک چیز ایسی ہے کہ اس کا تقدس اس کعبۃ اللہ سے بھی زیادہ ہے اور وہ چیز کیا؟ ایک مسلمان کی جان، مال اور آبرو کہ اس کا تقدس کعبہ سے بھی زیادہ ہے، اگر کوئی شخص دوسرے کی جان پر، مال پر، آبرو پر ناحق حملہ آور ہوتا ہے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرماتے ہیں کہ وہ کعبہ ڈھا دینے سے بھی زیادہ بڑا جرم ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حق دیا۔

اسلام میں معاش کا تحفظ

جو انسان کے بنیادی حقوق ہیں، وہ ہیں جان، مال اور آبرو، ان کا تحفظ ضرور ہے، پھر انسان کو دنیا میں جینے کے لیے معاش کی ضرورت ہے، روزگار کی ضرورت ہے، اس کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کسی انسان کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاسکتی ہے کہ وہ اپنی دولت کے بل بوتے پر دوسروں کے لیے معاش کے دروازے بند کرے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ اصول بیان فرمایا، ایک طرف تو یہ فرمایا، جس کو کہتے ہیں فریڈم آف کنٹریکٹ (Freedom of contract)، معاہدے کی آزادی جو چاہے معاہدہ کرو، لیکن فرمایا کہ ہر وہ معاہدہ جس کے نتیجے میں معاشرے کے اوپر خرابی واقع ہوتی ہو، ہر وہ معاہدہ جس کے نتیجے میں دوسرے آدمی پر رزق کا دروازہ بند ہوتا ہو وہ حرام ہے، فرمایا: ''لا یبیع حاضر لباد''، کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے، ایک آدمی دیہات سے مال لے کر آیا، مثلاً زرعی پیداوار، ترکاریاں لے کر شہر میں فروخت کرنے کے لیے آیا تو کوئی شہری اس کا آڑھتی نہ بنے، اس کا وکیل نہ بنے، سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں کیا حرج ہے اگر دو آدمیوں کے درمیان آپس میں معاہدہ ہوتا ہے کہ میں تمہارا مال فروخت کروں گا، تمہارے سے اجرت لوں گا، تو اس میں کیا حرج ہے؟ لیکن نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ بتلایا کہ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ جو شہری ہے، وہ مال لے کر بیٹھ جائے گا تو ذخیرہ اندوزی کرے گا اور بازار کے اوپر اپنی اجارہ داری قائم کرے گا، اس اجارہ داری قائم کرنے کے نتیجے میں دوسرے لوگوں پر معیشت کے دروازے بند ہوجائیں گے، اس لیے فرمایا کہ کوئی شہری کسی دیہاتی کا مال فروخت نہ کرے، تو کسب معاش کا حق ہر انسان کا ہے کہ کوئی بھی شخص اپنی دولت کے بل بوتے پر دوسرے کے لیے معیشت کے دروازے بند نہ کرے، یہ نہیں کہ سود کھا کھا کر، قمار (جوا) کھیل کھیل کر، گیمبلنگ کر کر کے، سٹہ کھیل کھیل کر آدمی نے اپنے لیے دولت

کے انبار جمع کر لیے اور دولت کے انباروں کے ذریعے سے وہ پورے بازار کے اوپر قابض ہو گیا، کوئی دوسرا آدمی اگر کسب معاش کے لیے داخل ہونا چاہتا ہے تو اس کے لیے دروازے بند ہیں، یہ نہیں، بلکہ کسب معاش کا تحفظ نبی کریم ﷺ نے تمام انسانوں کا بنیادی حق قرار دیا اور فرمایا:

"دعوا الناس یرزق اللہ بعضھم ببعض"

لوگوں کو چھوڑ دو کہ اللہ ان میں سے بعض کو بعض کے ذریعے رزق عطا فرمائیں گے، یہ کسب معاش کا تحفظ ہے، جتنے حقوق عرض کر رہا ہوں، یہ نبی کریم سرور دو عالم ﷺ نے متعین فرمائے اور متعین فرمانے کے ساتھ ساتھ ان پر عمل بھی کر کے دکھایا۔

اسلام اور عقیدے کا تحفظ

عقیدے اور دیانت کے اختیار کرنے کا تحفظ کہ اگر کوئی شخص، کوئی عقیدہ اختیار کیے ہوئے ہے تو اس کے اوپر کوئی پابندی نہیں ہے کہ کوئی زبردستی جا کر مجبور کر کے اسے دوسرا دین اختیار کرنے پر مجبور کرے: لا اکراہ فی الدین، دینی میں کوئی زبردستی نہیں، دین کے اندر کوئی جبر نہیں، اگر ایک عیسائی ہے تو عیسائی رہے، ایک یہودی ہے تو یہودی رہے، قانوناً اس پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی، اس کو تبلیغ کی جائے گی، دعوت دی جائے گی، اس کو حقیقت حال سمجھانے کی کوشش کی جائے گی، لیکن اس کے اوپر یہ پابندی نہیں ہے کہ زبردستی اس کو اسلام میں داخل کیا جائے۔

مرتد کے لیے سزا کیوں؟

ہاں! البتہ اگر ایک مرتبہ وہ اسلام میں داخل ہو گیا اور اسلام میں داخل ہو کر اسلام کے محاسن اس کے سامنے آ گئے، تو اب اس کو اس بات کی اجازت نہیں دی جا سکتی کہ دارالاسلام میں رہتے ہوئے وہ اس دین کو برملا چھوڑ کر ارتداد کا راستہ اختیار کرے، اس واسطے کہ اگر وہ ارتداد کا راستہ اختیار کرے گا تو اس کے معنی یہ ہیں کہ معاشرے میں فساد پھیلائے گا اور فساد کا علاج آپریشن ہوتا ہے، لہذا اس فساد کا آپریشن کر دیا جائے گا اور معاشرے میں اس کو فساد پھیلانے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔

بہر حال کسی کی عقل میں بات آئے یا نہ آئے، کسی کی سمجھ میں آئے یا نہ آئے، میں پہلے کہہ چکا ہوں کہ ان معاملات کے اندر محمد رسول اللہ ﷺ نے بنیاد فراہم فرمائی ہے، حق وہ ہے جسے اللہ مانے، حق وہ ہے جسے محمد رسول اللہ ﷺ مانیں، اس سے باہر حق نہیں ہے، اس لیے ہر شخص عقیدے کو اختیار کرنے میں شروع میں آزاد ہے، ورنہ اگر مرتد ہونا جرم نہ ہوتا تو اسلام کے دشمن اسلام کو بازیچہ اطفال بنا کر دکھلاتے، کتنے لوگ تماشا دکھانے کے لیے اسلام میں داخل ہوتے اور نکلتے، قرآن کریم میں ہے لوگ یہ کہتے ہیں صبح کو اسلام میں داخل ہو جاؤ اور شام کو کافر ہو جاؤ، تو یہ تماشہ بنا دیا گیا ہوتا، اس واسطے دارالاسلام میں داخل رہتے

ہوئے ارتداد کی گنجائش نہیں دی جائے گی، اگر واقعتاً دیانت داری سے تمہارا کوئی عقیدہ ہے تو پھر دارالاسلام سے باہر جاؤ، باہر جاکر جو چاہو کرو، لیکن دارالاسلام میں رہتے ہوئے فساد پھیلانے کی اجازت نہیں۔

خلاصہ - اسلام کے عطا کردہ پانچ بنیادی انسانی حقوق

بہرحال! یہ موضوع تو بڑا طویل ہے، لیکن پانچ مثالیں میں نے آپ حضرات کے سامنے پیش کی ہیں:

① جان کا تحفظ

② مال کا تحفظ

③ آبرو کا تحفظ

④ عقیدے کا تحفظ

⑤ کسب معاش کا تحفظ

یہ انسان کی پانچ بنیادی ضروریات ہیں، یہ پانچ مثالیں میں نے پیش کیں، لیکن ان پانچ مثالوں میں جو بنیادی بات غور کرنے کی ہے وہ یہ ہے کہ کہنے والے تو اس کے بہت ہیں لیکن اس کے اوپر عمل کر کے دکھانے والے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے غلام ہیں۔

مغربی دنیا کے نام نہاد ہیومن رائٹس

آج کہنے کے لیے ہیومن رائٹس کے بڑے شاندار چارٹر چھاپ کر دنیا بھر میں تقسیم کر دیے گئے کہ یہ ہیومن رائٹس چارٹر ہیں، لیکن یہ ہیومن رائٹس چارٹر کے بنانے والے، اپنے مفادات کی خاطر مسافر بردار طیارہ، جس میں بے گناہ افراد سفر کر رہے ہیں، اس کو گرا دیں، اس میں ان کو کوئی باک نہیں ہوتا اور مظلوموں کے اوپر مزید ظلم وستم کے شکنجے کسے جائیں، اس میں کوئی باک نہیں ہوتا، ہیومن رائٹس اسی جگہ پر مجروح ہوتے نظر آتے ہیں جہاں اپنے مفادات کے اوپر کوئی زد پڑتی ہو اور جہاں اپنے مفادات کے خلاف ہو تو وہاں ہیومن رائٹس کا کوئی تصور نہیں آتا، سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم ایسے ہیومن رائٹس کے قائل نہیں، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے ہمیں اس حقیقت کو صحیح طور پر سمجھنے کی توفیق عطا فرمائے، اور یہ جو باطل پروپیگنڈہ ہے اس کی حقیقت پہچاننے کی توفیق عطا فرمائے، یاد رکھیے! کہ بعض لوگ اس پروپیگنڈے سے مرعوب ہو کر، مغلوب ہو کر یہ معذرت خواہانہ انداز میں ہاتھ جوڑ کر یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! ہمارے ہاں تو یہ بات نہیں ہے، ہمارے ہاں تو اسلام نے فلاں حق دیا ہے، اور اس کام کے لیے قرآن وسنت کو توڑ مروڑ کر کسی نہ کسی طرح ان کی مرضی کے مطابق بنانے کی کوشش کرتے ہیں، یاد رکھیے!

﴿ولن ترضى عنك اليهود و لا النصارى حتى تتبع ملّتهم قل إن هدى الله هو الهدى﴾

یہ یہود اور نصاری آپ سے ہرگز اس وقت تک خوش نہیں ہوں گے، جب تک آپ ان کے دین کی اتباع نہیں کریں گے، لہذا جب تک اس پر نہیں آؤ گے کہ کتنا ہی کوئی اعتراض کرے، لیکن ہدایت تو وہی ہے جو اللہ تبارک وتعالی نے عطا فرمائی، جو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لے کر آئے، اس وقت تک کامیاب نہیں ہو سکتے، لہذا کبھی ان نعروں سے مرعوب اور مغلوب نہ ہوں، اللہ تبارک وتعالی ہمیں اس کی توفیق نصیب فرمائے، آمین۔

[اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۲۳۵ تا ۲۶۰]

اسلامی تحریکات

اسلامی تحریکیں کیوں ناکام ہیں؟

یہ درست ہے کہ اس راستے میں قربانیوں کی کمی نہیں، بہت سے ملکوں میں اسلام کو نافذ کرنے کے لیے جو تحریکیں چلی ہیں اور اس انداز سے چلی ہیں کہ لوگوں نے ان کے لیے اپنی جان، مال اور جذبات کی بیش بہا قربانیاں پیش کیں، سچی بات یہ ہے کہ وہ ہمارے لیے قابل فخر ہیں، مصر میں، الجزائر میں، اور دوسرے اسلامی ممالک میں جو قربانیاں دی گئیں، خود ہمارے ملک کے اندر اسلام کے نام پر، اسلامی شریعت کے نفاذ کی خاطر لوگوں نے اپنی جان و مال کی قربانیاں پیش کیں، وہ ایک ایسی مثال ہے جس پر امت بلاشبہ فخر کر سکتی ہے اور اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ آج بھی اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے دلوں میں ایمان کی چنگاری باقی ہے۔

لیکن ان ساری قربانیوں، ساری کوششوں کے باجود ایک عجیب منظر یہ نظر آتا ہے کہ کوئی تحریک ایسی نہیں ہے جو کامیابی کی آخری منزل تک پہنچی ہو، یا تو وہ تحریک بیچ میں دب کر ختم ہوگئی، یا اس کو دبا دیا گیا، یا خود وہ تحریک آگے چل کر شکست و ریخت کا شکار ہوگئی، جس کے نتیجے میں اس تحریک کے جو مطلوبہ ثمرات تھے وہ حاصل نہ ہو سکے، اب سوال یہ ہے کہ اس صورت حال کا بنیادی سبب کیا ہے؟ اس لیے کہ یہ بیداری کی تحریکیں اٹھ رہی ہیں، قربانیاں بھی دی جا رہی ہیں، وقت بھی صرف ہو رہا ہے، محنت بھی ہو رہی ہے، اس کے باوجود کامیابی کی کوئی واضح مثال سامنے نہیں آتی، ہم میں سے ہر شخص کو اس پہلو پر غور کرنے کی ضرورت ہے، میں ایک ادنیٰ طالب علم کی حیثیت سے اس پر جو غور کر سکا ہوں وہ آپ حضرات کی خدمت میں اس محفل میں پیش کرنا چاہتا ہوں، کہ اس صورت حال کے بنیادی اسباب کیا ہیں؟ اور ہم کس طرح ان کا ازالہ کر سکتے ہیں؟

اس سلسلے میں جو بات عرض کرنا چاہتا ہوں، وہ بہت نازک بات ہے، اور مجھے اس بات کا بھی خطرہ ہے کہ اگر اس نازک بات کی تعبیر میں تھوڑی سی بھی لغزش ہوئی تو وہ غلط فہمیاں پیدا کر سکتی ہے، لیکن میں یہ خطرہ مول کر ان دو پہلوؤں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں، جو میرے نزدیک اس صورت حال کا بنیادی سبب ہیں اور جن پر ہمیں سچے دل سے اور ٹھنڈے دل سے غور کی ضرورت ہے۔

غیر مسلموں کی سازشیں ہی اصل سبب نہیں

اسلامی تحریکوں کے بارآور نہ ہونے کا ایک سبب جو ہر شخص جانتا ہے وہ یہ ہے کہ غیر مسلم طاقتوں کی طرف سے اسلام اور مسلمانوں کو دبانے کی سازشیں کی جارہی ہیں، اس سبب کا مفصل تذکرہ کرنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ ہر مسلمان اس سے واقف ہے، لیکن میرا ذاتی ایمان یہ ہے کہ غیر مسلموں کی سازشیں امت مسلمہ کو نقصان پہنچانے کے لیے کبھی بھی اس وقت تک بارآور نہیں ہوسکتیں جب تک خود امت مسلمہ کے اندر کوئی خامی یا نقص موجود نہ ہو، بیرونی سازشیں ہمیشہ اس وقت کامیاب ہوتی ہے اور ہمیشہ اس وقت تباہی کا سبب بنتی ہے جب ہمارے اندر کوئی نقص آجائے، ورنہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے لے کر آج تک کوئی دور سازشوں سے خالی نہیں رہا:

ستیزہ کار رہا ہے ازل سے تا امروز
چراغ مصطفوی سے شرار بو لہبی

لہذا یہ سازش نہ کبھی ختم ہوئی اور نہ کبھی ختم ہوسکتی ہے، اللہ تعالی نے جب آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا تو اس سے پہلے ابلیس پیدا ہو چکا تھا، لہذا یہ توقع رکھنا کہ سازشیں بند ہو جائیں گی یہ توقع بڑی خودفریبی کی بات ہے۔

اب ہمارے لیے سوچنے کی بات یہ ہے کہ وہ نقص اور خرابی اور خامی کیا ہے جس کی وجہ سے یہ سازشیں ہمارے خلاف کامیاب ہورہی ہیں؟ اور یہ سوچنے کی ضرورت اس لیے ہے کہ آج جب ہم اپنی زبوں حالی کا تذکرہ کرتے ہیں تو عموماً ہم سارا الزام اور ساری ذمہ داری ان سازشوں پر ڈالتے ہیں کہ یہ فلاں کی سازش سے ہورہا ہے، یہ فلاں کا بویا ہوا بیج ہے، اور خود فارغ ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، حالانکہ سوچنے کی بات یہ ہے کہ خود ہمارے اندر کیا خرابیاں اور کیا خامیاں ہیں؟ اس سلسلے میں دو بنیادی چیزوں کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں جو میری نظر میں ان ناکامیوں کا بہت بڑا سبب ہیں۔

تحریکات میں ناکامی کا پہلا سبب

فرد کی اصلاح اور شخصیت کی تعمیر وتربیت سے غفلت

ان میں سے پہلی چیز شخصیت کی تعمیر کی طرف توجہ کا نہ ہونا ہے، اس سے میری مراد یہ ہے کہ ہر پڑھا لکھا انسان یہ بات جانتا ہے کہ اسلام کی تعلیمات زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہیں، ان میں بہت سے احکام اجتماعی نوعیت کے ہیں اور بہت سے احکام انفرادی نوعیت کے ہیں، بہت سے احکام کا خطاب پوری جماعت سے، اور بہت سے احکام کا خطاب ہر ایک فرد سے علیحدہ علیحدہ ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہا جاسکتا ہے کہ اسلامی احکام میں اجتماعیت اور انفرادیت دونوں کے درمیان ایک مخصوص توازن ہے، اس توازن کو قائم رکھا جائے تو اسلامی تعلیمات پر یکساں طور پر عمل ہوتا ہے، اور اگر ان میں سے کسی ایک کو یا تو نظر انداز کر دیا جائے، یا کسی پر ضرورت سے زیادہ زور دیا جائے اور دوسرے کی اہمیت کو کم کر دیا جائے تو اس سے اسلام کی صحیح تطبیق

سامنے نہیں آسکتی، اجتماعیت اور انفرادیت کے درمیان جو توازن ہے ہم نے اس توازن میں اپنے عمل اور اپنی فکر سے ایک خلل پیدا کر دیا ہے اور اس کے نتیجے میں ہم نے ترجیحات کی ترتیب الٹ دی ہے۔

سیکولر ازم کی تردید کے نتیجے میں اسلام کی سیاسی تعبیر

ایک زمانہ وہ تھا جس میں سیکولر ازم کے پروپیگنڈے کی وجہ سے لوگوں نے اسلام کو مسجد اور مدرسے اور نماز، روزے اور عبادات تک محدود کر لیا تھا، یعنی اسلام کو اپنی انفرادی زندگی تک محدود سمجھ لیا تھا، اور سیکولر ازم کا فلسفہ بھی یہی ہے کہ مذہب کا تعلق انسان کی انفرادی زندگی سے ہے، انسانی کی سیاسی، معاشی اور معاشرتی زندگی کسی مذہب کے تابع نہیں ہونی چاہیے، بلکہ وہ مصلحت وقت کے تابع ہونی چاہیے، اس غلط فلسفے اور غلط فکر کی تردید کے لیے ہمارے معاشرے کے اندر اہل فکر کا ایک بڑا طبقہ وجود میں آیا، جس نے اس فکر کی تردید کرتے ہوئے بجا طور پر یہ کہا کہ اسلام کے احکام، عبادات، اخلاق اور صرف انسان کی انفرادی زندگی کی حد تک محدود نہیں بلکہ وہ احکام زندگی کے ہر شعبے پر حاوی ہیں، اسلام میں اجتماعیت پر بھی اتنا ہی زور ہے جتنا انفرادیت پر ہے۔

لیکن ہم نے اس فکر کی تردید میں اجتماعیت پر اتنا زیادہ زور دیا کہ اس کے نتیجے میں انفرادی احکام پس پشت چلے گئے اور نظر انداز ہو گئے، یا کم از کم عملی طور پر غیر اہم ہو کر رہ گئے، مثلاً ایک نقطہ نظر یہ تھا کہ دین کا سیاست سے کوئی تعلق نہیں: "دع ما لقیصر لقیصر و ما للہ للہ"

یعنی جو قیصر کا حق ہے وہ قیصر کو دو، جو اللہ کا حق ہے وہ اللہ کو دو، گویا کہ دین کو سیاست میں لانے کی کوئی ضرورت نہیں اور اس طرح دین کو سیاست سے نکال دیا گیا۔

اس غلط نقطہ نظر کی تردید میں ایک اور فکر سامنے آئی، جس نے دین کے سیاسی پہلو پر اتنا زیادہ زور دیا کہ یہ سمجھا جانے لگا کہ دین کا مطمح نظر ہی ایک سیاسی نظام کا قیام ہے، یہ بات اپنی جگہ غلط نہیں تھی کہ سیاست بھی ایک ایسا شعبہ ہے جس کے بارے میں اسلام کے مخصوص احکام ہیں، لیکن اگر اس بات کو یوں کہا جائے کہ دین درحقیقت سیاست ہی کا نام ہے، یا سیاسی نظام کا نفاذ دین کا اولین مقصد ہے تو اس سے ترجیحات کی ترتیب الٹ جاتی ہے، اگر ہم اس فکر کو تسلیم کر لیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ ہم نے سیاست کو اسلامی بنانے کے لیے اسلام کو سیاسی بنا دیا، اور دین میں انفرادی زندگی کا جو حسن و جمال اور رعنائی تھی اس سے ہم نے اپنے آپ کو محروم کر دیا۔

صحابہ کرام کی شخصیت و تربیت سازی

نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حیات طیبہ زندگی کے ہر شعبے میں ہمارے لیے اسوہ حسنہ ہے، آپ کی ۲۳ سال کی نبوی زندگی دو حصوں میں تقسیم ہے، ایک مکی زندگی، اور دوسری مدنی زندگی، آپ کی مکی زندگی ۱۳ سال پر محیط ہے اور مدنی زندگی دس سال پر محیط ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مکی زندگی کو اگر آپ دیکھیں تو یہ

نظر آئے گا کہ اس میں سیاست نہیں، حکومت نہیں، قتال نہیں، جہاد نہیں، یہاں تک کہ تھپڑ کا جواب تھپڑ سے بھی نہیں بلکہ حکم یہ ہے کہ اگر دوسرا شخص تم پر ہاتھ اٹھا رہا ہے تو تمہیں ہاتھ نہیں اٹھانا ہے:

﴿واصبر وما صبرك إلا بالله ولا تحزن عليهم﴾

حالانکہ مسلمان کتنے ہی کمزور سہی، تعداد کے اعتبار سے کتنے ہی کم سہی، لیکن اتنے بھی گئے گذرے نہیں تھے کہ اگر دوسرا شخص دو ہاتھ مار رہا ہے تو اس کے جواب میں ایک ہاتھ بھی نہ مار سکیں، یا کم از کم مارنے والے کا ہاتھ بھی نہ روک سکیں، لیکن وہاں حکم یہ ہے کہ صبر کرو، یہ حکم کیوں دیا گیا اس لیے کہ اس پوری مکی زندگی کا مقصد یہ تھا کہ ایسے افراد تیار ہوں جو آگے جا کر اسلامی معاشرے کا بوجھ اٹھانے والے ہوں، تیرہ سالہ مکی زندگی کا خلاصہ یہ تھا کہ ان افراد کو بھٹی میں سلگا کر، ان کے کردار، ان کی شخصیت ان کے اعمال اور اخلاق کی تطہیر اور تزکیہ کیا جائے، ان تیرہ سال کے اندر اس کے علاوہ کوئی کام نہیں تھا کہ ان افراد کے اخلاق درست ہوں، ان کے عقائد درست ہوں، ان کے اعمال درست ہوں، ان کا کردار درست ہو، اور ان کی بہترین سیرت کی تعمیر ہو، ان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے قائم ہو جائے، تعلق مع اللہ کی دولت ان کو نصیب ہو اور اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس ان کے دلوں میں پیدا ہو جائے۔

تیرہ سال تک یہ کام ہونے کے بعد پھر مدنی زندگی کا آغاز ہوا، جس میں اسلامی ریاست بھی وجود میں آتی ہے، اسلامی قانون بھی اور اسلامی حدود بھی نافذ ہوتی ہیں، اور ایک اسلامی ریاست کے جتنے لوازم ہوتے ہیں وہ سب وجود میں آتے ہیں، لیکن ان تمام لوازم کے ہونے کے باوجود چونکہ ان افراد کو ایک مرتبہ ٹریننگ کورس سے گذارا جا چکا تھا، اس لیے کسی فرد کے حاشیہ خیال میں بھی یہ بات نہیں آتی کہ ہمارا مقصد محض اقتدار حاصل کرنا ہے، بلکہ اقتدار کے باوجود ان کا تعلق اللہ تعالیٰ سے جڑا ہوا تھا، اور وہ لوگ اقامت دین کی جدوجہد میں جہاد اور قتال میں لگے ہوئے تھے، ان کا یہ حال تاریخ میں لکھا ہے کہ یرموک کے میدان میں پڑے ہوئے صحابہ کرام کے لشکر پر تبصرہ کرتے ہوئے ایک غیر مسلم نے اپنے افسر سے کہا کہ یہ بڑے عجیب لوگ ہیں کہ: "رهبان بالليل وركبان بالنهار"

یعنی دن کے وقت میں یہ لوگ بہترین شہسوار ہیں، اور شجاعت اور جوانمردی کے جوہر دکھانے والے ہیں، اور رات کے وقت میں یہ بہترین راہب ہیں، اور اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنا رشتہ جوڑے ہوئے ہیں، اور عبادت میں مشغول رہتے ہیں، حاصل یہ کہ صحابہ کرام دو چیزوں کو ساتھ لے کر چلے، ایک جہد و عمل، اور دوسرے تعلق مع اللہ، یہ دونوں چیزیں ایک مسلمان کی زندگی کے لیے لازم اور ملزوم ہیں، اگر ان میں سے ایک کو دوسرے سے جدا کیا جائے گا تو اسلام کی صحیح تصویر سامنے نہیں آئے گی۔

ہم انفرادی اصلاح سے غافل ہوگئے

صحابہ کرام کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا کہ چونکہ اب ہم اعلیٰ اور ارفع مقام کے لیے نکل کھڑے ہوئے ہیں، ہم نے جہاد شروع کر دیا ہے اور پوری دنیا پر اسلام کا سکہ بٹھانے کے لیے جدوجہد شروع کر دی ہے، لہذا ہمیں اب تہجد پڑھنے کی کیا ضرورت ہے؟ اب ہمیں اللہ تعالیٰ کے سامنے رونے اور گڑگڑانے کی کیا حاجت ہے؟ اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق استوار کرنے اور اس کی طرف رجوع کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ کسی بھی صحابہ کے ذہن میں یہ خیال نہیں آیا، بلکہ انہوں نے ان سب چیزوں کو باقی رکھتے ہوئے جہد و عمل کا راستہ اختیار کیا، لیکن ہم نے جب سیاسی اقتدار حاصل کرنے کے لیے جہد و عمل کے راستے کو اپنایا، اور سیکولرازم کی تردید کرتے ہوئے سیاست کو اسلام کا ایک حصہ قرار دیا تو اس پر اتنا زور دیا کہ دوسرے پہلو یعنی رجوع الی اللہ یعنی اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم کرنے، اس کے حضور رونے اور گڑگڑانے، اس کے حضور جبین نیاز ٹیکنے اور اللہ تعالیٰ کی عبادت کر کے حلاوت حاصل کرنے کے پہلو کو یا تو فکری طور پر، یا کم از کم عملی طور پر نظر انداز کر گئے، اور ہم نے اپنے ذہنوں میں یہ بٹھالیا کہ اب ہمیں اس کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ ہم تو اس سے ارفع اور اعلیٰ مقاصد کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں، لہذا شخصی عبادت ایک غیر اہم چیز ہے، جسے اس اعلیٰ اور ارفع مقصد پر قربان کیا جا سکتا ہے، یا کم از کم اس کی طرف سے غفلت برتی جا سکتی ہے۔

لہذا اجتماعیت پر ضرورت سے زیادہ زور دینے کے نتیجے میں فرد کے اوپر جو احکام اللہ تعالیٰ نے عائد فرمائے تھے، ہم ان سے فکری یا عملی طور پر پہلوتہی شروع کر دیتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آج کے دور میں اٹھنے والی بیداری کی تحریکیں بڑے اخلاص اور جذبے کے ساتھ اسلام کو نافذ کرنے کے لیے کھڑی ہوتی ہیں، لیکن چونکہ یہ دوسرا پہلو نظر انداز ہو جاتا ہے، اس وجہ سے وہ تحریکیں کامیاب نہیں ہوتیں، دیکھیے! قرآن کریم نے واضح طور پر بیان فرمادیا ہے کہ: ﴿إن تنصروا الله ينصركم و يثبت أقدامكم﴾

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے امت مسلمہ کی نصرت، فتح اور ثابت قدمی کو "إن تنصروا الله" کے ساتھ مشروط کیا ہے، اور رجوع الی اللہ کے ساتھ مشروط کیا ہے، گویا کہ اللہ تعالیٰ کی مدد اس وقت آتی ہے جب انسان کا رشتہ اللہ تعالیٰ کے ساتھ مضبوط ہوتا ہے، اگر وہ رشتہ کمزور پڑ جائے تو پھر وہ انسان مدد کا مستحق نہیں رہتا۔

جو اسلامی تعلیمات فرد سے متعلق ہیں، وہ تعلیمات انسان کو اس بات پر تیار کرتی ہیں کہ اس کی اجتماعی جدوجہد صاف ستھری ہو، فرد سے متعلق تعلیمات جس میں عبادات، اخلاق، قلبی کیفیات سب چیزیں داخل ہیں، اگر انسان ان پر پوری طرح عمل پیرا نہ ہو، اور ان تعلیمات میں اس کی تربیت ناقص ہو، پھر وہ اصلاح معاشرہ کا علم لے کر کھڑا ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی کوششیں بار آور نہیں ہوتیں، اگر میں ذاتی طور پر اپنے اخلاق، کردار، اور سیرت کے اعتبار سے اچھا انسان نہیں ہوں، اور اس کے باوجود

میں اصلاح معاشرہ کا علم لے کر کھڑا ہو جاؤں، اور لوگوں کو دعوت دوں کہ اپنی اصلاح کرو، تو اس صورت میں میری بات میں کوئی وزن اور کوئی تاثیر نہیں ہوگی، لیکن جو شخص اپنی ذاتی زندگی کو، اپنی سیرت کو، اپنے اخلاق و کردار کو مجلی اور مصفی بنا چکا ہے، اور اپنی اصلاح کر چکا ہے، پھر وہ دوسروں کو اصلاح کی دعوت دیتا ہے تو اس کی بات میں وزن بھی ہوتا ہے، پھر وہ بات صرف کان تک نہیں پہنچتی بلکہ دل پر جا کر اثر انداز ہوتی ہے، اس لیے جب ہم اپنے اخلاق کو سنوارے بغیر دوسروں کی اصلاح کی فکر لے کر نکل کھڑے ہوتے ہیں تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب فتنوں کا سامنا ہوتا ہے، اس وقت ہتھیار ڈالتے چلے جاتے ہیں، اور بلند اخلاق و کردار کا مظاہرہ نہیں کرتے، نتیجے میں حب مال، حب جاہ کے فتنوں میں گرفتار میں ہو جاتے ہیں، پھر آگے چل کر اصل مقصد تو پیچھے رہ جاتا ہے اور کریڈٹ لینے کا شوق آگے آجاتا ہے، پھر ہماری ہر نقل و حرکت کے گرد یہ بات گھومتی ہے کہ کس کام کے کرنے سے مجھے کتنا کریڈٹ حاصل ہوگا؟ جس کے نتیجے میں کاموں کے چناؤ کے بارے میں ہمارے فیصلے غلط ہو جاتے ہیں اور ہم منزل مقصود تک نہیں پہنچ پاتے۔

پہلے اپنی اصلاح کی فکر ضروری ہے

اسی سلسلے میں قرآن کریم کی آیت اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایک ارشاد ہے، جو عام طور پر ہماری نظروں سے اوجھل رہتا ہے، آیت کریمہ یہ ہے کہ:

﴿يا أيها الذين امنوا عليكم أنفسكم لا يضركم من ضل إذا اهتديتم إلى الله مرجعكم جميعا فينبئكم بما كنتم تعملون﴾ [مائدة:١٠٥]

اے ایمان والو! تم اپنی خبر لو، (اپنے آپ کو درست کرنے کی فکر کرو) اگر تم راہ راست پر آ گئے تو جو لوگ گمراہی کے راستے پر جا رہے ہیں وہ تمہارا کچھ بگاڑ نہیں سکتے، تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتے، اللہ ہی کی طرف تم سب کو لوٹ کر جانا ہے، وہ اس وقت تم کو بتائے گا کہ تم دنیا میں کیا عمل کرتے رہے۔

انفرادی اصلاح کی بنا پر کیا امر بالمعروف اور نہی عن المنکر چھوڑ دیں؟

روایات میں آتا ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو ایک صحابیؓ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سوال کیا کہ یا رسول اللہ! یہ آیت تو بتا رہی ہے کہ اپنی اصلاح کی فکر کرو، اگر دوسرے لوگ گمراہ ہو رہے ہیں تو ان کی گمراہی تمہیں کچھ نقصان نہیں پہنچائے گی، تو کیا ہم دوسروں کو امر بالمعروف اور نہی عن المنکر نہ کریں؟ دعوت و تبلیغ کا کام نہ کریں؟ جواب میں نبی کریم و نے ارشاد فرمایا: ایسا نہیں ہے، تم تبلیغ و دعوت کا کام کرتے رہو، اس کے بعد آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ حدیث ارشاد فرمائی:

إذا رأيت شحا مطاعا ، وهوى متبعا ، ودنيا مؤثرة ، وإعجاب كل

ذی رأی برأیه فعلیك بخاصة نفسك ودع عنك أمر العامة

جب تم معاشرے کے اندر چار چیزیں پھیلی ہوئی دیکھو، ایک یہ کہ جب مال کی محبت کے جذبے کی اطاعت کی جا رہی ہو، ہر انسان جو کچھ کر رہا ہو وہ مال کی محبت سے کر رہا ہو، دوسرے یہ کہ خواہشات نفس کی پیروی کی جا رہی ہو، تیسرے یہ کہ دنیا ہی کو ہر معاملے میں ترجیح دی جا رہی ہو، چوتھے یہ کہ ہر ذی رائے شخص اپنی رائے پر گھمنڈ میں مبتلا ہو جائے، ہر شخص اپنے آپ کو عقل کل سمجھ کر دوسرے کی بات سننے سمجھنے سے انکار کرے تو تم اپنی جان کی فکر کرو، اپنے آپ کو درست کرنے کی فکر اور عام لوگوں کے معاملے کو چھوڑ دو۔

بگڑے ہوئے معاشرے میں کیا طرز عمل اختیار کیا جائے؟

اس حدیث کا مطلب بعض حضرات نے تو یہ بیان فرمایا کہ ایک وقت ایسا آئے گا کہ جب کسی انسان پر دوسرے انسان کی نصیحت کارگر نہیں ہوگی، اس لیے اس وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر اور دعوت وتبلیغ کا فریضہ ساقط ہو جائے گا، بس اس وقت انسان اپنے گھر میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرے، اور اپنے حالات کی اصلاح کی فکر کے اور کچھ کرنے کی ضرورت نہیں، دوسرے علما نے اس حدیث کا دوسرا مطلب بیان کیا ہے، وہ یہ کہ اس حدیث میں اس وقت کا بیان ہو رہا ہے جب معاشرے میں چاروں طرف بگاڑ پھیل چکا ہو، اور ہر شخص اپنی ذات میں اتنا مست ہو کہ دوسرے کی بات سننے کو تیار نہ ہو تو ایسے وقت اپنے آپ کی فکر کرو، اور عام لوگوں کے معاملے کو چھوڑ دو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کو بالکلیہ چھوڑ دو، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس وقت ''فرد'' کی اصلاح کی طرف ''اجتماع'' کی اصلاح کے مقابلے میں توجہ زیادہ دو، کیونکہ ''اجتماع'' درحقیقت ''افراد'' کے مجموعے ہی کا نام ہے، اگر ''افراد'' درست ہیں تو ''اجتماع'' خود بخود درست ہو جائے گا، لہذا اس بگاڑ کو ختم کرنے کا طریقہ درحقیقت انفرادی اصلاح اور انفرادی جد و جہد کا راستہ اختیار کرنے میں ہے، جس سے شخصیتوں کی تعمیر ہو، اور جب شخصیتوں کی تعمیر ہوگی تو معاشرے کے اندر خود بخود ایسے افراد کی تعداد میں اضافہ ہوگا جو خود با اخلاق اور با کردار ہوں گے، جس کے نتیجے میں معاشرے کا بگاڑ رفتہ رفتہ ختم ہو جائے گا، لہذا یہ حدیث دعوت وتبلیغ کو منسوخ نہیں کر رہی، بلکہ اس کا ایک خود کار طریقہ بتا رہی ہے۔

بہرحال میں یہ عرض کر رہا تھا کہ ہماری ناکامیوں کا بڑا اہم سبب میری نظر میں یہ ہے کہ ہم نے ''اجتماع'' کو درست کرنے کی فکر میں ''فرد'' کو کھو دیا ہے، اور اس فکر میں کہ ہم پورے معاشرے کی اصلاح کریں گے، ''فرد'' کی اصلاح کو بھول گئے ہیں، اور ''فرد'' کو بھولنے کے معنی یہ ہیں کہ ''فرد'' کو مسلمان بننے کے لیے جن تقاضوں کی ضرورت تھی، جس میں عبادات بھی داخل ہیں، جس میں تعلق مع اللہ بھی داخل ہے، جس میں اخلاق کا تزکیہ بھی داخل ہے، اور جس میں ساری تعلیمات پر عمل بھی داخل ہے، وہ سب پیچھے جا چکے ہیں، لہذا جب تک ہم اس کی طرف واپس لوٹ کر نہیں آئیں گے، اس وقت تک یہ تحریکیں اور ہماری یہ ساری

کوششیں کامیاب نہیں ہوں گی، امام مالکؒ فرماتے ہیں:

"لن يصلح آخر هذه الأمة بما صلح به أولها"

اس امت کے آخری زمانے کی اصلاح بھی اسی طرح ہوگی، جس طرح پہلے زمانے کی اصلاح ہوئی تھی، اس کے لیے کوئی نیا فارمولا وجود میں نہیں آئے گا، اور پہلے زمانے یعنی صحابہ کرام کے زمانے میں بھی فرد کی اصلاح کے راستے سے معاشرے کی اصلاح ہوئی تھی، لہذا اب بھی اصلاح کا وہی راستہ اختیار کرنا ہوگا۔

آج ہماری توجہ سیاست کی طرف بھی ہے، معیشت کی طرف بھی ہے، معاشرت کی طرف بھی ہے، لیکن فرد کی تعمیر کے لیے اور فرد کی اصلاح کے لیے ادارے نایاب ہیں اِلا ماشاء اللہ، اس وجہ سے آج ہماری تحریکیں کامیاب نہیں ہورہی ہیں، کسی نہ کسی مرحلے پر جاکر ناکام ہوجاتی ہیں، یہ ناکامی بعض اوقات اس لیے ہوتی ہے کہ یا تو خود بخود ہمارے آپس میں پھوٹ پڑ جاتی ہے، اور لڑائی جھگڑا شروع ہوجاتا ہے، اس کی ایک افسوس ناک مثال ہمارے سامنے موجود ہے، افغان جہاد ہماری تاریخ کا انتہائی تابناک باب ہے جس کے مطالعے سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ:

ایسی چنگاری بھی یارب میری خاکستر میں تھی

لیکن کامیابی کی منزل تک پہنچنے کے بعد جو صورت حال ہورہی ہے اس کو کسی دوسرے کے سامنے ذکر کرتے ہوئے بھی شرم معلوم ہوتی ہے:

منزل سے دور رہرو منزل تھا مطمئن

منزل قریب آئی تو گھبرا کے رہ گیا

آج جس طرح ہمارے افغان بھائیوں کے اندر خانہ جنگی ہورہی ہے، اس پر ہر مسلمان کا دل رو رہا ہے، یہ سب کچھ کیوں ہوا؟ اس لیے کہ اس جدوجہد کے جو تقاضے تھے وہ ہم نے پورے نہیں کیے، اگر وہ تقاضے پورے کیے ہوتے تو یہ ممکن نہیں تھا کہ اس منزل پر پہنچنے کے بعد دنیا کے سامنے جگ ہنسائی کا سبب بنتے، بہر حال یہ ساری تحریکیں بالآخر اس مرحلے پر جاکر رک جاتی ہیں کہ ان میں فرد کی تعمیر کا حصہ نہیں ہوتا اور ان میں شخصیت کو نہیں سنوارا جاتا، جس کی وجہ سے وہ تحریکیں آگے جاکر ناکام ہوجاتی ہیں۔

تحریکات میں ناکامی کا دوسرا سبب

اسلام کے عملی نفاذ اور تطبیقی پہلو سے عدم توجہ

ہماری ناکامی کا دوسرا سبب میری نظر میں یہ ہے کہ اسلام کے تطبیقی پہلو پر ہمارا کام یا تو مفقود ہے، یا کم از کم ناکافی ہے، اس سے میری مراد یہ ہے کہ ایک طرف تو ہم نے اجتماعیت پر اتنا زور دیا کہ عملاً اسی کو اسلام کا کل قرار دے دیا، اور دوسری طرف اس پہلو پر کماحقہ غور نہیں کیا کہ آج کے دور میں اس تطبیق کا طریقہ

کار کیا ہوگا؟ اس سلسلے میں نہ تو ہم نے کما حقہ غور کیا اور نہ اس کے لیے کوئی منضبط لائحہ عمل تیار کیا، اور اگر کوئی لائحہ عمل تیار کیا تو وہ ناکافی تھا، میں یہ نہیں کہتا کہ۔ خدا نہ کرے۔ اسلام اس دور میں قابل عمل نہیں ہے، اسلام کی تعلیمات کسی بشری ذہن کی پیداوار نہیں، یہ اس مالک الملک والملکوت کے احکام ہیں جس کے علم وقدرت سے زمان ومکان کا کوئی حصہ خارج نہیں، لہذا جو شخص اسلام کو اس دور میں نا قابل عمل قرار دے، وہ دائرہ اسلام میں نہیں رہ سکتا، لیکن ظاہر ہے کہ اسلام کو اس دور میں برپا اور نافذ کرنے کے لیے کوئی طریق کار اختیار کرنا ہوگا، اس طریق کار کے بارے میں سنجیدہ تحقیق اور حقیقت پسندانہ غور وفکر اور تحقیق کی کمی ہے۔

اسلام کی تطبیق کا طریقہ کیا ہو؟

ہم اسلام کے لیے کام کر رہے ہیں، اس لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور اس کے عملی نفاذ کے لیے تحریک چلا رہے ہیں، لیکن تحریک چلانے سے پہلے اور تحریک کے دوران سب کے ذہنوں میں یہ بات ہو کہ اسلام کے نفاذ کے معنی یہ ہیں کہ قرآن وسنت کو نافذ کر دیں گے، اور یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہمارے پاس فتاوی عالمگیری موجود ہے، اس کو سامنے رکھ کر فیصلے کر دیے جائیں گے، ہم اس معصوم تصور کو ذہنوں میں رکھ کر آگے بڑھتے ہیں، لیکن یہ بات یاد رکھیے کہ کسی اصول کا ابدی ہونا الگ بات ہے اور مختلف حالات اور مختلف زمانوں میں اس اصول کی تطبیق دوسری بات ہے، اسلام نے جو احکام، جو تعلیمات، جو اصول ہمیں عطا فرمائے وہ ابدی اور سرمدی ہیں اور ہر دور کے اندر کار آمد ہیں، لیکن ان کو نافذ کرنے اور برسر کار لانے کے لیے ہر دور، ہر زمانے کے تقاضے مختلف ہوتے ہیں، مثلاً مسجد پہلے بھی بنتی تھی، آج بھی بن رہی ہے، لیکن پہلے کھجور کے پتوں اور شہتیروں سے بنتی تھی، آج سیمنٹ اور لوہے سے بنتی ہے، تو دیکھیے! مسجد بننے کا اصول اپنی جگہ قائم ہے لیکن اس کے طریق کار بدل گئے، یا مثلاً قرآن کریم نے فرمایا: ﴿ وأعدوا لهم ما استطعتم من قوة ﴾

یعنی مخالفین کے لیے جتنی قوت ہو سکے تیار کرلو، لیکن پہلے زمانے میں وہ قوت تیز تلوار اور کمان کی شکل میں ہوتی تھی، اور اب وہ قوت بم، توپ، جہاز اور جدید اسلحہ کی شکل میں ہے، لہذا ہر دور کے لحاظ سے تطبیق کے طریقے مختلف ہوتے ہیں۔

اسی طرح جب اسلامی احکام کو موجودہ زندگی پر نافذ کیا جائے گا تو یقیناً اس کا کوئی طریق کار متعین کرنا ہوگا، اب دیکھنا یہ ہے کہ وہ تطبیق کا طریقہ کیا ہوگا؟ اور آج ہم اسلام کے ان ابدی اور سرمدی اصولوں کو کس طرح نافذ کریں گے؟ اس کے بارے میں ہم ابھی تک ایسا سمجھا لائحہ عمل تیار نہیں کر سکے جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکیں کہ یہ پختہ طریق کار ہے، اس کے لیے کوششیں بلا شبہ پورے عالم اسلام میں اور خود ہمارے ملک میں ہو رہی ہیں، لیکن کسی کوشش کو یہ نہیں کہا جا سکتا کہ وہ حتمی اور آخری ہے، اور چونکہ ایسا لائحہ عمل موجود نہیں ہے اس لیے اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ اگر کسی تحریک کے چلنے کے نتیجے میں فرض کرو اقتدار حاصل بھی ہو گیا تو

اس کے بعد اسلام کے احکام اور اصولوں کو پوری طرح نافذ اور برپا کرنے میں شدید مسائل پیدا ہوں گے۔

"اسلام کی نئی تعبیر" کا نقطہ نظر غلط ہے

اس سلسلے میں ایک نقطہ نظر یہ ہے کہ چونکہ اس دور کے اندر ہمیں اسلام کو نافذ کرنا ہے اور یہ دور پہلے مقابلے میں بہت بدلا ہوا ہے، اس لیے اس زمانے میں اسلام کو عملی طور پر نافذ کرنے کے لیے اسلام کی "نئی تعبیر" کی ضرورت ہے، اور بعض حلقوں کی طرف سے اس نئی تعبیروں کا مظاہرہ اس طرح ہو رہا ہے کہ اس زمانے میں جو کچھ ہو رہا ہے اس کو اسلام کی طرف سے سند جواز دے دی جائے، مثلاً سود کو حلال قرار دے دیا جائے، قمار کو حلال قرار دے دیا جائے، شراب کو حلال قرار دے دیا جائے، بے پردگی کو حلال قرار دے دیا جائے، گویا کہ اس طرح ان سب حرام چیزوں کو حلال قرار دینے کے لیے قرآن وحدیث کی نئی تعبیر کی جائے۔

یہ نقطہ نظر غلط ہے، اس لیے کہ اس کا حاصل یہ نکلتا ہے کہ جو کچھ آج ہو رہا ہے، وہ سب ٹھیک ہے، اور اسلام کے نافذ ہونے کے معنی صرف یہ ہیں کہ اقتدار مسلمانوں کے ہاتھ میں آجائے، اور جو کچھ مغرب کی طرف سے ہمیں پہنچا ہے وہ جوں کا توں باقی اور جاری رہے، اس میں کسی تبدیلی کی ضرورت نہیں ہے، اگر اس نقطہ نظر کو درست مان لیا جائے تو پھر اسلام کے نفاذ کی جدوجہد ہی بے معنی ہو کر رہ جاتی ہے۔

لہٰذا موجودہ دور میں اسلام کی تطبیق کے طریقے سوچنے کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اسلام پر عملی جراحی شروع کر دیا جائے اور اس میں کتر بیونت کر کے اسے مغربی تصورات کے سانچے میں ڈھال دیا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اسلام کے تمام اصول اور احکام اپنی جگہ باقی رہیں، ان کے اندر کوئی تبدیلی نہ کی جائے لیکن یہ بات طے کی جائے کہ جب ان اصولوں کو اس دور میں برپا کیا جائے گا تو اس صورت میں اس کا عملی طریق کار کیا ہوگا؟ مثلاً تجارت کے بارے میں تمام فقہی کتابوں میں اسلامی اصول اور اسلامی احکام بھرے ہوئے ہیں، لیکن موجودہ دور میں تجارت کے جو نت نئے مسائل پیدا ہوئے ہیں، ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں ان کا صریح جواب موجود نہیں، ان مسائل کا جواب قرآن وسنت اور فقہ اسلامی کے مسلم اصولوں کی روشنی میں تلاش کرنا ہوگا، اس بارے میں ابھی ہمارا کام ادھورا اور ناقص ہے، جب تک اس کام کی تکمیل نہیں ہو جاتی، اس وقت تک ہم پوری طرح کامیاب نہیں ہو سکتے، اسی طرح سیاست سے متعلق بھی اسلامی احکام اور اصول موجود ہیں، لیکن ہمارے دور میں جب ان اسلامی احکام کو نافذ کیا جائے گا تو اس کی عملی صورت کیا ہوگی؟ اس بارے میں بھی ہمارا کام ابھی تک ناقص اور ادھورا ہے، اس نقص کی وجہ سے بھی ہم بعض اوقات ناکامیوں کے شکار ہو جاتے ہیں۔

خلاصہ

بہر حال میری نظر میں مندرجہ بالا دو بنیادی سبب ہیں، اور دونوں کا تعلق درحقیقت فکری اسباب سے ہے:

① پہلا سبب: فرد کی اصلاح اور شخصیت کی تعمیر کی طرف سے غفلت اور اس اصلاح کے بغیر اجتماعی امور میں داخل ہو جانا۔

② دوسرا سبب: اسلام کے تطبیقی پہلو پر جس سنجیدگی اور متانت سے تحقیق کی ضرورت ہے، اس کا ناکافی ہونا۔

یہ دو اسباب ہیں، اگر ہم ان کو سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں اور ان کے ازالے کی فکر ہمارے دلوں میں پیدا ہو جائے اور ہم ان کا بہتر طور پر ازالہ کر سکیں تو پھر امید ہے کہ ان شاء اللہ ہماری تحریکیں کامیاب ہوں گی، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے وہ دن دکھائے جب یہ بیداری کی تحریکیں صحیح معنی میں کامیاب ہوں۔

[اصلاحی خطبات، ج ۶ ص ۲۵۵، ۲۷۱]

سیاست و حکومت

اسلام اور سیکولر نظام میں کیا فرق ہے ؟

اسلام اور ایک سیکولر نظام حیات میں یہی فرق ہے کہ سیکولر نظام میں علم کے پہلے دو ذرائع (حواس خمسہ اور عقل) استعمال کرنے کے بعد رک جاتے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ انسان کے پاس علم کے حصول کا کوئی تیسرا ذریعہ نہیں ہے، بس ہماری آنکھ، کان، ناک ہے اور ہماری عقل ہے، اس سے آگے کوئی اور ذریعہ علم نہیں ہے اور اسلام یہ کہتا ہے کہ ان دونوں ذرائع کے آگے تمہارے پاس ایک اور ذریعہ علم بھی ہے اور وہ ہے ''وحی الٰہی''۔ [اصلاحی خطبات، ج۱، ص۲۶]

اسلام اور سیکولرازم میں بنیادی فرق یہ ہے کہ اسلام یہ کہتا ہے کہ بیشک تم عقل کو استعمال کرو، لیکن صرف اس حد تک جہاں تک وہ کام دیتی ہے، ایک سرحد ایسی آتی ہے جہاں عقل کام دینا چھوڑ دیتی ہے بلکہ غلط جواب دینا شروع کر دیتی ہے، جیسے کمپیوٹر ہے، اگر آپ اس کو اس کام میں استعمال کریں جس کے لیے وہ بنایا گیا ہے تو وہ فورا جواب دے دے گا، لیکن جو چیز اس کمپیوٹر میں فیڈ نہیں کی گئی، وہ اگر اس سے معلوم کرنا چاہیں تو نہ صرف یہ کہ وہ کمپیوٹر کام نہیں کرے گا بلکہ غلط جواب دینا شروع کر دے گا، اسی طرح جو چیز اس عقل کے اندر فیڈ نہیں کی گئی، جس چیز کے لیے اللہ تعالی نے انسان کو ایک تیسرا ذریعہ علم عطا فرمایا ہے جو وحی الٰہی ہے، جب وہاں عقل کو استعمال کروگے تو یہ عقل غلط جواب دینا شروع کر دے گی، یہی وجہ ہے جس کی وجہ سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لائے، جس کے لیے قرآن کریم اتارا گیا، چنانچہ قرآن کریم کی آیت ہے کہ:

﴿إنا أنزلنا إليك الكتاب بالحق لتحكم بين الناس﴾ [سورة النساء].

ہم نے آپ کے پاس یہ کتاب بھیجی جس سے واقع کے موافق آپ لوگوں کے درمیان فیصلہ کریں۔

یہ قرآن کریم آپ کو بتائے گا کہ حق کیا ہے اور ناحق کیا ہے؟ یہ بتائے گا کہ صحیح کیا ہے اور غلط کیا ہے؟ یہ بتائے گا کہ خیر کیا ہے اور شر کیا ہے؟ یہ سب باتیں آپ کو محض عقل کی بنیاد پر نہیں معلوم ہو سکتیں۔

[اصلاحی خطبات، ج۱، ص۳۲]

سیکولر ڈیمو کریسی (لادینی جمہوریت) کا نظریہ کیا ہے ؟

اس نظریہ زندگی کا خلاصہ یہ ہے کہ جہاں تک زندگی کے اجتماعی کام ہیں، مثلاً معیشت اور سیاست وغیرہ یہ ہر مذہب سے آزاد ہیں، اور انسان اپنی عقل، تجربہ، مشاہدہ کے ذریعہ جس طریقے کو پسند کرلیں وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے، مذہب کی ان کے اوپر کوئی بالادستی نہیں ہونی چاہیے، اور جہاں تک ذاتی زندگی کا سوال ہے، تو جو شخص جس مذہب میں سکون پائے وہ مذہب اختیار کرلے، کسی دوسرے کو یہ کہنے کا حق نہیں کہ تمہارا یہ مذہب باطل ہے، ہر شخص اپنے مذہب پر عمل کرنے میں آزاد ہے، اس وجہ سے نہیں کہ وہ حق ہے بلکہ اس وجہ سے کہ اس میں اس کو راحت وسکون میسر آتا ہے، دوسرے الفاظ میں یوں کہہ سکتے ہیں کہ مذہب کا تصور آج مغربی نظریات کے تحت یہ ہے کہ ''مذہب کی کوئی حقیقت نہیں، بلکہ لطف وسکون کے حصول کا ایک ذریعہ ہے''، لہذا ایک شخص کو اگر اپنے دنیاوی مشاغل سے فرصت کے وقت بندروں کے تماشے کو دیکھ کر ذہنی سکون ملتا ہے تو اس کے لیے بندروں کا تماشہ اچھی چیز ہے، اور جس طرح بندروں کے تماشے کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، اسی طرح اگر کسی کو مسجد میں جا کر نماز پڑھنے میں لطف آتا ہے اور سکون ملتا ہے تو اس کے لیے یہی طریقہ مناسب ہے، لیکن اس کا حقیقی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، یعنی اس سے بحث نہیں کہ مسجد میں جا کر نماز پڑھنا فی نفسہ حق ہے یا باطل؟ (العیاذ باللہ) یہ وہ تصور ہے جو اس وقت پوری مغربی دنیا کے اوپر چھایا ہوا ہے، اور اس کا دوسرا نام ''سیکولر ڈیمو کریسی'' یعنی لادینی جمہوریت ہے۔

اور اب تو یہ کہا جا رہا ہے کہ دنیا کے اندر ہر نظام فیل ہو گیا، ہر نظریہ ناکام ہو گیا ہے، اب صرف آخری نظریہ جو کبھی فیل ہونے والا نہیں ہے وہ یہی سیکولر ڈیمو کریسی ہے، جب سوویت یونین کا زوال ہوا تو اس وقت مغرب میں بہت خوشی کے شادیانے بجائے گئے اور باقاعدہ ایک کتاب شائع کی گئی جو ساری دنیا کے اندر بڑی دل چسپی کے ساتھ پڑھی جاتی ہے، لاکھوں کی تعداد میں اس کے نسخے فروخت ہو چکے ہیں اور اس کو اس دور کی عظیم ترین کتاب کی حیثیت سے متعارف کرایا جا رہا ہے، یہ کتاب امریکی وزارت خارجہ کے ایک ترجمان نے ایک تحقیقی مقالے کی شکل میں لکھی ہے جس کا نام ہے (The end of the history and the last man) یعنی تاریخ کا خاتمہ اور آخری آدمی، اس کتاب کا خلاصہ یہ ہے کہ سوویت یونین کے خاتمہ پر ایک تاریخ کا خاتمہ ہو گیا ہے اور آخری انسان جو ہر لحاظ سے مکمل ہے وہ وجود میں آ گیا ہے، یعنی سیکولر ڈیمو کریسی کا نظریہ ثابت ہو گیا ہے اور اب رہتی دنیا تک اس سے بہتر کوئی نظام یا نظریہ وجود میں نہیں آئے گا۔ [اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۳۱۰]

مغرب نے سیکولر ڈیمو کریسی کو بزور شمشیر پھیلایا

جب مغربی استعمار نے اسلامی ملکوں پر اپنا تسلط جمایا تو اس نے اس لادینی جمہوریت کا تصور بھی پھیلایا، اور بزور شمشیر پھیلایا، مسلمانوں پر یہ الزام تھا کہ انہوں نے اسلام تلوار کے زور پر پھیلایا، حالانکہ خود

مغرب نے اپنا ڈیموکریسی کا نظام زبردستی اور بزور شمشیر پھیلایا ہے، اسی کی طرف اکبر مرحوم نے اپنے مشہور قطعے میں اشارہ کیا تھا کہ:

اپنے عیبوں کی کہاں آپ کو کچھ پروا ہے
غلط الزام بھی اوروں پہ لگا رکھا ہے
یہی فرماتے رہے تیغ سے پھیلا اسلام
یہ نہ ارشاد ہوا توپ سے کیا پھیلا ہے

توپ وتفنگ کے بل بوتے پر انہوں نے پہلے سیاسی تسلط قائم کیا، اس کے بعد رفتہ رفتہ سیاسی اور معاشی اداروں سے دین کا رابطہ توڑا، اور اس رابطے کو توڑنے کے لیے ایسا تعلیمی نظام وجود میں لائے جو ہندوستان میں لارڈ میکالے نے متعارف کرایا، اور کھل کھلا یہ کہہ کر متعارف کرایا کہ ہم ایک ایسا نظام تعلیم بروئے کار لانا چاہتے ہیں جس سے ایسی نسل پیدا ہو جو رنگ وزبان کے اعتبار سے تو ہندوستانی ہو، لیکن فکر اور مزاج کے اعتبار سے خالص انگریز ہو، بالآخر وہ اس تعلیمی نظام کو رائج کرنے میں کامیاب ہو گئے جس نے دین کا رشتہ، سیاست، معیشت، اقتصاد اور زندگی کے دوسرے شعبوں سے کاٹ دیا اور مذہب کو محدود کر دیا۔

[اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۳۱۱]

ہڑتال، بھوک ہڑتال اور جلوس کی شریعت میں کیا حیثیت ہے؟

حکومت کی تبدیلی، حکومت سے کوئی جائز مطالبہ منوانے یا اس سے اپنے حقوق حاصل کرنے کا پر امن طریقہ کیا ہو سکتا ہے؟ اور ان اغراض کے لیے آج کل کی سیاسی تحریکوں میں ہڑتال، بھوک ہڑتال، جلوس وغیرہ کے جو طریقے رائج ہیں، شرعی اعتبار سے وہ کس حد تک جائز ہیں؟

صورت حال یہ ہے کہ آج کل ہماری زندگی کا سارا ڈھانچہ بالخصوص سیاسی زندگی کا ڈھانچہ، پچھلی چند صدیوں میں مغربی افکار کی بنیاد پر تعمیر ہو رہا ہے، اس لیے بہت سی باتیں سیاسی زندگی کا لازمی حصہ سمجھ لی گئی ہیں، انہی میں سے احتجاج کے یہ طریقے بھی داخل ہیں، یعنی ہڑتالیں، جلوس، توڑ پھوڑ وغیرہ جس کے ذریعے حکومت کا پہیہ جام کر کے اس کو بالآخر اس بات پر مجبور کیا جاتا ہے کہ وہ مطالبات تسلیم کر لے۔

اس قسم کی سیاسی تحریکوں کی شرعی حیثیت کے بارے میں گذارش یہ ہے کہ ان میں سے بعض طریقے تو بالکل حرام اور ناجائز ہیں، مثلاً بھوک ہڑتال جو خودکشی کی حد تک پہنچ جائے، یا کوئی بھی ایسا طریقہ جس سے کسی کی جان، مال، یا آبرو پر حملہ کیا جاتا ہو، یا سرکاری املاک کو نقصان پہنچایا جاتا ہو، کیونکہ سرکاری املاک درحقیقت حکمرانوں کی نہیں، بلکہ ملک کے تمام باشندوں کی اجتماعی ملکیت ہوتی ہیں، اور انہیں نقصان پہنچانے سے پوری قوم کا حق پامال ہوتا ہے، اور یہ ایسا گناہ ہے کہ اس کی معافی بہت مشکل ہے،

کیونکہ اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے جن کے بارے میں اصول یہ ہے کہ وہ صرف توبہ سے معاف نہیں ہوتے، بلکہ صاحب حق کا معاف کرنا ضروری ہے، اور سرکاری املاک میں صاحب حق پوری قوم ہوتی ہے اور انسان کے لیے یہ بات تقریباً ناممکن ہے کہ وہ قوم کے ہر ہر فرد سے معافی مانگے، اس لیے ایسی املاک کو نقصان پہنچانے کا معاملہ شخصی املاک سے زیادہ سنگین ہے۔

جہاں تک عام ہڑتال کا تعلق ہے تو فی نفسہ اس کا حکم یہ ہے کہ حکومت کے کسی عمل پر ناراضگی یا احتجاج کے اظہار کے لیے اگر لوگوں سے یہ اپیل کی جائے کہ وہ اپنا کاروبار بند رکھیں، اور اس پر عمل کرنے کے لیے کسی شخص پر کوئی جبر نہ کیا جائے تو تنہا اس اپیل میں، یا اس اپیل پر خوش دلی سے عمل کرنے میں شرعاً کوئی گناہ نہیں، اور ایسی ہڑتال ایک مباح تدبیر کے درجہ میں فی نفسہ جائز ہے، بشرطیکہ اس میں ایسے استثنا بھی رکھے جائیں جو انسانوں کے لیے ضروری ہیں، مثلاً مریضوں کا علاج وغیرہ، لیکن عملاً ہوتا یہ ہے کہ ہڑتال کرانے والے لوگوں کو اپنا کاروبار بند کرنے پر مجبور کرتے ہیں، اگر کوئی گاڑی چلا رہا ہے تو اس پر پتھراؤ کیا جاتا ہے، راستے میں رکاوٹیں کھڑی کر دی جاتی ہیں، اور اگر کوئی شخص ہڑتال میں حصہ نہیں لے رہا تو اس کو کم از کم غم وغصہ کا نشانہ بنایا جاتا ہے، یا اسے زبردستی ہڑتال میں شریک ہونے پر مجبور کیا جاتا ہے، یا اس پر تشدد کیا جاتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ سارے اقدامات شرعاً بالکل حرام ہیں۔

ان کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ غریب لوگ جو روز کے روز اپنی روزی کماتے ہیں وہ اپنی روزی سے محروم ہو جاتے ہیں، بہت سے مریض علاج نہ ملنے کی وجہ سے سختیاں جھیلتے ہیں، اور بہت سے تو موت کے منہ میں چلے جاتے ہیں، اور عجیب قصہ ہے کہ ایک طرف جمہوریت اور آزادی اظہار رائے کا دعویٰ کیا جاتا ہے اور دوسری طرف جو شخص اس ہڑتال میں حصہ نہیں لینا چاہتا، اس کو اپنی رائے کے اظہار کا موقع دینے سے انکار کیا جاتا ہے، یہ بات نہ تو اسلام کے مطابق ہے، اور نہ یہ اخلاق اور آزادی اظہار رائے کے اصول کے مطابق ہے، عام طور سے آج کل کی ہڑتالیں ان امور سے خالی نہیں ہوتیں، ایسی ہڑتال جس میں ہڑتال کی اپیل کرنے والے شرافت کے ساتھ لوگوں سے اپیل کر کے بیٹھ جائیں کہ جو چاہے دکان کھولے اور جو چاہے نہ کھولے، ایسی شریفانہ ہڑتال آج کے ماحول میں تقریباً نایاب ہے، اور جب کسی مباح کو ناجائز امور کا ذریعہ بنا لیا جائے تو سد ذریعہ کے طور پر اس کو ممنوع ہی کہنا چاہیے، اگرچہ فی نفسہ جائز ہو، اس لیے ہڑتال کی یہ تدبیر جس میں توڑ پھوڑ اور امن وامان میں خلل اندوزی اور لوگوں کے کاموں میں رکاوٹ پیدا ہو شرعی تدابیر کے تحت نہیں آتی، اور جب سیاست بذات خود مقصود نہیں، مقصود اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہے تو اس صورت میں تدبیر بھی وہی اختیار کرنی چاہیے جو شریعت کے مطابق ہو، جس میں شریعت کی کوئی خلاف ورزی لازم نہ آئے، ورنہ اس کے کوئی معنی نہیں ہیں کہ اسلام کے احکام توڑ توڑ کر اسلام نافذ کرنے کی تحریک چلائی جائے۔

جلوسوں کا مسئلہ بھی یہ ہے کہ اگر ان سے لوگوں کو غیر معمولی تکلیف نہ پہنچے تو وہ فی نفسہ جائز ہیں،

لیکن عام طور سے ان میں بھی توڑ پھوڑ اور عوام کے لیے مشکلات پیدا ہونا ایک لازمی حصہ بن گیا ہے اور ظاہر ہے کہ اس پہلو کو جائز نہیں کہا جاسکتا۔ [اسلام اور سیاسی نظریات، ص ۱۷۴]

اسلام میں سیاست کا کیا مقام ہے ؟ کیا اسلام میں سرے سے سیاست کا کوئی پہلو نہیں یا اسلام سیاست ہی کا نام ہے؟

پہلی بات یہ ہے کہ اسلام اور سیاست کے تعلق کے بارے میں آج کل دو ایسے نظریات پھیل گئے ہیں جو افراط وتفریط کی دو انتہاؤں پر ہیں۔ایک نظریہ سیکولرزم کا ہے، جس کے نزدیک اسلام بھی دوسرے مذاہب کی طرح انسان کا ذاتی اور انفرادی معاملہ ہے، جس کا تعلق بس اسی کی ذاتی زندگی سے ہے۔آپ دیکھ چکے ہیں کہ درحقیقت یہ نظریہ عیسائی تھیوکریسی کی خرابیاں سامنے آنے کے بعد ایک ردعمل کے طور پر اپنا گیا تھا، اور سیکولر جمہوریت کے رواج کے بعد یہ دنیا میں مقبول ہوگیا۔اس نظریئے کو مزید تقویت بعض ان دینی حلقوں کے طرز عمل سے بھی ملی، جنہوں نے نہ صرف خود اپنی سرگرمیوں کا محور عقائد وعبادات اور زیادہ سے زیادہ اخلاق کی درستی کی حد تک محدود رکھا، بلکہ جو لوگ اس دائرے سے باہر جا کر کسی قسم کی سیاسی سرگرمیوں میں مصروف ہوئے، ان پر تنقید بھی کی، کہ ایک دیندار آدمی سیاست میں کیوں ملوث ہو؟ یہ نقطۂ نظر درحقیقت اسلام کو دوسرے مذاہب پر قیاس کرنے سے پیدا ہوا، حالانکہ یہ قیاس قطعی طور پر غلط ہے۔اسلام کی ہدایات وتعلیمات صرف عقائد وعبادات اور اخلاق کی حد تک محدود نہیں ہیں، بلکہ وہ مالیاتی معاملات اور سیاست وحکومت کے بارے میں بھی ہمیں بڑے اہم احکام عطا فرماتا ہے، جن کے بغیر اسلام کا کلی تصور نامکمل ہے، جیسا کہ ان احکام کی کچھ تفصیل انشاء اللہ آئندہ بیان کی جائے گی۔

دوسری انتہا پسندی بعض ایسے افراد نے اختیار کر لی جنہوں نے سیکولرزم کی تردید اس شدت کے ساتھ کی کہ سیاست ہی کو اسلام کا مقصود اصلی قرار دیدیا، یعنی یہ کہا کہ اسلام کا اصل مقصد ہی یہ ہے کہ دنیا میں ایک عادلانہ سیاسی نظام قائم کیا جائے، اور اسلام کے باقی سب احکام اس مقصود اصلی کے تابع ہیں۔لہٰذا جو شخص سیاست کے میدان میں دین کی سربلندی کے لئے کام کر رہا ہے، بس وہ ہے جس نے دین کے مقصود اصلی کو پالیا ہے، اور جو لوگ سیاست سے ہٹ کر اصلاح نفس، تعلیم، تبلیغ یا اصلاح معاشرہ کے کاموں میں لگے ہوئے ہیں، اور سیاست میں ان کا کوئی کردار نہیں ہے، وہ گویا تنگ نظر اور دین کے اصل مقصد سے غافل ہیں۔

یہ دونوں نظریات افراط وتفریط کے نظریات ہیں، جو اسلام میں سیاست کے صحیح مقام سے ناواقفیت پر مبنی ہیں۔حقیقت یہ ہے کہ اسلام کی ہدایات، تعلیمات اور احکام زندگی کے ہر شعبے سے متعلق ہیں، جس میں سیاست بھی داخل ہے، لیکن سیاست کو مقصود اصلی قرار دیکر باقی احکام کو اس کے تابع کہنا بھی غلط

ہے۔اس کی مثال یوں سمجھئے کہ جیسے اسلام نے تجارت کے بارے میں بڑے تفصیلی احکام عطافرمائے ہیں،لیکن اگرکوئی شخص یہ کہنے لگے کہ تجارت ہی اسلام کا اصل مقصود ہے تو یہ بالکل غلط بات ہوگی، یا مثلاً نکاح کے بارے میں اسلام نے مفصل احکام دیئے ہیں،لیکن ان احکام کی وجہ سے یہ ہرگزنہیں کہا جاسکتا کہ نکاح ہی اسلام کا اصل مقصود ہے۔ بالکل اسی طرح اسلام نے سیاست کے بارے میں بھی اصولی ہدایات اوراحکام عطافرمائے ہیں،لیکن اس کی وجہ سے یہ نہیں کہا جاسکتا کہ سیاست ہی اسلام کا مقصوداصلی ہے۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا مقصدواضح طور پراس آیت کریمہ میں بیان فرمایا ہے کہ:

﴿وماخلقت الجن والانس الا ليعبدون﴾ [الذاريات:٥٦]

''اورمیں نے انسان اور جنات کوکسی اورمقصد سے نہیں، بلکہ اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ میری عبادت کریں''۔

عبادت کے معنی ہیں بندگی اور بندگی کے مفہوم میں پرستش کے تمام مشروع طریقے بھی داخل ہیں،اورزندگی کے ہرمعاملے میں اللہ تعالیٰ کی اطاعت بھی۔ یوں سمجھئے کہ عبادت کا لفظ عبد سے نکلا ہے،جس کے لفظی معنی غلام کے ہیں، جوشخص کسی کاغلام ہوتا ہے وہ اپنے آقا کے ہرحکم کی اطاعت کا پابند ہے،لیکن وہ اپنے آقا کی پرستش نہیں کرتا،اس لئے اس کی اطاعت کوعبادت نہیں کہتے،لیکن اللہ تعالیٰ کے ساتھ اس کے بندوں کاتعلق اطاعت کا بھی ہے،اور پرستش کا بھی،اس لئے ان کے اس عمل کوعبادت کہا جاتا ہے۔

پھرعبادت کی بھی دوقسمیں ہیں۔ایک وہ عبادتیں ہیں جن کا مقصوداللہ تعالیٰ کی پرستش کے سوا کچھ اورنہیں، مثلاً نماز، روزہ، حج، زکوۃ، قربانی وغیرہ۔ یہ براہ راست عبادتیں ہیں،اوردوسری قسم عبادات کی وہ ہے جس میں کوئی عمل کسی دنیاوی فائدہ کے لئے کیاجاتا ہے،لیکن جب وہ عمل اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق کیاجاتا ہے،اوران احکام کی پابندی میں نیت اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی کی ہوتی ہے،تو وہ بالواسطہ عبادت بن جاتا ہے،مثلاً تجارت اگراللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کے ساتھ کی جائے ،اوراس پابندی میں اللہ تعالیٰ کی رضاجوئی مقصود ہو،تو وہ بھی اس معنی میں عبادت بن جاتی ہے کہ اس پرثواب ملتا ہے۔لیکن یہ بالواسطہ عبادت ہے کیونکہ تجارت اپنی ذات میں عبادت نہیں تھی، بلکہ وہ اطاعت اورحسن نیت کے واسطے سے عبادت بنی ہے۔یہی حال سیاست اورحکومت کا بھی ہے کہ سیاست وحکومت کی کارروائیاں اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق اسی کی رضاجوئی کے لئے انجام دی جائیں تووہ بھی عبادت ہیں،لیکن بالواسطہ عبادت،کیونکہ یہ کارروائیاں تجارت کی طرح اپنی ذات میں عبادت نہیں تھیں، بلکہ اطاعت اورحسن نیت کے واسطے سے عبادت بنی ہیں۔لہٰذا جب اللہ تبارک وتعالیٰ نے انسان کی تخلیق کا مقصدعبادت کوقراردیا تواس میں دونوں قسم کی عبادتیں داخل ہیں،اوران کا مجموعہ انسان کی تخلیق کا مقصد ہے۔اب ظاہر ہے کہ جوعبادت براہ راست اور بلاواسطہ عبادت کہلانے کی مستحق ہیں،ان کا مرتبہ بالواسطہ عبادتوں کے مقابلے میں زیادہ بلند ہے،اور بالواسطہ

عبادتیں بھی بہت سی ہیں، ان میں سے کسی ایک کو تنہا انسان کی تخلیق کا مقصد نہیں کہا جا سکتا، بلکہ ان کا مجموعہ بلاواسطہ عبادتوں کے ساتھ مل کر مقصود تخلیق ہے۔ البتہ یہ بات بھی پیش نظر رہنی چاہئے کہ ان بالواسطہ عبادتوں میں بھی اہمیت کے اعتبار سے مختلف درجات ہیں، اور جس بالواسطہ عبادت کے اثرات جتنے عام اور ہمہ گیر ہیں، اتنی ہی وہ اہمیت کی حامل ہے۔ سیاست کا معاملہ یہ ہے کہ اگر ایک مرتبہ اس نظام شریعت کے مطابق ہو کر صحیح معنی میں اسلامی حکومت قائم ہو جائے تو اس کے ذریعے تمام بلاواسطہ اور بالواسطہ عبادتوں کی ادائیگی نہ صرف آسان ہو جاتی ہے، بلکہ ان کا دائرہ عملاً زیادہ وسیع ہو جاتا ہے، اس لئے دوسری بلاواسطہ عبادتوں کے مقابلے میں اس کی اہمیت زیادہ ہے، اس لحاظ سے اگر اس کی اہمیت پر زور دیا جائے تو غلط نہیں ہے۔ لیکن تنہا اس کو دین کا اصل مقصود قرار دینے سے ترجیحات کی پوری ترتیب الٹ جاتی ہے۔ کیونکہ یہ بات اگر ذہن میں بیٹھ جائے کہ دین کا اصل مقصد سیاست و حکومت ہے تو اس ذہنیت سے متعدد خرابیاں جنم لیتی ہیں۔

دین کی سیاسی تعبیر کے نتیجے میں پیدا ہونے والی خرابیاں

پہلی خرابی تو یہ ہوتی ہے کہ جب مقصود اصلی سیاست قرار دیا گیا تو باقی ساری چیزیں اس کی تابع بن گئیں۔ چنانچہ وہ اعمال جو بلاواسطہ اور براہ راست عبادت ہیں، وہ مقصود اصلی نہ رہے، بلکہ مقصود اصلی کے تابع بن گئے، لہٰذا ان کی اہمیت گھٹ گئی، حالانکہ قرآن کریم سے معلوم ہوتا ہے کہ سیاسی اقتدار ذریعہ ہے، اور بلاواسطہ عبادتیں اس کا اصل مقصود ہیں، چنانچہ ارشاد ہے:

﴿الّذین انه مکناهم فی الأرض أقاموا الصلوة وآتواالزکوة وأمروا بالمعروف ونهوا عن المنکر﴾ [الحج:٤١]

''یہ وہ لوگ ہیں کہ اگر ہم انہیں زمین میں اقتدار عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں، اور زکوۃ ادا کریں، اور نیکی کا حکم دیں اور برائی سے روکیں''۔

دیکھئے یہاں اقتدار کا مقصد یہ قرار دیا گیا ہے کہ وہ نماز قائم کریں، زکوۃ ادا کریں، وغیرہ۔ اس سے صاف واضح ہے کہ مقصود اصلی یہ عبادات ہیں، اور اقتدار اس لئے مشروع ہے کہ وہ اس مقصد کے حصول کا ذریعہ ہے۔

بعض حضرات اقتدار کے مقصود اصلی ہونے پر سورۂ نور کی اس آیت سے استدلال کرتے ہیں جس میں فرمایا گیا ہے کہ:

﴿وعدالله الذین آمنوا منکم وعملوا الصالحات لیستخلفنهم فی الأرض کمااستخلف الذین من قبلهم ولیمکنّنّ لهم دینهم الذی ارتضی لهم ولیبدّلنّهم من بعد خوفهم أمنا یعبدوننی ولایشرکون بی

شيئاً﴾ [النور:٥٥]

''تم میں سے جولوگ ایمان لائے ہیں، اور جنہوں نے نیک عمل کئے ہیں، ان سے اللہ نے وعدہ کیا ہے کہ وہ انہیں ضرور زمین میں اپنا خلیفہ بنائے گا، جس طرح ان سے پہلے لوگوں کو بنایا تھا، اور ان کے لئے اس دین کو ضرور اقتدار بخشے گا، جسے ان کے لئے پسند کیا ہے، اور ان کو جو خوف لاحق ہو رہا ہے، اس کے بدلے انہیں امن ضرور عطا کرے گا۔ (بس) وہ میری عبادت کریں، میرے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرائیں''۔

لیکن اس دلیل کے بارے میں حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے جو کچھ ارشاد فرمایا ہے وہ کافی وافی ہے۔ اس لئے ہم یہاں حضرت ہی کے الفاظ میں یہ مضمون نقل کرتے ہیں۔ حضرت فرماتے ہیں:

﴿الّذين ان مكناهم فى الأرض أقاموا الصلوة وآتواالزكوة وأمروا بالمعروف ونهوا عن المنكر ولله عاقبة الامور﴾ [الحج:٤١]

''وہ لوگ جن کو اگر ہم زمین کی حکومت عطا کریں تو وہ نماز قائم کریں اور زکوۃ ادا کریں، اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فرض انجام دیں، اور سب کاموں کا انجام اللہ تعالیٰ ہی کے ہاتھ میں ہے''۔

اس سے واضح ہے کہ دیانات مقصود بالذات ہیں، اور سیاسیات اور جہاد مقصود اصلی نہیں، بلکہ اقامت دیانت کا وسیلہ ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دیانت اور احکام دیانت تو انبیاء علیہم السلام کو مشترک طور پر سب کو دیئے گئے، اور سیاسیات و جہاد سب کو نہیں دیا گیا، بلکہ جہاں ضرورت اور مصلحت سمجھی گئی، دی گئی ورنہ نہیں، وسائل کی یہی شان ہوتی ہے کہ وہ ضرورت ہی کے لئے دیئے جاتے ہیں۔

شاید کسی کو یہ شبہ ہو کہ دوسری آیات میں تو اس کے خلاف مضمون موجود ہے، جس سے دیانت کا وسیلہ ہونا اور تمکن فی الارض اور سیاست کا مقصود ہونا سمجھ میں آرہا ہے، اور وہ یہ ہے:

﴿وعدالله الذين آمنوا منكم وعملوا الصالحات ليستخلفنهم فى الأرض كمااستخلف الذين من قبلهم وليمكنّنّ لهم دينهم الذى ارتضى لهم﴾ [النور:٥٥]

''تم میں جو لوگ ایمان لاویں اور نیک عمل کریں، ان سے اللہ تعالیٰ وعدہ فرماتا ہے کہ ان کو زمین میں حکومت عطا فرمائے گا، جیسا ان سے پہلے لوگوں کو حکومت دی تھی، اور جس دین کو ان کے لئے پسند کیا ہے اس کو ان کے لئے قوت دے گا''۔

یہاں ایمان و عمل صالح کو شرط قرار دیا جارہا ہے تمکین فی الارض کی، جس سے تمکین و سیاست کا مقصود اصلی ہونا لازم آتا ہے۔ سو جواب اس کا یہ ہے کہ یہاں ایمان اور عمل صالح پر تمکین و شوکت کا وعدہ کیا گیا ہے، اور بطور خاصیت کے شوکت کا دین پر مرتب ہونا ذکر فرمایا گیا ہے۔ پس دین پر سیاست اور قوت

موعود ہوئی، لیکن موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں، ورنہ آیت کریمہ:

﴿ولو أنهم اقاموا التوراة والانجيل ومأأنزل اليهم من ربهم لأكلوا من فوقهم ومن تحت ارجلهم﴾ [المائدة:٦٦]

''اور اگر یہ لوگ تورات کی اور انجیل کی اور جو کتاب ان کے پروردگار کی طرف سے ان کے پاس بھیجی گئی (یعنی قرآن) اس کی پوری پابندی کرتے تو یہ لوگ اوپر سے اور نیچے سے خوب فراغت سے کھاتے''۔

جس میں اقامت تورات وانجیل وقرآن، یعنی عمل بالقرآن پر وسعت رزق کا وعدہ کیا گیا ہے، کیا کوئی کہہ سکتا ہے کہ دین سے یہ مقصود ہے؟ بلکہ دین پر موعود ہے کہ دیندار بھوکا ننگا نہیں رہ سکتا، پس موعود کا مقصود ہونا ضروری نہیں۔ یہاں بھی ایمان وعمل صالح پر شوکت وقت اور سیاست وغیرہ موعود ہیں، جو بطور خاصیت اس پر مرتب ہوں گی، نہ کہ مقصود جو اس کی غایت کہلائے۔

بہر حال! واضح ہوا کہ سیاست ودیانت میں سیاست وسیلہ ہے اور دیانت مقصود اصلی ہے، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ سیاست کسی درجے میں بھی مطلوب نہیں، بلکہ اس کا درجہ بتلانا مقصود ہے، کہ وہ خود مقصود اصلی نہیں، اور دیانت مقصود اصلی ہے۔ [اشرف السوانح ج:۴، خاتمۃ السوانح ص:۲۸، ۲۹، ط: ملتان]

خلاصہ یہ ہے کہ سیاست کو دین کا مقصود اصلی قرار دینے اور ان عبادتوں کو اس کا تابع بنانے کے نتیجے میں یہ خیال پیدا ہو جاتا ہے کہ یہ سب عبادتیں اس اعلیٰ مقصد یعنی سیاست وحکومت حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔ نماز باجماعت کا اصل مقصد یہ ہے کہ سیاسی مقاصد کے حصول کے لئے اجتماعی فکر پیدا ہو، نظم وضبط کی عادت پڑے، مسلمانوں میں میل جول بڑھے، وہ آپس میں تعاون کے طریقے سوچیں، اور متحد ہو کر اس اعلیٰ مقصد کے لئے کام کریں۔ زکوۃ کا اصل مقصد یہ ہے کہ اس اعلیٰ مقصد کے حصول کے لیے مالی قربانی دینے کا جذبہ پیدا ہو۔ روزہ درحقیقت اس بات کی ٹریننگ ہے کہ اس اعلیٰ مقصد کے حصول کے لئے فقر وفاقہ اور دوسری مشکلات سہنے کی عادت پڑے۔ حج اس لئے فرض کیا گیا ہے کہ وہ سارے مسلمانوں کی ایک عالمی کانفرنس کے مقاصد پورے کرے، اور اس سے مختلف خطوں کے لوگوں کے درمیان یک جہتی اور یگانگت پیدا ہو۔ غرض ساری عبادتوں کا اصل مقصود ان دنیاوی فوائد کا حصول بنا دیا گیا، لیکن یہ ان کے ثانوی فوائد ہیں، عبادتوں کی اصل روح نہیں ہے۔ ان کی اصل روح اللہ تبارک وتعالیٰ سے تعلق مضبوط کرنا، اس کی طرف انابت واخبات اور اس کی اطاعت کو ہر کام پر ترجیح دینا ہے۔ سیاست کو مقصود اصلی قرار دینے سے عبادت کی یہ روح کمزور پڑ جاتی ہے۔

تیسری خرابی یہ کہ جب یہ ساری عبادتیں اعلیٰ ترین مقصد حاصل کرنے کا ذریعہ بن گئیں، تو قدرتی طور پر اس کا نتیجہ یہ ہونا چاہئے کہ اگر اس اعلیٰ مقصد کی خاطر ان کی کچھ قربانی بھی دینی پڑے تو اس میں کوئی حرج نہ سمجھا جائے۔ لہٰذا سیاسی جدوجہد یا سیاسی اجتماعات کی خاطر اگر نماز باجماعت جاتی رہے، یا مسجد میں

حاضری نہ ہوتو کوئی مضائقہ نہیں، بلکہ نماز قضا بھی پڑھ لی جائے تو اتنی بری بات نہیں، تھوڑے بہت مکروہات کا ارتکاب بھی ہو جائے تو اعلیٰ مقصد کے لئے گوارا کر لینا چاہیئے۔

چوتھی خرابی یہ پیدا ہوتی ہے کہ جو حضرات بلاواسطہ عبادتوں میں زیادہ مشغول رہتے ہیں، اور لوگوں کو ان عبادات سے متعلق فضائل اعمال کے حصول کی ترغیب دیتے ہیں، انہیں دین کے اصل مقصود سے غافل سمجھا جاتا ہے، بلکہ بعض اوقات ان کی تحقیر اور ان کے ساتھ استہزاء کا معاملہ کیا جاتا ہے۔ جو کتابیں فضائل اعمال سے متعلق ہوتی ہیں، ان کو نہ صرف کوئی اہمیت نہیں دی جاتی، نہ انہیں پڑھنے کی ضرورت سمجھی جاتی ہے، بلکہ کچھ ایسا انداز اختیار کیا جاتا ہے جیسے یہ قطعی طور پر غیر ضروری یا دین کے مقصود اصلی سے غافل کرنے والی چیزیں ہیں۔ اسی وجہ سے اس تصوف وطریقت کو بھی افیون سے تعبیر کیا جاتا ہے جو شریعت وسنت کے مطابق ہے۔ جو لوگ علوم دین ہی کی تحصیل اور ان کی خدمت میں مشغول ہیں، ان کو بھی دین کی صحیح فکر سے محروم تصور کیا جاتا ہے۔

پانچویں خرابی یہ ہے کہ اس تصور کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ دنیا میں جتنے انبیاء کرام علیہم السلام تشریف لائے، ان کی اکثریت دین کے اصل اور بنیادی مقصد کو پورا کرنے میں ناکام رہی، کیونکہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء کرام علیہم السلام میں سے صرف چند انبیاء کرام ہیں جنہوں نے حکومت قائم کی۔ حضور سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے علاوہ حضرت یوسف، حضرت موسیٰ، حضرت یوشع، حضرت سموئیل، حضرت داؤد، اور حضرت سلیمان علیہم السلام نے بیشک حکومتیں قائم فرمائیں، لیکن ان کے علاوہ کسی اور نبی کے بارے میں حکومت قائم کرنا ثابت نہیں ہے۔ کیا اس کا مطلب یہ ہے کہ ان حضرات کے سوا کوئی نبی دین اصل مقصد حاصل کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا؟ جو حضرات سیاسی غلبے کو دین کا اصل مقصود قرار دیتے ہیں، ان کو یہ کہنے میں بھی تامل نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی دین کے اصل مقاصد میں کامیاب نہیں ہوا۔

خلاصہ یہ کہ دین میں سیاست کی اہمیت اپنی جگہ ہے، لیکن اس کو دین کا اصل مقصود قرار دینے سے اولیات اور ترجیحات کا پورا انظام بری طرح متاثر ہوتا ہے۔

دوسری طرف دین کو صرف نماز روزے کی حد تک محدود سمجھ کر دوسرے شعبوں سے بالکل غفلت اختیار کرنا بھی بہت بڑی غلطی ہے۔ حقیقت وہی ہے کہ دین کے بہت سے شعبے ہیں، جن میں سیاست بھی ایک اہم شعبہ ہے، اور اس سے غفلت اختیار کر کے اسے دین سے خارج سمجھنا بھی بڑی گمراہی ہے۔ دین پر عمل کے لئے اسلام کے تمام احکام پر عمل ضروری ہے، چاہے وہ کسی شعبے سے متعلق ہوں۔ البتہ جہاں تک دین کی جدوجہد کا تعلق ہے، عادۃً کوئی ایک شخص تمام شعبوں میں جدوجہد نہیں کرسکتا، اس لئے اس میں تقسیم کار پر عمل ضروری ہے کہ کچھ لوگ ایک شعبے میں جدوجہد کریں، کچھ دوسرے شعبے میں کام کریں۔

کسی نے اپنے لئے دین کے کام کا ایک شعبہ اختیار کر لیا، اس میں وہ اپنا وقت اور محنت زیادہ

لگا رہا ہے، اور اس پر زیادہ توجہ دے رہا ہے، کسی نے دوسرا شعبہ اختیار کرلیا ہے، اس میں وہ اپنا وقت زیادہ لگا رہا ہے، اور اس پر زیادہ توجہ دے رہا ہے، اس میں کوئی حرج نہیں۔

لیکن حرج اس میں ہے کہ کوئی یہ سمجھے کہ میں نے جو شعبہ اختیار کیا ہے، وہ دین کا مقصود اصلی ہے، جب کہ وہ مقصود اصلی نہ ہو، بلکہ جس طرح دین کے بہت سے کام ہیں، اسی طرح وہ بھی ایک کام ہے۔ مثلاً ایک شخص نے سیاست کے شعبے کو اس لئے اختیار کیا کہ میں اپنے حالات کے مطابق اس لائن میں خدمت کرنے کو زیادہ بہتر طریقے پر کرسکتا ہوں، اور اپنے آپ کو اس کام کے لیے لگا تا ہوں، تو بیشک لگائے، لیکن اگر یہ کہے کہ سیاست سارے دین کا مقصود اصلی ہے تو یہ غلط بات ہے، ورنہ کوئی شخص اپنے لئے سیاست کا راستہ اختیار کرتا ہے اور اسکے لئے جد وجہد کرتا ہے تو وہ بھی عین دین کا حصہ ہے۔

[اسلام اور سیاسی نظریات، ص ۱۶۲ تا ۱۷۱]

سیاست کے بارے میں اسلامی احکام کی کیا نوعیت ہے ؟

دوسری بات یہ ہے کہ سیاست کے بارے میں اسلام نے بیشک بہت سے احکام عطا فرمائے ہیں، لیکن حکومت کا کوئی تفصیلی نقشہ اسلام نے متعین نہیں فرمایا ہے۔ اصول اور قواعد عطا فرمائے ہیں۔ لیکن ان اصولوں کو کس طرح نافذ کیا جائے؟ اور عملاً ان کی صورت کیا ہو؟ اس کی تفصیلی جزئیات اسلام نے متعین نہیں فرمائی ہیں، بلکہ ان کو ہر دور کے اہل علم اور اہل بصیرت پر چھوڑ دیا ہے۔ جو اصول اللہ تبارک وتعالیٰ نے شریعت کے ذریعے ہمیں عطا فرمائے ہیں، وہ غیر متبدل ہیں۔ ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، ان کی ہدایت سدا بہار ہے، لیکن ان اصولوں کی روشنی میں اور ان کی پوری پابندی کرتے ہوئے جو تفصیلی عملی طریق کار مسلمان اہل بصیرت باہمی مشورے سے طے کرلیں، وہ جائز ہے۔

مثلاً قرآن کریم کی آیت ﴿واعدوا لهم ما استطعتم من قوة﴾ [الانفال: ۶۰] نے فرمایا کہ: ''تم دشمنوں کے مقابلے کے لئے جو تیاری کرسکتے ہو کرو'' یہ اصول تو دے دیا، اور اس کی کچھ مثالیں بھی دے دیں، لیکن یہ تفصیل نہیں بتائی کہ فلاں فلاں اسلحہ بناؤ۔ بلکہ یہ بات ہر دور کے اہل بصیرت کے لئے چھوڑ دی کہ وہ اپنے اپنے حالات، بصیرت، تجربے اور ضرورت مطابق قوت حاصل کرنے کی کوشش کریں۔

اسی طرح سیاست کے باب میں بھی اصولی ہدایات تو اسلام نے عطا فرما دی ہیں، لیکن آگے کی یہ تفصیلات کہ حکومت کے کتنے محکمے قائم کئے جائیں؟ انتظامی اختیارات کس طرح تقسیم کئے جائیں؟ وزراء ہوں یا نہ ہو؟ اگر ہوں تو کتنے ہوں؟ وحدانی طرز حکومت ہو یا وفاقی؟ مقننہ ایک ایوان پر مشتمل ہو یا دو ایوانوں پر؟ اس میں مشاورت کا کیا طریقہ ہونا چاہئے؟ یہ تفصیلات اسلام نے متعین نہیں فرمائی ہیں کیونکہ یہ مباحات کا دائرہ ہے، اس دائرے میں ہر زمانے کے اہل بصیرت فیصلے کر کے حالات کے مطابق عمل کرسکتے ہیں۔ لہٰذا

جب ہم اسلام کے اصول سیاست کی بات کریں تو یہ توقع نہیں کرنی چاہئے کہ فقہاء امت کے کلام میں ہمیں یہ تفصیلات مہیا ہوں گی، کہ مقننہ ایک دیوانی ہو یا دو دیوانی ہو، یا کابینہ کی تعداد کیا ہو؟ یہ تفصیلات نہ شریعت میں موجود ہیں، اور نہ ان کی ضرورت ہے۔

شریعت کی ہدایت تو آتی اس جگہ ہے جہاں شریعت یہ محسوس کرتی ہے کہ اگر اس بات کو لوگوں کی عقل وفہم پر چھوڑ دیا گیا تو لوگ گمراہ ہوجائیں گے۔ جہاں مباحات کا دائرہ ہے، اس میں اکثر معاملات کو انسان کی عقل وبصیرت پر چھوڑا گیا ہے۔ اس طرح اسلام کے اصول سیاست ایک طرف ناقابل تبدیلی ہیں، اور دوسری طرف اتنے لچکدار ہیں کہ ان پر عمل کا طریق کار زمان ومکان کے تقاضوں اور مصلحتوں کے لحاظ سے متعین کیا جاسکتا ہے، اور ان اصولوں کے دائرے میں رہتے ہوئے، ان میں مختلف زمانوں میں تبدیلی بھی ہوسکتی ہے۔ لہٰذا ہم جب اسلامی سیاست کی بات کرتے ہیں تو اس سے مراد کوئی ایسا لگا بندھا طریقۂ حکومت نہیں ہوتا جس کی تمام جزوی تفصیلات ہمیشہ کے لئے طے شدہ ہوں، بلکہ اس سے مراد وہ بنیادی تصورات اور وہ اساسی قواعد واصول ہیں جو قرآن وسنت نے متعین فرمائے ہیں۔

[اسلام اور سیاسی نظریات، ص ۱۷۱]

مذہبی اشرافیہ یا تھیوکریسی کسے کہتے ہیں؟

ایک قسم مذہبی اشرافیہ ہے، جس کو (Theocrasy) بھی کہا جاتا ہے، اصل میں یہ لفظ بھی یونانی اصلیت رکھتا ہے۔ یونانی زبان میں Theo خدا کو کہتے ہیں، (اور اسی سے تھیولوجی بنا ہے، لوجی کہتے ہیں علم کو، تو تھیولوجی کے معنی علم الٰہیات ہیں)، Crasy کے معنی ہیں حاکمیت۔ اسی طرح Theocrasy کے معنی ہوئے خدا کی حاکمیت۔

اس نظام کا اصل تصور تو بڑا مبارک ہے، اور وہ یہ کہ اس کائنات میں اصل حاکمیت اللہ تعالیٰ کی ہے اور یہاں جو بھی حکومت قائم ہو، اسے اللہ تعالیٰ کے احکام کی پابندی کرنی چاہئے۔ لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا تعین کون کرے؟ عیسائی دنیا میں اس کا عملی جواب یہ تھا کہ چرچ کا سربراہ جو پوپ کہلاتا تھا، اسی کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کا تعین کرکے بادشاہ کو بتائے۔ چنانچہ جس بات کو پوپ اللہ تعالیٰ کا حکم قرار دیدے، حکومت کا سربراہ اسی پر عمل کرنے پر مجبور ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ عملاً تھیوکریسی کا مطلب مذہبی پیشواؤں کی حاکمیت ہوگیا۔ چنانچہ اب جو تھیوکریسی کا ترجمہ کیا جاتا ہے تو بکثرت ''خدا کی حاکمیت'' کے بجائے ''مذہبی پیشواؤں کی حاکمیت'' سے کیا جاتا ہے۔

جیسا کہ میں پہلے بھی اشارہ کرچکا ہوں، روم کی عیسائی حکومتوں میں یہ ایک بہت لاینحل مسئلہ رہا ہے کہ اگرچہ حکمران تو بادشاہ ہوا کرتا تھا، لیکن وہ پوپ کے مذہبی احکام کا پابند ہوتا تھا۔ اس کے نتیجے میں ایک طرف

توبادشاہ اور پوپ کے درمیان بکثرت اختلافات رہتے تھے، دوسرے چونکہ پوپ کو بلاشرکت غیرے مذہب کے احکام متعین کرنے کا مکمل اختیار حاصل تھا، اور اس پر کوئی روک ٹوک نہیں تھی، اس لئے پوپ نے اپنے اس اختیار کا متعدد مواقع پر ناجائز استعمال کیا، اور خاص طور پر جب ایسے ایسے لوگ پوپ بنے جو اپنے ذاتی مفادات کے اسیر تھے تو انہوں نے بڑی بے رحمانہ پالیسیاں اپنائیں، جن سے پوری قوم کو جبر و تشدد کی گھٹی ہوئی فضا میں صدیاں گزارنی پڑیں۔ اس ساری صورتحال میں عوام کے درمیاں مذہب کے خلاف بغاوت پیدا ہوئی، اور آخر کار جب انہوں نے حکومت سے مذہب کا عمل دخل ختم کر کے سیکولر نظام حکومت قائم کیا تو تھیوکریسی کا لفظ ایک گالی بن کر رہ گیا، کیونکہ اس لفظ کو سنتے ہی ان کے ذہن میں وہ ساری خرابیاں ابھر آتی ہیں، جو پوپ کے ادارے نے پیدا کی تھیں۔

کیا علما اور مذہبی طبقے کا اسلامی حکومت کے قیام کی کوشش کرنا تھیو کریسی (مذہبی اجارہ داری) ہے ؟

چونکہ تھیوکریسی کا لفظ اب بہت بدنام، ہوگیا ہے، اس لئے ہمارے مسلمان معاشرے میں بھی لوگ بکثرت یہ کہنے لگے ہیں کہ اسلام تھیوکریسی کا حامی نہیں ہے، اور تھیوکریسی اسلام کے خلاف ہے۔ لیکن یہ کہتے وقت لوگ تھیوکریسی کے اصل تصور اور عیسائی دنیا میں اس کے عملی اطلاق کے درمیان فرق نہیں کرتے۔ چنانچہ جب پاکستان میں اسلامی حکومت کے قیام کی بات کی جاتی ہے، تو علماء کی طرف سے مطالبہ ہوتا ہے کہ اسلامی حکومت قائم ہونی چاہئے، یا علماء سیاست میں حصہ لیتے ہیں تو تجدد پسند حلقوں کی طرف سے جھٹ یہ اعتراض کیا جاتا ہے کہ یہ لوگ ملک میں Theocrasy قائم کرنا چاہتے ہیں، اور ہم پاکستان میں Theocrasy قائم نہیں ہونے دیں گے۔ لیکن Theocrasy کا مطلب کوئی سمجھتا نہیں، نہ اعتراض کرنے والا اور نہ جواب دینے والا۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ اس کے محاسن اور معائب سے باخبر ہوئے بغیر ایک نعرے کے طور پر یہ لفظ استعمال کیا جاتا ہے کہ اسلام میں تھیوکریسی نہیں ہے، اور یہ کہتے وقت تھیوکریسی کے اصل تصور اور عیسائی دنیا میں اس کے عملی اطلاق کے درمیان کوئی فرق نہیں کیا جاتا۔ حقیقت یہ ہے کہ جیسے پہلے عرض کیا گیا، تھیوکریسی کے اصل معنی ہیں ''خدا کی حاکمیت'' اور یہ وہی حقیقت ہے جسے قرآن کریم نے ''ان الحکم الا اللہ'' کے مختصر جملے میں بیان فرمایا ہے۔ اب اندازہ کر لیجئے کہ جب یہ کہا جاتا ہے کہ اسلام میں تھیوکریسی نہیں ہے تو اس کے معنی یہ ہوئے کہ اسلام میں خدا کی حاکمیت نہیں ہے۔ لہٰذا جو لوگ بے سوچے سمجھے اس لفظ کو استعمال کرتے ہیں وہ کتنی خطرناک بات کہہ دیتے ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ Theocrasy اپنے لغوی معنی اور اپنے اصل تصور کے لحاظ سے بالکل درست ہے، کہ اس کائنات میں حاکمیت کا حق درحقیقت اللہ جل جلالہٗ کو حاصل ہے، اور انسان جو کوئی حکومت قائم

کریں، وہ اللہ تعالیٰ کے احکام کے تابع ہونی چاہئے۔لیکن Theocrasy جب عملاً وجود میں آئی، تو مختلف مذاہب کی طرف سے اس میں طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوئیں جس کے نتیجے میں یہ لفظ بدنام ہو گیا۔

یہودی اور ہندو تھیو کریسی

سب سے پہلے جوتھیوکریسی وجود میں آئی، وہ یہودیوں کی تھیوکریسی تھی۔اس کی اصل یہ تھی کہ حضرت عیسی علیہ السلام سے پہلے تمام بنی اسرائیل حضرت موسی علیہ السلام کی شریعت کے احکام کے پابند تھے، جوتورات میں درج تھے، اور تورات کے احکام کو یہودی اصطلاح میں ''قانون'' کہا جاتا تھا۔لیکن تورات میں جو احکام ہیں، وہ عبادات، طہارت وغیرہ سے متعلق تو بہت زیادہ ہیں، تمدنی زندگی سے متعلق احکام ہیں تو ضرور، لیکن کم ہیں۔اس لئے یہودی مذہب کی بنیاد پر جو ریاست قائم ہوئی، اس میں ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم یہ ریاست تورات کے قانون کے مطابق چلائیں گے۔لیکن تورات کے قانون میں ساری باتیں تو درج نہیں۔لہٰذا اگر کوئی صورت حال ایسی سامنے آتی جس کا صریح حکم تورات میں موجود نہیں تھا، تو اس صورت میں ان کے جو مذہبی پیشوا تھے، ان کو یہ حق دیا گیا تھا کہ وہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی مرضی معلوم کر کے اس کے مطابق قانون سازی کریں۔اور اللہ تعالیٰ کی مرضی معلوم کرنے کے لئے ان کے یہاں طریقہ یہ تھا کہ ایک خیمہ ہوتا تھا، جس کو خیمہ عبادت کہتے تھے، اس خیمے میں ایک تابوت رکھا ہوتا تھا، اور تابوت کے اوپر سونے کا غلاف چڑھا ہوتا تھا۔جو مذہبی پیشوا ہوتا تھا وہ اس تابوت کے پاس جا کر بیٹھ جاتا تھا، اور حتی الامکان ایسے وقت کا انتخاب کرتا تھا جب آسمان پر ابر ہو اور بجلی چمکنے کا امکان ہو۔وہاں بیٹھ کر وہ مراقبہ کرتا، اور کچھ دعائیں پڑھتا۔اس کے نتیجے میں آسمان پر بجلی چمکتی تھی۔آسمان پر بجلی چمکنے کے بعد وہ کہتا تھا کہ مجھے یہوواہ یعنی اللہ تعالیٰ نے یہ حکم دیا ہے۔(یہودیوں کے ہاں یھوا خدا کو کہتے ہیں) ان کا کہنا یہ تھا کہ یہووا کسی مذہبی پیشوا سے براہ راست ہم کلام ہو کر اس کو نئی صورت حال کے بارے میں کوئی قانون فراہم کرتا ہے۔جب بھی کوئی صورت حال ایسی پیش آتی تو وہاں جاتے ، اگر بجلی چمک گئی تو ٹھیک، نہیں چمکی تب بھی وہ مراقبہ کرتا رہتا تھا، اور یہ دعویٰ کرتا تھا کہ مجھے یہ الہام ہوا ہے، یا مجھ پر یہ بات منکشف ہوئی ہے کہ اس صورت حال کا حکم یہ ہے۔یہ تھی یہودی تھیوکریسی!

ظاہر ہے کہ یہ بات کہ کسی مذہبی پیشوا کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے براہ راست الہام ہو یا کوئی بات اس کے اوپر منکشف ہو، یہ محض ایک توہماتی بات تھی، اور یہ محض اپنی چوہدراہٹ لوگوں پر قائم کرنے کے لیے گھڑی گئی تھی۔لہٰذا حقیقت میں جو قانون وہ جاری کرتا تھا، وہ قانون خدائی قانون نہیں ہوتا تھا، بلکہ اپنی خواہشات، اپنی رائے، اپنی سوچ کو خدا کی طرف منسوب کر کے اسے لوگوں کے اوپر نافذ کرتا تھا۔

اسی قسم کی تھیوکریسی ہندوؤں میں چلی کہ وہاں برہمن پروہت کو یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ براہ راست

خدا سے رابطہ قائم کر کے کوئی قانون جاری کر دے۔ ان دونوں قسم کے مذہبی پیشواؤں کے فیصلے کو چاہے وہ یہودی ہوں یا ہندو ہوں، کوئی شخص اٹھ کر چیلنج نہیں کر سکتا تھا، کہ تم نے جس حکم کو خدا کی طرف منسوب کیا ہے، وہ حکم حقیقت میں خدا کا نہیں ہے۔ اسے چیلنج کرنے کی کسی میں مجال نہیں تھی، بلکہ اس کو جوں کا توں مان لینا ضروری تھا۔ ان دونوں جگہوں پر یعنی یہودی تھیوکریسی میں بھی اور ہندوانہ تھیوکریسی میں بھی، اور بعض جگہ بدھ مذہب میں بھی مذہبی پیشواؤں کو براہ راست خدا سے رابطہ کر کے قانون متعین کرنے کا حق حاصل تھا۔ تبت اور جاپان میں لامہ نامی فرقوں میں یہ سلسلہ اب تک موجود ہے۔

بہر کیف! جب مذہبی پیشوا اپنے خود ساختہ الہام کی بنیاد پر کسی بات کو خدا کا حکم قرار دیدیتے تو بادشاہ اس کو ماننے کا پابند ہوتا تھا۔ رفتہ رفتہ بادشاہوں نے یہ سوچا کہ یہ عجیب کھڑی ہوگئی ہے کہ مذہبی پیشوا جو چاہتے ہیں، خدا کی طرف منسوب کر کے ہم پر مسلط کر دیتے ہیں، لہٰذا کیوں ایسا نہ کیا جائے کہ یہ اتھارٹی بھی خود ہی لے لی جائے، اگر وہ مراقبہ کر سکتا ہے اور خدا کی مرضی معلوم کر سکتا ہے تو ہم بھی کر سکتے ہیں۔ لہٰذا رفتہ رفتہ انہوں نے کچھ مذہبی پیشواؤں کو اپنا ہمنوا بنا کر یہ اختیار اپنی طرف منتقل کر لیا، یعنی یہ دعویٰ کیا گیا کہ کسی مذہبی پیشوا کو یہ الہام ہوگیا ہے کہ اب یہ اختیار بادشاہ کے حوالے کر دیا جائے۔ چنانچہ وہ اختیار بادشاہ کے حوالے ہوگیا، اس کے نتیجے میں اب یہ بات طے ہوگئی کہ بادشاہ جو کہے وہ خدائی قانون ہے، اور اسکے نتیجے میں یہ فلسفہ کھڑا کیا گیا کہ بادشاہ درحقیقت جنت میں بنتا ہے، اور یہ جنتی مخلوق ہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اس کو بادشاہ بناتے ہیں، وہ خدا سے اپنا اختیار لے کر دنیا میں وارد ہوتا ہے، لہٰذا وہ خدائی مخلوق ہے۔ وہ جو کچھ بھی قانون پاس کرے سب لوگوں کے لئے واجب الاطاعت ہے اور فرض کرو اگر وہ ظلم وجبر بھی کر رہا ہے تو کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کی مشیت کے مطابق کر رہا ہے، لہٰذا تمام شہریوں کا فرض ہے کہ اس ظلم وجبر کو برداشت کریں اور اس کو ہٹانے کی بھی کوشش نہ کریں، اس طرح تھیوکریسی مذہبی پیشوائیت سے چل کر پھر بادشاہت سے جا ملی۔

عیسائی تھیوکریسی اور سینٹ پال (پولوس، ساؤل) کی حقیقت

اس کے بعد عیسائیت آئی۔ عیسائیت کے بارے میں پہلے یہ سمجھ لیجئے کہ اصلاً حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی بعثت صرف بنی اسرائیل کی طرف ہوئی تھی، اور آپ کا اصل مقصد شرک اور دوسری برائیوں کو دور کرنا تھا، اس لئے بنیادی طور پر ان کی شریعت چند مخصوص احکام کے سوا مکمل طور پر تورات کی شریعت کے مطابق تھی۔ چند احکام کا استثناء بھی میں اپنے اسلامی تصور کے لحاظ سے کر رہا ہوں، ورنہ اصل بائبل کے تصور کے مطابق حضرت عیسیٰ علیہ السلام صرف تورات کو نافذ کرنے آئے تھے، اور اس میں کوئی تبدیلی پیدا کرنے کے لئے نہیں آئے تھے۔ بائبل کا تصور یہی ہے کہ آپ کوئی نئی شریعت لے کر نہیں آئے۔ بائبل

میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بے شمار اقوال اس معنی کے موجود ہیں کہ میں تورات کو منسوخ کرنے نہیں آیا، بلکہ تورات کو نافذ کرنے کے لیے آیا ہوں، ان اناجیل اربعہ میں ان کے یہ اقوال موجود ہیں جن کو آج عیسائی لوگ مانتے ہیں۔ لہٰذا عیسائیوں کے اصل مذہب میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی شریعت حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تورات سے مختلف نہیں تھی۔ لیکن پولوس یا سینٹ پال نے جس طرح دین عیسوی کو بگاڑا، اس میں یہ دعویٰ بھی کیا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آنے پر تورات کے سارے احکام منسوخ ہو گئے ہیں۔

سینٹ پال کا ذکر میں نے پہلے بھی کیا تھا۔ اردو میں جب اس کا نام لیتے ہیں تو پولوس کہا جاتا ہے۔ یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے زمانے میں موجود تھا، اور یہودی تھا اور اس کا نام بھی ساؤل تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے عروج آسمانی کے بعد جب حواریوں نے تبلیغ شروع کی تو یہ شخص حواریوں کو تکلیف پہنچانے میں اور ان پر ظلم وستم ڈھانے میں پیش پیش تھا۔ لیکن اس نے ایک عرصہ دراز تک عیسائی حواریوں پر ظلم وستم ڈھانے کے بعد اچانک یہ دعویٰ کیا کہ میں ایک مرتبہ دمشق سے آرہا تھا تو میرے اوپر ایک نور چمکا، اور اس نور میں سے آواز آئی کہ ''اے ساؤل! تو مجھے کیوں ستاتا ہے؟ یہ آواز حضرت مسیح علیہ السلام کی تھی، اور مطلب یہ تھا کہ میرے پیروؤں کو اور میرے حواریوں کو کیوں ستاتا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ اس واقعے کے بعد میں نے اپنی سابقہ زندگی سے توبہ کر لی، یہودی مذہب کو چھوڑ دیا اور بس عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا، اور اب میں عیسائی بن گیا۔ لیکن عیسائی بن کر پولوس نے عیسائی مذہب کو بگاڑ کر ایک بالکل نیا مذہب بنا دیا، جس کا انجیلوں والے مذہب سے کوئی تعلق نہیں تھا۔ تثلیث، کفارہ وغیرہ کے عقیدے اسی نے ایجاد کیے جبکہ چاروں انجیلوں میں ان کا کوئی ذکر تک نہیں ہے۔ آج بھی انجیلوں میں آپ کو تثلیث کا لفظ کہیں نہیں ملے گا، تثلیث کا عقیدہ نہیں ملے گا، کسی انجیل کا کوئی ایک فقرہ بھی ایسا پیش نہیں کیا جا سکتا جس میں یہ کہا گیا ہو کہ خدا تین ہوتے ہیں، یا خدا تین اقانیم سے عبارت ہے، باپ اور بیٹا اور روح القدس۔ یہ بات پوری اناجیل میں کہیں موجود نہیں ہے۔ یعنی ان تحریف شدہ اناجیل میں بھی تثلیث کا کوئی عقیدہ موجود نہیں ہے۔ کفارے کا کوئی عقیدہ پورے اناجیل کے اندر موجود نہیں ہے، جن باتوں پر موجودہ عیسائی مذہب کی بنیاد ہے، ان میں سے ایک عقیدہ بھی اناجیل میں موجود نہیں ہے، وہ سب پولوس کے گھڑے ہوئے ہیں۔

پولوس نے جہاں اور بہت سی چیزوں میں ترمیمات کیں اسی طرح ایک بہت بڑی ترمیم یہ کی کہ تورات کے قانون کو لعنت قرار دیا، اور کہا کہ میں اس لعنت کے جوئے سے لوگوں کو چھڑانے کے لیے آیا ہوں۔ یہ ایک لمبی داستان ہے کہ اس نے کس طریقے سے حواریوں کا اثر ورسوخ ختم کر کے اپنا اثر ورسوخ قائم کیا۔ میری کتاب ''عیسائیت کیا ہے؟'' میں اس کی پوری تفصیل موجود ہے۔

بہرحال! اس نے تورات کے احکام کو یہ کہہ دیا کہ یہ منسوخ ہیں، اور اب صرف وہ باتیں عیسائی مذہب میں قابل عمل ہیں جو اناجیل اربعہ میں مذکور ہیں۔ اب اگر آپ چاروں انجیلوں کا مطالعہ کریں تو ان میں

کوئی تمدنی یا سیاسی حکم مشکل سے ملے گا، سوائے اس کے کہ اگر کوئی تمہارے ایک تھپڑ مارے تو تم دوسرا گال بھی آگے کر دو، کوئی اگر تم سے کرتہ چھینے تو تم اپنا چغہ بھی پیش کر دو۔ مطلب یہ ہے کہ رواداری، تحمل اور بردباری ان کے اخلاقی اسباق ضرور موجود ہیں، لیکن احکام اور قوانین سے متعلق کوئی چیز ہے ہی نہیں۔ اب تصور فرمائیے کہ جب سرے سے کوئی قانون موجود ہی نہیں ہے تو اگر موجودہ عیسائی مذہب کی بنیاد پر کوئی حکومت قائم کی جائے تو اس کا رشتہ ان اناجیل سے تو قائم ہو ہی نہیں سکتا، اس لیے کہ اناجیل میں تو حکومت سے متعلق کوئی حکم ہے ہی نہیں۔ لہٰذا چوتھی صدی میں جب قسطنطین نے عیسائی مذہب قبول کر کے عیسائی مذہب کو سرکاری مذہب قرار دے دیا تو سوال پیدا ہوا کہ مذہب کی بنیاد پر قانون کیسے بنایا جائے جب کہ اناجیل اربعہ میں قانون کا کوئی ذکر ہے ہی نہیں ہے؟ یعنی اتنا ذکر بھی نہیں ہے جتنا تورات میں موجود تھا۔ تورات میں کم از کم کچھ تعزیراتی قوانین موجود تھے، کچھ دیوانی قوانین تھے، اگرچہ حکومت چلانے کے لئے پھر بھی مذہبی پیشواؤں کے مراقبے کی ضرورت پڑتی تھی، لیکن انجیلوں میں تو اتنے قوانین بھی موجود نہیں تھے۔ لہٰذا اب ایک اور فلسفہ گھڑا گیا، وہ یہ کہ قوانین بنانے کا مکمل اختیار کلیسا کو حاصل ہے۔

یہاں یہ سمجھنا ضروری ہے کہ کلیسا جس کو چرچ کہتے ہیں، وہ کیتھولک عیسائی مذہب میں صرف ایک عبادت گاہ نہیں ہے، بلکہ ایک مستقل ادارہ ہے۔ ہمارے ہاں مسجد ایک عبادت گاہ ہے اور بس! لیکن عیسائی مذہب میں کلیسا ایک پیچیدہ قسم کا ادارہ ہے۔ اس کے بارے میں فلسفہ یہ اختیار کیا گیا ہے کہ وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے سب سے مقدس حواری پُطرس کا نائب ہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارہ حواری تھے۔ ان میں عیسائی مذہب کی رو سے سب سے افضل حواری اور سب سے بلند رتبہ حواری جن کے پاس حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علوم منتقل ہوئے، وہ تھے جناب پُطرس، جن کو انگریزی میں Peter کہتے ہیں۔ اور عیسائی مذہب کا دعویٰ یہ ہے کہ کلیسا بحیثیت ایک ادارے کے جناب پُطرس کا نائب ہے، یعنی یوں سمجھ لیجئے کہ بلا تشبیہ اسلام میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کا جو مقام ہے، وہ عیسائیوں کے نزدیک جناب پُطرس کا ہے، بلکہ اس سے بھی بڑھ کر، کیونکہ عیسائیوں کے نزدیک تمام حواری پیغمبر بھی تھے۔ ان کا کہنا یہ ہے کہ پُطرسؑ نے اپنے بعد کام کرنے کے لیے مذہبی پیشواؤں کو وصیت کی تھی، اور یہ کلیسا کا ادارہ ان مذہبی پیشواؤں کے ذریعے قائم ہوا۔ لہٰذا یہ پطرس کا نائب ہے۔ اسی ادارے کو احکام وقوانین وضع کرنے کا حق حاصل ہے۔ کلیسا کا جو سربراہ ہوتا ہے اس کا نام پوپ یا پاپا ہے، اور اس پوپ کے تحت مذہبی پیشوائیت کا ایسا گا بندھا منضبط نظام ہے کہ مذہبی پیشوائیت کے مختلف درجے ہیں، اور ہر درجے کے اختیارات اور فرائض منصبی متعین ہیں۔ سب سے پہلے نیچے درجے میں ڈیکن (Deacon) ہوتا ہے، پھر آرچ ڈیکن (Arch Deacon) ہوتا ہے، پھر بشپ (Bishop) پھر آرچ بشپ (Arch Bishop) پھر کارڈینل (Crdinal) ہوتا ہے، پھر ستر کارڈینل مل کر پوپ کا انتخاب کرتے ہیں۔ پادری (Preist) تو ایسا لفظ ہے جیسے عبادت کرانے والا، یا علم دینے والا، اس کے وہ مختلف

درجات ہیں جن میں سے کچھ کے نام میں نے ذکر کئے ہیں، اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ پادری ہو لیکن مذکورہ درجات میں سے کوئی درجہ اس کو حاصل نہ ہو۔ غرض کلیسا کے ادارے میں درجہ بدرجہ مناصب ہیں، ان کے نظام کو عربی میں ''نظام الکہنوت'' اور انگریزی میں ہائرارکی (Heirarchy) کہتے ہیں، اور مختلف مناصب پر فائز افراد کے مجموعے کو کلرگی (Clergy) کہتے ہیں۔

کلیسا کے اس درجہ بدرجہ نظام میں کسی کا داخل ہونا اس کی علمی یا عملی قابلیت ہی کی بنیاد پر نہیں ہوتا، بلکہ اس میں نسلی تصورات بھی شامل ہوتے ہیں، اس میں وطنی تصورات بھی شامل ہوتے ہیں، اس میں انتخاب بھی شامل ہے، یعنی ایک کونسل ہوتی ہے جو مختلف مناصب پر کسی کو فائز کرنے کے لئے انتخاب کرتی ہے، اور اس انتخاب میں وہ سارے ہتھکنڈے چلتے ہیں جو سیاسی انتخابات میں ہوا کرتے ہیں، اور بسا اوقات ان میں نسلی پابندیاں بھی ہوتی ہیں۔ مثلاً ایک آبادی ہے جس میں کالے بھی ہیں اور گورے بھی ہیں، اور ہیں سب عیسائی، تو ہوسکتا ہے کہ بشپ ہمیشہ گورا ہی بنے، کالا نہ بن سکے۔ چاہے وہ کتنا ہی زیادہ علم حاصل کرلے۔ پھر یہ بات طے شدہ ہے کہ پوپ چونکہ کلیسا کا نمائندہ ہے، اور کلیسا حضرت پطرس کا خلیفہ ہے، لہٰذا پوپ کو معصوم عن الخطا قرار دیا گیا ہے۔ رومن کیتھولک مذہب کا یہ عقیدہ ہے کہ پوپ معصوم اور مذہبی معاملات میں غلطیوں سے پاک ہے۔ اس کے لئے انگریزی اصطلاح (Infallible) استعمال ہوتی ہے، یعنی وہ شخص جو کبھی پھسل نہیں سکتا۔ لیکن اس کی معصومیت امور تشریعیہ تک محدود ہے، یعنی جس وقت وہ کوئی شریعت کا حکم جاری کرے، یا کوئی قانون نافذ کرے تو وہ معصوم ہے، اور خطا نہیں کرسکتا۔ یہاں یہ بھی واضح رہے کہ پوپ صرف شارح قانون نہیں ہوتا، بلکہ وہ شارع یعنی قانون ساز بھی ہوتا ہے، اور اسے قانون وضع کرنے کا بھی اختیار بھی ہوتا ہے، اور اس معاملے میں اسے معصوم سمجھا جاتا ہے، البتہ باقی معاملات میں اس سے خطا ہوسکتی ہے۔ جب تک کوئی شخص پوپ نہیں بنا، اس وقت تک وہ معصوم نہیں ہے، لیکن جونہی اسے پوپ بنا دیا گیا، وہ بھی معصوم ہوگیا۔

اب ایک طرف تو انجیلوں میں حکومت وسیاست کے معاملات میں واضح قوانین موجود نہیں، دوسری طرف پوپ اتنے زبردست اقتدار کا مالک ہے کہ اس کو معصوم عن الخطا قرار دیدیا گیا ہے۔ اب سارا دارومدار پوپ پر ہوگیا کہ وہ جو چاہے حکم جاری کردے، جو چاہے قانون نافذ کردے، کوئی فرد بشر اس کو چیلنج نہیں کرسکتا۔

ایک طرف تو یہ اتنا غیر محدود اقتدار، دوسری طرف پوپ کے تقرر اور انتخابات میں نسلی اور قومی تعصبات کے عمل دخل کی وجہ سے یہ ضروری نہیں رہا کہ پوپ اسی کو بنایا جائے جو دوسروں پر علمی اور عملی اعتبار سے فوقیت رکھتا ہو۔ نتیجہ یہ کہ اس زبردست اقتدار والے منصب پر انتہائی نااہل لوگ بھی فائز ہوئے۔ نوبت یہاں تک آئی کہ ایک مرحلے پر زبردست اختلاف پیدا ہوا کہ کس کو پاپ بنایا جائے تو آخر کار قرعۂ فال ایک بحری قزاق کے نام پر پڑا بحری ڈاکو تھا۔ اس کا نام جون Jhon تھا، اور روپ

23واں جون Jhon Twenty Third کہلاتا ہے اور پوپ چونکہ تشریعی معاملات میں معصوم عن الخطا ہوتا ہے، اس لئے یہ سارے اختیارات اس کو بھی ملے۔ اس طرح اس پاپائیت میں سب تو نہیں لیکن ایک بہت بڑی تعداد ایسے لوگوں کی تھی جنہوں نے بدعنوانیوں یں کوئی کسر نہیں چھوڑی۔ یہاں تک یہ نوبت آ گئی کہ پوپ نے ایک مرتبہ یہ حکم جاری کر دیا کہ جس کو جنت میں جانا ہو، وہ ہم سے مغفرت کا پروانہ لکھوائے، اور اس مغفرت نامے کی بھاری قیمت کلیسا وصول کرتا تھا۔ ہزار ہا روپے میں مغفرت نامے فروخت ہوتے تھے، اور یہاں تک کہ جن مُردوں کو مرے ہوئے عرصہ دراز ہو چکا، ان کی ہڈیاں بھی گل سڑ گئیں، اب ان کے کسی وارث کو خیال آیا کہ ان کو جنت میں پہنچانا چاہئے، تو وہ پوپ کے پاس پہنچ گیا اس نے کہا کہ میرا فلاں عزیز مرا تھا، آپ اس کے لئے کوئی مغفرت کا انتظام کریں۔ جواب میں کلیسا پیسے لے کر مغفرت نامہ جاری کر دیتا تھا۔

دوسری طرف ان پاپاؤں نے بادشاہوں کا ناک میں دم کر رکھا تھا۔ اس لیے کہ بادشاہ ان کی ''معصوم'' تشریح احکام کے پابند تھے، کوئی کام ان کی مرضی کے بغیر نہیں کر سکتے تھے۔ اس لئے ان کے درمیان آپس میں رقابتیں بھی قائم ہوئیں۔ عاجز آ کر کبھی کبھی بادشاہ کہہ دیتا تھا کہ میں نہیں مانتا۔ تو وہ اس پر بدعتی ہونے کا مذہبی فتویٰ جاری کر دیتے تھے، اور اس کے نتیجے میں وہ بادشاہ معزولی کا مستحق ہو جاتا تھا۔

تیسرے اپنے مخالفین کو دبانے کے لئے انہوں نے ایک انتہائی سنگدل محکمہ قائم کر لیا تھا، جو تحقیق و تفتیش کا محکمہ (inquisition) کہلاتا تھا، اور اسے ہر شخص کے حالات کی غیر معمولی تفتیش کے بڑے وسیع اختیارات حاصل تھے کہ اس کے عقائد کیا ہیں؟ یہ تنہائی میں کیا باتیں کرتا ہے؟ کونسی کتابوں کا مطالعہ کرتا ہے؟ کن لوگوں سے اس کے تعلقات ہیں؟ اور دوسرے ملکوں میں جاتا ہے تو وہاں کن کن لوگوں سے ملتا ہے؟ اور یہ ایک ایسا شکنجہ تھا کہ جو بھی اس میں پھنس گا دیا اس کے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں تھا۔ ہر محلے کے اندر خفیہ جاسوسی کے لئے ان کے نمائندے موجود تھے، اور وہ شکایتیں ان کے پاس لاتے تھے، جو لوگ اس محکمے کے ظلم وستم کا نشانہ بنے، ان کی کھالیں نوچی گئیں، ناخن اتار دیئے گئے، زندہ جلا دیا گیا اور ظلم وستم و بربریت کا کوئی شعبہ ایسا نہیں ہے جو روا نہ رکھا گیا ہو۔

آپ کو معلوم ہے کہ اندلس پر 700 سال مسلمانوں نے حکومت کی، اور غرناطہ کے آخری تاجدار ابوعبداللہ نے عیسائی فوج کے آگے ہتھیار ڈال دیئے تو مسلمانوں کی حکومت اندلس سے ختم ہوئی، اس وقت ابوعبداللہ اور عیسائی باشاہ فرڈینینڈ کے درمیان ایک معاہدے پر دستخط ہوئے۔ اس معاہدے کے اندر یہ بات طے تھی کہ مسلمان اپنی عبادت کے لیے آزاد ہوں گے، اور مسلمانوں کی عبادت گاہیں برقرار رکھی جائیں گی، مسلمانوں کے ساتھ عبادات اور تعلیم میں کوئی ترض نہیں کیا جائے گا۔ لیکن جوں ہی فرڈینینڈ کی افواج غرناطہ میں داخل ہوئیں، وہ معاہدہ عملی طور پر اتنا بے حقیقت بنا دیا گیا کہ اس کی کسی ایک دفعہ پر بھی عمل نہیں

ہوا۔ساری مسجدیں کلیساؤں میں تبدیل کردی گئیں،سارے کتب خانے غرناطہ اورقرطبہ کے چوراہوں کتابوں کے ڈھیر کی شکل میں اس طرح جلائے گئے کہ مہینوں آگ نہیں بجھی،اوراس کے بعد مسلمانوں کے خلافInquisition کی کاروائیاں شروع کی گئیں کہ کون مسلمان ہے جوعیسائی مذہب کے بارے میں کوئی لفظ زبان سے نکالتا ہے؟اوراس کے نتیجے میں بے پناہ اذیتیں مسلمانوں کو دی گئیں،جس کے نتیجے میں مسلمانوں کو وہاں سے ہجرت کرنے پر مجبور ہونا پڑا،اورالجزائراورمراکش میں جا کرانہوں نے پناہ لی۔

اسی محکمے کا دستور یہ بھی تھا کہ اگر پوپ نے کوئی حکم جاری کردیا،اوراس سے کسی شخص کواختلاف ہوا کہ مثلاً یہ حکم بائبل کے تقاضوں کے خلاف ہے،یا عیسائی مذہب کی روح کے مطابق نہیں ہے،تو اگراس نے کھڑے ہوکرایسی کوئی بات کہہ دی تو کلیسا ایسے شخص کو بدعتیHeretic قرار دیتا تھا،اور بدعتی کا مطلب ان کے یہاں تھا کہ یہ اب ہمارے معاشرے میں زندہ رہنے کے لائق نہیں ہے۔اس کو سزائے موت ہی ہونی ہے۔یہاں تک کہ آپ کو شاید کہ یہ سن کر حیرت ہوگی کہ 14ویں یا15ویں صدی عیسوی تک بائبل کا ترجمہ کرنا جرم تھا۔بائبل کا ترجمہ نہیں ہوسکتا تھا۔بلکہ اگر کوئی شخص ترجمہ کرنے کی کوشش کرتا تو اس کو روکا جاتا تھا،مجرم قرار دیا جاتا تھا۔ترجمہ کرنا اس لئے منع تھا کہ جو اصل بائبل ہے،وہ اپنے ہی حلقے میں محدود رہے،اور کوئی باہر کا آدمی اس کو پڑھ کر یہ نہ کہہ سکے کہ تم نے فلاں حکم جو جاری کیا ہے،وہ بائبل کے حکم کے خلاف ہے۔اس لئے ترجمہ کرنا جرم تھا۔اسی دور میں ایک شخص پیدا ہوا جس کا نام جان ہس(John Huss)تھا،اس نے سب سے پہلے ان سے چھپ چھپ کر بائبل کا ترجمہ کیا تو ترجمہ کرنے کے نتیجے میں اس کو زندہ جلا دیا گیا۔یہ تھی پاپائیت اورعیسائیت کی تھیوکریسی جس کے طور طریقے میں نے آپ کے سامنے عرض کئے۔

اس سے آپ اندازہ کرسکتے ہیں کہ نام تو تھا خدا کی حاکمیت کا،لیکن حقیقت میں وہ چندافراد کی بدترین آمریت تھی،اور چندافراد کی بدترین ڈکٹیٹرشپ تھی،اورانہوں نے خدا کے نام پر ایک طوفان مچا رکھا تھا۔

اگرچہ یہ ساری تصویر جو میں نے آپ کے سامنے عرض کی ہے،اس میں پروٹسٹنٹ فرقے کے لوگوں نے بہت زیادہ مبالغہ سے کام لے کر اس میں طرح طرح کے رنگ بھر بھی پیش کئے ہیں،حقیقت میں ایسا نہیں تھا کہ یہ نظام سراسرخرابیوں پر ہی مبنی ہو،اس میں اچھے دور بھی آئے،اس میں بعض باتیں ایسی بھی تھیں جن پر اس قسم کے اعتراض وارد نہیں ہوتے تھے،لیکن اس مبالغے کے پہلو کو بھی تھوڑا سا الگ کرلیا جائے تب بھی وہ حقائق جو میں نے عرض کیے ہیں کہ پوپ کو معصوم سمجھا جاتا تھا،مغفرت ناموں کی تجارت ہوتی تھی،اور پوپ کا تشریعی حکم قانون کا درجہ رکھتا تھا اور وہ شارع قانون سمجھا جاتا تھا،اور تفتیش کے محکمے میں مظالم ہوتے تھے،اور بادشاہ اس بے مہار اختیار سے پریشان رہتا تھا،یہ ایسی باتیں ہیں جن میں کسی کا اختلاف نہیں ہے،اور عیسائی تھیوکریسی کی بنیاد انہی چیزوں پر قائم ہوئی ہے۔

اس تصور کو آپ سامنے رکھ کر غور کریں تو اس سے خود بخود یہ بات واضح ہو جاتی ہے کہ اسلامی حکومت یا علمائے کرام کی سیاست میں شمولیت کو جو تھیوکریسی کا نام دے کر روکا جاتا ہے، اس کا اس تھیوکریسی سے کوئی تعلق نہیں ہے، جو رومی حکومتوں میں جاری رہی ہے، بلکہ اسلامی حکومت کے تصور اور عیسائی تھیوکریسی کے درمیان بعد المشرقین ہے۔ غور سے دیکھا جائے تو اسلامی حکومت کے قیام اور عیسائی تھیوکریسی کے درمیان مندرجہ ذیل واضح فرق موجود ہیں۔

اسلامی حکومت اور عیسائی تھیوکریسی میں کیا فرق ہے ؟

① انجیلوں میں سیاست وحکومت سے متعلق احکام نہ ہونے کے برابر ہیں، اس لئے ان احکام کو وضع کرنے کا تمام اختیار مذہبی پیشواؤں کو حاصل ہے۔ اس کے برعکس اسلامی احکام کی بنیاد قرآن کریم اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر ہے اور ان دونوں میں مجموعی طور پر صریح احکام کی ایک بڑی مقدار موجود ہے، اور جہاں واضح نصوص موجود ہوں، وہاں کسی شخص کی انفرادی رائے کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

② عیسائیوں کے یہاں کلیسا ایک مستقل ادارہ ہے، جس کے افراد کو انسان ہی منتخب کرتے ہیں، اور یہ ادارہ جو قانون طے کر دے، اس سے کسی کو اختلاف کا حق حاصل نہیں ہے۔ اس کے برعکس اسلام میں اس قسم کا کوئی ادارہ موجود نہیں ہے۔ البتہ قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کے لئے منطقی طور پر اہلیت کی کچھ شرائط ضرور مقرر ہیں، لیکن جو کوئی ان شرائط پر پورا اترتا ہو، وہ قرآن وسنت کی تعبیر وتشریح کر سکتا ہے۔ اس کے بعد کوئی لگا بندھا ادارہ نہیں، بلکہ امت کا اجتماعی ضمیر اسے قبول کرنے یا رد کرنے کا فیصلہ رکھتا ہے۔ بلکہ اگر دو مستند مجتہدین میں اختلاف ہو تو حاکم ان میں سے کسی رائے کو اختیار کر کے اسے نافذ کر سکتا ہے، پھر اسی کو بطور قانون تسلیم کرنا سب پر لازم ہو جاتا ہے، چاہے کسی کی ذاتی رائے اس کے خلاف ہو۔

یہاں تک کہ آپ نے مشہور واقعہ سنا ہوگا جو طبقات ابن سعد میں منقول ہے کہ ابو جعفر منصور نے امام مالک رحمہ اللہ سے درخواست کی کہ میں آپ کی کتاب موطا امام مالک کو اور آپ کے مذہب کے احکام کو ملک کے قانون کی حیثیت میں نافذ کرنا چاہتا ہوں۔ امام مالک رحمہ اللہ نے منع کیا کہ نہیں، میں یہ نہیں چاہتا کہ اپنے اجتہادات کو پوری امت پر نافذ کر دوں، اس لئے کہ ہر شخص کو جو قرآن وسنت میں بصیرت رکھتا ہو، اجتہاد کا حق حاصل ہے، اور اس اجتہاد کے حق کے نتیجے میں ہو سکتا ہے کہ میری رائے سے اختلاف کرے، لہٰذا میں سب کو ایک اجتہاد کا پابند نہیں کر سکتا۔

③ عیسائیت میں پوپ کو تشریعی معاملات میں معصوم عن الخطا قرار دیا گیا ہے، اس کے برعکس اسلامی عقیدے کی رو سے عصمت صرف انبیاء کرام علیہم السلام کے ساتھ خاص ہے، اور نبوت کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد نہ کوئی عصمت کا دعویٰ کر سکتا ہے، نہ آج تک کسی بڑے سے بڑے عالم نے یہ دعویٰ کیا ہے۔

اسلام میں کسی ایک ادارے یا کسی ایک نظام کو معصوم قرار نہیں دیا گیا۔ البتہ یہ ضرور فرمایا گیا ہے کہ پوری امت کسی گمراہی پر متفق نہیں ہوسکتی ہے۔ لہٰذا اگر کسی مسئلے پر پوری امت متفق ہوجائے تو وہ برحق ہوگا۔ اس کے علاوہ قرآن وسنت کی تشریح کا کام نہ کسی نسل کے ساتھ مخصوص ہے، نہ کسی پیشے کے ساتھ، نہ کسی نسب کے ساتھ، بلکہ وہ کچھ علمی صلاحیتوں پر مبنی ہے۔ وہ علمی صلاحتیں اور صفات جس میں بھی اپی جائیں وہ قرآن وسنت کی تشریح کا حق رکھتا ہے۔ پھر مجتہدین امت کی تشریحات دوسروں کے سامنے پیش ہوتی ہیں، وہ ان پر تنقید کرنے کا حق رکھتے ہیں، وہ ان سے مباحثہ ومناظرہ کرنے کا حق رکھتے ہیں، اوراس کے نتیجے میں امت اسلامیہ کا اجتماعی ضمیر کسی ایک رائے کو اختیار کرلیتا ہے۔

لہٰذا عیسائی تاریخ میں جو تھیوکریسی رہی ہے، اس کو اسلامی نظام حکومت پر چسپاں کرنا انتہائے درجے کے ظلم کی بات ہے۔ آج کل جب اسلامی حکومت کی بات کی جاتی ہے تو بعض مغربی تعلیم پائے ہوئے طبقوں کی طرف سے کہا جاتا ہے کہ علماء پاپائیت قائم کرنا چاہتے ہیں۔ یہ بات درحقیقت پاپائیت کی حقیقت اور اسلام میں علمائے دین کے کردار کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ اگر آدمی کے سامنے حقیقت واضح ہو کہ پاپائیت کیا تھی، اور علماء اسلام کا مقام شریعت نے کیا مقرر کیا ہے تو اسکے بعد یہ مغالطہ کسی کو پیش نہیں آسکتا۔ ہاں یہ ضرور ہے کہ اسلام نے قرآن وسنت کی تشریح کے لئے کچھ صفات اہلیت مقرر کی ہیں، وہ صفات اہلیت اگر پائی جائیں تو بے شک انسان کو قرآن وسنت کی تشریح کا حق حاصل ہے، اور اگر صفات اہلیت موجود نہیں ہیں تو پھر اس کو حق حاصل نہیں ہے۔ ہر کہہ ومہہ اٹھ کر کھڑا ہو کر یہ کہنے لگے کہ اسلام میں پاپائیت نہیں ہے، لہٰذا اگرچہ میں نے ساری عمر قرآن نہیں پڑھا، اور نہ حدیث کا علم حاصل کیا ہے، لیکن میں بھی کوئی رائے دینے کا حق رکھتا ہوں تو اس حماقت کا کوئی علاج نہیں۔ ہر علم وفن کے دائرے میں کچھ صفات اہلیت درکار ہوتی ہیں، وہ صفات اہلیت پیدا کرلو تو تمہیں بات کرنے کا حق حاصل ہے۔ لیکن اگر وہ صفات اہلیت موجود نہیں ہیں تو پھر اس کر اگر علماء رد کرتے ہیں اس کو پاپائیت اور تھیوکریسی کا طعنہ نہیں دیا جاسکتا۔

خلاصہ یہ ہے کہ تھیوکریسی اپنے اصل معنی اور تصور کے لحاظ سے کوئی غلط عقیدہ نہیں ہے، کیونکہ تھیوکریسی کے معنی ہیں: اللہ تبارک وتعالٰی کی حاکمیت۔ لیکن اس تھیوکریسی کو یہودی مذہب، عیسائی مذہب اور دوسرے مذاہب میں جس طرح نافذ کیا گیا، اس نے حالات کا ستیاناس کیا، لیکن اگر اسلام کے اصولوں کے مطابق حکومت قائم ہو تو اس میں وہ خرابیاں کسی طریقے سے بھی پیدا نہیں ہوسکتیں۔

کفارے کے عقیدہ کا تھیو کریسی کے ساتھ کیا ربط وتعلق ہے ؟

تھیوکریسی کے سلسلے میں ایک اہم پہلو اور عرض کرنا ہے۔ تھیوکریسی کے جو مختلف حامی گزرے میں، ان میں سے بعض لوگ تھیوکریسی کے جواز کے لیے عیسائیوں کے عقیدہ کفارہ کو بنیاد کے طور پر پیش کرتے

ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ اس عقیدہ کے مطابق چونکہ ہر انسان اصلی گناہ میں مبتلا ہے، اس لئے اس گناہ کی سزا ہیں اس کے لئے حکومت کا مکمل فرماں بردار ہونا ضروری ہے۔ اس لئے یہاں عیسائیوں کے عقیدہ کفارہ کو بھی سمجھ لینا ضروری ہے۔

عیسائیوں کا عقیدہ کفارہ اور اس کا پس منظر

عُقیدۂ کفارہ عیسائیت کا سب سے بنیادی عقیدہ ہے، اور عیسائیت کا لفظ میں یہاں اس عیسائیت کے لیے بول رہا ہوں جو پولس نے وضع کی تھی، ورنہ اصل عیسیٰ علیہ السلام کے مذہب میں اس کا کوئی وجود نہیں ہے۔ چاروں انجیلوں میں سے تین انجیلوں میں بھی اس کا ذکر نہیں ہے۔ چوتھی انجیل میں ایک مجمل سا جملہ آیا ہے جسے انہوں نے کفارے کی بنیاد بنایا ہے۔ لیکن بہر حال یہ عقیدہ بعد کے عیسائی مذہب کی جان سمجھا جاتا ہے، اس کے بغیر عیسائیت کا تصور ناممکن سمجھا جاتا ہے، اور یہ ان عقائد میں سے ہے جس پر عیسائیت کے سارے فرقے تقریباً متفق ہیں۔ رومن کیتھولک، آرتھوڈوکس، پروٹسٹنٹ غرض ہر قسم کے فرقے اس عقیدے کو مانتے ہیں، جو پولس نے وضع کیا تھا۔

یہ کفارے کا عقیدہ بڑا پیچیدہ قسم کا عقیدہ ہے۔ اس کا حاصل یہ ہے کہ اس کائنات میں سب سے پہلا گناہ حضرت آدم علیہ السلام سے سرزد ہوا تھا۔ یعنی جس وقت اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام پیدا کیا تو انہیں جنت میں رکھا جہاں وہ ہر قسم کے کام کے لیے آزاد تھے، ان کے اندر نیکی کی بھی صلاحیت تھی اور گناہ کی بھی صلاحیت تھی، اور آزاد قوت ارادی کے مالک تھے۔ چاہتے تو اپنی قوت ارادی کو نیکی کے لیے استعمال کرتے، اور چاہتے تو اس کو بدی کے لیے استعمال کرتے۔ ان پر صرف ایک پابندی لگائی گئی تھی کہ گندم نہ کھائیں۔ حضرت آدم علیہ السلام کے اس پابندی کو شیطان کے زیر اثر توڑا اور گندم کا دانہ کھالیا۔ یہ گندم کھانے کا جو گناہ کیا (نقل کفر کفر نباشد) وہ تمام گناہوں کا مجموعہ تھا، یعنی اس میں سارے گناہ اکٹھے تھے۔ یہ کفر بھی تھا اس لیے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کے حکم کا گویا انکار کیا گیا۔ اس میں تکبر بھی تھا، اس لئے کہ انسان نے اپنی ذات کو اللہ تعالیٰ کے حکم سے بالاتر سمجھا، اس میں حرص بھی تھی، اس لئے کہ گندم کی لالچ دل میں پیدا ہوئی، اس میں چوری بھی تھی، اس لئے کہ جب گندم کو منع کر دیا گیا تھا تو وہ ان کی ملکیت اور تصرف سے خارج تھا، انہوں نے وہ چیز جو اپنے تصرف سے خارج تھی، اس کو اپنے تصرف میں لیا اور کھالیا، لہٰذا یہ چوری بھی ہوئی۔ اس میں روحانی زنا بھی تھا، کیونکہ شیطان نے عورت کو بہکایا، اور حضرت آدم علیہ السلام (معاذ اللہ) عورت کی چکنی چپڑی باتوں میں آ کر اپنی ذاتی خواہش کو بروئے کار لائے۔ لہٰذا روحانی زنا بھی اس عمل میں موجود تھا۔

غرض سینٹ آگسٹائن جو تیسری صدی کا عیسائی عالم ہے، کہتا ہے کہ جتنے گناہ اس روئے زمین کے

اوپر پائے جاسکتے ہیں، ان سب کا ایک نہ ایک عکس اس گناہ میں موجود ہے، اس لیے یہ سارے گناہوں کا مجموعہ تھا جو حضرت آدم علیہ السلام سے سرزد ہوا۔ اس لیے اس کو عیسائی فلسفے کی اصطلاح میں اصلی گناہ (Original Sin) کہتے ہیں۔ ایک اس اعتبار سے کہ سب سے پہلا گناہ اس کائنات میں یہ ہی سرزد ہوا، اور دوسرے اس وجہ سے کہ یہ سارے گناہوں کی بنیاد تھی، اور تیسرا اس وجہ سے کہ کائنات میں اس سے پہلے گناہوں کا کوئی تصور نہیں تھا۔ آدم علیہ السلام کے اس گناہ نے گناہ کو وجود بخشا، تو اس لحاظ سے بھی یہ اصلی گناہ کہلاتا ہے۔ عیسائیوں کا ایک مفروضہ تو یہ ہے۔

دوسرا مفروضہ یہ کہ جس وقت حضرت آدم کو اللہ تعالیٰ نے گندم کھانے سے منع کیا تھا تو اس وقت ان سے یہ کہہ دیا تھا کہ گندم کھانے کی سزا موت ہوگی۔ کیونکہ تورات کی کتاب ''پیدائش'' میں جب یہ واقعہ بیان کیا گیا ہے تو وہاں الفاظ یہ ہیں کہ ''جس دن تو نے اس میں سے کھایا، تو مرا'' جس کی تشریح یہ کی جاتی ہے کہ گندم کھانے کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ اعلان کر دیا تھا کہ تم نے گندم کھایا تو گندم کھانے کی سزا موت ہوگی۔ یہ دوسرا مفروضہ ہے۔

تیسرا مفروضہ یہ ہے کہ اس اصلی گناہ کے نتیجے میں آدم علیہ السلام کی قوت ارادی سلب ہوگئی، یعنی جو آزاد اختیار ان کو حاصل تھا کہ چاہے گناہ کریں یا نیکی کریں، یہ آزاد اختیار سلب کر لیا گیا، اور وہ مسلوب الاختیار ہو گئے۔ جس کے نتیجے میں وہ گناہ کرنے کے لیے تو آزاد ہیں، لیکن نیکی کرنے کے لئے آزاد نہیں۔ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اختیار اطاعت سلب کیوں کیا گیا؟ تو اسکا جواب یوں دیا جاتا ہے کہ گناہ کا ایک لازمی نتیجہ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے دور ہو جانا ہے، انسان کو گناہ کرنے سے جو چیز روکتی ہے وہ اللہ تعالیٰ کی رحمت ہے، اور جب انسان اللہ کی رحمت سے دور ہو گیا تو اب وہ گناہ کرنے پر بالکل مجبور جیسا ہو گیا، نتیجہ اس کا یہ ہوا کہ اب خود اپنے کیے ہوئے گناہوں کا پشتارا اس پر لدتا چلا گیا۔ یہ تیسرا مفروضہ ہے۔

چوتھا مفروضہ یہ ہے کہ آدم علیہ السلام کی صلب سے جتنے انسان پیدا ہوئے، وہ چونکہ آدم علیہ السلام کے بیٹے تھے، اور آدم علیہ السلام کا خون ان کے اندر سرایت کر رہا تھا، اور آدم علیہ السلام اصلی گناہ کے مرتکب تھے، لہٰذا یہ اصلی گناہ ان کے تمام بیٹوں میں منتقل ہوتا چلا گیا۔ یعنی اب ماں کے پیٹ سے جو بچہ بھی پیدا ہوتا ہے، وہ گناہ گار پیدا ہوتا ہے کیونکہ وہ اصلی گناہ اس کی سرشت میں داخل ہے، اور گناہ گار پیدا ہونے کے معنی کا ایک حصہ یہ بھی ہے کہ جب انسان ماں کے پیٹ سے پیدا ہوتا ہے تو وہ مسلوب الاختیار ہوتا ہے، اور وہ گناہ کر سکتا ہے لیکن نیکی نہیں کر سکتا۔ لہٰذا ایک اصلی گناہ تو وہ ماں کے پیٹ سے اپنی سرشت میں لے کر پیدا ہوا تھا، اور دوسرے اس کے اختیار کے مسلوب ہونے کے نتیجے میں خود اس نے بہت سارے گناہ کیے۔ اب یہ صورتحال ایسی ہوگئی کہ ایک طرف ہر انسان گناہ گار پیدا ہو رہا ہے اور گناہ پر مجبور ہے، اور دوسری طرف گناہ کی جو سزا ہے وہ موت ہے، تو اب اس مخمصے کا کیا علاج ہو؟ جتنے انسان ہیں ان سب کو سزائے موت دی جائے، اور سزائے موت دے کر اس گناہ کے وبال سے نکالا جائے، اور اگر سب کو سزائے موت دیدی جائے

تو دنیا ختم ہو جائے، اور اگر سزائے موت دے کر سب کو زندہ کریں تو یہ فطرت کے قانون کے خلاف ہے۔ ایک شکل یہ ہو سکتی ہے کہ خود اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے معاف کر دے، لیکن عقیدہ کہتا ہے کہ یہ صورت بھی ممکن نہیں تھی، کیونکہ اللہ تعالیٰ جہاں رحیم ہیں، وہ منصف بھی ہیں، اور انصاف کا تقاضہ یہ ہے کہ جو گناہ کیا گیا ہے، گناہ گار کو اس گناہ کا کوئی نہ کوئی بدلہ ضرور ملے۔

اس لیے اس ضیق سے نکلنے کا خود اللہ تعالیٰ نے یہ طریقہ نکالا کہ اللہ تعالیٰ نے اپنی صفت کلام کو ایک انسانی شکل میں مجسم کر کے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی انسانی شکل میں دنیا میں بھیجا۔ وہ دنیا میں آئے، آنے کے بعد وہ یہاں پر موجود رہے، یہاں تک کہ بالآخران کو سولی دے دی گئی، تو انہوں نے سولی پر چڑھ کر اصلی سزائے موت خود اپنے اوپر جاری کروالی، اور اسکے نتیجے میں اللہ تعالیٰ کا یہ قول پورا ہو گیا کہ جس دن تو نے اس میں سے کھایا، اس دن تو مرا، اس طرح آدم علیہ السلام اور اس کے بیٹوں کے گناہ کی سزا اللہ تعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر جاری کر دی، اور ان کی موت کو پوری نوع انسانی کے لئے کفارہ بنا دیا، یعنی کفارے کے نتیجے میں تمام بنی نوع انسانی کا اصلی گناہ معاف ہو گیا، وہ اصلی گناہ جو حضرت آدم علیہ السلام نے کیا تھا اور جس کی وجہ سے انسان کی سرشت میں گناہ داخل ہو گیا تھا، اور جس کے نتیجے میں انسان اطاعت کی قوت سے محروم ہو گیا تھا، وہ اصلی گناہ اس کفارے کے ذریعے معاف ہو گیا، اور انسان کو دوبارہ نیکی اور بدی دونوں کا اختیار مل گیا۔ اگر چاہے تو نیکی کرے اور چاہے تو بدی کرے۔ لیکن یہ کفارہ اسی وقت انسان کے لئے کفارہ ہو سکتا ہے جب کہ وہ یسوع مسیح پر ایمان لائے۔ لہٰذا اس کفارے سے فائدہ اٹھانے کا واحد طریقہ یہ ہے کہ انسان یسوع مسیح پر ان کے بیٹا ہونے پر اور کفارہ ہونے پر ایمان لائے، جس کی علامت یہ ہے وہ بپتسمہ لے جسے اصطباغ بھی کہتے ہیں۔ یعنی اس خاص طریقے سے غسل کرے جو عیسائیت میں داخل ہونے کا لازمی تقاضہ ہے۔ یہ وہی چیز ہے جس کی طرف قرآن کریم کا اشارہ ہے: ''ومن احسن من اللہ صبغۃ'' یعنی یہ لوگ تو اصطباغ کرتے ہیں ظاہری رنگ سے۔ لیکن حقیقت میں صبغہ تو اللہ تعالیٰ کا ہے اور اللہ تعالیٰ کے رنگ سے بہتر رنگ کس کا ہو سکتا ہے۔

یہ ہے عقیدۂ کفارہ کا خلاصہ! تھیوکریسی کے بعض حامیوں نے اسی عقیدے پر اپنے نظریہ کی بنیاد رکھی کہ درحقیقت حکومت جو ہے، یہ اصلی گناہ کا عذاب ہے جو انسانوں کے اوپر مسلط کیا گیا ہے۔ یعنی اصلی گناہ جو انسان کی سرشت میں داخل تھا، اس کی وجہ سے اس بات کی ضرورت تھی کہ کوئی ہیئت حاکمہ ہو جو اس گناہ کو بدلہ دے، یا آئیندہ گناہ سے روکے۔ اس کے لیے اللہ تعالیٰ کا تخلیق کردہ ایک ادارہ ہے، جس کو حکومت کہتے ہیں، اور چونکہ یہ اللہ تعالیٰ کا تخلیق کردہ ادارہ ہے، لہٰذا ہر حاکم ہر بادشاہ اور ہر سربراہ حکومت تقدس کا حامل ہے، اور تقدس کا حامل ہونے کی وجہ سے وہ واجب الاطاعت ہے اور چاہے ظلم کرے، یا انصاف کرے، اس کو معزول کرنے یا ہٹانے کا یا اس کے حکم کی خلاف ورزی کرنے کا کوئی جواز کسی بھی انسان کے پاس موجود نہیں ہے۔ تھیوکریسی کے ایک فریق کا نقطہ نظر یہ ہے۔ اس سے آپ تھوڑا سا اندازہ لگا سکتے ہیں کہ انسان کہاں کہاں

بھٹکا ہے اور کیسے کیسے بھٹکا ہے؟ اور اللہ تبارک وتعالیٰ نے ہمیں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے صدقے میں کن گمراہیوں سے اور کن ضلالتوں سے نجات عطا فرمائی ہے!

واقعی روشنی کی قدر اندھیرے کے بعد معلوم ہوتی ہے، اور ہدایت کی قدر بھٹکنے کے بعد معلوم ہوتی ہے، جب اس دنیا میں ان ضلالتوں کا آدمی مطالعہ کرے اور ان کو دیکھے تب اسلام کی قدر معلوم ہوتی ہے۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم۔ کے قربان جایئے۔ کہ آپؐ نے ہمیں کس طریقے سے ان ضلالتوں سے نکالا ہے!

[اسلام اور سیاسی نظریات، ص ۴۳ تا ۵۲]

استفسارات

''شریعت کے فلاں حکم کی حکمت (Reason) سمجھ نہیں آتی''!
احکام شرعیہ کی علت و حکمت کے بارے میں سوال

اسی طرح آج کل لوگوں میں یہ مرض بہت عام ہے کہ جب کسی عمل کے بارے میں بتاؤ کہ شریعت میں یہ حکم موجود ہے کہ یہ کام کرو، یا یہ حکم ہے کہ فلاں کام مت کرو، تو لوگ یہ سوال کرتے ہیں کہ فلاں چیز کو جو حرام قرار دیا گیا ہے، یہ حرمت کا حکم کیوں دیا گیا ہے؟ اس کی کیا وجہ ہے؟ اور سوال کرنے والے کا انداز یہ بتاتا ہے کہ اگر ہمارے اس سوال کا معقول جواب ہمیں مل گیا اور ہماری عقل نے اس جواب کو صحیح تسلیم کرلیا تب تو ہم اس حکم شرعی کو مانیں گے ورنہ نہیں مانیں گے، حالانکہ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صاف صاف فرمادیا کہ جب میں نے تم کو کسی چیز سے روک دیا تو تمہارا کام یہ ہے کہ رک جاؤ اور اس تحقیق میں پڑنا تمہارا کام نہیں کہ اس روکنے میں کیا حکمت ہے؟ کیا مصلحت اور کیا فائدہ ہے؟

اللہ تعالیٰ اپنی حکمت اور مصلحت سے اس کارخانہ عالم کا نظام چلارہے ہیں، تم یہ چاہتے ہو کہ تمہارا یہ چھوٹا سا دماغ جو تمہارے سر میں ہے، اس کی ساری حکمتوں اور مصلحتوں کا احاطہ کرلے، حالانکہ آج کے دور میں سائنس اتنی ترقی کے باجود اس چھوٹے سے دماغ کی بھی پوری تحقیق نہیں کرسکی اور یہ کہتی ہے کہ اس دماغ کا اکثر حصہ ایسا ہے جس کے بارے میں اب تک یہ پتہ نہیں چل سکا کہ اس کا عمل کیا ہے؟ ایسے دماغ کے ذریعہ تم یہ چاہتے ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ساری حکمتوں کا احاطہ کرلو کہ فلاں چیز کو کیوں حرام کیا؟ اور فلاں چیز کو کیوں حلال کیا؟ بات یہ ہے کہ اپنی حقیقت سے ناواقفیت اور دل میں اللہ تعالیٰ کی عظمت کی کمی کے نتیجے میں اس قسم کے سوال ذہن میں آتے ہیں۔

جب یہ بات ذہن میں آجائے کہ وحی الٰہی شروع ہی وہاں سے ہوتی ہے جہاں عقل کی پرواز ختم ہوجاتی ہے تو پھر وحی الٰہی کے ذریعہ قرآن وسنت میں جب کوئی حکم آجائے اس کے بعد اس بنا پر اس حکم کو رد کرنا کہ صاحب اس حکم کا ریزن (Reason) میری سمجھ میں نہیں آتا احمقانہ فعل ہوگا، اس واسطے کہ وحی کا حکم آیا

ہی اس جگہ پر ہے جہاں ریزن کام نہیں دے رہی تھی، اگر ریزن کام دے چکی ہوتی تو پھر وحی کے آنے کی ضرورت ہی نہیں تھی، اگر اس حکم کے پیچھے جو حکمتیں ہیں اگر وہ ساری حکمتیں تمہاری عقل ادراک کر سکتی تھی تو پھر اللہ کو وحی کے ذریعہ اس کے حکم دینے کی چنداں حاجت نہیں تھی۔

آج ہمارے معاشرے میں جو گمراہی پھیلی ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ اللہ تعالی کے ہر حکم میں حکمت تلاش کرو کہ اس کی حکمت اور مصلحت کیا ہے؟ اور اس کا عقلی فائدہ کیا ہے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ اگر عقلی فائدہ نظر آئے گا تو کریں گے اور اگر فائدہ نظر نہیں آئے گا تو نہیں کریں گے، یہ کوئی دین ہے؟ کیا اس کا نام اتباع ہے؟ اتباع تو وہ ہے جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے کر کے دکھایا اور ان کے بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام نے کر کے دکھایا اور اللہ تعالی کو ان کا یہ عمل اتنا پسند آیا کہ قیامت تک کے لیے اس کو جاری کر دیا۔

صحابہ کرام حضور ﷺ سے کیسے سوال کرتے تھے؟

احکام کی حکمتوں کے بارے میں سوالات

دین کے احکام کی حکمتوں کے بارے میں لوگ بکثرت سوالات کرتے ہیں کہ یہ فلاں چیز حرام کیوں ہے؟ فلاں چیز منع کیوں ہے؟ دین کے معاملے میں یہ کیوں ہے؟ ہمارے معاشرے میں یہ سوالات بہت پھیل گئے ہیں، حالانکہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے حالات پڑھو گے تو یہ نظر آئے گا کہ حضور ﷺ سے صحابہ کرام سوالات کرتے تھے، لیکن اس میں ''کیوں'' کا لفظ کہیں نہیں ملے گا، حضور ﷺ سے انہوں نے کبھی یہ نہیں پوچھا کہ آپ جو بات کر رہے ہیں یہ کیوں کر رہے ہیں؟ یا یہ حرام کر رہے ہیں تو کیوں کر رہے ہیں؟

اب آپ کو ایک مثال دیتا ہوں، وہ یہ ہے کہ اللہ تعالی نے سود حرام کیا، یعنی قرضہ دے کر اس کے او پر زیادہ پیسے لینا سود ہے، قرآن نے س کو حرام کہا اور کہا کہ جو یہ نہ چھوڑے وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلان جنگ سن لے، اتنی زبردست وعید بیان فرمائی، اس کے بارے میں تو صحابہ کرام یہ سوال کیسے کرتے کہ یہ کیوں حرام ہے؟ یہاں تک کہ بعد میں جب حضور اقدس ﷺ نے اس سود کی حرمت کی طرف لے جانے والے کچھ معاملات کو بھی حرام کیا، مثلاً ایک بات یہ حرام کی کہ اگر کوئی شخص گندم کو گندم سے بیچ رہا ہے تو چاہے ایک طرف گندم اعلی درجہ کا ہو اور دوسری طرف معمولی درجہ کا ہو تب بھی دونوں کا برابر ہونا ضروری ہے، اگر اعلی درجہ کا گندم دو سیر ہو، اور ادنی درجہ کا گندم چار سیر ہو، اور دونوں کو ایک دوسرے کے ذریعہ فروخت کیا جائے تو اس کو بھی آپ ﷺ نے حرام اور ناجائز فرمایا، یا مثلاً اچھی کھجور ایک سیر اور خراب کھجور دو سیر، اگر آپس میں بیچی جائیں تو فرمایا کہ یہ بھی حرام ہے، اب بظاہر تو عقل میں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ جب ایک اچھے درجے کا گندہ ہے تو اس کی قیمت بھی زیادہ ہے، اس کا فائدہ بھی زیادہ ہے اور جو ادنی

درجے کا گندم ہے اس کی قیمت بھی کم ہے اور اس کا فائدہ بھی کم ہے تو اگر ادنی درجے کے دو سیر اور اعلی درجے کا ایک سیر ملا کر فروخت کیا جائے تو اس میں کیا خرابی ہے؟ لیکن جب نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمادیا کہ گندم کی بیع جب گندم سے ہوگی تو برابر سرابر ہونا چاہیے، چاہے اعلی درجے کا ہو یا ادنی درجے کا ہو، کسی ایک صحابی نے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حکم سن کر نہیں فرمایا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کیوں؟ کیا وجہ ہے؟ جبکہ وہ اعلی اور یہ ادنی ہے، وجہ یہ تھی کہ لفظ ''کیوں'' کا سوال صحابہ کرام کے ہاں نہیں تھا، اس لیے کہ انہیں اللہ تعالی پر اور نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر ایسا بھروسہ تھا کہ جو حکم یہ دے رہے ہیں وہ برحق ہے، ہماری سمجھ میں آئے تو برحق ہے، نہ آئے تو برحق ہے، ہمیں حکمت کے پیچھے پڑنے کی حاجت نہیں، جب کہہ دیا کہ حرام ہے تو حرام ہے۔

یہ تھا صحابہ کرام کا طریقہ، آج سب سے زیادہ ''کیوں'' کا سوال ہے، آج جو گندم کی بات میں عرض کر رہا ہوں یہ کسی کے سامنے عرض کر کے دیکھ لو، وہ چھوٹتے ہی یہ کہے گا ''کیوں''؟ یہ کیوں ناجائز ہے؟ سب سے پہلے اس کا سوال یہی ہوگا، اور اسے تو چھوڑو، آج کل جو قرض والا اصل سود ہے اس کے بارے میں لوگ کہتے ہیں کہ یہ حرام کیوں ہے؟

بہر حال! کثرت سوال ایک بڑی بیماری ہے، احکام شرعیہ کے بارے میں یہ سوال کرنا کہ یہ کیوں ہے؟ یہ سوال ٹھیک نہیں، البتہ اگر کوئی شخص ویسے ہی اپنی زیادتی اطمینان کے لیے پوچھے تو چلو گوارا ہے، لیکن اب تو باقاعدہ اسی لیے پوچھا جاتا ہے کہ اگر ہماری سمجھ میں اس کی وجہ آ گئی تو حرام سمجھیں گے، اگر نہیں آئی تو حرام نہیں سمجھیں گے، اللہ بچائے، یہ بات انسان کو بعض اوقات کفر تک لے جاتی ہے، اللہ تعالی ہر مسلمان کو محفوظ رکھے، آمین۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۲، ص ۲۸۰، ۲۸۱]

فضول اور لا یعنی سوالات کرنا جن کا عملی زندگی سے کوئی تعلق نہ ہو

ایسی چیزوں کے بارے میں سوال کرنا کہ جن کا انسان کے عقیدے یا اس کی عملی زندگی سے کوئی تعلق نہیں، یا ایسے ہی فضول سوالات جیسے کہ یزید کی مغفرت ہوگی یا نہیں؟ جنگ میں کون باطل پر تھا اور کون حق پر تھا؟ یا تاریخی واقعات کی تفصیلات پوچھنا اور ان کے اندر جھگڑا کرنا، یا ایسے عقائد کے بارے میں سوالات کرنا جو بنیادی عقائد نہیں ہیں، جن کے بارے میں حشر نشر کے اندر کوئی سوال نہیں ہونا ہے، یہ ٹھیک نہیں، بلکہ ان کے بارے میں سوالات کرنے کے بجائے جو تمہاری عملی زندگی کے معاملات ہیں، حرام و حلال کے، جائز و ناجائز کے، ان کے بارے میں سوال کرو، اور ان کے اندر بھی جو سوالات ضروری ہیں، ان کے اندر اپنے آپ کو محدود رکھو، حضرات صحابہ کرام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوتے تو سوال بہت کم کیا کرتے تھے، جتنی بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سن لی اس پر عمل کرتے تھے، سوال کم کرتے تھے، لیکن سوال جو

کرتے تھے وہ عملی زندگی سے متعلق کرتے تھے۔

حضرت ابو ہریرہؓ فرماتے ہیں کہ حضور نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ جب تک کسی خاص مسئلے کے بارے میں کوئی خاص بات نہ بتاؤں، اس وقت تک تم مجھے چھوڑے رکھو اور مجھ سے سوال نہ کرو، یعنی جس کام کے بارے میں میں نے یہ کہا کہ یہ کرنا فرض ہے، یا یہ کام کرنا حرام اور ناجائز ہے، اس کے بارے میں بلاوجہ اور بلاضرورت سوال کرنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ تم سے پہلے انبیاء کی جو امتیں ہلاک ہوئیں، ان کی ہلاکت کا سبب ان کا کثرت سے سوال کرنا بھی تھا، اور دوسرا سبب اپنے انبیا کے بتائے ہوئے احکام کی خلاف ورزی تھی، لہذا جب میں تم کو کسی چیز سے روکوں تو تم اس سے رک جاؤ، اس میں قیل وقال اور چوں و چرا نہ کرو، اور جس چیز کا میں تم کو حکم دوں تو اس کو اپنی استطاعت کے مطابق بجالاؤ۔

اس حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے سوال کی کثرت کی مذمت بیان فرمائی ہے، لیکن بعض دوسری احادیث میں سوال کرنے کی فضیلت بھی آئی ہے، چنانچہ ایک حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا: "إنما شفاء العی السؤال"

یعنی پیاسے کی تشفی سوال سے ہوتی ہے، دونوں قسم کی احادیث اپنی اپنی جگہ درست ہیں، دونوں میں تطبیق یہ ہے کہ جس معاملے میں خود انسان کو حکم شرعی معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئے کہ یہ معاملہ جو میں کر رہا ہوں شرعاً جائز ہے یا نہیں، ایسے موقع پر سوال نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ ضروری ہے، لیکن اگر سوالات کرنے کا منشا یا تو محض وقت گذاری ہے، اس سوال کا اس کی ذات سے کوئی تعلق نہیں ہے، اس لیے کہ وہ مسئلہ اس کو پیش نہیں آیا یا وہ ایسا مسئلہ ہے جس کی دین میں کوئی اہمیت نہیں اور عملی زندگی سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اور نہ قبر میں اس کے بارے میں سوال ہوگا اور نہ آخرت میں سوال ہوگا اور اس کے معلوم نہ ہونے میں کوئی مضائقہ بھی نہیں ہے تو ایسے مسائل کے بارے میں سوال کرنے کی اس حدیث میں ممانعت آئی ہے۔

مثلاً ایک صاحب نے مجھ سے سوال کیا کہ حضرت آدم علیہ السلام کے جو دو بیٹے تھے، ھابیل اور قابیل، ان دونوں کے درمیان لڑائی ہوئی، جس کے نتیجے میں قابیل نے ھابیل کو قتل کر دیا، اس لڑائی کا سبب ایک لڑکی تھی، اس لڑکی کا نام کیا تھا؟ اب بتایے کہ اگر اس لڑکی کا نام معلوم ہو جائے تو اس سے کیا فائدہ ہوگا ؟اور اگر معلوم نہ ہو تو اس سے نقصان کیا ہوگا؟ کیا قبر میں منکر نکیر پوچھیں گے کہ اس لڑکی کا نام بتاؤ ورنہ تمہیں جنت نہیں ملے گی، یا میدان حشر میں اللہ تعالی اس کے نام کے بارے میں تم سے سوال کریں گے، لہذا اس قسم کے مسائل جن کا قبر میں، حشر میں، آخرت میں بھی واسطہ پیش نہیں آئے گا ان کے بارے میں سوال کرنا درست نہیں، بات دراصل یہ ہے کہ انسان کو صحیح راستے سے ہٹانے کے لیے شیطان کے پاس مختلف حربے ہیں، ان میں سے ایک حربہ یہ ہے کہ وہ شیطان انسان کو ایسے کام میں لگا دیتا ہے جس کا کوئی حاصل نہیں، جس کا نتیجہ

یہ ہوتا ہے کہ عملی کاموں سے انسان غافل ہوجاتا ہے اوران فضول سوالات کے چکر میں لگ جاتا ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۲۹۶]

افضل عمل کونسا ھے ؟
سوال ایک لیکن جواب مختلف کیوں؟

بار بار صحابہ کرام حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھتے تھے کہ یارسول اللہ! سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ روایات میں یہ نظر آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف صحابہ کرام کومختلف جواب دیے، مثلاً ایک حدیث میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب دیا کہ سب سے افضل عمل وقت پر نماز پڑھنا ہے، ایک حدیث میں ہے کہ ایک صحابی کے اس سوال کے جواب میں آپ نے ارشادفرمایا کہ سب سے افضل عمل یہ ہے کہ تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے، یعنی ہر وقت تمہاری زبان پر اللہ کا ذکر جاری ہو، چلتے پھرتے، اٹھتے بیٹھتے، ہر حالت میں تمہاری زبان اللہ کے ذکر سے تر رہے، یہ عمل اللہ تعالی کوسب سے زیادہ محبوب ہے، ایک روایت میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے یہ سوال کیا کہ یارسول اللہ! سب سے افضل عمل کونسا ہے؟ آپ نے فرمایا کہ سب سے افضل عمل والدین کی اطاعت اوران کے ساتھ حسن سلوک ہے، کسی صحابی نے پوچھا کہ یارسول اللہ! سب افضل عمل کونسا ہے؟ آپ نے جواب دیا کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرنا سب سے افضل عمل ہے، غرض یہ کہ مختلف صحابہ کرام کو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف جوابات عطا فرمائے، بظاہر اگر چہ ان جوابات میں تضادنظر آتا ہے لیکن حقیقت میں تضادنہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ ہر آدمی کے حالات کے لحاظ سے افضل عمل بدلتا رہتا ہے، کسی شخص کے لیے نماز پڑھنا سب سے افضل عمل ہے، کسی شخص کے لیے والدین کی اطاعت سب سے افضل عمل ہے، کسی شخص کے لیے جہاد سب سے افضل عمل ہے، کسی شخص کے لیے ذکر سب سے افضل عمل ہے، حالات کے لحاظ سے اور آدمیوں کے لحاظ سے فرق پڑجاتا ہے، مثلاً صحابہ کرام کے بارے میں آپ کو پہلے سے معلوم تھا کہ نماز کی تو ویسے بھی پابندی کرتے، ان کے سامنے نماز کی زیادہ فضیلت بیان کرنے کی ضرورت نہیں، لیکن والدین کے حقوق میں کوتاہی ہورہی ہے، تو اب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان سے فرمایا کہ تمارے حق میں سب سے افضل عمل والدین کی اطاعت ہے، کسی صحابی کا عبادت کی طرف تو زیادہ دھیان تھا، مگر جہاد کی طرف اتنی رغبت نہیں تھی، ان کے حق میں فرمایا کہ تمہارے لیے سب سے افضل عمل جہاد فی سبیل اللہ ہے، کسی صحابی کو آپ نے دیکھا کہ وہ عبادت بھی کررہے ہیں، جہاد بھی کررہے ہیں، لیکن ذکر اللہ کی طرف اتنا التفات نہیں ہے، ان کو فرمایا کہ تمہارے حق میں سب سے افضل عمل ذکر اللہ ہے، لہذ امختلف صحابہ کرام کو ان کے حالات کے لحاظ سے آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مختلف جواب دیے، لیکن یہ سب فضیلت والے اعمال ہیں، یعنی وقت پر نماز پڑھنا،

والدین کی اطاعت کرنا، جہاد فی سبیل اللہ کرنا، ہر وقت ذکر اللہ کرنا وغیرہ، البتہ لوگوں کے حالات کے لحاظ سے فضیلت بدلتی رہتی ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۵۶]

اصحاب کہف کے کتے کا رنگ کیا تھا؟

میرے پاس لوگوں کے بکثرت فون آتے ہیں اور مسائل پوچھتے ہیں، اس حد تک تو ٹھیک ہے کہ حلال، حرام یا جائز اور ناجائز کا مسئلہ پوچھ لیا، لیکن بسا اوقات سوال کرنے والے بالکل فضول سوال کرتے ہیں، مثلاً ایک صاحب نے ایک مرتبہ فون کیا اور پوچھا کہ اصحاب کہف کا جو کتا تھا اس کا رنگ کیا تھا؟ اور یہ سوال بھی اس وقت کیا جب کہ رات کو سونے کا وقت تھا، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ کو کتے کا رنگ معلوم کرنے کی ضرورت کیسے پیش آئی؟ جواب میں کہا کہ ہم چند دوست بیٹھے ہوئے تھے تو ہمارے درمیان یہ بحث چل پڑی، اس بحث کے تصفیہ کے لیے آپ سے سوال کر رہا ہوں، میں نے ان سے کہا کہ اگر تمہیں پتہ چل جائے کہ اس کتے کا رنگ کالا تھا یا سفید تھا تو اس کے نتیجے میں تمہیں دنیا یا آخرت کا کونسا فائدہ حاصل ہو جائے گا؟ یہ فضول باتیں ہیں جن کا آپ سے نہ قبر میں سوال ہوگا اور نہ حشر میں سوال ہوگا، بہت سے لوگ مذہب اور دین کے نام پر ایسی بحثیں شروع کر دیتے ہیں اور پھر اس پر آپس میں مناظرے ہو رہے ہیں، کتابیں لکھی جا رہی ہیں، مقالات لکھے جا رہے ہیں اور ایک دوسرے پر تنقید بھی ہو رہی ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۲۸۰]

یزید فاسق تھا یا نہیں؟

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ سے کسی نے ایک مرتبہ سوال کیا کہ حضرت! یزید فاسق تھا یا نہیں؟ والد صاحبؒ نے جواب میں فرمایا کہ بھائی میں کیا جواب دوں کہ فاسق تھا یا نہیں تھا؟ مجھے تو اپنے بارے میں فکر ہے کہ پتہ نہیں میں فاسق ہوں یا نہیں، مجھے تو اپنی فکر ہے کہ پتہ نہیں میرا کیا انجام ہونا ہے، دوسروں کے بارے میں مجھے کیا فکر جو اللہ تعالی کے پاس جا چکے ہیں، قرآن کریم میں ارشاد ہے:

﴿تلك أمة قد خلت لها ما كسبت ولكم ما كسبتم ولا تسئلون عما كانوا يعملون﴾

یہ امت ہے جو گذر گئی، ان کے اعمال ان کے ساتھ، تمہارے اعمال تمہارے ساتھ، ان کے اعمال کے بارے میں تم سے سوال نہیں کیا جائے گا۔

بہر حال! کیوں اس بحث کے اندر پڑ کر اپنا بھی وقت ضائع کرتے ہو اور دوسروں کا بھی وقت ضائع کرتے کہ کس کی مغفرت ہوگی اور کس کی نہیں ہوگی، اس قسم کے بے شمار مسائل ہمارے معاشرے کے اندر کثرت سے پھیلے ہوئے ہیں اور اس پر قیل وقال ہو رہی ہے، بحثیں ہو رہی ہیں، مناظرے ہو رہے ہیں، کتابیں لکھی جا رہی ہیں، وقت برباد ہو رہا ہے، نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فضول کی بحثوں سے منع فرمایا ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۲، ص ۲۷۹]

زلزلہ عذاب تھا یا نہیں؟

اب ہمارے ملک میں چند روز پہلے زلزلہ آیا، یہ کتنی بڑی آفت اور مصیبت تھی، کتنے شہروں میں ہمارے مسلمان بہن بھائی پریشانی کا شکار ہوگئے، اب بظاہر دیکھنے میں اس واقعے میں کوئی خیر کا پہلو نظر نہیں آتا، بظاہر یہ واقعہ برا ہی برا ہے، ہزاروں انسان اس میں شہید ہوئے، ہزاروں انسان زخمی ہوئے، ہزاروں انسان بے گھر ہوئے، لیکن اگر ایک شخص صاحب ایمان ہے تو اس کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ کہے کہ مجھے نہیں معلوم کہ اس واقعے کے پیچھے کیا مصلحتیں کام کر رہی ہیں، اور اللہ تعالی کا یہ فیصلہ کیا بھلائیاں پیدا کرے گا، اور کائنات کے مجموعی نظام کے اعتبار سے اس کے اندر کیا خیر کا پہلو ہے؟ میں نہیں جانتا ،لیکن اتنا جانتا ہوں کہ اس کائنات کا کوئی ذرہ کوئی پتہ اللہ تعالی کی مشیت کے بغیر نہیں ہلتا، اور کوئی حرکت اس کائنات میں اللہ تعالی کی حکمت کے بغیر نہیں ہوتی، لہذا سر تسلیم خم ہے، جو کچھ ہوا، وہ ان کی حکمت کے عین مطابق ہوا، چاہے ہماری سمجھ میں وہ حکمت آئے یا نہ آئے، ہم اس پر کوئی رائے زنی نہیں کرتے۔

اب آج کل اخبارات میں، رسائل میں، اور دوسرے ذرائع ابلاغ میں یہ بحث چل پڑی ہے کہ یہ زلزلہ عذاب ہے یا نہیں؟ ایک قوم کا کہنا یہ ہے کہ یہ عذاب ہے، اور ایک قوم اس کے عذاب ہونے کی نفی کر رہی ہے، خوب سمجھ لیں! کہ پورے جزم، وثوق اور یقین کے ساتھ اس زلزلہ کے بارے میں کوئی بات کہنا انسان کے دسترس سے باہر ہے، اس لیے کہ وہ یقین کہاں سے لائے گا؟ کیا تمہارے پاس وحی آئی تھی؟ لہذا کائنات کے ان واقعات کے بارے میں کس بنیاد پر یقین کے ساتھ فیصلہ کر سکتے ہو؟ ارے یہ سارے واقعات تو اس ذات کی طرف سے کنٹرول ہو رہے ہیں جس کے ہاتھوں میں پوری کائنات کی باگ ڈور ہے، وہی فیصلہ کرتا ہے اور وہی جانتا ہے کہ اس فیصلے کے پیچھے کیا اسباب ہیں؟ کیا فائدے اور حکمتیں ہیں؟ یہ سب ہماری سمجھ سے بالاتر ہے۔

سورۃ الکہف میں اللہ تعالی نے حضرت خضر علیہ السلام کا جو واقعہ بیان فرمایا، وہ یہی بات سمجھانے کے لیے بیان فرمایا کہ جب اس کائنات میں غیر اختیاری واقعات رونما ہوں تو اس میں اپنی عقل دوڑانے کے بجائے اس کا معاملہ اللہ کے حوالے کرو، اور تفویض کامل اختیار کرو، یہاں بھی ایک مؤمن کا کام یہ ہے کہ وہ جزم اور یقین کے ساتھ کوئی رائے زنی نہ کرے، بلکہ یہ کہے کہ ہمیں اس کے بارے میں معلوم نہیں، دیکھیے! ایک ہوتا ہے عذاب، جو کافروں پر آتا ہے، اس کا قاعدہ قرآن کریم نے یہ بتایا کہ جب تک کوئی ڈرانے والا ہم ان کے پاس نہیں بھیجتے اس وقت تک ہم کسی پر اس طرح کا عذاب عام جاری نہیں کرتے، اور جو صاحب ایمان ہیں ان کو بھی ان کی بداعمالیوں کی سزا بعض اوقات اللہ تعالی دنیا میں بھی دیتے ہیں، جیسے قرآن کریم نے فرمایا: ﴿ما أصابكم من مصيبة فبما كسبت أيديكم﴾ [الشوری: ۳۰]

لیکن وہ عذاب عام کی شکل میں نہیں ہوتا کہ پوری کی پوری قوم ہلاک ہو جائے، اللہ تعالی نے امت محمدیہ کو عذاب عام سے محفوظ رکھا ہے، ہاں! البتہ انفرادی طور پر ایک آدمی، یا ایک قبیلہ، ایک خاندان، یا ایک شہر

کے لوگ اپنی کسی بدعملی کی وجہ سے کسی عذاب میں مبتلا ہو سکتے ہیں۔

اب یہ اتنا بڑا زلزلہ آیا، جس میں لاکھوں انسان متأثر ہوئے، اللہ تعالیٰ ہی جانتے ہیں کہ کس کا متأثر ہونا سزا تھا، کس کا متأثر ہونا بلندی درجات کا سبب تھا، اس لیے کہ بعض اوقات اپنے نیک بندوں کو بھی اس قسم کے مصائب میں ڈال دیتے ہیں، اور اس سے ان کے درجات کی بلندی مقصود ہوتی ہے، ان کو وسعت کے مقام سے سرفراز کرنا مقصود ہوتا ہے، اگر دنیا میں رہتے تو نہ جانے کیا انجام ہوتا، کسی کے گناہوں کی مغفرت کا ذریعہ اللہ تعالیٰ ان مصائب کو بنا دیتے ہیں، کسی شخص کے لیے ان واقعات کو تنبیہ اور تازیانہ بنا دیتے ہیں، کسی کے دل کا حال پلٹنے کے لیے اس کو ذریعہ بنا دیتے ہیں کہ اب تک ایسا منظر اپنی آنکھ سے نہیں دیکھا تھا، اب تک ایسی آوازیں اپنے کانوں سے نہیں سنی تھیں، اس کے نتیجے میں دل غفلت میں مبتلا تھا، اب وہ آوازیں سن لیں، اور وہ منظر دیکھ لیا، اب دل میں ڈر پیدا ہو گیا، اور تنبیہ ہو گئی، خدا کو معلوم ہے کہ اس واقعے میں کس کس کے لیے کیا کیا مقاصد تھے؟ کیا کیا فوائد تھے جو اللہ تعالیٰ نے عطا کیے۔

دیکھیے! ایک تخریب ہے، ایک تعمیر ہے، ہر تخریب کے بعد ایک تعمیر ہوتی ہے، بحیثیت مجموعی پورے نظام کائنات کے تناظر میں دیکھا جائے تو بسا اوقات تخریب ایک تعمیر کا پیش خیمہ بنتی ہے، ایک عمارت منہدم ہوتی ہے، اس کی جگہ دوسری بہتر عمارت کھڑی ہوتی ہے، ایک قوم جاتی ہے، اس کی جگہ دوسری اس سے بہتر قوم آتی ہے، یہ سب فیصلے اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی کائنات کے اندر کرتے رہتے ہیں، لہٰذا ہم جزم اور وثوق سے یہ نہیں کہہ سکتے کہ یہ عذاب تھا یا یہ عذاب نہیں تھا، اللہ تعالیٰ ہی بہتر جانتے ہیں، ہاں! اس بحث میں پڑنے کے بجائے ہمارے کرنے کا کام یہ ہے کہ ہم سے متأثرین کی جتنی مدد ہو سکتی ہے، ہم وہ مدد کریں، جان سے، مال سے اور محنت سے جو خدمت ان کی بن پڑے وہ خدمت کریں، جو لوگ دنیا سے چلے گئے ہیں ان کے لیے دعا مغفرت کریں، جو موجود ہیں ان کے لیے دعائے صحت کریں، اور ساتھ ساتھ توبہ واستغفار کے ذریعے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں رجوع کریں، اور دعا کے ذریعے رجوع کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں مزید مصائب اور تکلیفوں سے محفوظ فرمادے۔

اپنے اعمال کے درست کرنے کی فکر کرو، کچھ پتہ نہیں کہ کس عمل کی بدولت اللہ تعالیٰ ہمیں سزا میں مبتلا کر دے، اس لیے یہ سب عبرت حاصل کرنے کے مقامات ہیں، اس عبرت کے ذریعے اپنے حالات کی اصلاح کرنے کی فکر کرنی چاہیے، جہاں تک اس واقعہ کا تعلق ہے تو اس میں رضا بالقضا مطلوب ہے کہ جو فیصلہ میرے مالک نے کر دیا، وہی برحق ہے، ہماری سمجھ میں آئے یا نہ آئے، اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں، اسی لیے اس حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "وارض بما قسم الله لك تكن أغنى الناس" یعنی اللہ تعالیٰ نے جو کچھ تمہاری قسمت میں لکھ دیا، چاہے وہ روپے پیسے ہوں، یا دنیا کے دوسرے واقعات ہوں، ان پر راضی ہو جائے، اور راضی رہنے کا مطلب یہ ہے کہ اس کے خلاف کوئی شکوہ دل میں نہ ہو اور اس کو اللہ تعالیٰ کی

حکمت تکوینیہ کے عین مطابق سمجھو:

نہیں ہے چیز نکمی کوئی زمانے میں
کوئی برا نہیں قدرت کے کارخانے میں

یہ جو کچھ ہو رہا ہے انہی کی حکمت سے ہو رہا ہے، جب ان کی حکمت سے ہو رہا ہے تو تم اس پر راضی ہو جاؤ، اس لیے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اگر تم نے رضامندی اختیار کر لی تو تم لوگوں میں سے سب سے زیادہ غنی ہو جاؤ گے، اس لیے کہ تم نے اپنے فیصلے کو اللہ کے فیصلے کے تابع کر دیا، کائنات میں سب کچھ ان کے فیصلے سے ہو رہا ہے اور تمہیں ان کے فیصلوں پر کوئی شکوہ شکایت نہیں، لہذا تم سب سے غنی ہو گئے اور کسی کے محتاج نہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۶، ص ۱۳۸ تا ۱۴۲]

حدیث قرطاس- حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ پر ایک بہتان

یہ روایت حضرت علیؓ سے مروی ہے، اس روایت میں وہ آنحضرت ﷺ کے مرض وفات کا واقعہ بیان فرما رہے ہیں، آپ ﷺ کی یہ بیماری کئی روز تک جاری رہی اور ان ایام میں آپ ﷺ مسجد نبوی میں بھی تشریف نہ لا سکے، آخری دن جب آپ کے وصال کا وقت قریب تھا، اس وقت کا واقعہ حضرت علیؓ بیان فرما رہے ہیں، وہ یہ کہ جب آپ ﷺ کی طبیعت زیادہ ناساز ہو گئی تو آپ ﷺ نے مجھ سے فرمایا کہ اے علی! میرے پاس کوئی تھال لے آؤ جس میں وہ بات لکھ دوں کہ جس کے بعد میری امت گمراہ نہ ہو، اس زمانے میں کاغذ کا اتنا زیادہ رواج نہیں تھا، اس لیے کبھی چمڑے پر لکھ لیا، کبھی درخت کے پتوں پر لکھ لیا، کبھی ہڈیوں پر لکھ لیا، کبھی مٹی کے برتن پر لکھ لیا، چنانچہ آپ ﷺ نے حضرت علیؓ سے لکھنے کے لیے تھال منگوایا۔

حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت حضور اقدس ﷺ کی طبیعت اتنی ناساز تھی کہ مجھے یہ اندیشہ ہوا کہ اگر میں لکھنے کے لیے کوئی چیز تلاش کرنے کے لیے جاؤں گا تو کہیں میرے پیچھے ہی آپ ﷺ کی روح پرواز نہ کر جائے، اس لیے میں نے حضور اقدس ﷺ سے کہا کہ آپ جو کچھ فرمائیں گے، میں اس کو یاد رکھوں گا اور بعد میں اس کو لکھ لوں گا، حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت حضور اقدس ﷺ کا سر اقدس میرے بازوؤں کے درمیان تھا، اس وقت آپ کی زبان مبارک سے جو کلمات نکل رہے تھے وہ یہ تھے "نماز کا خیال رکھو، زکوۃ کا خیال رکھو، اور تمہاری ملکیت میں جو غلام اور باندیاں ہیں ان کا خیال رکھو اور أشهد أن لا إله إلا الله وأشهد أن محمدا عبده و رسوله کی گواہی پر قائم رہو، جو شخص اس گواہی پر قائم رہے گا اللہ تعالی جہنم کو اس شخص پر حرام فرما دیں گے، یہ نصیحتیں حضور اقدس ﷺ نے آخری وقت میں ارشاد فرمائیں۔

مندرجہ بالا واقعہ خود حضرت علیؓ نے بیان فرمایا، اس میں کئی باتیں سمجھنے کی ہیں۔

پہلی بات یہ ہے کہ اسی طرح کا ایک واقعہ حضرت عمرؓ کے ساتھ بھی پیش آیا تھا، یہ واقعہ جس کا ذکر حضرت علیؓ نے فرمایا، یہ خاص اس دن کا واقعہ ہے جس دن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وصال ہوا اور حضرت عمرؓ کے ساتھ وصال سے تین دن پہلے ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا، اس دن بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت بوجھل اور ناساز تھی اور حضرت عمرؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس تھے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چچا حضرت عباسؓ بھی قریب تھے، اس وقت بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ان حضرت رضی اللہ عنہم سے فرمایا تھا کہ کوئی کاغذ وغیرہ لے آؤ تا کہ میں ایسی بات لکھ دوں جس کے بعد تم گمراہ نہ ہو، حضرت فاروق اعظمؓ یہ دیکھ رہے تھے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت زیادہ ناساز ہے، اور اس حالت میں اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ لکھوانے کی مشقت اٹھائیں گے تو کہیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت اور زیادہ خراب نہ ہو جائے، اس وجہ سے حضرت فاروق اعظمؓ نے عرض کیا کہ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اللہ تعالیٰ کی کتاب ہمارے پاس موجود ہے اور آپ پہلے ہی بہت سے ارشادات بیان فرما چکے ہیں، اس لیے اس وقت یہ مشقت اٹھانے کی ضرورت نہیں۔

یہ واقعہ جو حضرت فاروق اعظمؓ کے ساتھ پیش آیا تھا، اس کو شیعوں نے ایک پہاڑ بنا لیا اور اس کی بنیاد پر حضرت فاروق اعظمؓ پر یہ الزام عائد کیا کہ۔ معاذ اللہ۔ انہوں نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو وصیت لکھنے سے روکا، اور در حقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ وصیت لکھنا چاہتے تھے کہ میرے بعد حضرت علیؓ کو خلیفہ بنائیں، مگر حضرت فاروق اعظمؓ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس منشاء کو سمجھ گئے تھے، اس لیے انہوں نے بیچ میں آ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس وصیت کے لکھنے سے منع فرما دیا اور رکاوٹ ڈال دی، جس کے نتیجے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خلافت کی وصیت نہ لکھوا سکے، اس واقعہ کو بنیاد بنا کر شیعوں نے حضرت فاروق اعظمؓ کے خلاف تہمتوں کا ایک طوفان کھڑا کر دیا۔

حالانکہ بات صرف اتنی تھی کہ حضرت فاروق اعظمؓ نے یہ دیکھا کہ ایسا نہ ہو کہ لکھنے کی مشقت کی وجہ سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت اور زیادہ خراب ہو جائے اور وہ یہ بھی جانتے تھے کہ اگر کوئی بہت اہم بات لکھنی ہوگی تو صرف میرے کہنے کی وجہ سے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس بات کو بیان کرنے سے نہیں رکیں گے، حقیقت یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اگر کوئی بات بیان کرنی ہوتی اور اس بات کو آپ ضروری بھی سمجھتے تو کیا صرف حضرت فاروق اعظمؓ کے منع کرنے کی وجہ سے اس بات کو بیان کرنے سے رک جاتے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو حق بات پہنچانے میں کسی بڑے سے بڑے انسان کی بھی پرواہ نہیں کی، یہ حماقت اور گمراہی کی بات ہے جو ان شیعوں نے اختیار کی ہے۔

اور دوسری طرف بعینہ یہی واقعہ حضرت علیؓ کے ساتھ بھی پیش آیا کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت علیؓ سے فرمایا کہ تھال لے آؤ تا کہ میں کچھ لکھ دوں، لیکن حضرت علیؓ فرماتے ہیں کہ اس وقت حضور اقدس

صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت اتنی ناساز تھی کہ مجھے اندیشہ ہوا کہ اگر میں لکھنے کے لیے تھال لینے جاؤں گا تو میرے پیچھے کہیں آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی روح پرواز نہ کر جائے، اس لیے وہ بھی لکھنے کے لیے کوئی چیز نہیں لائے، اب دیکھیے! کہ حضرت علیؓ نے بھی وہی کام کیا جو حضرت فاروق اعظمؓ نے کیا تھا، لہذا اگر حضرت فاروق اعظمؓ پر کوئی اعتراض ہوتا ہے تو حضرت علیؓ پر بھی اعتراض ہوتا ہے۔

بلکہ حضرت علیؓ پر اعتراض زیادہ ہوتا ہے، کیونکہ حضرت فاروق اعظمؓ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ وصال سے تین دن پہلے پیش آیا اور اس واقعہ کے بعد تین دن تک آپ صلی اللہ علیہ وسلم دنیا میں تشریف فرما رہے، لہذا اگر کوئی ضروری بات لکھوانی تھی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بعد میں بھی لکھوا سکتے تھے، اور حضرت علیؓ کے ساتھ جو واقعہ پیش آیا وہ عین وصال کے وقت پیش آیا، اور اس واقعہ کے فوراً بعد آپ صلی اللہ علیہ وسلم کا وصال ہو گیا، لہذا اگر اس واقعہ سے حضرت فاروق اعظمؓ پر اعتراض ہوسکتا ہے تو حضرت علیؓ پر زیادہ ہوسکتا ہے۔

بات دراصل یہ ہے کہ دونوں بزرگوں نے وہی کام کیا جو ایک جانثار صحابی کو کرنا چاہیے تھا، دونوں یہ دیکھ رہے تھے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی طبیعت ناساز ہے، ہم اور آپ اس وقت کی کیفیت کا اندازہ بھی نہیں کر سکتے جو اس موقع پر صحابہ کرام پر نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کو بیمار دیکھ کر گذر رہی تھی، یہ وہ حضرات صحابہ کرام تھے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سانس کے بدلے ہزاروں زندگیاں قربان کرنے کے لیے تیار تھے، آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیماری اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تکلیف ان حضرات کے لیے سوہان روح تھی، اسی لیے ان دونوں حضرات نے وہی کام کیا جو ایک جانثار صحابی کو کرنا چاہیے تھا، وہ یہ کہ ایسے موقع پر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کو حتی الامکان تکلیف سے بچایا جائے، اور یہ دونوں حضرات جانتے تھے کہ آپ کی ساری زندگی اللہ جل شانہ کے دین کا پیغام پہنچانے اور پھیلانے میں صرف ہوئی، اور کوئی ضروری بات ایسی نہیں ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے واشگاف الفاظ میں بیان نہ فرما دی ہو، اس لیے کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کو اسی وقت لکھوانا ضروری ہو، اور اگر کوئی بات ایسی ہوگی بھی تو ہم اس کو زبانی سن کر یاد رکھیں گے۔

پھر ساتھ ہی اس حدیث میں یہ بھی آ گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم جو باتیں لکھوانا چاہتے تھے، وہ اسی وقت ارشاد بھی فرما دیں، جس کی وجہ سے پتہ چل گیا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کیا لکھوانا چاہ رہے تھے، اور وہی باتیں حضرت علیؓ نے روایت فرما دیں، جس کے نتیجے میں یہ بات سامنے آگئی کہ وہ باتیں جس کی آپ صلی اللہ علیہ وسلم بار بار تاکید فرما چکے تھے، اسی کو اور زیادہ تاکید کے ساتھ ہمیشہ کے لیے محفوظ کرنے کی خاطر لکھوانا چاہ رہے تھے، چنانچہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: الصلاۃ والزکاۃ وماملکت أیمانکم

اب نماز کی تاکید اور زکوۃ کی تاکید اور غلاموں کے ساتھ حسن سلوک کی تاکید کوئی نئی بات نہیں تھی، لیکن صرف اس لیے یہ باتیں بیان فرمائیں تاکہ امت کو پتہ چل جائے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دنیا سے جاتے جاتے جن باتوں کی تاکید فرمائی وہ یہ تھیں، لہذا نہ خلافت کا کوئی مسئلہ تھا اور نہ ہی اپنے بعد کسی کو جانشین بنانے کا

معاملہ تھا، بہر حال! شیعوں نے حضرت فاروق اعظمؓ کے خلاف اعتراضات کا جوطوفان کھڑا کیا تھا، اس کا اس حدیث سے بالکل قلع قمع ہوجاتا ہے کہ حضرت علیؓ کے ساتھ وہی معاملہ پیش آیا جو حضرت فاروق اعظمؓ کے ساتھ پیش آیا تھا۔

دوسری بات جو اس حدیث سے معلوم ہوئی وہ یہ کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت فاروق اعظمؓ کے واقعہ میں کاغذ منگوایا اور حضرت علیؓ کے واقعہ میں تھال منگوایا، لیکن یہ دونوں حضرات یہ چیزیں نہیں لائے، اب بظاہر دیکھنے میں یہ نظر آتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی تعمیل نہیں ہوئی، لیکن تعمیل نہ ہونے کی وجہ۔ معاذ اللہ۔ یہ نہیں تھی کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کی کوئی اہمیت نہیں سمجھی، بلکہ وجہ یہ تھی کہ یہ حضرات جانتے تھے کہ اگر اس وقت کوئی چیز لکھنے کے لیے لائیں گے اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کچھ لکھوائیں گے تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طبیعت پر اور زیادہ بار ہوگا۔

اس سے معلوم ہوا کہ اگر اپنا بڑا کوئی کام کرنے کو کہے اور چھوٹے یہ دیکھیں کہ اس کام سے ان کو تکلیف ہوگی اور اس سے ان کی طبیعت پر بار ہوگا، تو بڑے کو تکلیف سے بچانے کے لیے چھوٹے یہ کہہ دیں کہ اس کام کو دوسرے وقت کے لیے مؤخر کردیں تو اس میں نہ تو کوئی نافرمانی ہے اور نہ ہی اس میں کوئی بے ادبی ہے، بلکہ ادب کا اور محبت کا تقاضا ہی یہ ہے کہ ان کی راحت کا اور ان کی صحت کا خیال رکھا جائے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۲، ص ۱۶۰]

اجتہاد

”شریعت کی روح دیکھنی چاہیے ،ظاہر اور الفاظ کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے“

آج کل لوگوں کی زبانوں پر اکثر یہ رہتا ہے کہ شریعت کی روح دیکھنی چاہیے، ظاہر اور الفاظ کے پیچھے نہیں پڑنا چاہیے، معلوم نہیں کہ وہ لوگ روح کو کس طرح دیکھتے ہیں، ان کے پاس کونسی ایسی خوردبین ہے جس میں ان کو روح نظر آجاتی ہے، حالانکہ شریعت میں روح کے ساتھ ظاہر بھی مطلوب اور مقصود ہے، سلام ہی کو لے لیں کہ آپ ملاقات کے وقت السلام علیکم کے بجائے اردو میں یہ کہہ دیں کہ ”سلامتی ہو تم پر“ دیکھیے! معنی اور مفہوم تو اس کے وہی ہیں جو السلام علیکم کے ہیں لیکن وہ برکت وہ نور اور اتباع سنت کا اجر وثواب اس میں حاصل نہیں ہوگا جو السلام علیکم میں حاصل ہوتا ہے۔

اس سے ایک اور بنیادی بات معلوم ہوئی، جس سے آج کل لوگ بڑی غفلت برتتے ہیں، وہ کہ احادیث کے معنی مفہوم اور روح تو مقصود ہے ہی، لیکن شریعت میں اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے الفاظ بھی مقصود ہیں، دیکھیے السلام علیکم اور وعلیکم السلام دونوں کے معنی تو ایک ہی ہیں، یعنی تم پر سلامتی ہو، لیکن حضور اقدس ﷺ نے حضرت جابر بن سلیمؓ کو پہلی ملاقات ہی میں اس پر تنبیہ فرمائی کہ سلام کرنے کا سنت طریقہ اور صحیح طریقہ یہ ہے کہ السلام علیکم کہو، ایسا کیوں کیا؟ اس لیے کہ اس ذریعہ آپ نے امت کو یہ سبق دے دیا کہ شریعت اپنی مرضی سے راستہ بنا کر چلنے کا نام نہیں ہے، بلکہ شریعت اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کی اتباع کا نام ہے۔

”چودہ سو سال پرانے اصولوں کو موجودہ زمانے کی ضروریات پر کیسے اپلائی (Apply) کریں“؟

ایک بات یہ عرض کردوں کو جب اوپر کی بات سمجھ میں آگئی تو پھر دل میں یہ اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ہم چودہ سو سال پرانی زندگی کو کیسے لوٹائیں؟ چودہ سو سال پرانے اصولوں کو آج کی بیسویں اور اکیسویں صدی

پر کیسے اپلائی کریں؟ اس لیے کہ ہماری ضروریات نوع بنوع ہیں، بدلتی رہتی ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ اسلامی علوم سے عدم انسیت کی وجہ سے یہ اشکال پیدا ہوتا ہے، اس لیے کہ اسلام نے اپنے احکام کے تین حصے کیے ہیں:

① ایک حصہ وہ ہے جس میں قرآن وسنت کی نص قطعی موجود ہے، جس میں قیام قیامت تک آنے والے حالات کی وجہ سے کوئی تبدیلی نہیں ہوسکتی، یہ اصول غیر متبدل ہیں، زمانہ کیسا ہی بدل جائے لیکن اس میں تبدیلی نہیں آسکتی۔

② دوسرا حصہ وہ ہے جس میں اجتہاد اور استنباط کی گنجائش رکھی گئی ہے اور اس میں اس درجہ کی نصوص قطعیہ نہیں ہیں جو زمانہ کے حال پر اپلائی کریں، اس میں اسلامی احکام کی لچک (Elasticity) خود موجود ہے۔

③ اور احکام کا تیسرا حصہ وہ ہے جس کے بارے میں قرآن وسنت خاموش ہیں، جن کے بارے میں کوئی ہدایت اور کوئی رہنمائی نہیں کی گئی، جن کے بارے میں قرآن وسنت نے کوئی حکم نہیں دیا، حکم کیوں نہیں دیا؟ اس لیے کہ اس کو ہماری عقل پر چھوڑ دیا ہے اور اس کا اتنا وسیع دائرہ ہے کہ ہر دور میں انسان اپنی عقل اور تجربہ کو استعمال کر کے اس خالی میدان (Unoccupied Area) میں ترقی کر سکتا ہے اور ہر دور کی ضروریات پوری کر سکتا ہے۔

دوسرا حصہ جس میں اجتہاد اور استنباط کی گنجائش رکھی گئی ہے، اس کے اندر بھی حالات کے لحاظ سے علتوں کے بدلنے کی وجہ سے احکام کے اندر تغیر وتبدل ہوسکتا ہے، البتہ پہلا حصہ بیشک کبھی نہیں بدل سکتا، قیامت آجائے گی لیکن وہ نہیں بدلے گا، اس لیے کہ وہ درحقیقت انسان کے فطرت کے ادراک پر مبنی ہے، انسان کے حالات بدل سکتے ہیں لیکن فطرت نہیں بدل سکتی اور چونکہ وہ فطرت کے ادراک پر مبنی ہیں اس لیے ان میں بھی تبدیلی نہیں لائی جاسکتی۔

بہرحال! جہاں تک شریعت نے ہمیں گنجائش دی ہے، گنجائش کے دائرہ میں رہ کر ہم اپنی ضروریات کو پورے طریقے سے استعمال کر سکتے ہیں۔

اجتهاد کب اور کهاں سے شروع هوتا هے؟

اجتہاد کا دائرہ وہاں سے شروع ہوتا ہے جہاں نص قطعی موجود نہ ہو، جہاں نص موجود ہو وہاں عقل کو استعمال کر کے نصوص کے خلاف کوئی بات کہنا درحقیقت اپنے دائرہ کار (Jurisdiction) سے باہر جانے والی بات ہے اور اسی کے نتیجے میں دین کی تحریف کا راستہ کھلتا ہے، جس کی ایک مثال آپ حضرات کے سامنے عرض کرتا ہوں۔

قرآن کریم میں خنزیر کو حرام قرار دیا گیا ہے اور یہ حرمت کا حکم وحی کا حکم ہے، اس جگہ پر عقل استعمال کرنا کہ صاحب! یہ کیوں حرام ہے؟ یہ عقل کو غلط جگہ پر استعمال کرنا ہے، اسی وجہ سے بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ بات دراصل یہ ہے کہ قرآن کریم نے خنزیر اس لیے حرام کیا تھا کہ اس زمانے میں خنزیر بڑے گندے تھے اور غیر پسندیدہ ماحول میں پرورش پاتے تھے اور غلاظتیں کھاتے تھے، اب تو خنزیر کے لیے بڑے بڑے ہائی جینک فارم (Hygenic Farm) تیار کیے گئے ہیں اور بڑے صحت مندانہ طریقے سے پرورش ہوتی ہے، لہذا وہ حکم اب ختم ہونا چاہیے یہ اس جگہ پر عقل کو استعمال کرنا ہے جہاں وہ کام دینے سے انکار کر رہی ہے۔

اسی طرح ربا اور سود کو جب قرآن کریم نے حرام قرار دے دیا بس وہ حرام ہو گیا، عقل میں چاہے آئے یا نہ آئے، دیکھیے قرآن کریم میں مشرکین عرب کا قول نقل کرتے ہوئے فرمایا گیا:

﴿إنما البيع مثل الربوا﴾

کہ بیع بھی ربا جیسی چیز ہے، تجارت اور بیع وشراء سے بھی انسان نفع کماتا ہے اور ربا سے بھی نفع کماتا ہے، لیکن قرآن کریم نے اس کے جواب میں فرق بیان نہیں کیا کہ بیع اور ربا میں یہ فرق ہے بلکہ یہ جواب دیا کہ:﴿وأحل الله البيع وحرم الربوا﴾

بس! اللہ تعالی نے بیع کو حلال قرار دیا ہے اور ربا کو حرام قرار دیا ہے، اب آگے اس حکم میں تمہارے لیے چوں وچرا کی گنجائش نہیں، اس لیے کہ جب اللہ نے بیع کو حلال کر دیا ہے تو حلال ہے اور جب اللہ نے ربا کو حرام کر دیا اس لیے حرام ہے، اب اس کے اندر چوں چرا کرنا درحقیقت عقل کو غلط جگہ پر استعمال کرنا ہے۔

ایک واقعہ مشہور ہے کہ ہمارا ایک ہندوستانی گویّا ایک مرتبہ حج کرنے چلا گیا، حج کے بعد وہ جب مدینہ شریف جا رہا تھا، راستے میں منزلیں ہوتی تھیں، ان پر رات گذارنی پڑتی تھی، ایک منزل پر جب رات گذارنے کے لیے ٹھہرا تو وہاں ایک عرب گویّا آگیا، وہ بدو قسم کا عرب گویّا تھا، اس نے بہت بھدے انداز سے سارنگی بجا کر گانا شروع کر دیا، آواز بڑی بھدی تھی اور اس کو سارنگی اور طبلہ بھی صحیح بجانا نہیں آتا تھا، جب ہندوستانی گویے نے اس کی آواز سنی تو اس نے کہا کہ آج یہ بات میری سمجھ میں آگئی ہے کہ آنحضرت ﷺ نے گانے بجانے کو کیوں حرام قرار دیا ہے، اس لیے کہ آپ نے ان بدوؤں کا گانا سنا تھا، اگر آپ میرا گانا سن لیتے تو حرام قرار نہ دیتے، تو اس قسم کی فکر اور تھنکنگ (Thinking) ڈیولپ (Develop) ہو رہی ہے جس کو اجتہاد کا نام دیا جا رہا ہے، یہ نصوص قطعیہ کے اندر اپنی خواہشات نفس کو استعمال کرنا ہے۔

اجتہاد اور اس کے متعلق جدید ذہن کی غلط فہمیاں

۱۔کیا عقل و حالات کے مطابق نصوص میں اجتہاد کرنا درست ہے؟

پہلی غلط فہمی جو ان کے ذہنوں میں پائی جاتی ہے وہ یہ ہے کہ اجتہاد درحقیقت نصوص کے مقابلے میں اپنی عقل کو استعمال کرتے ہوئے حکمتوں اور مصلحتوں کی بنیاد پر احکام میں کسی تغیر کا نام ہے، عام طور پر جو لوگ یہ بات کہتے ہیں، ان کے ذہن میں یہ بات ہے کہ نصوص میں ایک حکم آیا ہے اور کسی خاص پس منظر میں کسی خاص مصلحت کے تحت آیا ہے، آج کے دور میں وہ مصلحت نہیں پائی جارہی ہے، یا اس کے خلاف کوئی اور مصلحت پائی جارہی ہے، لہذا ہم اپنی عقل سے سوچ کر فیصلہ کریں کہ اس دور کی مصلحت کیا ہے؟ اس حکم کو اس دور پر اطلاق پذیر نہ کریں، بلکہ اس کے بجائے اس حکم میں کوئی تبدیلی کر دیں۔

۲۔کیا اجتہاد سے شرعی حکم میں سہولت اور آسانی پیدا ہوتی ہے؟

دوسری غلط فہمی یہ ہے کہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ اجتہاد کے نتیجہ میں ہمیشہ کوئی سہولت، یا آسانی حاصل ہونی چاہئے، اگر ایک چیز پہلے حرام اور ناجائز سمجھی جاتی تھی تو اجتہاد کے نتیجے میں جائز سمجھی جانی چاہئے، اگر کوئی چیز شریعت میں منع تھی تو اجتہاد کے نتیجے میں ممنوع نہ ہونی چاہئے، چنانچہ ہر ایسی جگہ پر اجتہاد کی ضرورت کا دعویٰ کیا جاتا ہے جہاں ان کو کوئی سہولت، آسانی یا جواز مطلوب ہو، اس موقع پر ان کو زمانہ کی تبدیلی اور حالات کے تغیر کا بھی احساس ہو جاتا ہے، اور وہ اجتہاد کی ضرورت پر اصرار کرتے ہیں، لیکن اگر کسی جگہ حالات کے تغیر کی وجہ سے حکمت اور مصلحت اس کے برعکس ہو، یعنی اس صورت میں حالات کے تغیر کی وجہ سے اسی حکمت اور مصلحت کی بنیاد پر اگر ایک چیز پہلے جائز تھی، اب ناجائز ہو رہی ہو تو اس موقع پر اجتہاد کی ضرورت کا کوئی دعویٰ نہیں کرتا، مثلاً جو لوگ اجتہاد کی ضرورت کے داعی ہیں، آج تک ان سے نہیں سنا گیا کہ سفر میں جو قصر کا حکم دیا گیا تھا وہ اس زمانے کے سفر تھے، جو اونٹوں پر، گھوڑوں پر اور پیدل ہوا کرتے تھے، ان میں مشقت بہت زیادہ ہوتی تھی، آج ہوائی جہاز میں ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک چند گھنٹوں میں آدمی پہنچ جاتا ہے، فرسٹ کلاس میں سفر کرتے ہوئے، لیٹے ہوئے سوتے ہوئے جاتا ہے، اور وہاں جا کر آرام سے ہوٹلوں میں مقیم ہوتا ہے، تو چونکہ حالات بدل گئے ہیں لہذا اب سفر میں قصر کی اجازت نہیں ہونی چاہئے، یہ آج تک کسی سے نہیں سنا گیا کہ یہاں اجتہاد کی ضرورت ہے، وجہ یہ ہے کہ ذہن میں یہ بات ہے کہ اجتہاد کے نتیجے میں کوئی سہولت حاصل ہونی چاہئے، کوئی جواز حاصل ہونا چاہئے، اجتہاد کے نتیجے میں ایک جواز پہلے سے موجود تھا، اب ختم ہو رہا ہو تو ایسے اجتہاد سے توبہ، اس اجتہاد کی طرف کوئی جانے کو تیار نہیں۔

یہ ساری باتیں درحقیقت اس لئے ہیں کہ اجتہاد کا صحیح مفہوم ذہن میں نہیں، حالانکہ جب اجتہاد کا لفظ بولا جاتا ہے تو جہاں سے اجتہاد کا لفظ نکلا ہے اس کی طرف دیکھنا چاہئے کہ وہ کس سیاق میں آیا ہے

اوراس کا کیا مطلب تھا؟

لفظ اجتہاد کا مطلب کیا ھے ؟

آپ سب حضرات جانتے ہیں کہ اجتہاد کا لفظ سب سے پہلے کونسی حدیث میں آیا ہے، حضرت معاذ رضی اللہ عنہ کی حدیث ہے:

ان رسول الله ﷺ لماارادان يبعث معاذاً الى اليمن قال:كيف تقضى اذا عرض لك قضاء،قال:اقضى بكتاب الله،قال:فان لم تجب فى كتاب الله ،قال:فبسنة رسول الله ﷺ،قال:فان لم تجدفى سنة رسول الله،ولا فى كتاب الله، قال:اجتهدبرأيى،ولاآلو،فضرب رسول الله ﷺ صدره، و قال:الحمدلله الذى وفق رسول رسول الله لمايرضى رسول الله.

آپ صلی اللہ علیہ وسلم حضرت معاذ ابن جبلؓ کو یمن کی طرف حاکم، قاضی، معلم اور مفتی بنا کر بھیج رہے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم ان سے پوچھتے ہیں کہ تم کیسے فیصلہ کروگے؟ تو انہوں نے عرض کیا: "بكتاب الله"، اللہ کی کتاب سے، آپ نے پوچھا کہ اگر کتاب اللہ میں نہ پاؤ تو کیسے فیصلہ کروگے؟ عرض کیا "بسنة رسول الله"، پھر پوچھا اگر سنت میں نہ پاؤ تو پھر کیا کروگے؟ تو انہوں نے عرض کیا "اجتهدبرأيى" میں اپنی رائے سے اجتہاد کروں گا، "والاآلو"، اور کوئی کوتاہی نہیں کروں گا، اس پر آپ نے تائید فرمائی اور ان کے سینے پر ہاتھ مارااور فرمایا:

الحمدلله الذى وفق رسول رسول الله لمايرضى رسول الله

اجتہاد کب اور کس جگه کیا جاتا ھے ؟

اس حدیث سے معلوم ہوا کہ اجتہاد وہاں ہوتا ہے جہاں کوئی حکم کتاب اللہ اور سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں موجود نہ ہو، جیسا کہ حضرت معاذ رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ اس وقت میں اجتہاد کروں گا۔
اس میں کہیں یہ نہیں فرمایا کہ اجتہاد کسی جواز، کسی رخصت یا سہولت کو حاصل کرنے کے لئے کروں گا، بلکہ یہ فرمایا کہ جو حکم کتاب اللہ سے، سنت رسول اللہ سے براہ راست نہیں نکل رہا ہوگا تو (انہی نصوص کی روشنی میں) اپنی رائے کو استعمال کرتے ہوئے (قیاس کے ذریعے یا اصول کلیہ کو مدنظر رکھتے ہوئے) اس حکم کو حاصل کرنے کی پوری کوشش کروں گا۔

اب یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جس مسئلہ یا جس چیز کا حکم تلاش کیا جارہا ہے، اجتہاد کے نتیجے میں وہ جائز ثابت ہو، یہ بھی ہوسکتا ہے وہ ناجائز ثابت ہو، تو یہ حدیث خود بتارہی ہے کہ اجتہاد کا محل وہاں ہوتا ہے جہاں نصوص ساکت ہوں۔

اب نصوص کے ساکت ہونے کی دو صورتیں ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ جس خاص جزیئے کا حکم تلاش کرنا مقصود ہے، قرآن وحدیث نے اس خاص جزیئے سے بالکل تعرض نہ کیا ہو، دوسرا ساکت ہونے کا مفہوم یہ ہے کہ اس خاص جزیئے سے تعرض تو کیا ہے، لیکن جن الفاظ یا جس عبارت کے ساتھ کیا ہے اس عبارت اور اس تعبیر کے اندر کچھ اجمال اور ابہام ہے، جس کی بنا پر اس کی ایک سے زیادہ تشریحات ممکن ہیں، یعنی وہ کسی ایک مفہوم پر قطعی الدلالۃ نہیں، بلکہ اس کی تشریح مختلف طریقوں سے کی جاسکتی ہے۔

لہذا سکوت کی کل دو صورتیں ہوگئیں، یہ دونوں صورتیں محل اجتہاد ہیں، جہاں یہ دونوں صورتیں نہ ہوں، یعنی فرض کرو کہ قرآن وسنت نے کسی مسئلہ میں بالکل واضح اور دوٹوک الفاظ میں تعرض کیا ہے، اس میں ایک سے زیادہ تشریحات کا امکان یا احتمال نہیں تو ایسا مسئلہ نہ محل اجتہاد ہے، نہ محل تقلید، تقلید اور اجتہاد کا سوال ہی اس جگہ پیدا ہوتا ہے جہاں یا تو نصوص ساکت ہوں، یا ان کے اندر اجمال، ابہام یا تعارض میں سے کوئی چیز پائی جارہی ہو، یا جن میں ایک سے زیادہ تشریحات کا امکان ہو تو وہاں پر مجتہد اجتہاد کرتا ہے، اور مقلد تقلید کرتا ہے۔

نصوص قطعیه میں اجتهاد نہیں ہوسکتا !

اس لئے اگر کوئی نص قطعی الدلالۃ ہے تو وہ اجتہاد کا محل ہی نہیں، خود اس حدیث سے یہ بات ثابت ہورہی ہے جو اجتہاد کا اصل منبع ہے۔ لہذا نصوص قطعیہ یا واضح الدلالۃ نصوص کے مقابلے میں اجتہاد کرنا، یہ خود اجتہاد کے منبع کے اعتبار سے بالکل غلط اور ناقابل توجہ ہے۔ چونکہ یہ حقیقت پیش نظر نہیں ہوتی، اس لئے بعض اوقات نصوص کے مقابلے میں بھی اجتہاد کرلیا جاتا ہے، چنانچہ ہمارے ہاں بھی اس قسم کا اجتہاد ہوا۔ مثلاً قرآن کریم نے خنزیر کی حرمت کا حکم نص قطعی کے ذریعہ دیا ہے، لیکن آج ساری مغربی دنیا میں خنزیر خوراک بن چکا ہے تو اجتہاد کرنے والے والے نے یہ کہا کہ خنزیر کے بارے میں بھی اجتہاد کی ضرورت ہے۔ چنانچہ یہ اجتہاد چلایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں جو خنزیر ہوا کرتے تھے، وہ نالیوں پر پڑے رہتے تھے، گندگی کھاتے تھے، گندے ماحول میں پرورش پاتے تھے، اس لئے حرام قرار دیئے گئے، آج موجودہ دور میں جو خنزیر ہیں، وہ اعلیٰ فارموں (Hygenic Forms) میں پرورش پاتے ہیں، جہاں بڑے صحت افزاء ماحول میں ان کی پرورش ہوتی ہے، لہذا وہ علت ختم ہوگئی جس کی بنا پر حرمت کا حکم آیا تھا۔

اس کا پہلا جواب تو یہ ہے کہ درحقیقت یہ محل اجتہاد ہی نہیں ہے، کیونکہ نص میں اس کی حرمت صراحۃً موجود ہے، دوسرے یہ کہ اجتہاد کا یہ مفہوم کسی نے بھی معتبر قرار نہیں دیا کہ اگر اجتہاد کرنے کے نتیجے میں کوئی رخصت حاصل ہورہی ہے تب تو اجتہاد ہوا، لیکن اگر کسی چیز کے بارے میں قرآن وسنت کی روشنی میں بتلایا جائے کہ وہ ناجائز ہے، یا فلاں کام منع ہے، تو یہ کہنا کہ اجتہاد ہی نہیں ہوا، یہ دونوں باتیں اسی غلط فہمی کی بنیاد پر ہیں جو میں نے ابھی عرض کیں۔

پہلی بات سمجھنے کی یہ ہے کہ اجتہاد کے جو معنی حضرت معاذ ابن جبل رضی اللہ عنہ کی حدیث سے معلوم ہوتے ہیں وہ یہ ہیں کہ جہاں نصوص (قرآن وسنت) کسی مسئلہ کا حکم بیان کرنے میں ساکت ہوں، وہاں پر اجتہاد کی ضرورت پیش آتی ہے۔

کیا چوتھی صدی ہجری کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہوچکا ہے ؟

دوسرے یہ کہ فقہ میں اجتہاد کی بہت ساری قسمیں ہیں، جیسے اجتہاد مطلق، اجتہاد فی المذہب، اجتہاد فی المسائل، تخریج مسائل، ترجیح مسائل، تصحیح اور تمیز وغیرہ، جو حضرات اجتہاد کے نعرے لگاتے ہیں، ان کی نظر میں اجتہاد کے یہ مختلف درجات نہیں ہوتے، بلکہ ان کے ذہن میں اجتہاد کا وہ مفہوم ہے جو میں نے ابھی عرض کیا۔ لہذا جب ان کے سامنے یہ کہا جائے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا ہے تو ان کے ذہن میں یہ ہوتا ہے کہ علماء کرام نے اجتہاد کی ساری قسموں کا دروازہ بند کر رکھا ہے، اور یہ کہا ہے کہ چوتھی صدی کے بعد کسی قسم کا اجتہاد نہیں ہوسکتا۔ لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ یہ جو کہا گیا کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا ہے، اول تو دروازہ بند ہونے کے یہ معنی نہیں ہیں کہ اب یہ شرعی حکم آگیا کہ چوتھی صدی کے بعد کوئی مجتہد پیدا نہیں ہوسکتا، یا یہ کہ عقلی امکان ختم ہوگیا۔ یہ مقصود نہیں تھا، بلکہ مقصد یہ تھا کہ اجتہاد کے لئے جن شرائط اور جن اوصاف کی ضرورت ہے وہ شرائط مفقود ہوگئی ہیں۔

لیکن بالفرض ان شرائط کا حامل کوئی پیدا ہوجائے تو ایسا ہونا یہ نہ عقلاً ممتنع ہے نہ شرعاً۔ یہ ایک امر واقع ہے، حکم نہیں ہے کہ اب کوئی مجتہد پیدا نہیں ہوسکتا، بلکہ صورتحال ہی ایسی ہے کہ کوئی آدمی ایسا پیدا نہیں ہوسکا جو اجتہاد کی تمام شرائط کا جامع ہو، لیکن اگر ہوجائے تو نہ شرعاً ممتنع ہے نہ عقلاً، چنانچہ حدیث پاک سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ آئندہ بھی مجتہد ہوں گے، ایک حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

"مثل امتی مثل المطر لا یدری اوّله خیر ام آخره"

میری امت کی مثال بارش کی سی ہے جس کے بارے میں یہ فیصلہ نہیں کیا جاسکتا کہ بارش کا پہلا حصہ زیادہ بہتر تھا یا آخری حصہ زیادہ بہتر ہوگا۔

تو امت کا آخری حصہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے کہ اس میں حضرت امام مہدی تشریف لائیں گے، اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا نزول ہوگا، اب ظاہر ہے کہ یہ نہیں کہا جاسکتا کہ چونکہ چوتھی صدی میں اجتہاد کا دروازہ بند ہوگیا تھا، لہذا ان حضرات کو اجتہاد کی اجازت نہیں ہوگی، پہلی بات یہ ہے کہ دروازے پر تالے اس لئے ڈالے کہ اس میں داخل ہونے والے مفقود ہوگئے ہیں، لیکن اگر کوئی پوری شرائط کا حامل داخل ہوجائے تو نہ شرعی امتناع ہے نہ عقلی۔

دوسری بات یہ ہے کہ یہ جو کہا گیا تھا کہ چوتھی صدی کے بعد کوئی مجتہد پیدا نہیں ہوا، یہ درحقیقت

اجتہاد مطلق کے بارے میں کہا گیا تھا، اب کوئی ایسا شخص نہیں ہے کہ جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ وہ مجتہد مطلق ہے، لیکن اس کے بعد کے جو درجات ہیں، خواہ وہ اجتہاد فی المذہب ہو، یا اجتہاد فی المسائل، یا تخریج مسائل اور ترجیح مسائل ہو، ان تمام درجات میں اجتہاد کرنے والے بعد میں بھی آتے رہے، اور چوتھی صدی کے بعد بھی آئے۔ حضرت علامہ ابن عابدین شامیؒ، علامہ ابن ہمامؒ کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ مجتہد فی المذہب تھے، (بلغ مرتبۃ الاجتہاد) یہاں اجتہاد مطلق مراد نہیں ہے، بلکہ اجتہاد فی المذہب، یا اجتہاد فی المسائل مراد ہے، ابن ہمام تو کافی بعد کے ہیں، ان کے بارے میں بھی یہی کہا گیا، اسی طرح ہمارے اکابر میں سے بعض علماء فرماتے ہیں کہ مولانا عبدالحئی لکھنویؒ اجتہاد کے مرتبے پر پہنچے ہوئے تھے، حضرت شاہ ولی اللہ تو اس مرتبے پر فائز تھے ہی۔

مطلق اجتہاد اور جزئی اجتہاد

اس لئے یہ جو تصور ہے کہ اجتہاد نہیں ہوسکتا، یہ صرف اجتہاد مطلق کے بارے میں ہے، اور اجتہاد مطلق کے بارے میں یہ بات بالکل بدیہی ہے، کیوں کہ چوتھی صدی کے بعد آج تک کوئی ایسا شخص نہیں آیا جس نے طہارت سے لے کر فرائض تک تمام مسائل میں اس قسم کا مذہب جاری کیا ہو، جیسا ائمہ اربعہؒ نے کیا، اگرچہ دعوے بہت سے لوگوں نے کئے۔ لیکن ایسا مکمل اور جامع نظام کسی نے پیش نہیں کیا۔

اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ فلاں مسئلے میں میری رائے یہ ہے، یعنی کسی مسئلہ میں پوری تحقیق وتدقیق اور اجتہاد واستنباط کی ساری صلاحیتیں صرف کرنے کے بعد وہ اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے تو صرف ایک مسئلہ میں اس نے یہ کہہ دیا، باقی مسائل کا کیا ہوگا؟ بہرحال یہ دعویٰ کہ چوتھی صدی کے بعد اجتہاد ختم ہوگیا، یہ ایک بدیہی واقعہ ہے کہ کوئی شخص ایسا پیدا نہیں ہوا، اور اگر کوئی آیا بھی تو امت نے اس کو بحیثیت مجتہد اور بحیثیت امام متبوع تسلیم نہیں کیا۔

البتہ جہاں تک اجتہاد کی دوسری اقسام کا تعلق ہے تو وہ بعد میں بھی ہوتی رہیں، اور خاص طور سے دو قسمیں ایسی ہیں کہ جو اس دور میں بھی موجود ہیں، ایک اجتہاد فی المسائل اور دوسری اجتہاد جزئی۔ اجتہاد فی المسائل کے معنی یہ کہ جن مسائل کے بارے میں نہ کتب فقہ میں کوئی صراحت ہے، نہ اصحاب مذہب کی طرف سے کوئی حکم موجود ہے، (ایسے مسائل کو نوازل بھی کہتے ہیں) ائمہ کے بیان کئے ہوئے اصولوں کے مطابق ان نئے مسائل کا حکم معلوم کرنا، یہ اجتہاد فی المسائل ہے، جو آج بھی جاری ہے۔ ایسے مسائل جن کی صراحت کتب فقہ میں موجود نہیں، ان کے بارے میں جاری ہونے والے فتاویٰ حقیقت میں اجتہاد فی المسائل ہیں۔

یہ بات بھی تمام اصول فقہ کی کتابوں میں مذکور ہے اور صراحت کے ساتھ اس پر بحث ہوئی ہے کہ کیا اجتہاد جزئی بھی ہوسکتا ہے؟ کچھ حضرات یہ کہتے ہیں کہ اجتہاد جزئی نہیں ہوسکتا، اجتہاد تو کلی ہی ہوگا، جو شخص

تمام فقہی مسائل کے بارے میں اجتہاد کرے تب اس کی رائے معتبر ہوگی، لیکن اصولیین نے اس رائے کو تسلیم نہیں کیا۔ اصولیین یہ کہتے ہیں کہ اجتہاد جزئی بھی ہوسکتا ہے۔ یعنی یہ ہوسکتا ہے کہ ایک شخص کسی ایک مسئلہ میں اجتہاد کے درجے کو پہنچ جائے اور دوسرے مسائل میں نہ پہنچے، یہ اجتہاد جزئی اب تک کے جاری ہے۔

لہٰذا یہ کہنا کہ علماء کرام نے اجتہاد کا دروازہ بند کر دیا ہے، یہ بھی اجتہاد کی حقیقت کو نہ سمجھنے کا نتیجہ ہے۔ جس دروازے کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کھولا ہو تو کون ہے جو اس کو بند کر سکے۔ دروازہ بند نہیں کیا، لیکن اس میں داخل ہونے والے مفقود ہو گئے، وہ بھی اجتہاد مطلق میں داخل ہونے والے، البتہ اجتہاد کی دوسری قسمیں بعد میں بھی جاری رہی ہیں، اور ان میں سے بعض اقسام آج بھی جاری ہیں۔

کیا زمانے کے بدلتے ہوئے حالات کے مطابق فتووں کو بھی بدلنا چاہیے؟

تیسری بات جو سمجھنے کی ہے وہ یہ کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ زمانہ بدل گیا ہے، حالات میں تبدیلی آ گئی ہے، لہٰذا اب حکم بھی بدلنا چاہئے، اور یہ مقولہ بھی بکثرت زبانوں پر آتا رہتا ہے کہ: "الاحکام تتغیر بتغیر الزمان" اور "الفتویٰ تتغیر بتغیر الزمان"

خود ہمارے فقہاء نے یہ بات لکھی ہے، لیکن جن لوگوں کی میں بات کر رہا ہوں وہ اس کو اجتہاد کے اس مفہوم سے وابستہ کرتے ہیں جس کو میں نے شروع میں عرض کیا، اسی سے وابستہ کر کے یہ کہتے ہیں کہ تغیر زمانہ کا مطلب یہ ہے کہ زمانے کے تغیر کے نتیجے میں اگر حکمت اور مصلحت تبدیل ہو جائے تو (ان کے خیال میں اس صورت میں) احکام بھی بدلنے چاہئیں، تو یہاں سمجھنے کی بات یہ ہے کہ احکام میں جو تغیر آتا ہے وہ علت کے تغیر سے آتا ہے نہ کہ حکمت یا مصلحت کے تغیر سے۔

شریعت نے جس چیز کو کسی حکم کی علت قرار دیا ہو، اس کے تغیر سے حکم میں تغیر ہوگا، یعنی کسی جگہ اگر وہ علت مفقود ہو جائے تو بے شک حکم بدل جائے گا، لیکن اگر وہ علت باقی ہے، مگر محض ہماری سوچ اور خیال کے لحاظ سے اس میں حکمت نہیں پائی جا رہی تو اس کی وجہ سے حکم میں تغیر نہیں ہوگا۔

کسی حکم کا مدار علت پر ہوتا ہے یا حکمت پر؟

اصول یہ ہے کہ حکم کا دارومدار علت پر ہوتا ہے، نہ کہ حکمت پر، یہ بڑی اہم بات ہے، اور اس کو نظر انداز کرنے سے بہت سی گمراہیاں پیدا ہوتی ہیں، اور جو حضرات اجتہاد کے دعوے کرتے ہیں، ان کے ہاں بھی یہی صورتحال ہے کہ وہ حکمت کو علت قرار دیتے ہیں، اسی وجہ سے وہ کہتے ہیں کہ حکم بدل گیا۔

اس کی فقہی مثالیں دینے سے قبل میں ایک حسی مثال دیتا ہوں، کیونکہ فقہی مثال میں علت اور

حکمت کو سمجھانا بعض اوقات مشکل ہوجاتا ہے اور لوگوں کو حکمت اور علت میں فرق سمجھ میں نہیں آتا۔ اس لئے ایک حسی مثال جس سے فرق سمجھ میں آئے گا، وہ یہ کہ جب ہم گاڑی چلاتے ہیں تو چوراہوں پر سگنل لگے ہوتے ہیں، قانون یہ ہے کہ اگر سرخ بتی جلے تو گاڑی روک دو، اس وقت گاڑی چلانا منع ہے۔ اور جب سبز بتی جلے تو روانہ ہوجاؤ۔ اب چلنا جائز ہے، سرخ بتی پر رک جانا یہ حکم ہے، سرخ روشنی اس حکم کی علت ہے، حادثہ کے امکانات سے بچانا حکمت ہے۔ اب رکنے کا جو حکم ہے آیا اس کا دارومدار سرخ بتی پر ہے، یا حادثہ کے امکانات سے بچنے پر؟ فرض کرو کہ آپ گاڑی چلارہے ہیں، اور سڑک سنسان پڑی ہے، کوئی دوسری گاڑی دور دور تک نظر نہیں آرہی ہے، سرخ بتی جل رہی ہے تو رو کنے کا حکم نافذ ہوگا یا نہیں؟ ظاہر ہے کہ نافذ ہوگا۔ حالانکہ اس وقت رکنے کا حکم بے کار معلوم ہورہا ہے، اور رکنے میں وقت ضائع ہورہا ہے، کیونکہ تصادم کا کوئی خطرہ نہیں، اگر سیدھے نکل جاتے تو کسی گاڑی سے ٹکر نہ ہوتی، لیکن رکے ہوئے ہیں، کیوں رکے ہوئے ہیں؟ اس لئے کہ علت موجود ہے، اگر چہ حکمت نظر نہیں آرہی، معلوم ہوا کہ حکم کا دارومدار علت پر ہوتا ہے، نہ کہ حکمت پر۔

اگر چہ وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو سڑک سنسان ہونے کے باوجود سرخ روشنی پر رکنے میں حکمت بھی ہے، وہ حکمت یہ ہے کہ اگر ہر ایک کو یہ اختیار دے دیا جائے کہ تم خود فیصلہ کرو کہ تصادم کا امکان ہے یا نہیں؟ اگر تصادم کا امکان ہو تو رک جاؤ، اگر تصادم کا امکان نہ ہو تو چل پڑو، اگر یہی اختیار ہر ایک کو دے دیا جائے تو انارکی (Anarchy) پھیل جائے گی، فوضویت ختم ہوجائے گی، کیونکہ ہر شخص اس اختیار کو اپنی سمجھ کے مطابق استعمال کرے گا اور اسکے نتیجے میں وہ مقصد جس کے لئے سرخ بتی لگائی گئی تھی، ختم ہوجائے گا۔ یہ ایک حسی مثال ہے جس سے بات اچھی طرح سمجھ میں آجاتی ہے کہ شریعت میں بھی احکام کا دارومدار علت پر ہوتا ہے، حکمت پر نہیں ہوتا۔

حکم کا دارومدار علت پر ہونے کی فقہی مثال

علت کے معنی ہیں وہ وصف یا علامت جس پر کسی حکم کو شریعت نے دائر کیا ہو۔

فقہی مثالیں دیتے ہوئے پہلی مثال میں وہی دوں گا جو شروع میں دی تھی، وہ یہ کہ نماز میں قصر کی علت سفر کو قرار دیا ہے، اور حکمت مشقت سے بچانا ہے۔ اب حکم کا دارومدار سفر پر ہے، جب بھی سفر ہوگا، قصر ہوگا، چاہے اس خاص سفر میں مشقت نہ ہورہی ہو، جیسے ہوائی جہاز میں جارہے ہیں، فرسٹ کلاس میں سفر ہے، ہوٹلوں میں قیام ہے، تو یہاں بظاہر کوئی مشقت نہیں ہے، تو حکمت نہیں پائی جارہی، بلکہ بسا اوقات مجھ جیسا آدمی یہاں زیادہ مصروف رہتا ہے اور یہاں رہتے ہوئے نماز کے تمام لوازم کو پورا کرنا زیادہ مشکل ہوتا ہے، لیکن جب میں سفر میں جاتا ہوں، اور کسی کو سفر کی اطلاع نہ ہو، تو اس صورت میں مجھے سفر کے دوران اتنا وقت مل جاتا ہے کہ اطمینان سے نوافل تلاوت سب ادا ہوتے رہتے ہیں، تو وہ مشقت اس خاص سفر میں مفقود ہے،

لیکن اس کی وجہ سے حکم میں فرق نہیں آیا، کیونکہ سفر پایا گیا، اسی طرح تمام احکام شرعیہ کا معاملہ ہے۔

شراب کی حکمت قرآن کریم میں بیان فرمائی ہے:

﴿انما یرید الشیطن ان یوقع بینکم العداوة والبغضاء فی الخمر والمیسر و یصدکم عن ذکر الله وعن الصلوة﴾ [المائدة:۹۱]

شیطان یہی چاہتا ہے کہ شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے آپس میں دشمنی اور بغض واقع کر دے، اور تمہیں اللہ کی یاد سے اور نماز سے روک دے۔

آج کہنے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ اب جام شراب سے عداوت اور بغض پیدا نہیں ہوتا، بلکہ دوستی پیدا ہوتی ہے، اور انگریزی میں اس کے محاورے مشہور ہیں، جام صحت تجویز کیا جاتا ہے، جام ٹکرائے جاتے ہیں، اس سے کیا ہوتا ہے؟ دوستی پیدا ہوتی ہے، تو اگر کوئی کہے کہ یہاں عداوت اور بغض نہیں پایا جا رہا، لہذا حکم ختم ہو گیا، یہ بات تسلیم نہیں، اس لئے کہ یہ حکمت ہے، علت نہیں، علت کیا ہے؟

کیا حرمت شراب کی علت اس کا نشہ آور ہونا ہے ؟

اس کی اصل علت وہ نہیں جو منطق کی کتابوں میں ہمیں ملتی ہے، یعنی سکر حرمت خمر کی علت نہیں ہے، اگر سکر علت ہوتی تو مقدار غیر مسکر حرام نہ ہوتی، کیونکہ سکر نہیں پایا جا رہا ہے، اور آج بیشتر شراب کے عادی لوگوں کو صحیح معنوں میں سکر ہوتا ہی نہیں، حقیقت میں یہ سکر علت نہیں ہے، بلکہ حرمت خمر کی علت خمریت ہے، خمر کا خمر ہونا یہ بذات خود علت ہے، جہاں خمریت پائی جائے گی، وہاں حرمت آ جائے گی۔ اگر چہ حرمت کی جو حکمت بیان فرمائی گئی تھی (عداوت و بغض کا پیدا ہونا) وہ نہیں پائی جا رہی، کتنے فقیر، کتنے درویش اور جھوٹے صوفی نشہ کر کے کہتے ہیں کہ ہمیں تو اللہ یاد آتا ہے، تو اس حکمت کے مفقود ہونے سے حکم ختم نہیں ہوگا۔

علت اور حکمت میں کیا فرق ہے ؟

اس حقیقت کو ذرا اچھی طرح سمجھ لینا چاہئے کہ علت ہمیشہ ایسی چیز ہوتی ہے، جس کے وجود و عدم میں کوئی اختلاف نہ ہو، کوئی دو رائے نہ ہوں، اس کا وجود و عدم آدمی بالکل واضح طریقے پر متعین کر سکے، وہ مجمل اور مبہم قسم کی چیز نہیں ہوتی کہ اس کے بارے میں ایک شخص یہ کہے کہ علت پائی جا رہی ہے اور دوسرا شخص کہے کہ علت نہیں پائی جا رہی ہے، بلکہ وہ ہمیشہ دوٹوک چیز ہوتی ہے، جس کا وجود و عدم واضح طور پر متعین کیا جا سکے، مثلاً یہ خمر ہے کہ نہیں، ایک واضح بات ہے، یہ سفر ہے کہ نہیں ایک واضح بات ہے، بخلاف حکمتوں کے کہ وہ دوٹوک نہیں ہوتیں، کیونکہ ان کا کوئی پیمانہ نہیں ہوتا، اس کو متعین کرنا مشکل ہوتا ہے، جیسے سفر کے لئے مشقت، اب اس مشقت کے لئے کوئی پیمانہ نہیں ہے، جو یہ بتا دے کہ بھائی اتنی مشقت ہو تو اس میں قصر ہوگی ورنہ نہیں ہوگی، مثلاً آپ بس میں یہاں کورنگی سے شہر جائیں تو اس میں بعض اوقات مشقت زیادہ ہوتی

ہے، بنسبت جہاز میں لاہور چلے جانے سے کہ اس میں اتنی مشقت نہیں ہے کہ جو موجب قصر ہو۔لہذا مشقت ایک ایسی مجمل چیز ہے کہ کوئی کہتا ہے کہ مجھے مشقت ہوئی کوئی کہتا ہے کہ نہیں ہوئی۔ اگر مشقت کو حکم کا دارومدار بنادیا جائے تو انارکی (Anarchy) پھیل جائے گی، اسی طرح سکر (نشہ) کا معاملہ ہے، اگر نشہ آنے پر شراب کی حرمت کا دارومدار ہوتا تو کوئی کہتا کہ مجھے نشہ ہوا، کوئی کہتا ہے کہ مجھے نشہ نہیں ہوا، لہذا میرے لئے شراب حلال ہے۔

کیا حرمت سود کی علت ظلم سے بچانا ہے ؟

اسی طرح سود کے بارے میں قرآن کریم میں فرمایا گیا:

﴿و ان تبتم فلکم رؤس اموالکم لاتظلمون و لا تُظلمون﴾ [البقرۃ:۲۷۹]

سود کی حکمت یہ ہے کہ نہ تم دوسرے پر ظلم کرو، نہ کوئی تم پر ظلم کرے، لوگوں نے اس ظلم کو علت بنادیا، چونکہ ان کے خیال کے مطابق آج بینکنگ کے سود میں یہ ظلم نہیں پایا جاتا، لہذا یہ حلال ہے۔ حالانکہ یہ علت نہیں تھی، بلکہ حکمت تھی، اب یہ ظلم ایک ایسی چیز ہے کہ اس کا کوئی پیمانہ نہیں، اگر عقل کے اوپر دارومدار رکھا تھا تو پھر وحی کے آنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہر ایک شخص یہ کہہ سکتا ہے کہ اس معاملہ (Transaction) میں ظلم ہے، اس میں نہیں ہے، اس معاملے کے اندر زیادتی ہورہی ہے، اس میں نہیں، اس میں انسان کی آراء مختلف ہوسکتی ہیں، اور اس کے لئے کوئی جچا تلا اور کوئی دوٹوک پیمانہ مقرر نہیں کیا جاسکتا۔ لہذا اس میں علت بننے کی صلاحیت ہی نہیں، یاد رکھئے! علت ہمیشہ دوٹوک چیز ہوا کرتی ہے، اور وہ علت سود ہے اور سود کہتے ہیں: ''الز یادۃ المشر وطۃ فی القرض''، ایسی زیادتی جو قرض میں مشروط ہو۔ لہذا جہاں بھی زیادتی پائی جائے گی، وہ سود ہوگا، اور جب سود ہوگا تو حرام ہوگا۔

یہ بہت اہم نکتہ ہے علت اور حکمت کے فرق کو سمجھنے کے لئے اور یہ کہ دارومدار احکام کا علت پر ہوتا ہے، نہ کہ حکمت پر، یہ نکتہ اگر سمجھ میں آجائے تو بے شمار گمراہیوں کا سد باب ہوجائے۔

اجتہاد کے سلسلے میں پائی جانے والی غلط فہمیوں کی وجوہات

خلاصہ یہ نکلا کہ اجتہاد کے بارے میں جو نعرے لگائے جاتے ہیں، اور اس میں جو غلط فہمیاں خاص طور سے جدید تعلیم یافتہ لوگوں میں پائی جاتی ہیں، اس کی تین وجوہات ہیں:

① ایک یہ کہ یہ لوگ اجتہاد کا مقصد یہ سمجھتے ہیں کہ اس کے ذریعہ نصوص کے مقابلے میں کوئی سہولت حاصل کریں، لیکن اگر اجتہاد کے نتیجے میں کوئی مشقت حاصل ہو، یا کوئی ایسا تغیر ہو کہ اس کے نتیجے میں جو چیز پہلے جائز تھی اب ناجائز ہوجائے اس کو یہ سمجھتے ہیں کہ اجتہاد ہوا ہی نہیں۔

② دوسری بات یہ ہے کہ اجتہاد کا دروازہ بند ہونے کا صحیح مفہوم ذہن میں واضح نہیں ہے، اس کی

وجہ سے غلط فہمیاں پیدا ہوگئیں۔

③ تیسری بات یہ ہے کہ تغیر زمانہ کی بنیاد پر جو اجتہاد کے دعوے کئے جاتے ہیں تو اس میں حکمت اور علت کے فرق کو نہیں سمجھا جاتا، اس کی وجہ سے یہ غلط فہمیاں پیدا ہوتی ہیں۔

یہ تین وجوہات اگر ذہن نشین رہیں تو انشاء اللہ اجتہاد کے بارے میں جو گمراہیاں آرہی ہیں، ان کا معقول، مدلل، اور واضح جواب دیا جاسکتا ہے۔

[فقہی مقالات، ج ۵، ص ۲۰۴ تا ۲۲۲]

تقلید

تقلید کی حقیقت کیا ہے اور تقلید کیوں ضروری ہے؟

اس بات سے کسی مسلمان کو انکار نہیں ہوسکتا کہ دین کی اصل دعوت یہ ہے کہ صرف اللہ تعالیٰ کی اطاعت کی جائے، یہاں تک کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت بھی اس لئے واجب ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے قول وفعل سے احکام الٰہی کی ترجمانی فرمائی ہے، کون سی چیز حلال ہے؟ کونسی حرام ہے؟ کیا جائز ہے؟ کیا ناجائز؟ ان تمام معاملات میں خالصۃً اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اطاعت کرنی ہے، اور جو شخص اللہ اور اسکے رسول کے بجائے کسی اور کی اطاعت کرنے کا قائل ہو اور اس کو مستقل بالذات سمجھتا ہو وہ یقینا دائرہ اسلام سے خارج ہے، لہٰذا ہر مسلمان کے لئے ضروری ہے کہ وہ قرآن وسنت کے احکام کی اطاعت کرے۔

لیکن قرآن وسنت میں بعض احکام تو ایسے ہیں جنہیں ہر معمولی لکھا پڑھا آدمی سمجھ سکتا ہے، ان میں کوئی اجمال، ابہام یا تعارض نہیں، بلکہ جو شخص بھی انہیں پڑھے گا وہ کسی الجھن کے بغیر ان کا مطلب سمجھ لے گا، مثلاً قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿لا یغتب بعضکم بعضا﴾ (الحجرات)

تم میں سے کوئی کسی کو پیٹھ پیچھے برا نہ کہے۔

جو شخص بھی عربی زبان جانتا ہو وہ اس ارشاد کا معنی سمجھ جائے گا اور چونکہ نہ اس میں کوئی ابہام ہے اور نہ کوئی دوسری شرعی دلیل اس سے ٹکراتی ہے اس لئے اس میں کوئی الجھن پیش نہیں آئی گی، یا مثلاً آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: لا فضل لعربی علی عجمی

کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت نہیں ہے۔

یہ ارشاد بھی بالکل واضح ہے، اس میں کوئی پیچیدگی اور اشتباہ نہیں، ہر عربی داں بلا تکلف اس کا مطلب سمجھ سکتا ہے۔

اس کے برعکس قرآن وسنت کے بہت سے احکام وہ ہیں جن میں کوئی ابہام یا اجمال پایا جاتا ہے اور کچھ ایسے بھی ہیں جو قرآن ہی کی کسی آیت یا آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہی کی کسی دوسری حدیث سے متعارض معلوم

ہوتے ہیں، ہرایک کی مثال ملاحظہ فرمائیے:

① قرآن کریم میں ارشاد ہے: ﴿والمطلقات يتربصن بأنفسهن ثلثة قروء﴾

اور جن عورتوں کوطلاق دیدی گئی ہووہ تین قرء گزرنے تک انتظار کریں۔

اس آیت میں مطلقہ عورت کی عدت بیان کی گئی ہے، اوراس کے لئے تین قرء کالفظ استعمال کیا گیا ہے، لیکن قرء عربی بان میں حیض (ماہواری) کے لئے بھی استعمال ہوتا ہے اور طہر (پاکی) کیلئے بھی، اگر پہلے معنی لئے جائیں تو آیت کا مطلب یہ ہوگا کہ مطلقہ کی عدت تین مرتبہ ایام ماہواری کا گزرجانا ہے، اور اگر دوسرے معنی لئے جائیں تو تین طہر گزرجانے سے عدت پوری ہوگی، اس موقع پر ہمارے لئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس میں سے کون سے معنی پرعمل کریں؟

② ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

من لم يترك المخابرة فليؤذن بحرب من الله ورسوله (أبوداؤد)

جوشخص بٹائی کا کاروبار نہ چھوڑے وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی طرف سے اعلان جنگ سن لے۔

اس حدیث میں بٹائی کی ممانعت کی گئی ہے، لیکن بٹائی کی بہت سی صورتیں ہیں، یہ حدیث اس بارے میں خاموش ہے کہ یہاں بٹائی کی کونسی صورت مراد ہے۔ کیا بٹائی کی ہرصورت ناجائز ہوگی؟ یوں بعض صورتیں جائز قرار پائیں گی اور بعض ناجائز؟ حدیث میں ایک قسم کا اجمال پایا جارہا ہے، جس کی وجہ سے یہ سوال سامنے آتا ہے کہ بٹائی کوعلی الاطلاق ناجائز کہہ دیں یا اسمیں کوئی تفصیل یا تقسیم ہے؟

③ ایک حدیث میں آنحضرت ﷺ کا ارشاد ہے:

من كان له إمام فقراءة الإمام له قراءة

جس شخص کا کوئی امام ہوتو امام کی قراءت اس کے لئے بھی قراءت بن جائے گی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ نماز میں جب امام قراءت کررہا ہوتو مقتدی کو خاموش کھڑارہنا چاہئے، دوسری طرف آپ ہی کا ارشاد ہے: لاصلوٰة لمن لم يقرأ بفاتحة الكتاب (بخاری)

جس شخص نے سورۃ فاتحہ نہ پڑھی اس کی نماز نہیں ہوئی۔

اس سے معلوم ہوتا ہے کہ ہرشخص کیلئے سورہ فاتحہ پڑھنی ضروری ہے، ان دونوں حدیثوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آیا پہلی حدیث کو اصل قرار دے کر یوں کہا جائے کہ دوسری حدیث میں صرف امام اور منفرد کوخطاب کیا گیا ہے اور مقتدی اس سے مستثنیٰ ہے، یا دوسری حدیث کو اصل قرار دے کر یوں کہا جائے کہ پہلی حدیث میں قراءت سے مراد سورہ فاتحہ کے سوا کوئی دوسری سورہ ہے اور سورۃ فاتحہ اس سے مستثنیٰ ہے۔

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ قرآن و حدیث سے احکام کے مستنبط کرنے میں اس قسم کی بہت سی دشواریاں پیش آتی ہیں، اب ایک صورت تو یہ ہے کہ ہم اپنی فہم وبصیرت پر اعتماد کر کے اس قسم کے معاملات میں خود کوئی فیصلہ کرلیں اور اس پر عمل کرلیں، اور دوری صورت یہ ہے کہ اس قسم کے معاملات میں از خود کوئی فیصلہ کرنے کے بجائے یہ دیکھیں کہ قرآن وسنت کے ارشادات سے ہمارے جلیل القدر اسلاف نے کیا سمجھا ہے۔ چنانچہ قرون اولیٰ کے جن بزرگوں کو ہم علوم قرآن وسنت کا زیادہ ماہر پائیں، ان کی فہم وبصیرت پر اعتماد کریں، اور انہوں نے جو کچھ سمجھا ہے اس کے مطابق عمل کریں۔

اگر انصاف اور حقیقت پسندی سے کام کیا جائے تو ہمارے خیال کے مطابق اس بات میں دو رائے نہیں ہوسکتیں کہ ان دونوں صورتوں میں سے پہلی صورت خاصی خطرناک ہے اور دوسری صورت بہت محتاط ہے، یہ صرف تواضع اور کسر نفسی ہی نہیں بلکہ ایک ناقبل انکار حقیقت ہے کہ علم وفہم، ذکاوت وحافظہ، دین ودیانت، تقوی وپرہیزگاری، ہر اعتبار سے ہم اس قدر تہی دست ہیں کہ قرون اولیٰ کے علماء سے ہمیں کوئی نسبت نہیں پھر جس مبارک ماحول میں قرآن کریم نازل ہوا تھا قرون اولی کے علماء اس بھی قریب ہیں اور اس قرب کی بناء پر ان کے لئے قرآن وسنت کی مراد کو سمجھنا بھی زیادہ آسان ہے، اس کے برخلاف ہم عہد رسالت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اتنے عرصہ بعد پیدا ہوئے ہیں کہ ہمارے لئے قرآن وحدیث کو مکمل پس منظر، اس کے نزول کے ماحول، اس زمانے کے طرز گفتگو کا ہو بہو اور بعینہ تصور بڑا مشکل ہے، حالانکہ کسی کی بات کو سمجھنے کیلئے ان تمام باتوں کی پوری واقفیت انتہائی ضروری ہے۔

ان تمام باتوں کو لحاظ کرتے ہوئے اگر ہم اپنی فہم پر اعتماد کرنے کے بجائے قرآن وسنت کی مختلف التعبیر پیچیدہ احکام میں اس مطلب کو اختیار کرلیں جو ہمارے اسلاف میں سے کسی عالم نے سمجھا ہے، تو کہا جائیگا کہ ہم نے فلاں عالم کی تقلید کی ہے۔

یہ ہے تقلید کی حقیقت! اگر میں اپنے مافی الضمیر کو صحیح سمجھا سکا ہوں تو یہ بات آپ پر واضح ہوگئی ہوگی کہ کسی امام یا مجتہد کی تقلید صرف موقع پر کی جاتی ہے جہاں قرآن وسنت سے کسی حکم کو سمجھنے میں دشواری ہو، خواہ اس بناء پر کہ قرآن وسنت کی عبارت کے ایک سے زائد معنی نکل سکتے ہوں، خواہ اس بناء پر کہ اس میں کوئی اجمال ہو، یا اس بناء پر کہ اس مسئلے میں دلائل متعارض ہوں، چنانچہ قرآن وسنت کے جو احکام قطعی ہیں، یا جن میں کوئی اجمال وابہام، تعارض یا اسی قسم کی کوئی الجھن نہیں ہے وہاں کسی امام ومجتہد کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں، چنانچہ مشہور حنفی عالم علامہ عبدالغنی نابلسی تحریر کرتے ہیں:

> فالأمر المتفق عليه المعلوم من الدين بالضرورة لايحتاج إلى التقليد فيه لأحد الأربعة كفرضية الصلوٰة والصوم والزكوٰة والحج ونحوها وحرمة الزنا واللواطة وشرب الخمر والقتل والسرقة والغصب وما

أشبه ذٰلك والأمر المختلف فيه هو الذى يحتاج إلى التقليد فيه .

[خلاصة التحقيق فى حكم التقليد والتلفيق : ص: ٤ ، مطبوعة : مكتبة اليشيق استنبول]

ترجمہ: پس وہ متفقہ مسائل جن کا دین میں سے ہونا بداہۃً معلوم ہے، ان میں ائمہ اربعہ میں سے کسی کی تقلید کی کوئی ضرورت نہیں، مثلاً نماز، روزے، زکوٰۃ، حج وغیرہ کی فرضیت اور زنا، لواطت، شراب نوشی، قتل، چوری اور غصب کی حرمت، دراصل تقلید کی ضرورت ان مسائل میں پڑتی ہے جن میں علماء کا اختلاف ہو۔

اور علامہ خطیب بغدادی رحمۃ اللہ فرماتے ہیں:

وأما الأحكام الشرعية فضربان : أحدهما يعلم ضرورة من دين الرسول و كالصلوات الخمس والزكوٰة وصوم شهر رمضان والحج وتحريم الزنا وشرب الخمر وما أشبه ذلك ، فهٰذا لا يجوز التقليد فيه ؛ لأن الناس كلهم يشتركون فى ادراكه والعلم به ، فلا معنى للتقليد فيه ، وضرب اخر لايعلم الا بالنظر والاستدلال تفروع العبادات و المعاملات والفروج والمناكحات وغير ذٰلك من الاحكام فهٰذا يسوغ فيه التقليد بدليل قول الله تعالىٰ : ﴿فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون﴾ ولأنا لو منعنا التقليد فى هٰذا المسائل التى هى من فروع الدين لاحتاج كل أحد أن يتعلم ذٰلك ، وفى إيجاب ذٰلك قطع عن المعايش وهلاك الحرث والماشيه فوجب أن يسقط .

[الفقيه والمتفقه ، للخطيب بغدادى : ٦٧،٦٨/٢ ط:دارالافتاء سعوديه رياض ١٣٨٩ هـ]

ترجمہ: اور شرعی احکام کی دو قسمیں ہیں: ایک وہ احکام ہیں جنکا جزو دین ہونا بداہۃً ثابت ہے، مثلاً پانچ نمازیں، زکوٰۃ، رمضان کے روزے اور حج کی فرضیت اور زنا اور شراب نوشی کی حرمت اور اسی جیسے دوسرے احکام، تو اسی قسم میں تقلید جائز نہیں، کیونکہ ان چیزوں کا علم تمام لوگوں کو ہوتا ہی ہے لہذا اس مین تقلید سے کوئی معنیٰ نہیں اور دوسری قسم وہ ہے جس کا علم فکر ونظر اور استدلال کے بغیر نہیں ہوسکتا، جیسے عبادات و معاملات اور شادی بیاہ کے فروعی مسائل، اس قسم میں تقلید درست ہے، کیونکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے: ﴿فاسئلوا أهل الذكر إن كنتم لا تعلمون﴾، نیز اس لئے کہ اگر ہم دین کے ان فروعی مسائل میں تقلید کو ممنوع کر دیں تو اس کا مطلب یہ ہوگا کہ ہر شخص باقاعدہ علوم دین کی تحصیل میں لگ جائے، اور لوگوں پر اس کو واجب کرنے سے زندگی کی تمام ضروریات برباد ہو جائیں گی، اور کھیتیوں اور مویشیوں کی تباہی لازم آئی گی، لہذا ایسا حکم نہیں دیا جاسکتا۔

اور حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں:

''مسائل تین قسم کے ہیں:

① اول وہ جن میں نصوص متعارض ہوں۔

② دوم وہ جن میں نصوص متعارض نہیں، مگر وجوہ معانی متعددہ کو محتمل ہوں، گو اختلاف نظر سے کوئی معنی قریب، کوئی بعید معلوم ہوتے ہوں۔

③ سوم وہ جن میں تعارض بھی نہ ہو اور ان میں ایک ہی معنی ہو سکتے ہوں۔

پس قسم اول میں رفع تعارض کیلئے مجتہد کو اجتہد کی اور غیر مجتہد کو تقلید کی ضرورت ہوگی، قسم ثانی ظنی الدلالۃ کہلاتی ہے اس میں تعیین احد الاحتمالات کے لئے اجتہاد و تقلید کی حاجت ہوگی، قسم ثالث قطعی الدلالۃ کہلاتی ہے، اس میں ہم بھی نہ اجتہاد کو جائز کہتے ہیں نہ اس کی تقلید کو''۔

(الاقتصاد فی التقلید والاجتہاد: ۴۳/ دہلی بہ جواب شبہ سیزدہم)

امام کی تقلید بطور شارع یا بذات خود واجب الاطاعت سمجھ کر نہیں کی جاتی

مذکورہ بالا گزارشات سے یہ بات بھی واضح ہو جاتی ہے کہ کسی امام یا مجتہد کی تقلید کا مطلب یہ ہرگز نہیں کہ اسے بذات خود واجب الاطاعت سمجھ کر اتباع کی جا رہی ہے، یا اسے شارع (شریعت بنانے والا، قانون ساز) کا درجہ دیکر اس کی ہر بات کو واجب الاتباع سمجھا جا رہا ہے، بلکہ اس کا مطلب صرف یہ ہے کہ پیروی تو قرآن وسنت کی مقصود ہے لیکن قرآن وسنت کی مراد کو سمجھنے کیلئے شارحِ قانون ان کی بیان کی ہوئی تشریح وتعبیر پر اعتماد کیا جا رہا ہے، یہی وجہ ہے کہ قرآن وسنت کے قطعی احکام میں کسی امام یا مجتہد کی تقلید ضروری نہیں سمجھی گئی، کیونکہ وہاں اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت اصل مقصد اس کے بغیر بآسانی حاصل ہو جاتا ہے۔

یہ بات (کہ جس امام کی تقلید کی جائے اسے صرف شارح قرار دیا جائے بذات خود واجب الاتباع نہ سمجھا جائے) خود اصطلاح ''تقلید'' کے مفہوم میں داخل ہے۔ چنانچہ علامہ ابن الہمامؒ اور علامہ ابن نجیمؒ تقلید کی تعریف ان الفاظ میں فرماتے ہیں:

التقلید العمل بقول من لیس قوله احدی الحجج بلا حجة منها

تقلید کا مطلب یہ ہے کہ جس شخص کا قول مآخذ شریعت میں سے نہیں ہے اس کے قول پر دلیل کا مطالبہ کئے بغیر عمل کر لینا

اس تعریف نے واضح کر دیا کہ مقلد اپنے امام کے قول کو مآخذ شریعت نہیں سمجھتا کیونکہ مآخذ شریعت

صرف قرآن وسنت (اور انہی کے ذیل میں اجماع وقیاس) ہیں، البتہ یہ سمجھ کر اس کے قول پر عمل کرتا ہے کہ چونکہ قرآن وسنت کے علوم میں پوری بصیرت کا حامل ہے، اس لئے اس نے قرآن وسنت سے جو مطلب سمجھا ہے اور میرے لئے زیادہ قابل اعتماد ہے۔

اب آپ بہ نظر انصاف غور فرمائیے کہ اس عمل میں کون سی بات ایسی ہے جسے گناہ یا شرک کہا جا سکے؟ اگر کوئی شخص کسی امام کو شارع (قانون ساز) یا بذات خود واجب الاطاعت قرار دیتا ہو تو بلاشبہ اس عمل کو شرک کہا جا سکتا ہے، لیکن کسی کو شارح قانون قرار دے کر اپنے مقابلے میں اس کی فہم وبصیرت پر اعتماد کرنا تو افلاس علم کے اس دور میں اس قدر ناگزیر ہے کہ اس سے کوئی مفر نہیں۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ پاکستان میں جو قانون نافذ ہے وہ حکومت نے کتابی شکل میں مدون اور مرتب کر کے شائع کر رکھا ہے۔ لیکن ملک کے کروڑوں عوام میں سے کتنے آدمی ہیں جو براہ راست قانون کی عبارت دیکھ کر اس پر عمل کر سکتے ہوں؟؟ بے پڑھے لکھے افراد کا تو کچھ کہنا ہی نہیں ہے، ملک کے وہ بہترین تعلیم یافتہ افراد جنہوں نے قانون کا باقاعدہ علم حاصل نہیں کیا، اعلی درجہ کی انگریزی جاننے کے باوجود یہ جرأت نہیں کرتے کہ کسی قانون مسئلے میں براہ راست قانون کی کتاب دیکھیں، اور اس پر عمل کریں، اس کے بجائے جب انہیں کوئی قانون سمجھنے کی ضرورت پیش آتی ہے تو وہ کسی ماہر وکیل کو تلاش کر کے اس کے قول پر عمل کرتے ہیں، کیا کوئی صحیح العقل انسان اس طرز عمل کا یہ مطلب سمجھ سکتا ہے کہ انہوں نے اس وکیل کو قانون سازی کا اختیار دے دیا ہے اور وہ ملکی قانون کے بجائے وکلاء کو اپنا حاکم تسلیم کرنے لگے ہیں؟

بالکل یہی معاملہ قرآن وسنت کے احکام کا ہے کہ ان کی تشریح کیلئے ائمہ مجتہدین کی طرف رجوع کرنے اور ان پر اعتماد کرنے کا نام تقلید ہے، لہذا تقلید کرنے والے کو یہ الزام نہیں دیا جا سکتا کہ وہ قرآن و سنت کے بجائے ائمہ مجتہدین کا اتباع کر رہا ہے۔ [تقلید کی شرعی حیثیت، ص ۷ تا ۱۵]

قرآن میں تو آباء و اجداد کی تقلید کی مذمت کی گئی ہے

① تقلید پر پہلا اعتراض یہ کیا جاتا ہے کہ قرآن کریم نے بالفاظ ذیل تقلید کی مذمت فرمائی ہے۔

﴿واذا قیل لهم اتبعا ما انزل الله قالوا بل نتبع ما وجدنا علیه آبائنا اولو کا ن آبائهم لا یعقلون شیئا و لا یهتدون﴾

اور جب ان سے کہا جاتا ہے کہ اللہ نے جو احکام نازل فرمائے ہیں ان کی پیروی کرو تو وہ کہتے ہیں کہ نہیں! ہم تو ان باتوں کی پیروی کریں گے جن پر ہم نے اپنے باپ دادوں کو پایا ہے، (اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں) بھلا اگر ان کے باپ دادے عقل وہدایت نہ رکھتے ہوں تب بھی۔

لیکن جو گزارشات ہم نے پچھلے صفحات میں پیش کیں ہیں اگر ان کی روشنی میں بہ نظر انصاف غور کیا

جائے تو یہ شبہ خود بخود دور ہوجاتا ہے کہ ائمہ مجتہدین کی تقلید (معاذ اللہ) مذکورہ آیت کے خلاف ہے، پہلی بات تو یہ کہ قرآن کریم کی اس آیت میں دین کے بنیادی عقائد کا ذکر ہورہا ہے یعنی مشرکین توحید، رسالت اور آخرت جیسے مسائل میں حق کو قبول کرنے کے بجائے صرف یہ دلیل پیش کرتے تھے کہ ہم نے اپنے آباءواجداد کو انہی عقائد پر پایا ہے، گویا کہ ان کی تقلید دین کے بنیادی عقائد میں تھی اور دین کے بنیادی عقائد میں تقلید ہمارے نزدیک بھی جائز نہیں ہے، تمام اصول فقہ کی کتابوں میں یہ مسئلہ لکھا ہوا ہے کہ تقلید عقائد اور ضروریات دین میں نہیں ہوتی کیونکہ یہ مسائل نہ اجتہاد کا محل ہیں نہ تقلید کا، مثلاً علامہ امیر بادشاہ بخاریؒ تحریر الاصول کی شرح میں لکھتے ہیں:

(فیما یحل الاستیفاء فیه) الاحکام (الظنية لا العقلية) المتعلقة بالاعتقاد فان المطلوب فيها العلم (على) المذهب (الصحيح) فلا يجوز التقليد فيها، بل يجب تحصيلها بالنظر الصحيح (كوجوده تعالىٰ)

ترجمہ: جن مسائل میں استفتاء کرنا جائز ہے وہ ظنی احکام ہیں، نہ کہ وہ عقلی احکام جو عقائد سے متعلق ہوں، اس لئے کہ وہاں قطعی علم درکار ہے، چنانچہ صحیح مذہب یہی ہے کہ بنیادی عقائد میں تقلید جائز نہیں، بلکہ ان عقائد کو صحیح استدلال کے ذریعے اختیار کرنا ضروری ہے، مثلاً وجود باری تعالیٰ۔

لہٰذا جس تقلید کی مذمت مذکورہ آیت نے کی ہے اسے ائمہ مجتہدین کے مقلد حضرات بھی ناجائز کہتے ہیں، چنانچہ علامہ خطیب بغدادی نے اصول عقائد میں تقلید کو ناجائز قرار دیتے ہوئے اسی آیت سے استدلال کیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے باپ داداوں کی تقلید پر مذمت کے دو سبب بھی بیان فرمائے ہیں، ایک یہ کہ وہ لوگ اللہ تعالیٰ کے نازل کئے ہوئے احکام کو برملا رد کرکے انہیں نہ ماننے کا اعلان کرتے ہیں اور صاف کہتے ہیں کہ اس کے بجائے اپنے باپ داداوں کی بات مانیں گے، دوسرے یہ کہ ان کے آباءواجداد عقل وہدایت سے کورے تھے۔

لیکن ہم جس تقلید کی گفتگو کررہے ہیں اس میں یہ دونوں سبب مفقود ہیں، کوئی تقلید کرنے والا خدا و رسول کے احکام کو رد کرکے کسی بزرگ کی بات نہیں مانتا، بلکہ وہ اپنے امام مجتہد کو قرآن وسنت کا شارح قرار دے کر اس کی تشریح کی روشنی میں قرآن وسنت پر عمل کرتا ہے، اسی طرح دوسرا سبب بھی یہاں نہیں پایا جاتا کیونکہ اس سے کوئی اہل حق بھی انکار نہیں کرسکتا کہ جن ائمہ مجتہدین کی تقلید کی جاتی ہے، ان سے کتنا ہی اختلاف رائے کیوں نہ ہو مگر ہر اعتبار سے ان کی جلالت قدر ہر ایک کو مسلم ہے، اس لئے اس تقلید کو کافروں کی تقلید پر منطبق کرنا بڑے ظلم کی بات ہے۔ [تقلید کی شرعی حیثیت، ص ۱۱۵]

یہود ونصاریٰ میں احبار و رہبان کی تقلید کی جاتی تھی جس کی قرآن نے مذمت کی ہے

④ بعض حضرات مجتہدین کی تقلید پر اس آیت کو چسپاں فرماتے ہیں:

﴿اتخذوا احبارھم و رھبانھم اربابا من دون اللہ﴾

انہیں نے اپنے علماء اور تارک الدنیا زاہدوں کو اللہ کے بجائے اپنا پروردگا بنا رکھا ہے۔

لیکن ہم پیچھے تفصیل کے ساتھ عرض کر چکے ہیں کہ کسی مجتہد کی تقلید یا اطاعت شارع یا قانون ساز کی حیثیت سے نہیں کی جاتی، بلکہ اسے شارح قانون قرار دے کر کی جاتی ہے، اسے اپنی ذات کے اعتبار سے واجب الاتباع قرار نہیں دیا جاتا بلکہ اس کی بیان کردہ تشریحات پر اعتماد کر کے قرآن وسنت کی پیروی کی جاتی ہے۔

پیچھے ہم تفصیل کے ساتھ عرض کر چکے ہیں کہ ان کے نزدیک:

① دین کے بنیادی عقائد میں تقلید نہیں ہوتی۔

② جو احکام شریعت تواتر و بداہت سے ثابت ہیں ان میں کسی کی تقلید نہیں کی جاتی۔

③ قرآن وسنت کی جو نصوص قطعی الدلالۃ ہیں، اور جن کا کوئی معارض موجود نہیں ان میں کسی امام کی تقلید کی ضرورت نہیں۔

④ تقلید صرف اس غرض کے لئے کی جاتی ہے کہ قرآن وسنت سے اگر مختلف باتوں کا اثبات ممکن ہو تو کسی ایک معنی کو معین کرنے کے لئے اپنے ذہن کے بجائے کسی مجتہد کی فہم پر اعتماد کیا جائے۔

⑤ مجتہدین امت کسی کے نزدیک معصوم اور خطاؤں سے پاک نہیں ہیں، بلکہ ان کے ہر اجتہاد میں غلطی کا امکان موجود ہے۔

⑥ ایک متبحر عالم اگر مجتہد کے کسی قول کو کسی صحیح اور صریح حدیث کے خلاف پائے، اور اسکا کوئی معارض موجود نہ ہو تو اس کے لئے ان شرائط کے ساتھ جن کا ذکر متبحر عالم کی تقلید کے عنوان کے تحت گزر چکا ہے، مجتہد کے قول کو چھوڑ کر حدیث پر عمل کرنا ضروری ہے۔

اگر یہ طرز عمل بھی شرک ہے اور اس پر بھی علماء کو اپنا خدا بنانے کی وعید چسپاں ہو سکتی ہے تو پھر دنیا میں کونسا کام ایسے شرک سے خالی ہو سکتا ہے۔

جو حضرات تقلید کے مخالف ہیں عملاً وہ خود کسی نہ کسی مرحلہ پر کسی نہ کسی حیثیت سے تقلید ضرور کرتے ہیں، ظاہر ہے کہ غیر مقلد حضرات میں سے ہر فرد ماں کے پیٹ سے مجتہد بن کر پیدا نہیں ہوتا، اور نہ ہر شخص عالم ہوتا ہے، اور اگر عالم بھی ہو تو ہر عالم کو ہر مسئلے میں ہر وقت کتاب وسنت کے پورے ذخیرے کی طرف رجوع کرنے کا موقع نہیں ہوتا، چنانچہ ان حضرات میں سے جو عالم نہیں ہوتے وہ علماء اہل حدیث سے مسئلہ پوچھ کر ان کی تقلید کرتے ہیں، اسی مقصد کے لئے غیر مقلد علماء کے فتاوی کے مجموعے شائع شدہ موجود ہیں، جن

میں اول تو ہر جگہ دلیل بیان کرنے کا التزام نہیں، اور اگر ہو بھی تو ایک عام آدمی یہ فیصلہ کرسکتا ہے کہ جو دلیل انہوں نے بیان کی ہے وہ صحیح ہے یا نہیں؟ لہذا وہ تو ان کے علم وفہم پر اعتماد کرکے ہی عمل کرتا ہے، اور اسی کا نام تقلید ہے۔

رہے وہ حضرات جو باقاعدہ قرآن وسنت کے عالم ہوتے ہیں وہ انصاف سے غور فرمائیں کہ کیا وہ ہر نئے پیش آنے والے مسئلہ میں تفسیر وحدیث کے تمام ذخیرے کھنگال کر کوئی مسئلہ مستنبط کرتے ہیں؟ اگر انصاف اور حقیقت پسندی سے کام لیا جائے تو اس سوال کا جواب کلیۃً نفی ہے، اس کے بجائے یہ حضرات بھی علماء متقدمین کی کتابوں کی طرف رجوع کرتے ہیں، فرق یہ ہے کہ حضرات یا شافعی مسلک کی کتابوں کے بجائے علامہ ابن تیمیہ، علامہ ابن حزم، علامہ ابن القیم، اور قاضی شوکانی جیسے حضرات کی کتابیں دیکھتے ہیں اور ہر مسئلے میں انکی بیان کی ہوئی تحقیق کو اپنی ذاتی تحقیق سے جانچنے کا موقع نہیں پاتے، بلکہ اس اعتماد پر ان کے قول اختیار کر لیتے ہیں کہ یہ حضرات قرآن وسنت کے اچھے عالم ہیں، اور ان کے اقوال عموماً قرآن وسنت سے متعارض نہیں ہوتے۔

اور اگر بالفرض کسی خاص مسئلے میں ان حضرات کو قرآن وحدیث کے اصل ذخیرے کی تحقیق وتفتیش کا موقع بھی مل جائے تو کسی حدیث کو صحیح یا ضعیف قرار دینے کیلئے ان کے پاس ذاتی تحقیق کا کوئی ذریعہ اس کے سوا نہیں ہے کہ ائمہ جرح وتعدیل کیا قوال کو تقلیداً اور صرف تقلیداً اختیار کریں، یہ حضرات رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب ایک حدیث کو بعض اوقات ضعیف کہہ کر رد فرما دیتے ہیں، اگر پوچھا جائے کہ اس حدیث کے ضعیف ہونے کی کیا دلیل ہے؟ تو اس کا جواب ان حضرات کے پاس بجز اس کے اور کچھ نہیں ہوتا کہ اسے فلاں محدث نے ضعیف قرار دیا ہے، یا اس کے فلاں راوی پر فلاں امام نے جرح کی ہے، اور جرح وتعدیل کی کتابوں سے واقفیت رکھنے والا ہر شخص جانتا ہے کہ ان کتابوں میں ہمیشہ جرح وتعدیل کے تفصیلی دلائل مذکور نہیں ہوتے، بلکہ بالآخر ائمہ فن کی تحقیق پر ہی اعتماد کرنا ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات ایک صحیح حدیث کے مقابل دوسری حدیث بھی صحیح سند سے مروی ہوتی ہے، لیکن یہ حضرات دوسری حدیث کو محض اس بناء پر رد کردیتے ہیں کہ فلاں محدث نے اسے مرجوح یا معلول قرار دیا ہے، یہ سارا طرز عمل تقلید نہیں تو اور کیا ہے؟ اگر کوئی شخص اس پر......﴿اتخذوا احبارھم و رھبانھم من دون اللہ﴾ کی آیت چسپاں کرنے لگے تو غیر مقلد حضرات کا جواب اس کے سوا اور کیا ہوگا کہ ان ائمہ فن کی اطاعت ان کو مستقلاً واجب الاطاعت سمجھ کر نہیں کی جارہی ہے، بلکہ ماہر فن کی حیثیت سے ان کی تحقیق پر اعتماد کرکے کی جارہی ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ماہر فن کی تقلید سے زندگی کا کوئی گوشہ خالی نہیں ہے، اور اگر اس کو مطلقاً شجر ممنوعہ قرار دیدیا جائے تو دین کا کوئی کام نہیں چل سکتا۔ [تقلید کی شرعی حیثیت، ص ۱۱۷]

اهل کتاب اپنے احبار و رہبان کی تقلید کرتے تھے جس کی حدیث میں بھی مذمت کی گئی ھے

④ تقلید کی مخالفت میں حضرت عدی بن حاتم کی مذکورہ ذیل حدیث بھی بہ کثرت پیش کی جاتی ہے:

عن عدی بن حاتم قال اتیت النبی ﷺ و فی عنقی صلیب من ذهب فقال یا عدی : اطرح عنك هذا الوثن ، وسمعته یقرأ فی سورة براءة : ﴿اتخذوا احبارهم و رهبانهم اربابا من دون الله﴾ ، قال اما انهم لم یکونوا یعبدونهم ولکنهم کانوا اذا احلوا لهم شیئاً استحلوا و اذا حرموا علیهم شیئاً حرموا (رواه الترمذی)

حضرت عدی بن حاتم رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نبی کریم ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوا، میری گردن میں سونے کی صلیب تھی، آپ ﷺ نے فرمایا: اے عدی: اس بت کو اتار پھینکو اور میں نے آپ کو سورہ برائت کی یہ آیت تلاوۃ کرتے ہوئے سنا کہ ﴿اتخذوا احبارهم و رهبانهم اربابا من دون الله﴾ (ان اہل کتاب نے اپنے علماء اور راہبوں کو اللہ کے بجائے اپنا پروردگا بنالیا ہے) چنانچہ (اس آیت کی تفسیر میں) آپ ﷺ نے فرمایا کہ یہ لوگ اپنے علماء اور راہبوں کی پرستش نہیں کرتے تھے، لیکن جب ان کے علماء اور راہب ان کے لئے کوئی چیز حلال کرتے تو یہ اسے حلال قرار دیتے اور جب وہ ان پر کوئی چیز حرام کرتے تو یہ اسے حرام قرار دیتے۔

لیکن اس حدیث سے بھی ائمہ مجتہدین کی تقلید کا کوئی تعلق نہیں، اور فرق کی وجوہ وہی ہیں جو پچھلے اعتراضات میں بیان کی جا چکی ہیں، یہاں اتنا اضافہ ضروری ہے کہ جن اہل کتاب کے بارے میں آنحضرت ﷺ نے یہ ارشاد فرمایا کہ انہوں نے حلال وحرام کرنے کا اختیار اپنے علماء ورا ہبوں کو دے رکھا تھا، وہ اپنے پاپاؤں کو واقعۃً شارح قانون نہیں بلکہ شارع ور معصوم عن الخطا سمجھتے تھے، اور تحریم وتحلیل کا مکمل اقتدار و اختیار انہوں نے اپنے پاپاؤں کو دے رکھا تھا، چنانچہ انسائیکلو پیڈیا برٹانکا میں ''پوپ'' کے اختیارات بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

''لہٰذا پوپ عقائد کے معاملے میں مقتدر اعلیٰ ہونے کی حیثیت سے اسی حجیت (AUTHORITY) اور اسی معصومیت (INFALLIBILITY) کا حامل ہے جو پورے کلیسا کو مجموعی طور سے حاصل ہے ، چنانچہ پوپ واضع قانون ...... (LEGISLATOR) اور قاضی کی حیثیت میں وہ تمام اختیارات رکھتا ہے جو کلیسا کی اجماعی کونسل کو حاصل ہیں، چنانچہ پوپ کے اقتدار اعلیٰ کے دو لازمی حقوق ہیں، ایک عقائد وغیرہ کے معاملے میں معصوم عن الخطا ہونا اور دوسرے تمام اہل عقیدہ پر ہر پہلو سے مکمل

قانونی اختیار''۔

اوراسی کتاب میں دوسری جگہ کی معصومیت کی تشریح کرتے ہوئے لکھا ہے:

''رومن کیتھولک چرچ پوپ کی جس معصومیت کا قائل ہے اس کا بنیادی مفہوم یہ ہے کہ جب پوپ تمام اہل عقیدہ پر نافذ ہونے والا کوئی ایسا فرمان جاری کرے جو عقائد یا اخلاقیات سے متعلق ہوتو وہ غلطی نہیں کرسکتا''۔

ملاحظہ فرمایئے کہ عیسائیوں نے اپنے پاپاؤں کو جواختیارات دے رکھے تھے (اوراب بھی دے رکھے ہیں) ان کوائمہ مجتہدین کی تقلید سے کیا نسبت ہے؟

برٹانیکا کی مذکورہ عبارت کے مطابق:

① پوپ عیسائیوں کے نزدیک مستقل حجت ہے جبکہ اس کتاب کے ابتداء صفحات میں تقلید کی تعریف کرتے ہوئے یہ بات واضح کی جاچکی ہے کہ مجتہد کے قول کا حجیت شرعیہ نہ ہونا خودتقلید کی تعریف میں داخل ہے۔

② پوپ کوعقائد کے معاملے میں بھی ایسافرمان جاری کرنے کامکمل اختیار ہے جوتمام اہل عقیدہ پر نافذ ہوااور پیچھے بیان کیا جاچکا ہے کہ ایمہ مجتہدین کے مقلد حضرات عقائد مین تقلید کے قائل نہیں۔

③ عیسائی مذہب میں پوپ کوواضع قانون یعنی شارع قرار دیا گیاہے، حالانکہ ائمہ مجتہدین کوان کو کائی مقلد شارع یاواضع قانون نہیں مانتا، بلکہ محض شارح قانون سمجھتا ہے، جس کی تفصیل پچھلے اعتراض کے جواب میں آچکی ہے۔

④ عیسائی مذہب میں پوپ کومعصوم عن الخطا قراردیا جاتا ہےاورائمہ مجتہدین کے بارے میں تمام مقلدین کا یہ عقیدہ یہ ہے کہ ان کے ہراجتہاد میں خطا کا احتمال ہے۔

⑤ عیسائی مذہب میں پوپ کوتمام اہل عقائد پر ہر پہلو سے مکمل قانونی اختیار ہوتا ہےاورکسی بھی اہل عقیدہ کوواس کے کسی حکم سے سرموانحراف کی اجازت نہیں، اس کے برعکس ائمہ مجتہدین کے مقلد حضرات کو بعض حالات میں اپنے مجتہدین کے قول کوچھوڑ دینے کا اختیار ہے، جس کی تفصیل تقلید کے مختلف درجات کے عنوان کے تحت بیان ہوچکی ہے۔

زمین وآسمان کے اس عظیم فرق کی موجودگی میں حضرت عدی بن حاتم کی حدیث کوائمہ مجتہدین کے مقلدوں پر کیسے چسپاں کیا جاسکتا ہے؟ ہاں: البتہ اگر کوئی شخص تقلید جامد کی اس حد پر پہنچ جائے جس پرنصاری پہنچے تھے، اورائمہ مجتہدین کے بارے میں وہی عقائدرکھے جواوپرعیسائیوں کے بیان کئے گئے ہیں، تو بلاشبہ وہ اس حدیث کی وعید میں داخل ہوگا۔ [تقلید کی شرعی حیثیت، ص ۱۲۳]

کیا تقلید کرنا کوئی عیب ہے ؟

④ہم نے کتاب کے شروع میں مختلف روایات کے ذریعے یہ ثابت کیا ہے کہ تقلید کا رواج عہد صحابہ میں بھی تھا اور جو صحابہ بذات خود اجتہاد نہ فرماسکتے تھے، وہ فقہاء صحابہ رجوع فرماتے تھے، اس پر بعض حضرات نے یہ اعتراض فرمایا ہے کہ تقلید تو ایک عیب ہے جو کم علمی سے پیدا ہوتا ہے، لہٰذا صحابہ میں تقلید ثابت کرنا (نعوذ باللہ) ان پر ایک عیب لگانا ہے، اور یہ کونسا مقدس تحفہ ہے جسے آپ صحابہ کیلئے ثابت فرمارہے ہیں؟ نیز یہ کہ صحابہ تمام جس طرح عدول تھے اسی طرح وہ سب فقہاء بھی تھے اور صحابہ میں فقیہ اور غیر فقیہ کی تفریق شرمناک ہے۔

لیکن یہ اعتراض درحقیقت محض جذباتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ کسی شخص کا فقیہ یا مجتہد نہ ہونا کوئی عیب نہیں، اور نہ آدمی کی بڑائی اور افضلیت کیلئے اس کا فقیہ اور مجتہد ہونا ضروری ہے، قرآن کریم نے ان اکرمکم عند اللہ اتقاکم فرمایا ہے، اعلمکم یا افقھکم نہیں فرمایا، یعنی کسی شخص کے زیادہ قابل اکرام واحترام ہونے کا اصل معیار تقویٰ ہے، محض علم وتفقہ نہیں، لہٰذا اگر ایک شخص تقوی کی شرائط پر کھرا ثابت ہوتا ہے تو اس میں دینی اعتبار سے شمہ برابر کوئی عیب نہیں، خواہ اس میں فقہ واجتہاد کی ایک شرط بھی نہ پائی جاتی ہو۔

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ صحابہ کرام کے اس مقام پر...... جو دینی فضیلت کا حقیقی مقام ہے...... سب کے سب بلا استثناء فائز ہیں، اور اسی لئے ان کو بالکل بجا طور پر خیر الخلائق بعد الانبیاء (انبیاء کے بعد تمام مخلوقات میں افضل ترین) قرار دیا گیا ہے، لیکن جہاں تک علم وفقہ کا تعلق ہے اس کے بارے میں یہ دعوی کرنا کہ صحابہ سب کے سب فقہاء تھے، قرآن وحدیث کے بالکل خلاف ہے، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿فلولا نفر من کل فرقة منهم طائفة لیتفقهوا فی الدین ولینذرو قومهم اذا رجعو الیهم لعلهم یحذرون﴾ (التوبة : ۱۲۳)

پس کیوں نہ نکل پڑا ان کی ہر بڑی جماعت میں سے ایک گروہ تاکہ یہ لوگ دین میں تفقہ حاصل کریں، اور تاکہ لوٹنے کے بعد اپنی قوم کو ہوشیار کریں، شاید کہ وہ لوگ (اللہ کی نافرمانی سے) بچیں۔

اس آیت میں صحابہ کو یہ حکم دیا گیا ہے کہ ان کی ایک جماعت جہاد میں مشغول ہو اور دوسری جماعت تفقہ حاصل کرنی میں یہ آیت اس بات بر دلالت کر رہی ہے کہ بعض صحابہ خود اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق تفقہ حاصل کرنے کے بجائے جہاد اور دوسری اسلامی خدمات میں مصروف ہوئے، لہٰذا صحابہ میں فقیہ اور غیر فقیہ کی تفریق ت وخود اللہ تعالی نے فرمائی ہے، اور منشائے خداوندی کے عین مطابق ہے، اس کو عیب سمجھنے سے اللہ تعالی کی پناہ مانگنی چاہئے۔

اسی طرح پیچھے سورۃ نساء کی آیت ﴿لعلمه الذین یستنبطونه منهم﴾ کی تفسیر گزر چکی ہے جس سے صاف واضح ہے کہ صحابہ کرام میں سے کچھ حضرات کو قرآن کریم نے اہل استنباط قرار دیا اور کچھ کو یہ حکم دیا کہ ایسے معاملات میں ان اہل استنباط کی طرف رجوع کریں، صحابہ کرام میں اہل استنباط اور غیر اہل استنباط

کی تفریق بھی خود قرآن کریم نے فرمائی ہے۔

نیز سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا یہ ارشاد مشہور و معروف ہے کہ:

نضر الله عبدا سمع مقالتی فحفظها و وعاها و اداها فربّ حامل فقه غیر فقیه ، و رب حامل فقه الی من هو افقه منه .

اللہ تعالیٰ اس بندے کو شاداب کرے، جس نے میری بات سنی ، اسے یاد کیا ، اور محفوظ رکھا اور دوسروں تک اس کو پہنچایا اس لئے کہ بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں کہ وہ کسی فقہ کی بات کو اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں مگر خود فقیہ نہیں ہوتے ، اور بعض لوگ ایسے ہوتے ہیں، جو فقہ کی بات اٹھائے ہوئے ہوتے ہیں اور اپنے سے زیادہ فقیہ تک اس کو پہنچا دیتے ہیں۔

اس ارشاد کے بلاواسطہ مخاطب صحابہ کرام ہی میں، اور اس ارشاد نے دو باتیں واضح فرما دیں، ایک تو یہ کہ ایسا ممکن ہے کوئی راوی حدیث فقیہ نہ ہو، دوسری یہ کہ فقیہ نہ ہونا اس کے حق میں (معاذ باللہ) کوئی عیب نہیں، کیونکہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اسے شادابی کی دعا دی ہے۔

چنانچہ واقعہ یہ ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے صحبت کی نعمت بے بہا سے مختلف قسم کے حضرات سرفراز ہوتے ہیں ان میں حضرت ابوبکر وعمر جیسے حضرات بھی تھے، اور حضرات اقرع بن حابس اور حضرت سلمہ بن صخرہ رضی اللہ عنہم جیسے پاک نفس اور سادہ لوح اعراب بھی تھے، جہاں تک ان سادہ لوح اعرابہ صحابہ کے شرف صحابیت تقوی وطہارت اور فضیلت کا تعلق ہے اس اعتبار سے بلاشبہ ان پر بعد کے ہزار اہل علم وفضل قربان ہیں، اور کوئی کتنا بڑا مجتہد ہو جائے ، ان کے مقام بلند کو چھو بھی نہیں سکتا، لیکن جہاں تک ان حضرات علم وفقہ کے اعتبار سے حضرت ابوبکر وعمر، حضرت علی وابن مسعود اور دوسرے فقہاء صحابہ کرام کی صف میں شامل کرنے کا تعلق ہے، یہ کھلی ہوئی بداہت کا انکار ہے، یہی وجہ ہے کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار صحابہ کرام میں جن حضرات کے فتاوٰی امت میں محفوظ رہے ہیں، ان کی تعداد علامہ ابن قیم کے بیان کے مطابق کل ایک سوتیس سے کچھ اوپر ہے۔

اور یہ خیال تو بالکل غلط اور صحابہ کرام کے مزاج سے انتہائی بعید ہے کہ ان حضرات کا کسی کی تقلید کرنا یا کسی سے استفتاء (معاذ اللہ) ان کی شان میں کسی طرح عیب ہے یہ تو وہ حضرات ہیں جنہوں نے دین کے معاملے میں کسی سے استفادے کو ادنی عیب نہیں سمجھا، فقہاء صحابہ کی تقلید کی مثالیں تو پیچھے گزر چکی ہیں، صحابہ کرام کی بے نفسی اور خدا ترسی کا عالم تو یہ تھا کہ ان میں سے بعض حضرات تو تابعین سے علم حاصل کرنے اور ان سے مسائل پوچھنے میں ادنی تامل نہیں کرتے تھے، مثلاً حضرت علقمہ بن قیس نخعی حضرت ابن مسعودؓ کے شاگرد ہیں اور خود تابعی ہیں، لیکن بہت سے صحابہ کرام علم وفقہ کے معاملات میں ان کی طرف رجوع فرماتے تھے۔

لہٰذا صحابہ کرام کے عہد میں تقلید کی جو مثالیں اس کتاب میں پیش کی گئی ہیں، ان کو اس بناء پر ماننے میں...... تامل کرنا کوئی صحیح طرز عمل نہیں کہ ان کو تسلیم کرنے سے (معاذ اللہ) صحابہ کرام کی شان میں کوئی عیب

لازم آجائے گا۔ [تقلید کی شرعی حیثیت، ص ۱۳۵]

”تقلید کی وجہ سے زندگی میں تنگی پیدا ہوتی ہے اور نئے مسائل کا حل نہیں ملتا“

⑤ تقلید شخصی پر ایک اعتراض یہ بھی کیا جاتا ہے کہ اس سے زندگی میں تنگی پیدا ہوتی ہے اور زمانے میں جو نئے مسائل پیش آتے ہیں ان کا حل نہیں ملتا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ متبحر فی المذہب کی تقلید کے بیان میں ہم لکھ چکے ہیں کہ ایک متبحر فی العلم کی تقلید عوام کی تقلید سے بہت مختلف ہوتی ہے، چنانچہ تقلید شخصی ہی کے تحت درجہ اجتہاد فی المسائل کا ہے یعنی جب نئے پیش آنے والے مسائل کا کوئی جواب مجتہد کے اقوال میں نہیں ہے ان کا حکم مجتہد کے اصولوں کی روشنی میں قرآن وسنت سے مستنبط کرنا، اس قسم کا اجتہاد تقلید شخصی کے باوجود ہر دور میں ہوتا رہا، لہٰذا تقلید شخصی سے نئے مسائل کے حل میں کوئی رکاوٹ پیدا نہیں ہوتی۔

اس کے علاوہ زمانے اور عرف کے تغیر سے جن مسائل میں فرق پڑتا ہے ان میں ایک مذہب کے علماء غور وفکر اور مشورے سے احکام کے تغیر کا فیصلہ کر سکتے ہیں، نیز جہاں مسلمانوں کی کوئی شدید اجتماعی ضرورت داعی ہو وہاں اس خاص مسئلے میں کسی دوسرے مجتہد کے قول پر فتویٰ دیا جاسکتا ہے۔ جس کی شرائط اصول فقہ وفتوی کی کتابوں میں موجود ہیں، چنانچہ علماء احناف نے انہیں وجوہ سے بہت سے مسائل میں امام ابوحنیفہ کا قول چھوڑ دیا ہے، مثلاً استیجار علی تعلیم القرآن امام ابوحنیفہ کے نزدیک ناجائز تھا، لیکن زمانے کے تغیر کی وجہ سے بعد کے فقہاء حنفیہ نے اسے جائز قرار دیا، اسی طرح مفقود الخبر عنین اور متعنت وغیرہ کی بیوی کیلئے اصل حنفی مذہب میں گلوخلاصی کی کوئی صورت نہ تھی ، چنانچہ متاخرین علمائے حنفیہ نے ان تمام مسائل میں مالکی مذہب کو اختیار کر کے اس پر فتوی دیا، جس کی تفصیل حکیم الامت حضرات مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کی کتاب ”الحیلۃ الناجزہ للحلیلۃ العاجزۃ“ میں موجود ہے۔

آج بھی جب مسائل میں یہ محسوس ہو کہ مسلمانوں کی کوئی واقعی اجتماعی ضرورت داعی ہے وہاں متبحر علماء اربعہ میں سے کسی دوسرے امام کے مسلک کو اختیار کرنے کا فیصلہ کر سکتے ہیں، البتہ اس کیلئے ایک تو اس بات کی احتیاط لازم ہے کہ تلفیق کی صورت پیدا نہ ہو، یعنی کسی مجتہد کا مسلک ادھورا نہ لیا جائے ، بلکہ اس کی پوری شرائط اور تفاصیل کو اپنایا جائے ، اور اس معاملے میں خود اس مذہب کے ماہر علماء سے رجوع کر کے ان سے اس کی تفصیلات معلوم کی جائیں ، ، جیسا کہ الحیلۃ الناجزۃ کی تصنیف کے وقت کیا گیا ، دوسرے اس معاملے میں انفرادی آراء پر اعتماد کرنے کے بجائے اس بات کی ضروت ہے کہ متبحر فی المذہب علماء کے باہمی مشورے اور اتفاق سے کوئی فیصلہ کیا جائے

اس طریق کار سے واضح رہے کہ تقلید شخصی مسلمانوں کی کسی بھی اجتماعی ضرورت کی تکمیل میں رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ تقلید کے دائرے میں رہتے ہوئے مذکورہ طریق کے تحت نہایت حسن وخوبی اور حزم و احتیاط کے ساتھ مسلمانوں کے مسائل حل ہو سکتے ہیں۔ [تقلید کی شرعی حیثیت، ص ۱۴۰]

تقلید میں جمود اور غلو بھی قابل مذمت ہے

آخر میں یہ بات بھی بطور خاص قابل ذکر ہے کہ جس طرح تقلید کی مخالفت اور شرعی مسائل میں خود رائی قابل مذمت ہے، اسی طرح تقلید میں جمود اور غلو بھی قابل مذمّت ہے۔ اور مندرجہ ذیل صورتیں اسی جمود اور غلو میں داخل ہیں:

① ائمہ مجتہدین کے بارے میں یہ اعتقاد رکھا جائے کہ وہ (معاذ اللہ) شارع ہیں یا وہ معصوم اور انبیاء علیہم السلام کی طرح خطاؤں سے پاک ہیں۔

② کسی صحیح حدیث پر عمل کرنے سے محض اس بناء پر انکار کیا جائے کہ اس کے بارے میں ہمارے امام سے کوئی حکم ثابت نہیں ہے، مثلاً تشہد میں اشھد ان لا الٰہ الا اللہ کہتے ہوئے شہادت کی انگلی سے اشارہ کرنا بہت سی احادیث سے ثابت ہے، لیکن بعض لوگوں نے اس سنت سے محض اس بناء پر انکار کیا ہے کہ امام ابوحنیفہ سے اس کے بارے میں کوئی منقول نہیں، اور شاید یہی مسلہ ہے جس کے بارے میں بعض لوگوں نے یہ انتہائی گستاخانہ جملے کہا ہے کہ: ''ما را قول ابوحنیفہ باید قول رسول کافی نیست''، ونعوذ باللہ العلی العظیم، یہی وہ تقلید جامد ہے، جس کی مذمت قرآن وحدیث میں آئی ہے۔

③ احادیث نبویہ کو توڑ مروڑ کر اپنے امام کے مذہب کے مطابق بنانے کیلئے ان میں ایسی دور از کار تاویلات کی جائیں جن پر خود ضمیر مطمئن نہ ہو، لیکن یہ اپنے اپنے انداز فکر کا معاملہ ہے، اگر کسی شخص کو حدیث کی کسی توجیہ پر واقعی پر شرح صدر ہے، اور دوسرا اُسے درست نہیں سمجھتا، تو دوسرے کو پہلے شخص پر اعتراض کا حق نہیں ہے۔

④ ایک متبحر عالم کو بشہادت قلب یہ ثابت ہو جائے کہ امام کا قول فلاں صحیح حدیث کے خلاف ہے، اور اس حدیث کے معارض کوئی دلیل بھی نہیں ہے، اس کے باوجود وہ حدیث کو قابل عمل نہ سمجھے تو یہ بھی تقلید جامد ہے، اس مسئلے کی پوری تفصیل ''متبحر فی المذہب کی تقلید'' کے زیر عنوان گزر چکی ہے، وہیں اس کی شرائط بھی مذکور ہیں، اور حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے الفاظ میں اس کی مختلف صورتیں ہیں۔

⑤ اسی طرح یہ اعتقاد بھی تقلید کا بدترین غلو ہے کہ صرف ہمارے امام کا مسلک حق ہے اور دوسرے مجتہدین کے مذاہب (معاذ اللہ) باطل ہیں، واقعہ یہ ہے کہ تمام ائمہ مجتہدین نے اجتہاد کی شرائط کو پورا کر کے قرآن وحدیث کی صحیح مراد معلوم کرنے کی کوشش کی ہے اس لئے سب کے مذاہب برحق ہیں، اور اگر کسی سے

اجتہادی غلطی ہوئی ہے تو اللہ کے نزدیک وہ نہ صرف معاف ہے، بلکہ اپنی کوشش صرف کرنے کی وجہ سے مجتہد کو ثواب ہوگا، جس کی تصریح احادیث میں موجود ہے، البتہ ایک مقلد یہ اعتقاد رکھ سکتا ہے کہ میرے امام کا مسلک صحیح ہے، مگر اس میں بھی خطا کا بھی احتمال ہے، اور دوسرے مذاہب میں ائمہ سے اجتہادی خطا ہوئی ہے، لیکن ان میں صحت کا بھی احتمال ہے۔

⑥ ائمہ مجتہدین کے باہمی اختلافات کو حد سے بڑھا کر پیش کرنا بھی سخت غلطی ہے، بہت سے مسائل ایسے ہیں جن میں ائمہ کے درمیان صرف افضل اور غیر افضل کا اختلاف ہے، جائز و ناجائز کا یا حلال و حرام کا اختلاف نہیں، مثلاً نماز میں رکوع کے وقت ہاتھ اٹھائے جائیں یا نہیں؟ آمین آہستہ کہی جائے یا زور سے؟ ہاتھ سینے پر باندھے جائیں یا ناف پر؟ ان تمام مسائل میں ائمہ مجتہدین کا اختلاف محض افضلیت میں ہے، ورنہ یہ تمام طریقے سب کے نزدیک جائز ہیں، لہٰذا ان اختلافات کو حلال و حرام کی حد تک پہنچا کر امت میں انتشار پیدا کرنا کسی طرح جائز نہیں۔

⑦ اور جہاں ائمہ مجتہدین کے درمیان جائز و ناجائز کا اختلاف ہے وہاں بھی اس اختلاف کو خالص علمی حدود ہی میں رکھنا ضروری ہے، ان اختلافات کو نزاع وجدال اور جنگ و پیکار کا ذریعہ بنالینا کسی امام کے مذہب مین جائز نہیں، نہ ان اختلافات کی وجہ سے ایک دوسرے کی عیب جوئی یا ایک دوسرے کے خلاف بد گمانی اور بدزبانی کسی مذہب میں حلال ہے، اس موضوع پر علامہ شاطبیؒ نے بڑا نفیس کلام کیا ہے، جو اہل علم کیلئے قابل مطالعہ ہے۔ (ملاحظہ ہو: الموافقات شاطبی؛ ۴/ ۲۳۰ تا ۲۲۴)

[تقلید کی شرعی حیثیت، ص ۱۵۷]

علماء و دینی مدارس

علماء کی لغزش کسی کے لیے حجت نہیں
”فلاں عالم بھی تو یہ کام کرتے ہیں“ سے استدلال کرنا

حضرت عمرو بن عوف مزنی ؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عالم کی لغزش سے بچو اور اس سے قطع تعلق مت کرو، اور اس کے لوٹ آنے کا انتظار کرو۔

عالم سے مراد وہ شخص ہے جس کو اللہ تعالیٰ نے دین کا علم، قرآن کریم کا علم، حدیث کا علم، فقہ کا علم عطا فرمایا ہو، آپ کو یقین سے یہ معلوم ہے کہ فلاں کام گناہ ہے اور تم یہ دیکھ رہے ہے کہ ایک عالم اس گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے، اور اس غلطی کے اندر مبتلا ہے، پہلا کام تو تم یہ کرو کہ یہ ہرگز مت سوچو کہ جب اتنا بڑا عالم یہ گناہ کا کام کر رہا ہے تو لاؤ میں بھی کرلوں، بلکہ تم اس عالم کی اس غلطی اور اس گناہ سے بچو اور اس کو دیکھ کر تم اس گناہ کے اندر مبتلا نہ ہو جاؤ۔

اس حدیث کے پہلے جملے میں ان لوگوں کی اصلاح فرمادی جن لوگوں کو جب کسی گناہ سے روکا جاتا ہے اور منع کیا جاتا ہے کہ فلاں کام ناجائز اور گناہ ہے، یہ کام مت کرو، تو وہ لوگ بات ماننے اور سننے کے بجائے فوراً مثالیں دینا شروع کر دیتے ہیں کہ فلاں عالم بھی تو یہ کام کرتے ہیں، فلاں عالم نے فلاں وقت میں یہ کام کیا تھا، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے پہلے قدم پر ہی اس استدلال کی جڑ کاٹ دی کہ تمہیں اس عالم کی غلطی کی پیروی نہیں کرنی ہے، بلکہ تمہیں اس کی صرف اچھائی کی پیروی کرنی ہے، وہ اگر گناہ کا کام یا کوئی غلط کام کر رہا ہے تو تمہارے دل میں یہ جرأت پیدا نہ ہو کہ جب وہ عالم یہ کام کر رہا ہے تو ہم بھی کریں گے۔

کیا عالم کا ہر ہر عمل صحیح اور معتبر ہے؟

اس وجہ سے علما کرام نے فرمایا ہے کہ وہ عالم جو سچا اور صحیح معنی میں عالم ہو، اس کا فتوی تو معتبر ہے، اس کا زبان سے بتایا ہوا مسئلہ تو معتبر ہے، اس کا عمل معتبر ہونا ضروری نہیں، اگر وہ کوئی غلط کام کر رہا ہے تو اس سے پوچھو کہ یہ کام جائز ہے یا نہیں؟ وہ عالم یہی جواب دے گا کہ یہ عمل جائز نہیں، اس لیے تو اس کے بتائے

ہوئے مسئلے کی اتباع کرو، اس کے عمل کی اتباع مت کرو، لہذا یہ کہنا کہ فلاں کام جب اتنے بڑے بڑے علماء کرر ہے ہیں تو لاؤ میں بھی یہ کام کرلوں، یہ استدلال درست نہیں، اس کی مثال تو ایسی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ اتنے بڑے بڑے لوگ آگ میں کود رہے ہیں، لاؤ میں بھی آگ میں کود جاؤں، جیسے یہ طرز استدلال غلط ہے، اسی طرح وہ طرز استدلال بھی غلط ہے، اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عالم کی لغزش سے بچو، یعنی اس کی لغزش کی اتباع مت کرو۔

علماء فرشتہ نہیں ہماری طرح کے انسان ہی ہیں
عالم سے بدگمان نہیں ہونا چاہیے

بعض لوگ دوسری غلطی یہ کرتے ہیں کہ جب وہ کسی عالم کو کسی غلطی میں یا گناہ میں مبتلا دیکھتے ہیں تو بس فوراً اس سے قطع تعلق کر لیتے ہیں، اور اس سے بدگمان ہو کر بیٹھ جاتے ہیں، اور بعض اوقات اس کو بدنام کرنا شروع کر دیتے ہیں کہ یہ مولوی تو ایسے ہی ہوتے ہیں، اور پھر تمام علماء کرام کی توہین شروع کر دیتے ہیں کہ آج کل کے علماء تو ایسے ہی ہوتے ہیں، اسی حدیث کے دوسرے جملے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی بھی تردید فرما دی کہ اگر کوئی عالم گناہ کا کام کر رہا ہے تو اس کی وجہ سے اس سے قطع تعلق بھی مت کرو، کیوں؟

اس لیے کہ عالم بھی تمہاری طرح کا انسان ہے، جو گوشت پوست تمہارے پاس ہے وہ اس کے پاس بھی ہے، وہ کوئی آسمان سے اترا ہوا فرشتہ نہیں ہے، جو جذبات تمہارے دل میں پیدا ہوتے ہیں، وہ جذبات اس کے دل میں بھی پیدا ہوتے ہیں، نفس تمہارے پاس بھی ہے، اس کے پاس بھی ہے، شیطان تمہارے پیچھے بھی لگا ہوا ہے، اس کے پیچھے بھی لگا ہوا ہے، نہ وہ گناہوں سے معصوم ہے، نہ وہ پیغمبر ہے اور نہ وہ فرشتہ ہے، بلکہ وہ بھی اسی دنیا کا باشندہ ہے، اور جن حالات سے تم گذرتے ہو وہ بھی ان حالات سے گذرتا ہے، لہذا یہ تم نے کہاں سے سمجھ لیا کہ وہ گناہوں سے معصوم ہے اور اس سے کوئی گناہ سرزد نہیں ہوگا اور اس سے کبھی غلطی نہیں ہوگی، اس لیے کہ جب وہ انسان ہے تو بشری تقاضے سے کبھی اس سے غلطی بھی ہوگی، کبھی وہ گناہ بھی کرے گا، لہذا اس کے گناہ کرنے کی وجہ سے فوراً اس عالم سے برگشتہ ہو جانا اور اس کی طرف سے بدگمان ہو جانا صحیح نہیں، اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ فوراً اس سے قطع تعلق مت کرو، بلکہ اس کے واپس آنے کا انتظار کرو، اس لیے کہ اس کے پاس صحیح علم موجود ہے، امید ہے کہ وہ ان شاء اللہ کسی وقت لوٹ آئے گا۔

لہذا یہ پروپیگنڈہ کرنا اور علما کو بدنام کرتے پھرنا کہ ''ارے میاں! آج کل کے مولوی سب ایسے ہی ہوتے ہیں، آج کل کے علما کا تو یہ حال ہے''، یہ بھی موجودہ دور کا ایک فیشن بن گیا ہے، جو لوگ بے دین ہیں، ان کا تو یہ طرز عمل ہے ہی، اس لیے کہ ان لوگوں کو معلوم ہے کہ جب تک مولوی اور علما کو بدنام نہیں کریں گے، اس وقت تک ہم اس قوم کو گمراہ نہیں کر سکتے، جب علما سے اس کا رشتہ توڑ دیں گے تو پھر یہ لوگ

ہمارے رحم وکرم پر ہوں گے، ہم جس طرح چاہیں گے ان کو گمراہ کرتے پھریں گے، میرے والد ماجد رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ جب گلہ بان سے بکریوں کا رشتہ توڑ دیا تو اب بھیڑیے کے لیے آزادی ہوگئی کہ وہ جس طرح چاہے بکریوں کو پھاڑ کھائے، لہذا جو لوگ بے دین ہیں ان کا تو کام ہی یہ ہے کہ علما کو بدنام کیا جائے، لیکن جو لوگ دین دار ہیں ان کا بھی یہ فیشن بنتا جارہا ہے کہ وہ بھی ہر وقت علما کی توہین اور ان کی بے وقعتی کرتے پھرتے ہیں کہ ''ارے صاحب! علما کا تو یہ حال ہے''، ان لوگوں کی مجلسیں ان باتوں سے بھری ہوتی ہیں، حالانکہ ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں، سوائے اس کے کہ جب لوگوں کو علما سے بدظن کردیا تو اب تمہیں شریعت کے احکام کون بتائے گا؟ اب تو شیطان ہی تمہیں شریعت کے مسائل بتائے گا کہ یہ حلال ہے، یہ حرام ہے، پھر تم اس کے پیچھے چلو گے، اور گمراہ ہوجاؤ گے، لہذا علما اگرچہ بے عمل نظر آئیں، پھر بھی ان کی اس طرح توہین مت کیا کرو، بلکہ ان کے لیے دعا کرو، جب تم اس کے حق میں دعا کرو گے تو علم تو اس کے پاس موجود ہے، تمہاری دعا کی برکت سے ان شاء اللہ ایک دن وہ ضرور صحیح راستے پر لوٹ آئے گا۔

[اصلاحی خطبات، ج۸، ص۲۴۹ تا ۲۵۴]

کیا علماء دین کے ٹھیکیدار ہیں ؟

اللہ تعالیٰ نے مفتی صاحبان اور فقہاء کو دین کا پاسبان بنایا ہے، ان کا فرض ہے کہ جو بات حق ہے وہ بتادیں، اگر کسی نے کفر کی بات کی ہے تو وہ کہدیں گے کہ یہ کفر ہے۔ ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ آپ لوگ دین کے ٹھیکیدار بنے ہوئے ہیں، جس کو چاہا کافر بنادیا اور جس کو چاہا مسلمان بنادیا، میں نے کہا ہم ٹھیکیدار تو نہیں ہیں، البتہ اللہ تعالیٰ نے ہمیں دین کا چوکیدار ضرور بنایا ہے، اور چوکیدار کا کام یہ ہے کہ شناخت کے بغیر کسی کو اندر جانے کی اجازت نہ دے، حتی کہ اگر وزیر اعظم بھی آجائے گا تو اس کو بھی روک لے گا کہ پہلے شناختی کارڈ دکھاؤ اور اپنی شناخت کراؤ کہ آپ وزیر اعظم ہیں، تب اندر جانے دوں گا ورنہ اندر نہیں جانے دوں گا۔ حالانکہ وہ وزیر اعظم ہے اور یہ چوکیدار ہے، اسی طرح ہم بھی دین کے چوکیدار ہیں، لہٰذا اگر کوئی دین کے اندر داخل ہونا چاہے لیکن وہ ان صفات کا حامل نہ ہو تو ہمارا حق ہے کہ اس کو دین کے اندر داخل ہونے سے روک دیں۔ [اصلاحی مجالس، ج۲، ص۵۸]

''علماء ہر ایک کو کافر اور فاسق بناتے رہتے ہیں''

آج کل لوگ علما کرام پر ناراضگی کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہتے ہیں کہ یہ علما تو ہر ایک کو کافر اور فاسق بناتے رہتے ہیں، کسی پر کفر کا فتوی لگادیا، کسی پر فاسق ہونے کا فتوی لگادیا، کسی پر بدعتی ہونے کا فتوی لگادیا، ان کی ساری عمر اسی کام میں گذرتی ہے کہ دوسروں کو کافر بناتے رہتے ہیں، اس کے جواب میں حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ علما لوگوں کو کافر بناتے نہیں ہیں، بلکہ کافر بتاتے ہیں، جب کسی

شخص نے کفر کا ارتکاب کرلیا تو اصل میں تو خود اس شخص نے کفر کا ارتکاب کیا، اس کے بعد علما کرام یہ بتاتے ہیں کہ تمہارا یہ عمل کفر ہے، جس طرح آئینہ تمہیں بتاتا ہے کہ تم بدصورت ہو، تمہارے چہرے پر دھبہ لگا ہوا ہے ، وہ آئینہ بناتا نہیں اور نہ داغ دھبہ لگاتا ہے، اسی طرح علما کرام بھی یہ بتاتے ہی کہ تم نے جو عمل کیا ہے وہ کفر کا عمل ہے، یا فسق کا عمل ہے، یا بدعت کا عمل ہے، لہذا جس طرح آئینہ کو برا بھلا نہیں کہا جاتا اور نہ آئینہ پر یہ الزام لگایا جاتا ہے کہ آئینہ نے میرے چہرے پر داغ لگادیا، بالکل اسی طرح علما پر بھی یہ الزام نہیں لگانا چاہیے کہ انہوں نے کافر یا فاسق بنادیا، اوران پر ناراضگی کا اظہار نہیں کرنا چاہیے، بلکہ ان کا احسان ماننا چاہیے کہ انہوں نے ہمارا عیب بتادیا، اب ہم اس کی اصلاح کریں گے۔

مثلاً بعض اوقات ایک انسان کو اپنی بیماری کا علم نہیں ہوتا کہ میرے اندر فلاں بیماری ہے، لیکن جب وہ کسی طبیب اور ڈاکٹر کے پاس جاتا ہے تو وہ ڈاکٹر بتادیتا ہے کہ تمہارے اندر یہ بیماری ہے، اب ڈاکٹر کو یہ نہیں کہا جائے گا کہ تم نے اس شخص کو بیمار بنادیا، بلکہ یہ کہا جائے گا جو بیماری تمہارے اندر پہلے سے موجود تھی اور تم اس کی طرف سے غافل تھے، ڈاکٹر نے بتادیا کہ تمہارے اندر یہ بیماری ہے، اس کا علاج کرلو۔

البتہ بتانے کے طریقے مختلف ہوتے ہیں، کسی نے آپ کے عیب اور آپ کی خرابی کو اچھے طریقے سے بتادیا، اور کسی نے بے ڈھنگے طریقے سے بتادیا، لیکن اگر کسی نے آپ کی برائیاں ایسے طریقے سے آپ کو بتائیں جو طریقہ مناسب نہیں تھا، تب بھی اس نے تمہاری ایک بیماری پر تمہیں مطلع کیا، اس لیے تمہیں اس کا احسان ماننا چاہیے، عربی کے ایک شعر کا مفہوم یہ ہے کہ ”میرا سب سے بڑا محسن وہ ہے جو میرے پاس میرے عیوب کا ہدیہ پیش کرے“، جو مجھے بتائے کہ میرے اندر کیا عیب ہے، اور جو شخص تعریف کررہا ہے کہ تم ایسے اور ویسے، اور اس کو بڑھا چڑھا رہا ہے، جس کے نتیجے میں دل میں کبر اور غرور پیدا ہورہا ہے، یہ بظاہر تو دیکھنے میں اچھا معلوم ہورہا ہے، لیکن حقیقت میں وہ نقصان پہنچارہا ہے، لیکن جو شخص تمہارے عیوب بیان کررہا ہے اس کا احسان مانو، بہرحال! یہ حدیث ایک تو یہ بتارہی ہے کہ اگر کوئی شخص تمہاری غلطی بتائے تو اس پر ناراض ہونے کے بجائے اس کے بتانے کو اپنے لیے غنیمت سمجھو، جس طرح آئینہ کے بتانے کے غنیمت سمجھتے ہو۔

[اصلاحی خطبات، ج۸، ص۲۹۹، ۳۰۱]

”مولوی ملامتی فرقہ ہے“

علماء اور دینی مدارس کے بارے میں پروپیگنڈہ

آج کی فضا میں طرح طرح کے نعرے، طرح طرح کے پروپیگنڈے، طرح طرح کے اعتراضات ان دینی مدارس پر کیے جارہے ہیں، اعتراضات اور طعنوں کا ایک سیلاب ہے جو ان مدارس کی طرف بہایا جارہا ہے، یہ اعتراضات کچھ تو ان معاندین کی طرف سے ہیں جو دین کے دشمن، اسلام کے دشمن اور اس زمین پر اللہ کے کلمہ کے غلبہ کے دشمن ہیں، وہ ان مدارس کے خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں، لیکن بعض اوقات

اچھے خاصے پڑھے لکھے اور دین سے تعلق رکھنے والے بھی اس پروپیگنڈہ کا شکار ہو جاتے ہیں، دانستہ یا غیر دانستہ طور پر ان دینی مدارس کے بارے میں طرح طرح کے خیالات ان کے دلوں میں پیدا ہو جاتے ہیں۔

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ بعض اوقات ہنسی میں فرمایا کرتے تھے کہ یہ ''مولوی ملامتی فرقہ ہے'' ،یعنی جب کہیں دنیا میں کوئی خرابی ہوگی تو لوگ اس کو مولوی کی طرف موڑنے کی کوشش کرتے ہیں، مولوی کوئی بھی کام کرے، اس میں کوئی نہ کوئی اعتراض کا پہلو ضرور نکال لیتے ہیں، مولوی اگر بے چارہ گوشہ نشین ہے اور اللہ اللہ کر رہا ہے، قال اللہ، قال الرسول کا درس دے رہا ہے تو اعتراض یہ ہے کہ یہ مولوی تو دنیا سے بے خبر ہے، دنیا کہاں جارہی ہے، ان کو اپنے بسم اللہ کے گنبد سے نکلنے کی فرصت نہیں، اگر کوئی مولوی بے چارہ اصلاح کے لیے یا کسی اجتماعی کام کے لیے گوشہ سے باہر نکل آئے تو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ مولوی صاحب کا تو کام تھا مدرسہ میں بیٹھ کر اللہ اللہ کرنا اور آج یہ سیاست میں اور حکومت کے معاملات میں دخل انداز ہو رہے ہیں۔

اگر کوئی مولوی بے چارہ ایسا ہو کہ اس کے پاس مالی وسائل کا فقدان ہو، فقر و تنگ دستی کا شکار ہو تو لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے طالب علموں کے لیے مالی وسائل کا انتظام نہیں کر رکھا ہے، یہ مدرسہ سے نکل کر کہاں جائیں گے؟ کہاں سے روٹی کھائیں گے؟ کہاں سے گذارا ہوگا؟ اور اگر کسی مولوی کے پاس پیسے زیادہ آ گئے تو کہتے ہیں کہ لیجیے یہ مولانا صاحب ہیں؟ یہ تو لکھ پتی اور کروڑ پتی بن گئے، ان کے پاس تو دولت آ گئی، تو اس بے چارے مولوی کی کسی حالت میں معافی نہیں؛ یہ مولوی ملامتی فرقہ ہے۔

ایک قوم تو وہ ہے جو باقاعدہ اہتمام کے ساتھ پروپیگنڈہ کر کے اہل علم اور طلبہ کے خلاف بدگمانیاں پھیلا رہی ہے، خوب سمجھ لیں یہ اسلام دشمنی ہے، اس لیے کہ اسلام کے دشمن اس حقیقت سے واقف ہیں کہ اس روئے زمین کے اوپر جو طبقہ الحمدللہ اسلام کے لیے ڈھال بنا ہوا ہے وہ یہی بوریہ نشینوں کی جماعت ہے، انہیں بوریہ پر بیٹھنے والوں نے الحمدللہ اسلام کے لیے ڈھال کا کام کیا ہے، یہ لوگ جانتے ہیں کہ جب تک مولوی اس روئے زمین پر موجود ہے، ان شاء اللہ ثم ان شاء اللہ اس زمین سے اسلام کا نشان نہیں مٹایا جا سکتا، اور یہ ایک عام مشاہدہ ہے کہ جس جگہ پر بوریہ نشین مولوی ختم ہو گئے وہاں اسلام کا کس کس طرح حلیہ بگاڑا گیا، اور اسلام کو مٹانے کی سازشیں کس طرح کامیاب ہوئیں، اللہ تعالی نے بہت دنیا دکھائی ہے، اور عالم اسلام کے ایسے ایسے خطوں میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں اب ان مدارس کا بیج مار دیا گیا ہے، لیکن اس کا نتیجہ کھلی آنکھوں سے یوں نظر آتا ہے کہ جیسے کسی چرواہے کو قتل کر دینے کے بعد بھیڑوں کا کوئی ذمہ دار نہیں ہوتا اور بھیڑیے انہیں پھاڑ کر کھا جاتے ہیں، آج بہت سے خطوں میں عام مسلمانوں کا دینی اعتبار سے یہی حال ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج۷، ص۸۹]

کیا مولوی دقیانوس اور رجعت پسند ہیں؟

غرض مدارس کے بارے میں طرح طرح کے پروپیگنڈے پھیلائے جارہے ہیں کہ یہ چودہ سو سال پرانے لوگ ہیں، دقیانوسی لوگ ہیں، یہ رجعت پسند لوگ ہیں، ان کو دنیا کے حالات کی خبر نہیں ہے، ان کو اس دنیا میں رہنے کا سلیقہ نہیں ہے، ان کے پاس دنیاوی علوم وفنون نہیں ہیں، یہ امت مسلمہ کا پہیہ الٹا چلانے کی کوشش میں ہیں، یہ نعرے مختلف اوقات میں لگائے جاتے رہے ہیں، اور آج پھر پوری شدت سے ان کی صدائے بازگشت ہمارے ملک میں سنائی دے رہی ہے۔

یہ اعتراض بھی ہورہا ہے کہ دینی مدارس دہشت گرد بن گئے ہیں، یہ ترقی کے دشمن ہیں، دہشت گردی کا طعنہ ان کے اوپر، بنیاد پرستی کا بھی طعنہ ان کے اوپر، رجعت پسندی کا بھی طعنہ ان کے اوپر، تنگ نظری کا بھی طعنہ ان کے اوپر، ترقی کے دشمن، ہونے کا طعنہ بھی ان کے اوپر، ساری دنیا کے طعنوں کی بارش اس بے چارے مولوی کے اوپر ہے لیکن یہ مولوی بہت پکا ہے۔

میرے والد ماجد رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ یہ مولوی بڑا سخت جان ہے، اس پر ان طعنوں کی کتنی ہی بارش کردو، یہ ہر طرح کے حالات برداشت کر لیتا ہے، اس لیے کہ جب کوئی آدمی اس کوچہ میں داخل ہوتا ہے تو الحمدللہ کمر مضبوط کر کے داخل ہوتا ہے، اس کو پتہ ہے کہ یہ سارے طعنے مجھے برداشت کرنے پڑیں گے، دنیا مجھے برا کہے گی، وہ ان سب طعنوں کا استقبال کرتے ہوئے اور خوش آمدید کہتے ہوئے اس میں داخل ہوتا ہے:

جس کو ہو جان و دل عزیز اس کی گلی میں جائے کیوں

اس گلی میں تو آتا ہی وہ ہے جس کو معلوم ہے کہ یہ سب طعنے برداشت کرنے پڑیں گے، اللہ تعالی حقیقت بین نگاہ عطا کرے، تو یہ طعنے ایک داعی حق کے گلے کا زیور ہیں، اس کے سر کا تاج ہیں، یہ وہ طعنے ہیں جو حضرات انبیاء کرام علیہم الصلاۃ والسلام نے بھی سنے اور انبیاء کرام کے وارثوں نے بھی سنے اور قیامت تک یہ طعنے دیے جاتے رہیں گے، اللہ تعالی اپنے سیدھے راستہ پر رکھے، اخلاص عطا فرمائے، اپنی رضا جوئی کی فکر عطا فرمائے، آمین۔ [اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۹۳]

مولوی کی روٹی کی فکر چھوڑ دو

آج ہمارے ماحول کے اندر بار بار یہ آوازیں اٹھتی ہیں کہ ان دینی مدارس کو بند کر دیا جائے، ان کو ختم کر دیا جائے، بہت سے لوگ ایسے بھی ہیں جو اگرچہ عناد کی وجہ سے نہیں، لیکن ہمدردی ہی کے پیرایہ میں ان نعروں کے ساتھ ہم آواز ہوجاتے ہیں، اور بعض اوقات اپنی دانست میں اصلاح ہی کی غرض سے مشورے دیتے ہیں۔

کبھی کوئی یہ کہہ دیتا ہے کہ مولویوں کے کھانے کمانے کا کوئی بندوبست نہیں ہے، لہذا ان کو کوئی ہنر

سکھانا چاہیے، بڑھئی کا کام سکھا دو، کچھ لوہار کا کام سکھا دو، کچھ ایسے صنعتی کام سکھا دو کہ یہ اپنی روٹی کما سکیں، لوگ طرح طرح کی تجویزیں لے کر آتے ہیں کہ ایک دار الصنائع قائم کر دو، تا کہ ان مولویوں کی روٹی کا بندوبست ہو جائے۔

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ کے لیے اس مولوی کی روٹی کی فکر چھوڑ دو، یہ اپنی روٹی خود کھا کمالے گا، اس کی فکر چھوڑ دو، مجھے کچھ مثالیں ایسی دے دو کہ کسی مولوی نے فقر و فاقہ کی وجہ سے خودکشی کی ہے، بہت سے پی ایچ ڈی اور ماسٹر ڈگری رکھنے والوں کی مثالیں میں دے دیتا ہوں، جنھوں نے خودکشی کی اور حالات سے تنگ آ کر اپنے آپ کو ختم کر ڈالا، اور بہت سے ایسے ملیں گے جو ان ڈگریوں کو لیے جوتیاں چٹخاتے پھرتے ہیں لیکن نوکری نہیں ملتی، لیکن ایک مولوی ایسا نہیں بتا سکتے جس نے حالات سے تنگ آ کر خودکشی کی ہو یا اس کے بارے میں یہ کہا گیا ہو کہ وہ بے کار بیٹھا ہوا ہے، اللہ تبارک وتعالی اپنی رحمت سے مولوی کا بھی انتظام کر دیتے ہیں، دوسروں سے بہت اچھا انتظام فرماتے ہیں۔

حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ خالق کائنات کتوں کو روزی دیتا ہے، گدھوں کو دیتا ہے، خنزیروں کو دیتا ہے، وہ اپنے دین کے حاملوں کو کیوں نہیں دے گا، اس لیے تم یہ فکر چھوڑ دو۔

[اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۹۵]

کیا دیو بندیت کسی فرقے کا نام ہے؟
اور کیا اِنکا عقیدہ ومسلک قرآن وحدیث اور جمہور امت سے الگ ہے؟

علمائے دیو بند کے مسلک کی تشریح وتوضیح کے لیے اصلاً کسی الگ کتاب کی تالیف کی چنداں ضرورت نہیں تھی، اس لیے کہ ''علمائے دیو بند'' کوئی ایسا فرقہ یا جماعت نہیں ہیں جس نے جمہور امت سے ہٹ کر فکر وعمل کی کوئی الگ راہ نکالی ہو، بلکہ اسلام کی تشریح وتعبیر کے لیے چودہ سو سال میں جمہور علماء امت کا جو مسلک رہا ہے وہی علمائے دیو بند کا مسلک ہے، دین اور اس کی تعلیمات کا بنیادی سرچشمہ قرآن وسنت ہیں اور قرآن وسنت کی تمام تعلیمات اپنی جامع شکل وصورت میں علمائے دیو بند کے مسلک کی بنیاد ہیں۔

اہل سنت والجماعت کے عقائد کی کوئی بھی مستند کتاب اٹھا کر دیکھ لیجیے اس میں جو کچھ لکھا ہو گا وہی علمائے دیو بند کے عقائد ہیں، حنفی فقہ اور اصول فقہ کی کسی بھی مستند کتاب کا مطالعہ کر لیجیے اس میں جو فقہی مسائل واصول درج ہوں گے، وہی علمائے دیو بند کا فقہی مسلک ہیں، اخلاق واحسان کی کسی بھی مستند اور مسلّم کتاب کی مراجعت کر لیجیے وہی تصوف اور تزکیہ اخلاق کے باب مین علمائے دیو بند کا ماخذ ہے، انبیاء کرام اور صحابہ وتابعین سے لے کر اولیاء امت اور بزرگان دین تک جن جن شخصیتوں کی جلالت شان اور علمی وعملی قدر ومنزلت پر جمہور امت کا اتفاق رہا ہے وہی شخصیتیں علمائے دیو بند کے لیے مثالی اور قابل تقلید شخصیتیں ہیں۔

غرض دین کا کوئی گوشہ ایسا نہیں ہے جس میں علمائے دیوبند اسلام کی معروف ومتوارث تعبیر اور اس کے ٹھیٹھ مزاج ومذاق سے سرِ مُو اختلاف رکھتے ہوں، اس لیے ان کے مسلک کی تشریح وتوضیح کے لیے کسی الگ کتاب کی چنداں ضرورت نہیں، ان کا مسلک معلوم کرنا ہو تو وہ تفصیل کے ساتھ تفسیر قرآن کی مستند کتابوں، مسلّم شروح حدیث، فقہ حنفی، عقائد وکلام اور تصوف واخلاق کی ان کتابوں میں درج ہے جو جمہور علماء امت کے نزدیک مستند اور معتبر ہیں۔

علماء دیو بند پر شخصیت پرستی اور اسلاف کو معبود بنائے رکھنے کا الزام و پروپیگنڈہ

اسلام اعتدال کا دین ہے، قرآن کریم نے امت مسلمہ کو "أمة وسطا" کہہ کر اس بات کا اعلان فرمادیا ہے کہ اس امت کی ایک بنیادی خصوصیت توسط اور اعتدال ہے، اور علمائے دیوبند چونکہ اس دین کے حامل ہیں اس لیے ان کے مسلک ومشرب اور مزاج ومذاق میں طبعی طور پر یہی اعتدال پوری طرح سرایت کیے ہوئے ہے، ان کی راہ افراط اور تفریط کے درمیان سے اس طرح گذرتی ہے کہ ان کا دامن ان دو انتہائی سروں میں سے کسی سے بھی نہیں الجھتا اور یہ اعتدال کی خاصیت ہے کہ افراط اور تفریط دونوں ہی اس سے شاکی رہتے ہیں، افراط اس پر تفریط کا الزام عائد کرتا ہے اور تفریط اس پر افراط کی تہمت لگاتی ہے۔

اس وجہ سے علماء دیوبند کے خلاف بھی انتہا پسندانہ نظریات کی طرف سے متضاد قسم کا پروپیگنڈہ کیا گیا ہے، مثلاً علماء دیوبند کا اعتدال یہ ہے کہ وہ قرآن وسنت پر ایمان کامل کے علاوہ سلف صالحین پر اعتماد اور ان کی پیروی کو بھی ساتھ لے کر چلتے ہیں، ان کے نزدیک قرآن وسنت کی تشریح وتعبیر میں سلف صالحین کے بیانات اور ان کے تعامل کو مرکزی اہمیت بھی حاصل ہے اور وہ ان کے ساتھ عقیدت ومحبت کو بھی اپنے مسلک ومشرب کا اہم حصہ قرار دیتے ہیں، لیکن دوسری طرف اس عقیدت ومحبت کو عبادت اور شخصیت پرستی کی حد تک بھی نہیں پہنچنے دیتے، بلکہ فرق مراتب کا اصول ہمیشہ ان کے پیش نظر رہتا ہے۔

اب جو حضرات قرآن وسنت پر ایمان اور عمل کے تو مدعی ہیں لیکن ان کی تشریح وتعبیر میں سلف صالحین کو کوئی مرکزی مقام دینے کے لیے تیار نہیں بلکہ خود اپنی عقل وفکر کو قرآن وسنت کی تعبیر کے لیے کافی سمجھتے ہیں، وہ حضرات علماء دیوبند پر شخصیت پرستی کا الزام عائد کرتے ہیں اور یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ انہوں نے (معاذ اللہ) اپنے اسلاف کو معبود بنا رکھا ہے۔

اور دوسری طرف جو حضرات اسلاف کی محبت وعقیدت کو واقعۃً شخصیت پرستی کی حد تک لے گئے ہیں، وہ حضرات علمائے دیوبند پر یہ تہمت لگاتے رہے ہیں کہ ان کے دلوں میں اسلاف کی محبت وعظمت نہیں ہے، یا وہ اسلام کی ان مقتدر شخصیتوں کے بارے میں (معاذ اللہ) گستاخی کے مرتکب ہوئے ہیں۔

ان دونوں قسم کے متضاد پروپیگنڈے کے نتیجے میں ایک ایسا شخص جو حقیقت حال سے پوری طرح باخبر نہ ہو، علمائے دیوبند کے مسلک و مشرب کے بارے میں غلط فہمیوں کا شکار ہو سکتا ہے، اس لیے کچھ عرصے سے یہ ضرورت محسوس کی جارہی تھی کہ علمائے دیوبند کے مسلک اعتدال کو مثبت اور جامع انداز میں اس طرح بیان کر دیا جائے کہ ایک غیر جانب دار شخص ان کے موقف کو ٹھیک سمجھ سکے۔

[مقدمہ علمائے دیوبند کا دینی رخ اور مسلکی مزاج، ص ۷ تا ۱۰]

اخلاقیات

اخلاق حسنہ کیا ہیں ؟ اور آج کے دور کی رسمی "خوش اخلاقی"

آج کل ہر چیز کے معنی بدل گئے، ہر چیز کا مفہوم الٹ گیا، ہمارے حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ پہلے زمانے کے مقابلے میں اب اس دور میں ہر چیز الٹی ہوگئی، یہاں تک کہ پہلے چراغ تلے اندھیرا ہوتا تھا اور اب بلب کے اوپر اندھیرا ہوتا ہے، پھر فرماتے کہ آج کل ہر چیز کی قدریں بدل گئیں، ہر چیز کا مفہوم الٹ گیا، حتی کہ اخلاق کا مفہوم بھی بدل گیا، آج صرف چند ظاہری حرکات کا نام اخلاق ہے، مثلاً مسکرا کر مل لیے اور ملاقات کے وقت رسمی الفاظ زبان سے ادا کر دیے، مثلاً یہ کہہ دیا کہ "آپ سے مل کر بڑی خوشی ہوئی" یا "آپ سے مل کر بڑا اچھا معلوم ہوا" وغیرہ، اب زبان سے تو یہ الفاظ ادا کر رہے ہیں، لیکن دل کے اندر عداوت اور حسد کی آگ سلگ رہی ہے، دل کے اندر نفرت کروٹیں لے رہی ہے، بس آج اسی کا نام خوش اخلاقی ہے، اور آج باقاعدہ یہ ایک فن بن گیا ہے کہ دوسروں کے ساتھ کس طرح پیش آیا جائے تاکہ دوسرے لوگ ہمارے گرویدہ ہو جائیں اور باقاعدہ اس پر کتابیں لکھی جارہی ہیں کہ دوسرے کو گرویدہ بنانے کے لیے اور دوسرے کو متاثر کرنے کے لیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں؟ لہذا سارا زور اس پر صرف ہو رہا ہے کہ دوسرا گرویدہ ہو جائے دوسرا ہم سے متاثر ہو جائے اور ہم کو اچھا سمجھنے لگے، آج اسی کا نام "اخلاق" رکھا جاتا ہے۔

خوب سمجھ لیجیے! اس کا اس اخلاق سے کوئی تعلق نہیں جس کا ذکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرما رہے ہیں اور یہ دوسرے لوگوں کو اپنا گرویدہ بنانے اور اپنے گرد اکٹھا کرنے کا بہانہ ہے، یہ حب جاہ ہے، یہ حب شہرت ہے، جو بذات خود بیماری اور بداخلاقی ہیں، حسن اخلاق سے اس کا کوئی تعلق نہیں۔

حقیقت میں اخلاق دل کی ایک کیفیت کا نام ہے جس کا مظاہرہ اعضا اور جوارح سے ہوتا ہے اور وہ یہ ہے کہ دل میں ساری مخلوق خدا کی خیر خواہی ہو اور ان سے محبت ہو خواہ وہ دشمن اور کافر ہی کیوں نہ ہو، اور یہ سوچ کر کہ یہ میرے مالک کی مخلوق ہے لہذا مجھے اس سے محبت رکھنی چاہیے، اس کے ساتھ مجھے اچھا سلوک کرنا

چاہیے، اولاً دل میں یہ جذبہ پیدا ہوتا ہے اور پھر اس جذبے کے ماتحت اعمال صادر ہوتے ہیں اور اس کے ساتھ خیر خواہی کرتا ہے، اب اس جذبہ کے بعد چہرے پر جو مسکراہٹ اور تبسم آتا ہے وہ بناوٹی نہیں ہوتا اور وہ دوسروں کو اپنا گرویدہ کرنے کے لیے نہیں ہوتا بلکہ وہ اپنی دلی خواہش اور دلی جذبے کا ایک لازمی اور منطقی تقاضہ ہوتا ہے، لہٰذا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بیان کردہ اخلاق میں اور آج کے اخلاق میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔

خوب سمجھ لیجیے کہ شریعت کی نظر میں اخلاق کا مفہوم بہت وسیع اور عام ہے، اس مفہوم میں بیشک یہ باتیں بھی داخل ہیں کہ جب انسان دوسرے سے ملے تو خندہ پیشانی سے ملے، اظہار محبت کرے اور اس کے چہرے پر ملاقات کے وقت بشاشت ہو، نرمی کے ساتھ گفتگو کرے، لیکن اخلاق صرف اس طرز عمل میں منحصر نہیں، بلکہ اخلاق درحقیقت دل کی کیفیات کا نام ہے، دل میں جو جذبات اٹھتے ہیں اور جو خواہشات دل میں پیدا ہوتی ہیں ان کا نام اخلاق ہے، پھر اچھے اخلاق کے معنی یہ ہیں کہ انسان کے جذبات میں اچھی اور خوش گوار باتیں پیدا ہوتی ہوں اور برے اخلاق کے معنی یہ ہیں کہ اس کے دل میں خراب جذبات اور غلط خواہشات پیدا ہوتی ہوں، لہٰذا شریعت کا ایک بہت اہم حصہ یہ ہے کہ انسان اپنے اخلاق کی اصلاح کرے اور دل میں پرورش پانے والے جذبات کو اعتدال پر لائے۔

اور ان اخلاق کو حاصل کرنے کے لیے محض کتاب پڑھ لینا کافی نہیں ہے، نہ محض وعظ سن لینا کافی ہوتا ہے، اس کے لیے کسی مربی اور کسی مصلح کی صحبت میں رہنے کی ضرورت ہوتی ہے، تصوف اور پیری مریدی کا جو سلسلہ بزرگوں سے چلا آرہا ہے اس کا اصل مقصد یہ ہے کہ انسان کے اندر اخلاق فاضلہ پیدا ہوں اور برے اخلاق دور ہوں، بہرحال ایمان میں کامل ترین افراد وہ ہیں جن کے اخلاق اچھے ہوں، جن کے دل میں صحیح داعیے پیدا ہوتے ہوں اور ان صحیح داعیوں کا اظہار ان کے اعمال وافعال سے ہوتا ہو، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو ان کاملین میں داخل فرمادیں، آمین۔ [اصلاحی خطبات، ج ۲، ص ۶۲]

حقیقی خوش اخلاقی اور مغربی ممالک کی تجارتی خوش اخلاقی میں فرق

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے فرمایا کہ مؤمن خوش اخلاق ہوتا ہے، بداخلاق، کینہ پرور، لوگوں کے ساتھ درشت معاملہ کرنے والا نہیں ہوتا، یہ ایک مسلمان کی شان نہیں، مسلمان تو دوسرے لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی کا برتاؤ کرتا ہے، سختی کا برتاؤ نہیں کرتا۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ یہ خوش اخلاقی کیا چیز ہے؟ اور کس طرح پیدا ہوتی ہے؟ یہ طویل الذیل موضوع ہے، مختصر وقت میں بیان کرنا مشکل ہے، مختصر بات یہ ہے کہ خوش اخلاقی صرف اس کا نام نہیں کہ آپ نے

ظاہری طور پر دوسرے سے مسکرا کر بات کرلی، یہ بھی بیشک خوش اخلاقی کا ایک حصہ ہے، لیکن اگر ظاہری طور پر تو آپ مسکرا کر بات کررہے ہیں اور دل میں بغض بھرا ہوا ہے، یہ تو خوش اخلاقی کا مصنوعی مظاہرہ ہوا، جس میں اخلاص نہ ہوا، بلکہ ایک بناوٹی کاروائی ہوئی جو ایک مؤمن کے لیے زیبا نہیں۔

آج کل مغربی ممالک میں اس موضوع پر بہت کتابیں لکھی جارہی ہیں کہ لوگوں کے ساتھ کس طرح پیش آئیں؟ اور لوگوں کو کس طرح اپنی طرف مائل کریں؟ لوگ ایسی کتابوں کو بڑے ذوق وشوق سے پڑھتے ہیں، ان کتابوں میں یہ لکھتے ہیں کہ جب لوگوں سے ملو تو اس طرح ملو، جب باتیں کرو تو اس طرح باتیں کرو، اس طرح لوگوں کے ساتھ پیش آؤ، یہ خوش اخلاقی کا طریقہ ہے، لیکن اس خوش اخلاقی کا مطلب صرف یہ ہے کہ دوسرے کے دل کو اپنے حق میں کیسے مسخر کریں؟ دوسرے کے دل میں اپنی عظمت کیسے پیدا کریں؟ بس اس کے لیے خوش اخلاقی کے سارے طریقے اختیار کیے جارہے ہیں، وہ خوش اخلاقی جو دین اسلام کے اندر مطلوب ہے، اور جس کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ذکر فرمایا، اس خوش اخلاقی کا مقصد دوسرے کو مسخر کرنا نہیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ بحیثیت ایک مسلمان کے میرا فرض ہے کہ میں دوسروں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آؤں، لہذا دونوں مقصد میں زمین وآسمان کا فرق ہے، اس لیے کہ وہاں جو خوش اخلاقی ہورہی ہے، وہ لوگوں کو اپنا بنانے کے لیے ہورہی ہے، اپنا گاہک بنانے کے لیے ہورہی ہے، مارکیٹنگ کے لیے ہورہی ہے، لیکن اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جو خوش اخلاقی مطلوب ہے وہ خوش اخلاقی دوسروں کو مسخر کرنے کے لیے نہیں، بلکہ خود اپنے فائدے کے لیے ہے کہ میرا فرض ہے کہ میں اپنے مسلمان بھائی سے خندہ پیشانی کے ساتھ ملوں، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ بھی ایک صدقہ ہے کہ تم اپنے بھائی سے خندہ پیشانی سے ملو تاکہ میرا اللہ راضی ہوجائے۔

آج کل لوگ مغربی قوم کی بہت تعریف کرتے ہیں کہ یہ بڑے خوش اخلاق ہیں، اور ان کی خوش اخلاقی کی تعریف کرکے بسا اوقات مسلمانوں اور اسلام کے مقابلے میں ان کی برتری میں دل میں آنے لگتی ہے، ٹھیک ہے! بعض لوگ حقیقی معنوں میں خوش اخلاق ہوتے ہوں گے، لیکن عام طور پر ان کی خوش اخلاقی تجارتی ہے، وہ مارکیٹنگ کی خوش اخلاقی ہے، ایک سیلز مین جو ایک دوکان پر کھڑا ہوا ہے، وہ اگر اپنے گاہکوں سے مسکرا کر بات نہ کرے اور خوش اخلاقی سے پیش نہ آئے تو کون اس کا سامان خریدنے آئے گا، وہ تو اپنی تجارت کی خاطر اور اپنے نفع کی خاطر لوگوں کے ساتھ خوش اخلاقی سے پیش آنے پر مجبور ہے، لیکن اگر آپ اس سے یہ کہہ دیں کہ تم میرے ساتھ بڑے خوش اخلاقی سے پیش آرہے ہو، تو میرے لیے دس روپے کم کردو، تو پھر وہ ساری خوش اخلاقی رخصت ہوجائے گی، اس لیے کہ وہ ساری خوش اخلاقی تو اس لیے ہورہی ہے کہ میں اس سے زیادہ سے زیادہ پیسے کھینچ لوں، اور اپنا سامان اس کو فروخت کروں، یہ کیا خوش اخلاقی ہوئی؟ خوش اخلاقی وہ ہے جو انسان کے دل سے اُمڈے اور جو اللہ تعالی کو راضی کرنے کے لیے ہو، جس کا مقصد آخرت کی

فلاح ہو، دنیا کے اندر اس کا صلہ مطلوب نہ ہو، یہ ہے خوش اخلاقی۔

یہ خوش اخلاقی کیسے پیدا ہوگی؟ یہ سارا تصوف اور سلوک درحقیقت اسی خوش اخلاقی کو پیدا کرنے کا علم ہے، لوگ بزرگوں کی صحبت میں جو جاتے ہیں، وہ درحقیقت اسی خوش اخلاقی کو اپنے اندر پیدا کرنے کے لیے جاتے ہیں، اس کا ایک پورا نظام ہے، جس کو اس وقت پوری تفصیل سے بیان کرنا تو ممکن نہیں، لیکن میرے نزدیک خوش اخلاقی کی جو کلید ہے وہ اس وقت عرض کر دیتا ہوں، اللہ تعالیٰ اس پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

خوش اخلاقی کی بنیادی کنجی اگر حاصل ہوگئی تو خوش اخلاقی حاصل ہوگئی، وہ ہے ''تواضع''، یہ ساری خوش اخلاقی کی بنیاد ہے، اگر تواضع پیدا ہوگئی تو اب متواضع آدمی بد اخلاق نہیں ہوسکتا، اس لیے بد اخلاقی جب بھی ہوگی اس میں تکبر شامل ہوگا، اور تواضع کا مطلب ہے اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھنا، اور دوسروں کو اپنے سے بڑا سمجھنا، اپنے آپ کو چھوٹا سمجھنا، اگر آدمی کے دل میں یہ بات آجائے کہ میں چھوٹا ہوں، باقی سب بڑے ہیں، اور بڑے ہونے سے مراد عمر اور علم میں بڑا ہونا نہیں، بلکہ اللہ تعالیٰ کے ہاں مقبولیت میں اور تقوی میں، نیکی میں سب مجھ سے بڑے ہیں، یا فی الحال بڑے ہیں، یا فی المآل ان کے بڑے ہونے کا احتمال ہے۔

لہذا دل میں اپنی کوئی بڑائی نہ ہو، بلکہ یہ سوچے کہ میرے پاس جو کچھ ہے وہ اللہ کی عطا ہے، جب چاہیں واپس لے لیں، نہ میں اپنی ذات میں کوئی کمال رکھتا ہوں، نہ میرے پاس اپنی ذات میں کوئی خوبی ہے، اور دوسری مخلوق سب کو اللہ تعالیٰ نے بڑا نوازا ہوا ہے، یہ اپنے آپ کو بڑا نہ سمجھنا تواضع ہے، جب ایک شخص کے دل میں تواضع ہوگی، اور وہ یہ کہے گا کہ میں چھوٹا ہوں، یہ بڑا ہے، تو کیا ایسا شخص کسی بڑے کے ساتھ بد اخلاقی کرے گا؟ نہیں کرے گا، اس لیے کہ بد اخلاقی اس وقت ہوتی ہے جب دل میں اپنی بڑائی ہو اور دوسروں کی تحقیر ہو کہ میں تو بڑا آدمی ہوں، میرے حقوق لوگوں پر ہیں، اور لوگوں پر واجب ہے کہ وہ میرا فلاں حق ادا کریں، اگر وہ میرا حق ادا نہیں کر رہے ہیں تو وہ غلطی کر رہے ہیں، لہذا میں ان کے ساتھ اچھے انداز میں پیش نہیں آؤں گا، ساری بد اخلاقی کی بنیاد اور جڑ یہ ہے۔

اگر تواضع پیدا ہو جائے تو پھر کوئی بد اخلاقی سرزد نہیں ہوگی، اس لیے میں کہتا ہوں کہ خوش اخلاقی کی کلید اور بنیاد تواضع ہے، اور بد اخلاقی کی بنیاد تکبر اور عجب ہے، اگر انسان اس تکبر اور عجب کا علاج کروالے اور تواضع پیدا کرنے کی تدبیر اختیار کرلے اور کسی اللہ والے کی صحبت کے نتیجے میں یہ تواضع پیدا ہو جائے تو پھر ان شاء اللہ بد اخلاقی قریب نہیں آئے گی، حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من تواضع لله رفعه الله

یعنی جو شخص اللہ کے لیے تواضع اختیار کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلندی عطا فرماتے ہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۶، ۱۹۴ تا ۱۹۹]

پیٹھ پیچھے برائی چاہے صحیح ہو یا غلط ہرحال میں غیبت ہے

غیبت کا کیا معنی ہے؟ غیبت کے معنی ہیں دوسرے کی پیٹھ پیچھے برائی بیان کرنا، چاہے وہ برائی صحیح ہو، وہ اس کے اندر پائی جارہی ہو، غلط نہ ہو، پھر بھی اگر بیان کروگے تو وہ غیبت میں شمار ہوگا، حدیث میں آتا ہے کہ ایک صحابی نے حضور اقدس ﷺ سے سوال کیا، یارسول اللہ! غیبت کیا ہوتی ہے؟ تو آپ ﷺ نے جواب میں فرمایا: ذكرك أخاك بما يكره

یعنی اپنے بھائی کا اس کے پیٹھ پیچھے ایسے انداز میں ذکر کرنا جس کو وہ ناپسند کرتا ہو، یعنی اگر اس کو پتہ چلے کہ میرا ذکر اس طرح اس مجلس میں کیا گیا تھا، تو اس کو تکلیف ہو، اور وہ اس کو برا سمجھے، تو یہ غیبت ہے، ان صحابی نے پھر سوال کیا کہ: إن كان في أخي ما أقول

اگر میرے بھائی کے اندر وہ خرابی واقعۃً موجود ہے جو میں بیان کررہا ہوں؟ تو آپ نے جواب میں فرمایا کہ اگر وہ خرابی واقعۃً موجود ہے تب تو یہ غیبت ہے، اور اگر وہ خرابی اس کے اندر موجود نہیں ہے اور تم اس کی طرف جھوٹی نسبت کررہے ہو تو پھر یہ غیبت نہیں، پھر تو یہ بہتان بن جائے اور دوہرا گناہ ہو جائے گا۔

[أبو داود، كتاب الأدب، باب في الغيبة]

اب ذرا ہماری محفلوں اور مجلسوں کی طرف نظر ڈال کر دیکھیے کہ کس قدر اس رواج ہو چکا ہے اور دن رات اس گناہ کے اندر مبتلا ہیں، اللہ تعالیٰ ہماری حفاظت فرمائے، آمین۔

بعض لوگ اس کو درست بنانے کے لیے یہ کہتے ہیں کہ میں غیبت نہیں کررہا ہوں، میں تو اس کے منہ پر یہ بات کہہ سکتا ہوں، مقصد یہ ہے کہ جب میں یہ بات اس کے منہ پر کہہ سکتا ہوں تو میرے لیے یہ غیبت کرنا جائز ہے، یاد رکھو! چاہے تم وہ بات اس کے منہ پر کہہ سکتے ہو، یا نہ کہہ سکتے ہو، وہ ہر حالت میں غیبت ہے، بس اگر تم کسی کا برائی سے ذکر کررہے ہو تو یہ غیبت کے اندر داخل ہے اور یہ گناہ کبیرہ ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۸۲]

غیبت کا کفارہ یا تلافی کس طرح ہو؟

البتہ بعض روایات میں ہے، جو اگر چہ ہیں تو ضعیف، لیکن معنی کے اعتبار سے صحیح ہیں، کہ اگر کسی کی غیبت ہوگئی ہے تو اس غیبت کا کفارہ یہ ہے کہ اس کے لیے خوب دعائیں کرو، استغفار کرو، مثلاً فرض کریں کہ آج کسی کو غفلت سے تنبیہ ہوئی کہ واقعۃً آج تک ہم بڑی سخت غلطی کے اندر مبتلا رہے، معلوم نہیں کن کن لوگوں کی غیبت کرلی، اب آئندہ ان شاء اللہ کسی کی غیبت نہیں کریں گے، لیکن اب تک جن کی غیبت کی ہے، ان کو کہاں کہاں تک یاد کریں اور ان سے کیسے معافی مانگیں؟ کہاں کہاں جائیں؟ اس لیے اب ان کے لیے دعا

اور استغفار کرو۔ [مشکوۃ، کتاب الآداب، باب حفظ اللسان] [اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۹۴]

جس کی غیبت کی تھی اگر وہ مرچکا ہو تو کیسے معافی مانگی جائے ؟

یعنی جس شخص کی آپ نے غیبت کی تھی، اب اس کا انتقال ہو چکا ہے، تو اب اس سے کیسے معافی مانگی جائے؟ تو اس سے معاف کرانے کا طریقہ یہ ہے کہ اس کے لیے دعا و استغفار کرتے رہو، یہاں تک کہ تمہارا دل گواہی دے دے کہ اب وہ شخص تم سے راضی ہو گیا ہوگا۔

لہذا حقوق العباد کا معاملہ اگرچہ بڑا سنگین ہے کہ جب تک صاحب حق معاف نہ کرے، اس وقت تک معاف نہیں ہوگا، اور اگر صاحب حق کا انتقال ہو گیا تو اور زیادہ مشکل، لیکن کسی صورت میں مایوس ہونے کی ضرورت نہیں، کسی بھی حالت میں اللہ تعالیٰ نے مایوسی کا راستہ نہیں رکھا، کہ اب تیرے لیے معافی کا راستہ بند ہے۔ [اصلاحی مجالس، ج ۱، ص ۱۸۳]

بہرحال! مایوسی کا کوئی راستہ نہیں کہ چونکہ ہم سے حقوق العباد ضائع ہو گئے ہیں اور جن کے حقوق ضائع کیے ہیں ان کا انتقال ہو گیا ہے، لہذا اب ہماری مغفرت نہیں ہو سکتی، ایسا نہیں ہے، ابتدا میں تو حقوق العباد کا بہت اہتمام کرو، اور ان کے ضائع ہونے کو سنگین سمجھو، اور کسی اللہ کے بندے کے حق کو پامال نہ کرو، لیکن اگر کسی کا کوئی حق ضائع ہو جائے تو فوراً معاف کرالو اور اگر معاف کرانے کا کوئی راستہ نہ ہو تو مایوس نہ ہو، بلکہ اس کے لیے استغفار کرتے رہو اور اللہ تعالیٰ سے دعا کرتے رہو کہ یا اللہ! اپنے فضل و کرم سے مجھ سے ان بندوں کو راضی کر دیجیے جن کے حقوق میں نے پامال کیے اور یہ دعا کرتے رہو کہ یا اللہ! ان کے درجات بلند فرمایئے، ان کی مغفرت فرمایئے، ان کو رضائے کاملہ عطا فرمایئے، یہ دعا کرتے رہو، یہاں تک کہ یہ گمان غالب ہو جائے کہ وہ راضی ہو گئے ہوں گے۔ [اصلاحی مجالس، ج ۱، ص ۱۸۶]

کیا حجاج بن یوسف کی غیبت کرنا جائز ہے؟

آج حجاج بن یوسف کو کون مسلمان نہیں جانتا جس نے بے شمار ظلم کیے، کتنے علماء کو شہید کیا، کتنے حافظوں کو قتل کیا، حتیٰ کہ اس نے کعبہ شریف پر حملہ کر دیا، یہ سارے برے برے کام کیے اور جو مسلمان بھی اس کے ان برے افعال کو پڑھتا ہے تو اس کے دل میں اس کی طرف سے کراہیت پیدا ہوتی ہے، لیکن ایک مرتبہ ایک شخص نے حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے سامنے حجاج بن یوسف کی برائی شروع کر دی اور اس برائی کے اندر غیبت کی، تو حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے فوراً ٹوکا اور فرمایا کہ یہ مت سمجھنا کہ اگر حجاج بن یوسف ظالم ہے تو اب اس کی غیبت حلال ہو گئی یا اس پر بہتان باندھنا حلال ہو گیا، یاد رکھو! جب اللہ تعالیٰ قیامت کے دن حجاج بن یوسف سے اس کے ناحق قتل اور ظلم اور خون کا بدلہ لیں گے تو تم اس کی جو غیبت کر رہے ہو یا بہتان باندھ رہے ہو تو اس کا بدلہ اللہ تعالیٰ تم سے لیں گے، یہ نہیں کہ جو شخص بدنام ہو گیا تو اس کی بدنامی کے نتیجے میں اس پر

جو چاہو الزام عائد کرتے چلے جاؤ، اس پر بہتان باندھتے چلے جاؤ اور اس کی غیبت کرتے چلے جاؤ۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۹۱]

حقیقی تواضع کسے کہتے ہیں ؟

''تواضع'' عربی زبان کا لفظ ہے، اس کے معنی ہیں ''اپنے آپ کو کم درجہ سمجھنا''، اپنے آپ کو کم درجہ والا کہنا تواضع نہیں، جیسا کہ آج کل لوگ تواضع اس کو سمجھتے ہیں کہ اپنے لیے تواضع اور انکساری کے الفاظ استعمال کر لیے، مثلاً اپنے آپ کو ''احقر'' کہہ دیا، ''ناچیز''، ''ناکارہ'' کہہ دیا، یا ''خطاکار''، ''گناہ گار'' کہہ دیا، اور یہ سمجھتے ہیں کہ ان الفاظ کے استعمال کے ذریعہ تواضع حاصل ہوگئی، حالانکہ اپنے آپ کو کمتر کہنا تواضع نہیں، بلکہ اپنے آپ کو کمتر سمجھنا تواضع ہے، مثلاً یہ سمجھے کہ میری کوئی حیثیت، کوئی حقیقت نہیں، اگر میں کوئی اچھا کام کر رہا ہوں تو یہ محض اللہ تعالیٰ کی توفیق ہے، اس کی عنایت اور مہربانی ہے، اس میں میرا کوئی کمال نہیں، یہ ہے تواضع کی حقیقت، جب یہ حقیقت حاصل ہو جائے تو اس کے بعد زبان سے چاہے اپنے آپ کو ''حقیر'' اور ''ناچیز''، ''ناکارہ'' کہو یا نہ کہو اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا، جو شخص تواضع کی اس حقیقت کو حاصل کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو بلند مقام عطا فرماتے ہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۲۹]

کیا اپنے آپ کو ''حقیر، فقیر، ناکارہ'' کہنا تواضع ہے ؟

بعض لوگ تواضع کرتے ہوئے اپنے آپ کو ''ناکارہ، ناچیز'' کہہ دیا کرتے ہیں کہ ہم تو ناکارہ ہیں، اکثر و بیشتر یہ سب جھوٹ ہوتا ہے، جھوٹ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اگر اس کا ناکارہ کہنے کے جواب میں کہہ دیا جائے کہ بیشک آپ واقعی ناکارہ ہیں تو اس وقت اس کے دل پر کیا گذرے گی؟ دل میں اس کا یہ جواب ناگوار ہوگا، یہ ناگوار ہونا اس بات کی دلیل ہے کہ یہ شخص جو اپنے آپ کو ناکارہ کہہ رہا تھا یہ دل سے نہیں کہہ رہا تھا بلکہ اپنے آپ کو اس لیے ناکارہ کہہ رہا تھا تاکہ لوگ مجھے متواضع سمجھیں اور لوگ جواب میں مجھے یہ کہیں کہ نہیں حضرت! آپ تو بڑے عالم و فاضل ہیں، آپ کے درجات تو بہت بلند ہیں، دیکھیے! اس میں کتنے امراض جمع ہو گئے، لہٰذا یہ الفاظ کہنا کہ میں ناکارہ ہوں، یہ تواضع نہیں ہے بلکہ تواضع کا دکھاوا ہے کہ میں بہت متواضع ہوں، اس لیے اپنے کو ''ناچیز'' اور ''ناکارہ'' کہتا ہوں۔

چنانچہ ہم لوگ اپنے آپ کو ''حقیر، پرتقصیر، ناکارہ، آوارہ'' کے جو الفاظ لکھتے ہیں یہ اکثر و بیشتر ان امراض کا مجموعہ ہوتا ہے، اِلا یہ کہ کوئی شخص صدق دل سے یہ الفاظ استعمال کرے اور صدق دل کی علامت یہ ہے کہ اگر دوسرا شخص ان الفاظ کے جواب میں یہ تصدیق کر دے کہ بیشک آپ ایسے ہی ہیں تو اس وقت دل پر ذرہ برابر بال نہ آئے اور طبیعت پر ناگواری نہ ہو، اگر ایسا ہو تو پھر ان الفاظ کے استعمال میں کوئی حرج نہیں۔

اصل بات یہ ہے کہ ان الفاظ کے استعمال سے کچھ نہیں ہوتا، کیونکہ اپنے آپ کو کمتر کہنا تواضع

نہیں ہے، بلکہ اپنے آپ کو کمتر سمجھنا تواضع ہے، جو شخص حقیقی متواضع ہوگا وہ تکلفاً یہ الفاظ استعمال نہیں کرے گا اور ایسا شخص چاہے زبان سے اپنے آپ کو ناکارہ اور آوارہ کچھ بھی نہ کہے لیکن دل میں ہر وقت اس کو اپنے عیوب پر نظر ہوتی ہے جس کے نتیجے میں وہ اپنے آپ کو ساری مخلوق سے کمتر سمجھتا ہے۔ [اصلاحی مجالس، ج۵، ص۱۴۱]

تواضع اور احساس کمتری میں کیا فرق ہے ؟

آج کل علم نفسیات کا بڑا زور ہے اور علم نفسیات میں سے ایک چیز آج کل لوگوں میں بہت مشہور ہے، وہ ہے احساس کمتری، اس کو بہت برا سمجھا جاتا ہے کہ احساس کمتری بہت بری چیز ہے، اگر کسی میں یہ پیدا ہو جائے تو اس کا علاج کیا جاتا ہے، ایک صاحب نے سوال کیا کہ جب آپ لوگوں سے یہ کہتے ہیں کہ اپنے آپ کو مٹاؤ تو اس کے ذریعے آپ لوگوں کے اندر احساس کمتری پیدا کرنا چاہتے ہیں تو کیا یہ بات درست ہے کہ لوگ اپنے اندر احساس کمتری پیدا کریں؟

بات دراصل یہ ہے کہ تواضع اور احساس کمتری میں فرق ہے، پہلی بات یہ ہے کہ جن لوگوں نے یہ علم نفسیات ایجاد کی انہیں دین کا علم یا اللہ اور اس کے رسول کے بارے میں کوئی علم تھا ہی نہیں، انہوں نے ایک احساس کمتری کا لفظ اختیار کر لیا، حالانکہ اس میں بہت سی اچھی باتیں شامل ہو جاتی ہیں، ان کو احساس کمتری کہہ دیا جاتا ہے، لیکن حقیقت میں تواضع اور احساس کمتری میں فرق ہے، دونوں میں فرق یہ ہے کہ احساس کمتری میں اللہ تعالیٰ کی تخلیق پر شکوہ اور شکایت ہوتی ہے، یعنی احساس کمتری میں انسان کو یہ خیال ہوتا ہے کہ مجھے محروم اور پیچھے رکھا گیا ہے، میں مستحق تو زیادہ کا تھا لیکن مجھے کم ملا، یا مثلاً یہ احساس کہ مجھے بدصورت پیدا کیا گیا، مجھے بیمار پیدا کیا گیا، مجھے دولت کم دی گئی، میرا رتبہ کم رکھا گیا، اس قسم کے شکوے اس کے دل میں پیدا ہوتے ہیں اور پھر اس شکوے کا لازمی نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت میں جھنجھلاہٹ پیدا ہو جاتی ہے اور پھر اس احساس کمتری کے نتیجے میں انسان دوسروں سے حسد کرنے لگتا ہے اور اس کے اندر مایوسی پیدا ہو جاتی ہے کہ اب مجھ سے کچھ نہیں ہو سکتا، بہرحال احساس کمتری کی بنیاد اللہ تعالیٰ کی تقدیر کے شکوے پر ہوتی ہے۔

جہاں تک تواضع کا تعلق ہے یہ اللہ تعالیٰ کی تقدیر پر شکوے سے حاصل نہیں ہوتی، بلکہ اللہ تعالیٰ کے انعامات پر شکر کے نتیجے میں حاصل ہوتی ہے، تواضع کرنے والا یہ سوچتا ہے کہ میں تو اس قابل نہیں تھا کہ مجھے یہ نعمت ملتی مگر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی، یہ ان کا کرم اور ان کی عطا ہے میں تو اس کا مستحق نہیں تھا۔

اس سے اندازہ لگایئے کہ احساس کمتری اور تواضع میں کتنا بڑا فرق ہے، اس لیے تواضع محبوب اور پسندیدہ عمل ہے، حضور اقدس ﷺ کا ارشاد ہے کہ جو شخص تواضع اختیار کرتا ہے اللہ تعالیٰ اس کو رفعت اور بلندی عطا فرماتے ہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج۵، ص۴۹]

تواضع اور عاجزی

کمال کے ہوتے ہوئے اس سے انکار کس طرح کرے؟

یہاں ایک بات سمجھ لینی چاہئے، بعض اوقات دل میں یہ خیال آتا ہے کہ آدمی کسی حقیقت سے تو انکار نہیں کر سکتا، اگر ایک آدمی کے پاس علم ہے اور دوسرے کے پاس وہ علم نہیں ہے، اب جس کے پاس علم ہے وہ یہ کیسے کہہ دے کہ میرے پاس علم نہیں ہے، اور ظاہر ہے کہ علم جہل کے مقابلے میں بہتر ہے، قرآن کریم کی آیت ہے: ﴿قل هل یستوی الذین یعلمون والذین لا یعلمون﴾ [الزمر: ۹]

یعنی علم رکھنے والا بہتر ہے اس کے بنسبت جو علم نہیں رکھتا۔ لہٰذا جس کے پاس علم ہے وہ کیسے جھٹلا دے کہ میرے اندر یہ وصف نہیں ہے۔ یا مثلاً ایک آدمی زیادہ صحت مند ہے، اس کے مقابلے میں دوسرا آدمی کمزور ہے، اب ظاہر ہے کہ صحت مند یہ سوچے گا کہ اس کے مقابلے میں میری صحت اچھی ہے، میں اس کے مقابلے میں زیادہ طاقت ور ہوں، مضبوط ہوں۔

یا مثلاً ایک آدمی کے پاس پیسہ زیادہ ہے اور اس کے مقابلے میں دوسرے آدمی کے پاس پیسہ نہیں ہے، تو وہ یہ خیال کرے گا کہ میں اس کے مقابلے میں مالدار ہوں، اس کے پاس پیسہ نہیں ہے، میرے پاس پیسہ ہے۔ یا ایک آدمی بڑا افسر ہے، کسی بڑے عہدے پر فائز ہے، دوسرا آدمی چپراسی اور مزدور ہے، تو بڑے منصب اور عہدے والا اپنے آپ کو اس چپراسی سے بڑا سمجھے گا یا نہیں؟ اب اگر وہ اپنے کو بڑا سمجھے تو تکبر ہو گیا، اور اگر بڑا نہ سمجھے تو جھوٹ ہو گیا، مثلاً اگر وہ یہ سمجھے کہ میں افسر نہیں ہوں، بلکہ میں تو ایک مزدور ہوں، یہ تو بالکل جھوٹ ہو گیا، یا مثلاً ایک آدمی طاقت ور ہے، صحت مند ہے، وہ یہ کہے کہ میں طاقت ور نہیں ہوں، بلکہ جاہل ہوں، یا مثلاً ایک عالم ہے، وہ یہ کہے کہ میں عالم نہیں ہوں، یہ تو جھوٹ ہو گیا۔ اب سوال یہ ہے کہ دونوں باتوں کے درمیان تطبیق ہوگی کہ تکبر بھی نہ ہو اور جھوٹ بھی نہ ہو؟

ایک اور جگہ پر حضرت والا نے ایک اور جملہ ارشاد فرمایا ہے، اس کو یاد رکھنا چاہئے، اس سے یہ مسئلہ آسان ہو جاتا ہے وہ یہ کہ:

"اپنے آپ کو اکمل سمجھنا تکبر نہیں، افضل سمجھنا تکبر ہے"

اکمل سمجھنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یہ سمجھے کہ دوسرے کے پاس بظاہر علم کم ہے اور میرے پاس علم زیادہ ہے، اس کی صحت اچھی نہیں ہے اور میری صحت اچھی ہے، اس کے پاس اتنے پیسے نہیں ہیں میرے پاس الحمدللہ اتنے پیسے ہیں، اس کے پاس چھوٹا مکان ہے اور میرے پاس بڑا مکان ہے، اس کی اولاد کم ہے اور میری اولاد زیادہ ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں میں مقدار کے اعتبار سے اپنے آپ کو زیادہ سمجھنا تکبر نہیں۔ لیکن افضل سمجھنا کہ میں اس سے افضل ہوں، یہ تکبر ہے۔ اور اس کا علاج حضرت والا نے بتادیا کہ آدمی یہ سوچے کہ کیا معلوم خدا کے یہاں کون اچھا ہے۔

یہ جواد پر بیان کیا کہ اپنے آپ کو دوسرے کے مقابلے میں اکمل سمجھنا اور علم میں زیادہ سمجھنا تکبر نہیں، یا عمر میں زیادہ سمجھنا یا صحت میں زیادہ سمجھنا، یا مال میں زیادہ سمجھنا تکبر نہیں، اس میں بھی ایک شرط ہے، وہ یہ کہ دل میں جس زیادتی کا خیال آ رہا ہے، اس پر اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرے، اور یہ کہے کہ یہ زیادتی میری قوت بازو کا کرشمہ نہیں ہے، بلکہ یہ اللہ جل جلالہ کی عطا ہے۔ اور جب اللہ تعالیٰ کی عطا کا تصور کرے گا تو اس سے تکبر پیدا نہیں ہوگا۔ [اصلاحی مجالس، ج۱،ص۲۵۹]

شکر اور تواضع کیسے جمع ہوسکتے ہیں؟

یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ انسان کے اندر کچھ اچھے اوصاف ہوتے ہی ہیں، کسی کو اللہ تعالیٰ نے علم دیا ہے، کسی کو صحت دی ہے، کسی کو دولت دی ہے، کسی کو کوئی مرتبہ دیا ہے، کسی کو کوئی منصب دیا ہے، یہ ساری چیزیں موجود ہیں تو انسان کیسے انکار کر دے اور کہے کہ یہ چیز ہمیں حاصل نہیں، اگر اس کا انکار کر دے گا تو ناشکری اور کفران نعمت ہوگا۔

اس کے جواب میں بزرگوں نے فرمایا کہ تواضع کو اتنا نہ بڑھاؤ کہ ناشکری کی حد تک پہنچ جائے، تواضع بھی ہو، لیکن ساتھ میں اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناشکری بھی نہ ہو، ایک طرف ناشکری سے بھی بچنا ہے، دوسری طرف تکبر سے بھی بچنا ہے، اور تواضع اختیار کرنی ہے، دونوں کام جمع کرے، مثلاً نماز پڑھی، روزہ رکھا اور اس عمل کو یہ سمجھا کہ میں نے بڑا زبردست عمل کرلیا تو یہ بڑا تکبر ہے اور اگر اپنے عمل کے بارے میں یہ کہا کہ یہ تو بے کار ہے، جیسا کہ آج کل بعض لوگ نماز کے بارے میں یہ کہتے ہیں کہ صاحب! ہم نے ٹکریں مار لیں، تو یہ اس عمل پر اللہ تبارک وتعالیٰ کی ناشکری اور ناقدری ہے۔

سوال یہ ہے کہ دونوں چیزوں کو کیسے جمع کیا جائے کہ ناشکری بھی نہ ہو اور تکبر بھی نہ ہو؟ شکر بھی ادا ہو اور تواضع بھی ہو؟

حقیقت میں یہ کوئی مشکل کام نہیں، دونوں کاموں کو جمع کرنا بالکل آسان ہے، وہ اس طرح کہ انسان یہ خیال کرے کہ اپنی ذات میں تو میرے اندر اس عمل کی ذرہ برابر طاقت اور صلاحیت نہیں تھی، لیکن اللہ تبارک وتعالیٰ نے اپنے فضل وکرم سے یہ عمل کرا دیا اس طرح دونوں چیزیں جمع ہوجاتی ہیں کہ اپنی ذات میں اپنے آپ کو بے حقیقت سمجھا تو تواضع ہوگئی اور اللہ تبارک وتعالیٰ کی عطا کا اقرار کیا تو یہ شکر ہوگیا، اب دونوں باتیں جمع ہوگئیں، اس لیے جو بندہ اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر بجالاتا ہو، اس کے اندر کبھی تکبر نہیں آسکتا، کیونکہ شکر کے معنی یہ ہیں کہ میرے اندر اپنی ذات میں کوئی صلاحیت نہیں تھی، اللہ جل جلالہ نے اپنے فضل وکرم اور اپنی عطا سے مجھے یہ چیز عطا فرمائی ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۵،ص۵۱،۵۲]

حسد کسے کہتے ہیں؟

حسد کی حقیقت یہ ہے کہ ایک شخص نے دوسرے کو دیکھا کہ اس کو کوئی نعمت ملی ہوئی ہے، چاہے وہ نعمت دنیا کی ہو یا دین کی ہو، اس نعمت کو دیکھ کر اس کے دل میں جلن اور کڑھن پیدا ہوئی کہ اس کو یہ نعمت کیوں مل گئی؟ اور دل میں یہ خواہش ہوئی کہ یہ نعمت اس سے چھن جائے تو اچھا ہے، یہ ہے حسد کی حقیقت۔

[اصلاحی خطبات، ج۵، ص۶۵]

حسد اور رشک میں فرق کس طرح کیا جائے؟

یہاں یہ بات سمجھ لیں کہ بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ دوسرے شخص کو ایک نعمت حاصل ہوئی، اب اس کے دل میں یہ خواہش ہو رہی ہے کہ مجھے بھی یہ نعمت حاصل ہو جائے تو اچھا ہے، یہ حسد نہیں ہے بلکہ یہ رشک ہے، عربی میں اس کو غبطہ کہا جاتا ہے، اور بعض مرتبہ عربی زبان میں اس پر بھی حسد کا لفظ بول دیا جاتا ہے لیکن حقیقت میں یہ حسد نہیں، مثلاً کسی شخص کا اچھا مکان دیکھ کر دل میں یہ خواہش پیدا ہوئی کہ جس طرح اس شخص کا مکان آرام دہ اور اچھا بنا ہوا ہے میرا بھی ایسا مکان ہو جائے، یا مثلاً جیسی ملازمت اس کو ملی ہوئی ہے مجھے بھی ایسی ملازمت مل جائے، یا جیسا علم اللہ تعالیٰ نے اس کو دیا ہے ایسا علم اللہ تعالیٰ مجھے بھی عطا فرما دے یہ حسد نہیں بلکہ رشک ہے، اس پر کوئی گناہ نہیں، لیکن جب اس کی نعمت کے زائل ہونے کی خواہش دل میں پیدا ہو کہ اس کی یہ نعمت اس سے چھن جائے تو اچھا ہے یہ حسد ہے۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ اگر دوسرے کی نعمت کے چھن جانے کی خواہش دل میں نہ ہو بلکہ صرف یہ خیال ہو کہ یہ نعمت مجھے بھی مل جائے اگرچہ یہ حسد تو نہیں ہے بلکہ یہ رشک ہے، لیکن اس کا بہت زیادہ استحضار کرنا اور سوچنا بالآخر حسد تک پہنچا دیتا ہے، لہٰذا اگر دنیا کے مال و دولت کی وجہ سے کسی پر رشک آ گیا تو یہ بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے اس لیے کہ یہی رشک بعض اوقات دل میں مال و دولت کی حرص پیدا کر دیتا ہے اور بعض اوقات یہ رشک آگے چل کر حسد بن جاتا ہے، لیکن اگر دین داری کی وجہ سے رشک پیدا ہو رہا ہے یہ تو اچھی بات ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج۵، ص۶۶]

تکبر اور عزت نفس میں کیا اور کس طرح فرق کیا جائے؟

دل میں عزت نفس کا داعیہ پیدا ہونا کہ میں لوگوں کے سامنے ذلیل نہ ہوں اور بحیثیت انسان اور بحیثیت مسلمان کے میری عزت ہونی چاہیے، اس حد تک یہ جذبہ قابل تعریف ہے، یہ جذبہ برا نہیں ہے، کیونکہ شریعت نے ہمیں اپنے آپ کو ذلیل کرنے سے منع فرمایا ہے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اگر انسان کے دل میں عزت نفس کا جذبہ بالکل نہ ہو تو وہ انسان دوسروں کے ہاتھ میں کھلونا بن کر رہ جائے، جو چاہے وہ اس کو ذلیل کر جائے، لیکن اگر عزت نفس کا جذبہ حد سے بڑھ جائے اور دل میں یہ خیال آئے کہ میں سب سے بڑا

ہوں، میں عزت والا ہوں اور باقی سب لوگ ذلیل ہیں اور حقیر ہیں تو اب یہ دل میں تکبر آ گیا، اس لیے کہ تکبر کے معنی ہیں اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا سمجھنا۔

آپ کو بے شک یہ حق حاصل ہے کہ آپ یہ چاہیں کہ میں دوسروں کی نظر میں بے عزت نہ ہوں، لیکن کسی بھی دوسرے شخص سے اپنے آپ کو افضل سمجھنا کہ میں اس سے اعلیٰ ہوں اور یہ مجھ سے کمتر ہے، یہ خیال لانا جائز نہیں، مثلاً آپ امیر ہیں، آپ کے پاس کوٹھی بنگلے ہیں، آپ کے پاس بینک بیلنس ہے، آپ کے پاس دولت ہے اور دوسرا شخص غریب ہے، ٹھیلے پر سامان بیچ کر اپنا پیٹ پالتا ہے، اپنے گھر والوں کے لیے روزی کماتا ہے، اگر آپ کے دل میں یہ خیال آ گیا کہ میں بڑا ہوں اور یہ چھوٹا ہے، میری عزت اس کی عزت سے زیادہ ہے، میں اس سے افضل ہوں اور یہ مجھ سے کمتر ہے، اس کا نام تکبر ہے، یہ عزت نفس کا جذبہ اپنی حد سے آگے بڑھ گیا، اب یہ جذبہ اتنا خبیث بن گیا کہ اللہ تعالیٰ کو تکبر سے زیادہ کسی جذبے سے نفرت نہیں، اللہ تعالیٰ کے نزدیک مبغوض ترین جذبہ انسان کے اندر تکبر ہے، حالانکہ عزت نفس قابل تعریف چیز تھی لیکن جب وہ حد سے بڑھ گئی تو اس کے نتیجے میں وہ تکبر بن گئی اور تکبر بننے کے نتیجے میں وہ مبغوض بن گئی۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۵، ص ۹۰]

فخر، کبر اور شکر میں فرق کس طرح کیا جائے؟

فرمایا کہ: ''نعمت پر فخر کرنا ''کبر'' ہے اور اس کو عطاءِ حق سمجھنا اور اپنی نااہلی کو مستحضر رکھنا ''شکر'' ہے''، جیسا کہ پہلے بھی عرض کیا تھا کہ ''تکبر'' کی بیماری کا بہترین علاج کثرتِ شکر ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں پر شکر ادا کرنے کی عادت ڈالنا، وہی بات حضرت نے اس ملفوظ میں ارشاد فرمائی کہ کسی نعمت کے حصول پر فخر کرنا کہ اس کی وجہ سے اپنے آپ کو بڑا سمجھنا اور دوسروں کو کمتر سمجھنا، تکبر ہے، لیکن یہ سمجھنا کہ میں تو اس نعمت کا مستحق نہیں تھا، اللہ جل شانہ نے محض اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرمادی ہے۔ یہ استحضار ''شکر'' ہے اور یہی شکر کبر کا علاج ہے۔ [اصلاحی مجالس، ج ۱، ص ۳۰۴]

عجب کی تعریف اور
عجب، کبر اور تکبر میں فرق

سب سے پہلے انسان کے اندر عجب پیدا ہوتا ہے، اور اس عجب کی انتہاء تکبر پر ہوتی ہے۔ ''عجب'' کے معنی یہ ہیں کہ انسان اپنے کسی وصف کی طرف نگاہ کر کے اس کے نتیجے میں اپنے آپ کو دوسرے سے اچھا سمجھے اور اس وصف کے سلسلے میں عطاءِ حق تعالیٰ کی طرف نگاہ نہ ہو۔ مثلاً ایک شخص عالم ہے اب اس کے دل میں اپنے عالم ہونے کا احساس پیدا ہوا کہ میں عالم ہوں، اور عالم ہونے کی بنیاد پر اپنے آپ کو دوسروں سے اچھا سمجھا اور اس علم کے اللہ تعالیٰ کی عطاء اور نعمت ہونے کی طرف نگاہ نہیں کی، چاہے اسکے ساتھ دوسروں کی

تحقیر ہو یا نہ ہو، دونوں صورتیں عُجب میں داخل ہیں۔ لہٰذا محض اپنے کسی اچھے وصف کا استحضار اللہ تعالیٰ کی عطاء اور نعمت ہونے کے استحضار کے بغیر کرنا یہ ''عجب'' ہے۔ اس سے معلوم ہوا کہ 'عجب' کے اندر دوسرے سے کوئی تعلق نہیں ہوتا صرف اپنی ذات سے تعلق ہوتا ہے۔

اسی عجب کے نتیجہ میں انسان کے اندر کبر پیدا ہو جاتا ہے، کبر کا مطلب یہ ہے کہ دل میں یہ خیال آنا کہ چونکہ میرے اندر یہ وصف موجود ہے لہٰذا میں بڑا ہوں۔ عجب کے اندر اپنی اچھائی کی طرف نگاہ ہوتی ہے اور کبر کے اندر اپنی بڑائی کی طرف نگاہ ہوتی ہے، لہٰذا دوسروں سے اپنے کو بڑا سمجھ لینا کبر ہے۔ پھر اس بڑا سمجھنے کے نتیجے میں دوسروں پر اپنی بڑائی کا اظہار کرنا ''تکبر'' ہے، مثلاً اپنی اکڑ دکھا رہا ہے، اور دوسروں کو حقیر سمجھ رہا ہے، اور دوسروں کے ساتھ حقارت کا برتاؤ کر رہا ہے، یہ سب ''تکبر'' کے اندر داخل ہے۔

[اصلاحی مجالس، ج ۴، ص ۴۷]

تکبر کی علامت کیا ہے ؟

اور تعلّی اور تکبر کی علامت یہ ہے کہ اس سے گردن اکڑتی ہے، سینہ تنتا ہے، اور انسان اپنے آپ کو دوسروں سے بالاتر سمجھتا ہے، اور دوسروں کو حقیر سمجھتا ہے، اور ان کے ساتھ حقارت کا معاملہ کرتا ہے۔ ورنہ کم از کم یہ تو ہوتا ہی ہے کہ وہ اپنے آپ کو دوسروں سے بڑا اور افضل سمجھتا ہے۔ اب دونوں کے درمیان حد فاصل قائم کرنا کہ کہاں ''تحدیث نعمت'' ہے اور کہاں ''تکبر'' شروع ہو گیا، یہ حد قائم کرنا آسان کام نہیں۔ یہی وہ مقام ہے جہاں شیخ کی ضرورت ہوتی ہے، وہ شیخ یہ بتاتا ہے کہ تم جو نعمت کا اظہار کر رہے ہو، یہ ''تحدیث نعمت'' نہیں ہے بلکہ یہ تکبر ہے، لیکن اس کا نام تم نے تحدیث نعمت رکھ دیا، حالانکہ حقیقت میں وہ تکبر اور شیطانی عمل تھا۔ [اصلاحی مجالس، ج ۱، ص ۳۰۸]

تحدیث نعمت کسے کہتے ہیں؟

اسی کو ''تحدیث نعمت'' کہا جاتا ہے، یعنی اللہ تعالیٰ کی نعمت کا ذکر کرنا کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ نعمت عطا فرمائی ہے، نہ صرف یہ کہ یہ چیز تکبر نہیں بلکہ عبادت ہے، اور اپنی بڑائی کا ذکر کر کے اپنا کوئی وصف بیان کرنا تکبر ہے اور زبردست گناہ ہے۔

باطن کے یہ گناہ بہت باریک ہیں، اور ان کی سرحدیں آپس میں ایک دوسرے سے ملتی ہیں۔ ایک طرف ''تحدیث نعمت'' ہے، اگر تحدیث نعمت کی غرض سے انسان اپنا کوئی وصف بیان کر رہا ہے، یا اللہ تعالیٰ کی کسی نعمت کا اور اس کی عطاء کا اظہار کر رہا ہے تو یہ 'عبادت'' ہے، اور اگر اپنی بڑائی کے خیال سے اس کا اظہار کر رہا ہے تو یہ گناہ کبیرہ ہے، لیکن دونوں کے درمیان خط امتیاز کھینچنا کہ کیا بات ''تکبر'' ہے اور کیا بات ''تحدیث نعمت'' ہے، یہ ہر ایک کے بس کا کام نہیں۔

''تحدیث نعمت'' تو وہ چیز ہے اللہ تعالیٰ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دے رہے ہیں:

﴿وأما بنعمة ربك فحدث﴾ [سورۃالضحیٰ]

یعنی آپ پر آپ کے رب کی جو نعمتیں ہوئی ہیں، ان کو لوگوں کے سامنے بیان کیا کریں کہ مجھے اللہ تعالیٰ نے یہ نعمت عطا فرمائی ہے۔ اسی ''تحدیث نعمت'' کے طور پر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی باتیں ارشاد فرمائیں، ایک موقع پر آپ نے ارشاد فرمایا: ''أنا سيد ولد آدم و لا فخر''

میں آدم کے بیٹوں کا سردار ہوں، یہ ''تحدیث نعمت'' ہے، کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے یہ مقام عطا فرمایا کہ مجھے تمام آدم کے بیٹوں کا سردار بنایا۔ لیکن کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ ''تحدیث نعمت'' کبر کی حد میں داخل ہو جائے۔ اس لئے فوراً اگلا جملہ ارشاد فرمادیا ''ولافخر'' یعنی میں اس پر کسی فخر کا اظہار نہیں کرتا، جس سے دوسروں کی تحقیر ہو۔ اب دیکھئے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل میں اپنے اوپر ہونے والی نعمتوں کا ذکر فرما رہے ہیں، لیکن دھڑکا یہ لگا ہوا ہے کہ کہیں حدود سے متجاوز نہ ہو جاؤں، اس لئے فوراً فرمایا ''و لافخر'' میں فخر نہیں کرتا۔ [اصلاحی مجالس، ج ۱، ص ۳۰۴]

تحدیث نعمت کی علامت کیا ہے؟

پھر ''تحدیث نعمت'' کی ایک علامت ہے، وہ یہ کہ تحدیث نعمت کے نتیجے میں سر اور زیادہ جھکتا ہے، اور تواضع پیدا ہوتی ہے، اللہ تعالیٰ کے حضور مزید عاجزی اور انکساری پیدا ہوتی ہے۔ اس لئے کہ انسان یہ اللہ تعالیٰ کے سامنے اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ یا اللہ تعالیٰ میں اس نعمت کا مستحق نہیں تھا، اور میں اس نعمت کو حاصل کرنے سے عاجز تھا، لیکن آپ نے محض اپنے فضل سے یہ نعمت عطا فرمادی۔ اس استحضار اور اقرار کے نتیجے میں زیادہ عاجزی پیدا ہوگی۔

فتح مکہ کے موقع پر جناب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم فاتح بن کر مکہ مکرمہ میں داخل ہو رہے ہیں، اور اس شہر میں فاتح بن کر داخل ہو رہے ہیں جس شہر کے لوگوں نے آپ کو ہجرت کرنے پر مجبور کیا، جس شہر کے لوگوں نے آپ کو قتل کے منصوبے بنائے، جس شہر کے لوگوں کے آپ کے راستے میں کانٹے بچھائے، جس شہر کے لوگوں نے آپ کے اوپر غلاظتیں ڈالنے کی کوشش کی، جہاں کے لوگوں نے آپ پر پتھر برسانے کی کوشش کی۔ اس شہر کے لوگوں پر فاتح بن کر تشریف لا رہے ہیں، صرف ۸ آٹھ سال کی مدت کے بعد تشریف لا رہے ہیں۔ آپ کے علاوہ کوئی اور اس شہر میں فاتح بن کر داخل ہوتا تو اس کا سینہ تنا ہوا ہوتا، گردن اکڑی ہوئی ہوتی، ''أنا و لا غيري'' کے نعرے لگا رہا ہوتا۔ لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم مکہ مکرمہ میں اس شان سے داخل ہوئے کہ آپ کی گردن مبارک جھکی ہوئی ہے، یہاں تک کہ سینہ مبارک سے آپ کی ٹھوڑی لگ رہی ہے، آنکھوں سے آنسو جاری ہیں، اور زبان مبارک پر قرآن کریم کی یہ آیات ہیں:

﴿انّا فتحنا لك فتحاً مّبيناً ليغفرلك الله ماتقدم من ذنبك وما تأخّر و يتم نعمته عليك و يهديك صراطاً مستقيماً﴾ [الفتح:۱،۲]

یہ ہے "تحدیث نعمت" کیونکہ "انّا فتحنا لك فتحاً مّبيناً" کی آیات تلاوت کر کے اللہ تعالیٰ کی اس نعمت کا ذکر فرما رہے ہیں کہ یا اللہ! آپ نے یہ فتح مجھے عطا فرمائی۔ اور اس نعمت کے استحضار کے نتیجے میں عاجزی اور انکساری پیدا ہو رہی ہے، اور شکستگی پیدا ہو رہی ہے، اور رجوع الی اللہ زیادہ ہو رہا ہے۔ یہ "تحدیث نعمت" کی علامت ہے۔ [اصلاحی مجالس، ج۱، ص۳۰۶]

تجسّس کیا ہے اور کیوں حرام ہے؟

حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے لئے دو لفظ استعمال فرمائے، فرمایا:

ولا تجسّسوا ولا تحسّسوا

نہ تجسّس کرو اور نہ ہی تحسس کرو۔

"تجسس" کے معنی وہ ہیں جو اوپر بیان کئے یعنی انسان اس فکر میں پڑے کہ دوسرے کا عیب مجھے معلوم ہو جائے، چاہے اس کے لئے کوئی بھی طریقہ اختیار کرے۔ اور "تحسس" کے معنی وہ ہیں جس کو اردو میں "کنسوئے لینا" کہتے ہیں۔ یعنی کسی کی راز کی بات چپکے سے سننے کی کوشش کرنا، وہ چھپانا چاہتا ہے اور یہ سننے کی کوشش کر رہا ہے۔ اس حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے "تجسس" اور "تحسس" دونوں کو حرام قرار دیا ہے۔

کیوں حرام قرار دیا؟ اس لئے کہ تجسس کرنا یا تحسس کرنا اس بات کی علامت ہے کہ انسان اپنے عیب سے بے خبر اور بے فکر ہے، اگر اسے اپنے عیب کی فکر ہوتی تو کبھی دوسرے کے عیوب کی تجسس میں نہ پڑتا۔ جس آدمی کے خود پیٹ میں درد ہو رہا ہو اور وہ اس درد سے بے تاب اور بے چین ہو، کیا اس کو یہ فکر ہوگی کہ فلاں کو نزلہ ہے یا نہیں؟ فلاں کو کھانسی ہے یا نہیں؟ اس لئے کہ اس کو اپنی فکر پڑی ہوئی ہے، وہ اپنے درد سے بے چین ہے، جب تک اس درد سے اس کو سکون نہ مل جائے، وہ اس وقت تک دوسرے کی طرف کیسے دیکھے!

اگر ہم لوگوں کو اپنے عیب کی فکر ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں جا کر میرا کیا انجام ہونا ہے؟ آخرت میں میرا کیا حال ہوگا؟ جب یہ فکر پیدا ہو جائے تو پھر دوسرے کی طرف نگاہ پڑ ہی نہیں سکتی۔ بہادر شاہ ظفر مرحوم فرماتے ہیں:

تھے جب اپنے عیوب سے بے خبر
رہے دیکھتے اوروں کے عیب و ہنر
پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر

تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

جب تک اپنی برائیوں سے بے خبر تھے، اس وقت تک یہ حال تھا کہ کبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہیں، کبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہیں۔ اورانہی کو برا سمجھ رہے ہیں، لیکن جب اپنے عیوب پر نگاہ پڑی تو کوئی برا نہ رہا۔ [اصلاحی مجالس، ج ۱، ص ۲۱۸]

بد گمانی کیا ہے اور کیوں حرام ہے ؟

ایک شخص کے طرز عمل سے اس کے بارے میں آپ کو کچھ شبہ ہوا، اور دل میں وسوسہ آیا کہ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے فلاں کام کیا ہوگا، اگر دل میں یہ بات وسوسہ خود بخود آیا اور خود بخود دل میں شبہ پیدا ہوا تو اس پر کوئی گناہ نہیں، کیونکہ اس میں آپ کے اختیار کو کوئی دخل نہیں۔

مثلاً رمضان کے دن میں آپ نے ایک شخص کو ہوٹل سے نکلتے دیکھا، آپ کے دل میں خیال آئے گا کہ ایسے معلوم ہوتا ہے کہ اس نے روزہ توڑا ہے، اب یہ جو خیال دل میں خود بخود پیدا ہوا، یہ کوئی گناہ نہیں۔ البتہ آدمی کو چاہئے کہ حتی الامکان اس کے عمل کو صحیح محمل پر محمول کرے۔ مثلاً یہ کہ یہ جو شخص ہوٹل سے نکل رہا ہے، شاید یہ اپنے بیمار کے لئے کھانا خریدنے گیا ہوگا یا کسی آدمی سے بات کرنے کے لئے ہوٹل کے اندر گیا ہوگا۔ یہ احتمالات بھی موجود ہیں، لہٰذا دل میں یہ احتمالات پیدا کرے کہ شاید ایسا ہوا ہو، زیادہ تحقیق میں پڑنے کے ہم مکلف نہیں۔

لہٰذا خود بخود دل میں جو خیال آیا تھا، وہ گناہ نہیں، اس پر مؤاخذہ بھی نہیں، لیکن دل میں جو خیال پیدا ہوا تھا، اس پر آپ نے پہلے اعتقاد اور یقین کر لیا کہ یہ صاحب ہوٹل میں روزہ توڑنے کے لئے داخل ہوئے تھے اور کھانا کھا کر باہر آئے ہیں، اس کا یقین کر لیا اور دوسرے احتمالات کی طرف دھیان نہیں کیا، اور پھر اس سے آگے بڑھ کر یہ کیا کہ دوسروں کے سامنے بیان کرنا شروع کر دیا کہ میں نے خود اس کو روزہ میں کھاتے ہوئے دیکھا ہے، حالانکہ اس نے صرف یہ دیکھا تھا کہ وہ شخص ہوٹل سے نکل رہا تھا، کھاتے ہوئے نہیں دیکھا تھا، دوسروں کے سامنے اس طرح بیان کر رہا ہے جیسے خود اس نے کھاتے ہوئے دیکھا تھا اور سو فیصد یقین کے ساتھ دوسروں سے کہہ رہا ہے کہ یہ شخص روزہ خور ہے، یہ بدگمانی حرام اور ناجائز ہے۔

حضرت والا رحمۃ اللہ علیہ فرمارہے ہیں کہ دل میں خود بخود کسی کے بارے میں کوئی گمان پیدا ہو جانا، یہ کچھ گناہ نہیں، لیکن اس گمان پر سو فیصد یقین کر بیٹھنا اور پھر اس یقینی انداز میں اس کا تذکرہ کرنا گناہ ہے۔ اس لئے حضرت فرماتے ہیں کہ:

''مذموم بدگمانی وہ ہے جو خود لائی جائے، باقی جو وسوسہ خود آئے وہ مذموم بدگمانی نہیں جب تک اس پر عمل نہ ہو، اور عمل کی صورت یہ ہے کہ یا دل سے اس پر اعتقاد جازم کرلے (یعنی یقین کرلے، پہلے صرف

گمان تھا پھر اس گمان کو یقین سے تبدیل کر دیا) یا زبان سے کسی کے سامنے اس کا تذکرہ کر دے"۔

گویا بدگمانی کے دو درجے ہوئے، ایک درجہ غیر اختیاری ہے، وہ یہ کہ اپنے کسی عمل کے بغیر دل میں کسی کی طرف سے کوئی گمان پیدا ہوا۔ اللہ تعالیٰ کے یہاں اس پر کوئی مؤاخذہ نہیں، دوسرا درجہ اختیاری ہے، وہ یہ کہ جو گمان دل میں پیدا ہوا، اس گمان کو لے کر بیٹھ گیا، اور اس سے مختلف باتیں نکال رہا ہے، اور اس پر یقین کر رہا ہے، یا اس کا تذکرہ دوسروں کے سامنے کر رہا ہے، یہ دوسرا درجہ حرام ہے اس سے بچنا ضروری ہے۔

[اصلاحی مجالس، ج۱ص۲۲۱، ۲۲۴]

تزکیہ و تصوف

کیا تصوف بدعت ہے ؟

آج علم تصوف کے بارے میں لوگ افراط وتفریط میں مبتلا ہو گئے ہیں، بعض لوگ تو سمجھتے ہیں کہ تصوف کا شریعت سے کوئی واسطہ نہیں اور قرآن کریم اور حدیث مبارکہ میں اس کا کہیں ذکر نہیں، بلکہ تصوف کو اختیار کرنا بدعت ہے، خوب سمجھ لیں کہ قرآن کریم اور حدیث مبارکہ نے اخلاق کو درست کرنے کا جو حکم دیا ہے ، وہی تصوف کا موضوع ہے، اس لیے یہ تصوف قرآن کریم اور حدیث مبارکہ کے خلاف نہیں، جبکہ دوسرے بعض لوگوں نے تصوف کو غلط معنی پہنا دیے ہیں، ان کے نزدیک تصوف کے معنی ہیں مراقبے کرنا، کشف حاصل ہونا، الہام ہونا، خواب اور اس کی تعبیر اور کرامات کا حاصل ہونا وغیرہ، ان کے نزدیک اسی کا نام تصوف ہے، اس کے نتیجے میں ان لوگوں نے بعض اوقات تصوف کے نام پر ایسے کام شروع کر دیے جو شریعت کے خلاف ہیں اور اس سلسلے میں دو تصرف کر لیے۔

۱: ”بھنگ پی کر اللہ کا تقرب حاصل کر رہے ہیں“

ایک تصرف تو یہ کیا کہ بہت سے لوگ جو اپنے آپ کو ”صوفی“ کہلاتے ہیں مگر ساتھ میں بھنگ بھی پی رہے ہیں اور کہتے یہ ہیں کہ یہ بھنگ مولویوں کے لیے حرام ہے لیکن صوفیوں کے لیے حلال ہے، اس لیے کہ ہم تو بھنگ پی کر اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کر رہے ہیں، ۔العیاذ باللہ العظیم۔خدا جانے کہاں کہاں کے خرافات، غلط عقیدے، مشرکانہ خیالات داخل کر دیے اور اس کا نام تصوف رکھ دیا۔

۲: پیر کیسا ہی خلاف شریعت عمل کرے مرید اس کا غلام ہے

دوسرا تصرف یہ کیا کہ مرید پیر کا غلام ہے، جب ایک مرتبہ کسی کو پیر بنا لیا تو اب وہ پیر چاہے شراب پیے، چاہے جوا کھیلے، چاہے حرام کاموں کا ارتکاب کرے، سنتوں کو پامال کرے، لیکن پیر صاحب اپنی جگہ برقرار ہیں، مرید کے ذمے ان کے قدم چومنا لازم ہے اور ہر چند روز کے بعد اس پیر کو نذرانہ پیش کرنا لازم ہے

، کیونکہ جب تک وہ پیر صاحب کو اس طرح خوش نہیں کرے گا، جنت کے دروازے اس کے لیے نہیں کھل سکتے ۔العیاذ باللہ العظیم ۔تصوف کا یہ تصور نہ قرآن کریم میں ہے اور نہ حدیث میں ہے، اس تصور کا کوئی تعلق شریعت اور سنت سے نہیں ہے۔

جبکہ تصوف کا اصل تصور اخلاق کی اصلاح اور باطنی اعمال کی اصلاح تھا، اس کے لیے ضروری تھا کہ کوئی شخص کسی متبع سنت، صحیح علم رکھنے والے، صحیح عقیدہ رکھنے والے شخص کو اپنا مقتدا بنائے، جس نے خود اپنی تربیت کسی بڑے سے کرائی ہو اور اس سے جا کر کہے کہ میں آپ کی رہنمائی چاہتا ہوں اور وہ پھر اس کی رہنمائی کرے، جس طرح صحابہ کرام نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنا مقتدا بنایا کہ آپ ہمارے مربی ہیں، ہماری تربیت کرنے والے ہیں، ہمارے اعمال واخلاق کو درست کرنے والے ہیں، اس لیے آپ کی اطاعت ہمیں کرنی ہے، یہ تصور بالکل درست تھا اور یہ پیری مریدی صحیح تھی اور قرآن وحدیث کے مطابق تھی، قرآن وحدیث میں جگہ جگہ اچھے اخلاق اختیار کرنے کی تلقین فرمائی گئی ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۵، ص۱۲۲]

تصوف کیا ھے ؟

کیا تصوف صرف پیری مریدی اور وظائف و اذکار کا نام ھے؟

آپ حضرات نے ''تصوف'' کا لفظ بار بار سنا ہوگا، آج لوگوں نے تصوف کے بارے میں غلط فہمیاں پیدا کر کے اس کو ایک ملغوبہ بنا دیا ہے، آج تصوف نام ہو گیا اس بات کا کہ کسی پیر صاحب کے پاس چلے گئے، ان کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ دیا، بیعت کر لی اور بیعت کرنے کے بعد انہوں نے کچھ وظیفے بتا دیے، کچھ اوراد سکھا دیے کہ صبح کو یہ پڑھا کرو، شام کو یہ پڑھا کرو، اور بس اللہ خیر سلا، اب نہ باطن کی فکر، نہ اخلاق کے درست کرنے کا اہتمام، نہ اخلاق فاضلہ کو حاصل کرنے کا شوق، نہ اخلاق رذیلہ کو ختم کرنے کی فکر، یہ سب کچھ نہیں، بس بیٹھے ہوئے وظیفے پڑھ رہے ہیں، اور بعض اوقات یہ وظیفے پڑھنا ان بیماریوں کے اندر اور زیادہ شدت پیدا کرتا ہے۔

آج کل تصوف کا اور پیری مریدی کا سارا زور اس پر ہے کہ معمولات بتا دیے گئے کہ فلاں وقت یہ ذکر کرنا ہے، فلاں وقت یہ ذکر کرنا ہے، بس! وہ محض ذکر کے پیچھے لگے ہوئے ہیں، چاہے باطن کے اندر کتنی ہی بیماریاں جوش مار رہی ہوں، پہلے زمانے میں صوفیاء کرام کے ہاں معمول تھا کہ کسی شخص کی اصلاح کا پہلا قدم یہ ہوتا تھا کہ اس کے اخلاق کی اصلاح کرنے کی فکر کرتے، اس کے لیے مجاہدات کروائے جاتے تھے، ریاضتیں ہوتی تھیں، رگڑا جاتا تھا، تب جا کر اندر کی اصلاح ہوتی تھی اور اس کے بعد انسان کسی قابل ہوتا تھا۔

حالانکہ تصوف کا اصل مقصد یہ ہے کہ تمہارے جذبات صحیح ہونے چاہئیں، تمہارے اخلاق صحیح ہونے چاہئیں، تمہاری خواہشات صحیح ہونی چاہئیں اور ان کو کس طرح صحیح کیا جائے، یہ اعمال تصوف کے اندر

بتائے جاتے ہیں، تصوف کی حقیقت بس اتنی ہے، اس سے آگے لوگوں نے جو باتیں تصوف کے اندر داخل کردی ہیں، اس کا تصوف سے کوئی تعلق نہیں، جس طرح فقہا ظاہری اعمال مثلاً نماز، روزہ، زکوۃ، حج، بیع وشراء، نکاح وطلاق کے احکام بیان کرتے ہیں، اسی طرح صوفیاء کرام دل میں پیدا ہونے والے جذبات کے احکام بیان کرتے ہیں۔

تصوف، طریقت، سلوک، احسان اور اخلاق کا حاصل اور مقصود اصلی کیا ہے؟

تصوف، طریقت، سلوک، احسان ایک ہی مفہوم کے مختلف عنوانات ہیں، اس تصوف کا اصل مقصود نہ تو محض ذکر ہے، چنانچہ بعض لوگ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصود ذکر ہی ہے، جب ہم کسی شیخ سے بیعت ہوجائیں گے تو وہ ہمیں وظائف بتادے گا، اور بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصد عملیات اور روحانی علاج ہے کہ شیخ ہمیں کچھ عملیات اور تعویذ گنڈے اور روحانی علاج کا طریقہ بتائے گا، خوب سمجھ لیں کہ تصوف کا ان باتوں سے کوئی تعلق نہیں، حتی کہ ذکر بھی تصوف کا مقصود اصلی نہیں، بلکہ مقصود اصلی کے حصول کا ایک ذریعہ ہے، اسی طرح بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تصوف کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کہیں تنہائی میں بیٹھ کر مراقبہ کرے اور چلہ کاٹے، مجاہدہ کرے، حالانکہ یہ سب چیزیں بھی تصوف کا مقصود اصلی نہیں ہیں بلکہ مقصود اصلی کو حاصل کرنے کے مختلف طریقے اور راستے ہیں۔

پھر تصوف کا مقصود اصلی کیا ہے؟ تصوف کا مقصود اصلی وہ ہے جس کی طرف قرآن کریم نے اس آیت میں ارشاد فرمایا:﴿ قد افلح من زکٰھا ﴾

یعنی تزکیہ نفس، جس کو اللہ تعالی نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کے مقاصد میں سے بیان کرتے ہوئے فرمایا:﴿ و یعلمهم الكتاب والحكمة و یزکیهم ﴾

اس آیت میں تعلیم کتاب اور تعلیم حکمت کو مقاصد بعثت میں سے بیان فرمایا، پھر تزکیہ کو علیحدہ کرکے بیان فرمایا، تزکیہ کے لفظی معنی ہیں، پاک صاف کرنا، شریعت کی اصطلاح میں تزکیہ سے مراد یہ ہے کہ جس طرح انسان کے ظاہری اعمال وافعال ہوتے ہیں اور ان کے بارے میں اللہ تعالی کے نواہی ہیں، مثلاً یہ کہ نماز پڑھو، روزہ رکھو، زکوۃ دو، حج کرو وغیرہ، یہ اوامر ہیں اور جھوٹ نہ بولو، غیبت نہ کرو، شراب نہ پیو، چوری نہ کرو، ڈاکہ نہ ڈالو وغیرہ یہ نواہی اور گناہ ہیں ان سے بچنے کا شریعت نے حکم دیا ہے۔

اسی طرح انسان کے باطن یعنی قلب میں بعض صفتیں مطلوب ہیں، وہ اوامر میں داخل ہیں، ان کو حاصل کرنا واجب ہے اور ان کو حاصل کیے بغیر فریضہ ادا نہیں ہوتا، اور بعض صفات ایسی ہیں جن کو چھوڑنا واجب ہے وہ نواہی میں داخل ہیں، مثلاً اللہ تعالی کی نعمت پر شکر کرنا واجب ہے، اگر کوئی ناگوار واقعہ پیش آئے

تو اس پر صبر کرنا واجب ہے، اللہ تعالی پر توکل اور بھروسہ رکھنا واجب ہے، تواضع اختیار کرنا یعنی اپنے آپ کو کمتر سمجھنا واجب ہے، اخلاص حاصل کرنا، یعنی جو کام بھی آدمی کرے وہ صرف اللہ تعالی کی رضا کے لیے کرے ،اس اخلاص کی تحصیل واجب ہے، اخلاص کے بغیر کوئی عمل مقبول نہیں، لہذا یہ صفات شکر، صبر، توکل، تواضع، اخلاص وغیرہ یہ سب صفات فضائل اور اخلاق فاضلہ کہلاتی ہیں ان کی تحصیل واجب ہے۔

اسی طرح باطن کے اندر بعض بری صفات ہیں جو حرام اور نا جائز ہیں جن سے بچنا ضروری ہے، وہ رذائل اور اخلاق رذیلہ کہلاتی ہیں، یعنی یہ صفات کمینی اور گھٹیا صفات ہیں، اگر یہ صفات باطن کے اندر موجود ہوں تو ان کو کچلا اور مٹایا جاتا ہے، تاکہ یہ صفات انسان کو گناہ پر آمادہ نہ کریں، مثلاً تکبر کرنا یعنی اپنے آپ کو بڑا سمجھنا، حسد کرنا، ریا کاری اور دکھاوا یعنی انسان اللہ کو راضی کرنے کے بجائے مخلوق کو راضی کرنے کے لیے اور ان کو دکھانے کے لیے کوئی دینی کام کرے یہ ریا ہے لہذا تکبر حرام، حسد حرام، بغض حرام، ریا کاری حرام اور بے صبری یعنی اللہ تعالی کی قضا پر راضی نہ ہونا بلکہ اللہ تعالی کی تقدیر کا شکوہ کرنا یہ حرام ہے یہ سب رذائل ہیں جو انسان کے باطن میں موجود ہوتے ہیں، اسی طرح غصہ کو اگر انسان بے محل استعمال کرے تو یہ بھی رذائل میں داخل ہے۔

خلاصہ یہ کہ باطن میں بہت سے فضائل ہیں جن کو حاصل کرنا ضروری ہے اور بہت سے رذائل ہیں، جن سے اجتناب ضروری ہے اور حضرات صوفیا اور مشائخ یہ کام کرتے ہیں کہ اپنے مریدین اور شاگردوں کے دلوں میں اخلاق فاضلہ کی آبیاری کرتے ہیں اور اخلاق رذیلہ کو کچلتے ہیں تاکہ یہ اخلاق رذیلہ کچلتے کچلتے نہ ہونے کے حکم میں ہو جائیں، جس کے لیے حضرت تھانوی رحمہ اللہ نے یہ اصطلاح بیان فرمائی کہ ''امالہ بدرجہ ازالہ'' یعنی باطن کے اندر جو رذیلہ ہے اس کو اتنا کچلو اور اس کو اتنا پیٹو کہ اس کے بعد وہ رذیلہ باقی تو رہے گا ختم تو نہیں ہوگا لیکن نہ ہونے کے حکم میں ہو جائے گا، بہر حال! تصوف میں رذائل کو کچلنا ہوتا ہے اور فضائل کو حاصل کرنا ہوتا ہے، اسی کا نام تزکیہ ہے اور بس یہی تصوف کا مقصود اصلی ہے۔

[اصلاحی مجالس، ج ا، ص ۳۰]

نفس اور باطن کی اصلاح کے لیے شیخ کی ضرورت کیوں ہے؟

لیکن عام طور پر یہ چیز کسی شیخ کی صحبت حاصل کیے بغیر اور شیخ کے سامنے اپنے آپ کو فنا کیے بغیر حاصل نہیں ہوتی، کیوں؟ اس لیے کہ ''لکل فن رجال'' یعنی ہر فن کو حاصل کرنے کے لیے اس کے ماہر کے پاس جانا ضروری ہے، اگر فقہ کا مسئلہ معلوم کرنا ہو تو کسی مفتی کے پاس چلے جاؤ، کیونکہ اس کو یہ فن آتا ہے، وہ جانتا ہے کہ کس سوال کا کیا جواب دینا چاہیے، لیکن اعمال باطنہ کے بارے میں مہارت حاصل کرنا اور یہ پہچاننا کہ آیا اس شخص کے اندر یہ بیماری پیدا ہو رہی ہے یا نہیں؟ کیونکہ باطن کی بیماریاں بھی مخفی اور باریک قسم کی

ہوتی ہیں، ایک چیز بڑی اچھی ہے اور دوسری چیز بڑی خراب ہے، لیکن دونوں کے درمیان فرق کرنا بڑا مشکل ہے، مثلاً تکبر کرنا حرام ہے اور اس سے بچنا واجب ہے، اس لیے کہ یہ تکبر ام الامراض ہے، لیکن دوسری صفت عزت نفس ہے، اس کو حاصل کرنا واجب ہے، کیونکہ اپنے نفس کو ذلیل کرنا جائز نہیں، لیکن یہ دیکھنا کہ کہاں تکبر ہے اور کہاں عزت نفس ہے، جو کام میں کر رہا ہوں یہ تکبر کی وجہ سے کر رہا ہوں یا یہ عزت نفس کی وجہ سے کر رہا ہوں، دونوں کے درمیان کون خط امتیاز کھینچے اور دونوں کو کون پہچانے کہ یہ تکبر ہے اور یہ عزت نفس ہے، یہ ہر ایک کے بس کا روگ نہیں، خاص طور پر انسان کا خود اپنے اندر ان بیماریوں کا پہچاننا بڑا مشکل ہے۔

مثلاً ایک بیماری ہے اپنی بڑائی بیان کرنا کہ میں ایسا اور ویسا ہوں، میرے اندر یہ اچھائی ہے، میرے اندر یہ خوبی ہے، یہ حرام ہے اور اسی کو ''تعلّی'' کہا جاتا ہے، دوسری چیز ہے ''تحدیث نعمت'' جس کا قرآن کریم کے اندر ذکر ہے:﴿ وأما بنعمة ربك فحدث ﴾

اب کون اس کے درمیان فرق کرے کہ میں جو اپنی اچھائی بیان کر رہا ہوں یہ تعلّی ہے یا تحدیث نعمت ہے؟ [اصلاحی مجالس، ج۱، ص۳۳]

اسی طرح تواضع بڑی عمدہ چیز ہے، اعلی درجے کی صفت ہے اور مطلوب ہے، ایک دوسری صفت ہوتی ہے ذلت نفس یعنی دوسرے کے سامنے نفس کو ذلیل کرنا، یہ حرام ہے، اللہ تعالی نے نفس کی عزت واجب کی ہے، اس کو ذلیل نہیں کرنا چاہیے، لیکن ان دونوں کے درمیان فرق کرنا کہ کونسا عمل تواضع کی وجہ سے کیا جا رہا ہے اور کون سے فعل میں ذلت نفس ہے، ان کے درمیان فرق کرنا ہر ایک کے بس کی بات نہیں ہے، کبھی تواضع کی سرحد ذلت نفس کے ساتھ مل جاتی ہے اور کبھی اس کی سرحد ناشکری کے ساتھ مل جاتی ہے، اب کس حد تک تواضع کرے اور کس حد پر تواضع نہ کرے، کہاں تواضع ہے اور کہاں ناشکری ہے؟ کہاں تواضع ہے اور کہاں ذلت نفس ہے؟ ان کے درمیان فرق کو پہچاننا ہر ایک کا کام نہیں جب تک کسی شیخ سے تربیت حاصل نہ کر لے۔

یہ چیز محض پڑھا دینے سے حاصل نہیں ہوتی کہ کتاب میں پڑھ کر کسی چیز کی حد تام معلوم کر لی اور پھر خود ہی اس کے فوائد اور قیود نکالنے شروع کر دیے، یاد رکھیے! یہ اس قسم کا کام نہیں ہے، بلکہ یہ کام عملی تربیت سے آتا ہے، جب کسی شیخ کو مسلسل آدمی دیکھتا رہے اور اس کے طرز عمل کا مشاہدہ کرتا رہے اور اس کو اپنے حالات بتا کر اس سے ہدایات لیتا رہے، اس کے نتیجے میں پھر انسان کو یہ ادراک حاصل ہوتا ہے کہ عمل واخلاق کا یہ درجہ قابل حصول صفت ہے اور یہ کیفیت یا درجہ قابل ترک رذیلہ ہے، اسی طرح انسان کے باطن کے جو فضائل ہیں مثلاً تواضع ہے اگر اس کی لفظوں میں کوئی مکمل تعریف بیان کرنا چاہے تو بہت مشکل ہے، لیکن جب کسی متواضع آدمی کو دیکھو گے اور اس کے طرز عمل کا مشاہدہ کرو گے اور اس کی صحبت میں رہو گے تو اس کے نتیجے میں وہ اوصاف تمہارے اندر بھی منتقل ہونے شروع ہو جائیں گے، اس لیے تصوف اور سلوک میں شیخ کی صحبت اور اس کی طرف رجوع کرنے کی ضرورت ہوتی ہے، صرف باتیں کر لینے سے یہ چیز حاصل نہیں ہوتی

، بلکہ کسی کے سامنے رگڑے کھانے سے اللہ تعالیٰ فضل فرما دیتے ہیں اور یہ چیز حاصل ہو جاتی ہے۔

بہر حال! پیر اور شیخ کے ہاتھ پر بیعت ہونا کوئی فرض نہیں کہ آدمی کسی شیخ کے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر ضرور بیعت ہو جائے، لیکن اپنی اصلاح کرانا ضروری ہے، اور جب اپنی اصلاح کے لیے کوئی شخص اپنے شیخ کی طرف رجوع کرتا ہے تو اس رجوع کرنے کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے کہ آدمی کو فضائل حاصل ہوں اور رذائل سے آدمی بچ جائے، ان رذائل کا امالہ ہو اور وہ انسان کے قابو میں آجائیں، سلوک وتصوف کا یہ اصل مقصد ہے ،البتہ اس سلسلہ میں اذکار واوراد یا مختلف وظائف سالک کے لیے معین اور مددگار ہو جاتے ہیں، مگر ہر شخص کے لیے ان اذکار واوراد کی مقدار، اس کا موقع اور وقت، یہ شیخ کی رہنمائی اور مشورے سے ہی مقرر کرنے کی ضرورت ہوتی ہے اور اسی سے اصلاح حال کا فائدہ ہوتا ہے ورنہ عام حالات میں یہ اذکار واوراد اس درجہ میں خود مقصود نہیں، بلکہ اصل کام اپنے اخلاق کی اصلاح ہے اور اس کا تزکیہ ہے، جس کے لیے ضروری ہے کہ شیخ کو اپنے حالات کی اطلاع دیتا رہے اور اس سے ہدایات لیتا رہے اور پھر ان ہدایات پر عمل کرتا رہے بس ساری زندگی یہی کام کرتا رہے، شیخ کی طرف رجوع کرنے کا اصل مقصد یہی ہوتا ہے۔

”آج کل کے دور میں شبلیؒ ، جنید بغدادیؒ ، شیخ عبد القادر جیلانیؒ اور بایزید بسطامیؒ جیسے لوگ کہاں سے تلاش کریں“ ؟

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سچے لوگ کہاں سے لائیں؟ ہر شخص دعوی کرتا ہے کہ میں بھی سچا ہوں، میں بھی صادق ہوں اور اسی فہرست میں داخل ہوں، بلکہ لوگ یہ کہا کرتے ہیں کہ صاحب! آج کل تو دھوکہ بازی کا دور ہے، ہر شخص لمبا کرتا پہن کر اور عمامہ سر پر لگا کر اور داڑھی لمبی کر کے کہتا ہے کہ میں بھی صادقین میں داخل ہوں، اقبال نے کہا تھا:

خداوند! یہ تیرے سادہ دل بندے کدھر جائیں
کہ درویشی بھی عیاری ہے سلطانی بھی عیاری

یہ حالت نظر آتی ہے تو اب کہاں سے لائیں وہ صادقین جن کی صحبت انسان کو کیمیا بنا دیتی ہے، کہاں سے لائیں وہ اللہ والے جن کی ایک نظر سے انسان کی زندگیا بدل جاتی ہیں، وہ جنید وہ شبلی رحمہم اللہ جیسے بڑے بڑے اولیا کرام اس دور میں کہاں سے لے کر آئیں، کس طرح ان کی صحبت حاصل کریں، آج کل تو عیاری کا اور مکاری کا دور ہے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ اس کا ایک بڑا عمدہ جواب دیا کرتے تھے، وہ فرماتے تھے کہ میاں! لوگ یہ کہتے ہیں کہ آج کل صادقین کہاں سے تلاش کریں؟ ہر جگہ عیاری مکاری کا دور ہے، تو بات دراصل یہ ہے کہ یہ زمانہ ہے ملاوٹ کا، ہر چیز میں ملاوٹ، گھی میں ملاوٹ،

چینی میں ملاوٹ، آٹے میں ملاوٹ، دنیا کی ہر چیز میں ملاوٹ، یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ زہر میں بھی ملاوٹ، کسی نے لطیفہ سنایا کہ ایک شخص نے ہر چیز میں ملاوٹ دیکھی کہ کوئی چیز خالص نہیں ملتی تو عاجز آ گیا، اس نے سوچا کہ میں خودکشی کرلوں، اس دنیا میں زندہ رہنا فضول ہے، جہاں پر کوئی چیز خالص نہیں ملتی، نہ آٹا خالص ملے، نہ چینی خالص ملے، نہ گھی خالص ملے، کچھ بھی خالص نہیں، تو اس نے سوچا کہ خودکشی کر لینی چاہیے اور اس دنیا سے چلے جانا چاہیے، چنانچہ وہ بازار سے زہر خرید کر لایا اور وہ زہر کھالیا، اب کھا کر بیٹھا ہے انتظار میں کہ اب موت آئے اور تب موت آئے، لیکن موت ہے کہ آتی ہی نہیں، معلوم ہوا کہ زہر بھی خالص نہیں تھا، تو دنیا کی کوئی چیز خالص نہیں، ہر چیز میں ملاوٹ ہے، حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ دنیا کی ہر چیز میں ملاوٹ ہے، تو بھائی آٹے میں بھی ملاوٹ ہے اور یہ آٹا بھی خالص نہیں ملتا لیکن یہ بتاؤ کہ اگر آٹا خالص نہیں ملتا تو کسی نے آٹا کھانا چھوڑ دیا کہ صاحب! آٹا تو اب خالص ملتا نہیں، لہٰذا اب آٹا نہیں کھائیں گے، اب تو بھس کھایا کریں گے، یا گھی اگر خالص نہیں ملتا تو کسی نے گھی کھانا چھوڑ دیا کہ صاحب! گھی تو اب خالص ملتا نہیں، لہٰذا اب مٹی کا تیل استعمال کریں گے، کسی نے بھی باوجود اس ملاوٹ کے دور کے نہ آٹا کھانا چھوڑا، نہ چینی کھانی چھوڑی، نہ گھی کھانا چھوڑا، بلکہ تلاش کرتا ہے کہ گھی کونسی دوکان پر اچھا ملتا ہے اور کونسی بستی میں اچھا ملتا ہے، آدمی بھیج کر وہاں سے منگواؤ، مٹھائی کونسی دوکان والا اچھی بناتا ہے، آٹا کس جگہ سے اچھا ملتا ہے، وہاں سے جا کر تلاش کر کے لائے گا، اسی کو حاصل کرے گا، اسی کو استعمال کرے گا، تو فرمایا کہ بے شک آٹا گھی چینی کچھ خالص نہیں ملتی، لیکن تلاش کرنے والے کو آج بھی مل جاتا ہے، اگر کوئی اللہ کا بندہ تلاش کرنا چاہے، طلب کرنا چاہے تو اس کو آج کے دور میں بھی صادقین مل جائیں گے، یہ کہنا بالکل شیطان کا دھوکہ ہے کہ آج کے دور میں صادقین ختم ہو گئے، ارے جب اللہ تبارک وتعالیٰ فرمارہے ہیں کہ تم صادقین کے ساتھی بن جاؤ، یہ حکم کیا صرف صحابہ کرام کے دور کے ساتھ مخصوص تھا کہ وہ صحابہ کرام اس پر عمل کرسکیں، بیسویں صدی میں آنے والے اس پر عمل نہیں کرسکتے؟ ظاہر ہے کہ قرآن کریم کے ہر حکم پر قیامت تک جب تک مسلمان باقی ہیں عمل کرنا ممکن رہے گا، تو اس کے معنی خود بخود نکال لو کہ صادقین اس وقت بھی ہیں، ہاں! تلاش کرنے کی بات ہے، یہ نہیں کہ صاحب ملتا ہی نہیں، لہٰذا بیٹھے ہیں، تلاش کرو گے اور طلب پیدا کرو گے تو مل جائے گا۔

حضرت والد صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ میاں! آج کل لوگوں کا حال یہ ہے کہ خود خواہ کسی حالت میں ہوں، گناہ میں، معصیت میں، کبائر میں، فسق وفجور میں مبتلا ہوں، لیکن اپنے لیے صادقین تلاش کریں گے تو معیار سامنے رکھیں گے جنید بغدادیؒ کا، شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کا اور بایزید بسطامیؒ کا اور بڑے بڑے اولیا کرام کا جن کے نام سن رکھے ہیں کہ صاحب! ہمیں تو ایسا صادق چاہیے جیسا کہ جنید بغدادی تھے یا شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تھے، حالانکہ اصول یہ ہے کہ جیسی روح ویسے فرشتے، جیسے تم ہو ویسے ہی تمہارے مصلح ہوں گے، تم جس معیار کے ہو تمہارے لیے یہی لوگ کافی ہو سکتے ہیں، جنیدؒ وشبلیؒ کے معیار کے نہ سہی لیکن تمہارے

لیے یہ بھی کافی ہیں۔

بلکہ میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ فرماتے تھے کہ میں تو قسم کھا کر کہتا ہوں کہ اگر کوئی شخص اللہ تعالی کی طلب لے کر اپنی مسجد کے اَن پڑھ مؤذن کی صحبت میں جا کر بیٹھے گا تو اس کی صحبت سے بھی فائدہ پہنچے گا، اس واسطے کہ وہ مؤذن کم از کم پانچ وقت اللہ کا نام بلند کرتا ہے، اس کی آواز فضاؤں میں پھیلتی ہے، وہ اللہ کے کلمے کو بلند کرتا ہے، اس کی صحبت میں جا کر بیٹھو، تمہیں اس سے بھی فائدہ پہنچے گا، یہی شیطان کا دھوکہ ہے کہ صاحب! ہمیں تو اس معیار کا بزرگ اور اس معیار کا مصلح چاہیے، یہ انسان کو دھوکا دینے کی بات ہے، حقیقت میں تمہاری اپنی اصلاح کے واسطے تمہارے معیار کے اور تمہاری سطح کے مصلح آج بھی موجود ہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۱۱۲]

"شیخ نے ایک نظر ڈالی اور دل کی دنیا بدل گئی"
تصرّف اور اس کے متعلق غلط فہمی

لوگ سمجھتے ہیں کہ جب کسی اللہ والے کے پاس آدمی جاتا ہے یا کسی شیخ کی خدمت میں حاضری دیتا ہے اور اس سے اصلاحی تعلق قائم کرتا ہے اور اس سے بیعت ہوتا ہے تو وہ اپنی نظر سے کام بنا دیتے ہیں، شیخ نے ایک نظر ڈال دی تو بس دل کی دنیا بدل گئی۔

خوب سمجھ لیں کہ اصلاح نفس کے لیے یہ کوئی معمول کا طریقہ نہیں ہے، لہذا یہ نہیں ہوگا کہ کوئی اللہ والا نظر ڈال دے گا تو تمہاری طبیعت بدل جائے گی اور تمہارے حالات میں خود بخود انقلاب آجائے گا بلکہ کرنا تو خود ہی پڑے گا، ہمت کرنی ہوگی، کوشش کرنی ہوگی، مشقت اٹھانی ہوگی، شیخ کا کام صرف اتنا ہے کہ وہ توجہ دلا دے اور راستہ بتا دے ایسی تدبیریں بتا دے جس کے ذریعہ کام نسبتاً آسان ہو جائے، لیکن کرنا خود ہی پڑے گا، چلنا خود ہی پڑے گا، کوئی شخص یہ سوچے کہ مجھے خود کچھ کرنا نہ پڑے بلکہ دوسرا آدمی مجھے منزل تک پہنچا دے، تو یہ بات نہیں ہے، اگر ایسا ہوتا تو پھر انبیاء کرام علیہم السلام کو اشاعت دین کے لیے مجاہدات اور مشقت اٹھانے کی ضرورت نہ ہوتی، بس لوگوں پر ایک نظر ڈال دیتے اور سب لوگ مسلمان ہو جاتے۔

[اصلاحی مجالس، ج ۱، ص ۷۸]

پچھلے زمانے کے صوفیاء کرام کے یہاں اس قسم کے چند واقعات ملتے ہیں کہ شیخ نے ایک نظر ڈالی اور ایک نظر سے زندگی میں انقلاب آگیا، اس بارے میں کچھ باتیں سمجھنے کی ہیں:

پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ نظر ڈالنا تصرف ہے، اور یہ تصرف کرنا ہر ایک کو نہیں آتا، اور تصرف نہ آنا کوئی عیب کی بات نہیں، یعنی اگر کسی شیخ اور ولی اللہ کی نظر میں تصرف کی قوت نہ ہو تو اس کے اندر کوئی عیب نہیں، اگر تصرف کی یہ قوت حاصل ہو جائے تو اللہ کی نعمت ہے اور اگر حاصل نہ ہو تو کوئی عیب نہیں، آج کل ایک پیر

صاحب بڑے مشہور ہو رہے ہیں ان کی کتاب میں لکھا ہوا دیکھا کہ جو پیر اپنے مریدوں کو بیت اللہ میں نماز نہ پڑھوا سکے وہ پیر بیعت کے لائق نہیں، یاد رکھیے! یہ گمراہی کی فکر ہے، اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں، تصرف کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا، یہ تصرف کا عمل فاسق و فاجر کو بھی حاصل ہو جاتا ہے، حتی کہ کافر اور غیر مسلم کو حاصل ہو جاتا ہے، معلوم ہوا کہ یہ حالت مقرب بارگاہ خداوندی ہونے کی علامت نہیں اور نہ ہی یہ متقی ہونے کی علامت ہے، اور نہ اس کا نہ ہونا کوئی عیب ہے، بعض اوقات کسی کو تصرف حاصل ہو جاتا ہے اور بعض اوقات نہیں ہوتا۔

دوسری بات یہ ہے کہ تصرف کا حاصل صرف یہ ہے کہ جس شخص پر تصرف کیا گیا ہے، تصرف کے نتیجے میں اس کی طبیعت میں ذرا سا نشاط پیدا ہو جاتا ہے، لیکن یہ نشاط دیرپا نہیں ہوتا بلکہ وقتی ہوتا ہے، آگے کام اس کو خود ہی کرنا پڑتا ہے، یہ نہیں ہوسکتا کہ اس تصرف کے نتیجے میں ساری عمر کام کرتا رہے، اس تصرف کی مثال ایسی ہے جیسے گاڑی کو دھکا لگانا، اگر گاڑی اسٹارٹ نہیں ہو رہی ہے تو اس کو دھکا لگا کر اسٹارٹ کرنے کی کوشش کی جاتی ہے، اس دھکا لگانے کے نتیجے میں اس گاڑی میں چلنے کی تھوڑی سی صلاحیت پیدا ہوئی، لیکن جب دھکے کے ذریعہ اسٹارٹ ہوگئی تو اب وہ گاڑی انجن اور پیٹرول کی طاقت سے چلے گی، لیکن اگر انجن ہی خراب ہے یا پیٹرول ہی نہیں ہے، تو پھر ہزار دھکے لگاؤ، گاڑی نہیں چلے گی، بس دھکا لگانے سے دو چار قدم چل کر کھڑی ہو جائے گی۔

بالکل اسی طرح اگر انسان کے اندر سلوک میں اور اللہ تعالی کے راستے میں چلنے کی ہمت اور طاقت ہے تو کسی کی نظر پڑ جانے سے اس کے اندر چلنے کی صلاحیت پیدا ہوگئی اور طبیعت کے اندر ذرا سا نشاط پیدا ہوگیا، اب اگر اپنے اندر طاقت ہے تو وہ اس کے ذریعہ آگے چلے گا، لیکن اگر اندر ہی طاقت نہیں تو ہزار نظر ڈالتے رہو، ہزار تصرف کرتے رہو، کچھ نہیں ہوگا، ہاں! وقتی طور پر تھوڑا سا جذبہ پیدا ہوگا پھر وہ ٹھنڈا پڑ جائے گا۔

بہر حال! یہ نظر نہ تو دیرپا چیز ہے، نہ دائمی ہے، نہ ہر ایک کو حاصل ہوتی ہے، نہ کوئی ایسی صفت مدح ہے جس کا نہ ہونا عیب ہو، اور اگر نظر سے فائدہ ہو بھی جائے تو وہ وقتی ہوگا، آخر میں کام اپنی ہمت ہی سے کرنا ہوگا، انجن اپنا مضبوط کرنا ہوگا، اسی انجن سے ہی گاڑی چلے گی، دھکے سے نہیں چلے گی، لہذا اصل کام یہ ہے کہ اپنی ہمت کو تازہ کرو۔ [اصلاحی مجالس، ج ا، ص ۸۵، ۸۷]

تصوف میں وظائف و اذکار کیوں بتائے جاتے ہیں؟

ان وظائف، اذکار اور معمولات کی مثال ایسی ہے جیسے مقویات، اور مقویات کا اصول یہ ہے کہ اگر کسی کے اندر بیماری موجود ہے، اور بیماری کی حالت میں وہ مقویات کھاتا رہے تو بسا اوقات نہ صرف یہ کہ اس کو قوت حاصل نہیں ہوتی، بلکہ بیماری کو قوت حاصل ہو جاتی ہے، بیماری بڑھ جاتی ہے، اگر دل میں تکبر بھرا ہوا

ہے، عجب بھرا ہوا ہے، اور بیٹھ کر وظیفے گھونٹ رہا ہے اور ذکر بہت کر رہا ہے، تو بعض اوقات اس کے نتیجے میں اصلاح ہونے کے بجائے تکبر اور بڑھ جاتا ہے، اس لیے یہ جو بتایا جاتا ہے کہ جب بھی کوئی وظیفہ کرو یا ذکر کرو ، کسی شیخ کی رہنمائی میں کرو، اس لیے کہ شیخ جانتا ہے کہ اس سے زیادہ اگر بتاؤں گا تو وہ اس کے اندر بیماری پیدا کر دے، اس واسطے وہ اس کو روک دیتا ہے کہ بس! اب مزید ذکر کی ضرورت نہیں، حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ نے کتنے آدمیوں کے لیے یہ علاج تجویز کیا کہ تمام وظائف واذکار ترک کر دیں، حضرتؒ نے ان کے تمام معمولات چھڑوا دیے، خاص حالات میں جب دیکھا کہ اس کے لیے یہ وظیفہ مضر ثابت ہو رہا ہے تو وہ چھڑوا دیا۔ [اصلاحی خطبات، ج ۳، ص ۹۰]

عرض کرنے کا مقصد یہ تھا کہ حضرات صوفیائے کرام کا اصل کام اندر کی بیماریوں کا علاج تھا، محض وظیفے، ذکر، تسبیح، معمولات نہیں تھے، یہ ذکر، وظیفے، تسبیح، معمولات یہ سب بطور مقویات کے ہیں، یہ اصلاح کے عمل میں معاونت کرنے کے لیے کروائے جاتے تھے، لیکن اصل مقصد یہ تھا کہ باطن کی بیماریاں دور ہوں، تکبر دل سے نکلے، حسد دل سے نکلے، بغض دل سے نکلے، عجب دل سے نکلے، منافقت دل سے نکلے، دکھاوے کا شوق دل سے نکلے، حب جاہ دل سے نکلے، حب دنیا دل سے نکلے، قلب کو ان چیزوں سے صاف کرنا اصل مقصود ہے، اللہ تعالیٰ کا خوف پیدا ہو، اللہ تعالیٰ سے امید وابستہ ہو، اللہ تعالیٰ پر بھروسہ ہو، توکل ہو، استقامت ہو، اخلاص ہو، اللہ تبارک وتعالیٰ کے لیے تواضع ہو، یہ چیزیں پیدا کرنا تصوف کا اصل مقصود ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۳، ص ۹۴]

صوفیاء کرام سے منقول ذکر کے خاص طریقوں پر بدعت ہونے کا اعتراض

حضرات صوفیاء کرام نے ذکر کے خاص طریقے جو بیان فرمائے ہیں، ان کا مقصد یہ تھا کہ ذکر میں انسان کا دل لگ جائے، اور یہ طریقے بطور علاج کے بیان فرمائے ہیں۔ اس لئے یاد رکھئے! کہ یہ خاص طریقے نہ مقصود ہیں، نہ مسنون ہیں اور نہ ان طریقوں کو مسنون سمجھنا جائز ہے، مثلاً ہمارے تمام مشائخ کے یہاں دوازدہ تسبیح (بارہ تسبیح) بہت معروف ہے، یہ دوازدہ تسبیح ضرب لگا کر کی جاتی ہے، مگر یہ خاص طریقہ نہ مقصود ہے، اور نہ مسنون ہے، اگر کوئی شخص اس کو مسنون سمجھ لے تو یہ طریقہ بدعت ہو جائے گا، بلکہ اس کے جائز ہونے کی شرط یہی ہے کہ اس کے بارے میں یہ تصور رکھا جائے کہ یہ طریقہ مبتدی کو صرف علاج کے طور پر بتایا جاتا ہے، تاکہ اس کا دل ذکر میں لگ جائے اور خیالات میں یکسوئی پیدا ہو جائے۔

آج کل لوگ افراط وتفریط میں مبتلا ہیں، چنانچہ بعض لوگ ضرب لگا کر ذکر کرنے کو بدعت کہتے ہیں، اور یہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے یہ کہیں ثابت نہیں ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح

ضرب لگا کر ذکر فرمایا ہو اور نہ کسی صحابی سے ضرب لگا کر ذکر کرنا ثابت ہے، اور جب ایسا ذکر ثابت نہیں ہے اور تم لوگ ایسا ذکر کر رہے ہو، لہٰذا یہ ذکر بدعت ہے۔

چنانچہ ایک صاحب مجھ سے کہنے لگے کہ آپ کے تمام مشائخ بدعتی ہیں (معاذ اللہ) اس لئے کہ یہ مشائخ ضرب لگا کر ذکر کرنے کی تلقین کرتے ہیں، اور اس طرح ذکر کرنا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں۔ میں نے ان صاحب سے پوچھا کہ جب تمہیں نزلہ زکام ہوتا ہے تو تم ''جوشاندہ'' پیتے ہو؟ کہنے لگے کہ ہاں پیتا ہوں، میں نے پوچھا کہ کیا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے جوشاندہ پینا ثابت ہے؟ یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی جوشاندہ پیا ہے؟ یا کسی صحابیؓ سے جوشاندہ پینا ثابت ہے؟ کہنے لگے کہ جوشاندہ پینا تو ثابت نہیں، میں نے کہا کہ جب ثابت نہیں تو آپ کا جوشاندہ پینا بدعت ہو گیا، اس لئے کہ آپ کا دعوی اس کے بغیر ثابت نہیں ہو سکتا کہ یوں کہا جائے کہ جو چیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہ ہو وہ بدعت ہے، تو چونکہ جوشاندہ پینا بھی ثابت نہیں لہٰذا یہ بھی بدعت ہے۔

درحقیقت صحیح بات یہ ہے کہ ذکر کرنے کے یہ سارے طریقے علاج ہیں، یعنی جس شخص کا ذکر میں دل نہیں لگتا اور ذکر میں اس کی طبیعت مائل نہیں ہوتی، تو اس کے علاج کے لئے یہ طریقہ بتا گیا کہ تم اس طریقے سے ذکر کرلو، تاکہ ذکر میں تمہارا دل لگ جائے، گویا کہ جوشاندہ پلایا جا رہا ہے۔

ہاں! اگر کوئی شخص ذکر کے کسی خاص طریقے کے بارے میں یہ کہہ دے کہ یہ طریقہ سنت ہے، یا یہ طریقہ مستحب ہے، یا یہ طریقہ زیادہ افضل ہے تو پھر وہ طریقہ بدعت ہو جائے گا، کیونکہ افضلیت کا مدار، استحباب کا مدار، اور سنیت کا مدار حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثبوت پر ہے، جو چیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں، وہ سنت نہیں ہو سکتی، وہ افضل نہیں ہو سکتی، البتہ نافع ہو سکتی ہے۔

یعنی جو چیز حضور اقدس علیہ السلام سے ثابت نہیں، وہ ''نافع'' ہو سکتی ہے، اور ''انفع'' بھی ہو سکتی ہے، لیکن جو چیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں وہ ''افضل'' نہیں ہو سکتی، ہمارے بزرگوں نے افراط و تفریط سے ہمیشہ احتراز کیا ہے، اس لئے ذکر کے ان خاص طریقوں کے بارے میں نہ تو یہ کہا کہ یہ بدعت ہیں، ان کو اختیار نہ کرو، اور نہ یہ کہا کہ یہ طریقہ ''افضل'' ہے۔ [اصلاحی مجالس، ج ۳، ص ۵۹]

ذکر جهری افضل یا ذکر خفی ؟

یاد رکھئے! ذکر کے اندر افضل طریقہ ہمیشہ ہر حالت میں قیام قیامت تک ذکر خفی ہے، اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں، ذکر جتنا آہستہ آواز سے ہوگا اتنا ہی افضل ہوگا۔ قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿أدعوا ربكم تضرعاً وخفية﴾ [الاعراف: ۵۵]

اپنے رب کو عاجزی سے اور چپکے چپکے پکارو۔

دوسری جگہ ارشاد ہے:

﴿واذکر ربك فی نفسك تضرعا وخیفة ودون الجهر من القول﴾

[الاعراف:۲۰۵]

اپنے رب کو اپنے دل میں پکارو عاجزی کے ساتھ، اور ڈرتے ہوئے، اور زور کی آواز کی نسبت کم آواز کے ساتھ۔

اس سے معلوم ہوا کہ زیادہ زور سے ذکر کرنا پسندیدہ نہیں، پسندیدہ ذکر وہ ہے جو آہستہ آواز کے ساتھ ہو۔

یہ اصول ہمیشہ کا ہے، ابدی ہے اور قیامت تک کبھی نہیں ٹوٹ سکتا کہ افضل ذکر ''ذکر خفی'' ہے، ذکر جتنا آہستہ کیا جائے گا اتنا ہی زیادہ ثواب ملے گا، البتہ ''ذکر جہری'' جائز ہے، ناجائز نہیں ،لہٰذا ''ذکر جہری'' کبھی ''ذکر خفی'' سے افضل نہیں ہوسکتا، البتہ علاج کے طور پر ذکر جہری کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر کوئی شخص ذکر جہری کو افضل سمجھنے لگے، یا کوئی شخص ذکر جہری کو مقصود سمجھ لے، یا ذکر جہری کو مسنون سمجھ لے، یا ذکر جہری نہ کرنے والے پر نکیر کرنے لگے، تو پھر یہی چیز بدعت بن جاتی ہے، اس کا نام بدعت ہے۔ اس راستے میں اسی افراط وتفریط سے بچ کر گزرنا ہے، اس لئے ہمارے اس آخری دور کے بزرگ ذکر جہری کی زیادہ ہمت افزائی نہیں کرتے بلکہ ذکر خفی کی تلقین فرماتے ہیں۔

بات دراصل یہ ہے کہ جب کام آگے بڑھتا ہے تو اپنی حد پر نہیں رہتا، اب ذکر کے مندرجہ بالا طریقے صوفیاء کرام نے بطور علاج بتائے تھے، لیکن رفتہ رفتہ یہ طریقے خود مقصود بن گئے، اب ہر سلسلہ والوں نے اپنے لئے ذکر کا ایک طریقہ مقرر کرلیا ہے کہ فلاں سلسلہ میں ''پاس انفاس'' کے طریقے سے ذکر ہوتا ہے اور فلاں سلسلہ میں ''سلطان الاذکار'' ہوتا ہے، اور فلاں سلسلہ میں فلاں طریقہ سے ذکر ہوتا ہے، یہ اس سلسلے کی خصوصیات بن گئیں، اب اس سلسلہ سے وابستہ لوگ باہر کے لوگوں کو یہ باور کراتے ہیں کہ آپ جس طریقہ سے ذکر کرتے ہیں وہ طریقہ صحیح نہیں یا افضل نہیں، صحیح اور افضل طریقہ وہ ہے جو ہمارے شیخ نے بتایا ہے۔ اس طرح سے جو چیز مقصود نہیں تھی وہ مقصود قرار پاگئی، اسی کا نام ''احداث فی الدین'' ہے، اسی کا نام ''بدعت'' ہے، اس کی جڑ کاٹنی ہے۔ [اصلاحی مجالس، ج ۳،ص ۶۱]

ذکر کے بارے میں افراط و تفریط کا رویہ

یہ تفصیل اس لئے عرض کردی کہ ہمارے دور میں افراط وتفریط چل رہی ہے، ایک قوم وہ ہے جو صوفیاء کرام کے ان طریقوں کو علی الاطلاق بدعت کہتی ہے، ان کا کہنا یہ ہے کہ یہ تصوف بھی بدعت ہے اور یہ خانقاہیں بھی بدعت ہیں اور یہ چلہ کشی بھی بدعت ہے اور یہ ذکر کرنے کے یہ خاص طریقے بھی بدعت ہیں۔

دوسری طرف ایک گروہ ایسا پیدا ہو گیا ہے جس نے ذکر کے ان خاص طریقوں کو ہی مقصود بالذات بنا دیا، چنانچہ یہ جاہل پیر اپنی خانقاہیں بھی کھول کر بیٹھ گئے ہیں، ان کا کہنا یہ ہے کہ جس نے ''پاس انفاس'' کے طریقہ سے ذکر نہیں کیا وہ تصوف کے حروف ابجد سے بھی واقف نہیں، گویا کہ ''پاس انفاس'' ہی مقصود بالذات ہے، یہ دوسری انتہاء ہے۔

ہمارے بزرگوں نے تو اللہ کے فضل وکرم سے ہمیں اتدال کا راستہ دکھا دیا اور اس پر ہمیں چلا دیا، اس اعتدال کے راستے میں نہ افراط ہے اور نہ تفریط ہے، اور یہ بتا دیا کہ یہ راستہ جائز ہے لیکن بذات خود مقصود نہیں، اس پر عمل کرو۔ [اصلاحی مجالس، ج ۳، ص ۶۵]

مشائخ اور صوفیاء بعض جائز کاموں سے بھی روک دیتے ہیں؟ جائز کاموں میں کیسا مجاہدہ؟

گناہ سے بچنے کے لیے بعض اوقات انسان کو کچھ جائز چیزیں بھی ترک کرنی پڑ جاتی ہیں، ایک کام بذات خود جائز ہے لیکن کبھی اس کو بھی اس لیے چھوڑنا پڑتا ہے کہ کہیں یہ نفس اس جائز کام سے بالآخر کسی ناجائز کام کی طرف لے جانے والا نہ بن جائے، مثلاً بعض اوقات صوفیا کرام فرماتے ہیں کہ کھانا بھوک سے کم کھاؤ، اب بتایئے کہ بھوک کے مطابق کھانا کھانا کوئی گناہ ہے؟ ظاہر ہے کہ یہ گناہ نہیں، اس کے باوجود فرماتے ہیں کہ کم کھاؤ، کیوں؟ اس لیے کہ کم کھانے کے نتیجے میں یہ تمہارے نفس کا مجاہدہ ہوگا اور مجاہدہ کا اثر یہ ہوگا کہ نفس کے تقاضوں کے خلاف کام کرنے کی عادت پڑے گی جو معصیت کے تقاضے کی خلاف ورزی کرنے میں کام آئے گی۔

اصل مجاہدہ تو یہ ہے کہ انسان جو ناجائز اور شریعت کے خلاف کام کر رہا ہے، ان سے اپنے آپ کو بچائے، اور اپنے نفس پر زبردستی دباؤ ڈال کر ان سے باز رہے، لیکن چونکہ ہمارا نفس لذتوں کا، خواہشات کا اور راحتوں کا عادی ہو چکا ہے، اور اتنا زیادہ عادی بنا ہوا ہے کہ اگر اس کو اللہ کے راستے کی طرف اور شریعت کی طرف موڑنا چاہو تو آسانی سے نہیں مڑتا، بلکہ دشواری پیدا ہوتی ہے، اس لیے اس نفس کو رام کرنے کے لیے اور اللہ کے بتائے ہوئے احکام کے تابع بنانے کے لیے اس کو بعض مباح اور جائز کاموں سے بھی روکنا پڑتا ہے، اس لیے کہ جب نفس کو جائز کاموں سے روکیں گے تو پھر اس کو لذتوں کو چھوڑنے کی عادت پڑے گی، اور پھر اس کے لیے ناجائز امور سے بچنا بھی آسان ہو جائے گا، صوفیاء کرام کی اصطلاح میں اس کو بھی مجاہدہ کہا جاتا ہے۔

حضرت مولانا محمد یعقوب نانوتوی صاحبؒ سے کسی نے پوچھا کہ حضرت! یہ کیا بات ہے کہ صوفیاء کرام بعض جائز کاموں سے بھی روک دیتے ہیں؟ اور ان کو چھڑا دیتے ہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ نے ان کو جائز قرار دیا ہے؟ حضرت والا نے جواب میں فرمایا کہ دیکھو! اس کی مثال یہ ہے کہ یہ کتاب کا ورق ہے، اس ورق

کو موڑو، موڑ دیا، اچھا اس کو سیدھا کرو، اب وہ ورق سیدھا نہیں ہوتا، بہت کوشش کر لی، لیکن وہ دوبارہ مڑ جاتا ہے، پھر آپ نے فرمایا کہ اس کو سیدھا کرنے کا طریقہ یہ ہے کہ اس ورق کو مخالف سمت میں موڑ دو، یہ سیدھا ہو جائے گا، پھر فرمایا کہ یہ نفس کا کاغذ بھی گناہوں کی طرف مڑا ہوا ہے، اب اگر اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو یہ سیدھا نہیں ہوگا، اس کو دوسری طرف موڑ دو، اور تھوڑے سے مباحات بھی چھڑا دو، جس کے نتیجے میں یہ بالکل سیدھا ہو جائے گا، اور راستے پر آ جائے گا، یہ بھی مجاہدہ ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۲، ص ۲۵۴]

صوفیاء کرام کا خاص توکل کیا عام لوگوں کے لیے قابلِ تقلید ہے؟

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ رزق حلال کو طلب کرنا دین کے اولین فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ہے۔

اس حدیث نے ''رہبانیت'' کی جڑ کاٹ دی، بعض صوفیاء کرامؒ کی طرف یہ منسوب ہے اور ان سے یہ طرز عمل منقول ہے کہ انہوں نے کوئی پیشہ اختیار نہیں کیا اور رزق کی طلب میں کوئی کام نہیں کیا، بلکہ توکل کی زندگی اس طرح گذاردی کہ بس اپنی جگہ پر بیٹھے ہیں، اللہ تعالیٰ نے جو کچھ غیب سے بھیج دیا اس پر شکر کیا اور قناعت کر لی، اگر نہیں بھیجا تو صبر کر لیا، اس بارے میں یہ سمجھ لیں کہ صوفیاء کرام سے اس قسم کا جو طرز عمل منقول ہے وہ دو حال سے خالی نہیں، یا تو وہ صوفیاء کرامؒ ایسے تھے جن پر غلبہ حال کی کیفیت طاری ہوئی اور وہ استغراق کے عالم میں تھے اور اپنے عام ہوش وحواس کے عالم میں نہیں تھے، اور جب انسان اپنے ہوش وحواس میں نہ ہو تو وہ احکام شریعت کا مکلف نہیں ہوتا، اس وجہ سے اگر ان صوفیاء کرامؒ نے یہ طرز عمل اختیار کیا تو یہ ان کا اپنا مخصوص معاملہ تھا، تمام امت کے لیے وہ عام حکم نہیں تھا۔

یا پھر ان صوفیاء کرام کا توکل اتنا زبردست اور کامل تھا کہ وہ اس بات پر راضی تھے کہ اگر ہم پر مہینوں فاقہ بھی گذرتا ہے تو ہمیں کوئی فکر نہیں، ہم نہ تو کسی کے سامنے ہاتھ پھیلائیں گے، نہ کسی کے سامنے شکوہ کریں گے، یہ صوفیاء بڑے مضبوط اعصاب کے مالک تھے، بڑے اعلیٰ درجے کے مقامات پر فائز تھے، انہوں نے اسی پر اکتفا کیا کہ ہم اپنے ذکر وشغل میں مشغول رہیں گے اور اس کے نتیجے میں فاقے کی نوبت آتی ہے تو کوئی بات نہیں، اور ان کے ساتھ دوسروں کے حقوق وابستہ نہیں تھے، نہ بیوی بچے تھے کہ ان کو کھانا کھلانا ہو، لہٰذا یہ ان صوفیاء کرامؒ کے مخصوص حالات تھے اور ان کا خاص طرز عمل تھا جو عام لوگوں کے لیے اور ہم جیسے کمزوروں کے لیے قابل تقلید نہیں ہے، ہمارے لیے نبی صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے سنت کا جو راستہ بتایا وہ یہ ہے کہ رزق حلال کی طلب دوسرے دینی فرائض کے بعد دوسرے درجے کا فریضہ ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۰، ص ۱۹۳، ۱۹۵، ۱۹۷]

ملامتی صوفیاء کا غلط طرز عمل
ایک گناہ سے بچنے کے لیے دوسرا گناہ کرنا

ایک فرقہ گذرا ہے جو اپنے آپ کو ''ملامتی'' کہتا تھا اور پھر اسی ''ملامتی'' فرقہ کے نام سے مشہور ہوا، یہ فرقہ اپنی ظاہری حالت گناہ گاروں، فاسقوں اور فاجروں جیسی رکھتا تھا، مثلاً وہ نہ تو مسجد میں جا کر نماز پڑھتے تھے اور نہ ہی کسی کے سامنے ذکر و عبادت کرتے تھے، اپنا حلیہ بھی فاسقوں جیسا بناتے تھے، ان کا کہنا یہ تھا کہ ہم اپنا حلیہ اس لیے ایسا بنا دیتے ہیں تا کہ ریاکاری نہ ہو جائے، دکھاوا نہ ہو جائے، اگر ہم داڑھی رکھیں اور مسجد میں جا کر صف اول میں نماز پڑھیں گے تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ ہم بڑے بزرگ آدمی ہیں، لوگ ہماری عزت کریں گے اور اس سے ہمارا دل خراب ہو گا اور اس کے نتیجے میں ہمارے دلوں میں تکبر پیدا ہو گا، اس لیے ہم مسجد میں نماز نہیں پڑھتے، یہ ملامتی فرقہ کہلاتا تھا، یہ نام اس لیے پڑ گیا کہ یہ لوگ اپنی ظاہری حالت ایسی بناتے تھے کہ دوسرے لوگ ان پر ملامت کریں کہ یہ کیسے خراب لوگ ہیں، لیکن ان کا یہ طرز عمل اور طریقہ سنت کا طریقہ اور شریعت کا طریقہ نہیں تھا اور نہ ہی یہ ہمارے بزرگان دین کا صحیح طریقہ تھا۔

یہ ہو سکتا ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ غلبہ حال میں ایسا طرز اختیار کر گیا ہو، وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معذور ہو گا لیکن اس کا یہ طرز عمل قابل تقلید نہیں، کیونکہ یہ طرز عمل شرعاً درست نہیں، کیا آدمی اپنے آپ کو ریاکاری اور تکبر سے بچانے کے لیے ایک دوسرے گناہ کا ارتکاب کرے؟ ریاکاری ایک گناہ ہے اور اس گناہ سے بچنے کے لیے ایک دوسرے گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے کہ مسجد میں نماز نہیں پڑھ رہا ہے، شرعاً یہ بالکل درست نہیں، اللہ تعالیٰ نے جس چیز کو حرام کر دیا بس وہ حرام ہو گئی، اگر کوئی شخص یہ کہتا ہے کہ مسجد میں جا کر نماز نہیں پڑھتا بلکہ گھر میں نماز پڑھتا ہوں اس لیے کہ اگر مسجد میں صف اول میں نماز پڑھوں گا تو یہ دکھاوا ہو جائے گا، سب لوگ دیکھیں گے کہ یہ شخص صف اول میں نماز پڑھ رہا ہے، چنانچہ کتنے لوگ ایسے ہیں جن کے ذہنوں میں یہ خیال آتا ہے۔

یاد رکھیے! یہ سب شیطان کا دھوکہ ہے، جب اللہ تعالیٰ نے کہہ دیا ہے کہ مسجد میں آ کر نماز پڑھو، تو بس اب مسجد میں ہی آ کر نماز پڑھنا ضروری ہے اور یہ خیال کہ یہ مسجد میں جا کر نماز پڑھنے سے ریاکاری اور دکھاوا ہو جائے گا، یہ سب شیطان کا دھوکہ ہے، اس خیال پر ہرگز عمل مت کرو اور مسجد میں آ کر نماز پڑھو اور اگر ریاکاری کا خیال آئے تو استغفار کر لو۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۲۲۲]

ملامت کے خوف سے کسی نیک کام کی تاویل یا حجت کی ضرورت نہیں

مثلاً کسی شخص نے سنت کا کوئی کام کیا، لیکن وہ سنت کا کام ایسا ہے جس کو لوگ اچھا نہیں سمجھتے، جیسے کسی نے داڑھی رکھ لی، اور لوگ اس کو پسند نہیں کرتے، اب یہ شخص اس کی تاویل کرتا پھر رہا ہے تا کہ لوگ اس کو ملامت نہ کریں اور اس کی برائی نہ کریں، یاد رکھیے! اس کی چنداں ضرورت نہیں، اس لیے کہ جب اللہ تعالیٰ

کو راضی کرنے کے لیے ایک سنت کا کام کیا ہے اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم کی تعمیل میں یہ کام کیا ہے تو اب لوگ تمہیں اچھا سمجھیں یا برا سمجھیں، لوگ تمہیں اس کام پر ملامت کریں یا تمہاری تعریف کریں، ان سب سے بے نیاز ہو کر تم اپنا کام کیے جاؤ، اگر وہ ملامت کرتے ہیں تو کرنے دو، وہ ملامت ایک مسلمان کے گلے کا ہار ہے، وہ اس کے لیے زینت ہے، اگر کوئی شخص اتباع سنت کی وجہ سے تمہیں ملامت کر رہا ہے، دین پر چلنے اور اللہ کے حکم کی اتباع کی وجہ سے ملامت کر رہا ہے تو وہ ملامت قابل مبارک باد ہے، یہ انبیاء علیہم السلام کا ورثہ ہے جو تمہیں مل رہا ہے، اس سے مت گھبراؤ اور اس کی وجہ سے اپنی براءت ظاہر مت کرو۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۰،ص ۲۲۴]

گناہ کے ذریعے دوسروں کا دل خوش کرنا

دوسروں کا دل توڑنے سے بچنے کی خاطر اپنے دین اور فرائض کو چھوڑ دینا ٹھیک نہیں!

لوگوں میں جو یہ بات مشہور ہے کہ دل آزاری نہ ہونی چاہیے، تو بات یہ ہے کہ اگر محبت، پیار اور شفقت اور نرمی سے ذلیل کیے بغیر وہ کسی دوسرے شخص کو منع کر رہا ہے کہ یہ کام مت کرو، اس کے باوجود اس کا دل ٹوٹ رہا ہے تو ٹوٹا کرے، اس کے ٹوٹنے کی کوئی پرواہ نہ کرے، کیونکہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کا حکم دل ٹوٹنے سے بلند تر ہے، البتہ اتنا ضرور کرے کہ کہنے میں ایسا انداز اختیار نہ کرے جس سے دوسرے کا دل ٹوٹے، اور اس کی توہین نہ کرے، اور اس کو ذلیل نہ کرے، اور ایسے انداز سے نہ کہے جس سے وہ اپنی سبکی محسوس کرے، بلکہ تنہائی میں محبت سے شفقت سے اس کو سمجھا دے، اس کے باوجود اگر دل ٹوٹتا ہے تو اس کی پرواہ نہ کرے۔ [اصلاحی خطبات، ج۹،ص ۲۱۱]

اگر مجلس میں غیبت شروع ہوگئی تو اب کیا کیا جائے؟ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اگر منع کرنے پر قدرت ہے تو روک دے روکنے کے دو طریقے ہیں:

ایک طریقہ تو یہ ہے کہ صاف صاف کہہ دے کہ دیکھو! اس طرح تذکرہ کرنے سے غیبت ہو جائے گی، چھوڑ اس تذکرے کو، اور اگر اس طرح نہیں کہہ سکتے تو دوسرا طریقہ یہ ہے کہ خود موضوع کلام بدل دے اور کوئی اور بات چھیڑ دے تاکہ وہ قصہ ختم ہو جائے، اور اگر ان دونوں طریقوں پر قدرت نہ ہو تو پھر وہاں سے اٹھ جائے اس مجلس میں نہ بیٹھے۔

آگے ایک اصول بیان فرمادیا کہ اس کی دل شکنی کا خیال نہ کرے، کیونکہ دوسرے کی دل شکنی سے اپنی دین شکنی زیادہ قابل احتراز ہے، ہمارے ہاں افراط اور تفریط حد درجے کی ہے، ایک طرف تو یہ عالم ہے کہ حقوق العباد کی پرواہ ہی نہیں، جس کا جو حق چاہا مار لیا، چاہے وہ جانی حق ہو یا مالی حق ہو، اور دوسری طرف یہ ہے کہ اگر کسی کو حقوق العباد کا خیال ہے تو وہ اس درجہ اس کے اندر آگے بڑھ جاتا ہے کہ اس کے نتیجے میں اپنے

فرائض شرعیہ کے اندر کوتاہی کرنا شروع کر دیتا ہے، یہ سب افراط اور تفریط ہے، وجہ اس کی یہ ہے کہ دین کی صحیح فہم اور سمجھ نہیں، اسی لیے حضرت فرماتے ہیں کہ دوسرے کی دل شکنی سے بچنے کی خاطر اپنے دین کو توڑ دینا ٹھیک نہیں ہے، لہذا یہ خیال کرنا کہ میں اگر اس کو غیبت سے روکوں گا تو اس کا دل برا ہوگا، یا میں اٹھ کر چلا جاؤں گا تو اس کا دل برا ہوگا، یاد رکھیے! اگر معصیت سے بچنے کے نتیجے میں دوسرے کا دل برا ہوتا ہے تو ہونے دو، اس کی پرواہ ہی مت کرو، تم اس حد تک مکلف ہو کہ جائز حدود میں رہ کر اس کی دل شکنی سے بچو، لیکن جہاں دل شکنی سے بچنے کے لیے کسی گناہ کا ارتکاب کرنا پڑے تو پھر دل ٹوٹتا ہے تو ٹوٹنے دو، اس کی پرواہ نہ کرو۔

ایک حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جو شخص دوسرے کو دنیا کا فائدہ پہنچانے کے لیے اپنی آخرت خراب کرے تو اللہ تعالیٰ اس دوسرے شخص کو دنیا ہی میں اس پر مسلط کر دیتے ہیں کہ تو نے اس کی دنیا کی خاطر اپنی آخرت خراب کی تھی، اب یہ تیری دنیا کو بھی خراب کرے گا، جو لوگ بیوی بچوں کو آرام اور راحت پہنچانے کی خاطر حرام آمدنی میں مبتلا ہوتے ہیں تو تجربہ یہ ہے کہ وہی بچے اس باپ کے سر پر جوتے بجاتے ہیں، اس لیے کہ اس نے بیوی بچوں کو راضی کرنے کی خاطر اللہ تعالیٰ کو ناراض کیا، اور ان کی دنیا بنانے کے لیے اپنی آخرت خراب کی، تو پھر دنیا کے اندر ہی ان کو مسلط کر دیا جاتا ہے، اس لیے دوسرے کی دل شکنی سے بچنے کے لیے اپنی دین شکنی مت کرو۔

حقوق العباد باقی رہ جائیں تو؟

یہ تو اپنی جگہ درست ہے کہ حقوق اللہ توبہ سے معاف ہو جاتے ہیں، لیکن حقوق العباد اس وقت تک معاف نہیں ہوتے جب تک صاحب حق معاف نہ کرے، یا اس کو ادا نہ کرے، لیکن حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ فرماتے ہیں کہ ایک آدمی سے زندگی میں حقوق العباد ضائع ہوئے، اور بعد میں اللہ تعالیٰ نے اس کے دل میں ان حقوق کی ادائیگی کی فکر عطا فرمائی اور توبہ کی توفیق عطا فرمائی، جس کے نتیجے میں اس نے ان حقوق کی ادائیگی کی فکر شروع کر دی، اور اب لوگوں سے معلوم کر رہا ہے کہ میرے ذمے کس شخص کے کیا حقوق باقی رہ گئے ہیں، تا کہ میں ان کو ادا کر دوں، لیکن ابھی ان حقوق کی ادائیگی کی تکمیل نہیں کر پایا تھا کہ اس سے پہلے ہی اس کا انتقال ہو گیا، اب سوال یہ ہے کہ چونکہ اس نے حقوق کی ادائیگی مکمل نہیں کی تھی، اور معاف نہیں کرائے تھے، کیا آخرت کے عذاب سے اس کی نجات اور بچاؤ کی کوئی صورت نہیں ہے؟ حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس شخص کو بھی مایوس نہیں ہونا چاہیے، اس لیے کہ جب یہ شخص حقوق کی ادائیگی اور توبہ کے راستے پر چل پڑا تھا، اور کوشش بھی شروع کر دی تھی، تو ان شاء اللہ اس کوشش کی برکت سے آخرت میں اللہ تعالیٰ اس کے اصحاب حقوق کو راضی فرما دیں گے اور وہ اصحاب حقوق اپنا حق معاف فرما دیں گے، چنانچہ جب کسی انسان کے ذمے حقوق العباد ہوں اور وہ ان کی ادائیگی کی کوشش شروع کر دے اور اس فکر میں لگ جائے اور پھر درمیان میں موت آ جائے تو اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ وہ اصحاب حقوق کو قیامت کے دن راضی فرما دیں گے۔

[اصلاحی خطبات، ج٦، ص٦١]

عملیات و تعویذات

روحانی علاج کیا ہوتا ہے ؟

لوگوں نے یہ تعویذ گنڈے، یہ عملیات، یہ وظیفے اور جھاڑ پھونک ان کا نام ''روحانی علاج'' رکھ لیا ہے، حالانکہ یہ بڑے مغالطے اور دھوکے میں ڈالنے والا نام ہے، اس لیے کہ روحانی علاج تو دراصل انسان کے اخلاق کی اصلاح کا نام تھا، اس کے ظاہری اعمال کی اصلاح اور اس کے باطن کے اعمال کی اصلاح کا نام تھا، یہ اصل میں روحانی علاج تھا، مثلاً ایک شخص میں تکبر ہے، اب یہ تکبر کیسے زائل ہو؟ یا مثلاً حسد پیدا ہو گیا ہے وہ کیسے زائل ہو؟ یا مثلاً بغض پیدا ہو گیا ہے وہ کیسے زائل ہو؟ حقیقت میں اس کا نام ''روحانی علاج'' ہے، لیکن آج تعویذ گنڈے کے علاج کا نام روحانی علاج رکھ دیا ہے جو بڑے مغالطے والا عمل ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۵،ص۵۹]

کیا جھاڑ پھونک (دَم) کا عمل سنت سے ثابت ہے؟

ہمارے زمانے میں جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کے بارے میں لوگوں کے درمیان افراط و تفریط پائی جارہی ہے، بعض لوگ وہ ہیں جو سرے سے جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں کے بالکل ہی قائل نہیں، بلکہ وہ لوگ اس قسم کے تمام کاموں کو ناجائز سمجھتے ہیں، اور بعض لوگ تو اس کام کو شرک قرار دیتے ہیں، اور دوسری طرف بعض لوگ ان تعویذ گنڈوں کے اتنے زیادہ معتقد اور اس میں اتنے زیادہ منہمک ہیں کہ ان کو ہر کام کے لیے ایک تعویذ ہونا چاہیے، ایک وظیفہ ہونا چاہیے، ایک گنڈا ہونا چاہیے، میرے پاس روزانہ بے شمار لوگوں کے فون آتے ہیں کہ صاحب بچی کے رشتے نہیں آرہے ہیں، اس کے لیے کوئی وظیفہ بتادیں، روزگار نہیں مل رہا ہے، اس کے لیے وظیفہ بتادیں، میرا قرضہ ادا نہیں ہو رہا ہے، اس کے لیے کوئی وظیفہ بتادیں، دن رات لوگ بس اس فکر میں رہتے ہیں کہ سارا کام ان وظیفوں سے اور ان تعویذ گنڈوں سے ہو جائے، ہمیں ہاتھ پاؤں ہلانے کی ضرورت نہ پڑے۔

یہ دونوں باتیں افراط و تفریط کے اندر داخل ہیں، اور شریعت نے جو راستہ بتایا ہے وہ ان

دونوں انتہاؤں کے درمیان ہے، جو قرآن وسنت سے سمجھ میں آتا ہے، یہ سمجھنا بھی غلط ہے کہ جھاڑ پھونک کی کوئی حیثیت نہیں، اور تعویذ کرنا، ناجائز ہے، اس لیے کہ اگرچہ ایک روایت میں ان لوگوں کی فضیلت بیان کی گئی ہے جو جھاڑ پھونک نہیں کرتے، لیکن خوب سمجھ لیجیے! کہ اس سے ہر قسم کی جھاڑ پھونک مراد نہیں، بلکہ اس حدیث میں زمانہ جاہلیت میں جھاڑ پھونک کا جو طریقہ تھا، اس کی طرف اشارہ ہے، زمانہ جاہلیت میں عجیب وغریب قسم کے منتر لوگوں کو یاد ہوتے تھے اور یہ مشہور تھا کہ یہ منتر پڑھو تو اس سے فلاں بیماری سے افاقہ ہوجائے، فلاں منتر پڑھو تو اس سے فلاں کام ہوجائے گا وغیرہ، اور ان منتروں میں اکثر وبیشتر جنات اور شیاطین سے مدد مانگی جاتی تھی، کسی میں بتوں سے مدد مانگی جاتی تھی، بہرحال ان منتروں میں ایک خرابی تو یہ تھی کہ ان میں غیر اللہ سے اور بتوں سے اور شیاطین سے مدد مانگی جاتی تھی کہ تم ہمارا یہ کام کردو، اسی طرح ان منتروں میں مشرکانہ الفاظ ہوتے تھے۔

دوسری خرابی یہ تھی کہ اہل عرب ان الفاظ کو بذات خود مؤثر مانتے تھے، یعنی ان کا یہ عقیدہ نہیں تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ تاثیر دے گا تو ان میں تاثیر ہوگی، اور اللہ تعالیٰ کی تاثیر کے بغیر تاثیر نہیں ہوگی، بلکہ ان کا عقیدہ یہ تھا کہ ان الفاظ میں بذات خود تاثیر ہے، اور جو شخص یہ الفاظ بولے اس کو شفا ہوجائے گی، یہ دو خرابیاں تو تھیں ہی، اس کے علاوہ بسا اوقات وہ الفاظ ایسے ہوتے تھے کہ ان کے معنی ہی سمجھ میں نہیں آتے تھے، بالکل مہمل قسم کے الفاظ ہوتے تھے، جن کے کوئی معنی نہیں ہوتے تھے، وہ الفاظ بولے بھی جاتے تھے، اور ان الفاظ کو تعویذ کے اندر لکھا بھی جاتا تھا، درحقیقت ان الفاظ میں بھی اللہ کے سوا شیاطین اور جنات سے مدد مانگی جاتی تھی، ظاہر ہے کہ یہ سب شرک کی باتیں تھیں، اس لیے نبی کریم ﷺ نے جاہلیت کے جھاڑ پھونک کے طریقے کو منع فرمادیا اور یہ فرمایا کہ جو لوگ اس قسم کے جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈوں میں مبتلا نہیں ہوتے، یہ وہ لوگ ہوں گے جن کو اللہ تعالیٰ بلاحساب وکتاب جنت میں داخل فرمائیں گے، لہٰذا اس حدیث میں جس جھاڑ پھونک کا ذکر ہے اس سے وہ جھاڑ پھونک مراد ہے جس کا زمانہ جاہلیت میں رواج تھا۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۵، ص۳۸]

بہرحال یہ طریقہ جو زمانہ جاہلیت میں رائج تھا نبی کریم ﷺ نے اس کو منع فرمایا کہ اگر اللہ پر ایمان ہے، اگر اللہ تعالیٰ کی قدرت پر ایمان ہے تو پھر یہ شرکیہ کلمات کہہ کر اور فضول مہمل کلمات ادا کر کے شیاطین کے ذریعہ کام کرانا شریعت میں ناجائز اور حرام ہے، اور کسی مسلمان کا یہ کام نہیں ہے۔

لیکن ساتھ ہی رسول کریم ﷺ نے اس قسم کے منتروں کے بجائے اور شرکیہ کلمات کے بجائے آپ نے خود اللہ جل شانہ کے نام مبارک سے جھاڑ پھونک کیا اور صحابہ کرام کو یہ طریقہ سکھایا، چنانچہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ جب کوئی شخص بیمار ہوجائے تو یہ کلمات کہو:

اللهم ربنا أذهب البأس واشف أنت الشافي لا شفاء إلا شفاءك شفاءا لا يغادر سقما [ابو داود، كتاب الطب، باب في التمائم]

اور: أسئل الله العظيم رب العرش الكريم أن يشفيك

کہہ کر دم کر دیا، اور اس طرح کے کچھ ذکر ہیں ان کو پڑھ کر دم کرنا تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، ان دعاؤں کا ترجمہ یہ ہے کہ اللہ جو سارے انسانوں کا پروردگار ہے یہ بیماری دور فرما، "انت الشافی" آپ ہی شفا دینے والے ہیں، "لا شفاء إلا شفائك" آپ کے سوا کوئی شفا نہیں دے سکتا، "شفاءا لا یغادر سقما" ایسی شفا دے دیجیے جس کے بعد کوئی بیماری باقی نہ رہے، یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے ،"أسئل الله العظيم رب العرش العظيم أن يشفيك" میں اس عظمت والے اللہ سے سوال کرتا ہوں جو سارے عرش کا مالک ہے کہ وہ آپ کو شفا دے دے، اور بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کلمات سکھا کر فرمایا کہ ان کلمات کو پڑھ کر تھوکو اور اس کے ذریعہ جھاڑو، آپ نے خود بھی اس پر عمل فرمایا اور صحابہ کرام کو اس کی تلقین بھی فرمائی۔ یہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بہت سی چیزوں کے لیے جھاڑ تو کی ہے، دم تو کیا ہے، لیکن تعویذ لکھ کر کسی کو نہیں دیا، نہ کسی صحابی سے کہا کہ تم اس کو لکھ کر دے دو۔

حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا روزانہ کا معمول تھا کہ رات کو سونے سے پہلے معوذتین پڑھتے اور بعض روایات میں "قل يا أيها الكافرون" کا بھی اضافہ ہے، یعنی "قل يا أيها الكافرون " اور "قل أعوذ برب الفلق" اور "قل أعوذ برب الناس" ان تینوں سورتوں کو تین تین مرتبہ پڑھتے، اور پھر اپنے دونوں ہاتھوں پر پھونک مارتے، اور پھر پورے جسم پر ہاتھ پھیرتے، یہ جھاڑ پھونک خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمائی، اور آپ نے یہ بھی فرمایا کہ اس عمل کے ذریعہ شیطانی اثرات سے حفاظت رہتی ہے، سحر سے اور فضول حملوں سے انسان محفوظ رہتا ہے۔

ایک اور حدیث میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم مرض وفات میں تھے اور صاحب فراش تھے اور اتنے کمزور ہو گئے تھے کہ اپنا دست مبارک پوری طرح اٹھانے پر قادر نہیں تھے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ مجھے خیال آیا کہ رات کا وقت ہے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم ساری عمر یہ عمل فرماتے رہے کہ معوذتین پڑھ کر اپنے ہاتھوں پر دم فرماتے تھے اور پھر ان ہاتھوں کو سارے جسم پر پھیرتے تھے، لیکن آج آپ کے اندر یہ طاقت نہیں کہ یہ عمل فرمائیں، چنانچہ میں نے خود معوذتین پڑھ کر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے دست مبارک پر دم کیا اور آپ ہی کے دست مبارک کو آپ کے جسم مبارک پھر پھیر دیا، اس لیے کہ اگر میں نے اپنے ہاتھوں کو آپ کے جسم مبارک پر پھیرتی تو اس کی اتنی تاثیر اور اتنا فائدہ نہ ہوتا جتنا فائدہ خود آپ کے دست مبارک پھیرنے سے ہوتا، اور بھی متعدد مواقع پر رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ تلقین فرمائی کہ اگر جھاڑ پھونک کرنی ہے تو اللہ کے کلام سے کرو، اور اللہ کے نام سے کرو، اس لیے کہ اللہ تعالی کے نام میں یقینا جو تاثیر ہے وہ شیاطین کے شرکیہ کلام میں کہاں ہو سکتی ہے، لہذا آپ نے اس کی اجازت عطا فرمائی۔

روایات میں حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کا ایک واقعہ آتا ہے کہ ایک مرتبہ صحابہ کرام کا ایک

قافلہ کہیں سفر پر جا رہا تھا، راستے میں ان کا زادِ راہ کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا، راستے میں غیر مسلموں کی ایک بستی پر اس قافلے کا گذر ہوا، انہوں نے جا کر بستی والوں سے کہا کہ ہم مسافر لوگ ہیں، اور کھانے پینے کا سامان ختم ہو گیا ہے، اگر تمہارے پاس کچھ کھانے پینے کا سامان ہو تو ہمیں دے دو، ان لوگوں نے شاید مسلمانوں سے تعصب اور مذہبی دشمنی کی بنیاد پر کھانا دینے سے انکار کر دیا کہ ہم تمہاری مہمانی نہیں کر سکتے، صحابہ کرام کے قافلے نے بستی کے باہر پڑاؤ ڈال دیا، رات کا وقت تھا، انہوں نے سوچا کہ رات یہاں پر گذار کر صبح کسی اور جگہ پر کھانا تلاش کریں گے۔

اللہ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس بستی کے سردار کو سانپ نے کاٹ لیا، اب بستی والوں نے سانپ کے کاٹنے کے جتنے علاج تھے وہ سب آزما لیے، لیکن اس کا زہر نہیں اترتا تھا، کسی نے ان سے کہا کہ سانپ کا زہر اتارنے کے لیے جھاڑ پھونک کی جاتی ہے، اگر جھاڑ پھونک جاننے والا ہو تو اس کو بلایا جائے تاکہ وہ آکر زہر اتارے، انہوں نے کہا کہ بستی میں تو جھاڑ پھونک کرنے والا کوئی نہیں ہے، کسی نے کہا کہ وہ قافلہ جو بستی کے باہر ٹھہرا ہوا ہے، وہ مولوی قسم کے لوگ معلوم ہوتے ہیں، ان کے پاس جا کر معلوم کرو، شاید ان میں سے کوئی شخص سانپ کی جھاڑ جانتا ہو، چنانچہ بستی کے لوگ حضرت ابو سعید خدری رضی اللہ عنہ کے پاس آئے اور پوچھا کہ کیا آپ میں کوئی شخص ہے جو سانپ کے ڈسے کو جھاڑ دے، بستی کے ایک شخص کو سانپ نے ڈس لیا ہے، حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا کہ ٹھیک ہے میں جھاڑ دوں گا، لیکن تم لوگ بہت بخیل ہو کہ ایک مسافر قافلہ آیا ہوا ہے، تم سے کہا کہ ان کے کھانے پینے کا انتظام کر دو، تم نے ان کے کھانے کا کوئی انتظام نہیں کیا، بستی والوں نے کہا کہ ہم بکریوں کا پورا گلہ آپ کو دے دیں گے، لیکن ہمارے آدمی کا تم علاج کر دو۔

چنانچہ حضرت ابو سعید خدریؓ خود اپنا واقعہ سناتے ہیں کہ مجھے جھاڑ پھونک تو کچھ نہیں آتا تھا، لیکن میں نے سوچا کہ اللہ تعالیٰ کے کلام میں یقیناً برکت ہوگی، اس لیے میں ان لوگوں کے ساتھ بستی میں گیا، اور وہاں جا کر سورہ فاتحہ پڑھ کر دم کرتا رہا، سورہ فاتحہ پڑھتا اور دم کرتا، اللہ تعالیٰ کا کرنا ایسا ہوا کہ اس کا زہر اتر گیا، اب وہ لوگ بہت خوش ہوئے اور بکریوں کا ایک گلہ ہمیں دے دیا، ہم نے بکریوں کا گلہ ان سے لے تو لیا، لیکن بعد میں خیال آیا کہ ہمارے لیے ایسا کرنا جائز بھی ہے یا نہیں؟ اور یہ بکریاں ہمارے لیے حلال بھی ہیں یا نہیں؟ لہٰذا جب تک حضور اقدس ﷺ سے نہ پوچھ لیں، اس وقت تک ان کو استعمال نہیں کریں گے

[بخاریؒ، کتب الطب، باب النفث فی الرقیۃ]

چنانچہ حضرت ابو سعید خدریؓ حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو سارا واقعہ سنایا اور پوچھا کہ یا رسول اللہ! اس طرح بکریوں کا گلہ ہمیں حاصل ہوا ہے، ہم اس کو رکھیں یا نہ رکھیں؟ حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ تمہارے لیے اس کو رکھنا جائز ہے، لیکن یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ سانپ کے کاٹنے کا یہ علاج ہے؟ حضرت ابو سعید خدریؓ نے فرمایا کہ یا رسول اللہ! میں نے سوچا کہ بے ہودہ قسم کے کلام میں

تاثیر ہو سکتی ہے تو اللہ کے کلام میں بطریق اولی تاثیر ہوگی، اس وجہ سے میں سورہ فاتحہ پڑھتا رہا اور دم کرتا رہا، اللہ تعالی نے اس سے فائدہ پہنچا دیا، سرکار دو عالم ﷺ ان کے اس عمل سے خوش ہوئے اور ان کی تائید فرمائی اور بکریوں کا گلہ رکھنے کی بھی اجازت عطا فرمائی، اب دیکھیے! اس واقعے میں حضور اکرم ﷺ نے جھاڑ پھونک کی نہ صرف تائید فرمائی، بلکہ اس عمل کے نتیجے میں بکریوں کا جو گلہ بطور انعام کے ملا تھا، اس کو رکھنے کی اجازت عطا فرمائی، اس قسم کے بے شمار واقعات ہیں کہ رسول کریم ﷺ نے خود بھی عمل فرمایا اور صحابہ کرام سے بھی کرایا، یہ تو جھاڑ پھونک کا قضیہ ہوا۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۵، ص ۴۳]

کیا تعویذ لٹکانا شرک ہے؟

تعویذ گنڈوں کی شرعی حیثیت

اب تعویذ کی طرف آیے! تعویذ کاغذ پر لکھے جاتے ہیں اور ان کو کبھی پیا جاتا ہے، اور کبھی گلے اور بازو میں باندھا جاتا ہے، کبھی جسم کے کسی اور حصے پر استعمال کیا جاتا ہے، خوب سمجھ لیں! کہ رسول اللہ ﷺ سے تو یہ ثابت نہیں کہ آپ نے کوئی تعویذ لکھا ہو، لیکن صحابہ کرام سے تعویذ لکھنا ثابت ہے، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کی روایت ہے کہ حضور اکرم ﷺ نے بہت سے صحابہ کرام کو یہ کلمات سکھائے تھے کہ:

أعوذ بكلمات الله التامات من شر ما خلق ، فالله خير حافظا وهو أرحم الراحمين

چنانچہ حضرت عبد اللہ بن سلامؓ جو یہودی سے مسلمان ہوئے تھے اور یہودی ان کے دشمن تھے، اور ان کے خلاف جادو وغیرہ کرتے رہتے تھے، تو حضور اقدس ﷺ نے ان کو یہ کلمات سکھاتے ہوئے فرمایا تھا کہ تم یہ کلمات خود پڑھا کرو اور اپنے اوپر اس کا دم کر لیا کرو، پھر ان شاء اللہ کوئی جادو تم پر اثر نہیں کرے گا، چنانچہ وہ یہ کلمات پڑھا کرتے تھے۔

اور حضور اقدس ﷺ نے یہ بھی فرمایا تھا کہ اگر رات کو سوتے ہوئے کسی کی آنکھ گھبراہٹ سے کھل جائے اور اس کو خوف محسوس ہو تو اس وقت یہ کلمات پڑھ لے، چنانچہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ میں نے اپنی بڑی اولاد کو تو یہ کلمات سکھا دیے ہیں اور یاد کرا دیے ہیں، تاکہ اس کو پڑھ کر وہ اپنے اوپر دم کرتے رہا کریں، اور اس کے نتیجے میں وہ اللہ تعالی کی حفاظت میں رہیں، اور جو میرے چھوٹے بچے ہیں وہ یہ کلمات خود سے نہیں پڑھ سکتے، ان کے لیے میں نے یہ کلمات کاغذ پر لکھ کر ان کے گلے میں ڈال دیے ہیں، یہ حضرت عبد اللہ بن عمرؓ کا اثر ہے اور ثابت ہے، اور حضرت عبد اللہ بن عباسؓ سے منقول ہے کہ اگر کسی عورت کی ولادت کا وقت ہو، تو ولادت میں سہولت پیدا کرنے کے لیے تشتری یا صاف برتن میں یہ کلمات لکھ کر اس کو دھو کر اس خاتون کو پلا دیا جائے تو اللہ تعالی اس کی برکت سے ولادت میں سہولت فرما دیتے ہیں، اسی طرح بہت سے

صحابہ اور تابعین سے منقول ہے کہ وہ لکھ کر لوگوں کو تعویذ دیا کرتے تھے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ تعویذ لٹکانا شرک ہے اور گناہ ہے، اس کی وجہ ایک حدیث ہے جس کا مطلب لوگ صحیح نہیں سمجھتے، اس کے نتیجے میں وہ تعویذ لٹکانے کو ناجائز سمجھتے ہیں، چنانچہ حدیث شریف میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: "إن الرقى والتمائم والتولة شرك"

[ابو داود، کتاب الطب، باب فی التمائم]

"تمائم" تميمة کی جمع ہے اور عربی زبان میں "تميمة" کے جو معنی ہیں اردو میں اس کے لیے کوئی لفظ نہیں تھا، اس لیے لوگوں نے غلطی سے اس کے معنی "تعویذ" سے کر دیے، اس کے نتیجے میں اس حدیث کے معنی یہ ہوئے کہ "تعویذ شرک ہے"، اب لوگوں نے اس بات کو پکڑ لیا کہ ہر قسم کا تعویذ شرک ہے، حالانکہ یہ بات صحیح نہیں، "تميمة" عربی زبان میں سیپ کی ان کوڑیوں کو کہا جاتا ہے جن کو زمانہ جاہلیت میں لوگ دھاگے میں پرو کر بچوں کے گلے میں ڈال دیا کرتے تھے اور ان کوڑیوں پر مشرکانہ منتر پڑھے جاتے تھے، اور دوسری طرف یہ کہ ان کوڑیوں کو بذات خود موثر سمجھا جاتا تھا، یہ ایک مشرکانہ عمل تھا، جس کو "تميمة" کہا جاتا تھا، اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی ممانعت فرمائی کہ "تمائم" شرک ہے۔

چنانچہ جو لوگ زبان سے خود نہیں پڑھ سکتے ان کے لیے بعض صحابہ کرام نے یہ کیا کہ ان کو تو زبان سے یاد نہیں رہے گا کہ یہ پڑھے اور اپنے اوپر دم کرے، لاؤ اس کو لکھ کر دے دیں تو یہ باندھ لے، اپنے بازو پر باندھ لے، یا گلے میں ڈال لے، یہ بعض صحابہ سے منقول ہے لہذا وہ ناجائز نہیں ہے، کوئی قرآنی آیات کا تعویذ گلے میں ڈال لے تو ناجائز نہیں ہے، لیکن یہ بھی سمجھ لیں کہ وہی تعویذ جائز ہے جس میں یا تو قرآن کریم کی آیات ہوں یا اس میں کوئی دعا ہو، ذکر ہو، اس کے معنی سمجھ میں آتے ہوں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۵، ص ۴۹]

تعویذ کی ابتدا کس طرح ہوئی؟

یہ تعویذ نہ قرآن میں آئے اور نہ حدیث میں آئے لیکن پیدا اسی لیے ہوئے کہ کسی بزرگ نے کوئی بات، کوئی کلمہ لکھ کر دے دیا، اللہ تعالی نے اس میں تاثیر پیدا کر دی، فائدہ ہو گیا تو لوگوں نے کہا کہ یہ فلاں چیز کا تعویذ ہو گیا، یہ بخار کا تعویذ ہے، یہ سر کے درد کا تعویذ ہے، اس طرح تعویذ پیدا ہو گئے، لیکن اصل بات یہ ہے کہ جب کبھی انسان کو کوئی حاجت کوئی مشکل کوئی پریشانی آئے تو جو طریقہ قرآن نے بتایا اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتایا اس کی طرف زیادہ توجہ دو اور اس کو زیادہ اہم سمجھو، اس کو زیادہ موثر سمجھو، اور دوسری چیزوں کو اس کے مقابلے میں کم تر سمجھو، اب الٹا سمجھ لینا کہ تعویذ کو دعا سے افضل سمجھ لینا کہ ہر چیز کا ایک تعویذ ہوتا ہے تو یہ خیال ایک غلط خیال ہے اور یہ قرآن و سنت کو صحیح مرتبہ نہ دینے کے مترادف ہے، میں کہتا ہوں اس سے زیادہ موثر نہ تعویذ ہے، نہ گنڈا ہے، نہ کوئی اور جھاڑ پھونک ہے، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا ہے اس کو یاد کر لو، نماز

حاجت اور اس کے بعد کی جو دعا ہے، اس دعا کو یاد کر کے ہر مقصد اللہ تبارک وتعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کرنا چاہیے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہمیں اس پر عمل کرنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۸، ص ۲۸۳]

جھاڑ پھونک (دَم) کا عمل تعویذ سے زیادہ مؤثر اور مفید ہے !

لیکن ایک بات یاد رکھنی چاہیے جو حکیم الامت حضرت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ نے فرمائی ہے اور احادیث سے یقیناً وہی بات ثابت ہوتی ہے، وہ یہ کہ تعویذ کا فائدہ ثانوی درجہ کا ہے، اصل فائدے کی چیز ''جھاڑ پھونک'' ہے جو براہ راست رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہے، یہ عمل آپ نے خود فرمایا اور صحابہ کرام کو اس کی تلقین فرمائی، اس عمل میں زیادہ تاثیر اور زیادہ برکت ہے اور تعویذ اس جگہ استعمال کیا جائے جہاں آدمی وہ کلمات خود نہ پڑھ سکتا ہو، اور نہ دوسرا شخص پڑھ کر دم کر سکتا ہو، اس موقع پر تعویذ دے دیا جائے، ورنہ اصل تاثیر ''جھاڑ پھونک'' میں ہے، بہرحال صحابہ کرام سے دونوں طریقے ثابت ہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۵، ص ۵۰]

تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کی شرائط

جہاں تک اللہ تعالیٰ کے نام کے ذریعہ جھاڑ پھونک کا تعلق ہے وہ خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اور آپ کے صحابہ سے ثابت ہے، اس لیے وہ ٹھیک ہے لیکن اس کے جواز کے لیے چند شرائط انتہائی ضروری ہیں، ان کے بغیر یہ عمل جائز نہیں۔

پہلی شرط یہ ہے کہ جو کلمات پڑھے جائیں، ان میں کوئی کلمہ ایسا نہ ہو جس میں اللہ تعالیٰ کے سوا کسی اور سے مدد مانگی گئی ہو، اس لیے کہ بعض اوقات ان میں "یا فلان" کے الفاظ ہوتے ہیں، اور اس جگہ پر اللہ کے علاوہ کسی اور کا نام ہوتا ہے، ایسا تعویذ، ایسا گنڈا، ایسی جھاڑ پھونک حرام ہے جس میں غیر اللہ سے مدد لی گئی ہو۔

دوسری شرط یہ ہے کہ اگر جھاڑ پھونک کے الفاظ یا تعویذ میں لکھے ہوئے الفاظ ایسے ہیں جن کے معنی ہی معلوم نہیں کہ کیا معنی ہیں؟ ایسا تعویذ استعمال کرنا بھی ناجائز ہے، اس لیے کہ ہو سکتا ہے کہ وہ کوئی مشرکانہ کلمہ ہو اور اس میں غیر اللہ سے مدد مانگی گئی ہو، یا اس میں شیطان سے خطاب ہو، اس لیے ایسے تعویذ بالکل ممنوع اور ناجائز ہیں۔

ایسے تعویذ جس میں ایسی بات لکھی ہوئی ہو جس کا مطلب ہی سمجھ میں نہیں آتا، ایسا تعویذ حرام ہے، اگر اس میں کوئی ایسی عبارت لکھی ہوئی ہے، ایسی بات لکھی ہوئی ہے، جس کا مطلب ہی سمجھ میں نہیں آرہا تو ایسا تعویذ استعمال کرنا ناجائز ہے، بعض تعویذ ایسے ہوتے ہیں جس میں غیر اللہ سے مدد مانگی جاتی ہے، وہ چاہے نبی

ہو، چاہے ولی ہو، اور چاہے کتنا بڑا بزرگ ہو، اللہ کے سوا کسی سے مراد نہیں مانگی جاتی اور وہ شرک کے قریب انسان کو پہنچا دیتی ہے، ایسے تعویذ بالکل حرام ہیں اور انسان کو شرک کے قریب پہنچا دیتے ہیں، اسی لیے فقہا کرام نے فرمایا کہ تعویذ میں اگر کوئی ایسی بات لکھی ہوئی ہے جو ہم اور آپ سمجھتے نہیں ہیں تو کیا پتہ اس میں کوئی غیر اللہ سے مدد مانگ لی گئی ہو، کوئی شرک کا کلمہ اس کے اندر موجود ہو، اس واسطے ایسا تعویذ استعمال کرنا بالکل جائز نہیں ہے، لیکن اگر قرآن کریم کی آیات ہیں ان کو بھی ادب کے ساتھ استعمال کیا جائے یا کوئی ذکر ہے اللہ تبارک وتعالیٰ کا، یا کوئی دعا ہے جو تعویذ میں لکھ دی گئی تھی تو وہ جائز ہے، لیکن اس میں کوئی ثواب نہیں۔

بہر حال تعویذ اور جھاڑ پھونک کی یہ شرعی حقیقت ہے، لیکن اس معاملے میں افراط وتفریط ہو رہی ہے، ایک طرف تو وہ لوگ ہیں جو اس عمل کو حرام اور ناجائز کہتے ہیں ان کی تفصیل تو عرض کر دی۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۵، ص۵۲]

کیا مدارس میں تعویذ گنڈے سکھائے جاتے ہیں؟

دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو یہ سمجھتے ہیں کہ بس سارا دین ان تعویذ گنڈوں کے اندر منحصر ہے، اور جو شخص تعویذ گنڈا کرتا ہے وہ بہت بڑا عالم ہے، وہ بہت بڑا نیک آدمی ہے، متقی اور پرہیز گار ہے، اسی کی تقلید کرنی چاہیے، اس کا معتقد ہونا چاہیے، اور جو شخص تعویذ گنڈا نہیں کرتا یا جس کو تعویذ گنڈا کرنا نہیں آتا اس کے بارے میں یہ سمجھتے ہیں کہ اس کو دین کا علم ہی نہیں، بہت سے لوگ میری طرف رجوع کرتے ہیں کہ فلاں مقصد کے لیے تعویذ دے دیجیے، میں ان سے جب کہتا ہوں کہ مجھے تو تعویذ دینا نہیں آتا تو وہ لوگ بہت حیران ہوتے ہیں، وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ جو اتنا بڑا دارالعلوم بنا ہوا ہے، اس میں تعویذ گنڈے ہی سکھائے جاتے ہیں، اور اس میں جو دروس ہوتے ہیں وہ سب تعویذ اور جھاڑ پھونک کے ہوتے ہیں، لہٰذا جس کو جھاڑ پھونک اور تعویذ گنڈا نہیں آتا، وہ یہاں پر اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں، اس لیے جو اصل کام یہاں پر سیکھنے کا تھا وہ تو اس نے سیکھا ہی نہیں!!!!۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۵، ص۵۴]

ہر کام اور ہر خواہش تعویذ گنڈے کے ذریعے پورا کروانے کی کوشش کرنا صحیح نہیں ہے

ان لوگوں نے سارا دین تعویذ گنڈے میں سمجھ لیا ہے، اور ان لوگوں کا خیال یہ ہے کہ دنیا کی کوئی غرض ایسی نہ ہو جس کا علاج کوئی تعویذ نہ ہو، چنانچہ ان کو ہر کام کے لیے ایک تعویذ چاہیے، فلاں کام نہیں ہو رہا ہے، اس کے لیے کیا وظیفہ پڑھوں؟ فلاں کام کے لیے ایک تعویذ دے دیں، لیکن ہمارے اکابر نے اعتدال کو ملحوظ رکھا کہ جس حد تک حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے عمل کیا، اس حد تک ان پر عمل کریں، یہ نہیں کہ دن رات آدمی یہی کام کرتا رہے، اور دین ودنیا کا ہر کام تعویذ گنڈے کے ذریعہ کرے، یہ بات غلط ہے، اگر یہ عمل درست

ہوتا تو پھر سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو جہاد کرنے کی کیا ضرورت تھی، بس کافروں پر کوئی ایسی جھاڑ پھونک کرتے کہ وہ سب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قدموں میں آکر ڈھیر ہو جاتے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس جھاڑ پھونک پر کبھی کبھی عمل بھی کیا ہے، لیکن اتنا غلو اور انہماک بھی نہیں کیا کہ ہر کام کے لیے تعویذ گنڈے کو استعمال فرماتے۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۵، ص۵۵]

آج کل یہ صورت حال ہوگئی ہے کہ ہر وقت آدمی اسی جھاڑ پھونک کے دھندے میں لگا رہتا ہے، ہر وقت اسی تعویذ گنڈے کے چکر میں لگا رہتا ہے کہ صبح سے شام تک جو بھی کام ہو وہ تعویذ کے ذریعہ ہو، فلاں کام کا الگ تعویذ ہونا چاہیے، ملازمت کا الگ تعویذ ہونا چاہیے، بیماری کا الگ تعویذ ہونا چاہیے، ہر چیز کا الگ تعویذ ہونا چاہیے، ہر چیز کی ایک الگ دعا ہونی چاہیے، تعویذ گنڈے میں اتنا انہماک اور غلو سنت کے خلاف ہے، آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کبھی کبھی جھاڑ پھونک کی ہے، لیکن یہ نہیں تھا کہ دنیا کے ہر کام کے لیے جھاڑ پھونک کر رہے ہیں، کافروں کے ساتھ جہاد ہو رہے ہیں، لڑائی ہو رہی ہے، کہیں یہ منقول نہیں کہ کفار کو زیر کرنے کے لیے آپ نے کوئی جھاڑ پھونک کی ہو۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۵، ص۵۷]

تعویذ گنڈے اور جھاڑ پھونک کرنا نہ عبادت ہے اور نہ اس پر ثواب

یاد رکھیے! تعویذ اور جھاڑ پھونک کے ذریعہ علاج جائز ہے، مگر یہ عبادت نہیں، قرآن کریم کی آیات کو اور قرآن کریم کی سورتوں کو اور اللہ تعالیٰ کے ناموں کو اپنے کسی دنیوی مقاصد کے لیے استعمال کرنا زیادہ سے زیادہ جائز ہے، لیکن یہ کام عبادت نہیں اور اس میں ثواب نہیں ہے، جیسے آپ کو بخار آیا، اور آپ نے دوا پی لی، تو یہ دوا پینا جائز ہے، لیکن دوا پینا عبادت نہیں، بلکہ ایک مباح کام ہے، اسی طرح تعویذ کرنا اور جھاڑ پھونک کرنا، اس تعویذ اور جھاڑ پھونک میں اگرچہ اللہ کا نام استعمال کیا، لیکن جب تم نے اس کو اپنے دنیوی مقصد کے لیے استعمال کیا تو اب یہ بذات خود ثواب اور عبادت نہیں، تلاوت کا ثواب اس وقت ملتا ہے جب خالص اللہ کے لیے پڑھے، اللہ کے لیے پڑھے تو تلاوت کرے گا تو ثواب ملے گا، لیکن اگر وہ کسی ذاتی مقصد کے لیے پڑھ رہا ہے تو جائز ہے، کوئی گناہ بھی نہیں ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۵، ص۵۸]

یہ جھاڑ پھونک اور یہ تعویذ کوئی عبادت نہیں، بلکہ علاج کا ایک طریقہ ہے، اس پر کوئی اجر وثواب مرتب نہیں ہوتا، یہی وجہ ہے کہ اس کی اجرت لینا دینا بھی جائز ہے، اگر یہ عبادت ہوتی تو اس پر اجرت لینا جائز نہ ہوتا، کیونکہ کسی عبادت پر اجرت لینا جائز نہیں، مثلاً کوئی شخص تلاوت کرے اور اس پر اجرت لے تو یہ حرام ہے، لیکن تعویذ پر اجرت لینا جائز ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۵، ص۴۲]

دُعا! تعویذ جھاڑ پھونک وغیرہ سے بدرجہا افضل اور بہتر ہے

ہاں! نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم دعا ضرور فرماتے تھے، اس لیے کہ سب سے بڑی اور اصل چیز دعا ہے، اگر براہ راست اللہ تعالیٰ سے مانگو، اور دو رکعت صلوۃ الحاجت پڑھ کر اللہ تعالیٰ سے دعا کرو کہ یا اللہ! اپنی رحمت سے میرا یہ مقصد پورا فرما دیجیے، یا اللہ! میری مشکل حل فرما دیجیے، یا اللہ! میری یہ پریشانی دور فرما دیجیے، تو اس دعا کرنے میں ثواب ہی ثواب ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت یہ ہے کہ جب کوئی حاجت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کرو، اور اگر دو رکعت صلوۃ الحاجت پڑھ کر دعا کرو تو زیادہ اچھا ہے، اس سے یہ ہوگا کہ جو مقصد ہے وہ اگر مفید ہے تو ان شاء اللہ حاصل ہوگا، اور ثواب تو ہر حال میں ملے گا، اس لیے کہ دعا کرنا چاہے دنیا کی غرض سے ہو وہ ثواب کا موجب ہے، اس لیے کہ دعا کے بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا :"الدعاء ھو العبادۃ" یعنی دعا بذات خود عبادت ہے۔

لہذا اگر کسی شخص کو ساری عمر جھاڑ پھونک کا طریقہ نہ آئے، تعویذ لکھنے کا طریقہ نہ آئے، لیکن وہ براہ راست اللہ تعالیٰ سے دعا کرے تو یقیناً اس کا یہ عمل اس تعویذ اور جھاڑ پھونک سے بدرجہا افضل اور بہتر ہے، لہذا ہر وقت تعویذ گنڈے میں لگے رہنا یہ عمل سنت کے مطابق نہیں، جو بات نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام سے جس حد تک ثابت ہے اس کو اسی حد پر رکھنا چاہیے، اس سے آگے نہیں بڑھنا چاہیے، اگر کبھی ضرورت پیش آئے تو اللہ تعالیٰ کا نام لے کر جھاڑ پھونک کرنے میں کوئی حرج نہیں، لیکن ہر وقت اس کے اندر انہماک اور غلو کرنا اور اس کو اپنا مشغلہ بنالینا کسی طرح بھی درست نہیں، بس تعویذ گنڈوں کی یہ حقیقت ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۵، ص۵۸]

خواب اور تعبیر

خواب اور اس کی تعبیر

ہمارے ہاں خواب کے معاملے میں بڑی افراط وتفریط پائی جاتی ہے، بعض لوگ تو وہ ہیں جو سچے خوابوں کے قائل ہی نہیں، نہ خواب کے قائل، نہ خواب کی تعبیر کے قائل ہیں، یہ خیال غلط ہے، اس لیے کہ حدیث میں آیا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ سچے خواب نبوت کا چھیالیسواں حصہ ہیں اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سچے خواب مبشرات ہیں۔

اور دوسری طرف بعض لوگ وہ ہیں جو خوابوں ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور خواب ہی کو مدار نجات اور فضیلت سمجھتے ہیں، اگر کسی نے اچھا خواب دیکھ لیا تو بس اس کے معتقد ہو گئے، اور اگر کسی نے اپنے بارے میں اچھا خواب دیکھ لیا تو وہ اپنا ہی معتقد ہو گیا کہ میں اب پہنچا ہوا بزرگ ہو گیا ہوں۔

[اصلاحی خطبات، ج۵، ص۹۰]

خواب میں نبی کریم ﷺ کی زیارت کی خواہش کرنا

الحمدللہ! اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے بہت سے لوگوں کو یہ سعادت عطا فرما دیتے ہیں اور انہیں خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہو جاتی ہے، یہ بڑی عظیم نعمت اور عظیم سعادت ہے، لیکن اس معاملے میں ہمارے بزرگوں کے ذوق مختلف رہے ہیں، ایک ذوق تو یہ ہے کہ اس سعادت کے حصول کی کوشش کی جاتی ہے اور ایسے عمل کیے جاتے ہیں جس سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہو جائے اور بزرگوں نے ایسے خاص عمل لکھے ہیں، مثلاً یہ کہ جمعہ کی شب میں اتنی مرتبہ درود شریف پڑھنے کے بعد فلاں عمل کر کے سوئیں تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زیارت ہونے کی توقع اور امید ہوتی ہے، اس قسم کے بہت سے اعمال مشہور ہیں، بعض حضرات کا ذوق اور مذاق یہ ہے، اب اگر کوئی شخص اس ذوق کے پیش نظر خواب میں زیارت کی کوشش کرنا چاہے تو کر لے اور اس سعادت سے سرفراز ہو جائے۔

لیکن دوسرے بعض حضرات کا ذوق کچھ اور ہے، مثلاً میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ کے پاس ایک

صاحب آیا کرتے تھے، ایک مرتبہ آکر کہنے لگے کہ طبیعت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کا بہت شوق ہو رہا ہے، کوئی ایسا عمل دیجیے جس کے نتیجے میں یہ نعمت حاصل ہو جائے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت خواب میں ہو جائے، حضرت والد صاحبؒ نے فرمایا کہ بھائی! تم بڑے حوصلے والے آدمی ہو کہ تم اس بات کی تمنا کرتے ہو کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو جائے، ہمیں یہ حوصلہ نہیں ہوتا کہ یہ تمنا بھی کریں، اس لیے کہ ہم کہاں؟ اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کہاں؟ اس لیے کبھی اس قسم کے عمل سیکھنے کی نوبت ہی نہیں آئی، اور نہ کبھی یہ سوچا کہ ایسے عمل سیکھے جائیں، جن کی وجہ سے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو جائے، اس لیے کہ اگر زیارت ہو جائے تو ہم اس کے آداب، اس کے حقوق، اس کے تقاضے کس طرح پورے کریں گے؟ اس لیے خود سے اس کے حصول کی کوشش نہیں کی، البتہ اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے خود ہی زیارت کرا دیں تو یہ ان کا انعام ہے اور جب خود کرائیں گے تو پھر اس کے آداب کی بھی توفیق بخشیں گے، لیکن خود سے ہمت نہیں ہوتی، البتہ جس طرح ایک مومن کے دل میں آرزو ہوتی ہے اس طرح کی آرزو دل میں ہے، لیکن زیارت کی کوشش کرنا بڑی ہمت اور حوصلہ والوں کا کام ہے، مجھے تو حوصلہ نہیں ہوتا، بہر حال اس سلسلے میں ذوق مختلف ہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج۵، ص۹۴]

خواب میں حضور ﷺ کا کسی بات کا حکم دینا

یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ اگر خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو گئی تو اس کا حکم یہ ہے کہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا فرمان ہے کہ جو کوئی مجھے خواب میں دیکھتا ہے تو مجھے ہی دیکھتا ہے، اس لیے کہ شیطان میری صورت میں نہیں آسکتا، لہٰذا اگر خواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہو اور وہ کوئی ایسا کام کرنے کو کہیں جو شریعت کے دائرے میں ہے، مثلاً فرض ہے یا واجب ہے، یا سنت ہے، یا مباح ہے تو پھر اس کو اہتمام سے کرنا چاہیے اس لیے جو کام شریعت کے دائرے میں ہے اس کے کرنے کا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم حکم فرما رہے ہیں تو وہ خواب سچا ہوگا، اس کام کا کرنا ہی اس کے حق میں مفید ہے اور اگر نہیں کرے گا تو بعض اوقات اس کے حق میں بے برکتی شدید ہو جاتی ہے۔

لیکن اگر خواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم ایسی بات کا حکم دیں جو شریعت کے دائرے میں نہیں ہے، مثلاً خواب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت ہوئی اور ایسا محسوس ہوا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ایسی بات کا حکم فرمایا جو شریعت کے ظاہری احکام کے دائرے میں نہیں ہے تو خوب سمجھ لیجیے کہ اس خواب کی وجہ سے وہ کام کرنا جائز نہیں ہوگا، اس لیے کہ ہمارے دیکھے ہوئے خواب کی بات کو اللہ تعالیٰ نے مسائل شریعت میں حجت نہیں بنایا اور جو ارشادات حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے قابل اعتماد واسطوں سے ہم تک پہنچے ہیں وہ حجت ہیں، ان پر عمل کرنا ضروری ہے، خواب کی بات پر عمل کرنا ضروری نہیں، کیونکہ یہ بات تو صحیح ہے کہ شیطان حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صورت مبارکہ میں نہیں آسکتا، لیکن بسا اوقات خواب دیکھنے والے کے ذاتی خیالات اس خواب

کے ساتھ مل گڈ مڈ ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے اس کو غلط بات یاد رہ جاتی ہے، یا سمجھنے میں غلطی ہو جاتی ہے اس لیے ہمارے خواب حجت نہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۹۷]

کشف کیا ہوتا ہے؟

یہ خواب تو سونے کی حالت میں ہوتا ہے لیکن بعض اوقات اللہ تعالیٰ بیداری کی حالت میں کچھ چیزیں دکھاتے ہیں، جس کو ''کشف'' کہتے ہیں، چنانچہ اگر کسی کو کشف ہو گیا تو لوگ اسی کو سب کچھ سمجھ بیٹھے کہ یہ بہت بزرگ آدمی ہے، اب چاہے بیداری کے اندر اس کے حالات سنت کے مطابق نہ بھی ہوں۔

خوب سمجھ لیجیے کہ انسان کی فضیلت کا معیار خواب اور کشف نہیں، بلکہ اصل معیار یہ ہے کہ اس کی بیداری کی زندگی سنت کے مطابق ہے یا نہیں؟ بیداری کی حالت میں وہ گناہوں سے پرہیز کر رہا ہے یا نہیں؟ بیداری کی حالت میں وہ اللہ تعالیٰ کی اطاعت کر رہا ہے یا نہیں؟ اگر اطاعت نہیں کر رہا ہے تو پھر اس کو ہزار خواب نظر آئے ہوں، ہزار کشف ہوئے ہوں، ہزار کرامتیں اس کے ہاتھ پر صادر ہوئی ہوں وہ معیار فضیلت نہیں، آج کل اس معاملے میں بڑی سخت گمراہی پھیلی ہوئی ہے، پیری مریدی کے ساتھ اس کو لازم سمجھ لیا گیا ہے، ہر وقت لوگ خوابوں اور کشف و کرامات ہی کے پیچھے پڑے رہتے ہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۹۰]

کیا خواب اور کشف سے شرعی حکم بدل سکتا ہے؟

اگر ایک مرتبہ یہ اصول مان لیا جاتا کہ خواب اور کشف سے بھی شریعت بدل سکتی ہے تو پھر شریعت کا کوئی ٹھکانہ نہیں رہتا، ایک سے ایک خواب لوگ دیکھ لیتے اور آ کر بیان کر دیتے، آج آپ دیکھیں کہ یہ جتنے جاہل پیر ہیں جو بدعات میں مبتلا ہیں وہ انہی خوابوں کو سب کچھ سمجھتے ہیں، کوئی خواب دیکھ لیا یا کشف ہو گیا، الہام ہو گیا اور اس کی بنیاد پر شریعت کے خلاف عمل کر لیا، خواب تو خواب ہے، اگر کسی کو کشف ہو جائے جو جاگتے اور بیداری کی حالت میں ہوتا ہے، اس میں آواز آتی ہے اور وہ آواز کانوں کو سنائی دیتی ہے، لیکن اس کے باوجود کشف شریعت میں حجت نہیں، کوئی شخص کتنا ہی پہنچا ہوا عالم یا بزرگ ہو، اس نے اگر خواب دیکھ لیا، یا اس کو کشف یا الہام ہو گیا وہ بھی شرعی احکام کے مقابلے میں حجت نہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۹۹]

خواب کے ذریعے حدیث یا شرعی حکم کی تردید جائز نہیں

یہ راستہ بڑا خطرناک ہے، آج کل خاص طور پر جس طرح کا مذاق بنا ہوا ہے کہ لوگ خواب، کشف، کرامات اور الہامات کے پیچھے پڑے ہوئے ہیں، یہ دیکھے بغیر کہ شریعت کا تقاضہ کیا ہے؟ اچھے خاصے دیندار اور پڑھے لکھے لوگوں نے یہ دعویٰ کرنا شروع کر دیا کہ مجھے یہ کشف ہوا ہے کہ فلاں حدیث صحیح نہیں ہے اور صحیح بخاری اور صحیح مسلم کی فلاں حدیث یہودیوں کی گھڑی ہوئی ہے، اور مجھے یہ بات کشف کے ذریعہ معلوم

ہوئی ہے، اگراس طریقے سے کشف ہونے لگے تو دین کی بنیاد ہل جائیں، اللہ تعالی ان علماء کو غریق رحمت کرے، جن کو درحقیقت اللہ تعالی نے دین کا محافظ بنایا، یہ دین کے چوکیدار ہیں، لوگ ان پر ہزار لعنتیں ملامتیں کریں، لیکن اللہ تعالی نے ان کو دین کا محافظ اور نگہبان بنایا تا کہ کوئی دین پر حملہ نہ کر سکے اور دین میں تحریف نہ ہو، چنانچہ ان علماء نے صاف صاف کہہ دیا کہ چاہے خواب ہو یا کشف ہو یا کرامت ہو، ان میں سے کوئی چیز بھی دین میں حجت نہیں، وہ چیزیں حجت ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے بیداری کے عالم میں ثابت ہیں، کبھی خواب، کشف اور الہام اور کرامت کے دھوکے میں مت آنا، حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ صحیح کشف تو دیوانوں بلکہ کافروں کو بھی ہو جاتا ہے اس لیے کبھی اس دھوکے میں مت آنا کہ نور نظر آ گیا، یا دل چلنے لگا، یا دل دھڑکنے لگا وغیرہ، اس لیے کہ یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ شریعت میں ان چیزوں کا پر فضیلت کا کوئی مدار نہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۵،ص ۱۰۱]

اصلاح معاشرہ

دور حاضر میں اصلاح معاشرہ کی کوششیں بے اثر کیوں؟

بعض اوقات ہمارے اور آپ کے دلوں میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ آج ہم دنیا میں دیکھ رہے ہیں کہ اصلاح حال اور اصلاح معاشرہ کی نہ جانے کتنی کوششیں مختلف جہتوں اور مختلف گوشوں سے ہو رہی ہیں، کتنی انجمنیں، کتنی جماعتیں، کتنی پارٹیاں، کتنے افراد، کتنے جلسے، کتنے جلوس کتنے اجتماع ہوتے ہیں، اور سب کا مقصد بظاہر یہ ہے کہ معاشرہ میں پھیلی ہوئی برائیوں کا سدباب کیا جائے، معاشرے کو سیدھے راستے پر لایا جائے، اور انسان کو انسان بنانے کی فکر کی جائے، ہر ایک کے اغراض ومقاصد میں اصلاح حال، اصلاح معاشرہ، فلاح وبہبود جیسی بڑی بڑی باتیں درج ہوتی ہیں اور بڑے بڑے دعوے ہوتے ہیں، جو انجمنیں اور جماعتیں اس کام پر لگی ہوئی ہیں اور جو ایسے افراد اس کام میں مصروف ہیں اگر ان کو شمار کیا جائے تو شاید ہزاروں تک ان کی تعداد پہنچے گی، ہزاروں جماعتیں ہزاروں افراد اس کام پر لگے ہوئے ہیں۔

لیکن دوسری طرف اگر معاشرے کی عمومی حالت کو بازاروں میں نکل کر دیکھیں، دفتروں میں جا کر دیکھیں، جیتی جاگتی زندگی کو ذرا قریب سے دیکھنے کا موقع ملے تو یوں محسوس ہوتا ہے کہ وہ ساری کوششیں ایک طرف اور خرابی کا سیلاب ایک طرف، معاشرے پر اس اصلاح کا کوئی نمایاں اثر نظر نہیں آتا، بلکہ ایسا لگتا ہے کہ زندگی کا پہیہ اسی طرح غلط راستے پر گھوم رہا ہے، اگر ترقی ہو رہی ہے تو برائی میں ہو رہی ہے، اچھائی میں نہیں ہو رہی ہے، لیکن یہ سارا تذکرہ ہونے کے باوجود یہ نظر آتا ہے کہ پرنالہ وہیں گر رہا ہے اور حالات میں کوئی بہتری نظر نہیں آتی، بہت سی جماعتیں، انجمنیں اور ادارے اس مقصد کے تحت قائم ہیں کہ حالات کی اصلاح کریں، لیکن حالات جوں کے توں ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بے دینی کا جو سیلاب امڈ رہا ہے اس کی رفتار میں اضافہ ہو رہا ہے، اس میں کمی نہیں آ رہی ہے، کسی شاعر نے کہا تھا:

یہ کیسی منزل ہے کیسی راہیں
کہ تھک گئے پاؤں چلتے چلتے

مگر وہی فاصلہ ہے قائم
جو فاصلہ تھا سفر سے پہلے

تو ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ ساری کوششیں معاشرے کو بدلنے میں کیوں ناکام نظر آتی ہیں؟ اکادکا مثالیں اپنی جگہ ہیں، لیکن بحیثیت مجموعی اگر پورے معاشرے پر نظر ڈال کر دیکھا جائے تو کوئی بڑا فرق نظر نہیں آتا، اس کی کیا وجہ ہے؟ [اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۵۲]

ہم اصلاح کا آغاز دوسروں سے چاہتے ہیں اور اپنی اصلاح کی فکر نہیں کرتے

اس سوال کا جواب اللہ تعالیٰ نے اس آیت میں عطا فرمایا ہے، اور ہماری ایک بیماری کی تشخیص بھی فرمادی ہے، اور یہ وہ آیت ہے جو اکثر و بیشتر ہماری نگاہوں سے اوجھل رہتی ہے، اس کے معنی بھی معلوم نہیں ہیں، مفہوم بھی پیش نظر نہیں رہتا:

﴿يا أيها الذين امنوا عليكم أنفسكم لا يضركم من ضل إذا اهتديتم إلى الله مرجعكم جميعا فينبئكم بما كنتم تعملون﴾ [المائدة:۱۰۵]

اے ایمان والو! تم اپنے آپ کی خبر لو، اگر تم سیدھے راستے پر آگئے (تم نے ہدایت حاصل کر لی، صحیح راستہ اختیار کر لیا) تو جو لوگ گمراہ ہیں، ان کی گمراہی تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی، تم سب کو اللہ کی طرف لوٹنا ہے، وہاں پر اللہ تعالیٰ تمہیں بتائیں گے کہ تم دنیا کے اندر کیا کرتے رہے ہو۔

اس آیت میں ہماری ایک بہت بنیادی بیماری یہ بتادی کہ یہ اصلاح کی کوششیں جو ناکام نظر آتی ہیں، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہر شخص جب اصلاح کا جھنڈا لے کر کھڑا ہوتا ہے تو اس کی خواہش یہ ہوتی ہے کہ اصلاح کا آغاز دوسرا شخص اپنے آپ سے کرے، یہ خود دوسروں کو بلا رہا ہے، دوسروں کو دعوت دے رہا ہے، دوسروں کو اصلاح کا پیغام دے رہا ہے، لیکن اپنے آپ سے اور اپنے حالات میں تبدیلی لانے سے غافل ہوتا ہے، آج ہم سب اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھ لیں کہ مختلف محفلوں اور مجلسوں میں ہمارا طرز عمل یہ ہوتا ہے کہ ہم معاشرے کی برائیوں کا تذکرہ مزے لے لے کر کرتے ہیں، ''سب لوگ تو یوں کر رہے ہیں''، ''لوگوں کا تو یہ حال ہے''، ''معاشرہ تو اس درجے خراب ہو گیا ہے''، ''فلاں کو میں نے دیکھا وہ یوں کر رہا تھا''، سب سے آسان کام اس بگڑے ہوئے معاشرے میں یہ ہے کہ دوسروں پر انسان اعتراض کر دے، تنقید کر دے، دوسروں کے عیب بیان کر دے کہ لوگ تو یوں کر رہے ہیں، اور معاشرے کے اندر یہ ہو رہا ہے، شاید ہی ہماری کوئی محفل اور کوئی مجلس اس تذکرے سے خالی ہوتی ہو، لیکن کبھی اپنے گریبان میں منہ ڈال کر یہ دیکھنے کی توفیق نہیں ہوتی کہ خود میں کتنا بگڑ گیا ہوں، خود میرے حالات کتنے خراب ہیں، خود میرا طرز عمل کتنا

غلط ہے، اس کی کتنی اصلاح کی ضرورت ہے، بس دوسروں پر تنقید کا سلسلہ جاری رہتا ہے، دوسروں کی عیب جوئی جاری رہتی ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ساری گفتگو لطف سخن کے لیے مجلس آرائی کے لیے، مزہ لینے کے لیے ہو کر رہ جاتی ہے، اس کے نتیجہ میں اصلاح کی طرف کوئی قدم نہیں بڑھتا۔

ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا، کیا عجیب ارشاد ہے، ہم لوگوں کو یاد رکھنا چاہیے ،فرمایا کہ: من قال هلك الناس فهو أهلكهم [صحیح مسلم، کتاب البر والصلۃ]

جو شخص یہ کہے کہ ساری دنیا تباہ و برباد ہوگئی، یعنی دوسروں پر اعتراض کر رہا ہے کہ وہ بگڑ گئے، ان کے اندر بے دینی آگئی، ان کے اندر بے راہ روی آگئی، وہ بدعنوانیوں کا ارتکاب کرنے لگے) تو سب سے زیادہ برباد خود وہ شخص ہے۔

اس لیے کہ دوسروں پر اعتراض کی غرض سے یہ کہہ رہا ہے کہ وہ برباد ہو گئے، اگر اس کو واقعی بربادی کی فکر ہوتی تو پہلے اپنے گریبان میں منہ ڈالتا، اپنی اصلاح کی فکر کرتا۔ [اصلاحی خطبات، ج ۳، ص ۲۰۰]

اللہ جل جلالہ اس آیت کے اندر فرماتے ہیں کہ اے ایمان والو! پہلے اپنے آپ کی فکر کرو، اور یہ جو تم کہہ رہے ہو کہ فلاں شخص گمراہ ہو گیا، فلاں شخص تباہ و برباد ہو گیا، تو یاد رکھو کہ اگر تم سیدھے راستے پر آگئے تو اُس کی گمراہی تم کو کوئی نقصان نہیں پہنچائے گی، ہر انسان کے ساتھ اس کا اپنا عمل جائے گا، لہٰذا اپنی فکر کرو، تم سب اللہ تعالیٰ کے پاس لوٹ کر جاؤ گے، وہاں وہ تمہیں بتائے گا کہ تم کیا عمل کرتے رہے تھے، تمہارا عمل زیادہ بہتر تھا، یا دوسرے کا عمل زیادہ بہتر تھا، کیا معلوم کہ جس پر اعتراض کر رہے ہو، جس کے عیب تلاش کر رہے ہو، اس کی کوئی ادا، اس کا کوئی فعل اللہ تبارک و تعالیٰ کے یہاں اتنا مقبول ہو کہ وہ تم سے آگے نکل جائے، بہر حال! یہ صرف لطف سخن کے لیے اور مجلس آرائی کے لیے ہم لوگ جو باتیں کرتے ہیں وہ اصلاح کا راستہ نہیں۔

ہماری یہ حالت ہے کہ میں آپ کو ایک بات کی نصیحت کر رہا ہوں، اور خود میرا عمل اس پر نہیں ہے، اس لیے اولاً تو اس بات کا اثر نہ ہوگا، اور اگر اس بات کا اثر ہو بھی گیا تو سننے والا جب یہ دیکھے گا کہ یہ خود تو اس کام کو نہیں کر رہے ہیں، اور ہمیں نصیحت کر رہے ہیں، اگر یہ کوئی اچھا کام ہوتا تو پہلے یہ خود عمل کرتے، اس طرح وہ بات ہوا میں اڑ جاتی ہے اور اس کا کوئی اثر نہیں ہوتا۔ [اصلاحی خطبات، ج ۳، ص ۲۰۴، ۲۰۷]

لہٰذا ہمارے اندر خرابی یہ ہے کہ اصلاح کا جو پروگرام شروع ہوگا، جو جماعت قائم ہوگی، جو انجمن کھڑی ہوگی، جو آدمی کھڑا ہوگا، اس کے دماغ میں یہ بات ہوگی کہ یہ سب لوگ خراب ہیں، ان کی اصلاح کرنی ہے، اور اپنی خرابی کی طرف دھیان اور فکر نہیں، اگر انسان اپنے عیوب کا جائزہ لینا شروع کرے تو پھر دوسروں کے عیوب نظر نہیں آتے، اس وقت انسان اپنی فکر میں لگ جاتا ہے، بہادر شاہ ظفر مرحوم نے کہا تھا کہ:

تھے جو اپنی برائی سے بے خبر
رہے اوروں کے ڈھونڈتے عیب و ہنر

پڑی اپنی برائیوں پر جو نظر
تو نگاہ میں کوئی برا نہ رہا

اس لیے اس آیت میں اللہ تعالیٰ یہ فرمارہے ہیں کہ:

﴿یا أیها الذین امنوا علیکم أنفسکم لا یضرکم من ضل إذا اهتدیم﴾

اے ایمان والو! اپنی خبر لو، اگر تم راستے پر آجاؤ تو گمراہ ہونے والے اور غلط راستے پر جانے والے تمہیں کوئی نقصان نہیں پہنچائیں گے، لہذا مجلس آرائی کے طور پر، اور محض برسبیل تذکرہ دوسروں کی برائیاں کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، اپنی فکر کرو، اور اپنی جتنی اصلاح کر سکتے ہو، وہ کرلو، واقعہ یہ ہے کہ معاشرے کی اصلاح کا راستہ بھی یہی ہے، اس لیے معاشرہ کس کا نام ہے؟ میرا، آپ کا اور افراد کے مجموعے کا نام معاشرہ ہے، اب اگر ہر شخص اپنی اصلاح کی فکر کرلے کہ میں ٹھیک ہوجاؤں، تو رفتہ رفتہ سارا معاشرہ ٹھیک ہوجائے گا، لیکن اگر معاملہ یہ رہا کہ میں تمہارے اوپر تنقید کروں اور تم میرے اوپر تنقید کرو، میں تمہاری برائی بیان کروں اور تم میری برائی بیان کرو، پھر تو اس طرح معاشرے کی حالت کبھی درست نہیں ہوسکتی، بلکہ اپنی فکر کرو، تم دیکھ رہے ہو کہ دنیا جھوٹ بول رہی ہے، لیکن تم نہ بولو، دوسرے لوگ رشوت لے رہے ہیں، تم رشوت نہ لو، دوسرے لوگ سود کھارہے ہیں، تم سود نہ کھاؤ، دوسرے لوگ دھوکہ دے رہے ہیں، تم دھوکہ نہ دو، دوسرے لوگ حرام کھارہے ہیں، تم نہ کھاؤ، لیکن اس کے تو کوئی معنی نہیں ہیں کہ مجلس کے اندر تو کہہ دیا کہ لوگ جھوٹ بول رہے ہیں، اور پھر خود بھی صبح سے شام تک جھوٹ بول رہے ہیں، یہ طریقہ درست نہیں، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے اس فکر ہمارے دلوں میں پیدا فرمادے کہ ہر شخص کو اپنی اصلاح کی فکر ہوجائے، آمین۔

[اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۲۱۳]

اگر صرف اپنی ہی اصلاح کی فکر ہو تو کیا دوسروں کی اصلاح کی فکر کرنا ہمارے ذمہ ضروری نہیں ؟؟

البتہ یہاں یہ سمجھ لینا ضروری ہے کہ اپنی اصلاح کی فکر میں یہ بات بھی ضروری ہے کہ جس جگہ نیکی کی بات پہنچانا ضروری ہے وہاں نیکی کی بات پہنچائے اور اپنا فرض ادا کرے، اس کے بغیر وہ ہدایت یافتہ نہیں کہلاسکتا، نہ اس کے بغیر اپنی اصلاح کا فریضہ مکمل ہوتا ہے، یہی بات سیدنا ابوبکر صدیقؓ نے ایک حدیث میں واضح فرمادی، حدیث یہ ہے:

عن ابی بکر الصدیق رضی الله عنه قال : یا ایها الناس انکم تقرؤون هذه الایة : یا ایها الذین آمنوا علیکم انفسکم لا یضرکم من ضل اذا اهتدیتم﴾ وانی سمعت رسول الله ﷺ یقول : ان الناس اذا رأوا الظالم

فلم یاخذوا علی یدیه او شلك ان یعمهم الله بعقاب منه

یہ حضرت ابوبکر صدیق ؓ سے روایت ہے جس میں آپ نے قرآن کریم کی اس آیت کی صحیح تشریح نہ سمجھنے پر لوگوں کو تنبیہ فرمائی، اور اس آیت کی تشریح میں حضور اقدس ﷺ کی ایک حدیث ارشاد فرمائی جس سے اس آیت کے صحیح مفہوم پر روشنی پڑتی ہے۔

حضرت صدیق اکبرؓ نے اس طرف اشارہ فرمایا کہ بعض لوگ اس آیت کا یہ مطلب سمجھتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ اپنی خبر لو، اپنی اصلاح کی فکر کرو، پس اب ہمارے ذمے تو اپنی اصلاح کی فکر واجب ہے، اگر کسی دوسرے کو غلط کام کرتے ہوئے دیکھ رہے ہیں تو اس کو ٹوکنا اس کی اصلاح کی فکر کرنا ہمارے ذمے ضروری نہیں، حضرت ابوبکر صدیق ؓ فرمارہے ہیں کہ اس آیت کا یہ مطلب لینا غلط فہمی ہے، اس لیے کہ اگر لوگ یہ دیکھیں کہ ایک ظالم کسی دوسرے پر ظلم کررہا ہے لیکن وہ لوگ اس ظالم کا ہاتھ پکڑ کر اس کو ظلم سے نہ روکیں تو ان حالات میں قریب ہے کہ اللہ تعالیٰ ایسے تمام افراد پر اپنا عذاب نازل فرمادیں۔

حضرت صدیق اکبرؓ یہ فرمارہے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ تمہارے سامنے ظالم ظلم کررہا ہے اور مظلوم پٹ رہا ہے اور ظالم کو ظلم سے روکنے کی طاقت تمہارے اندر موجود ہے لیکن اس کے باوجود تم نے یہ سوچا کہ اگر یہ ظلم کررہا ہے، یہ غلط کام کررہا ہے تو یہ اس کا اپنا ذاتی عمل ہے، میں تو ظلم نہیں کررہا ہوں، لہٰذا مجھے اس کے اس فعل میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے اور مجھے ان سے الگ رہنا چاہیے، اور وہ اپنے اس طرزِ عمل پر اس آیت سے استدلال کرے کہ اللہ تعالیٰ نے تو یہ فرمادیا کہ اپنی اصلاح کی فکر کرو، اگر دوسرا شخص غلط کام کررہا ہے تو اس کی غلط کاری تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی، حضرت ابوبکر صدیق ؓ فرمارہے ہیں کہ یہ حدیث اس بات پر دلالت کررہی ہے کہ اس آیت سے یہ مطلب نکالنا بالکل غلط ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی حکم دیا ہے کہ اگر ظالم کو ظلم سے روکنے کی قدرت اور طاقت تمہارے اندر ہو تو تم اس کو ضرور ظلم سے روک دو۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ پھر اس آیت کا کیا مطلب ہے؟ آیت کا مطلب یہ ہے کہ اس میں یہ جو فرمایا کہ کسی کی غلط کاری تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی بشرطیکہ تم اپنی اصلاح کی فکر کرلو، اس میں اصل بات یہ ہے کہ ایک شخص اپنی استطاعت کے مطابق اور اپنی طاقت کے مطابق امر بالمعروف کا فریضہ ادا کرچکا ہے لیکن اس کے باوجود دوسرا شخص اس کی بات نہیں مانتا، تو تمہارے اوپر اس کی کوئی ذمہ داری نہیں ہے، اب اس کی غلط کاری تمہیں نقصان نہیں پہنچائے گی، اب تم اپنی فکر کرو، اور اپنے حالات کو درست رکھو، ان شاء اللہ! اللہ تعالیٰ کے ہاں تم سے مواخذہ نہیں ہوگا۔ [اصلاحی خطبات، ج ۳، ص ۲۱۴]

کیا ایک آدمی معاشرے میں تبدیلی لاسکتا ھے ؟

آج کل یہ عذر پیش کیا جاتا ہے کہ جب تک نظام نہ بدلے اور جب تک سب لوگ نہ بدلیں، اس وقت تک اکیلا آدمی کیسے تبدیلی لاسکتا ہے؟ اور اکیلا آدمی ان ہدایتوں پر کس طرح عمل کر سکتا ہے؟ یاد رکھیے! نظام اور معاشرہ افراد کے مجموعے کا نام ہے، اگر ہر فرد اپنی جگہ یہ سوچتا رہے کہ جب تک معاشرہ نہیں بدلے گا، اس وقت تک میں بھی نہیں بدلوں گا، تو پھر معاشرے میں کبھی تبدیلی واقع نہیں ہو سکتی، تبدیلی ہمیشہ اس طرح آیا کرتی ہے کہ کوئی اللہ کا بندہ فرد بن کر اپنی زندگی میں تبدیلی لاتا ہے، پھر اس چراغ کو دیکھ کر دوسرا چراغ جلتا ہے، اور پھر دوسرے سے تیسرا چراغ جلتا ہے، اسی طرح افراد کے سنورنے سے معاشرہ سنورتا ہے، اور افراد سے قوموں کی تعمیر ہوتی ہے، لہذا یہ عذر کہ میں تنہا کچھ نہیں کر سکتا یہ معقول عذر نہیں۔

جب نبی کریم محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے، اس وقت معاشرے کی خرابیاں اور برائیاں اپنی انتہا کو پہنچی ہوئی تھیں، اس وقت اگر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ سوچتے کہ اتنا بڑا معاشرہ الٹی سمت کی طرف جارہا ہے، میں تنہا کیا کرسکوں گا اور یہ سوچ کر آپ ہمت ہار کر بیٹھ جاتے تو آج ہم اور آپ یہاں پر مسلمان بیٹھے ہوئے نہ ہوتے، آپ نے دنیا کی مخالفتوں کے سیلاب کا مقابلہ کرتے ہوئے ایک راہ ڈالی، نیا راستہ نکالا، اور اس راستے پر گامزن ہوئے، یہ بات ٹھیک ہے کہ آپ کو اس راستے میں قربانیاں بھی دینی پڑیں، آپ کو پریشانیاں بھی پیش آئیں، مشکلات بھی سامنے آئیں، لیکن آپ نے ان سب کو گوارہ کیا، اسی کا نتیجہ ہے کہ آج دنیا کی ایک تہائی آبادی محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نام لیوا اور ان کی غلام ہے، لیکن اگر آپ یہ سوچ کر بیٹھ جاتے کہ جب تک معاشرہ نہیں بدلے گا اس وقت تک تنہا میں کیا کرسکتا ہوں تو یہ صورت حال نہ ہوتی۔

اللہ تعالی نے ہر انسان کی ذمہ اس کے اوپر ڈالی ہے، لہذا اس بات کو دیکھے بغیر کہ دوسرے لوگ کیا کرر ہے ہیں، ہر انسان پر فرض ہے کہ وہ اپنے طرز عمل کو درست کرے۔ [اصلاحی خطبات، ج۹، ص۶۹]

ایسے معاشرے میں کیسے چلوں ؟

"کیا کریں ؟ ماحول اور معاشرے کی وجه سے دنیا داری کرنی پڑتی ھے "!

آج کی دنیا میں جب لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ شریعت کی پابندی کرو، شریعت کے احکام پر چلو، واجبات اور فرائض بجالاؤ، گناہوں سے بچو، اللہ تعالی نے جن چیزوں کو حرام قرار دیا ہے ان سے اجتناب کرو، تو بعض کہنے والے یہ کہتے ہیں کہ کیسے کریں؟ ماحول تو سارا کا سارا بگڑا ہوا ہے، ماحول تو الٹی سمت جارہا ہے، باہر نکلو تو نگاہوں کو پناہ نہیں ملتی اور دفتروں میں جاؤ تو رشوت کا بازار گرم ہے، کسی مجمع میں جاؤ تو وہاں عورتوں اور مردوں کا ایسا اختلاط ہے کہ نگاہوں کو پناہ ملنا مشکل ہے، اور سارا معاشرہ الٹی سمت جارہا ہے، کوئی ایک آدمی اگر

سارے معاشرے سے ہٹ کر کوئی کام کرنا چاہے تو نکو بنا دیا جاتا ہے، رشوت کا بازار گرم ہے، کوئی شخص یہ چاہے کہ میں رشوت نہ دوں یا رشوت نہ لوں تو چلو ٹھیک ہے، نہ دوں تو کام نہیں بنتا، لوگ مجبور ہو جاتے ہیں، سود کو شیر مادر سمجھا ہوا ہے، پورا بازار سود کے کاروبار سے بھرا ہوا ہے، ناجائز معاملات دن رات ہو رہے ہیں، حلال اور حرام کی فکر نہیں ہے، ماحول پورا غلط سمت میں جا رہا ہے، میں تنہا اکیلا اس ماحول میں کیا کروں؟ کیسے چلوں؟ شریعت کے احکام پر کیسے عمل کروں؟

میرے شیخ حضرت عارفی قدس اللہ سرہ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، وہ فرمایا کرتے تھے کہ ذرا تصور کرو کہ میدان حشر میں تم اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑے ہو اور اللہ تعالیٰ تم سے تمہارے اعمال کی باز پرس فرما رہے ہیں، پوچھ رہے ہیں کہ تم نے یہ گناہ کیوں کیا تھا؟ ہماری نافرمانی کیوں کی تھی؟ آپ اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ یا اللہ! میں کیا کرتا؟ آپ نے پیدا ہی ایسے زمانے میں کیا تھا جس میں چاروں طرف معصیتیں کا، گناہوں کا بازار گرم تھا، ماحول خراب تھا، کہیں پر بھی جاتا تو دین پر چلنا مشکل ہو رہا تھا، تو ایسے زمانے میں آپ نے پیدا کیا تو میں مجبور ہو گیا، اور گناہوں میں مبتلا ہو گیا، اگر اللہ تعالیٰ اس کے جواب میں تم سے یہ کہیں کہ اگر تم کو مشکل ہو رہا تھا، ماحول کے خلاف چلنا مشکل لگ رہا تھا تو ہم سے رجوع کیوں نہیں کیا؟ ہم سے کیوں نہیں مانگا؟ ہم نے تو پورے قرآن میں جگہ جگہ کہا تھا: ﴿إن الله على كل شيئ قدير﴾

بیشک اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں۔

اور تم بھی ایمان لائے تھے اس بات پر کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہیں اور تم ہر نماز کے اندر یہ کہتے بھی تھے إياك نعبد وإياك نستعين تو یہ بتاؤ جب تمہیں مشکل پیش آ رہی تھی تو تم نے ہم سے رجوع کر کے کیوں نہیں مانگا؟ کہ یا اللہ! میرے لیے مشکل ہو رہا ہے، ماحول خراب ہے، زمانہ پلٹ چکا ہے، اس ماحول اور اس زمانے میں میرے لیے دین پر چلنا مشکل ہو رہا ہے، یا اللہ! مجھے اپنی رحمت سے توفیق دے دیجیے اور میری مدد فرما دیجیے، کہ میں آپ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق زندگی گذار دوں، ہم سے کیوں نہیں مانگا؟

بتاؤ اس کا کیا جواب ہے؟ اس کا کوئی جواب نہیں، اللہ تعالیٰ نے تو ہر روز ہر نماز میں ہر رکعت میں سورہ فاتحہ تم سے پڑھوائی تھی، ہر رکعت میں تم یہ کہتے تھے کہ إياك نعبد وإياك نستعين لیکن عمل کیوں نہیں کیا؟ مانگتے اللہ تعالیٰ سے کہ یا اللہ! مجھ سے نہیں ہو رہا ہے، آپ مجھے توفیق دے دیجیے، اللہ تعالیٰ سے نیاز کے ساتھ، اللہ تعالیٰ کی رحمت پر قدرت پر ایمان رکھتے ہوئے مانگو، یا اللہ! میں پھنس گیا ہوں سود میں، سودی کاروبار میں، مجھے اس سے نکال دیجیے، یا اللہ! میں پھنس گیا ہوں فلاں گناہ میں، یا اللہ! مجھے اس سے نکال دیجیے، مانگتے رہو، مسلسل مانگو اللہ تعالیٰ سے۔ [خطبات عثمانی، ج ۱، ص ۱۲۲]

ہمارے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ بڑے کام کی بات فرمایا کرتے تھے، یاد رکھنے کی ہے، وہ فرماتے تھے کہ:

''تم کہتے ہو کہ ماحول خراب ہے، معاشرہ خراب ہے، ارے! تم اپنا ماحول خود بناؤ، تمہارے تعلقات ایسے لوگوں سے ہونے چاہئیں جو ان اصولوں میں تمہارے ہم نوا ہوں، جو لوگ ان اصولوں میں تمہارے ہم نوا نہیں، ان کا راستہ الگ ہے اور تمہارا راستہ الگ ہے، لہذا اپنا ایک ایسا حلقہ احباب تیار کرو جو ایک دوسرے کے ساتھ ان معاملات میں تعاون کے لیے تیار ہو اور ایسے لوگوں سے تعلق گھٹاؤ جو ایسے معاملات میں تمہارے راستے میں رکاوٹ ہیں''۔

اچھائی اور برائی کا فیصلہ کون کرے گا؟

اسی طرح یہ بات کہ کونسی چیز اچھی ہے اور کون سی چیز بری ہے؟ کیا کام اچھا ہے اور کیا کام برا ہے؟ کیا چیز حلال ہے اور کیا چیز حرام ہے؟ کون سا کام جائز ہے اور کان سا کام ناجائز ہے؟ یہ کام اللہ تعالی کو پسند اور یہ کام اللہ تعالی کو ناپسند ہے، یہ فیصلہ وحی پر چھوڑا گیا محض انسان کی عقل پر نہیں چھوڑا گیا، اس لیے کہ تنہا انسان کی عقل یہ فیصلہ نہیں کر سکتی تھی کہ کون سا کام اچھا ہے اور کون سا کام برا ہے؟ کون سا حلال ہے اور کون سا حرام ہے؟

اس دنیا کے اندر جتنی بڑی سے بڑی برائیاں پھیلی ہیں اور غلط سے غلط نظریات اس دنیا کے اندر آئے وہ سب عقل کی بنیاد پر آئے، مثلاً ہم اور آپ بحیثیت مسلمان کے یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ سور کا گوشت حرام ہے، اگر اس کے بارے میں وحی کی رہنمائی سے ہٹ کر صرف عقل کی بنیاد پر سوچیں گے تو عقل غلط رہنمائی کرے گی، جیسا کہ غیر مسلموں نے صرف عقل کی بنیاد پر یہ کہہ دیا کہ ہمیں تو سور کا گوشت کھانے میں بڑا مزہ آتا ہے، اس کے کھانے میں کیا حرج ہے؟ اس میں کیا عقلی خرابی ہے؟ اسی طرح ہم اور آپ کہتے ہیں کہ شراب پینا حرام ہے، شراب بری چیز ہے، لیکن جو شخص وحی الٰہی پر ایمان نہیں رکھتا، وہ یہ کہے گا کہ شراب پینے میں کیا قباحت ہے؟ کیا برائی ہے؟ ہمیں تو اس میں کوئی برائی نظر نہیں آتی، لاکھوں افراد شراب پی رہے ہیں، ان کو اس پینے سے کوئی خاص نقصان نہیں ہو رہا ہے، اور ہماری عقل میں تو اس کے بارے میں کوئی خرابی سمجھ میں نہیں آتی حتی کہ بعض لوگوں نے یہاں تک کہہ دیا کہ مرد و عورت کے درمیان بدکاری میں کیا حرج ہے؟ اگر ایک مرد اور ایک عورت اس کام پر رضامند ہیں تو اس کام میں عقلی خرابی کیا ہے؟ اور عقلی اعتبار سے ہم کیسے کہہ سکتے ہیں کہ یہ برا کام ہے؟ اور اگر رضامندی کے ساتھ مرد و عوت نے یہ کام کر لیا تو تیسرے آدمی کو کیا اختیار ہے کہ اس کے اندر رکاوٹ ڈالے؟ دیکھیے! اسی عقل کے بل بوتے پر بد سے بدتر برائی کو جائز اور صحیح قرار دیا گیا، اس لیے کہ جب عقل کو اس کے دائرہ کار سے آگے بڑھایا تو یہ عقل اپنا جواب غلط دینے لگی، لہذا جب انسان عقل کو اس جگہ پر استعمال کرے گا جہاں پر اللہ تعالی کی وحی آ چکی ہے تو وہاں پر عقل غلط جواب دینے لگی گی اور غلط راستے پر لے جائے گی۔

ظالم حکمران کیوں مسلط ہو رہے ہیں؟

آج ہمارے معاشرے میں جو فساد برپا ہے اور ہر شخص یہ شکوہ کر رہا ہے کہ ہمارے اوپر ایسے لوگ حکمران بن کر آجاتے ہیں جو ظالم ہوتے ہیں، جو عام کے حقوق کا خیال نہیں رکھتے، جو اخلاقی قدروں کو پامال کرتے ہیں اور جو بے دین ہوتے ہیں وغیرہ وغیرہ، لیکن سوال یہ ہے کہ ایسے حکمران ہمارے اوپر کیوں مسلط ہوتے ہیں؟ یہ اس لیے مسلط ہوتے ہیں کہ جب ان کو منتخب کرنے کا وقت آتا ہے تو اس وقت قرآن کریم کا بتایا ہوا اصول اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے ارشادات سب پیچھے چلے جاتے ہیں، بتایے! اگر انتخابات میں اپنی برادری کا آدمی بھی کھڑا ہوا ہے اور دوسری برادری کا آدمی بھی کھڑا ہوا ہے، اور اپنی برادری کا آدمی اتنا اچھا نہیں ہے، جبکہ دوسری برادری کا آدمی اچھا ہے تو آپ ووٹ کس کو دیں گے؟ آج عام طرز عمل یہی ہے کہ سارے ووٹ برادریوں کی بنیاد پر دیے جاتے ہیں، کسی برادری کے سربراہ سے جا کر بات کرلی کہ میں تمہاری برادری کا آدمی ہوں اور میں انتخابات میں کھڑا ہو رہا ہوں، لہذا تم میری حمایت کرنا، اب برادری کے سربراہ نے کہہ دیا کہ ہاں! ہماری پوری برادری آپ کو ووٹ دے گی، اب ساری برادری اس کو ووٹ دے رہی ہے، اس سے کوئی بحث نہیں کہ جس کو ہم ووٹ دے رہے ہیں وہ کیسا ہے، ظالم ہے، جابر ہے، جاہل ہے، فاسق وفاجر ہے، بددین ہے، اس سے کوئی بحث نہیں، چونکہ وہ ہماری برادری کا ہے، لہذا ہمارا ووٹ اسی کو جائے گا، یہ جاہلیت نہیں تو اور کیا ہے ؟اور اس کے نتیجے میں ہمارے اوپر ظالم وجابر حکمران مسلط ہو رہے ہیں تو کس کے کرتوت سے ہو رہے ہیں۔

اس لیے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ "إنما أعمالكم عمالكم" جو حکمران تمہارے اوپر آتے ہیں وہ سب تمہارے اعمال کا آئینہ ہوتے ہیں، اگر تمہارے اعمال درست ہوتے، اگر تمہیں اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احکام کا پاس ہوتا تو یہ ظالم اور جابر حکمران تم پر حاکم بن کر نہیں آسکتے تھے، لیکن تمہارے اعمال کی وجہ سے یہ حکمران تمہارے اوپر مسلط ہوئے۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۷، ص۱۳۸]

حکمرانوں کو گالیاں دینا
جیسے اعمال ہوں گے ویسے حکمران ہوں گے

لوگ حکمرانوں کو برا بھلا کہتے ہیں، ان کو گالیاں دیتے ہیں، حالانکہ حدیث میں فرمایا کہ حکمرانوں کو گالیاں مت دو، بلکہ اعمال کو درست کرو، جو کچھ مصائب آرہے ہیں تمہارے اعمال کے سبب آرہے ہیں، ارے جن کو گالیاں دے رہے ہو، تم ہی تو لے کر آئے ہو، تم ہی نے اپنے ووٹوں سے ان کو وہاں تک پہنچایا ہے، تو گالیاں دینے سے کیا حاصل؟ ہاں اپنی غلطیوں پر توبہ کرو۔ انّما أعمالكم عمّالكم۔ یہ تمہارے حکمران یہ تو تمہارے اعمال ہیں، یہ تمہارے اعمال کا آئینہ ہیں، تو یہ سب کچھ جو صورتحال نظر آرہی ہے، درحقیقت بداعمالیوں کا وبال ہے، اور بداعمالیاں ایک نہیں، کسی کے ہاں کچھ ہے، کسی کے ہاں کچھ ہے، نمازیں چھوڑ رکھی ہیں، روزے چھوڑ رکھے ہیں۔ [خطبات عثمانی، ج۳، ص

نماز

محلے کی مسجد چھوڑ کر جامع مسجد میں نماز پڑھنا

فرمایا کہ محلے کی مسجد میں نماز پڑھنے سے پچیس گنا ثواب ملتا ہے اور جامع مسجد میں نماز پڑھنے سے پانچ سو گنا ثواب ملتا ہے۔لیکن شریعت کا حکم یہ ہے کہ محلے کی مسجد میں نماز پڑھو، کیونکہ محلے کی اس مسجد کو آباد کرنا تمہاری ذمہ داری ہے، اس لئے کہ تم اہل محلہ ہو، اب اگر سارے محلے کے لوگ پانچ سو کا ثواب حاصل کرنے کے چکر میں جامع مسجد چلے جائیں اور محلے کی مسجد خالی ہو جائے تو وہ گناہ گار ہوں گے، کیونکہ اہل محلہ کا فرض ہے کہ وہ اپنے محلے کی مسجد آباد کریں۔تو اگر چہ جامع مسجد میں ثواب کی گنتی زیادہ ہے، اس لئے گنتی کے چکر میں مسنون عبادت کو ترک نہیں کرنا چاہئے۔ [اصلاحی مجالس، ج ۲، ص ۱۱۹]

کیا نماز کی نیت زبان سے کرنی ضروری ہے؟ نماز کے لیے نیت کس طرح کی جائے؟

یہاں ایک مسئلہ کی وضاحت کردوں، وہ یہ کہ نیت نام ہے دل کے ارادہ کرنے کا، بس آگے زبان سے نیت کرنا کوئی ضروری نہیں، چنانچہ آج بہت سے لوگ نیت کے خاص الفاظ زبان سے ادا کرنے کو ضروری سمجھتے ہیں، مثلاً چار رکعت نماز فرض، وقت ظہر کا، منہ میرا کعبہ شریف کی طرف، پیچھے پیش امام کے، واسطے اللہ تعالی کے اللہ اکبر! زبان سے یہ نیت کرنے کو لوگوں نے فرض و واجب سمجھ لیا ہے، گویا اگر کسی نے یہ الفاظ نہ کہے تو اس کی نماز ہی نہیں ہوئی، یہاں تک کہ دیکھا گیا کہ امام صاحب رکوع میں ہیں، مگر وہ صاحب اپنی نیت کے تمام الفاظ ادا کرنے میں مصروف ہیں اور اس کے نتیجے میں رکعت بھی چلی جاتی ہے، حالانکہ یہ الفاظ زبان سے ادا کرنا کوئی ضروری اور فرض و واجب نہیں، جب دل میں یہ ارادہ ہے کہ فلاں نماز فلاں امام صاحب کے پیچھے پڑھ رہا ہوں، بس یہ ارادہ کافی ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۱۹۹]

آج کل لوگوں میں یہ مشہور ہو گیا ہے کہ ہر نماز کی نیت کے الفاظ علیحدہ علیحدہ ہوتے ہیں اور جب تک وہ الفاظ نہ کہے جائیں اس وقت تک نماز نہیں ہوتی، اسی وجہ سے لوگ بار بار یہ پوچھتے بھی رہتے ہیں کہ

فلاں نماز کی نیت کس طرح ہوتی ہے؟ اور فلاں نماز کی نیت کس طرح ہوگی؟ اور لوگوں نے نیت کے الفاظ کو باقاعدہ نماز کا حصہ بنا رکھا ہے، مثلاً یہ الفاظ کہ ''نیت کرتا ہوں دو رکعت نماز کی، پیچھے اس امام کے، واسطے اللہ تعالیٰ کے، منہ میرا کعبہ شریف کی طرف وغیرہ وغیرہ، خوب سمجھ لیں کہ نیت ان الفاظ کا نام نہیں ہے بلکہ نیت تو دل کے ارادے کا نام ہے، جب آپ نے گھر سے نکلتے وقت دل میں یہ نیت کرلی کہ میں ظہر کی نماز پڑھنے جارہا ہوں تو بس نیت ہوگئی، میں نماز جنازہ پڑھنے جارہا ہوں تو بس نیت ہوگئی، میں نماز عید پڑھنے جارہا ہوں، بس نیت ہوگئی، میں نماز حاجت پڑھنے جارہا ہوں، بس نیت ہوگئی، اب یہ الفاظ زبان سے کہنا نہ تو واجب ہیں نہ ضروری ہیں، نہ سنت ہیں نہ مستحب ہیں، زیادہ سے زیادہ جائز ہیں، اس سے زیادہ کچھ نہیں، لہٰذا صلوٰۃ الحاجت پڑھنے کا نہ کوئی مخصوص طریقہ ہے اور نہ ہی نیت کے لیے الفاظ مخصوص ہیں، بلکہ عام نمازوں کی طرح دو رکعتیں پڑھ لو۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۴۳]

نماز پڑھنے کے دوران آنکھیں بند کرلینا

حضرت حاجی امداد اللہ صاحب مہاجر مکیؒ نے ایک واقعہ بیان کیا ہے جو حضرت تھانویؒ نے اپنے مواعظ میں بیان کیا کہ ان کے قریب کے زمانے میں ایک بزرگ تھے، وہ جب نماز پڑھا کرتے تھے تو آنکھیں بند کرکے نماز پڑھتے تھے، اور فقہا کرام نے لکھا ہے کہ نماز میں ویسے تو آنکھ بند کرنا مکروہ ہے، لیکن اگر کسی شخص کو اس کے بغیر خشوع حاصل نہ ہوتا ہو تو اس کے لیے آنکھ بند کرکے نماز پڑھنا جائز ہے، کوئی گناہ نہیں ہے، تو وہ بزرگ نماز بہت اچھی پڑھتے تھے اور لوگوں میں ان کی نماز مشہور تھی، کیونکہ نہایت خشوع وخضوع اور نہایت عاجزی کے ساتھ نماز پڑھتے تھے، وہ بزرگ صاحب کشف بھی تھے، ایک مرتبہ انہوں نے اللہ تعالیٰ سے درخواست کی یا اللہ! میں یہ جو نماز پڑھتا ہوں میں اس کو دیکھنا چاہتا ہوں کہ آپ کے یہاں میری نماز قبول ہے یا نہیں؟ اور کس درجہ میں قبول ہے؟ اور اس کی صورت کیا ہے؟ وہ مجھے دکھادیں، اللہ تعالیٰ نے ان کی یہ درخواست قبول فرمائی اور ایک نہایت حسین وجمیل عورت سامنے لائی گئی، جس کے سر سے لے کر پاؤں تک تمام اعضاء میں نہایت تناسب اور توازن تھا، لیکن اس کی آنکھیں نہیں تھی، بلکہ اندھی تھی اور ان سے کہا گیا کہ یہ ہے تمہاری نماز، ان بزرگ نے پوچھا کہ یا اللہ! یہ اتنے اعلیٰ درجہ کی حسن وجمال والی خاتون ہے، مگر اس کی آنکھیں کہاں ہیں؟ جواب میں فرمایا کہ تم جو نماز پڑھتے ہو وہ آنکھیں بند کرکے پڑھتے ہو، اس واسطے تمہاری نماز ایک اندھی عورت کی شکل میں دکھائی گئی۔

یہ واقعہ حضرت حاجی صاحب قدس اللہ سرہ نے بیان فرمایا اور حضرت تھانوی قدس اللہ سرہ اس واقعہ پر تبصرہ کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ بات دراصل یہ تھی کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے نماز پڑھنے کا جو سنت طریقہ بتایا وہ یہ تھا کہ آنکھیں کھول کر نماز پڑھو، سجدہ کی جگہ پر نگاہ ہونی چاہیے، یہ ہمارا بتایا ہوا طریقہ ہے

،اگرچہ دوسرا طریقہ جائز ہے، گناہ نہیں ہے، لیکن سنت کا نور اس میں حاصل نہیں ہوسکتا، اگرچہ فقہا کرام نے یہ فرمایا کہ اگر نماز میں خیالات بہت آتے ہیں اور خشوع حاصل کرنے کے لیے اور خیالات کو دفع کرنے کے لیے کوئی شخص آنکھیں بند کر کے نماز پڑھتا ہے تو کوئی گناہ نہیں، جائز ہے مگر پھر بھی خلاف سنت ہے، کیونکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری عمر کبھی کوئی نماز آنکھیں بند کر کے نہیں پڑھی، اس کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے کبھی کوئی نماز آنکھ بند کر کے نہیں پڑھی، اس لیے فرمایا کہ ایسی نماز میں سنت کا نور نہیں ہوگا۔

"لم يكن من هديه ﷺ تغميض عينيه في الصلاة"

[زاد المعاد لابن قیم ج۱ ص۷۵]

اور یہ جو خیال ہو رہا ہے کہ چونکہ نماز میں خیالات و وساوس بہت آتے ہیں، اس لیے آنکھ بند کر کے نماز پڑھ لو، تو بھائی، اگر خیالات غیر اختیاری طور پر آتے ہیں تو اللہ تعالیٰ کے ہاں اس پر کوئی مواخذہ کوئی پکڑ نہیں، وہ نماز جو آنکھیں کھول کر اتباع سنت میں پڑھی جا رہی ہے اور اس میں غیر اختیاری خیالات آرہے ہیں وہ نماز پھر بھی اس نماز سے اچھی ہے جو آنکھ بند کر کے پڑھی جا رہی ہے اور اس میں خیالات بھی نہیں آرہے ہیں، اس لیے کہ وہ نماز نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں ادا کی جا رہی ہے اور یہ دوسری نماز اتباع رسول نہیں ہے۔

بھائی یہ سارا معاملہ اتباع کا ہے، اپنی طرف سے کوئی طریقہ گھڑنے کا نہیں، اسی کا نام دین ہے ،اب ہم نے یہ جو سوچ لیا ہے کہ فلاں عبادت اس طرح ہوگی اور فلاں عبادت اس طرح ہوگی تو یہ سب اللہ تعالیٰ کے ہاں غیر مقبول ہے، اس لیے فرمادیا کہ "كل بدعة ضلالة" کہ ہر بدعت گمراہی ہے۔

[اصلاحی خطبات ج۱ ص۲۲۱ تا ۲۲۳]

"ہم دین کا بڑا اور اہم کام کر رہے ہیں اس لیے نماز چھوٹ گئی تو کوئی حرج کی بات نہیں"

ترک نماز سے متعلق ایک گمراہ کن نظریہ

آج کل ہمارے معاشرے میں ایک گمراہی پھیل گئی ہے، وہ یہ ہے کہ لوگوں کے دماغ میں یہ بات آگئی ہے کہ بہت سے کام ایسے ہیں جو نماز سے زیادہ فوقیت رکھتے ہیں، خاص طور پر یہ بات ان لوگوں کے اندر پیدا ہوگئی ہے جو دین کے کام میں مشغول ہیں، دعوت وتبلیغ کا کام کر رہے ہیں، جہاد کا کام کر رہے ہیں، سیاست کا کام کر رہے ہیں، یہ حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ ہم بہت بڑا کام کر رہے ہیں، لہٰذا چونکہ ہم بڑا کام کر رہے ہیں، اس لیے اگر کبھی اس بڑے کام کی خاطر نماز چھوٹ گئی یا نماز میں کمی آگئی، یا نماز میں نقص واقع ہوگیا تو کوئی حرج کی بات نہیں، کیونکہ ہم اس سے بڑے کام میں لگے ہوئے ہیں، ہم دعوت وتبلیغ کے کام میں اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے کام میں لگے ہوئے ہیں، جہاد کے کام میں لگے ہوئے ہیں اور سیاست کے کام

ہیں، یعنی دین کو اس دنیا میں برپا کرنے اور اقامت دین کے کام میں لگے ہوئے ہیں، اس لیے اگر ہماری جماعت چھوٹ جائے گی تو ہم گھر میں نماز پڑھ لیں گے اور اگر نماز کا وقت نکل گیا تو قضا پڑھ لیں گے، یاد رکھیے! یہ بڑی گمراہانہ فکر ہے۔

حضرت فاروق اعظمؓ سے زیادہ دین کا کام کرنے والا کون ہوگا؟ ان سے بڑا سیاست کا علم بردار کون ہوگا؟ ان سے بڑا جہاد کرنے والا کون ہوگا؟ ان سے بڑا داعی اور مبلغ کون ہوگا؟ لیکن وہ اپنے تمام فرمانرواؤں کو باقاعدہ یہ سرکاری فرمان جاری کر رہے ہیں کہ میرے نزدیک تمہارے سب کاموں میں سب سے اہم چیز نماز ہے، اگر تم نے اس کی حفاظت کی تو تمہارے اور کام بھی درست ہوں گے اور اگر اس کو ضائع کر دیا تو تمہارے اور کام بھی خراب ہوں گے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۱۸۴]

ڈاکٹر کے لیے خدمت خلق کی وجہ سے فرض نماز معاف نہیں ہے

چند روز پہلے ایک خاتون نے مجھ سے پوچھا کہ میرے شوہر ڈاکٹر ہیں، انہوں نے اپنا کلینک کھول رکھا ہے، مریضوں کو دیکھتے ہیں اور جب نماز کا وقت آتا ہے تو وہ وقت پر نماز نہیں پڑھتے، اور رات کو جب کلینک بند کر کے گھر واپس آتے ہیں تو تینوں نمازیں ایک ساتھ پڑھ لیتے ہیں، میں نے ان سے کہا کہ آپ گھر آ کر ساری نمازیں اکٹھی کیوں پڑھتے ہیں؟ وہیں کلینک میں وقت پر نماز ادا کر لیا کریں تا کہ قضا نہ ہوں، جواب میں شوہر نے کہا کہ میں مریضوں کا جو علاج کرتا ہوں، یہ خدمت خلق کا کام ہے، اور خدمت خلق بہت بڑی عبادت ہے، اور اس کا تعلق حقوق العباد سے ہے، اس لیے میں اس کو ترجیح دیتا ہوں اور نماز پڑھنا چونکہ میرا ذاتی معاملہ ہے، اس لیے میں گھر آ کر اکٹھی ساری نمازیں پڑھ لیتا ہوں، تو وہ خاتون مجھ سے پوچھ رہی تھیں کہ میں اپنے شوہر کی اس دلیل کا کیا جواب دوں؟

حقیقت میں ان کے شوہر کو یہاں سے غلط فہمی پیدا ہوئی کہ ان دونوں قسم کی عبادتوں کے مرتبے میں جو فرق ہے اس فرق کو نہیں سمجھے، وہ فرق یہ ہے کہ نماز کی عبادت براہ راست ہے، جس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر تم جنگ کے میدان میں بھی ہو اور دشمن سامنے موجود تب بھی نماز پڑھو، اگرچہ اس وقت نماز کے طریقے میں آسانی پیدا فرما دی، لیکن نماز کی فرضیت اس وقت بھی ساقط نہیں فرمائی، حتیٰ کہ اگر ایک انسان بیمار پڑا ہوا ہے اور اتنا بیمار ہے کہ وہ کوئی کام انجام نہیں دے سکتا، اس حالت میں بھی یہ حکم کہ نماز مت چھوڑو، نماز تو ضرور پڑھو، لیکن ہم تمہارے لیے یہ آسانی کر دیتے ہیں کہ کھڑے ہو کر نہیں پڑھ سکتے تو بیٹھ کر پڑھ لو، بیٹھ کر نہیں پڑھ سکتے تو لیٹ کر پڑھ لو اور اشارہ سے پڑھ لو، وضو نہیں کر سکتے تو تیمم کر لو، لیکن پڑھو ضرور، یہ نماز کسی حال میں بھی معاف نہیں فرمائی، اس لیے کہ نماز براہ راست اور مقصود بالذات عبادت ہے اور پہلے درجے کی عبادت ہے اور ڈاکٹر صاحب جو مریضوں کا علاج کرتے ہیں یہ خدمت خلق ہے، یہ بھی بہت بڑی

عبادت ہے، لیکن یہ دوسرے درجے کی عبادت ہے، براہ راست عبادت نہیں، لہٰذا اگر ان دونوں قسموں کی عبادتوں میں تعارض اور تقابل ہو جائے تو اس صورت میں اس عبادت کو ترجیح ہوگی جو براہ راست عبادت ہے، چونکہ ان ڈاکٹر صاحب نے ان دونوں قسم کی عبادتوں کے درمیان فرق کو نہیں سمجھا، اس کے نتیجے میں اس غلطی کے اندر مبتلا ہو گئے، یوں تو دوسری قسم کی عبادت کے لحاظ سے ایک مومن کا ہر کام عبادت بن سکتا ہے، اگر ایک مومن نیک نیتی سے سنت کے طریقے پر کام کرے تو اس کی ساری زندگی عبادت ہے، لیکن وہ دوسرے درجے کی عبادت ہے، پہلے درجے کی عبادت نماز، روزہ، حج، زکوۃ، اللہ کا ذکر وغیرہ، یہ براہ راست اللہ کی عبادتیں ہیں اور اصل میں انسان کو اسی عبادت کے لیے پیدا کیا گیا ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۰، ص۶۷]

"غیر مسلم بھی تو نماز نہیں پڑھ رہے مگر ترقی کر رہے ہیں"

تم اپنے آپ کو کافروں پر قیاس مت کرنا، غیر مسلموں پر قیاس مت کرنا اور یہ مت سوچنا کہ غیر مسلم بھی تو نماز نہیں پڑھ رہے ہیں مگر ترقی کر رہے ہیں، دنیا میں ان کا ڈنکا بج رہا ہے، خوش حالی ان کا مقدر بنی ہوئی ہے اور دنیا کے اندر ان کی ترقی کے ترانے پڑھے جا رہے ہیں، یاد رکھو! تم اپنے آپ کو ان پر قیاس مت کرنا، اللہ تعالیٰ نے مؤمن کا مزاج اور مؤمن کا طریقہ زندگی کافر کے مقابلے میں بالکل مختلف قرار دیا ہے، قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ مؤمن کو فلاح نہیں ہو سکتی جب وہ ان کاموں پر عمل نہ کرے جو قرآن وحدیث میں بیان کیے گئے ہیں، ان میں سب سے پہلا کام نماز ہے۔

جاہل پیروں کا یہ خیال کہ ان پر نماز روزہ وغیرہ معاف ہے گمراہی ہے

چنانچہ جاہل پیروں کا ایک طبقہ ہے جو یہ کہتا ہے کہ ہم تو اب درویش اور فقیر ہو گئے ہیں اور اب تو ہم ہر وقت اللہ تعالیٰ کی یاد میں گم ہیں، لہٰذا اب ہمیں نہ نماز کی ضرورت ہے، نہ روزے کی ضرورت ہے، نہ تلاوت کی ضرورت ہے، نہ تسبیحات کی ضرورت۔ اس لئے کہ نماز کا مقصود تو ''وصول الی اللہ'' تھا، یعنی اللہ تعالیٰ تک پہنچ جانا، اب جب ہمارے دل میں اللہ تعالیٰ کا ذکر اور اللہ تعالیٰ کا خیال جم گیا، تو اب ہمیں نماز کی ضرورت نہیں، اب ہم مسجد جائیں یا نہ جائیں، نماز پڑھیں یا نہ پڑھیں، کوئی فرق نہیں پڑتا۔ یاد رکھئے! یہ گمراہی ہے، اور یہ گمراہی یہاں سے پیدا ہوئی کہ ''ذکر قلبی'' کو اس درجہ کا مقصود قرار دید یا کہ اس کے نتیجے میں ظاہری عبادات کو بیکار سمجھا جانے لگا، یہی گمراہی ہے۔ [اصلاحی مجالس، ج۳، ص۶۹]

کیا کسی ولی اور بزرگ کو فرائض سے چھوٹ مل سکتی ہے ؟

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ نے حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بارے میں ایک حکایت لکھی ہے، یہ بڑے درجہ کے اولیاء اللہ میں سے ہیں، ایک مرتبہ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ تہجد پڑھ رہے تھے، اس دوران

انہوں نے دیکھا کہ ایک نور چمکا اور پوری فضا منور ہوگئی اور اس نور میں سے آواز آئی:

''اے عبدالقادر! تو نے ہماری عبادت کا حق ادا کردیا، جو عبادت اب تک تم نے ادا کرلی وہ کافی ہے، آج کے بعد تم پر نماز فرض نہیں، روزہ فرض نہیں، تمام عبادات کی تکلیف تم سے اٹھالی گئی''۔

یہ آواز نور میں سے آئی، گویا کہ اللہ تعالیٰ فرمارہے ہیں کہ تیری عبادتیں اس درجہ میں قبول ہوگئیں کہ آئندہ کے لیے تجھے عبادتوں سے فارغ کردیا گیا، حضرت عبدالقادر جیلانیؒ نے جب یہ نور دیکھا اور یہ آواز سنی تو فوراً جواب میں فرمایا: ''کمبخت! دور ہو، مجھے دھوکہ دیتا ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے تو عبادتیں معاف نہیں ہوئیں اور ان پر سے عبادتوں کی تکلیف ختم نہیں ہوئی، مجھ سے ختم ہوجائے گی؟ تو مجھے دھوکہ دینا چاہتا ہے؟''

دیکھیے! شیطان نے کتنا بڑا وار کیا، اگر ان کے دل میں عبادت کا ناز آجاتا تو ہیں پھسل جاتے جو لوگ کشف و کرامات کے پیچھے بہت پڑے رہتے ہیں، ان کو ختم کرنے کے لیے تو شیطان کا یہ بہترین وار تھا لیکن شیخ تو شیخ تھے، فوراً سمجھ گئے کہ یہ بات اللہ تعالیٰ کی طرف سے نہیں ہوسکتی، اس لیے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر سے تو عبادت کی تکلیف ختم نہیں ہوئی، میرے اوپر سے کیسے ختم ہوجائے گی؟۔

تھوڑی دیر کے بعد پھر ایک اور نور چمکا اور فضا منور ہوئی اور اس نور میں سے آواز آئی: ''اے عبدالقادر! آج تیرے علم نے تجھے بچالیا، ورنہ میں نے نجانے کتنے عابدوں کو اس وار کے ذریعہ تباہ کردیا''۔

حضرت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ نے دوبارہ فرمایا: ''کمبخت! دوبارہ مجھے دھوکہ دیتا ہے، میرے علم نے مجھے نہیں بچایا، مجھے اللہ کے فضل نے بچایا ہے''۔

یہ دوسرا حملہ پہلے حملے سے زیادہ خطرناک اور اس سے زیادہ سنگین تھا، کیونکہ اس کے ذریعہ ان کے اندر علم کی بڑائی اور اس کا ناز پیدا کرنا چاہتا تھا۔

حضرت شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد فرماتے ہیں کہ پہلا حملہ اتنا سنگین نہیں تھا، کیونکہ جس شخص کے پاس ذرا بھی شریعت کا علم ہو، وہ اس بات کو سمجھ سکتا ہے کہ زندگی میں ہوش حواس کی حالت میں کسی انسان سے عبادات معاف نہیں ہوسکتیں، لیکن یہ دوسرا حملہ بڑا سنگین تھا، نہ جانے کتنے لوگ اس حملے میں بہک گئے، اس لیے کہ اس میں اپنے علم پر ناز پیدا کرنا مقصود تھا اور یہ باریک بات ہے۔

''لوگ کیا سوچیں گے؟''
کی وجہ سے نیک عمل کو چھوڑ دینا بھی تکبر ہے

مذکورہ ارشاد کے آخر میں حضرت والا نے یہ اصول ارشاد فرمادیا کہ ''پس مخلوق کے لئے کسی بھی عمل عبادت کو ترک کرنا تکبر ہے''۔ جس طرح مخلوق کے لئے عمل کرنا ریاکاری اور دکھاوا ہے، یعنی مخلوق کے خاطر عمل کرنا کہ مخلوق مجھے دیکھ کر عبادت گزار سمجھے، جس طرح یہ عمل ریا ہے بلکہ شرک کے قریب پہنچ جاتا ہے، اسی

طرح ترک عمل للخلق بھی جائز نہیں، اس لئے یہ ترک عمل یا تو ریا ہوگا یا تکبر میں داخل ہوگا۔

مثلاً نماز کا وقت آ گیا اور آپ اس وقت ایسی جگہ پر ہیں جہاں نماز کا ماحول نہیں، اب اگر آپ وہاں نماز پڑھنے سے اس لئے شرمائیں کہ لوگ مجھے نماز پڑھتا دیکھ کر معلوم نہیں کیا سمجھیں گے۔ العیاذ باللہ۔ تو یہ ترک عمل للخلق ہے جو جائز نہیں۔ آج کل بہت کثرت سے یہ صورت پیش آتی رہتی ہے، مثلاً جو لوگ ہوائی جہاز میں سفر کرتے ہیں، انہوں نے یہ سمجھ لیا ہے کہ جہاز میں نماز معاف ہے اور نماز کو چھوڑنے کی وجہ صرف یہ ہوتی ہے کہ سب لوگ تو بیٹھے ہیں، اب اگر میں ان سب کے سامنے کھڑا ہو کر نماز پڑھوں گا تو ایک بھدّی صورت پیدا ہو جائے گی۔ العیاذ باللہ۔ نماز تو اللہ تعالیٰ کے حضور عاجزی ظاہر کرنے کا ایک طریقہ ہے، اب جو شخص اس وقت نماز کر ترک کر رہا ہے وہ مخلوق کے سامنے اس عاجزی کا اظہار نہیں کرنا چاہ رہا ہے، اس لئے کہ اس سے میری ھیٹی ہوگی، تو یہ صورت ''تکبر مع اللہ'' ہے۔

فرض نماز کسی حالت میں بھی معاف نہیں

جو عبادات فرض ہیں ان میں اللہ تعالیٰ نے جو تخفیف کر دی، اس تخفیف کے ساتھ ان کو انجام دینا ہی ہے، مثلاً نماز ہے، انسان کتنا ہی بیمار ہو، بستر مرگ پر ہو اور مرنے کے قریب ہو، تب بھی نماز ساقط نہیں ہوتی، اللہ تعالیٰ نے یہ آسانی تو فرما دی کہ کھڑے ہو کر نماز پڑھنے کی طاقت نہیں تو بیٹھ کر پڑھ لو، بیٹھ کر پڑھنے کی طاقت نہیں تو لیٹ کر پڑھ لو، وضو نہیں کر سکتے تو تیمم کر لو، اگر کپڑے پاک رکھنا بالکل ممکن نہیں تو اسی حالت میں پڑھ لو، لیکن نماز کسی حالت میں معاف نہیں، جب تک انسان کے دم میں دم ہے، ہاں! اگر کوئی بے ہوش ہو جائے یا غشی طاری ہو جائے، اور اسی حالت میں چھ نمازوں کا وقت گذر جائے تو اس وقت نماز معاف ہو جاتی ہے، لیکن جب تک ہوش میں ہے اور دم میں دم ہے اس وقت تک نماز معاف نہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج۱، ص ۱۸۲]

بیماری کی حالت میں تیمم کرنے یا لیٹ کر نماز پڑھنے کو دل نہیں مانتا کیا کریں؟

بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ انسان بیمار ہوا، اور اب کھڑے ہونے کے بجائے بیٹھ کر نماز پڑھ رہا ہے، بیٹھ کر پڑھنے کی قدرت نہیں تو لیٹ کر پڑھ رہا ہے، ایسے موقع پر بہت سے لوگوں کو دیکھا کہ وہ دل تنگ کرتے رہتے ہیں کہ اس حالت میں اب کھڑے ہو کر پڑھنے کا موقع نہیں مل رہا ہے، اور بیٹھ کر پڑھنے کا بھی موقع نہیں مل رہا ہے، لیٹے لیٹے نماز پڑھ رہا ہوں، پتہ نہیں کہ وضو بھی ٹھیک ہو رہا ہے یا نہیں، تیمم بھی صحیح ہو رہا ہے یا نہیں، ان چیزوں میں پریشان رہتے ہیں، حالانکہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم تسلی دے رہے ہیں کہ جب تم مجبوری کی وجہ سے ان چیزوں کو چھوڑ رہے ہو تو اللہ تعالیٰ ان کو تمہارے نامہ اعمال میں لکھ رہے ہیں جو تن درستی کی

حالت میں تم کیا کرتے تھے۔

ایک حدیث میں ہے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إن الله يحب أن تؤتى رخصه كما يحب أن تؤتى عزائمه

[مجمع الزوائد ج۳، ص ۱۶۲]

یعنی جس طرح عزیمت جو اعلیٰ درجے کا کام ہے اس پر عمل کرنا اللہ تعالیٰ کو پسند ہے، اسی طرح مجبوری کی وجہ سے اگر رخصت پر عمل کریں تو اللہ تعالیٰ اس کو بھی پسند کرتے ہیں، لہٰذا اپنی پسند کی فکر نہ کرو، اللہ تعالیٰ کو جو حالت پسند ہے وہی حالت مطلوب ہے۔

دین کی ساری بنیاد یہ ہے کہ کسی خاص عمل کا نام دین نہیں، کسی خاص شوق کا نام دین نہیں، اپنے معمولات پورا کرنے کا نام دین نہیں، اپنی عادت پوری کرنے کا نام دین نہیں، دین نام ہے ان کی اتباع کا، وہ جیسا کہیں ویسا کرنے کا نام دین ہے، ان کو جو چیز پسند ہے، اس کو اختیار کرنے کا نام دین ہے، اور اپنے آپ کو ان کے حوالے کردینے کا نام دین ہے، وہ جیسا کرا رہے ہیں، وہی بہتر ہے، یہ جو صدمہ اور حسرت ہوتی رہتی ہے کہ ہم تو بیمار ہوگئے، اس واسطے کھڑے ہوکر نماز نہیں پڑھی جارہی ہے، لیٹ کر پڑھ رہے ہیں، یہ صدمہ کرنے کی بات نہیں، ارے! اللہ تعالیٰ کو وہی پسند ہے، اور جب یہی پسند ہے تو اس وقت کا تقاضہ یہی ہے کہ یہ کرو، اور ان کو ویسا ہی کرنا پسند ہے، اگرچہ اس وقت تم کو زبردستی کھڑے ہوکر نماز پڑھنا پسند ہے، لیکن اپنی تجویز کو فنا کردینے اور اللہ جل جلالہ نے جیسا مقدر کردیا اس پر راضی رہنے کا نام بندگی ہے، اپنی طرف سے تجویز کرنا کہ یوں ہوتا تو یوں کرلیتا، یہ کوئی بندگی نہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج۱، ص ۱۸۳، ۱۸۴]

جہاز ، ائیر پورٹ ، اسٹیشن اور ریل گاڑی میں نماز معاف نہیں ہے

غیر مسلم ملکوں میں میرا اکثر جانا ہوتا ہے، وہاں بکثرت یہ بات دیکھنے میں آتی ہے کہ ایسے مقامات پر جہاں غیر مسلموں کی آمد و رفت ہے یا جہاں غیر مسلم کثرت سے موجود ہیں، وہاں بعض مسلمان نماز پڑھنے سے کتراتے ہیں، اس لئے کتراتے ہیں کہ اگر ہم یہاں نماز پڑھیں گے تو ہم ان کے سامنے تماشہ بن جائیں گے۔ اب اس ڈر سے نماز چھوڑنا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ یہ غیر مسلم لوگ ہمارا مذاق اڑائیں اور ہمیں تماشہ سمجھیں، اور اس نماز کی ہیئت کو ذلت کی ہیئت سمجھ کر ترک کرنا اور دوسرے لوگوں کے سامنے اس ہیئت میں آنے سے پرہیز کرنا یہ "تکبر مع اللہ" ہے۔ واقعۃً بعض جگہیں ایسی ہیں کہ اگر آدمی وہاں نماز پڑھے تو ایک تماشا بن جاتا ہے اور لوگ آکر دیکھتے ہیں کہ یہ کیا ہو رہا ہے۔

اب تو چونکہ مسلمان ہر جگہ پہنچ گئے ہیں، اس لئے الحمدللہ نماز اتنی اجنبی نہیں رہی، مجھے تو ایسی ایسی

جگہوں پر نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا جہاں ایک انسان بھی کلمہ گو نہیں تھا، لیکن سب سے زیادہ حسرت مجھے اندلس میں ہوئی، وہ اندلس جہاں مسلمانوں نے آٹھ سو سال تک حکومت کی، اور آٹھ سو سال تک جس کی فضاؤں میں اذان کی آوازیں گونجتی رہیں، جب میں وہاں ایئرپورٹ پر اترا تو نماز کا وقت تھا، نماز پڑھنے کے لئے ایک گوشہ تلاش کیا تاکہ وہاں نماز ادا کریں، میرے ساتھ ایک دوست بھی تھے، چنانچہ ایک گوشہ میں ہم دونوں نے نماز شروع کر دی، وہ گوشہ ایسا نہیں تھا جو بہت نمایاں ہو، اس لئے کہ آدمی نماز پڑھنے کے لئے ایسا گوشہ تلاش کرتا ہے جو ذرا آڑ میں ہو، لیکن میں نے دنیا میں لوگوں کے لئے نماز کو اتنی انجانی اور اچھنبی محسوس نہیں کی جیسی وہاں محسوس کی، پہلے تو ہمیں نماز پڑھتا دیکھ کر دو چار آدمی کھڑے ہو گئے، پھر وہ لوگ دوسروں کو بلا بلا کر لائے کہ دیکھو یہ کیا ہو رہا ہے، پھر تو باقاعدہ ہمیں دیکھنے کے لئے ٹھٹ کے ٹھٹ لگ گئے، گویا کہ آج تک انہوں نے یہ نظارہ دیکھا ہی نہیں تھا۔

مجھے حسرت اس بات کی ہوئی کہ مجھے امریکہ میں اور یورپ کے بہت سے ملکوں میں جو کفر کے بڑے بڑے مراکز ہیں، ان میں نماز پڑھنے کا اتفاق ہوا، لیکن کہیں بھی نماز اتنی اچھنبی محسوس نہیں کی گئی جتنی اندلس کے ایئرپورٹ پر محسوس کی گئی۔

اب اگر آدمی اس وجہ سے نماز چھوڑ دے کہ اگر میں یہاں نماز پڑھوں گا تو یہ لوگ تماشہ بنائیں گے اور برا سمجھیں گے یا نماز پڑھنے سے میری خفت ہوگی، تو یہ خطرناک خیال ہے اور یہ "تکبر مع اللہ" ہے۔

بعض جگہ نماز کو مؤخر کرنا اس لئے ضروری ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے سے کہیں اسلام کی غلط نمائندگی نہ ہو جائے، مثلاً ایک شخص ریل گاڑی میں سفر کر رہا ہے یا جہاز میں سفر کر رہا ہے، اور نماز پڑھنے کی اتنی جگہ ضروری ہے جس میں آدمی سجدہ کر سکے، لیکن نماز پڑھنے کے لئے اتنی جگہ حاصل کرنے کے لئے دوسرے کو تکلیف پہنچانی پڑے گی یا کسی کو اس کی جگہ سے اٹھانا پڑے گا، تو اگر اس تکلیف سے دوسرے کو بچانے کے لئے آدمی نماز مؤخر کر دے تو یہ مؤخر کرنا درست ہے، اس لئے کہ دوسرے کو تکلیف دے کر نماز پڑھنے سے غیر مسلموں کے سامنے اسلام کی غلط نمائندگی ہوگی، اور لوگ یہ سمجھیں گے کہ اسلام ایسا مذہب ہے جو لوگوں کو تکلیف دیتا ہے، لہٰذا اس وجہ سے نماز کا مؤخر کرنا صحیح ہے اور اس میں کوئی حرج نہیں۔ [اصلاحی مجالس، ج ۲، ص ۱۳۱]

جہاز میں وضو اور نماز کے بارے میں عدم توازن اور افراط و تفریط

بہر حال! ایک انتہاء تو یہ ہے کہ لوگ جہازوں میں نماز پڑھنے سے اس لئے گھبراتے ہیں کہ کہیں دوسروں کے سامنے تماشہ نہ بن جائیں اور نماز پڑھنے سے کہیں ہماری خفت نہ ہو۔ العیاذ باللہ۔ یہ تو "تکبر مع اللہ" ہے۔ دوسری انتہاء وہ ہے جو اس واقعہ سے سامنے آتی ہے، واقعہ یہ ہے کہ میں ایک مرتبہ جہاز میں

سفر کر رہا تھا، جہاز بھی چھوٹا تھا اور سفر بھی صرف ایک گھنٹے کا تھا، نماز کا وقت آ گیا تھا لیکن منزل پر پہنچ کر جہاز سے اتر کر آرام سے نماز پڑھ سکتے تھے، مگر میرے کچھ دوست جو میرے ساتھ تھے، ان کا اصرار یہ تھا نماز جہاز ہی میں پڑھنی ہے، یہاں وضو کرنا ہے، اذان دینی ہے اور پھر جماعت سے نماز پڑھنی ہے۔ چنانچہ جب وضو کرنے کا ارادہ کیا تو جہاز کے عملہ نے منع بھی کیا کہ یہاں وضو کرنا مشکل ہوگا لیکن وہ لوگ نہیں مانے اور اصرار کیا کہ ہم تو وضو کریں گے۔ چنانچہ دو آدمیوں نے غسل خانے میں جا کر اس شان سے وضو کیا کہ غسل خانے کا سارا فرش گیلا ہو گیا اور اس میں پانی بھر گیا۔ حالانکہ جب آدمی وضو کرے تو اس طرح وضو کرنا چاہئے کہ بعد میں آنے والے کو غسل خانے کے استعمال سے تکلیف نہ ہو لیکن ان حضرات نے اس کی کوئی پرواہ نہیں کی۔

اس کے بعد اذان کہی اور پھر کہا کہ ہم تو جماعت سے نماز پڑھیں گے، اب کوئی آ رہا ہے، کوئی جا رہا ہے، ان سب کے درمیان انہوں نے صف بنا کر نماز شروع کر دی، چونکہ بہر حال جہاز کے عملے کے لوگ مسلمان تھے، انہوں نے ان کی رعایت تو کی لیکن ہر ایک دوسرے سے کہہ رہا تھا کہ دیکھو انہوں نے کیا حرکت کی ہے۔ اب اگر ایک گھنٹہ کے بعد آرام سے منزل مقصود پر پہنچ کر وضو کر کے نماز پڑھ لیتے تو اس میں کیا حرج ہو جاتا لیکن اس عمل کے نتیجے میں ایک ہنگامہ پیدا کر دیا۔ اس کے نتیجے میں غسل خانہ الگ خراب کیا۔ اب جو شخص بھی غسل خانہ میں جا رہا ہے وہ ان کو برا کہہ رہا ہے کہ ان لوگوں نے یہ حرکت کی ہے، لوگوں کا راستہ الگ بند کیا۔ میں نے ان کو سمجھایا کہ ابھی نماز کو رہنے دو، اور میں بھی جہاز سے اتر کر نماز پڑھوں گا لیکن ان لوگوں نے بالکل نہیں سنی، یہ دوسری انتہاء ہے۔

جہاز اور ریل میں وضو کا صحیح طریقہ اور صفائی کا اہتمام

اس دوسری انتہاء میں ہم جیسے لوگ مبتلا ہو جاتے ہیں اور ہمیں ان باتوں کا خیال نہیں ہوتا۔ جہاز کا عملہ ہمیشہ لوگوں کو جہاز میں وضو کرنے سے منع کرتا ہے، اگر کسی شخص کے بارے میں یہ معلوم ہو جائے کہ یہ شخص غسل خانے میں جا کر وضو کرے گا تو اس کو روک دیتے ہیں، اس لئے کہ ان کو معلوم ہے کہ جب یہ شخص وضو کرے گا تو سارا غسل خانہ خراب کر کے آئے گا۔ میں جہازوں میں اکثر سفر کرتا رہتا ہوں، اور جہاز کے غسل خانہ میں ہمیشہ وضو کرتا ہوں، مجھے آج تک کسی نے وضو سے منع نہیں کیا، وجہ اس کی یہ ہے کہ میں اس بات کا اہتمام کرتا ہوں کہ جب میں وضو کر کے باہر نکلوں تو فرش پر پانی کی ایک چھینٹ بھی باقی نہ رہے اور غسل خانے کا واش بیسن بالکل صاف ستھرا رہے، تاکہ بعد میں آنے والے کو تکلیف نہ ہو۔

لہذا اگر ہم صفائی کا ذرا اہتمام کریں تو کوئی مشکل کام نہیں، غسل خانے میں تولئے موجود ہوتے ہیں اور ٹیشو پیپر، ٹوئیلیٹ پیپر ہوتے ہیں، آدمی فرش اور واش بیسن کو ان سے صاف کر لے لیکن ہم تو یہ سوچتے ہیں کہ بس ہم للہ فی اللہ وضو کر کے آ گئے، اب بعد میں آنے والے پر کیا گزرے گی، اس سے ہمیں کوئی بحث

نہیں، حالانکہ اس گندگی کے نتیجے میں دوسروں کو تکلیف دینے کا گناہ الگ ہوگا، اور لوگوں کو اسلام سے اور دین کے شعائر سے متنفر کرنے کا گناہ الگ ہوگا۔ العیاذ باللہ۔ [اصلاحی مجالس، ج ۲، ص ۳۴]

فرائض میں کیفیات ہرگز مقصود نہیں

ہمارے دلوں میں ہر وقت یہ اشکال رہتا ہے کہ اتنے دن سے نماز پڑھ رہے ہیں، تسبیح پڑھ رہے ہیں، ذکر بھی کر رہے ہیں، معمولات بھی ہیں، نفلیں بھی پڑھی ہیں، تہجد اور اشراق بھی پڑھ رہے ہیں، لیکن دل کی حالت میں تبدیلی کیوں نظر نہیں آ رہی ہے؟ کوئی کیفیت کیوں پیدا نہیں ہو رہی ہے؟

خوب سمجھ لو کہ یہ کیفیات ہرگز مقصود نہیں اور جو کچھ عمل کی توفیق ہو رہی ہے، یہ اللہ تبارک وتعالیٰ ہی کی طرف سے انعام ہے اور یہ جو فکر ہوتی ہے کہ یہ اعمال پتہ نہیں قبول ہوتے ہیں کہ نہیں؟ یہ خوف دل میں ہونا چاہیے اور یہ سوچے کہ اپنی ذات میں تو یہ عمل اس قابل نہیں تھا کہ اس کو اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش کیا جائے لیکن جب اس نے اس عمل کی توفیق دے دی تو اس کی رحمت سے یہ بھی امید ہے کہ یہ عمل قبول ہوگا۔

[اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۵۶]

صرف نفلی عبادات ہی نجات کے لیے کافی نہیں

پہلا جملہ یہ ارشاد فرمایا کہ "اتق المحارم تکن أعبد الناس" یعنی تم حرام کاموں سے بچو تو تم تمام لوگوں میں سب سے زیادہ عبادت گذار بن جاؤ گے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملہ کے ذریعے یہ حقیقت واضح فرمادی کہ فرائض وواجبات کی تعمیل کے بعد سب سے زیادہ اہم چیز مؤمن کے لیے یہ ہے کہ وہ اپنے آپ کو ناجائز وحرام کاموں سے بچائے، نفلی عبادتوں کا معاملہ اس کے بعد آتا ہے، اگر کوئی شخص اس دنیا میں اپنے آپ کو گناہوں سے بچالے تو ایسا شخص سب سے زیادہ عبادت گذار ہے، چاہے وہ نفلیں زیادہ نہ پڑھتا ہو۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس جملے کے ذریعہ ایک بڑی غلط فہمی کا ازالہ فرمایا ہے، وہ یہ کہ ہم لوگ بسا اوقات نفلی عبادتوں کو تو بہت اہمیت دیتے ہیں، مثلاً نوافل پڑھنا، تسبیح، مناجات، تلاوت وغیرہ، حالانکہ ان میں کوئی ایک کام بھی ایسا نہیں جو فرض ہو، چاہے نفلیں نمازیں ہوں، یا نفلی روزے ہوں، یا نفلی صدقات ہوں، ان کو تو ہم نے بڑی اہمیت دی ہوئی ہے، لیکن گناہوں سے بچنے کا اور ان کو ترک کرنے کا اہتمام نہیں، یاد رکھیں! کہ یہ نفلی عبادات انسان کو نجات نہیں دلاسکتیں، جب تک انسان گناہوں کو نہ چھوڑے، اب رمضان المبارک کا مہینہ چل رہا ہے، اس ماہ مبارک میں لوگوں کی نفل عبادات کی طرف توجہ ہوتی ہے کہ عام دنوں کے مقابلے میں زیادہ نفلی پڑھ لیں، تلاوت زیادہ کرلیں، ذکر وتسبیح زیادہ کرلیں، یہ بھی اچھی بات ہے، لیکن کوئی یہ نہیں سوچتا کہ میں نفل عبادات تو کر رہا ہوں ساتھ میں گناہ بھی تو کر رہا ہوں، اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو حرام اور

ناجائز قرار دیا ہے ان کے اندر مبتلا ہو رہا ہوں، دونوں کا اگر موازنہ کریں تو یہ نظر آئے گا کہ نفلی عبادات سے جو فائدہ ہو رہا تھا وہ گناہوں کے ذریعے نکل رہا ہے۔

اب رمضان المبارک میں تراویح پڑھنے کا کتنا اہتمام ہم لوگ کر رہے ہیں، جو لوگ پنج وقتہ نمازوں میں کوتاہی کرتے ہیں، ان کو بھی رمضان میں تراویح کی لمبی لمبی بیس رکعتوں میں کھڑے ہونے میں کوئی تأمل نہیں ہوتا، اور رات کو سحری کے وقت تہجد بھی پڑھ لیتے ہیں، لہذا نفلی عبادات تو ہو رہی ہیں، لیکن اس شخص کو یہ فکر نہیں کہ جب شام کا افطار کرنے کے لیے دسترخوان پر بیٹھیں گے تو وہ کھانا حلال ہوگا یا حرام ہوگا؟ سارا دن روزہ رکھا، رات کو تراویح ادا کی، تہجد پڑھی، لیکن منہ میں جو لقمہ جا رہا ہے وہ حلال کا ہے یا حرام کا ہے؟ اس کی فکر نہیں، اس حدیث کے ذریعے حضور اقدس ﷺ یہ فرما رہے ہیں کہ اصل فکر اس کی کرو کہ کوئی گناہ تم سے سرزد نہ ہو، اگر یہ کر لیا تو پھر چاہے نفلی عبادات تم نے زیادہ نہ کی ہوں، تو بھی تمام لوگوں میں تم سب سے زیادہ عبادت گذار لکھے جاؤ گے۔

اس کی مثال ایسی ہے جیسے آپ نے کمرے کا ائیر کنڈیشن تو چلا دیا، لیکن دروازے اور کھڑکیاں کھلی پڑی ہیں، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ ایک طرف سے ٹھنڈک آرہی ہے اور دوسری طرف سے ٹھنڈک نکل رہی ہے اور باہر کی گرمی بھی اندر آرہی ہے اور اس کے نتیجے میں کمرہ ٹھنڈا نہیں ہو رہا ہے، اور ائیر کنڈیشن چلانے کا کوئی فائدہ نہیں ہو رہا ہے، اسی طرح آپ نے نفلوں کا ائیر کنڈیشن تو لگا لیا، ذکر اور تلاوت کا ائیر کنڈیشن تو لگا لیا، لیکن گناہوں کی کھڑکیاں چاروں طرف سے کھلی ہوئی ہیں، نتیجہ یہ ہے کہ ان عبادات سے جو فائدہ حاصل ہونا چاہیے تھا وہ حاصل نہیں ہو رہا ہے۔

اس بات کو ایک مثال سے اور زیادہ واضح طریقے پر سمجھ لیں، فرض کریں کہ ایک شخص نفلی عبادات بھی کرتا ہے، ذکر میں، تلاوت میں مشغول رہتا ہے، ہر وقت اس کی تسبیح چلتی رہتی ہے، لیکن ساتھ میں وہ گناہ بھی کرتا رہتا ہے، دوسرا شخص وہ ہے جس نے زندگی بھر ایک نفلی عبادت نہیں کی، لیکن زندگی بھر اس نے کوئی گناہ بھی نہیں کیا، بتاؤ! ان دونوں میں سے افضل کون ہے؟ وہ شخص افضل ہے جس نے گناہوں سے بچتے ہوئے زندگی گذاری، اگرچہ نفلی عبادتوں میں اس کا کوئی خاص حصہ نہیں ہے، اس شخص سے آخرت میں یہ سوال نہیں ہوگا کہ تم نے نفلی عبادات کیوں نہیں کیں؟ کیونکہ نفلی عبادات فرض نہیں ہیں، لہذا ان شاء اللہ وہ سیدھا جنت میں جائے گا، اس کے برخلاف پہلا شخص جو نفلی عبادات میں تو بہت مشغول رہا، لیکن ساتھ ساتھ گناہ بھی کرتا رہا، اور گناہ ایسی چیز ہے جس کے بارے میں آخرت میں سوال ہوگا "من یعمل مثقال ذرۃ شرا یرہ" لہذا اس سے یہ سوال ہوگا کہ تو نفلی عبادات تو کرتا رہا اور یہ گناہ کا کام بھی کرتا رہا، نتیجہ یہ ہوگا کہ ایسا شخص بڑے خسارے میں ہوگا۔ [اصلاحی خطبات، ج ١٦، ص ٩٠]

اس حدیث سے بھی یہ بات واضح ہوگئی کہ نفلی عبادات بیشک اعلیٰ درجے کی نعمت ہے، ضرور ان کو

انجام دینا چاہیے ،لیکن اس کے ساتھ زیادہ فکر اپنے آپ کو گناہوں سے بچانے کی کرنی چاہیے ، رمضان المبارک میں تو الحمدللہ، اللہ تعالیٰ کی توفیق سے روزے رکھے، تلاوت بھی خوب کی، تراویح بھی باجماعت ادا کی ،تہجد بھی پڑھی، نوافل بھی پڑھیں ، اعتکاف بھی کیا، لیکن ادھر رمضان رخصت ہوا ادھر دوبارہ وہی پرانی زندگی شروع ہوگئی ، اب نہ آنکھ کی حفاظت ، نہ زبان کی حفاظت ، نہ کان کی حفاظت ، نہ حلال وحرام کی فکر، جس کا مطلب یہ ہوا کہ رمضان المبارک میں جو پونجی نیکیوں کی جمع کی تھی وہ جا کر لٹادی ، لہذا فکر اس کی کرنی ہے کہ گناہوں سے بچ جائیں ، اور گناہوں سے بچنے کا پکا عزم بھی کریں ، اور ساتھ میں اللہ تعالیٰ سے گناہوں سے بچنے کی توفیق کی دعا بھی کریں کہ یا اللہ! مجھے گناہوں سے بچنے کی توفیق بھی دے دے۔

یہ جو میں نے عرض کیا کہ ہمارے دلوں میں نفلی عبادات کی تو اہمیت ہے، لیکن گناہوں سے بچنے کی اہمیت اور فکر نہیں ، یہ ایک ایسا مرض ہے جس میں ہم سب مبتلا ہیں ، شاید ہی کوئی اللہ کا بندہ اس سے مستثنیٰ ہوگا ، اس لیے کہ بعض گناہ تو ایسے ہیں جن کو ہم گناہ سمجھتے ہیں اور گناہ سمجھنے کی وجہ سے ان سے نفرت بھی ہوتی ہے، ان سے اپنے آپ کو بچانے کی کچھ فکر بھی ہو جاتی ہے، الحمدللہ! لیکن کتنے گناہ ایسے ہیں جن کو گناہ سمجھا ہی نہیں جاتا ، یہ بڑی خطرناک بات ہے ، کیونکہ انسان بیماری کو بیماری سمجھے گا تو اس کا علاج بھی کرے گا ، خاص طور پر شریعت کے یہ تین شعبے یعنی معاملات، معاشرت اور اخلاقیات ایسے ہیں جن پر عمل نہ کرنے کی وجہ سے ہماری ساری کوششیں اکارت ہو رہی ہیں ، معاملات میں حلال وحرام کی فکر ، معاشرت میں حلال وحرام کی فکر ، اخلاقیات میں حلال وحرام کی فکر مٹتی جارہی ہے اور ان کو ہم نے دین سے خارج کر دیا ہے، زبان کی حفاظت ، آنکھ کی حفاظت، کان کی حفاظت کی طرف دھیان نہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۶، ۹۴]

ہم نے اللہ کو کب اور کیسے بھلادیا ؟ ہم نماز تو پڑھتے ہیں اور روزے بھی رکھتے ہیں

عام طور پر لوگوں کے ذہنوں میں یہ خیال آتا ہے کہ ہم نے اللہ تعالیٰ کو کہاں بھلادیا، اللہ تعالیٰ نے ہمیں حکم دیا کہ نماز پڑھو، ہم نماز پڑھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ جمعہ کی نماز کے لیے آؤ، ہم جمعہ کی نماز کے لیے آرہے ہیں ، اللہ تعالیٰ کا حکم تھا کہ رمضان میں روزے رکھو تو ہم روزے رکھ رہے ہیں ، لہذا ہم نے اللہ کو نہیں بھلایا۔

بات دراصل یہ ہے کہ لوگوں نے صرف نماز پڑھنے اور روزے رکھنے کو دین سمجھ لیا ہے اور زکوۃ دینے اور حج کرنے اور عمرے کرنے کو دین سمجھ لیا ہے ، حالانکہ دین کے بے شمار شعبے ہیں ، اس میں معاملات بھی ہیں، اس میں معاشرت بھی ہے، اس میں اخلاق بھی ہے، یہ سب دین کے شعبے ہیں، اب ہم نے نماز تو پڑھ لی اور روزہ بھی رکھ لیا، زکوۃ کا وقت آیا تو زکوۃ بھی دے دی، عمرے کر کے خوب سیر سپاٹے بھی

کر لیے، لیکن جب اللہ تعالیٰ کے حکم آگے اپنے مصالح کو قربان کرنے کا موقع آتا ہے تو وہاں پھسل جاتے ہیں اور تاویل شروع کر دیتے ہیں کہ آج کل سب لوگ ایسا کر رہے ہیں اور حالات ایسے ہیں وغیرہ وغیرہ، آج ہم اللہ تعالیٰ کے احکام کو بھلائے ہوئے ہیں، خاص طور سے اپنی معاشرت کی زندگی میں، اپنے معاملات کی زندگی میں، اخلاق کی زندگی میں اور سیاست کی زندگی میں اسلام کو اور اسلامی احکام کو فراموش کیا ہوا ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۵ص ۱۱۱]

قضاء نمازوں کا حساب کس طرح کیا جائے؟

سب سے پہلے معاملہ نماز کا ہے، بالغ ہونے کے بعد سے اب تک جتنی نمازیں قضا ہوئی ہیں، ان کا حساب لگائے، بالغ ہونے کا مطلب یہ ہے کہ لڑکا اس وقت بالغ ہوتا ہے جب اس کو احتلام ہو، اور لڑکی اس وقت بالغ ہوتی ہے جب اس کو حیض آنا شروع ہو جائے، لیکن اگر کسی کے اندر یہ علامتیں ظاہر نہ ہوں، تو اس صورت میں، جس دن پندرہ سال عمر ہو جائے اس وقت وہ بالغ ہو جاتا ہے، چاہے لڑکا ہو یا لڑکی ہو، اس دن سے اس کو بالغ سمجھا جائے، اس دن سے اس پر نماز بھی فرض ہے، روزے بھی فرض ہیں، اور دوسرے فرائض دینیہ بھی اس پر لاگو ہو جائیں گے۔

لہذا انسان سب سے پہلے یہ حساب لگائے کہ جب سے میں بالغ ہوا ہوں، اس وقت سے اب تک کتنی نمازیں چھوٹ گئی ہیں، بہت سے لوگ تو ایسے بھی ہوتے ہیں جو دین دار گھرانے میں پیدا ہوئے، اور بچپن ہی سے ماں باپ نے نماز پڑھنے کی عادت ڈال دی، جس کی وجہ سے بالغ ہونے کے بعد سے اب تک کوئی نماز قضا ہی نہیں ہوئی، اگر ایسی صورت ہے تو سبحان اللہ! اور ایک مسلمان گھرانے میں ایسا ہی ہونا چاہیے، اس لیے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب بچہ سات سال کا ہو جائے تو اس کو مار کر نماز پڑھواؤ، لیکن اگر بالفرض بالغ ہونے کے بعد غفلت کی وجہ سے نمازیں چھوٹ گئیں تو ان کی تلافی کرنا فرض ہے، تلافی کا طریقہ یہ ہے کہ اپنی زندگی کا جائزہ لے کر یاد کرے کہ میرے ذمے کتنی نمازیں باقی ہیں؟ اگر ٹھیک ٹھیک حساب لگانا ممکن ہو تو ٹھیک ٹھیک حساب لگا لے، لیکن اگر ٹھیک ٹھیک حساب لگانا ممکن نہ ہو تو اس صورت میں ایک محتاط اندازہ کر کے اس طرح حساب لگائے کہ اس میں نمازیں کچھ زیادہ تو ہو جائیں، لیکن کم نہ ہوں، اور پھر اس کو ایک کاپی میں لکھ لے کہ: "آج اس تاریخ کو میرے ذمے اتنی نمازیں فرض ہیں اور آج سے میں ان کو ادا کرنا شروع کر رہا ہوں، اور اگر میں اپنی زندگی میں ان نمازوں کا ادا نہ کر سکا تو میں وصیت کرتا ہوں کہ میرے ترکے سے ان نمازوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے"۔ [اصلاحی خطبات، ج ۶ص ۵۵]

قضا نمازوں کا فدیہ ادا کرنے کی وصیت

یہ وصیت لکھنا اس لیے ضروری ہے کہ اگر آپ نے یہ وصیت نہیں لکھی اور قضا نمازوں کو ادا کرنے

سے پہلے آپ کا انتقال ہوگیا تو اس صورت میں ورثاء کے ذمے شرعاً یہ ضروری نہیں ہوگا کہ آپ کی نمازوں کا فدیہ ادا کریں، یہ فدیہ ادا کرنا ان کی مرضی پر موقوف ہوگا، چاہیں تو دیں اور چاہیں تو نہ دیں، اگر فدیہ ادا کردیں گے تو یہ ان کا احسان ہوگا، شرعاً ان کے ذمے فرض وواجب نہیں، لیکن اگر آپ نے فدیہ ادا کرنے کی وصیت کردی تو اس صورت میں ورثاء شرعاً اس بات کے پابند ہوں گے کہ وہ کل مال کے ایک تہائی ترکہ کی حد تک اس وصیت کو نافذ کریں اور نمازوں کا فدیہ ادا کریں۔

لہذا اگر تم نے نمازوں کا فدیہ ادا کرنے کی وصیت نہیں کی تو اگر چہ تمہارے وارثوں کو لاکھوں روپے مل گئے ہوں تب بھی ان پر یہ واجب نہیں ہے کہ وہ تمہاری نمازوں کا فدیہ ادا کریں، ہاں! اگر وہ اپنی خوشی سے تمہاری نمازوں کا فدیہ ادا کردیں تو ان کو اختیار ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ ہر وہ شخص جو اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور اس کے پاس کوئی بات وصیت لکھنے کے لیے موجود ہو تو اس کے لیے دو راتیں بھی وصیت لکھے بغیر گذارنا جائز نہیں۔

[ترمذی: ص ۳۳ ج ۲]

لہذا اگر کسی کے ذمے نمازیں قضا ہیں تو اس حدیث کی روشنی میں اس کو وصیت لکھنا ضروری ہے، اب ہم لوگوں کو ذرا اپنے گریبان میں منہ ڈال کر دیکھنا چاہیے کہ ہم میں سے کتنے لوگوں نے اپنا وصیت نامہ لکھ کر رکھا ہوا ہے، حالانکہ وصیت نامہ نہ لکھنا ایک مستقل گناہ ہے، جب تک وصیت نامہ نہیں لکھے گا اس وقت تک یہ گناہ ہوتا رہے گا، اس لیے فوراً آج ہی ہم لوگوں کو اپنا وصیت نامہ لکھ لینا چاہیے، اگر یہ دو کام کر لیے تو پھر اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید ہے کہ اگر بالفرض نمازیں پوری ہونے سے پہلے ہی وفات ہوگئی تو ان شاء اللہ معافی ہو جائے گی، لیکن اگر یہ دو کام نہ کیے، نہ تو وصیت کی اور نہ ہی نمازوں کو ادا کرنا شروع کیا تو اس کا مطلب یہ ہے کہ نماز جیسے عظیم الشان فریضے سے یہ شخص غافل ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۶، ص ۵۶]

قضاء (عمری) نمازوں کو کس طرح ادا کیا جائے؟

اس کے بعد ان قضا نمازوں کو ادا کرنا شروع کردے، ان کو ''قضاء عمری'' بھی کہتے ہیں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ ایک مستقل کاپی بنائے، اس کاپی کے اندر لکھے کہ میرے ذمے اتنی نمازیں باقی ہیں، اگر پوری طرح یاد نہ ہوں تو ایک احتیاطی تخمینہ لگا کر ان کی تعداد لکھے اور یہ لکھے کہ میں آج فلاں تاریخ سے ان نمازوں کی ادائیگی شروع کر رہا ہوں، اس کا طریقہ یہ ہے کہ ہر وقتی نماز کے ساتھ ایک نماز قضا بھی پڑھ لے، مثلاً فجر کے ساتھ فجر، ظہر کے ساتھ ظہر، عصر کے ساتھ عصر، مغرب کے ساتھ مغرب اور عشا کے ساتھ عشا، اور اگر کسی کے پاس وقت زیادہ ہو تو ایک سے زیادہ بھی پڑھ سکتا ہے، تاکہ جتنی جلدی یہ نمازیں پوری ہو جائیں اتنا ہی بہتر ہے، بلکہ وقتی نمازوں کے ساتھ جو نوافل ہوتے ہیں، ان کے بجائے قضا نماز پڑھ لے، اور نماز فجر کے

بعد اور عصر کی نماز کے بعد نفلی نماز پڑھنا تو جائز نہیں، لیکن قضا نماز پڑھنا جائز ہے، اس میں اللہ تعالی نے اتنی آسانی فرمادی ہے، ہمیں چاہیے کہ ہم اس آسانی سے فائدہ اٹھائیں، اور جتنی جلدی نمازیں ادا کرتے جائیں، اس کاپی میں ساتھ ہی ساتھ لکھتے جائیں کہ اتنی ادا کرلیں اتنی باقی ہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۶ ص ۵۷]

قضا نماز کی نیت کس طرح کریں ؟

ہر قضا نماز کی نیت کا طریقہ یہ ہے کہ مثلاً فجر کی نماز قضا کر رہا ہے تو یہ نیت کرے کہ میرے ذمے جتنی فجر کی نمازیں قضا ہیں، ان میں سب سے پہلی فجر کی نماز پڑھ رہا ہوں، اسی طرح ظہر کی نماز قضا کرتے وقت یہ نیت کر کے کہ میرے ذمے ظہر کی جتنی نمازیں قضا ہیں، ان میں سے سب سے پہلی ظہر کی نماز پڑھ رہا ہوں، اسی طرح عصر، مغرب اور عشا میں نیت کرے، اور اگلے روز پھر یہی نیت کرے اور اس سے اگلے روز پھر یہی نیت کرے۔

سنتوں کے بجائے قضا نماز پڑھنا درست نہیں

بعض لوگ یہ مسئلہ پوچھتے ہیں کہ چونکہ ہمارے ذمے قضاء نمازیں بہت باقی ہیں تو کیا ہم سنتیں پڑھنے کے بجائے قضا پڑھ سکتے ہیں؟ تاکہ قضا نمازیں جلد پوری ہوجائیں؟ اس کا جواب یہ ہے کہ سنت مؤکدہ پڑھنی چاہیے، ان کو چھوڑنا درست نہیں، البتہ نوافل کے بجائے قضا نمازیں پڑھنا جائز ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۶ ص ۵۸]

قضا نمازوں کی ادائیگی میں ایک سہولت

پھر قضا نماز کے لیے اللہ تعالی نے یہ سہولت رکھی ہے کہ اس کو ایسے وقت میں بھی پڑھا جا سکتا ہے جس وقت میں دوسری نمازیں نہیں پڑھی جاسکتیں، مثلاً صبح صادق کے بعد سے طلوع آفتاب تک کوئی نفل یا سنت پڑھنا جائز نہیں، لیکن قضا نماز کی اس وقت بھی اجازت ہے، یا مثلاً عصر کی نماز کے بعد سے غروب آفتاب تک کوئی نفل یا سنت نہیں پڑھ سکتے، یہاں تک کہ طواف کی دوگانہ بھی عصر کے بعد پڑھنا جائز نہیں، بلکہ اگر کسی نے عصر کی نماز کے بعد کئی طواف کرلیے ہیں تو اس کے لیے یہ حکم یہ ہے کہ وہ مغرب کی نماز کے بعد تمام واجب طواف ایک ساتھ ادا کرے، لیکن قضا نماز اس وقت بھی جائز ہے، اللہ تعالی نے یہ سہولت اور آسانی اسی لیے دی ہے کہ مسلمان کو جب بھی اپنی قضا نمازوں کو ادا کرنے کا خیال آئے تو وہ اسی وقت سے ادا کرنا شروع کردے، اس کے لیے کوئی رکاوٹ نہ ہو۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۲ ص ۱۷۵]

قضائے عمری نمازوں کی ادائیگی کا انکار غلط نظریہ ہے

آج کل یہ مسئلہ بہت زوروشور سے پھیلایا جارہا ہے کہ قضاء عمری کوئی چیز نہیں، دلیل اس کی یہ پیش کرتے ہیں کہ حدیث شریف میں آیا ہے کہ "الإسلام يهدم ما كان قبله" یعنی اگر کوئی شخص نیا مسلمان ہو تو اسلام لانے سے پہلے جو اس نے گناہ کے تھے، اسلام لانے سے وہ سب ختم ہوجاتے ہیں، مثلاً اگر کوئی شخص ستر سال کی عمر میں اسلام لایا تو اب اسلام لانے کے بعد گذشتہ ستر سال کی نمازیں قضا کرنے کی ضرورت نہیں، بلکہ جب وہ آج اسلام لایا تو اب آج ہی سے نمازیں شروع کردے۔

بعض لوگوں نے اسلام لانے پر توبہ کرنے کو بھی قیاس کرلیا، وہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کسی شخص نے ساری عمر نمازیں نہیں پڑھیں، اب توبہ کرلی، تو اب گذشتہ زمانے کی نمازیں قضا کرنے کی ضرورت نہیں۔

یہ بات درست نہیں، اس لیے کہ توبہ کو اسلام پر قیاس کرنا درست نہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ جو شخص ابھی مسلمان ہوا ہے، وہ جب کافر تھا تو اس کفر کے زمانے وہ فروع کا مخاطب ہی نہیں تھا، اس کو تو یہ حکم تھا پہلے اسلام لاؤ، اس زمانے میں اس پر نماز فرض نہیں تھی، کیونکہ نماز تو اس وقت فرض ہوگی جب وہ مسلمان ہوگا، اس لیے گذشتہ زمانے کی نمازیں اس پر قضا کرنی ضروری نہیں۔

بخلاف مسلمان کے، اس پر تو بالغ ہوتے ہی نماز فرض ہوگئی اور جب اس نے وہ نمازیں نہیں پڑھیں تو وہ اس کے ذمے پر باقی رہیں، ایک عرصہ دراز کے بعد جب اس نے نماز چھوڑنے کے گناہ سے توبہ کی، تو توبہ کا اصول یہ ہے کہ جس گناہ سے توبہ کی ہے، اگر اس کی تلافی ممکن ہے تو تلافی کیے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی، لہذا اس کے ذمے ان نمازوں کی قضا ضروری ہوگی، اسی طرح اگر روزے چھوڑے ہیں تو ان روزوں کی قضا کرنی ہوگی، کیونکہ روزے اس کے ذمے باقی ہیں۔

ورنہ اس کی تو کوئی معقول وجہ نہیں کہ ایک شخص تو اسّی سال تک مسلسل نماز پڑھتا رہے اور دوسرا شخص اسّی سال تک نماز نہ پڑھے اور پھر آخر میں اللہ تعالی سے توبہ استغفار کرلے کہ یا اللہ! میں توبہ استغفار کرتا ہوں اور اس توبہ کے نتیجے میں اس کی ساری نمازیں معاف ہوجائیں، یہ تو کوئی معقول بات نہیں، بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر ایک دن کی نمازیں قضا ہوجائیں تو ان کو قضا کرلو اور پڑھ لو، لیکن اگر ایک دن سے زیادہ کی نمازیں قضا ہوجائیں تو ان کو قضا کرنے کی ضرورت نہیں، صرف توبہ کرلو، یہ عجیب مسئلہ اپنی طرف سے بنالیا ہے، اس کے ذریعہ لوگوں کے ہاتھ میں بڑا اچھا نسخہ آ گیا کہ جب نمازیں قضا ہوجائیں تو ان کو ایک دن سے زیادہ کرلو اور اس کے بعد توبہ کرلو، یہ سب فضول باتیں ہیں، کیونکہ توبہ کا اصول یہ ہے کہ جس کی تلافی ممکن ہو، اس کی تلافی کیے بغیر توبہ قبول نہیں ہوتی۔

مثلاً ایک شخص بہت عرصے تک شراب پیتا رہا، اب توبہ کرنے کی توفیق ہوئی تو بس توبہ کرلینا کافی ہے، کیونکہ اس کی تلافی کی کوئی صورت نہیں، تلافی کے بغیر ہی اللہ تعالی اس کی توبہ قبول فرمالیں گے، یا مثلاً کسی

شخص نے کچھ پیسے چوری کیے اور کھا لیے، بعد میں توبہ کی توفیق ہوئی تو اس کی تلافی ممکن ہے، وہ اس طرح کہ جس کے پیسے چوری کیے تھے اس کو پیسے واپس کرے یا اس سے معاف کرائے، اس کے بغیر توبہ قبول نہیں ہوگی، یا مثلاً گذشتہ سالوں کی زکوۃ ادا نہیں کی، اب توبہ کی توفیق ہوئی تو جب تک گذشتہ سالوں کی زکوۃ ادا نہیں کرے گا، اس وقت تک توبہ قبول نہیں ہوگی، یہی معاملہ نمازوں کا اور روزوں کا ہے کہ جب تک ان کو ادا نہیں کرے گا، صرف توبہ کر لینے سے معاف نہیں ہوں گے۔

بہر حال! توبہ تفصیلی یہ ہے کہ انسان اپنی گذشتہ زندگی کا جائزہ لے کر دیکھے کہ میرے ذمے اللہ تعالیٰ کے یا بندوں کے حقوق کچھ واجب ہیں یا نہیں؟ حقوق اللہ میں نماز کو دیکھے کہ میرے ذمے کتنی نمازیں باقی ہیں، ان کو قضا کرنے کی فکر کرے۔ [اصلاحی مجالس، ج ۵، ص ۲۳۱]

تمام عبادات کا فدیہ ترکہ کے ایک تہائی سے ادا ہوگا

لہٰذا اگر ہمارے ذمے نمازیں رہ گئی ہیں تو ان نمازوں کا فدیہ اس ایک تہائی سے ادا ہوگا، اگر روزے چھوٹ گئے ہیں تو ان روزوں کا فدیہ بھی اسی ایک تہائی سے ادا ہوگا، اگر زکوۃ باقی رہ گئی ہے تو اس کی ادائیگی بھی اسی ایک تہائی سے ہوگی، اگر حج رہ گیا ہے تو وہ بھی اسی ایک تہائی سے ادا ہوگا، اور تہائی سے باہر کی وصیت وارثوں کے ذمہ لازم نہیں ہوگی، اس لیے زندگی میں حج ادا نہ کرنا بڑا خطرناک ہے، کیونکہ اگر ہم وصیت بھی کر جائیں کہ ہمارے مال سے حج ادا کر دیا جائے لیکن ترکہ اتنا نہ ہو جس کے ایک تہائی سے حج ادا ہو سکے تو ان کے ذمے اس وصیت کو پورا کرنا لازم نہیں ہوگا، اگر حج کرا دیں تو یہ ان کا ہم پر احسان ہوگا اور اگر حج نہ کرائیں تو ان پر آخرت میں کوئی گرفت نہیں ہوگی۔

"نماز میں مزہ نہیں آتا"

ایک صاحب نے حضرت تھانویؒ کو لکھا کہ حضرت! نماز پڑھتے ہوئے ساری عمر گذر گئی مگر نماز میں مزہ ہی نہیں آیا، کچھ علاج فرما دیں، حضرت نے جواب میں لکھا کہ نماز میں مزہ آنا کوئی ضروری نہیں، تم مزہ کی خاطر نماز پڑھ رہے ہو یا اللہ تعالیٰ کی بندگی کی خاطر نماز پڑھ رہے ہو کہ چونکہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہے اس لیے نماز پڑھ رہا ہوں، ارے! اگر مزہ کی خاطر نماز پڑھی جا رہی ہے تو وہ نماز ہی کیا ہوئی، نماز تو وہ ہے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی خاطر اور اس کی بندگی کی خاطر پڑھی جائے، چاہے اس نماز میں مزہ آئے یا نہ آئے، تکلیف ہو یا مشقت ہو۔

اسی لیے حضرت گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کو ساری عمر کبھی نماز میں مزہ نہ آیا ہو، لطف نہ آیا ہو اور اس پر کبھی سرور کی کیفیت طاری نہ ہوئی ہو، میں اس شخص کو مبارک باد دیتا ہوں، کیوں؟ اس لیے کہ اگر اس کو نماز کے اندر مزہ آتا یا نماز کے اندر اس کو کوئی کیف و سرور حاصل ہو جاتا تو خطرہ یہ تھا کہ کہیں وہ اسی کو مقصود سمجھ

بیٹھتا اوراسی کو حاصل نماز سمجھ لیتا، اس کے نتیجے میں وہ گمراہی میں مبتلا ہوجاتا، اللہ تعالیٰ نے اس کو احوال وکیفیات سے دور رکھ کر گمراہی سے بچالیا، بہرحال! عبادات کی ادائیگی میں ان سرور اور کیفیات کے پیچھے مت پڑو، ان کیفیات کی وجہ سے یا تو عجب اور ناز پیدا ہوجاتا ہے، یا اس کو اصل مقصود سمجھ لینے سے کسی وقت اس میں کمی آجانے پر خود کو ناکام اور محروم سمجھ بیٹھتا ہے، دونوں صورتوں میں نقصان ہے، اس لیے کیفیات ہر شخص کے لیے موزوں بھی نہیں، لہذا ان کی فکر ہی نہ کی جائے، بس اللہ تعالیٰ کا جو حکم ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جو سنت ہے اس پر سیدھے سیدھے عمل کرتے چلے جاؤ، اس فکر میں مت پڑو کہ رونا آیا کہ نہیں آیا، دل چلا کہ نہیں، وجد طاری ہوا کہ نہیں، مزہ آیا کہ نہیں آیا۔ [اصلاحی مجالس، ج ۲، ص ۲۷۹]

نفسانیت اور روحانیت میں کیا فرق ھے ؟

ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحبؒ نے ایک دن بڑی عجیب بات ارشاد فرمائی، فرمایا کہ ''نفسانیت'' اور ''روحانیت'' ان دونوں میں بڑا باریک فرق ہے، اور یہ پہچاننا بڑا مشکل ہے کہ کیا چیز نفسانیت ہے اور کیا چیز روحانیت ہے؟ کس چیز میں نفسانیت آرہی ہے اور کس چیز میں روحانیت ہورہی ہے؟ پھر یہ فرق سمجھانے کے لیے ہم سے ایک سوال کیا کہ ایک شخص ریٹائرڈ زندگی گذار رہا ہے اور اس کے بیٹے جوان ہیں جو کمارہے ہیں، کھا رہے ہیں، بیٹیوں کی شادی کردی اور یہ فارغ البال ہے، پنشن مل رہی ہے اور اچھے طریقے سے گذارا ہورہا ہے، کوئی فکر نہیں، کوئی مشغلہ نہیں، اس کا معمول یہ ہے کہ اذان سے بھی پہلے نماز کے لیے تیار ہوکر وضو کرکے تحیۃ الوضو پڑھتا ہے اور اذان سنتا ہے، فوراً ہی مسجد میں پہنچتا ہے، پھر اطمینان سے تحیۃ المسجد پڑھتا ہے، پھر سنتیں پڑھتا ہے، اور پھر اطمینان سے جماعت کے انتظار میں بیٹھا رہتا ہے، یہاں تک کہ نماز کی جماعت کا وقت آجاتا ہے تو فرض نماز جماعت کے ساتھ اطمینان سے خشوع وخضوع کے ساتھ ادا کرتا ہے اور اس کو اپنی نماز میں بڑا لطف آتا ہے اور اس کو نماز میں عجیب نورانیت، سرور اور سکون محسوس ہوتا ہے، ایک حال یہ ہے۔

دوسری طرف ایک شخص وہ ہے جو ٹھیلہ لگاتا ہے اور صبح سے شام تک آوازیں لگا کر اپنا سامان بیچتا ہے اور اپنا اور اپنی بیوی بچوں کا پیٹ پالتا ہے، اس ذریعہ سے حلال روزی کماتا ہے، مگر جب اذان کی آواز آئی تو اس کو نماز کی فکر لگ گئی، اس نے چاہا کہ میں جلدی گاہکوں کو نمٹاؤں اور پھر نماز ادا کروں، چنانچہ کبھی ایک کو سامان دے رہا ہے، کبھی دوسرے کو سامان دے رہا ہے، یہاں تک کہ عین نماز کا وقت آگیا تو اس نے گاہکوں سے کہا کہ میں ابھی نماز پڑھ کر آتا ہوں، یہ کہہ کر اس نے جلدی سے ٹھیلہ ایک طرف کھڑا کیا اور اس پر کپڑا ڈالا اور بھاگا بھاگا مسجد گیا، جلدی جلدی سے وضو کیا اور صف میں جاکر کھڑا ہوگیا اور حواس باختگی کے عالم میں اللہ اکبر کہہ کر نیت باندھ لی، اب نماز میں کھڑا ہوا ہے، لیکن دل کہیں ہے، دماغ کہیں ہے، اور دل میں یہ خیالات آرہے ہیں کہ کوئی ٹھیلہ پر چوری نہ کرلے، کہیں گاہک نہ بھاگ جائیں وغیرہ اور نماز بھی پڑھ رہا ہے،

جماعت کے بعد جلدی سے اس نے دو سنتیں پڑھیں اور بھاگا بھاگا جا کر دوبارہ ٹھیلہ لگالیا، ایک حال یہ ہے۔

پھر حضرت والا نے پوچھا کہ بتاؤ کہ پہلا شخص جو ریٹائرمنٹ کی زندگی گذار رہا ہے اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے، یا اس ٹھیلے والے کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے؟ بظاہر یوں لگتا ہے کہ وہ پہلا شخص جو اذان سے پہلے سے گھر سے نکلا ہوا ہے، اس نے اطمینان سے تحیۃ الوضو پڑھی، تحیۃ المسجد پڑھی، سنتیں پڑھیں، اور پھر خشوع و خضوع کے ساتھ دل لگا کر اس نے فرض نماز ادا کی، اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے، دوسری طرف وہ ٹھیلے والا جس نے بھاگا دوڑی میں نماز ادا کرلی، اس کی نماز میں بظاہر روحانیت نہیں ہے، لیکن میں یہ سچ کہتا ہوں کہ اس دوسرے شخص کی نماز میں روحانیت پہلے شخص کی نماز سے کہیں زیادہ ہے، اور اس پہلے شخص کو نماز میں جو کیفیات حاصل ہورہی ہیں، وہ حقیقت میں نفسانی کیفیات ہیں، وہ حظ نفسانی ہیں، اگرچہ وہ جائز اور محمود حظ نفسانی ہے، مگر روحانیت تو محض عمل سے حاصل ہوتی ہے، اس میں وہ دونوں برابر ہیں، بلکہ ٹھیلے والا شخص اس پہلے شخص سے بڑھا ہوا ہے کہ وہ اپنے مشاغل اور مصروفیات کے باوجود اللہ کے دربار میں آکر کھڑا ہوگیا، چاہے وہ مختصر وقت کے لیے ہی آگیا ہو مگر تعمیل حکم میں آیا، اس لیے اس کی نماز میں روحانیت زیادہ ہے۔

بہر حال! پہلے شخص کو نماز میں جو حظ حاصل ہو رہا تھا وہ حال بالمعنی الاول ہے اور یہ حال مطلوب اور مقصود نہیں اور مامور بہ نہیں، اور دوسرے شخص کا جو عمل ہے اس میں رسوخ ہے، اس کو اپنے عمل میں اتنا رسوخ حاصل ہوگیا کہ اپنے شواغل اور مصروفیات کے باوجود ان سب کو چھوڑ کر نماز ادا کر رہا ہے، یہ حال بالمعنی الثانی ہے، یہ مطلوب اور مقصود ہے اور مامور بہ ہے، اس کو حاصل کرنے کی کوشش کرو، پہلی چیز حاصل ہو یا نہ ہو اس کا مطالبہ نہیں، اگر ہوجائے تو اللہ کا شکر ادا کرے، اگر نہ ہو تو کوئی پرواہ نہیں۔ [اصلاحی مجالس، ج ۲، ص ۲۸۱]

نماز کے بعد استغفار کیوں؟

حدیث میں آتا ہے کہ جب نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نماز سے فارغ ہوتے تو نماز ختم ہوتے ہی آپ تین مرتبہ فرماتے تھے: أستغفر الله ، أستغفر الله ، أستغفر الله

اب یہ اس وقت استغفار کرنا سمجھ میں نہیں آتا، اس لیے کہ استغفار تو اس وقت ہوتا ہے جب انسان سے کوئی گناہ ہوجائے تو وہ استغفار کرے کہ یا اللہ! مجھے معاف کردے، تو بظاہر نماز کے بعد استغفار کا موقع نہیں، بلکہ نماز تو اللہ کے حضور حاضری ہے، اس کے بعد استغفار کیوں؟ بات دراصل یہ ہے کہ نماز تو ہم نے پڑھ لی مگر اللہ تبارک وتعالی کی ذات کبریائی کا جو حق تھا وہ نماز میں ادا نہ ہوا: ما عبدناك حق عبادتك

اے اللہ! ہم آپ کی بندگی کا حق ادا نہ کرسکے، تو نماز کے بعد یہ "استغفر اللہ" اس واسطے ہے کہ جو حق تھا وہ تو ادا ہوا نہیں، اس واسطے اے اللہ! ہم ان کوتاہیوں سے استغفار کرتے ہیں جو نماز کے اندر ہوئیں، تو ایک بندے کا کام یہ ہے کہ جو نیک عمل بھی کرے، نیکی کے جس کام کی جو توفیق ہو اس پر غرور میں مبتلا ہونے کے

بجائے اس کی کوتاہیوں پر استغفار کرے، اللہ تبارک وتعالیٰ کا شکر ادا کرے اور اس کی قبولیت کی دعا مانگے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۱۷۹]

نماز اور دیگر عبادات کے قبول ہونے کی علامت کیا ہے ؟

حاجی امداد اللہ قدس اللہ سرہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین) ان سے کسی نے سوال کیا کہ حضرت! اتنے دن سے نماز پڑھ رہا ہوں، معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کے ہاں قبول ہوتی ہے کہ نہیں؟ حضرت نے جواب میں فرمایا ارے بھئی! اگر یہ نماز قبول نہ ہوتی تو دوسری بار پڑھنے کی توفیق نہ ہوتی، جب تم نے ایک عمل کر لیا، اس کے بعد اللہ تبارک وتعالیٰ نے وہی عمل دوبارہ کرنے کی توفیق دے دی تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ پہلا عمل قبول ہے ان شاء اللہ، اس وجہ سے نہیں کہ اس عمل کی کوئی خصوصیت تھی، بلکہ اس وجہ سے کہ اس نے تمہیں توفیق دی، اس لیے اپنی نماز اور عبادتوں کو کبھی حقیر نہ سمجھو۔

مولانا رومی رحمہ اللہ نے مثنوی میں ایک بزرگ کا قصہ لکھا ہے کہ ایک بزرگ بہت دنوں تک نمازیں پڑھتے رہے، روزے رکھتے رہے اور تسبیحات واذکار کرتے رہے، ایک دن دل میں یہ خیال آیا کہ میں اتنے عرصے سے یہ سب کچھ کر رہا ہوں، لیکن اللہ میاں کی طرف سے کوئی جواب وغیرہ تو آتا نہیں ہے، معلوم نہیں اللہ تعالیٰ کو یہ اعمال پسند ہیں یا نہیں؟ اس کی بارگاہ میں مقبول ہیں یا نہیں؟ آخر کار اپنے شیخ کے پاس جا کر عرض کیا کہ حضرت! اتنے دن سے عمل کر رہا ہوں، لیکن اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی جواب نہیں آتا، یہ سن کر شیخ نے فرمایا، ارے بے وقوف! یہ جو تمہیں اللہ اللہ کرنے کی توفیق ہو رہی ہے، یہ ہی ان کی طرف سے جواب ہے، اس لیے کہ اگر تمہارا عمل قبول نہ ہوتا، تو تمہیں اللہ اللہ کرنے کی توفیق نہ ہوتی، کسی اور جواب کے انتظار میں رہنے کی ضرورت نہیں:

کہ گفت آن اللہ تو لبیک ماست

زیں نیاز و درد و سوزک ماست

یعنی یہ جو تو اللہ اللہ کر رہا ہے، یہ اللہ اللہ کرنا ہی ہماری طرف سے لبیک کہنا ہے، یہ تیرے اللہ اللہ کا جواب ہے کہ ایک مرتبہ کرنے کے بعد دوسری مرتبہ کرنے کی توفیق دے دی۔ [اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۵۶]

کسی نمازی کا انتظار کس جگہ کیا جائے؟

دیکھئے! یہ ادب بھی یاد رکھنے کا ہے، اکثر لوگ اس میں کوتاہی کرتے ہیں، وہ یہ کہ ایک آدمی نماز یا ذکر میں مشغول ہے اور آپ کو اس سے کچھ کام ہے، تو اکثر یہ ہوتا ہے کہ جس کو کام ہوتا ہے وہ سر پر آ کر کھڑا ہو جاتا ہے یا اس کے پاس جا کر اس انداز سے بیٹھ جاتا ہے کہ جس سے یہ ظاہر ہو کہ ہم تمہارے انتظار میں ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ نماز پڑھنے والے کا دھیان اس طرف لگ جاتا ہے کہ ایک شخص

میرا انتظار کر رہا ہے اور اس کا قلب اس کی طرف مشغول ہو جاتا ہے، اور اس کے نتیجے میں نماز کی طرف کما حقہ دھیان نہیں رہتا۔ اس لئے یہ بڑی بے ادبی کی بات ہے، اس میں ایک طرف تو اس نماز کی بے ادبی ہے اور دوسری طرف اس نماز پڑھنے والے کو تکلیف پہنچانا ہے۔ ادب یہ ہے کہ جس شخص سے آپ کو کام ہو اور وہ نماز کے اندر مشغول ہو تو آپ اتنی دور بیٹھ کر انتظار کریں جس سے اس کو پتہ بھی نہ چلے کہ کوئی میرا انتظار کر رہا ہے اور جب وہ سلام پھیر لے تو اس وقت اس سے رابطہ کر لیں، پہلے سے بالکل قریب جا کر بیٹھ جانا بے ادبی کی بات ہے، یاد رکھئے! یہ سب دین کے آداب ہیں، دین سے خارج نہیں ہیں، ان کی حفاظت بھی اتنی ہی ضروری ہے جتنی دوسری عبادات کی پابندی ضروری ہے۔ [اصلاحی مجالس، ج ۳، ص ۲۴۰]

عورتوں کی فرض یا نفل نماز کی جماعت

ایک مسئلہ عورتوں کی جماعت کا ہے، مسئلہ یہ ہے کہ عورتوں کی جماعت پسندیدہ نہیں ہے، چاہے وہ فرض نماز کی جماعت ہو، یا سنت کی ہو، یا نفل کی ہو، اس لیے کہ اللہ تعالی نے عورتوں کو یہ حکم فرمادیا کہ اگر تمہیں عبادت کرنی ہے تو تنہائی میں کرو، جماعت عورتوں کے لیے پسندیدہ نہیں، جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ دین اصل میں شریعت کی اتباع کا نام ہے، اب یہ مت کہو کہ ہمارا تو اس طرح عبادت کرنے کو دل چاہتا ہے، اس دل کے چاہنے کو چھوڑ دو، اس لیے کہ دل تو بہت ساری چیزوں کو چاہتا ہے اور صرف دل چاہنے کی وجہ سے کوئی چیز دین میں داخل نہیں ہو جاتی، جس بات کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پسند نہیں کیا، اس کو محض دل چاہنے کی وجہ سے نہ کرنا چاہیے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۲۷۱]

حاجت و استخارہ

صلوۃ الحاجت کا کیا طریقہ ہے؟

صلوۃ الحاجت کے طریقے میں کوئی فرق نہیں ہے، جس طرح عام نماز پڑھی جاتی ہے اسی طرح سے یہ دو رکعتیں پڑھی جائیں گی، بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ صلوۃ الحاجت پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ ہے، لوگوں نے اپنی طرف سے اس کے خاص خاص طریقے گھڑ رکھے ہیں، بعض لوگوں نے اس کے لیے خاص خاص سورتیں بھی متعین کر رکھی ہیں کہ پہلی رکعت میں فلاں سورۃ پڑھے اور دوسری رکعت میں فلاں سورۃ پڑھے وغیرہ وغیرہ، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے صلوۃ الحاجت کا جو طریقہ بیان فرمایا ہے اس میں نماز پڑھنے کا کوئی الگ طریقہ بیان نہیں فرمایا اور نہ کسی سورۃ کی تعیین فرمائی۔

البتہ بعض بزرگوں کے تجربات ہیں کہ اگر صلوۃ الحاجت میں فلاں فلاں سورتیں پڑھ لی جائیں تو بعض اوقات اس سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے، تو اس کو سنت سمجھ کر انسان اختیار نہ کرے، اس لیے کہ اگر سنت سمجھ کر اختیار کرے گا تو وہ بدعت ہو جائے گا، چنانچہ میرے حضرت ڈاکٹر عبد الحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ فرمایا کرتے تھے کہ جب صلوۃ الحاجت پڑھنی ہو تو پہلی رکعت میں سورۃ الم نشرح اور دوسری رکعت میں سورۃ اذا جاء نصر اللہ پڑھ لیا کرو، لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ یہ سورتیں نماز حاجت میں پڑھنا سنت ہے، بلکہ بزرگوں کے تجربہ سے یہ پتہ چلا ہے کہ ان سورتوں کے پڑھنے سے زیادہ فائدہ ہوتا ہے، لہذا اگر کوئی شخص سنت سمجھے بغیر ان سورتوں کو پڑھے تو بھی ٹھیک ہے اور اگر ان کے علاوہ کوئی دوسری سورۃ پڑھ لے تو اس میں سنت کی خلاف ورزی لازم نہیں آتی، بہرحال صلوۃ الحاجت پڑھنے کا کوئی خاص طریقہ نہیں ہے بلکہ جس طرح عام نمازیں پڑھی جاتیں ہیں اسی طرح صلوۃ الحاجت کی دو رکعتیں پڑھی جائیں، بس نماز شروع کرتے وقت دل میں یہ نیت کر لے کہ میں یہ دو رکعت صلوۃ الحاجت کے طور پر پڑھتا ہوں۔[اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۴۲]

استخارہ کی حقیقت اور چند غلط فہمیاں

استخارہ کسے کہتے ہیں؟ اس بارے میں لوگوں کے درمیان طرح طرح کی غلط فہمیاں پائی جاتی ہیں، عام طور پر لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ استخارہ کرنے کا کوئی خاص طریقہ اور خاص عمل ہوتا ہے، اس کے بعد کوئی خواب نظر آتا ہے اور اس خواب کے اندر ہدایت دی جاتی ہے کہ فلاں کرو یا نہ کرو، خوب سمجھ لیں کہ حضور اقدس ﷺ سے استخارہ کا جو مسنون طریقہ ثابت ہے اس میں اس قسم کی کوئی بات موجود نہیں۔

استخارہ کا مسنون طریقہ یہ ہے کہ آدمی دو رکعت نفل استخارہ کی نیت سے پڑھے، دل میں یہ نیت ہو کہ میرے سامنے دو راستے ہیں، ان میں سے جو راستہ میرے حق میں بہتر ہو اللہ تعالیٰ اس کا فیصلہ فرمادیں پھر دو رکعت نماز پڑھے اور نماز کے بعد استخارہ کی وہ مسنون دعا مانگے جو حضور اقدس ﷺ نے تلقین فرمائی ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۱۵۸]

استخارہ رات کے وقت ہی کرنا ضروری نہیں ہے

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ استخارہ ہمیشہ رات کو سوتے وقت ہی کرنا چاہیے، یا عشا کی نماز کے بعد ہی کرنا چاہیے، ایسا کوئی ضروری نہیں، بلکہ جب بھی موقع ملے اس وقت یہ استخارہ کرلے، نہ رات کی کوئی قید ہے اور نہ دن کی کوئی قید ہے، نہ سونے کی کوئی قید ہے اور نہ جاگنے کی کوئی قید ہے۔

کیا استخارہ میں خواب کا آنا ضروری ہے؟

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ استخارہ کرنے کے بعد خواب آئے گا اور خواب کے ذریعہ ہمیں بتایا جائے گا کہ یہ کام کرو یا نہ کرو، یاد رکھیے! خواب آنا کوئی ضروری نہیں کہ خواب میں کوئی بات ضرور بتائی جائے یا خواب میں کوئی اشارہ ضرور دیا جائے، بعض مرتبہ خواب میں آجاتا ہے اور بعض مرتبہ خواب میں نہیں آتا۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۱۶۰]

استخارہ کا نتیجہ کس طرح معلوم ہوگا؟

بعض حضرات کا کہنا یہ ہے کہ استخارہ کرنے کے بعد خود انسان کے دل کا رجحان ایک طرف ہوجاتا ہے، بس جس طرف رجحان ہوجائے وہ کام کرلے، اور بکثرت ایسا رجحان ہوجاتا ہے، لیکن بالفرض اگر کسی ایک طرف رجحان نہ بھی ہو بلکہ دل میں کشمکش موجود ہو تو بھی استخارہ کا مقصد حاصل ہوگیا، اس لیے کہ بندہ کے استخارہ کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ وہی کرتے ہیں جو اس کے حق میں بہتر ہوتا ہے، اس کے بعد حالات ایسے پیدا ہوجاتے ہیں پھر وہی ہوتا ہے جس میں بندے کے لیے خیر ہوتی ہے اور اس کو پہلے سے معلوم بھی نہیں ہوتا، بعض اوقات انسان ایک راستے کو بہت اچھا سمجھ رہا ہوتا ہے لیکن اچانک رکاوٹیں پیدا ہوجاتی ہیں اور اللہ تعالیٰ اس کو اس بندے سے پھیر دیتے ہیں، لہٰذا اللہ تعالیٰ استخارہ کے بعد اسباب ایسے پیدا فرمادیتے ہیں کہ پھر وہی ہوتا ہے جس

میں بندے کے لیے خیر ہوتی ہے، اب خیر کس میں ہے؟ انسان کو پتہ نہیں ہوتا لیکن اللہ تعالی فیصلہ فرما دیتے ہیں۔

اب جب وہ کام ہو گیا تو ظاہری اعتبار سے بعض اوقات ایسا لگتا ہے کہ جو کام ہوا وہ اچھا نظر نہیں آ رہا ہے، دل کے مطابق نہیں ہے، تو اب بندہ اللہ تعالی سے شکوہ کرتا ہے کہ یا اللہ! میں نے آپ سے استخارہ کیا تھا مگر کام وہ ہو گیا جو میری مرضی اور طبیعت کے خلاف ہے اور بظاہر یہ کام اچھا معلوم نہیں ہو رہا ہے، اس پر حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ تعالی عنہ فرما رہے ہیں کہ ارے نادان! تو اپنی محدود عقل سے سوچ رہا ہے کہ یہ کام تیرے حق میں بہتر نہیں ہوا، لیکن جس کے علم میں ساری کائنات کا نظام ہے وہ جانتا ہے کہ تیرے حق میں کیا بہتر تھا اور کیا بہتر نہیں تھا، اس نے جو کیا وہی تیرے حق میں بہتر تھا، بعض اوقات دنیا میں تجھے پتہ چل جائے گا کہ تیرے حق میں کیا بہتر تھا اور بعض اوقات پوری زندگی میں کبھی پتہ نہیں چلے گا، جب آخرت میں پہنچے گا تب وہاں جا کر پتہ چلے گا کہ واقعتہ یہی میرے لیے بہتر تھا۔

اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے ایک بچہ ہے جو ماں باپ کے سامنے مچل رہا ہے کہ فلاں چیز کھاؤں گا اور ماں باپ جانتے ہیں کہ اس وقت یہ چیز کھانا بچے کے لیے نقصان دہ اور مہلک ہے، چنانچہ ماں باپ بچے کو وہ چیز نہیں دیتے، اب بچہ اپنی نادانی کی وجہ سے یہ سمجھتا ہے کہ میرے ماں باپ نے مجھ پر ظلم کیا، میں جو چیز مانگ رہا تھا وہ مجھے نہیں دی اور اس کے بدلے میں مجھے کڑوی کڑوی دوا کھلا رہے ہیں، اب وہ بچہ اس دوا کو اپنے حق میں خیر نہیں سمجھ رہا ہے لیکن بڑا ہونے کے بعد جب اللہ تعالی اس بچے کو عقل اور فہم عطا فرمائیں گے اور اس کو سمجھ آئے گی تو اس وقت اس کو پتہ چلے گا کہ میں تو اپنے لیے موت مانگ رہا تھا اور میرے ماں باپ میرے لیے زندگی اور صحت کا راستہ تلاش کر رہے تھے، اللہ تعالی تو اپنے بندوں پر ماں باپ سے زیادہ مہربان ہیں، اس لیے اللہ تعالی وہ راستہ اختیار فرماتے ہیں جو انجام کار بندہ کے لیے بہتر ہوتا ہے، اب بعض اوقات اس کا بہتر ہونا دنیا میں پتہ چل جاتا ہے اور بعض اوقات دنیا میں پتہ نہیں چلتا۔

یہ کمزور انسان کس طرح اپنی محدود عقل سے اللہ تعالی کے فیصلوں کا ادراک کر سکتا ہے، وہی جانتے ہیں کہ کس بندے کے حق میں کیا بہتر ہے؟ انسان صرف ظاہر میں چند چیزوں کو دیکھ کر اللہ تعالی سے شکوہ کرنے لگتا ہے اور اللہ تعالی کے فیصلوں کو برا ماننے لگتا ہے، لیکن حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی سے بہتر فیصلہ کوئی نہیں کر سکتا کہ کس کے حق میں کیا اور کب بہتر ہے۔

اسی وجہ سے اس حدیث میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما فرما رہے ہیں کہ جب تم کسی کام کا استخارہ کر چکو تو اس کے بعد اس پر مطمئن ہو جاؤ کہ اب اللہ تعالی جو بھی فیصلہ فرمائیں گے وہ خیر ہی کا فیصلہ فرمائیں گے، چاہے وہ فیصلہ ظاہر نظر میں تمہیں اچھا نظر نہ آ رہا ہو، لیکن انجام کے اعتبار سے وہی بہتر ہوگا، اور پھر اس کا بہتر ہونا یا تو دنیا ہی میں معلوم ہو جائے گا، ورنہ آخرت میں جا کر تو یقینا معلوم ہو جائے گا کہ اللہ تعالی نے جو فیصلہ کیا تھا وہی میرے حق میں بہتر تھا۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۱۶۱]

وسوسہ اور خیالات

نماز میں آنے والے وسوسے اور خیالات

وسوسے کی تیسری قسم اگر چہ مباح ہے، کیونکہ وہ کسی گناہ کا وسوسہ اور خیال نہیں ہے لیکن وہ خیال انسان کو کسی عبادت اور طاعت کی طرف متوجہ ہونے سے روک رہا ہے، مثلاً جیسے ہی نماز کی نیت باندھی، بس اس وقت دنیا بھر کے خیالات کی چکی چلنی شروع ہوگئی، اور وہ خیالات چاہے گناہ کے خیال نہ ہوں مثلاً کھانے پینے کا خیال، بیوی بچوں کا خیال، اپنی روزی کا خیال، تجارت کا خیال، یہ تمام خیالات فی نفسہ گناہ کے خیالات نہیں ہیں، لیکن ان خیالات کی وجہ سے دل نماز کی طرف متوجہ نہیں ہو رہا ہے اور ان خیالات کی وجہ سے خشوع میں رکاوٹ پیدا ہو رہی ہے، چونکہ یہ خیالات جو غیر اختیاری طور پر آ رہے ہیں اور انسان کے اپنے اختیار کو کوئی دخل نہیں ہے اس لیے ان شاء اللہ ان خیالات پر کوئی گرفت اور مؤاخذہ نہیں ہوگا بلکہ معاف ہوں گے، البتہ اپنے اختیار سے باقاعدہ ارادہ کر کے خیالات نماز میں مت لاؤ اور نہ دل میں ان لگاؤ بلکہ جب اللہ اکبر کہہ کر نماز شروع کرو تو ذہن کو نماز کی طرف متوجہ کرو، جب ثنا پڑھو تو اس کی طرف دھیان لگاؤ اور جب سورہ فاتحہ پڑھنی شروع کرو تو اس کی طرف دھیان لگاؤ، پھر دھیان لگانے کے باوجود غیر اختیاری طور پر ذہن دوسری طرف بھٹک گیا اور خیالات کہیں اور چلے گئے تو ان شاء اللہ ان پر گرفت نہیں ہوگی، لیکن تنبہ ہو جائے کہ میں تو بھٹک گیا، تو پھر دوبارہ نماز کی طرف لوٹ آؤ اور نماز کے الفاظ اور اذکار کی طرف لوٹ آؤ، بار بار یہ کرتے رہو گے تو ان شاء اللہ یہ خیالات آنے کم ہو جائیں گے اور اس کام کے ذریعہ اللہ تعالیٰ خشوع عطا فرما دیں گے، اور خیالات اور وساوس کا علاج ہی یہ ہے کہ ان خیالات کی طرف التفات اور توجہ مت کرو، جب توجہ نہیں کرو گے تو ان شاء اللہ یہ خیالات خود بخود دور ہو جائیں گے، بس اپنا کام کیے جاؤ کہ جب نماز کی نیت باندھو تو اپنا ذہن نماز کی طرف لگاؤ۔ [اصلاحی خطبات، ج۹، ص۱۶۱]

خیالات لانے کا مطلب یہ ہے کہ مثلاً آپ کو کسی کاروباری مسئلے میں سوچنا ہے اور آپ نے سوچا کہ کوئی اور وقت تو ملتا نہیں، چلو نماز پڑھتے وقت سوچ لیں گے اور اس وقت غور کر لیں گے، اب جب نماز میں

کھڑے ہوئے تو باقاعدہ اس کاروباری مسئلے پر غور کرنا شروع کردیا۔ یہ صورت حرام اور ناجائز ہے، اس لئے کہ اس میں اپنی طرف سے قصد کرکے خیالات لا رہے ہیں جانا جائز ہے۔ [اصلاحی مجالس، ج ۴، ص ۶۶]

وسوسہ اور خیال آنے اور لانے میں کس طرح فرق کیا جائے؟

ایک صاحب نے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کو لکھا کہ:

''بعض دفعہ یہ نہیں سمجھ سکتا کہ وسوسہ خود آتا ہے یا میں لاتا ہوں، معیار بتلایا جائے''۔

جواب میں حضرت والا نے لکھا کہ: ''معیار کی حاجت نہیں، جب آمد اور آورد میں شک ہے اور ادنی درجہ یقینی ہے تو ''الیقین لا یزول بالشك'' اس کو آمد ہی سمجھنا چاہئے''۔

بات دراصل یہ ہے کہ خیالات کا خود بخود آنا منع نہیں، لیکن خیالات کا لانا منع ہے، مثلاً آپ نماز پڑھ رہے ہیں، اب اگر نماز میں خیالات لائے بغیر خود بخود خیالات آ رہے ہیں اور اپنی طرف سے دھیان نماز کے الفاظ کی طرف لگایا ہوا ہے تو یہ بذات خود منع نہیں، لیکن آدمی نماز کے اندر سوچ سوچ کر خیالات لائے، یہ منع ہے۔ اور یہ مسئلہ حضرت والا نے بہت سے مقامات میں بیان فرمایا ہے کہ خیالات کا آنا منع نہیں، خیالات کا لانا منع ہے۔ اگر کوئی شخص حضرت والا سے عرض کرتا کہ حضرت! نماز میں دل نہیں لگتا تو جواب میں حضرت والا فرماتے کہ نماز میں دل لگانا فرض ہے، دل لگنا فرض نہیں۔ لہٰذا اگر دل لگانے کی کوشش کے باوجود خیالات آتے ہیں تو آنے دو، اس پر مؤاخذہ نہیں۔

اس پر ایک صاحب نے سوال کیا کہ حضرت! بعض خیال کے بارے میں یہ شک ہوجاتا ہے کہ یہ خیال اور اور وسوسہ خود آیا ہے یا میں لایا ہوں، اس کا پتہ کیسے چلایا جائے؟ اس کا کیا معیار ہے؟ اس پر حضرت والا نے جواب میں لکھا کہ معیار کی حاجت نہیں، جب ''آمد'' اور ''آورد'' میں شک ہے اور ادنی درجہ یقینی ہے تو ''الیقین لا یزول بالشك'' اس کو آمد ہی سمجھنا چاہئے۔ یعنی اگر یہ یقین ہوجائے کہ یہ خیال میں خود لایا ہوں تو اسے اجتناب کرو اور اس پر استغفار کرو، اور اگر یہ پتہ چل جائے کہ یہ خیال خود بخود آیا تھا، میں نہیں لایا تھا، تو اس پر زیادہ فکر کرنے کی ضرورت نہیں، انشاء اللہ اس پر مؤاخذہ نہیں ہوگا۔ لیکن جہاں شک ہو کہ پتہ نہیں کہ یہ خیال خود آیا تھا یا میں لایا تھا تو اسکے بارے میں سمجھنا چاہئے کہ یہ خیال خود بخود آیا ہے، یعنی اس پر زیادہ پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔ [اصلاحی مجالس، ج ۴، ص ۵۹ تا ۶۱]

نماز میں دینی خیالات و مسائل کا سوچنا

لیکن یہاں ایک بات اور عرض کردوں جو بڑے کام کی بات ہے، وہ یہ کہ ان خیالات کا لانا ناجائز ہے جو خالص دنیاوی ہوں، لیکن طاعت اور عبادت کا خیال سوچ کر اور قصد کرکے لانا بھی جائز ہے، یہ گناہ اور ناجائز نہیں۔ مثلاً ایک شخص عالم اور وہ نماز میں قصد کرکے کسی فقہی مسئلے کے بارے میں سوچ رہا ہے

اور جان بوجھ کر خیال لا رہا ہے۔ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ یہ صورت ناجائز نہیں، اس لئے کہ وہ خیال لانا منع ہے جو ''ماسوی اللہ'' ہو، اور جو خیال اللہ ہی کے لئے ہو وہ ''ماسوی اللہ'' میں داخل نہیں، لہٰذا اس کا لانا ناجائز نہیں۔ اور حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کا جو عمل بیان کیا کہ:

''انی لأجهز جيشي وأنا في الصلوة''

[بخاری، کتاب العمل فی الصلوۃ، باب یفکر الرجل الشئ فی الصلوۃ]

کہ میں نماز کے اندر لشکر کو ترتیب دیتا ہوں۔ ان کا یہ عمل بھی اسی پر محمول ہے، کہ وہ ماسوی اللہ میں داخل نہیں، کیونکہ یہ لشکر کی ترتیب جہاد جیسی عظیم الشان عبادت کے لئے ہو رہی ہے جو اللہ جل شانہ کی رضا جوئی کے لئے ہو رہا ہے، اس لئے وہ ماسوی اللہ نہیں۔ لہٰذا لشکر کی ترتیب کا خیال قصداً لانا بھی ناجائز نہیں۔

لہٰذا عالم شخص کو نماز میں مسئلہ سوچنا جائز تو ہے، لیکن سوچنا نہیں چاہئے، کیونکہ ہر کام کا ایک موقع ہوتا ہے، لہٰذا ہمیں تو اس کی کوشش کرنی چاہئے کہ دسرا خیال نہ آئے، اسی طاعت کی طرف توجہ رہے، لیکن اگر کبھی ضرورت پڑ جائے، مثلاً وقت نہیں ہے اور نماز ہی میں سوچنا پڑ گیا تو بھی گناہ نہیں۔

[اصلاحی مجالس، ج ۴، ص ۶۷]

نماز میں خیالات آنے کی ایک وجہ نماز کا سنت کے مطابق ادا نہ کرنا ہے

آج ہمیں اکثر و بیشتر یہ شکوہ رہتا ہے کہ نماز میں خیالات منتشر رہتے ہیں، کبھی کوئی خیال آ رہا ہے، کبھی کوئی خیال آ رہا ہے اور نماز میں دل نہیں لگتا، اس کی ایک بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم نے نماز کا ظاہری طریقہ سنت کے مطابق نہیں بنایا اور نہ ہی اس کا اہتمام کیا، بس جس طرح بچپن میں نماز پڑھنا سیکھ لی تھی، اسی طرح پڑھتے چلے آ رہے ہیں، یہ فکر نہیں کہ واقعتہ یہ نماز سنت کے مطابق ہے یا نہیں؟ یہ نماز اتنا اہم فریضہ ہے کہ فقہ کی کتابوں میں اس پر سینکڑوں صفحات لکھے ہوئے ہیں جن میں نماز کے ایک ایک رکن کو تفصیل سے بیان کیا گیا ہے کہ تکبیر تحریمہ کے لیے ہاتھ کیسے اٹھائیں، قیاس کس طرح کریں، رکوع کس طرح کیا جائے، سجدہ کس طرح کیا جائے، قعدہ کس طرح کیا جائے، ان سب کی تفصیلات کتابوں میں موجود ہے، لیکن ان طریقوں کے سیکھنے کی طرف دھیان نہیں، بس جس طرح قیام کرتے چلے آ رہے ہیں اسی طرح قیام کر لیا، جس طرح اب تک رکوع سجدہ کرتے چلے آ رہے ہیں، اسی طرح رکوع سجدہ کر لیا، لیکن ان کو ٹھیک ٹھیک سنت کے مطابق انجام دینے کی فکر نہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۱۹۷]

نماز میں خیالات آنے کی دوسری وجہ وضو کا صحیح طور پر نہ کرنا ہے

پھر یہ بھی عرض کردوں کہ یہ جو دوسرے خیالات آتے ہیں، اس کی بہت بڑی وجہ یہ بھی ہوتی ہے کہ ہم وضو ڈھنگ سے نہیں کرتے، سنت کے مطابق نہیں کرتے، حواس باختہ حالت میں ادھر ادھر باتیں کرتے ہوئے وضو کرلیا، حالانکہ وضو کے آداب میں سے یہ ہے کہ وضو کے دوران باتیں نہ کی جائیں، بلکہ وضو کے دوران وہ دعائیں پڑھی جائیں جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں اور آدمی اطمینان سے وضو کرکے ایسے وقت مسجد میں آئے جبکہ نماز کھڑی ہونے میں کچھ وقت ہو اور مسجد میں آکر آدمی پہلے سنت اور نفل ادا کرلے، کیونکہ سنت اور نفل جو نماز سے پہلے رکھی گئی ہیں یہ درحقیقت فرض نماز کی تمہید ہیں تاکہ فرض نماز سے پہلے ہی اس کا دھیان اللہ تعالی کی طرف ہوجائے اور ادھر ادھر کے خیالات آنا بند ہوجائیں، ان سب آداب کا لحاظ کرکے جب آدمی نماز پڑھے گا تو پھر دوسرے خیالات نہیں آئیں گے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۲۴۷]

نماز کے دوران یہ وسوسہ ہوجانا کہ کہیں وضو تو نہیں ٹوٹ گیا؟

بعض مرتبہ نماز کے اندر ہوتا ہے کہ پتہ نہیں نماز صحیح ہوئی کہ نہیں ہوئی، یہ اتنی کثرت سے وسوسے ڈالتا ہے کہ اس میں لوگ پریشان ہوتے رہتے ہیں، ایک ایسے ہی صاحب تھے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں ان کو یہ وہم ہوجاتا تھا کہ نماز میں میرا وضو ٹوٹ گیا ہے، یہ وہم ہوتا تھا اور آکر انہوں نے یہ کیفیت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ذکر کی کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم میں جب نماز پڑھتا ہوں تو ایسا خیال ہوتا ہے کہ وضو ٹوٹ گیا ہے، تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم سے زیادہ حکیم کون ہوگا؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا وضو نہیں ٹوٹے گا جب تک کہ تم کوئی بدبو محسوس نہ کرو، یا آواز نہ سن لو، حالانکہ وضو ٹوٹنے کے لئے ضروری نہیں کہ آدمی بدبو محسوس کرے یا آواز سنے، مثلاً ریح خارج ہوگئی ہے تو وضو ٹوٹ جاتا ہے، لیکن اس سے یہ فرمایا کہ تمہارا وضو اس وقت تک نہیں ٹوٹے گا جب تک کہ تمہیں بدبو نہ آجائے، یا آواز نہ آجائے، اس وقت تک تمہارا وضو نہیں ٹوٹے گا۔

بعض لوگ اس حدیث کو دیکھ کر کہتے ہیں کہ بھئی حدیث میں نبی کریم سرور دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ بدبو جب تک نہ آئے، یا آواز جب تک نہ ہو، اس وقت تک وضو نہیں ٹوٹتا، مجھے خود ایک صاحب ملے جو کہتے تھے کہ بھئی ہم مولوی ملاؤں کے پیچھے نہیں جاتے، ہم تو قرآن وسنت کو براہ راست دیکھتے ہیں، براہ راست قرآن شریف کے اور حدیث کی کتابوں کے ترجمے پڑھیں گے، اور جو مطلب سمجھ میں آئے گا اس پر عمل کریں گے، یہ ان کا ذہن تھا جیسا کہ آج کل بہت سے لوگوں کا ہوتا ہے، تو ایک مرتبہ یہ حدیث

پڑھ لی انہوں نے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمایا ہے کہ جب تک بو نہ ہو، آواز نہ ہو، جب تک وضونہیں ٹوٹتا، تو وہ فرمانے لگے کہ حضور نے یہ فرمایا ہے، لہٰذا ہمارے لئے تو حضور کا قول حجت ہے، امام ابوحنیفہؒ کچھ کہہ رہے ہیں، امام شافعیؒ کچھ کہہ رہے ہیں، اور ائمہ کچھ کہہ رہے ہیں، لیکن حضور کا قول حجت ہے، لہٰذا وہ ساری عمر خود عمل اس پر کرتے رہے کہ جب تک بو نہ آئی آواز نہ آئی، سمجھا کہ وضونہیں ٹوٹا، چاہے یقین ہو گیا وضوٹوٹنے کا۔ [خطبات عثمانی، ج ۱، ص ۲۸۷]

غسل یا وضو میں وسوسہ ہوجانا کہ آیا پاک ہوا بھی یا نہیں؟

ایک اور وسوسہ ہے جو وہم کی بیماری ہو جاتی ہے، مثلاً وسوسے آرہے ہیں کہ میں ناپاک ہو گیا، پاکی ناپاکی کے مسئلے میں انسان مبتلا ہو جاتا ہے، شریعت نے تین مرتبہ وضو کے اندر ہاتھ پاؤں کے دھونے کا حکم دیا ہے، ہاتھوں کو، منہ کو، پاؤں کو تین مرتبہ دھولیں اتنا حکم ہے، اب بعض اوقات شیطان یہ وسوسے ڈالتا ہے کہ نہیں تیرا تو وضو ہی نہیں ہوا، تین مرتبہ دھونا تیرے لئے کافی نہیں ہے، تیرا پاؤں خشک رہ گیا، تیری کہنی خشک رہی گئی، تیرا ہاتھ خشک رہ گیا، اس قسم کے وسوسے ڈالتا ہے، اور درحقیقت اس قسم کے وسوسے ڈالنے سے اس کا منشا یہ ہوتا ہے کہ جب اس کے دل میں یہ بات بیٹھ جائے گی کہ میں تو پاک ہوا ہی نہیں، اب وہ بار بار وضو کرائے گا، یہاں تک کہ ایک ایک نماز میں ایک گھنٹہ لگ جائے گا، جب ایک نماز میں ایک گھنٹہ لگے گا تو ایک وقت ایسا آئے گا کہ وہ یہ سوچے گا کہ یہ تو بڑا مشکل ہو گیا میرے لئے نماز پڑھنا، اس طرح وہ نماز چھڑوادے گا، تو یہ وسوسہ بھی شیطان ڈالتا ہے، اور بہت سے لوگ اس میں مبتلا ہو جاتے ہیں، وہم کی بیماری یہ بھی شیطانی تصرف ہے۔

اس کا علاج بزرگوں نے یہ فرمایا کہ جس چیز کا وہم پیدا ہو رہا ہے، آدمی اس کی زبردستی خلاف ورزی کرے، مثلاً تین مرتبہ ہاتھ اچھی طرح دھو لیے مناسب طریقہ پر جیسے دھوئے جاتے ہیں، پھر بھی یہ خیال آرہا ہے کہ میرا ہاتھ خشک رہ گیا لاؤ، دوبارہ دھولوں، تو اب اس کی مخالفت کرو، اور کہو نہیں نہیں، اب دوبارہ نہیں دھوں گا، زبردستی اس کی مخالفت کرے تو اس صورت میں رفتہ رفتہ وہ شیطان مایوس ہو جائے گا، یہ تو میرا کہنا مانتا نہیں ہے، لہٰذا اس کے پاس جانے کی ضرورت نہیں اور وہ بھاگ جائے گا، اس کا یہی علاج ہے۔

ہمارے بزرگوں میں سے شاید حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ خود اپنا واقعہ بیان فرماتے ہیں کہ میں ایک مرتبہ وضو کر رہا تھا، جب وضو کر کے فارغ ہو کر چلا تو ذہن میں خیال آیا کہ کہنی خشک رہ گئی ہے، میں نے سوچا کہ یہ شبہ دل میں پیدا ہوا ہے، تو اس کو دور کرنا چاہئے، چنانچہ دوبارہ واپس گیا اور جا کر کہنی کے اوپر پانی ڈال کر خشکی کا جو خیال تھا وہ دور کر لیا، پھر چلا، تھوڑی دور گیا تو خیال آیا کہ شاید بائیں کہنی خشک رہ گئی ہے، یہ دل میں خیال آیا تو میں نے کہا کہ یہ شبہ کیوں چھوڑیں، دوبارہ گئے اور جا کر دوسری کہنی بھی دھولی، پھر ذرا آگے

چلے تو پھر خیال آیا کہ ٹخنہ خشک رہ گیا ہے، جب تیسری مرتبہ یہ خیال آیا تو میں نے دل میں کہا کہ اچھا یہ حضرت آپ ہیں، یہ کہہ کر میں نے کہا کہ آج ہم بغیر وضو ہی کے نماز پڑھیں گے، تم کہتے رہو کہ وضو نہیں ہوا، آج ہم بغیر وضو ہی کے نماز پڑھیں گے، اور پھر یہ فرمایا کہ اگر میں اس وقت یہ نہ کہتا تو یہ زندگی بھر کا وظیفہ ہو گیا تھا، وہ زندگی بھر اسی شک میں، اسی وسوسے میں اور اسی وہم میں مبتلا رکھتا، اور ہر تھوڑی دیر کے بعد اس قسم کے وسوسے ڈالتا، لہٰذا الحمدللہ اس کا علاج ہو گیا، اس کے بعد پھر وہ وسوسہ نہیں آیا، بہرحال! علاج اس کا یہی ہے کہ زبردستی اس وہم کی مخالفت کی جائے۔ [خطبات عثمانی، ج ۱، ص ۲۸۵]

خیالات کی وجہ سے نماز میں مزہ نہیں آتا اور دل نہیں لگتا

حضرت تھانویؒ نے اپنے مواعظ اور ملفوظات میں یہ نکتہ واضح کیا ہے کہ یہ نماز بذات خود مطلوب ہے، لہٰذا اگر غیر اختیاری طور پر خیالات آرہے ہیں تو اس کی وجہ سے نماز کی ناقدری مت کرو، نمازی اکثر یہ سوال کرتے ہیں کہ ہم نماز پڑھتے ہیں لیکن نماز میں مزہ ہی نہیں آتا، لطف ہی نہیں آتا، یا پہلے نماز میں بہت لطف اور مزہ آتا تھا اور اب وہ لطف آنا بند ہو گیا، تو اس کا جواب یہ ہے کہ بھائی! یہ نماز اس لیے فرض نہیں کی گئی کہ اس میں تمہیں مزہ اور لطف آیا کرے، بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ کی عبادت اور بندگی کا ایک طریقہ ہے، اب اگر نماز میں مزہ آجائے تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہے، اور اگر مزہ نہ آئے تو اس کی وجہ سے نماز کی فضیلت میں ذرہ برابر کمی نہیں آتی، اگر تم نماز کے ارکان اور اس کی شرائط اور اس کے آداب پورے طور پر بجالا رہے ہو اور سنت کے مطابق نماز ادا کر رہے ہو تو پھر ساری عمر بھی اگر مزہ نہ آئے تو اس میں تمہارا کوئی نقصان نہیں، اگر نماز میں مزہ آئے تو بھی نماز پڑھنی ہے، اگر مزہ نہ آئے تو بھی نماز پڑھنی ہے۔

بلکہ اگر نماز میں مزہ نہیں آیا اور نماز پڑھنے میں مشقت محسوس ہوئی، لیکن اس کے باوجود تم نے نماز پڑھی تو اس پر تمہارے لیے زیادہ ثواب لکھا جائے گا، اس لیے کہ نماز پڑھنے کو دل نہیں چاہ رہا تھا بلکہ نفس شرارت کر رہا تھا لیکن تم نے زبردستی اللہ کی عبادت کی خاطر اور اس کی اطاعت کی خاطر نفس پر جبر کر کے نماز پڑھ لی تو ان شاء اللہ اس نماز پر تمہیں زیادہ ثواب ملے گا، چنانچہ حضرت مولانا رشید احمد صاحب گنگوہیؒ فرمایا کرتے تھے کہ جس شخص کو ساری عمر کبھی نماز میں مزہ نہ آئے لیکن پھر بھی نماز پڑھتا رہے، نماز کو چھوڑے نہیں، میں اس کو دو باتوں کی مبارک باد دیتا ہوں، ایک اس بات کی کہ جب اس کو نماز میں مزہ نہیں آیا لیکن اس کے باوجود وہ نماز پڑھتا رہا تو ان شاء اللہ اس کے اجر میں اضافہ ہوگا اور اس کو زیادہ ثواب ملے گا، اور دوسرے اس پر کہ اگر اس کو نماز میں مزہ آتا تو یہ شبہ ہوتا کہ یہ شاید نفس کے مزے کی خاطر نماز پڑھ رہا ہے، لیکن جب نماز میں مزہ آیا ہی نہیں تو اب یہ شائبہ ختم ہو گیا، لہٰذا معلوم ہوا کہ یہ نماز صرف اللہ کے لیے پڑھ رہا ہے کیونکہ اس میں اخلاص زیادہ ہو گیا، اس کی وجہ سے اجر و ثواب میں اضافہ ہو جائے گا، اس لیے اس فکر میں مت پڑا کرو کہ

مزہ آیا یا نہیں، لطف آیا یا نہیں۔

لوگ خطوط میں لکھتے ہیں کہ ایک زمانہ وہ تھا کہ ہم پہلے نماز پڑھا کرتے تھے تو بڑی عجیب وغریب کیفیت ہوتی تھی، دنیا و مافیہا سے بالکل بے خبر ہو جاتے تھے اور اب لطف جاتا رہا اور وہ کیفیت باقی نہیں رہی، کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ شیطان نے مجھے مردود بنا دیا ہے، خوب سمجھ لیں کہ یہ ساری کیفیات جو غیر اختیاری ہیں جس میں انسان کے اختیار کو دخل نہیں ہے، مزہ آیا یا نہیں، یہ انسان کے اختیار سے باہر ہے، مزہ آنا اور لطف آنا اور نہ آنا انسان کے اختیار میں نہیں اور انسان اس کا مکلف بھی نہیں، اس لیے کہ انسان تو عمل کا مکلف ہے، دیکھنا یہ ہے کہ عمل کیا یا نہیں؟ اور اگر عمل کیا تو دیکھنا یہ ہے کہ یہ عمل محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کے مطابق کیا یا نہیں؟ اگر اس طرح عمل کر لیا تو چاہے کوئی کیفیت حاصل ہوئی یا نہیں؟ مگر عہدہ برآ ہو گئے اور تمہارا وہ عمل مقبول ہو گیا، وجہ یہ ہے کہ یہ ساری کیفیات آنی جانی ہے، نہ ان پر عمل کی قبولیت موقوف ہے اور نہ ہی ان پر نجات موقوف ہے، بس اگر اللہ تعالی کے فضل و کرم سے عمل کی توفیق ہو رہی ہے تو اس پر اللہ تعالی کا شکر ادا کرتے رہو۔ [اصلاحی خطبات، ج۹،ص ۱۶۷]

نماز میں خیالات آنے پر مایوسی اور ناقدری نہ ہو

بہر حال نماز میں یہ جو خیالات آتے ہیں، بہت سے لوگ ان سے پریشان ہوتے ہیں اور ان خیالات کے نتیجے میں سمجھتے ہیں کہ ہماری یہ نماز تو اٹھک بیٹھک ہے، اس میں کوئی رح اور جان نہیں ہے، یاد رکھیے! نماز کی ایسی ناقدری نہیں کرنی چاہیے، ارے یہ تو اللہ تعالی کا فضل و کرم ہے کہ اس نے ہمیں نماز پڑھنے کی توفیق عطا فرمائی اور اس پر اللہ تعالی کا شکر ادا کرو، اور ان خیالات کی وجہ سے اپنی نماز کو بے کار مت سمجھو، یہ نماز کی توفیق تو اللہ تعالی کی نعمت ہے اور ان غیر اختیاری خیالات کی وجہ سے ان شاء اللہ تمہاری گرفت نہیں ہوگی ، البتہ اپنے اختیار سے خیالات مت لاؤ۔

آج کل لوگ عام طور پر غیر اختیاری امور کے پیچھے پڑے رہتے ہیں اور اس کی وجہ سے پریشان اور مایوس ہو جاتے ہیں اور پھر مایوسی کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بالآخر شیطان وہ عمل چھڑوا دیتا ہے، شیطان اس کو یہ سکھاتا ہے کہ جب تیری نماز کسی قابل نہیں ہے تو پڑھنے سے کیا فائدہ؟ اس گمراہی میں مبتلا کر دیتا ہے، اس لیے غیر اختیاری امور کے پیچھے مت پڑو اور نماز پڑھنے کا جو طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے سکھا دیا بس اسی طریقے سے نماز پڑھنے کی فکر کرو اور اپنی طرف سے دھیان نماز کی طرف لگانے کی کوشش کرتے رہو، اس کے بعد اگر کیفیت طاری ہو یا نہ ہو، نماز میں لذت آئے یا نہ آئے، اس سے کوئی فرق واقع نہیں ہوتا، اللہ تعالی کے ہاں وہ نماز مقبول ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۹،ص ۱۶۲، ۱۶۳]

روزہ و رمضان

۳۰ شعبان کو نفلی روزہ رکھنا صحیح نہیں

تیس شعبان کا جو دن ہوتا ہے، اس میں حکم یہ ہے کہ اس دن روزہ نہ رکھا جائے، بعض لوگ اس خیال سے روزہ رکھ لیتے ہیں کہ شاید آج رمضان کا دن ہو، اس لیے کہ ہوسکتا ہے کہ رمضان کا چاند ہو چکا ہو، لیکن ہمیں نظر نہ آیا، اس لیے احتیاط کے طور پر لوگ شعبان کی تیس تاریخ کا روزہ رکھ لیتے ہیں، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے احتیاطِ رمضان کے طور پر تیس شعبان کو روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے، لیکن یہ روزہ نہ رکھنے کا حکم اس شخص کے لیے ہے جو صرف احتیاطِ رمضان کی غرض سے روزہ رکھ رہا ہو، البتہ جو شخص عام نفلی روزے رکھتا چلا آرہا ہے، اور وہ اگر تیس شعبان کو بھی روزہ رکھ لے اور احتیاطِ رمضان کی نیت اور خیال دل میں نہ ہو تو اس کے لیے جائز ہے۔

امام ابو یوسفؒ تیس شعبان کے دن خود روزے سے ہوتے تھے، اور پورے شہر میں منادی کرتے ہوئے پھرتے تھے کہ آج کے دن کوئی شخص روزہ نہ رکھے، اس لیے کہ عام لوگوں کے بارے میں یہ خطرہ تھا کہ اگر وہ اس دن روزہ رکھیں گے تو احتیاطِ رمضان کا خیال ان کے دل میں آجائے گا اور روزہ رکھنا گناہ ہوگا، اس لیے سختی سے منع فرمادیا۔

کیا نیک کام صرف رمضان کے ساتھ خاص ہیں؟

حضرت والا نے اس ملفوظ میں زکوۃ سے متعلق ایک اصول بیان فرمایا، لیکن یہ بات صرف زکوۃ کے ساتھ خاص نہیں ہے، بلکہ یہی اصول تمام اعمال کے اندر جاری ہے، ہم لوگ رمضان میں تو اعمال کے اندر تھوڑا بہت اہتمام کرتے ہیں، چنانچہ ہوتا یہ ہے کہ جتنے نیک کام ہیں، سب رمضان کے لئے اٹھا کر رکھ دیے ہیں، نفلیں پڑھیں گے تو رمضان میں، تلاوت کریں گے تو رمضان میں کریں گے، رات کو اٹھیں گے تو رمضان میں اٹھیں گے، اور اشراق اور چاشت کے نوافل پڑھیں گے تو رمضان میں پڑھیں گے، اس طرح ہم نے سارے کام اٹھا کر رمضان کے لئے رکھ دیئے۔ اور ادھر جیسے ہی رمضان ختم ہوا، ادھر سارے اعمال ختم، اب نہ

تو تلاوت ہے، نہ ذکر ہے، نہ نوافل ہیں، نہ اللہ تعالیٰ کی یاد ہے، اور نہ گناہوں سے بچنے کا وہ اہتمام ہے۔ رمضان میں گناہ کرتے ہوئے ذرا شرم آجاتی ہے کہ بھائی! رمضان کا مہینہ ہے، ذرا آنکھ کی حفاظت کرلیں، ذرا کان کی حفاظت کرلیں، ذرا زبان کی حفاظت کرلیں، لیکن رمضان کے گزرتے ہی گناہوں کی چھٹی مل گئی، اب نہ گناہوں سے بچنے کا اہتمام ہے اور جو نیک کام رمضان میں شروع کئے تھے، نہ ان کو باقی رکھنے کا اہتمام ہے۔

اللہ تعالیٰ نے رمضان المبارک کو ایک تربیتی کورس بنایا ہے، جب تم اس تربیتی کورس سے گزر گئے اور اس کے اندر اللہ تعالیٰ نے خاص ملکات مثلاً روزے سے، تراویح سے، اعتکاف سے، ذکر سے، تسبیح اور تلاوت سے تمہارے اندر جو جلا پیدا فرمادی، اس کو اب برقرار رکھنا تمہارا کام ہے۔ لہٰذا رمضان کے بعد جب تم عام زندگی کے اندر داخل ہو تو اس جذبے کو برقرار رکھنا تمہارا کام ہے۔ [اصلاحی مجالس، ج ۲، ص ۱۲۲]

کیا رمضان کے انتظار میں نیک اعمال کو ٹالا جاسکتا ہے ؟

اس ملفوظ میں حضرت والا نے بڑی اصولی بات بیان فرمادی جو بکثرت مغالطوں اور غلطیوں کا سبب بنتی ہے، چنانچہ بہت لوگوں کو دیکھا کہ ان پر زکوۃ فرض ہوگئی ہے مگر اس انتظار میں رو کے بیٹھتے ہیں کہ جب رمضان آئے گا تو اس وقت زکوۃ نکالیں گے، یا مثلاً کچھ صدقہ کرنے کی نیت ہے لیکن رو کے بیٹھے ہیں کہ جب رمضان آئے گا تو اس وقت صدقہ کریں گے، اس لئے کہ حدیث میں ہے کہ رمضان میں نفل کام کا ثواب فرض کے برابر ملے گا اور فرض ادا کرنے پر ستر گنا ثواب ملے گا۔ اس حدیث کی وجہ سے لوگ زکوۃ اور صدقہ کی ادائیگی کو رمضان کے لئے مؤخر کردیتے ہیں کہ جب رمضان آئے گا تو اس وقت ادا کریں گے۔

حضرت والا نے دو لفظوں میں اس حدیث کی تشریح فرمادی کہ اس حدیث کا مقصود "تعجیل اعمال فی رمضان" ہے، نہ کہ "تاخیر اعمال الی رمضان" یعنی اس حدیث کا مطلب یہ ہے کہ رمضان میں جب نیکی کا اتنا زیادہ ثواب ہے اور تمہارے دل میں کسی نیکی کے کرنے کا خیال آرہا ہے تو اس نیکی کو ابھی فوراً رمضان کے اندر ہی کرلو اور اس کو مت ٹالو، کیونکہ رمضان میں نیک کام کرنے کا ثواب زیادہ ہے۔ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اگر رمضان سے پہلے کسی نیکی کا خیال آیا ہے تو اس خیال کو ٹال دو کہ یہ نیکی رمضان میں کریں گے، تاکہ اس وقت ثواب زیادہ ملے، لہٰذا جس وقت جس نیکی کے کرنے کا خیال آئے، چاہے وہ نفل کام ہو یا فرائض کی ادائیگی ہو، اسی وقت اس کو کرلو۔ [اصلاحی مجالس، ج ۲، ص ۱۱۲]

جمعۃ الوداع (رمضان کے آخری جمعہ) کے متعلق ایک غلط فہمی

اس آخری جمعہ کے بارے میں بعض لوگوں کے ذہنوں میں کچھ خاص تصورات ہیں، جن کی اصلاح ضروری ہے، عام طور پر ہمارے معاشرے میں یہ سمجھا جاتا ہے کہ یہ آخری جمعہ جس کو "جمعۃ الوداع" بھی کہتے ہیں، یہ کوئی مستقل تہوار ہے اور اس کے کچھ خاص احکام ہیں، اس کی کوئی خاص عبادتیں ہیں جو حضور

اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تجویز فرمائیں ہیں، اور لوگوں نے اس دن عبادت کرنے کے مختلف طریقے گھڑ رکھتے ہیں، مثلاً جمعۃ الوداع کے دن اتنی رکعتیں نوافل پڑھنی چاہیے اور ان رکعتوں میں فلاں فلاں سورتیں پڑھنی چاہیے۔

خوب سمجھ لیجیے! کہ اس قسم کی کوئی ہدایت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں دی، جمعۃ الوداع بحیثیت جمعۃ الوداع کوئی تہوار نہیں، نہ اس کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کوئی احکام الگ سے عطا فرمائے، نہ اس دن میں عبادت کا کوئی خاص طریقہ بتلایا، نہ اس دن میں کسی خاص عمل کی تلقین فرمائی جو عام دنوں میں نہ کیا جاتا ہو، بلکہ یہ عام جمعوں کی طرف ایک جمعہ ہے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ ویسے تو رمضان المبارک کا ہر لمحہ ہی قابل قدر ہے لیکن رمضان کا جمعہ بڑا قابل قدر ہے، حدیث شریف کے بیان کے مطابق رمضان ''سید الشہور'' ہے یعنی تمام مہینوں کا سردار ہے، اور جمعہ ''سید الایام'' ہے، یعنی تمام دنوں کا سردار ہے، لہذا جب رمضان المبارک میں جمعہ کا دن آتا ہے تو اس دن میں دو فضیلتیں جمع ہو جاتی ہیں، ایک رمضان کی فضیلت، اور دوسری جمعہ کی فضیلت، اس لحاظ سے رمضان کا ہر جمعہ بڑا قابل قدر ہے۔

اور آخری جمعہ اس لحاظ سے زیادہ قابل قدر ہے کہ اس سال یہ مبارک دن دوبارہ نہیں ملے گا، سارے رمضان میں چار یا پانچ جمعے ہوتے ہیں، تین جمعے گذر چکے ہیں اور یہ اب آخری جمعہ ہے، اب اس سال یہ نعمت میسر آنے والی نہیں، اللہ تعالیٰ نے اگر زندگی دی تو شاید آئندہ سال یہ نعمت دوبارہ مل جائے، اس لیے یہ ایک نعمت ہے جو ہاتھ سے جا رہی ہے، اس کی قدر و منزلت پہچان کر انسان جتنا بھی عمل کر لے وہ کم ہے، بس اس جمعۃ الوداع کی یہ حقیقت ہے، ورنہ یہ نہ تو کوئی تہوار ہے، نہ اس کے اندر کوئی خاص عبادت اور خاص عمل مقرر ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۲، ص ٦٦]

قضا روزوں کا حساب اور وصیت

اسی طرح روزوں کا جائزہ لیں، جب سے بالغ ہوئے ہیں، اس وقت سے اب تک روزے چھوٹے ہیں یا نہیں؟ اگر نہیں چھوٹے تو بہت اچھا، اگر چھوٹ گئے ہیں تو ان کا حساب لگا کر اپنے پاس وصیت نامہ کی کاپی میں لکھ لیں کہ آج فلاں تاریخ کو میرے ذمے اتنے روزے باقی ہیں، میں ان کی ادائیگی شروع کر رہا ہوں، اگر میں اپنی زندگی میں ان کو ادا نہیں کر سکا تو میرے مرنے کے بعد میرے ترکہ میں سے ان روزوں کا فدیہ ادا کر دیا جائے، اس کے بعد جتنے روزے ادا کرتے جائیں، اس وصیت نامہ کی کاپی میں لکھتے جائیں کہ اتنے روزے ادا کر لیے، اتنے باقی ہیں، تاکہ حساب صاف رہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ٦، ص ٥٨]

زکوۃ

زکوۃ کس پر فرض ہوتی ہے؟ اور اس کا نصاب کیا ہے؟

خوب سمجھ لیں کہ شریعت نے زکوۃ کا ایک نصاب مقرر کیا ہے، جس شخص کے پاس وہ نصاب موجود ہوگا اس پر زکوۃ فرض ہوجائے گی اور نصاب ساڑھے باون تولہ چاندی ہے، بازار میں ساڑھے باون تولہ چاندی کی قیمت معلوم کرلی جائے، آج کل کے لحاظ سے اس کی قیمت تقریبا چھ ہزار روپے بنتی ہے، لہذا شریعت کا حکم یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے پاس چھ ہزار روپے نقد ہوں یا سونے کی شکل میں ہوں، یا چاندی کی شکل میں، یا مال تجارت کی شکل میں ہوں، اس شخص پر زکوۃ واجب ہوجاتی ہے، بشرطیکہ یہ روپے اس کی ضروریات اصلیہ سے زائد ہوں، یعنی روزمرہ کی ضروریات اور اپنے بیوی بچوں پر خرچ کرنے کی ضرورت سے زائد ہوں، البتہ اگر کسی شخص پر قرض ہے تو جتنا قرض ہے، وہ اس زکوۃ کے نصاب سے منہا کرلیا جائے گا، مثلا یہ دیکھا جائے کہ یہ رقم جو ہمارے پاس ہے، اگر اس کو قرض ادا کرنے میں صرف کردی جائے تو باقی کتنی رقم بچے گی، اگر باقی چھ ہزار روپے یا اس سے زائد نہ بچے تو پھر زکوۃ واجب نہیں اور اگر چھ ہزار روپے یا اس سے زائد بچے تو زکوۃ واجب ہوگی۔

جو رقم بیٹی کی شادی یا مکان بنانے کی نیت سے جمع کر رکھی ہے اس پر بھی زکوۃ دینی ہوگی

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہمارے پاس چھ ہزار روپے تو ہیں، مگر وہ ہم نے اپنی بیٹی کی شادی کے لیے رکھے ہیں اور شادی کرنا ضرورت میں داخل ہے، لہذا اس رقم پر زکوۃ واجب نہیں، یہ خیال غلط ہے، اس لیے کہ ضرورت سے مراد زندگی کی روزمرہ کی کھانے پینے کی ضرورت مراد ہے، یعنی اگر وہ ان روپوں کو خرچ کردے گا تو اس کے پاس کھانے پینے کے لیے کچھ نہیں بچے گا اپنے بیوی بچوں کو کھلانے کے لیے کچھ باقی نہیں رہے گا، لیکن جو رقم دوسرے منصوبوں کے لیے رکھی ہے، مثلا بیٹیوں کی شادی کرنی ہے، یا مکان بنانا ہے، یا گاڑی خریدنی ہے اور اس کے واسطے رقم جمع کرکے رکھی ہے تو وہ رقم ضرورت سے زائد ہے، اس پر

زکوۃ واجب ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۲۹۳]

زکوۃ کا حساب لگانے میں ایک غلطی
زکوۃ کی ادائیگی کو رمضان کے ساتھ خاص سمجھ لینا

خاص طور پر زکوۃ کے مسئلہ میں لوگوں کو بہت غلط فہمی ہوتی ہے، ان کا کہنا ہے کہ ہم رمضان ہی میں زکوۃ نکالیں گے، چاہے ان کی زکوۃ کا سال ربیع الاول کے مہینے میں پورا ہوجاتا ہو۔ خوب اچھی طرح سمجھ لیجئے کہ ہر آدمی کے لئے زکوۃ ادا کرنے کی وہ تاریخ ہے جس تاریخ میں وہ پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنا تھا، پھر جب آئندہ سال وہی تاریخ آئے گی تو اس دن اس پر زکوۃ فرض ہوجائے گی، مثلاً ایک شخص یکم ربیع الاول کو نصاب زکوۃ مال کا مالک بن گیا، تو اگلے سال یکم ربیع الاول ہی کو اس پر زکوۃ فرض ہوگی، اب اس شخص کو آئندہ ہمیشہ یکم ربیع الاول ہی کو اپنے اموال زکوۃ کا حساب لگانا چاہئے، یہ نہ ہو کہ صاحب نصاب تو آپ یکم ربیع الاول کو بنے اور حساب یکم رمضان کو لگا رہے ہیں، یہ طریقہ درست نہیں۔

لیکن آج کل لوگ بہت کثرت سے دو غلطیاں کرتے ہیں۔ ایک یہ کہ بہت سے لوگ حساب لگانے کی تاریخ مقرر کرنے میں غلطی کرتے ہیں، مثلاً صاحب نصاب بننے کی تاریخ یکم ربیع الاول تھی، لیکن خود اپنی طرف سے زکوۃ کا حساب کرنے کی تاریخ یکم رمضان مقرر کرلی تو اس کے نتیجے میں سارا حساب خراب ہوجاتا ہے، کیونکہ جب زکوۃ فرض ہونے کی تاریخ آپ کی یکم ربیع الاول تھی، اس دن تو آپ نے حساب نہیں لگایا، اور پھر ان پیسوں کو خرچ کرتے رہے، یہاں تک کہ یکم رمضان المبارک تک اس میں سے آدھی رقم خرچ ہوگئی، اس وقت آپ زکوۃ کا حساب لگانے بیٹھ گئے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ آدھی رقم کا حساب ہی نہیں ہوا۔

مثلاً یکم ربیع الاول کو آپ کی زکوۃ کا سال پورا ہوا، اس وقت آپ کے پاس ایک لاکھ روپے تھے، تو آپ پر ایک لاکھ روپے کی زکوۃ ڈھائی ہزار روپے واجب ہوگئی، لیکن آپ نے یکم ربیع الاول کو حساب نہیں لگایا، یہاں تک کہ رمضان المبارک آگیا، اور اس وقت تک اس رقم میں سے پچاس ہزار روپے خرچ کرلئے، اور اب یکم رمضان کو آپ کے پاس صرف پچاس ہزار روپے باقی رہ گئے، اور اس دن آپ نے زکوۃ کا حساب لگا کر پچاس ہزار روپے کی زکوۃ ساڑھے بارہ سو روپے ادا کردی، اور اس طرح وہ پچاس ہزار روپے جو آپ نے خرچ کرلئے، نہ تو اس کا حساب لگایا اور نہ اس کی زکوۃ ادا کی، حالانکہ ان پچاس ہزار روپے پر بھی زکوۃ فرض ہوچکی تھی۔ اور ان پچاس ہزار روپے کا حساب بھی نہیں لگایا، حالانکہ حساب لگایا ہوتا تو پھر اس بات کی توقع تھی کہ چلو ابھی تو زکوۃ ادا نہیں کی، لیکن آئندہ کسی وقت اس کی زکوۃ ادا کردے گا، لیکن جب حساب ہی نہیں لگایا تو اب آئندہ زندگی میں ادائیگی کے ذریعہ اس کی تلافی بھی نہیں ہوپائے گی، یہ بڑا خطرناک معاملہ ہے۔ جس تاریخ کو آدمی صاحب نصاب بنا، اسی تاریخ میں آئندہ ہر سال حساب لگانا ضروری ہے، اس میں

غلطی کرنے سے بہت بڑا نقصان ہو جاتا ہے۔

بعض حضرات یہ کرتے ہیں کہ حساب تو صحیح تاریخ پر کر لیتے ہیں، مثلاً یکم ربیع الاول ہی کو حساب کرلیا اور اپنے پاس لکھ کر رکھ لیا کہ ڈھائی ہزار روپے زکوۃ میرے اوپر فرض ہے اور اس رقم کو علیحدہ کر کے رکھ دیا، لیکن اس رقم کو روکے بیٹھے ہیں کہ جب رمضان کا مہینہ آئے گا تو اس وقت دیں گے، کیونکہ رمضان میں اس پر ستر گنا ثواب ملے گا، اس لئے اس وقت ادا کریں گے، حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ اس ملفوظ میں اسی کی طرف اشارہ فرما رہے ہیں کہ یہ بڑی سخت غلطی ہے۔ [اصلاحی مجالس، ج ۲، ص ۱۱۴]

زکوۃ کی تاریخ کیا ہونی چاہیے؟
کیا زکوۃ کی ادائیگی کے لیے رمضان کی کوئی تاریخ مقرر کرسکتے ہیں؟

ایک بات سمجھ لیں کہ زکوۃ کے لئے شرعاً کوئی تاریخ مقرر نہیں ہے اور نہ کوئی زمانہ مقرر ہے کہ اس زمانے میں یا اس تاریخ میں زکوۃ ادا کی جائے، بلکہ ہر آدمی کی زکوۃ کی تاریخ جدا ہوتی ہے، شرعاً زکوۃ کی اصل تاریخ وہ ہے جس دن آدمی پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنا، مثلاً ایک شخص یکم محرم الحرام کو پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنا تو اس کی زکوۃ کی تاریخ یکم محرم الحرام ہوگئی، اب آئندہ ہر سال اس کو یکم محرم الحرام کو اپنی زکوۃ کا حساب کرنا چاہئے، لیکن اکثر ایسا ہوتا ہے کہ لوگوں کو یہ یاد نہیں رہتا کہ ہم کس تاریخ کو پہلی مرتبہ صاحب نصاب بنے تھے، اس لئے اس مجبوری کی وجہ سے وہ اپنے لئے کوئی ایسی تاریخ زکوۃ کے حساب کی مقرر کر لے جس میں اس کے لئے حساب لگانا آسان ہو، پھر آئندہ ہر سال اسی تاریخ کو زکوۃ کا حساب کر کے زکوۃ ادا کرنے، البتہ احتیاطاً کچھ زیادہ ادا کریں۔

عام طور پر لوگ رمضان المبارک میں زکوۃ نکالتے ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ حدیث میں ہے کہ رمضان المبارک میں ایک فرض کا ثواب ستر گنا بڑھا دیا جاتا ہے، لہذا زکوۃ بھی چونکہ فرض ہے اگر رمضان المبارک میں ادا کریں گے تو اس کا ثواب بھی ستر گنا ملے گا، یہ بات اپنی جگہ بالکل درست ہے اور یہ جذبہ بہت اچھا ہے، لیکن اگر کسی شخص کو اپنے صاحب نصاب بننے کی تاریخ معلوم ہے تو محض اس ثواب کی وجہ سے وہ شخص رمضان کی تاریخ مقرر نہیں کرسکتا، لہذا اس کو چاہئے کہ اسی تاریخ پر اپنی زکوۃ کا حساب کرے، البتہ زکوۃ کی ادائیگی میں یہ کرسکتا ہے کہ اگر تھوڑی تھوڑی زکوۃ ادا کر رہا ہے، تو اس طرح ادا کرتا رہے اور باقی جو بچے اس کو رمضان المبارک میں ادا کرے، البتہ اگر تاریخ یاد نہیں ہے تو پھر گنجائش ہے کہ رمضان المبارک کی کوئی تاریخ مقرر کر لے، البتہ احتیاطاً زیادہ ادا کردے تاکہ اگر تاریخ کے آگے پیچھے ہونے کی وجہ سے جو فرق ہو گیا ہو وہ فرق بھی پورا ہو جائے۔

پھر جب ایک مرتبہ جو تاریخ مقرر کرلے تو پھر ہر سال اسی تاریخ کو اپنا حساب لگائے اور یہ دیکھے کہ اس تاریخ میں میرے کیا کیا اثاثے موجود ہیں، اس تاریخ میں نقد رقم کتنی ہے، اگر سونا موجود ہے تو اسی تاریخ کی سونے کی قیمت لگائے، اگر شیئرز ہیں تو اسی تاریخ کی ان شیئرز کی قیمت لگائے، اگر اسٹاک کی قیمت لگانی ہے تو اسی تاریخ کی اسٹاک کی قیمت لگائے اور پھر ہر سال اسی تاریخ کو حساب کر کے زکوۃ ادا کرنی چاہئے ،اس تاریخ سے آگے پیچھے نہیں کرنا چاہئے۔ [اصلاحی خطبات، ج۹،ص ۱۵۴]

زکوۃ میں ہر رقم پر علیحدہ سال کا گزرنا ضروری نہیں

پھر اس نصاب پر سال گزرنا چاہئے، یعنی ایک سال تک اگر کوئی شخص صاحب نصاب رہے تو اس پر زکوۃ واجب ہوتی ہے، اس بارے میں عام طور پر یہ غلط فہمی پائی جاتی ہے کہ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ہر ہر روپے پر مستقل پورا سال گزرے تب اس پر زکوۃ واجب ہوتی ہے، یہ بات درست نہیں، بلکہ جب ایک مرتبہ سال کے شروع میں ایک شخص صاحب نصاب بن گیا، مثلاً فرض کریں کہ یکم رمضان کو اگر کوئی شخص صاحب نصاب بن گیا، پھر آئندہ سال جب یکم رمضان آیا تو اس وقت بھی وہ صاحب نصاب ہے، تو ایسے شخص کو صاحب نصاب سمجھا جائے گا، درمیان سال میں جو رقم آتی جاتی رہی اس کا کوئی اعتبار نہیں، بس یکم رمضان کو دیکھ لو کہ تمھارے پاس کتنی رقم موجود ہے، اس رقم پر زکوۃ نکالی جائے گی، اگرچہ اس میں سے کچھ رقم صرف ایک دن پہلے ہی کیوں نہ آئی ہو۔

فرض کریں کہ ایک شخص کے پاس یکم رمضان کو ایک لاکھ روپیہ تھا، اگلے سال یکم رمضان سے دو دن پہلے پچاس ہزار روپے اس کے پاس اور آگئے اور اس کے نتیجے میں یکم رمضان کو اس کے پاس ڈیڑھ لاکھ روپے ہوگئے، اب اس ڈیڑھ لاکھ روپے پر زکوۃ فرض ہوگی، یہ نہیں کہا جائے گا کہ اس میں پچاس ہزار روپے تو صرف دو دن پہلے آئے ہیں اور اس پر ایک سال نہیں گزرا، لہذا اس پر زکوۃ نہ ہونی چاہئے یہ درست نہیں، بلکہ زکوۃ نکالنے کی جو تاریخ ہے اور جس تاریخ کو آپ صاحب نصاب بنے ہیں اس تاریخ میں جتنا مال آپ کے پاس موجود ہے اس پر زکوۃ واجب ہے، چاہے یہ رقم پچھلے سال ایک لاکھ روپے تھی، اب ڈیڑھ لاکھ ہے تو ڈیڑھ لاکھ پر زکوۃ ادا کرو، درمیان سال میں جو رقم خرچ ہوگئی اس کا کوئی حساب کتاب نہیں اور اس خرچ شدہ رقم پر زکوۃ نکالنے کی ضرورت نہیں، اللہ تعالی نے حساب کتاب کی الجھن سے بچانے کے لئے یہ آسان طریقہ مقرر کیا ہے کہ درمیان سال میں جو کچھ تم نے کھایا پیا اور وہ رقم تمھارے پاس سے چلی گئی تو اس کا کوئی حساب کتاب کرنے کی ضرورت نہیں، اسی طرح درمیان سال میں جو رقم آگئی ہے اس کا الگ سے حساب رکھنے کی ضرورت نہیں کہ وہ کس تاریخ میں آئی اور کب اس پر سال پورا ہوگا، بلکہ زکوۃ نکالنے کی تاریخ میں جو رقم تمھارے پاس ہے، اس پر زکوۃ ادا کرو، سال گزرنے کا مطلب یہ ہے جو میں نے ابھی بیان کیا۔

[اصلاحی خطبات، ج۹،ص ۱۳۹]

کارخانہ اور فیکٹری کی کن اشیاء پر زکوۃ ہے ؟

اگر کوئی شخص فیکٹری کا مالک ہے تو اس فیکٹری میں جو تیار شدہ مال ہے اس کی قیمت پر زکوۃ واجب ہے، اسی طرح جو مال تیاری کے مختلف مراحل میں ہے یا خام مال کی شکل میں ہے اس پر بھی زکوۃ واجب ہے، البتہ فیکٹری کی مشینری گاڑی وغیرہ پر زکوۃ واجب نہیں ہے۔

اسی طرح اگر کسی شخص نے کسی کاروبار میں شرکت کے لئے روپیہ لگایا ہوا ہے اور اس کاروبار کا کوئی متناسب حصہ اس کی ملکیت ہے تو جتنا حصہ اس کی ملکیت ہے اس حصے کی بازاری قیمت کے حساب سے زکوۃ واجب ہوگی۔

بہرحال خلاصہ یہ کہ نقد روپیہ جس میں بینک بیلنس اور فائینانشل انسٹرومنٹس بھی داخل ہیں ان پر زکوۃ واجب ہے اور سامان تجارت جس میں تیار مال، خام مال اور جو مال تیاری کے مراحل میں ہیں وہ سب سامان تجارت میں داخل ہیں اور کمپنی کے شیئرز بھی سامان تجارت میں داخل ہیں، اس کے علاوہ ہر وہ چیز جو آدمی نے فروخت کرنے کی غرض سے خریدی ہو وہ بھی سامان تجارت میں داخل ہے، زکوۃ نکالتے وقت ان سب کی مجموعی مالیت نکالیں اور اس پر زکوۃ ادا کریں۔ [اصلاحی خطبات، ج۹،ص ۱۴۵]

پلاٹ یا مکان کی زکوۃ

اگر کوئی پلاٹ، کوئی زمین، کوئی مکان خریدتے وقت شروع ہی میں یہ نیت تھی کہ میں اس کو فروخت کروں گا تو اس کی مالیت پر زکوۃ واجب ہے، بہت سے لوگ وہ ہوتے ہیں جو ''انویسٹمنٹ'' کی غرض سے پلاٹ خرید لیتے ہیں اور شروع ہی سے یہ نیت ہوتی ہے کہ جب اس پر اچھے پیسے ملیں گے تو اس کو فروخت کر دوں گا اور فروخت کر کے اس سے نفع کماؤں گا، تو اس پلاٹ کی مالیت پر بھی زکوۃ واجب ہے۔

لیکن اگر پلاٹ اس نیت سے خریدا کہ اگر موقع ہوا تو اس پر رہائش کے لئے مکان بنالیں گے، یا موقع ہوگا تو اس کو کرائے پر چڑھادیں گے یا کبھی موقع ہوگا تو اس کو فروخت کر دیں گے، کوئی ایک واضح نیت نہیں بلکہ ویسے ہی خرید کر ڈال دیا ہے اب اس میں یہ بھی احتمال ہے کہ آئندہ کسی وقت اس کو مکان بنا کر وہاں رہائش اختیار کرلیں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ کرائے پر چڑھادیں گے اور یہ احتمال بھی ہے کہ فروخت کریں گے تو اس صورت میں اس پلاٹ پر زکوۃ واجب نہیں ہے، لہٰذا زکوۃ صرف اس صورت میں واجب ہوتی ہے جب خریدتے وقت ہی اس کو دوبارہ فروخت کرنے کی نیت ہو، یہاں تک کہ اگر پلاٹ خریدتے وقت شروع میں یہ نیت تھی کہ اس پر مکان بنا کر رہائش اختیار کریں گے، بعد میں ارادہ بدل گیا اور یہ ارادہ کرلیا کہ اب اس کو فروخت کر کے پیسے حاصل کریں گے تو محض نیت اور ارادہ کی تبدیلی سے فرق نہیں پڑتا جب تک کہ آپ اس پلاٹ کو واقعۃ فروخت نہیں کر دیں گے، اور اس کے پیسے آپ کے پاس نہیں آجائیں گے اس وقت تک اس پر

زکوۃ واجب نہیں ہوگی۔

واجب زکوۃ کا حساب اور وصیت

اسی طرح زکوۃ کا جائزہ لیں، بالغ ہونے کے بعد زکوۃ ادا کرنا فرض ہوجاتا ہے لہذا بالغ ہونے کے بعد اگر اپنی ملکیت میں قابل زکوۃ اشیا تھیں اور ان کی زکوۃ ادا نہیں کی تھی، تو اب تک جتنے سال گذرے ہیں، ہر سال کی علیحدہ علیحدہ زکوۃ نکالیں اور اس کا باقاعدہ حساب لگائیں، اور پھر زکوۃ ادا کریں، اور اگر یاد نہ ہو تو پھر احتیاط کر کے اندازہ کریں، جس میں زیادہ ہوجائے تو کوئی حرج نہیں، لیکن کم نہ ہو، اور پھر اس کی ادائیگی کی فکر کریں، اور اس کو اپنے وصیت نامہ کی کاپی میں لکھ لیں، اور جتنی زکوۃ ادا کردیں اس کو کاپی میں لکھتے چلے جائیں، اور جلد از جلد ادا کرنے کی فکر کریں۔ [اصلاحی خطبات، ج۶،ص۵۸]

خواتین کے استعمالی زیور کی زکوۃ کس کے ذمہ ہے ؟

بہت سی خواتین اپنے شوہروں کو کہتی ہیں کہ ہمارے زیور کی زکوۃ آپ ادا کریں، کیوں کہ ہمارے پاس زکوۃ ادا کرنے کے لئے پیسہ نہیں ہیں، ایسی صورت میں اگر شوہر زکوۃ ادا کردے تو زکوۃ ادا ہوگی یا نہیں؟

یہ بات پہلے سمجھ لیں کہ جو شخص صاحب نصاب ہے اور اس پر زکوۃ فرض ہے، وہ اپنی زکوۃ کا خود ذمہ دار ہے، جس طرح ہر شخص اپنی نماز کا خود ذمہ دار ہے، جس طرح شوہر کے ذمے بیوی کی نماز نہیں، اسی طرح شوہر کے ذمے بیوی کی زکوۃ نہیں، اگر بیوی خود صاحب نصاب ہے تو زکوۃ ادا کرنا اسی کے ذمے فرض ہے، اور بیوی کا یہ کہنا کہ میرے پاس پیسے نہیں ہیں، یہ بات اس لئے درست نہیں کہ اگر پیسے نہ ہوتے تو زکوۃ واجب ہی کیوں ہوتی، اور اگر بیوی کے پاس صرف زیور ہے اور زیور کی وجہ سے وہ صاحب نصاب بن گئی اور اس کے پاس الگ سے پیسے نہیں ہیں، تو وہ اپنے زیور بیچ کر زکوۃ ادا کرے، لیکن اگر شوہر خوش دلی سے اس کی یہ درخواست قبول کرلے اور اس کی طرف سے زکوۃ ادا کردے تو زکوۃ ادا ہوجائے گی۔

البتہ یہ یاد رکھنا چاہئے کہ بیوی کے ذمے اسی زیور کی زکوۃ فرض ہے جو اس کی ملکیت میں ہو، لیکن اگر وہ زیور شوہر کی ملکیت میں ہے خواہ بیوی ہی پہنتی ہو تو اس کی زکوۃ بیوی پر فرض نہیں شوہر کو دینی ہوگی۔

اگر بچیاں نابالغ ہیں اور والدین نے وہ زیور ان کی ملکیت میں اس طرح دیدیا ہے کہ اب وہ زیور نہ بچیوں سے لیا جائے گا اور نہ دوسروں کو دیا جائے گا، تو اس صورت میں اس زیور پر زکوۃ نہیں۔ اس لئے کہ نابالغ پر زکوۃ واجب نہیں، لیکن اگر بچیاں بالغ ہیں اور والدین نے زیور کا مالک ان کو بنادیا ہے، تو اس صورت میں خود اس بچی پر اس زیور کی زکوۃ فرض ہے، اگر اسکے پاس کوئی ذریعہ آمدنی نہیں ہے تو پھر یا تو والدین اس کی طرف سے اس کی اجازت سے زکوۃ ادا کردیں، اور اگر یہ ممکن نہ ہو تو زیور فروخت کر کے زکوۃ ادا کرنی ہوگی۔

اگر اس طرح ہر سال زیور فروخت کر کے زکوۃ ادا کرتے رہیں تو پھر ایک وقت آئے گا کہ سارا زیور

ختم ہوجائے گا؟

سارا زیور ختم نہیں ہوگا، بلکہ ساڑھے باون تولہ چاندی کے بقدر ضرور باقی رہے گا، اس لئے کہ جب ساڑھے باون تولہ چاندی کی مقدار سے کم ہوگا تو نصاب زکوۃ ختم ہوجائے گا اور زکوۃ ہی واجب نہیں رہے گی۔

کن رشتہ داروں کو زکوۃ دی جاسکتی ہے ؟

زکوۃ ادا کرنے کا یہ حکم انسان کے اندر یہ مطلب اور جستجو خود بخود پیدا کرتا ہے کہ میرے پاس زکوۃ کے اتنے پیسے موجود ہیں، ان کو صحیح مصرف میں خرچ کرنا ہے، اس لئے وہ مستحقین کو تلاش کرتا ہے کہ کون کون لوگ مستحقین ہیں اور ان مستحقین کی فہرست بناتا ہے، پھر ان کو زکوۃ پہنچاتا ہے، یہ بھی انسان کی ذمہ داری ہے کہ اپنے محلے میں ملنے جلنے والوں میں عزیز واقارب اور رشتہ داروں میں، دوست احباب میں جو مستحق زکوۃ ہوں ان کو زکوۃ ادا کرے، اور ان میں سے سب سے افضل یہ ہے کہ اپنے رشتہ داروں کو زکوۃ ادا کریں، اس میں ڈبل ثواب ہے، زکوۃ ادا کرنے کا ثواب بھی ہے اور صلہ رحمی کرنے کا ثواب بھی ہے اور تمام رشتہ داروں کو زکوۃ دے سکتے ہیں، صرف دو رشتے ایسے ہیں جن کو زکوۃ نہیں دی جاسکتی، ایک ولادت کا رشتہ ہے، لہذا باپ بیٹے کو زکوۃ نہیں دے سکتا اور بیٹا باپ کو زکوۃ نہیں دے سکتا، دوسرا نکاح کا رشتہ ہے، لہذا شوہر بیوی کو زکوۃ نہیں دے سکتا اور بیوی شوہر کو زکوۃ نہیں دے سکتی، ان کے علاوہ باقی تمام رشتوں میں زکوۃ دی جاسکتی ہے، مثلاً بھائی کو بہن کو چچا کو پھوپھی کو ماموں کو زکوۃ دی جاسکتی ہے، البتہ یہ ضرور دیکھ لیں کہ وہ مستحق زکوۃ ہوں اور صاحب نصاب نہ ہوں۔ [اصلاحی خطبات، ج۹، ص۱۵۰]

کیا ہر بیوہ اور یتیم کو زکوۃ دی جاسکتی ہے ؟

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی خاتون بیوہ ہے تو اس کو زکوۃ ضرور دینی چاہئے، حالانکہ یہاں بھی شرط یہ ہے کہ وہ مستحق زکوۃ ہو اور صاحب نصاب نہ ہو، اگر بیوہ مستحق زکوۃ ہے تو اس کی مدد کرنا بڑی اچھی بات ہے، لیکن اگر خاتون بیوہ اور مستحق زکوۃ نہیں تو محض بیوہ ہونے کی وجہ سے وہ مصرف زکوۃ نہیں بن سکتی، اسی طرح یتیم کو زکوۃ دینا اور اس کی مدد کرنا بہت اچھی بات ہے لیکن یہ دیکھ کر زکوۃ دینی چاہئے کہ وہ مستحق کون ہے، لیکن اگر کوئی یتیم ہے مگر وہ مستحق زکوۃ نہیں ہے بلکہ صاحب نصاب ہے تو یتیم ہونے کے باوجود اس کو زکوۃ نہیں دی جاسکتی، ان احکام کو مدنظر رکھتے ہوئے زکوۃ نکالنی چاہئے۔ [اصلاحی خطبات، ج۹، ص۱۵۱]

حج عمرہ و عید

ارکان حج کا مقصد کیا ہے ؟

حج کے ذریعہ اللہ تبارک وتعالی ہمیں دین کی حقیقت سمجھانا چاہتے ہیں کہ دین کی حقیقت یہ ہے کہ کسی بھی عمل کی اپنی ذات میں کچھ نہیں رکھا، نہ کسی جگہ میں کچھ رکھا ہے، نہ کسی عمل میں، نہ کسی وقت میں، ان چیزوں میں جو فضیلت آتی وہ ہمارے کہنے کی وجہ سے آتی ہے، اگر ہم کہہ دیں کہ فلاں کام کرو تو وہ اجر وثواب کا کام بن جائے گا، اور اگر ہم اس کام سے روک دیں تو پھر اس میں کوئی اجر وثواب نہیں، میدان عرفہ کو لے لیجیے، ۹ ذی الحجہ کے علاوہ سال کے ۳۵۹ دن وہاں گذار دیں، ذرہ برابر بھی عبادت کا ثواب نہیں ملے گا، حالانکہ وہی میدان عرفات ہے، وہی جبل رحمت ہے، اس واسطے کہ ہم نے عام دنوں میں وہاں وقوف کرنے کے لیے نہیں کہا، جب ہم نے کہا کہ نو ذی الحجہ کو آؤ، تو اب نو ذی الحجہ کو آنا تو عبادت ہوگی اور ہماری طرف سے اجر وثواب کے مستحق ہوگے، اصل بات یہ ہے کہ نہ میدان عرفات میں کچھ رکھا ہے اور نہ اس وقت میں کچھ رکھا ہے اور نہ اس عمل میں کچھ رکھا ہے، لیکن جب ہم کہہ دیں تو پھر عمل میں بھی فضیلت پیدا ہو جاتی ہے اور جگہ میں بھی اور وقت میں بھی فضیلت پیدا ہو جاتی ہے۔

آپ سب حضرات کو معلوم ہے کہ اللہ تعالی نے مسجد حرام میں نماز پڑھنے کی اتنی فضیلت رکھی ہے کہ ایک نماز ایک لاکھ نمازوں کا اجر رکھتی ہے، اور حج کے لیے جانے والے حضرات ہر نماز پر ایک لاکھ نمازوں کا ثواب حاصل کرتے ہیں، لیکن جب ۸ ذی الحجہ کی تاریخ آتی ہے تو اب اللہ تعالی کی طرف سے حکم ہوا کہ مسجد حرام کو چھوڑ دو اور ایک لاکھ نمازوں کا ثواب جو اب تک مل رہا تھا اس کو ترک کرو اور اب منی میں جا کر پڑاؤ ڈالو، چنانچہ ۸ ذی الحجہ کی ظہر سے لے کر ۹ ذی الحجہ کی فجر تک کا وقت منی میں گذارنے کا حکم دے دیا گیا، اور ذرا یہ دیکھیے کہ اس وقت میں حاجی کا منی کے اندر کوئی کام ہے؟ کچھ نہیں! نہ اس میں جمرات کی رمی ہے اور نہ اس میں وقوف ہے اور نہ کوئی اور عمل ہے، بس صرف یہ ہے کہ پانچ نمازیں وہاں پڑھو اور ایک لاکھ نمازوں کا ثواب چھوڑ کر جنگل میں نماز پڑھو، اس حکم کے ذریعہ اس بات کی طرف اشارہ فرما دیا کہ جو ثواب ہے وہ

ہمارے کہنے کی وجہ سے ہے، اب جب ہم نے یہ کہہ دیا کہ جنگل میں جا کر نماز پڑھو تو جنگل میں نماز پڑھنے کا جو ثواب ہے وہ مسجد حرام میں بھی نماز پڑھنے سے حاصل نہیں ہوگا، اب اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ منی میں اس روز کوئی عمل تو کرنا نہیں ہے، چلو مکہ میں رہ کر یہ پانچ نمازیں مسجد حرام میں پڑھ لوں تو اس نماز سے ایک لاکھ نمازوں کا ثواب تو کجا! ایک نماز کا ثواب بھی نہیں ملے گا، اس لیے کہ اس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے خلاف کیا اور حج کے مناسک میں کمی کر دی۔

حج کی عبادت میں جگہ جگہ قدم قدم پر یہ بات نظر آتی ہے، ان بتوں کو توڑا گیا ہے جو انسان بعض اوقات اپنے سینوں میں بسا لیتا ہے، وہ یہ کہ اپنی ذات میں کسی عمل میں کچھ نہیں رکھا، کسی مقام میں کچھ نہیں رکھا، جو کچھ بھی ہے وہ ہمارے حکم کی اتباع میں ہے، جب ہم کسی چیز کا حکم دیں تو اس میں برکت اور اجر و ثواب ہے، اور جب ہم کہیں کہ یہ کام نہ کرو تو اس وقت نہ کرنے میں اجر و ثواب ہے۔

حج کی پوری عبادت میں یہی فلسفہ نظر آتا ہے، اب یہ دیکھیے کہ ایک پتھر منی میں کھڑا ہے اور لاکھوں افراد اس پتھر کو کنکریاں مار رہے ہیں، کوئی شخص اگر یہ پوچھے کہ اس کا مقصد کیا ہے؟ یہ تو دیوانگی ہے کہ ایک پتھر پر کنکر برسائے جا رہے ہیں، اس پتھر نے کیا قصور کیا ہے؟ لیکن چونکہ ہم نے کہہ دیا کہ یہ کام کرو، اس کے بعد اس میں حکمت مصلحت اور عقلی دلائل تلاش کرنے کا مقام نہیں ہے، بس اب اس پر عمل ہی میں اجر و ثواب ہے، اس دیوانگی ہی میں لطف بھی ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی رضا بھی ہے۔

حج کی عبادت میں قدم قدم پر یہ سکھایا جا رہا ہے کہ تم نے اپنی عقل کے سانچے میں جو چیزیں بٹھا رکھی ہیں اور سینے میں جو بت بسا رکھے ہیں ان کو توڑ دو اور اس بات کا ادراک پیدا کرو کہ جو کچھ بھی ہے وہ ہمارے حکم کی اتباع میں ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۲، ص ۱۳۰]

حج کس پر فرض ہوتا ہے؟
فرض حج کے ادا کرنے میں تاخیر نہ کی جائے

آج کل ہم لوگوں نے حج کرنے کے لیے اپنے اوپر بہت سی شرطیں عائد کر لی ہیں، بہت سی ایسی پابندیاں عائد کر لی ہیں جن کی شریعت میں کوئی اصل نہیں، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک ان کے دنیوی مقاصد پورے نہ ہو جائیں، مثلاً جب تک مکان نہ بن جائے یا جب تک بیٹیوں کی شادیاں نہ ہو جائیں، اس وقت تک حج نہیں کرنا چاہیے، یہ خیال بالکل غلط ہے، بلکہ جب انسان کے پاس اتنا مال ہو جائے کہ اس کے ذریعہ حج ادا کر سکے، یا اس کی ملکیت میں سونا اور زیور ہے اور وہ اتنا ہے کہ اگر اس کو وہ فروخت کر دے تو اس کی رقم اتنی وصول ہو جائے گی جس کے ذریعہ حج ادا ہو جائے گا تب بھی حج فرض ہو جائے گا، لہٰذا حج فرض ہو جانے کے بعد اس کو کسی چیز کے انتظار کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۶۲]

قرآن کریم نے فرمایا ہے کہ حج ہر اس شخص پر فرض ہے جو بیت اللہ تک جانے کی استطاعت رکھتا ہو، اس استطاعت کا مطلب یہ ہے کہ انسان کے پاس مکہ مکرمہ آنے جانے اور وہاں قیام وطعام وغیرہ کا ضروری خرچ موجود ہو، نیز اگر وہ اہل وعیال کو وطن میں چھوڑ کر جارہا ہے تو ان کے ضروری اخراجات ان کو دے کر جاسکے، جب بھی کسی شخص کے پاس اتنی رقم موجود ہو کہ وہ یہ ضروریات پوری کرسکے، تو اس پر حج کی ادائیگی فرض ہے، اگر اتنا خرچ نقد موجود نہ ہو، لیکن اپنی ملکیت میں اتنا زیور ہو، یا فوری ضرورت سے زائد اتنا سامان (مثلاً سامان تجارت) ہو کہ اس کی مالیت سے یہ خرچ پورے ہوسکتے ہوں تو اس پر بھی حج فرض ہوجاتا ہے۔

جب ایک مرتبہ حج فرض ہوجائے تو پھر اسے کسی شدید عذر کے بغیر ٹلانا یا مؤخر کرنا جائز نہیں، بلا وجہ مؤخر کرنے سے انسان گناہگار ہوتا ہے، ظاہر ہے کہ یہ بات کسی کو معلوم نہیں ہے کہ وہ کتنا عرصہ زندہ رہے گا، لہٰذا حج فرض ہونے کے بعد جس قدر جلد ممکن ہو یہ فریضہ ادا کرلینا چاہئے، آج کل چونکہ اس کام کے لئے درخواست دے کر منظوری لینی پڑتی ہے، اس لئے جس شخص کے ذمہ بھی اوپر بیان کئے ہوئے معیار کے مطابق حج فرض ہو، اس پر حج کے لئے درخواست دینا شرعاً ضروری ہے، اگر قرعہ اندازی میں نام نہ آئے یا سرکار کی طرف سے اجازت نہ ملے تو ایک مجبوری ہے، اور انشاء اللہ اس صورت میں درخواست دینے والا حج کو مؤخر کرنے سے گناہگار نہیں ہوگا، اور جب تک وہ ہر سال درخواست دیتا رہے گا اس کی ذمہ داری پوری ہوتی رہے گی، یہاں تک کہ اسے اجازت مل جائے، اور وہ باقاعدہ حج کرے۔ لیکن یہ تصور قطعی طور پر غلط اور بے بنیاد تصور ہے کہ جب عمر بڑی ہوجائے گی اس وقت حج کے لئے درخواست بھیجی جائے گی۔

بلکہ سچی بات تو یہ ہے کہ حج کا اصل لطف درحقیقت جوانی ہی میں ہے، اول تو اس لئے کہ حج میں جسمانی محنت اور مشقت کی ضرورت ہوتی ہے، اور حج کے افعال اسی وقت نشاط اور ذوق وشوق کے ساتھ انجام دیئے جاسکتے ہیں جب انسان کے قویٰ اچھے ہوں، اور وہ اطمینان کے ساتھ یہ محنت برداشت کرسکتا ہو، ورنہ بڑھاپے میں اگرچہ انسان جوں توں کرکے حج کرلیتا ہے، لیکن کتنے کام ایسے ہیں جنہیں نشاط چستی اور حضور قلب کے ساتھ انجام دینے کی حسرت ہی دل میں رہ جاتی ہے، دوسرے اس لئے کہ حج اگر اخلاص اور نیک نیتی سے صحیح طور پر انجام دیا جائے تو تجربہ یہ ہے کہ وہ انسان کے دل میں ایک انقلاب ضرور لیکر آتا ہے، اس سے انسان کے دل میں نرمی، اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی ہے جو بالآخر اسے گناہ، جرائم اور بدعنوانیوں سے روکتی ہے، قلب وذہن کی اس تبدیلی کی سب سے زیادہ ضرورت انسان کو جوانی میں ہوتی ہے، کیونکہ اس کے بغیر وہ جوانی کی رو میں غلطیاں کرتا چلا جاتا ہے:

وقت پیری گرگ ظالم می شود پرہیز گار
درجوانی توبہ کردن شیوۂ پیغمبری است

(بڑھاپے میں تو ظالم بھیڑیا بھی پرہیزگار بن جاتا ہے، پیغمبروں کا شیوہ یہ ہے کہ جوانی میں ظلم اور گناہ سے توبہ کی جائے) [ذکر و فکر، ص ۲۱۵]

آج تک حج کی وجہ سے کوئی فقیر نہیں ہوا

لہذا یہ سوچنا کہ ہمارے ذمے بہت سارے کام ہیں، ہمیں مکان بنانا ہے، ہمیں اپنی بیٹیوں یا بیٹوں کی شادی کرنی ہے، اگر یہ رقم ہم حج میں صرف کردیں گے تو ان کاموں کے لیے رقم کہاں سے آئے گی؟ یہ سب فضول خیالات اور فضول سوچ ہے، اللہ تعالی نے اس حج کی خاصیت یہ رکھی ہے کہ اللہ تعالی کے فضل وکرم سے حج ادا کرنے کے نتیجے میں آج تک کوئی شخص مفلس نہیں ہوا، قرآن کریم کا ارشاد ہے:

﴿ليشهدوا منافع لهم﴾ [الحج:۲۸]

یعنی ہم نے حج فرض کیا ہے، تاکہ اپنی آنکھوں سے وہ فائدے دیکھیں جو ہم نے ان کے لیے حج کے اندر رکھے ہیں، حج کے بے شمار فائدے ہیں، ان کا احاطہ کرنا بھی ممکن نہیں ہے، ان میں سے ایک فائدہ یہ ہے کہ اللہ تعالی رزق میں برکت عطا فرما دیتے ہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۶۳]

حج بیت اللہ کا سلسلہ ہزاروں سال سے جاری ہے، آج تک کوئی ایک انسان بھی ایسا نہیں ملے گا جس کے بارے میں یہ کہا جاسکے کہ اس شخص نے چونکہ اپنے پیسے حج پر خرچ کردیے تھے، اس وجہ سے یہ مفلس اور فقیر ہوگیا، البتہ ایسے بے شمار لوگ آپ کو ملیں گے کہ حج کی برکت سے اللہ تعالی نے ان کے رزق میں برکت عطا فرمائی اور وسعت اور خوش حالی عطا فرمائی، لہذا یہ خیال بالکل غلط ہے کہ جب تک دنیا کے فلاں فلاں کام سے فارغ نہ ہوجائیں، اس وقت تک حج نہیں کریں گے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۶۴]

والدین کو پہلے حج کرانا ضروری نہیں

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جب تک ہم والدین کو حج نہیں کرادیں گے، اس وقت تک ہمارا حج کرنا درست نہیں ہوگا، یہ خیال اتنا عام ہوگیا ہے کہ کئی لوگوں نے مجھ سے پوچھا کہ میں حج پر جانا چاہتا ہوں لیکن میرے والدین نے حج نہیں کیا، لوگ مجھے یہ کہتے ہیں کہ اگر والدین کے حج سے پہلے تم حج کرلوگے تو تمہارا حج قبول نہیں ہوگا، یہ محض جہالت کی بات ہے، ہر انسان پر اس کا فریضہ الگ ہے، جیسے والدین نے اگر نماز نہیں پڑھی تو بیٹے سے نماز ساقط نہیں ہوتی، بیٹے سے اس کی نماز کے بارے میں الگ سوال ہوگا اور ماں باپ سے ان کی نمازوں کے بارے میں الگ سوال ہوگا، یہی معاملہ حج کا ہے، اگر ماں باپ پر حج فرض نہیں ہے تو کوئی حرج نہیں، اگر وہ حج پر نہیں گئے تو کوئی بات نہیں، لیکن اگر آپ پر حج فرض ہے تو آپ کے لیے حج پر جانا ضروری ہے اور یہ کوئی ضروری نہیں کہ پہلے والدین کو حج کرائے اور پھر خود کرے، یہ سب خیالات غلط ہیں، ہر انسان اللہ تعالی کے نزدیک اپنے اعمال کا مکلف ہے، اس کو اپنے اعمال کی فکر کرنی چاہیے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۶۵]

اس کی مثال ایسی ہے جیسے رمضان کے مہینے میں باپ بیماری یا ضعیفی کی وجہ سے روزے نہ رکھ سکے تو بیٹے کے لئے اس بات کا جواز پیدا نہیں ہوتا کہ وہ باپ کی وجہ سے خود اپنے روزے بھی چھوڑ دے، اور یہ طے کرلے کہ جب تک باپ روزے رکھنے کے لائق نہ ہو میں بھی روزے نہیں رکھوں گا، جس طرح یہ طرز عمل غلط ہے، اسی طرح اپنے حج کو باپ کے حج پر موقوف رکھنا بھی غلط ہے، اپنا فرض ادا کرلینا چاہئے پھر جب کبھی استطاعت ہو، اس وقت باپ کو حج کرانے کی بھی کوشش کرلینی چاہئے۔ [ذکر وفکر، ص۲۱۷]

فرض حج کے لیے گھر کے بڑوں کی حج کی ادائیگی کا انتظار کرنا

بعض گھروں میں یہ رواج بھی دیکھنے میں آیا کہ جب تک گھر کا بڑا فرد حج نہ کرلے اس وقت تک چھوٹے حج کرنا ضروری نہیں سمجھتے، بلکہ بعض گھرانوں میں اس کو ایک عیب سمجھا تا ہے کہ چھوٹا بڑے سے پہلے حج کرآئے، حالانکہ دوسری عبادتوں، نماز، روزے اور زکوۃ کی طرح حج بھی ایک ایسا فریضہ ہے جو ہر شخص پر انفرادی طور سے عائد ہوتا ہے، خواہ کسی دوسرے نے حج کیا ہو، یا نہ کیا ہو، اگر گھر کے کسی چھوٹے فرد کے پاس حج کی استطاعت ہے تو اس پر حج فرض ہے، اگر بڑے کے پاس استطاعت نہ ہو، یا استطاعت کے باوجود وہ حج نہ کررہا ہو تو نہ اس سے چھوٹے کا فریضہ ساقط ہوتا ہے، نہ اسے مؤخر کرنے کا کوئی جواز پیدا ہوتا ہے۔

[ذکر وفکر، ص۲۱۶]

بیٹیوں کی شادی کے عذر سے فرض حج مؤخر کرنا

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ بیٹیوں کی شادیاں کرنی ہیں، جب تک بیٹیوں کی شادیاں نہ ہوجائیں، اس وقت تک حج نہیں کرنا، لہذا پہلے بیٹیوں کی شادی کریں گے پھر حج کریں گے، یہ بھی بیکار بات ہے، یہ بالکل ایسی ہی ہے جیسے کوئی شخص یہ کہے کہ جب بیٹی کی شادی ہوجائے تو اس کے بعد نماز پڑھوں گا، بھائی! اللہ تعالی نے جو فریضہ عائد کیا ہے وہ فریضہ ادا کرنا ہے، وہ کسی اور بات پر موقوف نہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۴، ص۶۶]

فرض حج کے لیے بڑھاپے کا انتظار کرنا

بعض لوگ یہ سوچتے ہیں کہ جب بڑھاپا آجائے گا تو اس وقت حج کریں گے، جوانی میں حج کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ حج کرنا تو بوڑھوں کا کام ہے، جب بوڑھے ہوجائیں گے اور مرنے کا وقت قریب آئے گا تو اس وقت حج کرلیں گے، یادرکھیے! یہ شیطانی دھوکہ ہے، ہر وہ شخص جو بالغ ہوجائے اور اس کے پاس اتنی استطاعت ہو کہ وہ حج ادا کرسکے تو اس پر حج فرض ہوگیا اور جب حج فرض ہوگیا تو اب جلد از جلد اس فریضے کو انجام دینا واجب ہے، بلا وجہ تاخیر کرنا جائز نہیں، کیا پتہ کہ بڑھاپے تک وہ زندہ بھی رہے گا یا نہیں؟ بلکہ درحقیقت حج تو جوانی کی عبادت ہے، جوانی میں آدمی کے قویٰ مضبوط ہوتے ہیں، وہ تندرست ہوتا ہے، اس

وقت وہ حج کی مشقت کو آسانی کے ساتھ برداشت کرسکتا ہے، لہذا یہ سمجھنا کہ بڑھاپے میں حج کریں گے، یہ بات درست نہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ٦٦]

حج فرض ادا نہ کرنے کی صورت میں وصیت کرنا

یہاں یہ مسئلہ بھی عرض کردوں کہ اگر بالفرض کوئی شخص حج فرض ہوجانے کے باوجود اپنی زندگی میں حج ادا نہ کرسکا تو اس پر یہ فرض ہے کہ وہ اپنی زندگی میں یہ وصیت کرے کہ اگر میں زندگی میں حج فرض ادا نہ کرسکوں تو میرے مرنے کے بعد میرے ترکے سے کسی کو میری طرف سے حج بدل کے لیے بھیجا جائے، کیونکہ اگر آپ یہ وصیت کردیں گے تب تو آپ کے وارثین پر لازم ہوگا کہ وہ آپ کی طرف سے حج بدل کرائیں ورنہ نہیں۔

اور وارثین پر بھی آپ کی طرف سے حج بدل کرانا اس وقت لازم ہوگا جب حج کا پورا خرچہ آپ کے پورے ترکے کے ایک تہائی کے اندر آتا ہو، مثلاً فرض کریں کہ حج کا خرچ ایک لاکھ روپے ہے اور آپ کا ترکہ تین لاکھ روپے بنتا ہے یا اس سے زیادہ، تو اس صورت میں یہ وصیت نافذ ہوگی اور ورثا پر لازم ہوگا کہ آپ کی طرف سے حج بدل کرائیں، لیکن اگر حج کا خرچ ایک لاکھ روپے ہے اور آپ کا پورا ترکہ تین لاکھ سے کم ہے تو اس صورت میں ورثا پر یہ لازم نہیں ہوگا کہ آپ کی طرف سے حج بدل ضرور کرائیں، کیونکہ شریعت کا یہ اصول ہے کہ یہ مال جو ہمارے پاس موجود ہے، اس مال پر ہمارا اختیار اس وقت تک ہے جب تک ہم پر مرض الموت طاری نہیں ہوجاتا، ہم اس مال کو جس طرح چاہیں استعمال کریں، لیکن جیسے ہی مرض الموت شروع ہوجاتا ہے، اس وقت اس مال پر سے ہمارا اختیار ختم ہوجاتا ہے اور یہ مال وارثوں کا ہوجاتا ہے، البتہ اس وقت صرف ایک تہائی مال کی حد تک ہمارا اختیار باقی رہ جاتا ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ٦٨]

حج بدل کس شہر سے ادا کرایا جائے؟

بعض لوگ حج بدل کراتے وقت یہ سوچتے ہیں کہ اگر ہم یہاں کراچی سے حج بدل کرائیں گے تو ایک لاکھ کا خرچ ہوگا، اس لیے ہم مکہ مکرمہ میں ہی کسی کو پیسے دے دیں گے، وہ وہیں سے حج ادا کرلے گا، یاد رکھیے! اس بارے میں مسئلہ یہ ہے کہ شدید مجبوری کے بغیر اس طرح حج بدل ادا نہیں ہوتا، اگر میں کراچی میں رہتا ہوں اور میرے ذمے حج فرض ہے تو اگر میں کسی کو اپنی طرف سے حج بدل کے لیے بھیجوں تو وہ بھی کراچی سے جانا چاہیے، یہ نہیں کرسکتا کہ مکہ مکرمہ سے کسی کو پکڑ کر دو سو روپے میں حج کرالیا، چونکہ میں کراچی میں رہتا ہوں، اس لیے میرے وطن سے ہی حج بدل ہوگا، مکہ مکرمہ سے نہیں ہوگا۔

یہ اور بات ہے کہ ایک آدمی دنیا سے چلا گیا اور اس نے ترکہ بالکل نہیں چھوڑا، اب اس کے ورثا نے سوچا کہ اور کچھ نہیں ہوسکتا تو کم از کم اتنا ہوجائے گا کہ کسی کو مکہ مکرمہ ہی سے بھیج کر اس کی طرف سے حج

کرادیں، تو قانون کے اعتبار سے تو وہ حج بدل نہیں ہوگا، لیکن اللہ تعالیٰ اپنے فضل سے قبول کرلیں تو یہ ان کا کرم ہے اور نہ ہونے سے یہ صورت بہرحال بہتر ہے، لیکن اصول اور قانون وہی ہے کہ جس شخص کے ذمے حج واجب ہے، حج بدل والے کو اسی شخص کے شہر سے جانا چاہیے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۶۹]

قانونی یا سرکاری رکاوٹ کی وجہ سے فرض حج ادا نہ کرسکنا معقول عذر ہے

آج کل یہ حال ہے کہ حج کرنا اپنے اختیار میں نہیں رہا، کیونکہ حج کرنے پر بہت ساری قانونی اور سرکاری پابندیاں عائد ہیں، مثلاً پہلے درخواست دو، پھر قرعہ اندازی میں نام آئے وغیرہ، لہذا جب کسی شخص پر حج فرض ہوگیا اور اس نے حج پر جانے کی قانونی کوشش کرلی اور پھر بھی نہ جاسکا تو وہ اللہ تعالیٰ کے ہاں معذور ہے، لیکن اپنی طرف سے کوشش کرے اور حج پر جانے کے جتنے قانونی ذرائع ہوسکتے ہیں ان کو اختیار کرے، لیکن آدمی ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جائے اور جانے کی فکر ہی نہ کرے تو یہ گناہ کی بات ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۷۰]

بیت اللہ پر پہلی نظر پڑنے کے باوجود رونا نہ آنا

بہت سے لوگوں سے یہ سن رکھا ہے کہ جب بیت اللہ شریف پر پہلی نظر پڑتی ہے تو آدمی ہنستا ہے یا روتا ہے، یہ بات لوگوں کے درمیان مشہور ہوچکی ہے۔ اب ایک شخص وہاں پہنچا اور بیت اللہ پر نظر پڑی تو نہ ہنسی آئی اور نہ رونا آیا، اب وہ شخص بہت پریشان ہو رہا ہے کہ میں تو شیطان ہوں، میں تو مردود ہوچکا ہوں، اس لئے مجھے تو نہ ہنسی آئی اور نہ رونا آیا۔ یاد رکھئے! وہاں پر ہنسنے اور رونے کی کوئی حقیقت نہیں، ارے جب وہاں پہنچ گئے اور بیت اللہ شریف پر نگاہ پڑ گئی، اور وہاں پر حاضر ہوکر طواف کرنے کی توفیق ہوگئی تو بس یہ بھی اللہ تعالیٰ کا کرم اور احسان ہے، چاہے رونا آئے یا نہ آئے، اگر رونا آئے تو نعمت ہے، رونا نہ آئے تب بھی غم کی کوئی بات نہیں، اور اس کی وجہ سے محرومی نہیں ہوگی۔ اس لئے کہ یہ کیفیات مقصود ہی نہیں، ان کی طرف زیادہ دھیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں، اصل یہ ہے کہ یہ دیکھو کہ جو عمل مامور بہ ہے وہ ادا ہو رہا ہے یا نہیں؟

[اصلاحی مجالس، ج ۳، ص ۱۰۹]

حج عمرہ کرنے گئے لیکن مزہ ہی نہیں آیا

جو لوگ حج یا عمرہ پر حرمین شریفین جاتے ہیں، عام طور سے ان پر مختلف کیفیات طاری ہوتی ہیں، مثلاً یہ بات مشہور ہے کہ جب بیت اللہ پر پہلی نظر پڑتی ہے تو اس پر گریہ طاری ہوجاتا ہے یا ہنسی آجاتی ہے یا کوئی دوسری کیفیت طاری ہوجاتی ہے، اور جب ملتزم پر پہنچتے ہیں تو وہاں پر بھی رونا آتا ہے اور گریہ طاری

ہوجاتا ہے وغیرہ وغیرہ، تو یہ سب کیفیات پیدا ہوتی ہیں، لیکن یہ کیفیات غیر اختیاری ہیں، اگر حاصل ہوجائیں تو یہ اللہ تعالیٰ کی نعمت ہیں اور اگر حاصل نہ ہوں تو اس پر گھبرانے اور پریشان ہونے کی کوئی بات نہیں، چنانچہ بعض لوگ صرف اس وجہ سے پریشان ہوجاتے ہیں کہ ہم عمرہ کرنے یا حج کرنے گئے وہاں تو ہمارا دل پتھر ہوگیا، نہ تو ہمیں رونا آیا، نہ ہم پر گریہ طاری ہوا، نہ آنسو نکلے اور نہ ہی کوئی اور کیفیت طاری ہوئی، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ہمارے اوپر مردودیت غالب ہوگئی ہے اور ہم پر شیطانی اثرات غالب آگئے وغیرہ وغیرہ، اس قسم کے خیالات دل میں آتے ہیں، یاد رکھیے! اللہ تعالیٰ تمہیں اس بنیاد پر راندہ درگاہ نہیں کریں گے کہ تمہیں غیر اختیاری طور پر رونا کیوں نہیں آیا؟ اور نہ اس پر گرفت کریں گے، بشرط یہ کہ عمل صحیح ہو اور جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سنت کے مطابق ہو تو پھر رونا آئے یا نہ آئے، کیفیت طاری ہو یا نہ ہو لیکن ان شاء اللہ، اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ حج وعمرہ مقبول ہے اور موجب اجر ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۹، ص۱۶۹]

اسلامی تہوار عید الفطر وعید الاضحی رمضان اور حج کے ساتھ ہی کیوں خاص ہیں؟

یہ بھی اسلام کا نرالا انداز ہے کہ پورے سال میں صرف دو تہوار اور دو عیدیں مقرر کی گئی ہیں، جبکہ دنیا کے دوسرے مذاہب اور ملتوں میں سال کے دوران بہت سے تہوار منائے جاتے ہیں، عیسائیوں کے تہوار الگ ہیں، یہودیوں کے تہوار الگ ہیں، ہندوؤں کے تہوار الگ ہیں، لیکن اسلام نے صرف دو تہوار مقرر کیے ہیں، ایک عید الفطر اور دوسری عید الاضحیٰ، اور ان دونوں تہواروں کو منانے کے لیے جن دنوں کا انتخاب کیا گیا، وہ بھی دنیا سے نرالے ہیں، اگر آپ دوسرے مذاہب کے تہواروں پر غور کریں گے تو یہ نظر آئے گا کہ وہ لوگ ماضی میں پیش آنے والے کسی اہم واقعہ کی یادگار میں تہوار مناتے ہیں، مثلاً عیسائی ۲۵ دسمبر کو کرسمس کا تہوار مناتے ہیں، اور بقول ان کے یہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی پیدائش کا دن ہے، حالانکہ تاریخی اعتبار سے یہ بات درست نہیں، لیکن انہوں نے اپنے طور پر یہ سمجھ لیا کہ ۲۵ دسمبر کو حضرت عیسیٰ علیہ السلام دنیا میں تشریف لائے تھے، چنانچہ آپ کی پیدائش کی یاد میں انہوں نے کرسمس کے دن کو تہوار کے لیے مقرر کرلیا۔

جس دن حضرت موسیٰ علیہ السلام کو اور بنی اسرائیل کو فرعون سے نجات ملی اور فرعون غرق ہوگیا اور موسیٰ علیہ السلام بنی اسرائیل کو لے کر چلے گئے، اس دن کی یاد میں یہودی اپنا تہوار مناتے ہیں، ہندوؤں کے یہاں بھی جو تہوار ہیں وہ بھی ماضی کے کسی نہ کسی واقعہ کی یاد میں منائے جاتے ہیں۔

جبکہ اسلام نے جو دو تہوار عید الفطر اور عید الاضحیٰ مقرر کیے ہیں، ماضی کا کوئی واقعہ اس دن کے ساتھ وابستہ نہیں، یکم شوال کو عید الفطر منائی جاتی ہے اور دس ذی الحجہ کو عید الاضحیٰ منائی جاتی ہے، ان دونوں تاریخوں میں کوئی واقعہ پیش نہیں آیا، اسلام نے نہ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت کے دن کو عید الفطر اور عید الاضحیٰ قرار

دیا، نہ ہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مکہ مکرمہ سے مدینہ طیبہ کی طرف ہجرت کرنے کے واقعہ کو عید کا دن قرار دیا، نہ ہی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے بدر کے میدان میں فتح حاصل کرنے کو عید کا دن قرار دیا، نہ ہی غزوہ احد اور غزوہ احزاب کے دن کو عید کا دن قرار دیا، اور جس مکہ مکرمہ فتح ہوا اور بیت اللہ کی چھت سے حضرت بلال ؓ کی اذان پہلی مرتبہ گونجی، اس دن کو بھی عید کا دن قرار نہیں دیا، اسلام کی پوری تاریخ اور خاص طور پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی حیاتِ طیبہ ایسے واقعات سے مالا مال ہے، لیکن اسلام نے ان میں سے کسی واقعہ کو عید کا دن قرار نہیں دیا، جن ایام کو اسلام نے تہوار کے لیے مقرر فرمایا، ان کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ وابستہ نہیں جو ماضی میں ایک مرتبہ پیش آ کر ختم ہو چکا ہو۔

بلکہ اس کے بجائے ایسے خوشی کے واقعات کو تہوار کی بنیاد قرار دیا جو ہر سال پیش آتے ہیں اور ان کی خوشی میں عید منائی جاتی ہے، چنانچہ اللہ تعالیٰ نے دونوں عیدیں ایسے موقع پر مقرر فرمائیں ہیں جب مسلمان کسی عبادت کی تکمیل سے فارغ ہوتے ہیں، چنانچہ عید الفطر رمضان کے گذرنے کے بعد رکھی ہے کہ میرے بندے پورے مہینے عبادت کے اندر مشغول رہے، پورے مہینے انہوں نے میرے خاطر کھانا پینا چھوڑے رکھا، نفسانی خواہشات کو چھوڑے رکھا، اور پورا مہینہ عبادت کے اندر گذارا، اس کی خوشی اور انعام میں یہ عید الفطر مقرر فرمائی۔

اور عید الاضحیٰ ایسے موقع پر مقرر فرمائی جب مسلمان ایک دوسری عظیم عبادت یعنی حج کی تکمیل کرتے ہیں، اس لیے کہ حج کا سب سے بڑا رکن وقوف عرفہ ۹ ذی الحجہ کو ادا کیا جاتا ہے، اس تاریخ کو پوری دنیا سے آئے ہوئے لاکھوں مسلمان میدان عرفات میں جمع ہو کر اللہ تعالیٰ کی عظیم عبادت کی تکمیل کرتے ہیں، اس عبادت کی تکمیل کے اگلے دن یعنی دس ذی الحجہ کو اللہ تعالیٰ نے دوسری عید مقرر فرمائی، اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ نے یہ سبق دے دیا کہ ماضی کے وہ واقعات جو ایک مرتبہ پیش آئے اور ختم ہو گئے، وہ واقعات تمہارے لیے عید کی بنیاد نہیں، بیشک تمہاری تاریخ ان واقعات سے جگمگا رہی ہے اور تمہیں ان پر فخر کرنے کا بھی حق پہنچتا ہے کہ تمہارے آباء واجداد نے یہ کارنامے انجام دیے تھے، لیکن تمہارے لیے ان کا عمل کافی نہیں، تمہارے لیے تمہارا اپنا عمل ہونا ضروری ہے، کوئی شخص آخرت میں صرف اس بنیاد پر نجات نہیں پائے کہ میرے آباء واجداد نے اتنے بڑے کارنامے انجام دیے تھے، بلکہ وہاں پر ہر آدمی کو اپنے عمل کا جواب دینا ہوگا، اقبال مرحوم نے خوب کہا کہ:

تھے تو وہ آباء تمہارے مگر تم کیا ہو
ہاتھ پر ہاتھ دھرے منتظر فردا ہو

لہٰذا محض پرانے واقعات پر خوشی مناتے رہنا، صاحب ایمان کے لیے یہ کافی نہیں، بلکہ خود تمہیں اپنے عمل کو دیکھنا ہے، اگر تمہارے اپنے عمل کے اندر اچھائی ہے تو خوشی منانی ہے، اور اگر برائی ہے تو رنج کرنا ہے اور ندامت کا اظہار کرنا ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۲، ص ۸۸]

قربانی

ذی الحجہ کے پہلے عشرے میں قربانی کرنے والے کے لیے بال اور ناخن نہ کاٹنے کا حکم کیوں ہے؟

ذی الحجہ کا چاند دیکھتے ہی جو حکم سب سے پہلے ہماری طرف متوجہ ہو جاتا ہے وہ ایک عجیب وغریب حکم، وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ جب تم میں سے کسی کو قربانی کرنی ہو تو جس وقت وہ ذی الحجہ کا چاند دیکھے اس کے بعد اس کے لیے بال کاٹنا اور ناخن کاٹنا درست نہیں، چونکہ یہ حکم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے اس واسطے اس عمل کو مستحب قرار دیا گیا ہے کہ آدمی اپنے ناخن اور بال اس وقت تک نہ کاٹے جب تک قربانی نہ کرلے۔[ابن ماجه،كتاب الاضاحى،باب من أراد أن يضحى فلا يأخذ فى العشر من شعره الخ]

بظاہر یہ حکم بڑا عجیب وغریب معلوم ہوتا ہے کہ چاند دیکھ کر بال اور ناخن کاٹنے سے منع کر دیا گیا ہے، لیکن بات دراصل یہ ہے کہ ان ایام میں اللہ تعالی نے حج کی عظیم الشان عبادت مقرر فرمائی اور مسلمانوں کی ایک بہت بڑی تعداد الحمدللہ اس وقت اس عبادت سے بہرہ اندوز ہوتی ہے، ان دنوں وہاں یہ حال ہے کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ بیت اللہ کے اندر ایک ایسا مقناطیس لگا ہوا ہے جو چاروں طرف سے فرزندان توحید کو اپنی طرف کھینچ رہا ہے، ہر لمحے ہزاروں افراد اطراف عالم سے وہاں پہنچ رہے ہیں اور بیت اللہ کے اردگرد جمع ہو رہے ہیں، اللہ تعالی نے ان لوگوں کو حج بیت اللہ کی ادائیگی کی یہ سعادت بخشی ہے، ان حضرات کے لیے یہ حکم ہے کہ جب وہ بیت اللہ شریف کی طرف جائیں تو وہ بیت اللہ کی وردی یعنی احرام پہن کر جائیں اور پھر احرام کے اندر شریعت نے بہت سی پابندیاں عائد کر دیں، مثلا یہ کہ سلا ہوا کپڑا نہیں پہن سکتے، خوشبو نہیں لگا سکتے، منہ نہیں ڈھانپ سکتے وغیرہ وغیرہ، ان میں سے ایک پابندی یہ ہے کہ بال اور ناخن نہیں کاٹ سکتے۔

حضور سرور عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم پر اور ان لوگوں پر جو بیت اللہ کے پاس حاضر نہیں ہیں اور حج بیت اللہ کی عبادت میں شریک نہیں ہیں، اللہ تعالی کے کرم کو متوجہ فرمانے اور ان کی رحمت کا مورد بنانے کے لیے یہ فرما دیا کہ ان حجاج بیت اللہ کے ساتھ تھوڑی سی مشابہت اختیار کرلو، تھوڑی سی ان کی شباہت اپنے اندر پیدا کرلو اور جس طرح وہ بال نہیں کاٹ رہے ہیں تم بھی مت کاٹو، یہ ان اللہ کے بندوں کے ساتھ

شباہت پیدا کردی جو اس وقت حج بیت اللہ کی عظیم سعادت سے بہرہ اندوز ہو رہے ہیں۔

ہمارے حضرت ڈاکٹر محمد عبدالحئی صاحبؒ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی رحمتیں بہانے ڈھونڈتی ہیں، جب ہمیں یہ حکم دیا کہ ان کی مشابہت اختیار کرلو تو اس کے معنی یہ ہیں کہ ان پر جو رحمتیں نازل فرمانا منظور ہے اس کا کچھ حصہ تمہیں بھی عطا فرمانا چاہتے ہیں تاکہ جس وقت عرفات کے میدان میں اللہ کے بندوں پر رحمت کی بارشیں برسیں اس کی بدلی کا کوئی ٹکڑا ہم پر بھی رحمت برسا دے تو یہ شباہت پیدا کرنا بھی بڑی نعمت ہے اور حضرت مجذوب صاحبؒ کا یہ شعر بکثرت پڑھا کرتے تھے کہ:

تیرے محبوب کی یارب شباہت لے کر آیا ہوں
حقیقت اس کو تو کردے میں صورت لے کر آیا ہوں

کیا بعید ہے کہ اللہ اس صورت کی برکت سے حقیقت میں تبدیل فرمادے اور اس کی رحمت کی جو گھٹائیں وہاں برسیں گی ان شاء اللہ ہم اور آپ اس سے محروم نہیں رہیں گے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۲، ص ۱۲۴]

کیا قربانی معاشی تباہی ونقصان کا ذریعہ ہے ؟ اگر قربانی کرنے کے بجائے وہی پیسہ غریب کو دے دیا جائے تو اس میں کیا برائی ہے ؟

جس مقصد کے تحت اللہ تعالیٰ نے یہ قربانی واجب فرمائی تھی، آج اسی کے بالکل برخلاف کہنے والے یہ کہہ رہے ہیں کہ صاحب! قربانی کیا ہے؟ یہ قربانی (معاذ اللہ) خواہ مخواہ رکھ دی گئی ہے، لاکھوں روپیہ خون کی شکل میں نالیوں میں بہہ جاتا ہے اور معاشی اعتبار سے نقصان دہ ہے، کتنے جانور کم ہوجاتے ہیں، اور فلاں فلاں معاشی نقصان ہوتے ہیں وغیرہ، لہٰذا قربانی کرنے کے بجائے یہ کرنا چاہیے کہ وہ لوگ جو غریب ہیں جو بھوک سے بلبلا رہے ہیں تو قربانی کرکے گوشت تقسیم کرنے کے بجائے اگر وہ روپیہ اس غریب کو دے دیا جائے تو اس کی ضرورت پوری ہوجائے، یہ پروپیگنڈہ اتنی کثرت سے کیا جارہا ہے کہ پہلے زمانے میں تو صرف ایک مخصوص حلقہ تھا جو یہ باتیں کہتا تھا، لیکن اب یہ حالت ہوگئی ہے کہ شاید ہی کوئی دن خالی جاتا ہو جس میں کم از کم دو چار افراد یہ بات نہ پوچھ لیتے ہوں کہ ہمارے عزیزوں میں بہت سے لوگ غریب ہیں، لہٰذا اگر ہم لوگ قربانی نہ کریں اور وہ رقم ان کو دے دیں تو اس میں کیا حرج ہے؟

بات دراصل یہ ہے کہ ہر عبادت کا ایک موقع اور ایک محل ہوتا ہے، مثلاً کوئی شخص یہ سوچے کہ میں نماز نہ پڑھوں اور اس کے بجائے غریب کی مدد کردوں تو اس سے نماز کا فریضہ ادا نہیں ہوسکتا، غریب کی مدد کرنے کا اجروثواب اپنی جگہ ہے، لیکن جو دوسرے فرائض ہیں وہ اپنی جگہ فرض وواجب ہیں اور قربانی کے خلاف یہ جو

پروپیگنڈہ کیا گیا ہے کہ وہ عقل کے خلاف ہے اور یہ معاشی بدحالی کا سبب ہے اور معاشی اعتبار سے اس کا کوئی جواز نہیں ہے، یہ درحقیقت قربانی کے سارے فلسفے اور اس کی روح کی نفی ہے، ارے بھائی! قربانی تو مشروع ہی اس لیے کی گئی ہے کہ یہ کام تمہاری عقل اور سمجھ میں آرہا ہو یا نہ آرہا ہو، پھر بھی یہ کام کرو اس لیے کہ ہم نے اس کے کرنے کا حکم دیا ہے، ہم جو کہیں اس پر عمل کر کے دکھاؤ، یہ قربانی کی اصل روح ہے، یاد رکھو! جب تک انسان کے اندر اتباع پیدا نہیں ہو جاتی اس وقت تک انسان انسان نہیں بن سکتا، جتنی بدعنوانیاں، جتنے مظالم، جتنی تباہ کاریاں آج انسانوں کے اندر پھیلی ہوئی ہیں وہ درحقیقت اس بنیاد کو فراموش کرنے کی وجہ سے ہے کہ انسان اپنی عقل کے پیچھے چلتا ہے اللہ کے حکم کی اتباع کی طرف نہیں جاتا۔

اور عبادت کے اندر یہ ہے کہ وہ نفلی طور پر جس وقت چاہیں ادا کریں لیکن قربانی کے اندر اللہ تعالیٰ نے یہ سکھا دیا کہ گلے پر چھری پھیرنا یہ صرف تین تک عبادت ہے اور تین دن کے بعد اگر قربانی کرو گے تو کوئی عبادت نہیں، کیوں؟ یہ بتانے کے لیے کہ اس عمل میں کچھ نہیں رکھا، بلکہ جب ہم نے کہہ دیا کہ قربانی کرو اس وقت عبادت ہے اور اس کے علاوہ عبادت نہیں ہے، کاش! یہ نکتہ ہماری سمجھ میں آجائے تو سارے دین کی فہم حاصل ہو جائے، دین کا سارا نکتہ اور محور یہ ہے کہ دین اتباع کا نام ہے، جس چیز میں اللہ تبارک وتعالیٰ کا حکم آ گیا وہ مانو اور اس پر عمل کرو، اور جہاں حکم نہیں آیا اس میں کچھ نہیں ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۲، ص ۱۳۶]

قربانی کی عبادت کا سارا فلسفہ یہی ہے، اس لیے کہ قربانی کے معنی ہیں "اللہ کا تقرب حاصل کرنے کی چیز" اور یہ لفظ قربانی "قربان" سے نکلا ہے اور لفظ قربان "قرب" سے نکلا ہے، تو قربانی کے معنی یہ ہیں کہ وہ چیز جس سے اللہ تعالیٰ کا تقرب حاصل کیا جائے اور اس قربانی کے سارے عمل میں یہ سکھایا گیا ہے کہ ہمارے حکم کی اتباع کا نام دین ہے، جب ہمارا حکم آجائے تو اس کے بعد عقلی گھوڑے دوڑانے کا موقع ہے نہ اس میں حکمتیں اور مصلحتیں تلاش کرنے کا موقع باقی رہتا ہے اور نہ اس میں چوں وچرا کرنے کا موقع ہے، ایک مومن کا کام یہ ہے کہ اللہ کی طرف سے حکم آجائے تو اپنا سر جھکا دے اور اس حکم کی اتباع کرے۔

جب حضرت ابراہیم علیہ السلام کے پاس حکم آ گیا کہ بیٹے کو ذبح کر دو، اور وہ حکم بھی خواب کے ذریعہ سے آیا، اگر اللہ تعالیٰ چاہتے تو وحی کے ذریعہ حکم نازل فرما دیتے کہ اپنے بیٹے کو ذبح کرو، لیکن اللہ تعالیٰ نے ایسا نہیں کیا، بلکہ خواب میں آپ کو یہ دکھایا گیا کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر رہے ہیں، اگر ہمارے جیسا تاویل کرنے والا کوئی شخص ہوتا تو یہ کہہ دیتا کہ یہ تو خواب کی بات ہے، اس پر عمل کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ مگر یہ بھی حقیقت میں ایک امتحان تھا کہ چونکہ جب انبیاء علیہم السلام کا خواب وحی ہوتا ہے تو کیا وہ اس وحی پر عمل کرتے یا نہیں؟ اس لیے آپ کو یہ عمل خواب میں دکھایا گیا، اور جب آپ کو یہ معلوم ہو گیا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ایک حکم ہے کہ اپنے بیٹے کو ذبح کر دو تو باپ نے پلٹ کر اللہ تعالیٰ سے یہ نہیں پوچھا کہ یا اللہ! یہ حکم

آخر کیوں دیا جارہا ہے؟ اس میں کیا حکمت اور کیا مصلحت ہے؟ دنیا کا کوئی قانون اور کوئی نظام زندگی اس بات کو اچھا نہیں سمجھتا کہ باپ اپنے بیٹے کو ذبح کرے، عقل کی کسی میزان پر اس حکم کو اتار کر دیکھیں تو کسی میزان پر یہ پورا اُترتا نظر نہیں آتا۔ [اصلاحی خطبات، ج ۲، ص ۱۳۲]

یہ پورا واقعہ جو درحقیقت قربانی کے عمل کی بنیاد ہے، روز اول سے یہ بتا رہا ہے کہ قربانی اس لیے مشروع کی گئی ہے تاکہ انسانوں کے دل میں یہ احساس، یہ علم اور معرفت پیدا ہو کہ اللہ تعالیٰ کا حکم ہر چیز پر فوقیت رکھتا ہے اور دین درحقیقت اتباع کا نام ہے اور جب حکم آجائے تو پھر عقلی گھوڑے دوڑانے کا موقع نہیں، حکمتیں اور مصلحتیں تلاش کرنے کا موقع نہیں۔

مسلمان اللہ تعالیٰ کے حضور جو قربانی پیش کرتے ہیں یہ ایک ایسا نذرانہ ہے کہ ادھر اس نے اللہ کے لیے قربانی اور نذرانہ پیش کرتے ہوئے جانور کے گلے پر چھری پھیری، ادھر قربانی کی عبادت ادا ہوگئی، اور اللہ تعالیٰ نے وہ نذرانہ قبول کرلیا، گویا کہ اللہ تعالیٰ نے اس پر اپنا ہاتھ رکھ دیا، اور اب وہ جانور بھی پورا کا پورا تمہارا ہے، اور فرمادیا کہ یہ جانور لے جا کر کھاؤ، اس کا گوشت تمہارا ہے، اس کی کھال تمہاری ہے، اس جانور کی ہر چیز تمہاری ہے، امت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والسلام کا اکرام دیکھیے کہ نذرانہ مانگا جارہا ہے لیکن جب بندہ نے خون بہادیا اور نذرانہ پیش کردیا اور ہمارے حکم کی تعمیل کرلی تو بس کافی ہے، ہمیں اتنا ہی چاہیے تھا، چنانچہ فرمایا کہ:

﴿لن ينال الله لحومها ولا دمائها ولكن يناله التقوى منكم﴾

ہمیں تو اس کا گوشت نہیں چاہیے، ہمیں اس کا خون نہیں چاہیے، ہمیں تو تمہارے دل کا تقوی چاہیے، جب تم نے اپنے دل کے تقوی سے یہ قربانی پیش کردی وہ ہمارے یہاں قبول ہوگئی، اب اس کو تم ہی کھاؤ، چنانچہ اگر کوئی شخص قربانی کا سارا گوشت خود کھالے اس پر کوئی گناہ نہیں، البتہ مستحب یہ ہے کہ تین حصے کرے، ایک حصہ خود کھائے، ایک حصہ عزیزوں میں تقسیم کرے اور ایک حصہ غرباء میں خیرات کرے، لیکن اگر ایک بوٹی بھی خیرات نہ کرے تب بھی قربانی کے ثواب میں کوئی کمی نہیں آتی، اس لیے کہ قربانی تو اس وقت مکمل ہوگئی جس وقت جانور کے گلے پر چھری پھیردی، جب میرے بندے نے میرے حکم پر عمل کرلیا تو بس! قربانی کی فضیلت اس کو حاصل ہوگئی۔ [اصلاحی خطبات، ج ۲، ص ۱۴۵]

کیا قربانی کے جانور پل صراط کی سواریاں ہوں گی؟

لوگوں میں یہ بات بہت کثرت سے کہی جاتی ہے کہ یہ قربانی کے جانور پل صراط پر سے گذرنے کے لیے سواری بنیں گے اور قربانی کرنے والے اس کے اوپر بیٹھ کر گذریں گے، یہ ایک ضعیف اور کمزور روایت ہے، جس کے الفاظ یہ آئے ہیں: "سمّنوا ضحایاکم فإنّها علی الصراط مطایاکم"

یعنی اپنی قربانی کے جانوروں کو موٹا تازہ بناؤ، کیونکہ پل صراط پر یہ تمہاری سواریاں بنیں گی، لیکن یہ انتہا درجے کی ضعیف حدیث ہے اور ضعیف حدیث کو اس کے ضعف کی صراحت کے بغیر بیان کرنا جائز نہیں ہوتا، اس لیے اس حدیث پر زیادہ اعتقاد رکھنا درست نہیں، اس لیے کہ یہ ضعیف حدیث ہے، لیکن لوگوں میں یہ حدیث اتنی مشہور ہوگئی ہے کہ یہ سمجھا جاتا ہے کہ اگر اس کا اعتقاد نہ رکھا تو قربانی ہی نہ ہوگی، ہم اس حکم کی نہ نفی کرتے ہیں اور نہ اثبات کرتے ہیں، اس کا صحیح علم اللہ تعالیٰ ہی کو ہے، البتہ یہ حدیث بالکل صحیح ہے کہ قربانی کے جانور کا خون زمین پر گرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے یہاں وہ قربانی قبول ہوجاتی ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۲، ص ۱۴۶]

دُعا و مُناجات

اپنی عمر میں اضافے کی دعا کرنا !

جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رجب کا چاند دیکھتے تو یہ دعا فرمایا کرتے تھے کہ:

اللهم بارك لنا في رجب و شعبان و بلغنا رمضان [مجمع الزوائد، ج۲، ص۱۶۵]

اے اللہ! ہمارے لیے رجب اور شعبان کے مہینوں میں برکت عطا فرما اور ہمیں رمضان کے مہینے تک پہنچا دیجیے۔

یعنی ہمار عمر اتنی دراز کر دیجیے کہ ہمیں اپنی عمر میں رمضان کا مہینہ نصیب ہو جائے، اس حدیث یہ پتہ چلا کہ اگر کوئی شخص اس نیت سے اپنی عمر میں اضافے کی دعا کرے کہ میری عمر میں اضافہ ہو جائے تا کہ اس عمر کو میں اللہ تعالی کی مرضی کے مطابق صحیح استعمال کر سکوں اور پھر وہ آخرت میں کام آئے تو عمر کے اضافے کی یہ دعا کرنا اس حدیث سے ثابت ہے، لہذا یہ دعا مانگنی چاہیے کہ یا اللہ! میری عمر میں اتنا اضافہ فرما دیں کہ میں اس میں آپ کی رضا کے مطابق کام کر سکوں اور جس وقت میں آپ کی بارگاہ میں پہنچوں تو اس وقت آپ کی رضا کا مستوجب بن جاؤں، لیکن جو لوگ اس قسم کی دعا مانگتے ہیں کہ "یا اللہ! اب تو اس دنیا سے اٹھا ہی لے"، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایسی دعا کرنے سے منع فرمایا ہے اور موت کی تمنا کرنے سے بھی منع فرمایا ہے، ارے! تم تو یہ سوچ کر موت کی دعا کر رہے ہو کہ یہاں دنیا میں حالات خراب ہیں جب وہاں چلے جائیں گے تو وہاں اللہ میاں کے پاس سکون مل جائے گا، ارے! یہ تو جائزہ لو کہ تم نے وہاں کے لیے کیا تیاری کر رکھی ہے؟ کیا معلوم کہ اگر اس وقت موت آجائے تو خدا جانے کیا حالات پیش آئیں؟ اس لیے ہمیشہ یہ دعا کرنی چاہیے کہ اللہ تعالی عافیت عطا فرمائے اور جب تک اللہ تعالی نے عمر مقرر کر رکھی ہے اس وقت تک اللہ تعالی اپنی رضا کے مطابق زندگی گذارنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یہ دعا فرمایا کرتے تھے:

اللهم احيني ما كانت الحياة خيرا لي ، و توفني إذا كانت الوفاة خيرا لي

[مسند احمد، ج۳ ص۱۰۴]

اے اللہ! جب تک میرے حق میں زندگی فائدہ مند ہے، اس وقت تک مجھے زندگی عطا فرما اور جب میرے حق میں موت فائدہ مند ہوجائے، اے اللہ! مجھے موت عطا فرما، لہذا یہ دعا کرنا کہ یا اللہ! میری عمر میں اتنا اضافہ کردیجیے کہ آپ کی رضا کے مطابق اس میں کام کرنے کی توفیق ہوجائے یہ دعا کرنا درست ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہی اس دعا سے مستفاد ہوتی ہے کہ اے اللہ! ہمیں رمضان تک پہنچادیجیے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۶۲]

موت کی تمنا یا دعا کرنا جائز نہیں

موت کی دعا کرنا بھی ناجائز ہے، چنانچہ بہت سے لوگوں کی زبانوں پر یہ جملہ آجاتا ہے کہ یا اللہ! میرا حال بہت خراب ہے، مجھے موت ہی دے دے، العیاذ باللہ العظیم، یہ بڑی خطرناک بات ہے، ارے! تمہیں کیا معلوم کہ اگر اس وقت تمہاری موت آجائے تو تمہارا کیا انجام ہوگا، اللہ تعالی ہی جانتے ہیں کہ تمہارے حق میں کب تک زندہ رہنا بہتر ہے، اگر ایک لمحے کے لیے یا ایک گھنٹے کے لیے موت مؤخر ہوجائے تو کیا معلوم کہ اس ایک گھنٹے میں تمہیں وہ کام کرنے کی توفیق ہوجائے جو تمہارے سارے پچھلے گناہوں کو دھو دے اور تمہارا بیڑا پار کردے، لہذا موت کی تمنا مت کرو، نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس سے منع فرمایا ہے۔

موت کی تمنا کرنا اس لیے منع ہے کہ تم یہ فیصلہ کرنے والے کون ہو کہ تمہارے حق میں جینا بہتر ہے یا مرنا بہتر ہے؟ یہ اللہ تعالی کا فیصلہ ہے، اسی کے اوپر یہ فیصلہ چھوڑ دو اور اسی سے مدد مانگو، اس لحاظ سے اگر دیکھا جائے تو موت بھی اللہ ہی کے لیے ہے۔

خود کشی کیوں حرام ہے ؟

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دعا فرمائی:

اللهم أحينى ما علمت الحياة خيرا لى وتوفنى إذا علمت الوفاة خيرا لى

اے اللہ! مجھے اس وقت تک زندہ رکھیے جب تک میرا زندہ رہنا آپ کے علم کے مطابق میرے حق میں بہتر ہو، اور جب آپ کے علم کے مطابق میرا مرنا بہتر ہوجائے تو مجھے موت دے دیجیے، یعنی آدمی اپنی طرف سے کوئی فیصلہ نہ کرے۔

یہی وجہ ہے کہ خودکشی کرنا حرام ہے، کیونکہ وہ فیصلہ جو اللہ تعالی کو کرنا ہے کہ تمہیں کب اس دنیا سے جانا چاہیے، یہ فیصلہ تم اپنے ہاتھ میں لے رہے ہو، یہ جان تمہاری ملکیت نہیں ہے کہ اس کے ساتھ جیسا چاہو سلوک کرو، بلکہ اللہ تعالی کی ملکیت ہے جو اس نے عطا کی ہے، لہذا اس جان کی حفاظت تمہاری ذمہ داری ہے، یہاں تک کہ موت کی تمنا کرنا بھی ناجائز ہے۔

یہ ہماری زندگی جو ہمارے پاس، اسی طرح ہمارا پورا جسم سر سے لے کر پاؤں تک یہ امانت ہے، ہم اس جسم کے مالک نہیں، اللہ جل شانہ نے یہ جسم جو ہمیں عطا فرمایا ہے اور یہ اعضا جو ہمیں عطا فرمائے ہیں، یہ آنکھیں جس سے ہم دیکھتے ہیں، یہ کان جس سے ہم سنتے ہیں، یہ ناک جس سے ہم سونگھتے ہیں، یہ منہ جس سے ہم کھاتے ہیں، یہ زبان جس سے ہم بولتے ہیں، یہ سب اللہ تعالیٰ کی امانت ہیں، بتاؤ! کیا تم یہ اعضا کہیں بازار سے خرید کر لائے تھے؟ بلکہ اللہ تعالیٰ نے بغیر کسی معاوضے کے اور بغیر کسی محنت اور مشقت کے پیدا ہونے کے وقت سے ہمیں دے دیے ہیں اور ہمیں یہ فرمایا دیا کہ ان اعضا سے اور ان قوتوں سے لطف اٹھاؤ، ان اعضا کو استعمال کرنے کی تمہیں کھلی اجازت ہے، البتہ ان اعضا کو ہماری معصیت اور گناہوں میں مت استعمال کرنا۔

چونکہ یہ زندگی، یہ جسم اور یہ اعضا امانت ہیں، اسی وجہ سے انسان کے لیے خودکشی کرنا حرام ہے، اور اپنے آپ کو قتل کر دینا حرام ہے، کیوں حرام ہے؟ اس لیے کہ یہ جان اور یہ جسم ہماری اپنی ملکیت ہوتا تو ہم جو چاہتے کرتے، چاہے اس کو تباہ کرتے یا برباد کرتے یا آگ میں جلاتے، لیکن چونکہ یہ جان اور یہ جسم اللہ کی امانت ہے اس لیے یہ امانت اللہ کے سپرد کرنی ہے، لہذا جب اللہ تعالیٰ ہمیں اپنے پاس بلائیں گے، اس وقت ہم جائیں گے، پہلے سے خودکشی کر کے اپنی جان کو ختم کرنا امانت میں خیانت ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۵، ص ۲۳۱]

بزرگوں سے منقول دعاؤں اور مسنون دعاؤں میں فرق

جو دعائیں بزرگوں نے وضو کرتے وقت پڑھنے کے لیے بتائی ہیں اور بڑی اچھی دعائیں ہیں، اگر اللہ تعالیٰ ان دعاؤں کو ہمارے حق میں قبول فرمالے تو بیڑہ پار ہو جائے، لیکن ان مواقع پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ان دعاؤں کو پڑھنا یا پڑھنے کے لیے کہنا ثابت نہیں، لہذا یہ دعائیں پڑھنا اس اعتبار سے سنت نہیں ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ہاتھ دھوتے وقت یہ دعا پڑھی، چہرہ دھوتے وقت یہ دعا پڑھی وغیرہ، اس لیے سنت سمجھ کر ان دعاؤں کو نہیں پڑھنا چاہیے، لیکن ویسے ہی پڑھنا بڑی اچھی بات ہے، خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے دوسرے مواقع پر ان دعاؤں کا پڑھنا ثابت ہے، بڑی اچھی دعائیں ہیں، ان کو ضرور پڑھیں، لیکن سنت سمجھ کر نہیں پڑھنا چاہیے۔

لہذا جو دعائیں آپ سے پڑھنا ثابت ہیں، ان کا تو خاص اہتمام کرے اور جو دعائیں ہر عضو دھوتے وقت بزرگوں سے پڑھنا منقول ہیں، وہ دعائیں بھی بہت اچھی ہیں، ان کو بھی یاد کر لینا چاہیے، ان کو بھی پڑھ لینا چاہیے، لیکن دونوں قسم کی دعاؤں میں فرق رکھنا چاہیے کہ جو دعائیں آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے براہ راست ان مواقع پر پڑھنا ثابت ہیں، ان کا اہتمام زیادہ ہونا چاہیے اور جو دعائیں آپ سے ثابت نہیں، ان کا اس درجہ اہتمام نہ ہونا چاہیے، بلکہ ان کو دوسرے درجہ پر رکھنا چاہیے۔

ہماری دعائیں کیوں قبول نہیں ہوتیں؟

آج لوگ یہ کہتے ہیں کہ اتنی دعا کی گئیں، اللہ تعالی سے اتنا مانگا گیا، لیکن ہماری دعائیں قبول نہیں ہوتیں، ہمیں فتح نہیں دی گئی اور دشمن کو فتح ہوگی، اس کی کیا وجہ ہے؟ یہاں تک کہ لوگوں کے ایمان متزلزل ہورہے ہیں، لوگوں کے دلوں میں یہ شکوک اور شبہات پیدا ہورہے ہیں کہ اللہ تعالی ہماری مدد کو کیوں نہیں آیا؟ ہماری مدد کیوں نہیں کی؟ لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ اللہ تعالی نے یہ دنیا عالم اسباب بنائی ہے، جب تم اپنی حالت بدلنے کے لیے تیار نہیں ہو، اللہ تعالی اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی آواز پر کان دھرنے کے لیے تیار نہیں ہو، بلکہ جہاں تمہیں چار پیسے کا نفع مل رہا ہو، وہاں تم اللہ کو بھلا بیٹھتے ہو اور رسول کو بھی بھلا بیٹھتے ہو، تو پھر اللہ تعالی تمہاری مدد کیوں کریں گے؟ قرآن کریم فرماتا ہے کہ: ﴿نسو ا اللہ فنسیھم﴾

یعنی انہوں نے اللہ تعالی کو بھلا دیا، اللہ تعالی نے ان کو بھلا دیا، اللہ تعالی کو بھلا دینے کا مطلب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالی کے احکامات کو چھوڑ دیا۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۵، ص ۱۱۰]

پریشانی اور تکلیف میں دعا کے قبول ہونے کی علامت کیا ہے؟

البتہ یہ اشکال ہوتا ہے کہ بعض اوقات جب تکلیف کے اندر اللہ تعالی سے دعا کرتے ہیں اور اللہ تعالی کی طرف رجوع کرتے ہیں، اس کے باوجود وہ تکلیف اور پریشانی نہیں جاتی اور دعا قبول نہیں ہوتی، اس کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالی کی بارگاہ میں دعا کرنے اور عرض معروض پیش کرنے کی توفیق مل جانا ہی اس بات کی علامت ہے کہ ہماری دعا قبول ہوگئی، ورنہ دعا کرنے کی بھی توفیق نہ ملتی، اور اب اس صورت میں تکلیف پر الگ انعام ملے گا، اور اس دعا کرنے پر الگ انعام حاصل ہوگا، اور اس دعا کے بعد دوبارہ دعا کرنے کی جو توفیق ہوگی، اس پر الگ انعام ملے گا، لہذا یہ تکلیف رفع درجات کا ذریعہ بن رہی ہے، اسی کے بارے میں مولانا رومی رحمہ اللہ فرماتے ہیں: گفت آن "اللہ" تو لبیک ماست

یعنی جس وقت تو ہمارا نام لیتا ہے اور "اللہ" کہتا ہے، تو یہ تیرا "اللہ" کہنا ہی ہماری طرف سے "لبیک" کہنا ہے، اور تمہارا اللہ کہنا ہی اس بات کی علامت ہے کہ ہم نے تمہاری پکار کو سن لیا اور اس کو قبول بھی کرلیا، لہذا دعا کی توفیق ہوجانا ہی ہماری طرف سے دعا کی قبولیت کی علامت ہے، البتہ یہ ہماری حکمت کا تقاضہ ہے کہ کب اس پریشانی کو تم سے دور کرنا ہے اور کب تک اس کو باقی رکھنا ہے، تم جلد باز ہو، اس لیے جلدی اس تکلیف کو دور کرانا چاہتے ہو، لیکن اگر اس تکلیف کو کچھ دیر کے بعد دور کیا جائے گا تو اس کے نتیجے میں تمہارے درجات بہت زیادہ بلند ہوجائیں گے، لہذا تکلیف میں یہ گلہ شکوہ نہیں ہونا چاہیے، البتہ یہ دعا ضرور کرنی چاہیے کہ یا اللہ! میں کمزور ہوں، مجھ سے برداشت نہیں ہورہا ہے، مجھ سے یہ تکلیف دور فرمادیجیے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۱۲۳]

گناہ و توبہ

گناہوں کے خیالات آنا

دوسرے گناہ کرنے اور فسق و فجور کرنے کے وسوسے اور خیالات آتے ہیں، مثلاً دل میں یہ خیال آتا ہے کہ فلاں گناہ کا ارتکاب کرلوں، یا فلاں گناہ کرلوں، یا کسی گناہ کی طرف طبیعت مائل ہورہی ہے اور اس کی طرف کشش ہورہی ہے، ان کے بارے میں اللہ تعالی نے فرمادیا کہ اگر محض دل میں خیال آیا ہے تو اس پر ان شاءاللہ کوئی مؤاخذہ نہیں ہوگا جب تک اس خیال اور وسوسے پر عمل نہ کرلوگے، لہذا جب گناہ کے تقاضے اور داعیے پر عمل کرلوگے تو یہ قابل مؤاخذہ اور قابل گرفت ہے، اور جب بھی کسی گناہ کا خیال یا وسوسہ آئے کہ فلاں گناہ کرلوں تو اس کا فوری توڑ یہ ہے کہ فوراً اللہ کی پناہ مانگو کہ یا اللہ! میرے دل میں اس گناہ کا خیال آرہا ہے، میں آپ کی پناہ چاہتا ہوں، آپ مجھے اس گناہ سے بچالیجیے، اس طرح اس خیال اور وسوسے کا توڑ ہوجائے گا۔ [اصلاحی خطبات، ج۹، ص۱۶۰]

کیا کسی برائی کا خیال دل میں آنا گناہ ہے ؟

کسی برائی کا خیال خود بخود دل میں آجانا یہ ایک غیر اختیاری معاملہ ہے، انسان کے اختیار کو اس میں دخل نہیں، اسی وجہ سے اللہ تعالی کی طرف سے اس پر گرفت بھی نہیں ہے، گناہ بھی نہیں، یہاں تک کہ اگر شدید گناہ بلکہ (العیاذ باللہ) کفر و شرک کا خیال بھی دل میں آجائے، لیکن یہ خیال خود بخود آئے، تو محض اس خیال کا آجانا نہ تو موجب ملامت ہے، یعنی وہ آدمی اس پر ملامت کا مستحق نہیں، نہ وہ سزا کا مستحق ہے، اور نہ ہی اس کا فعل گناہ ہے، کیونکہ غیر اختیاری طور پر یہ خیال اس کے دل میں آیا ہے۔

اسی طرح کسی شخص کے کوئی عمل کرنے کے نتیجے میں دل کے اندر اگر کوئی تغیر پیدا ہوا جس کو انفعال کہا جاتا ہے، انفعال کا مطلب ہے کسی دوسرے کا اثر قبول کرنے کے نتیجے میں دل میں ایک حالت کا پیدا ہونا ، مثلاً دوسرے نے گالی دی، اس کے نتیجے میں طبیعت کے اندر ایک جوش پیدا ہوا اور غصہ آیا کہ اس نے مجھے گالی

دی اور میرے خاندان کو برا کہا، اس غصہ اور جوش کے پیدا ہونے کو انفعال کہا جاتا ہے، یہ انفعال غیر اختیاری ہے، بلکہ طبعی ہے اور انسان کی فطرت میں داخل ہے، اس لیے گناہ بھی نہیں۔ [اصلاحی مجالس، ج۱،ص ۱۶۳]

گناہ سے نفرت کریں ، گناہ گار سے نہیں

بزرگوں نے ایک بات فرمائی ہے جو ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے، وہ یہ کہ نفرت اور بغض کافر سے نہیں بلکہ اس کے ''کفر'' سے ہے، ''فاسق'' سے بغض نہیں بلکہ اس کے ''فسق'' سے بغض ہے، نفرت اور بغض گناہ گار سے نہیں بلکہ اس کے گناہ سے ہے، جو آدمی فسق و فجور اور گناہ کے اندر مبتلا ہے اس کی ذات غصہ کا محل نہیں ہے بلکہ اس کا فعل غصہ کا محل ہے، اس لیے کہ ذات تو قابل رحم ہے، وہ بے چارہ بیمار ہے، کفر کی بیماری میں مبتلا ہے، فسق کی بیماری میں مبتلا ہے اور نفرت بیمار سے نہیں ہوتی بلکہ بیماری سے ہوتی ہے، اس لیے کہ اگر بیمار سے نفرت کرو گے تو پھر اس کی کون دیکھ بھال کرے گا؟ لہذا فسق و فجور سے اور کفر سے نفرت ہوگی، اس کی ذات سے نہیں ہوگی، یہی وجہ ہے کہ اگر اس کی ذات فسق و فجور سے باز آجائے تو وہ ذات گلے لگانے کے لائق ہے، اس لیے کہ ذات کے اعتبار سے اس سے کوئی پرخاش اور کوئی ضد نہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج۸،ص ۲۸۵]

یہ گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ ؟

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی رحمہ اللہ فرماتے ہیں کہ لوگ بہت اشتیاق سے پوچھتے ہیں کہ فلاں گناہ صغیرہ ہے یا کبیرہ ہے؟ اور پوچھنے کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر صغیرہ ہے تو کر لیں گے، اور اگر کبیرہ ہے تو اس کے کرنے میں تھوڑا ڈر اور خوف محسوس ہوگا، حضرتؒ فرمایا کرتے تھے کہ صغیرہ اور کبیرہ گناہوں کی مثال ایسی ہے جیسے ایک چنگاری اور ایک بڑا انگارہ، کبھی آپ نے کسی کو دیکھا کہ ایک چھوٹی سی چنگاری کو صندوق میں رکھ لے، اور یہ سوچے کہ یہ تو ایک چھوٹی سی چنگاری ہے، کوئی عقل مند انسان ایسا نہیں کرے گا ، کیونکہ صندوق میں رکھنے کے بعد وہ آگ بن جائے گی اور صندوق کے اندر جتنی چیزیں ہوں گی ان سب کو جلا دے گی ، اور ہوسکتا ہے کہ وہ پورے گھر کو جلا دے، یہی حال گناہ کا ہے، گناہ چھوٹا ہو یا بڑا ہو، وہ آگ کی چنگاری ہے، اگر تم اپنے اختیار سے ایک گناہ کرو گے تو ہوسکتا ہے کہ وہ ایک گناہ تمہاری پوری زندگی کی پونجی خاکستر کر دے، اس لیے اس فکر میں مت پڑو کہ چھوٹا ہے یا بڑا؟ بلکہ یہ دیکھو کہ گناہ ہے یا نہیں؟ جب یہ معلوم ہو جائے کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے منع فرمایا ہے تو پھر اللہ تعالیٰ کے سامنے جواب دہی کا احساس پیدا کر کے یہ سوچو کہ یہ گناہ کر کے میں اللہ تعالیٰ کو کیا منہ دکھاؤں گا، جب بھی انسان کے دل میں گناہ کا داعیہ پیدا ہو تو اس وقت اللہ کے سامنے موجود ہونے کا دل میں دھیان کرے اور اس کے ذریعہ گناہ کو چھوڑ دے۔

گناہ صغیرہ اور گناہ کبیرہ کا دھوکہ

بعض اوقات شیطان یہ دھوکہ بھی پیدا کرتا ہے کہ یہ گناہ کبیرہ ہے کہ صغیرہ ہے، یہ مسئلہ بہت لوگ پوچھتے ہیں، اور اگر یہ کہیں کہ بھئی ناجائز ہے تو کہتے ہیں کہ ناجائز ہے یا حرام ہے؟ مطلب یہ ہے کہ حرام ہو تو بچیں، ناجائز ہو تو چلیں کوئی بات نہیں، اور اگر گناہ کبیرہ ہو تو تھوڑی بہت رعایت کرلیں، اور اگر صغیرہ ہو تو کوئی بات نہیں چلو کر گزریں، یہ تحقیق اکثر لوگوں کو میں نے کرتے ہوئے دیکھا ہے، تو ہمارے حضرت حکیم الامت قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ صغیرہ اور کبیرہ کی مثال ایسی ہے جیسے ایک بڑا سا شعلہ اور ایک چھوٹی سی چنگاری دونوں آگ ہیں، لیکن وہ بڑا شعلہ ہے، وہ چھوٹی چنگاری ہے، کوئی آدمی آپ نے ایسا دیکھا کہ بڑا انگارا تو اپنی الماری میں نہ رکھے، اور چھوٹی چنگاری ہو تو بولے کہ چلو چھوٹی چنگاری ہے، کپڑوں کی الماری میں رکھ دوں، تو کوئی بھی ایسا نہیں کرے گا، اس واسطے کہ جانتا ہے کہ یہ ہے تو چھوٹی چنگاری، لیکن یہی چنگاری بڑھ کر شعلہ بن سکتی ہے، پورے گھر کو تباہ کرسکتی ہے، اسی طرح گناہ کبیرہ اور صغیرہ ہیں، صغیرہ اگرچہ دیکھنے میں چھوٹا نظر آرہا ہے، لیکن اگر بے پرواہی کے ساتھ انسان اس کا ارتکاب کرے گا تو وہ بڑھتے بڑھتے کبیرہ بن جائے گا۔

گناہ صغیرہ بھی کبیرہ بن جاتاھے

اسی واسطے بزرگوں نے فرمایا کہ کسی صغیرہ گناہ کو معمولی سمجھ کر کر گزرنا خود کبیرہ ہے، کیونکہ نافرمانی تو دونوں ہیں، نافرمانی کبیرہ میں بھی ہے، صغیرہ میں بھی ہے، اللہ نے کہا ہے کہ صغیرہ سے بھی بچو، اور کبیرہ سے بھی بچو، جب اللہ تعالیٰ کسی سے بچنے کا فرما رہے ہیں تو وہ کام نافرمانی کا ہے، البتہ اس نافرمانی میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے دو درجے رکھ دیئے ہیں، مگر ہیں دونوں نافرمانی، اب کوئی آدمی یہ سمجھے کہ میں صغیرہ ہونے کی وجہ سے کوئی پرواہ نہیں کرتا، تو لاپرواہ ہو جانا اللہ کی نافرمانی سے، یہ خود کبیرہ بنا دیتا ہے، اسی طرح صغائر پر اصرار کرنا کبیرہ بن جاتا ہے، یعنی صغیرہ گناہ پر اصرار کرنا کہ مسلسل وہ صغیرہ گناہ کیے ہی چلا جارہا ہے، کبھی چھوڑنے کی فکر نہیں کرتا، مسلسل کیے چلا جارہا ہے تو وہ صغائر کا اصرار بھی انسان کو کبیرہ کے عذاب میں مبتلا کر دیتا ہے، لہٰذا اس فکر میں نہ پڑو کہ یہ صغیرہ ہے یا کبیرہ ہے، جو بھی ہے گناہ ہے، اللہ جل جلالہ نے اس سے منع فرمایا ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جس سے منع فرمایا ہے، اس سے بچو۔ [خطبات عثمانی، ج ۳، ص ۲۶۴]

چھوٹے گناہ پر بھی اللہ کی طرف سے پکڑ ھوسکتی ھے

جس طرح یہ بات ہے کہ اللہ تبارک وتعالیٰ کسی چھوٹے عمل پر بعض اوقات اپنی رحمت سے مغفرت فرما دیتے ہیں، اسی طرح یہ بات بھی ہے کہ بعض اوقات کوئی گستاخی کا عمل ایسا ہوتا ہے کہ اسی پر پکڑ ہو جاتی ہے، لہٰذا اگر انسان سے غلطی ہو جائے تو بجائے سینہ زوری کرنے کے اللہ تبارک وتعالیٰ سے توبہ کرکے

استغفار کرے، اللہ تعالیٰ کے سامنے اقراری مجرم بن کر حاضر ہو جائے، بس یہ کام کرے تو باقی ہر عمل جن کے اوپر احادیث میں مغفرت کے وعدے آئے ہیں، ان اعمال کو بے شک انجام دیتا رہے، اللہ تبارک وتعالیٰ اپنی رحمت سے کس بات پہ نوازدیں، اس واسطے اگر کوئی چھوٹے سے چھوٹا عمل بھی نیکی کا نظر آئے، اس کو حقیر سمجھ کر نظر انداز نہ کریں، اور اسی طرح کسی گناہ کو چاہے وہ چھوٹے سے چھوٹا نظر آرہا ہو، چھوٹا سمجھ کر اختیار نہ کرے، کہ بھئی یہ تو چھوٹا سا گناہ ہے چلو کرلو، کیونکہ گناہ کی خاصیت یہ ہے کہ آدمی ایک گناہ کر کے بسا اوقات دوسرے گناہ کی طرف مائل ہو جاتا ہے، یعنی ایک گناہ دوسرے گناہ کو کھینچتا ہے۔ [خطبات عثمانی، ج ۳، ص ۲۶۳]

بعض فضائل کی احادیث میں آتا ہے کہ فلاں عمل کرنے سے ایک سال گذشتہ اور آئندہ کے گناہ معاف ہوجائیں گے تو اس کا کیا مطلب ہے ؟

یہاں یہ بات بھی عرض کردوں کہ بعض لوگ جو دین کا کما حقہ علم نہیں رکھتے تو اس قسم کی جو حدیثیں آتی ہیں کہ ایک سال پہلے کے گناہ معاف ہو گئے اور ایک سال آئندہ کے گناہ معاف ہو گئے، اس سے ان لوگوں کے دلوں میں یہ خیال آتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک سال پہلے کے گناہ تو معاف کر ہی دیے اور ایک سال آئندہ کے بھی گناہ معاف فرما دیے، اس کا مطلب یہ ہے کہ سال بھر کے لیے چھٹی ہو گئی، جو چاہیں کریں، سب گناہ معاف ہیں، خوب سمجھ لیجیے! جن جن اعمال کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ فرمایا کہ یہ گناہوں کو معاف کرنے والے اعمال ہیں، مثلاً وضو کرنے میں ہر عضو کو دھوتے وقت اس عضو کے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، نماز پڑھنے کے لیے جب انسان مسجد کی طرف چلتا ہے تو ایک قدم پر ایک گناہ معاف ہوتا ہے اور ایک درجہ بلند ہوتا ہے، رمضان کے روزوں کے بارے میں فرمایا کہ جس شخص نے رمضان کے روزے رکھے اس کے تمام پچھلے گناہ معاف ہو جاتے ہیں، یاد رکھیے! اس قسم کی تمام احادیث میں گناہوں سے مراد گناہ صغیرہ ہوتے ہیں، اور جہاں تک کبیرہ گناہوں کا تعلق ہے اس کے بارے میں قانون یہ ہے کہ بغیر توبہ کے معاف نہیں ہوتے، ویسے اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے کسی کے کبیرہ گناہ بغیر توبہ کے بخش دیں وہ الگ بات ہے، لیکن قانون یہ ہے کہ جب تک توبہ نہیں کرلے معاف نہیں ہوں گے، اور پھر توبہ سے بھی وہ گناہ کبیرہ معاف ہوتے ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ سے ہو، اور اگر اس گناہ کا تعلق حقوق العباد سے ہے، مثلاً کسی کا حق دبالیا ہے، کسی کا حق مارلیا ہے، کسی کی حق تلفی کرلی ہے، اس کے بارے میں قانون یہ ہے کہ جب تک صاحب حق کو اس کا حق ادا نہ کردے یا اس سے معاف نہ کرالے اس وقت تک معاف نہیں ہوں گے لہذا یہ تمام فضیلت والی احادیث جن میں گناہوں کی معافی کا ذکر ہے، وہ صغیرہ گناہوں کی معافی سے متعلق ہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج ۲، ص ۱۲۷]

گناہ سے توبہ کے وقت دل میں یہ شبہ آنا کہ گناہ چھوڑنے کا عزم پکا بھی ہے یا نہیں؟

گناہ سے توبہ کی ایک شرط یہ ہے کہ آئندہ کے لیے دل میں یہ عزم اور ارادہ کرلے کہ میں آئندہ یہ گناہ نہیں کروں گا اور اس کے پاس نہیں پھٹکوں گا، اس شرط کے پورا ہونے میں اکثر شبہ رہتا ہے کہ معلوم نہیں پکا ارادہ ہوا یا نہیں؟ کیونکہ توبہ کرتے وقت دل میں یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ توبہ تو کررہا ہوں لیکن میں کتنا اس توبہ پر قائم رہوں گا اور کتنا میں اپنے آپ کو اس گناہ سے بچا سکوں گا، اس بارے میں دل میں شبہ رہتا ہے، اس شبہ کی موجودگی میں عزم مکمل ہوا یا نہیں اور جب عزم مکمل ہونے میں شبہ ہے تو توبہ مکمل ہونے میں بھی شبہ ہوا، کیونکہ عزم کے بغیر توبہ مکمل نہیں ہوتی، اس وجہ سے آدمی پریشانی کا شکار رہتا ہے۔

غور سے سمجھ لیجیے کہ توبہ کے پکا اور سچا ہونے کے لیے عزم بیشک ضروری ہے، لیکن اگر دل میں ساتھ ساتھ یہ دھڑکہ لگا ہوا ہے کہ میں عزم تو کررہا ہوں مگر پتہ نہیں میں آئندہ اس عزم پر قائم رہوں گا یا نہیں؟ اپنے نفس پر بھروسہ نہیں ہے، تو محض یہ دھڑکا لگا رہنا توبہ کی تکمیل کے منافی نہیں، جب پکا ارادہ کرلیا تو دھڑکے کے باوجود وہ ارادہ پکا ہی رہے گا، اور اس کی وجہ سے توبہ میں کوئی نقص واقع نہیں ہوگا، ان شاء اللہ۔

اس کی مثال یوں سمجھیں جیسے آپ نے ایک عمارت تعمیر کی اور اپنی طرف سے اس کو پختہ بنایا، ستون پختہ بنائے، بیم پختہ بنایا، لوہا اور سیمنٹ مناسب لگایا، لیکن ساتھ میں یہ دھڑکا لگا ہوا ہے کہ اگر کسی دن زلزلہ آیا تو عمارت گرجائے گی، یا کسی وقت اس کے اوپر بم گرگیا تو یہ عمارت گرجائے گی، اب زلزلہ کا بھی اندیشہ ہے، بم گرنے کا بھی اندیشہ ہے اور کوئی حادثہ پیش آجانے کا بھی اندیشہ ہے، لیکن ان اندیشوں کی وجہ سے یہ نہیں کہا جائے گا کہ یہ عمارت پکی نہیں بنی، بلکہ عمارت تو پکی ہے، البتہ اندیشے اپنی جگہ ہیں، ان اندیشوں کے لیے کوئی اور تدبیر اور سدباب سوچو لیکن اس کی وجہ سے عمارت کو کمزور نہیں کہا جائے گا۔ [اصلاحی مجالس، ج ۵، ص ۲۳۷]

ہمارے بزرگ حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمہ اللہ توبہ پر بہت زور دیا کرتے تھے، چنانچہ میں ایک دن ان کے پاس گیا تو اس وقت ایک نوجوان اپنے کسی کام سے ان کے پاس آیا ہوا تھا، اس نوجوان میں سر سے لے کر پاؤں تک دین داری کے کوئی آثار نظر نہیں آرہے تھے، حضرت بابا صاحبؒ کا طریقہ یہ تھا کہ جو شخص بھی ان کے پاس آتا تو اس کے کان میں کوئی دین کی بات ڈال دیتے تھے، چاہے وہ کسی بھی مقصد سے آیا ہو، لہٰذا جب وہ نوجوان واپس جانے لگا تو آپ نے اس سے فرمایا کہ:

> ''بیٹا! ایک بات سنتے جاؤ، وہ یہ کہ لوگ دین کو بہت مشکل سمجھتے ہیں کہ دین پر عمل کرنا بڑا مشکل کام ہے، ارے کچھ بھی مشکل نہیں، بس رات کو سونے سے پہلے تھوڑی دیر بیٹھ کر اللہ تعالیٰ کے سامنے توبہ کرلیا کرو''۔

وہ نوجوان آدمی تھا، نہ نماز، نہ روزہ، نہ کوئی اور عبادت کرتا تھا لیکن حضرت والا نے اس کے کان

میں یہ بات ڈال دی کہ بس توبہ کر لیا کرو، حضرت بابا صاحبؒ نے اس نوجوان کے کان میں یہ بات ڈال دی اور وہ چلا گیا۔

میں نے حضرت بابا صاحبؒ سے عرض کیا کہ حضرت! میرے دل میں توبہ کے بارے میں یہ اشکال رہتا ہے کہ میں نے توبہ تو کر لی، لیکن کیا پتہ کہ وہ توبہ صحیح ہوئی یا نہیں؟ کیونکہ یہ معلوم نہیں ہوتا کہ گناہ چھوڑنے کا جو عزم کیا ہے وہ پختہ ہوا ہے یا نہیں؟ اس کا اطمینان نہیں ہوتا، اللہ تعالیٰ سے یہ تو کہہ دیا کہ اے اللہ! مجھ سے گناہ سرزد ہو گیا، میں آپ سے معافی مانگتا ہوں، اے اللہ! مجھے معاف فرما دیجیے، اور وقتی طور پر اس گناہ کو چھوڑ بھی دیا لیکن آئندہ ساری عمر کبھی اس گناہ کے پاس نہیں جاؤں گا، یہ عزم پکا ہوا یا نہیں؟ اس کا اطمینان نہیں ہوتا اور یہ عزم توبہ کی شرط ہے، جب اس شرط کے پائے جانے میں شبہ ہوتا ہے تو توبہ کے درست ہونے میں بھی شبہ رہتا ہے کہ یہ توبہ درست ہوئی یا نہیں؟ حضرت بابا نجم احسن صاحب رحمہ اللہ نے میری بات سن کر فرمایا کہ ارے بھائی! تم نے اپنے ذہن میں عزم کا بہت بڑا لمبا چوڑا معیار قائم کر رکھا ہے، ارے بھائی! عزم کے معنی یہ ہیں کہ اپنی طرف سے ارادہ کر لو کہ میں یہ کام دوبارہ نہیں کروں گا، پھر اگر دل میں یہ وسوسے، خدشات اور اندیشے آ رہے ہیں کہ معلوم نہیں کہ میں اس عزم پر ثابت قدم رہوں گا یا نہیں؟ میں اس عزم کو پورا کر سکوں گا یا نہیں؟ یہ اندیشے اور وسوسے عزم کی صحت کے منافی نہیں۔

مثلاً اپنی طرف سے یہ عزم کر لیا کہ یا اللہ! اب میں جھوٹ نہیں بولوں گا، اب غیبت نہیں کروں گا، اب اپنی نگاہ غلط جگہ پر نہیں اٹھاؤں گا، اب اس عزم کے بعد دل میں یہ وسوسہ آ رہا ہے کہ پتہ نہیں میں اس عزم پر قائم رہ سکوں گا یا نہیں؟ تو اس وسوسے کو آنے دو، کیونکہ یہ وسوسہ عزم کے مکمل ہونے میں مانع نہیں، بس عزم مکمل ہو گیا۔

پھر اللہ تعالیٰ سے کہہ دو کہ یا اللہ! میں نے تو اپنی طرف سے عزم کر لیا، لیکن میری سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کہ میں اس عزم پر کیسے قائم رہوں گا، اے اللہ! آپ ہی مجھے توفیق عطا فرمایئے، آپ ہی مجھے استقامت عطا فرمایئے اور آپ ہی مجھے اس عزم پر قائم اور دائم رکھیے، بس توبہ مکمل ہو گئی، اس لیے کہ عزم کا مطلب یہ ہے کہ اپنے اختیار سے ارادہ کر لینا، اب ارادہ پر میں کتنا قائم رہوں گا اور کتنا قائم نہیں رہوں گا، اس کی پیشین گوئی تو کوئی بھی نہیں کر سکتا، یہ کسی کے بس میں نہیں، یہ اختیار سے باہر ہے اور جب اختیار سے باہر ہے تو انسان اس کا مکلف نہیں، کیونکہ انسان اپنے اختیاری امور کا مکلف ہے، حضرت بابا صاحبؒ نے ایسی بات فرما دی کہ الحمدللہ! اس سے بڑا اطمینان اور تسلی حاصل ہو گئی۔ [اصلاحی مجالس، ج۵، ص۳۰۹ تا ۳۱۵]

ہماری توبہ تو بار بار ٹوٹ جاتی ہے

بعض اوقات یہ خیال آتا ہے کہ ہم توبہ کرتے ہیں لیکن وہ گناہ پھر سرزد ہو جاتا ہے اور توبہ ٹوٹ جاتی ہے، پھر توبہ کرتے ہیں، پھر ٹوٹ جاتی ہے، بار بار ایسا ہوتا رہتا ہے، اس سے طبیعت میں مایوسی ہونے لگتی ہے

کہ میری اصلاح کی کوئی توقع نہیں، کیونکہ اللہ کے بندے توبہ کر کے اس پر ثابت قدم رہتے ہیں، لیکن میں توبہ کرتا ہوں وہ توبہ ٹوٹ جاتی ہے، پھر توبہ کرتا ہوں پھر ٹوٹ جاتی ہے۔

خوب اچھی طرح سمجھ لیجیے کہ یہ بھی کوئی مایوسی کی بات نہیں، اتنی بات تو ضرور ہے کہ اپنی طرف سے توبہ پر قائم رہنے کی پوری کوشش کرو اور کرتے رہو اور گناہ پر جرأت پیدا نہ کرو، پھر بھی اگر غلطی ہو جائے تو توبہ کرلو، پھر غلطی ہو جائے پھر توبہ کرلو، قرآن کریم میں اللہ تعالی نے ارشاد فرمایا:

﴿إن الله يحب التوابين ويحب المتطهرين﴾ [البقرة:٢٢٢]

اس آیت "التوابین" کا لفظ لائے ہیں، حالانکہ توبہ کرنے والے کو تائب کہتے ہیں، لہذا اصل میں "تائبین" کہنا چاہیے تھا، مگر اس کے بجائے "التوابین" کا لفظ لائے، اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے، لہذا اس کے معنی ہوئے بہت توبہ کرنے والے اور کثرت سے توبہ کرنے والے۔[اصلاحی مجالس، ج۵،ص۲۹۸]

بار بار توبہ کی ضرورت کیوں ہے؟

ذہن میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ جب انسان سے گناہ سرزد ہوا اور وہ ان گناہوں سے توبہ کر کے فارغ ہو گیا اور اللہ تعالی کے حضور سارے گناہوں سے معافی مانگ لی اور اس پر جم گیا تو اب دوبارہ توبہ کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ اور ایسا شخص بار بار توبہ کرنے والا نہ ہوا، اس کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں ذکر ہی ان لوگوں کا ہو رہا ہے جن سے ایک مرتبہ غلطی ہوئی اور انہوں نے توبہ کر لی، پھر دوبارہ غلطی ہوئی پھر توبہ کر لی، پھر غلطی ہوئی پھر توبہ کر لی اور اللہ تعالی کی طرف رجوع ہوئے۔

لہذا اس آیت میں "تواب" کا لفظ خود اس بات کی طرف دلالت کر رہا ہے کہ اپنی طرف سے تو پکی توبہ کرو اور پھر اس توبہ پر پوری طرح ثابت قدم رہنے کی کوشش کرو، لیکن تم پھر دوبارہ کہیں نہ کہیں پھسلو گے اور جب پھسل جاؤ تو اس وقت گھبرانا مت اور مایوس مت ہو جانا بلکہ دوبارہ ہمارے پاس لوٹ آنا، کیونکہ توبہ کا لفظ "تاب، یتوب" سے نکلا ہے، جس کے معنی ہیں لوٹ آنا اور رجوع کرنا، لہذا اس آیت کے معنی یہ ہوئے کہ اللہ تعالی ان لوگوں کو پسند کرتے ہیں جو کثرت سے اللہ تعالی کی طرف رجوع کرتے ہیں اور کثرت سے لوٹتے ہیں، اس لیے مایوسی کے کوئی معنی نہیں، بلکہ غلطی ہو جائے تو دوبارہ لوٹ آؤ، پھر غلطی ہو جائے پھر لوٹ آؤ۔

[اصلاحی مجالس، ج۵،ص۲۹۹]

فاحشہ عورت کی مغفرت - عام قانون نہیں
ایک غلط فہمی کا ازالہ

بخاری شریف میں ایک واقعہ لکھا ہے کہ ایک طوائف اور فاحشہ عورت تھی، ساری زندگی طوائفی کا کام کیا، ایک مرتبہ وہ کہیں سے گذر رہی تھی راستے میں اس نے دیکھا کہ ایک کتا پیاس کی شدت کی وجہ سے

زمین کی مٹی چاٹ رہا تھا، قریب میں ایک کنواں تھا، اس عورت نے اپنے پاؤں سے چمڑے کا موزہ اتارا، اور اس موزے میں کنویں سے پانی نکالا، اور اس کتے کو پلا دیا، اللہ تعالی کو یہ عمل اتنا پسند آیا کہ اس کی مغفرت فرمادی کہ میری مخلوق کے ساتھ تم نے محبت اور رحم کا معاملہ کیا، تو ہم تمہارے ساتھ رحم کا معاملہ کرنے کے زیادہ حق دار ہیں۔

لیکن ایک بات یاد رکھیے کہ یہ اوپر کا معاملہ یہ رحمت کا معاملہ ہے، یہ کوئی قانون نہیں ہے، لہذا کوئی شخص یہ نہ سوچے کہ یہ اچھا نسخہ ہاتھ آ گیا کہ نہ نماز پڑھو، نہ روزہ رکھو، نہ زکوۃ دو، نہ دوسرے فرائض انجام دو، نہ گناہوں سے بچو، بس میں بھی اسی طرح جانوروں کے ساتھ رحم دلی کا معاملہ کیا کروں گا تو قیامت کے روز میری بھی معافی ہو جائے گی، یہ درست نہیں، اس لیے کہ یہ معاملہ رحمت کا ہے، اور اللہ کی رحمت کسی قاعدے اور قانون کی پابند نہیں ہوتی، وہ جس کو چاہیں اپنی رحمت سے بخش دیں، لیکن قانون یہ ہے کہ فرائض کی ادائیگی ضرور کرنی ہے، گناہوں سے بچنا ضروری ہے، اگر کوئی شخص فرائض کی ادائیگی نہیں کرتا، یا گناہوں سے نہیں بچتا ، تو محض کسی ایک عمل کی بنیاد پر تکیہ کر کے بیٹھ جائے کہ بس اس ایک عمل کے ذریعہ میری چھٹی ہو جائے گی، یہ بات درست نہیں، اس لیے کہ یہ اللہ تعالی کا قانون نہیں ہے، جس شخص کی صرف ایک عمل کی بنیاد پر بخشش ہوگئی معلوم نہیں اس نے وہ عمل کس جذبہ کے ساتھ کیا ہوگا، اور اس کی بنیاد پر اللہ تعالی کی رحت جوش میں آ گئی، اور اللہ تعالی نے اس کو معاف کر دیا، ہمارے اور آپ کے لیے یہ کوئی ہمیشہ کا دستور العمل نہیں ہے۔

اللہ کی رحمت کسی قید، کسی شرط اور کسی قانون کی پابند نہیں: ﴿ وسعت رحمتی کل شيئ ﴾ میری رحمت تو ہر چیز پر وسیع ہے، اس لیے کسی کے ساتھ ناانصافی کبھی نہیں ہوتی، لیکن بعض اوقات کسی کو کسی عمل پر نواز دیا جاتا ہے، جب وہ عمل اللہ تعالی کو پسند آ جاتا ہے۔

تاہم اس سے یہ نتیجہ تو ضرور نکالا جاتا ہے کہ کوئی نیکی کا کام حقیر نہیں ہوتا، کیا پتہ کہ اللہ تعالی کس نیک کام کو قبول فرمالیں، اور اس سے بیڑہ پار ہو جائے، اس لیے کسی نیکی کے کام کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے، لیکن یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں ہے کہ چونکہ یہ واقعات سننے میں آئے ہیں کہ اللہ تعالی نے فلاں نیک کام پر بخش دیا، لہذا اب نہ تو نماز پڑھنے کی ضرورت ہے اور نہ فرائض ادا کرنے کی ضرورت ہے، بس آدمی اللہ کی رحمت پر تکیہ کر کے بیٹھ جائے، چنانچہ یہ حدیث آپ نے سنی ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عاجز شخص وہ ہے جو اپنے نفس کو خواہشات کے پیچھے چھوڑ دے، اور جو دل میں آ رہا ہے وہ کام کر رہا ہے، یہ نہیں دیکھ رہا ہے کہ یہ کام حلال ہے یا حرام ہے؟ جائز ہے یا ناجائز؟ لیکن اللہ تعالی پر تمنا اور آرزو لگائے بیٹھا ہے کہ اللہ میاں تو بڑے غفور رحیم ہے سب معاف فرمادیں گے، بہر حال! ان جیسے واقعات سے یہ نتیجہ نکالنا درست نہیں۔

سنت و بدعت

بدعت کسے کہتے ہیں ؟

بدعت کے دو معنی ہوتے ہیں، ایک لغوی اور ایک اصطلاحی، اگر آپ لغت اور ڈکشنری میں بدعت کے معنی دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ لغت میں اس کے معنی نئی چیز کے ہیں، لہذا جو بھی نئی چیز ہے اس کو لغوی اعتبار سے بدعت کہہ سکتے ہیں، مثلاً یہ پنکھا، یہ بجلی، یہ ٹرین اور ہوائی جہاز وغیرہ، لغت اور ڈکشنری کے اعتبار سے سب بدعت ہیں، کیونکہ یہ چیزیں ہمارے دور کی ہی پیداوار ہیں، مسلمانوں کے اولین دور میں ان کا وجود نہ تھا یہ سب نئی چیزیں ہیں، لیکن شریعت کی اصطلاح میں ہر نئی چیز کو بدعت نہیں کہتے، بلکہ بدعت کے معنی یہ ہیں کہ دین میں کوئی نیا طریقہ نکالنا اور اس طریقہ کو از خود مستحب یا لازم یا مسنون قرار دینا جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور خلفائے راشدین نے مسنون قرار نہیں دیا اس کو بدعت کہیں گے، اس اصطلاحی معنی کے لحاظ جن چیزوں کو بدعت کہا گیا ہے ان میں سے کوئی بدعت اچھی نہیں ہوتی اور ایسی کوئی بدعت حسنہ نہیں ہے بلکہ ہر بدعت بری ہی ہے۔

خوب سمجھ لیجیے! کہ لوگوں نے جو بدعت کی قسمیں نکال لیں ہیں کہ ایک بدعت حسنہ ہوتی ہے اور ایک بدعت سیئہ ہوتی ہے، ایک اچھی ہوتی ہے اور ایک بری ہوتی ہے، یاد رکھو! بدعت کوئی حسنہ نہیں، کوئی بدعت اچھی نہیں، جو طریقہ نبی کریم سرور دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اور حضرات خلفا راشدین اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین نے ضروری قرار نہیں دیا اور سنت قرار نہیں دیا، مستحب قرار نہیں دیا، دنیا کی کوئی طاقت اس کو واجب، سنت اور مستحب قرار نہیں دے سکتی، اگر ایسا کوئی کرے گا تو وہ ضلالت اور گمراہی ہوگی، اس لیے کہ اس کا مطلب یہ ہوگا کہ صحابہ کرام دین کو اتنا نہیں سمجھتے تھے جتنا ہم سمجھتے ہیں۔ [اصلاحی خطبات ج ۱، ص ۲۲۷، ۲۳۵]

کیا ہر نئی چیز بدعت ہے ؟

دیکھیے! بہت سی چیزیں ایسی ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے عہد مبارک میں نہیں تھیں، نہ ان کا رواج تھا لیکن زمانے کے حالات کی تبدیلی کی وجہ سے وہ چیزیں وجود میں آئیں، اور لوگوں نے ان سے فائدہ اٹھانا

شروع کر دیا، مثلاً حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بجلی نہیں تھی، آج ہمارا بجلی کے بغیر گذارا نہیں ہوتا، اس زمانے میں پنکھے نہیں تھے، آج ہمارا پنکھے کے بغیر گذارا نہیں، اس زمانے میں گھوڑے اور اونٹوں پر سفر ہوتا تھا، آج موٹروں کی، بسوں کی، ریلوے اور ہوائی جہازوں کی بھرمار ہے، ان کے بغیر گذارا نہیں، لیکن یہ سب چیزیں ایسی ہیں کہ کوئی ان کو دین کا حصہ نہیں سمجھتا، مثلاً کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ پنکھا چلانا سنت ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ بجلی جلانا واجب ہے، اور شرعی اعتبار سے ضروری ہے، کوئی شخص یہ نہیں کہتا کہ ریل میں سفر کرنا سنت یا مستحب ہے، یا واجب ہے، لہٰذا کوئی شخص ان چیزوں کو دین کا حصہ نہیں سمجھتا، بلکہ ضرورتوں کو پورا کرنے کے لیے نئے نئے طریقے وجود میں آتے رہتے ہیں، اس لیے شریعت نے بھی ان پر پابندی نہیں لگائی، ان سب چیزوں کو استعمال کرنا شرعاً جائز ہے۔

لیکن کوئی نیا کام انسان اس خیال سے شروع کرے کہ یہ دین کا حصہ ہے، یا یہ سوچے کہ یہ کام واجب ہے، یا سنت ہے، یا فرض ہے، یا مستحب ہے، یا یہ ثواب کا کام ہے، حالانکہ وہ کام نہ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیا، نہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کا حکم دیا، اور نہ صحابہ کرام نے وہ کام کیا، جس کا مطلب یہ ہے کہ دین کے معاملے میں ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔ استغفر اللہ۔ شریعت میں اسی کا نام ''بدعت'' ہے، بدعت کے لفظی معنی ہیں نئی چیز، لہٰذا لغت کے اعتبار سے تو یہ پنکھا بھی بدعت ہے، یہ بجلی بھی بدعت ہے، یہ ٹائلز اور ماربل بھی بدعت ہے، یہ کاریں، یہ بسیں اور یہ ہوائی جہاز بھی بدعت ہے، لیکن شریعت کی اصطلاح میں بدعت اس نئے کام کو کہا جاتا ہے جس کا حکم نہ قرآن کریم نے دیا ہو اور نہ ہی سنت سے اس کا ثبوت ہو اور نہ صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا ہو اور نہ ہی اس کی تلقین کی ہو، ایسے کام کو شریعت کی اصطلاح میں بدعت کہا جاتا ہے، بدعت کے بارے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

كل محدثة بدعة وكل بدعة ضلالة

یعنی ہر وہ نیا کام جو دین میں پہلے داخل نہیں تھا اور نہ دین کا حصہ تھا، آج اسکو دین میں داخل کر دیا گیا وہ بدعت ہے اور ہر بدعت گمراہی ہے اور ہر گمراہی جہنم میں لے جانے والی ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۶، ۲۲۴]

بدعت خواہ حسنہ ہو یا سیئہ غلط ہے

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ بدعت کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک بدعت حسنہ اور ایک بدعت سیئہ، یعنی بعض کام بدعت تو ہوتے ہیں لیکن اچھے ہوتے ہیں اور بعض کام بدعت بھی ہیں اور برے بھی ہیں، لہٰذا اگر کوئی اچھا کام شروع کیا جائے تو اس کو بدعت حسنہ کہا جائے گا اور اس میں کوئی خرابی نہیں ہے۔

خوب سمجھ لیجیے کہ بدعت کوئی اچھی نہیں ہوتی، جتنی بدعتیں ہیں وہ سب بری ہیں، اصل بات یہ ہے کہ بدعت کے دو معنی ہوتے ہیں، ایک لغوی اور ایک اصطلاحی، اگر آپ لغت اور ڈکشنری میں بدعت کے معنی

دیکھیں تو آپ کو نظر آئے گا کہ لغت میں اس کے معنی نئی چیز کے ہیں، لہذا جو بھی نئی چیز ہے اس کو لغوی اعتبار سے بدعت کہہ سکتے ہیں، مثلاً یہ پنکھا، یہ بجلی، یہ ٹرین اور ہوائی جہاز وغیرہ لغت اور ڈکشنری کے اعتبار سے سب بدعت ہیں کیونکہ یہ چیزیں ہمارے دور کی ہی پیداوار ہیں، مسلمانوں کے اولین دور میں ان کا وجود نہ تھا یہ سب نئی چیزیں ہیں۔ [اصلاحی خطبات ج ا،ص ۲۲۷]

بدعت گمراہی کیوں ہے ؟

بدعت گمراہی کیوں ہے؟ اس لیے کہ بدعت میں اگر غور کیا جائے تو یہ نظر آئے گا کہ جو شخص بدعت کو اختیار کرنے والا ہے وہ درحقیقت یہ سمجھتا ہے کہ اللہ اور اللہ کے رسول نے جو دین ہمیں دیا تھا وہ ادھورا اور ناقص تھا، آج میں نے اس میں اس عمل کا اضافہ کر کے اس کو مکمل کر دیا، گویا کہ آدمی عملی طور پر بدعت کے ذریعہ یہ دعوی کر رہا ہے کہ میں اللہ اور اس کے رسول سے آگے نکل جاؤں، جو چیز دین میں داخل کی جاتی ہے بظاہر دیکھنے میں وہ ثواب کا کام معلوم ہوتی ہے، عبادت لگتی ہے، لیکن چونکہ وہ عبادت اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں ہوتی اس لیے وہ عبادت بدعت ہے اور بدعت گمراہی ہے، جتنی بدعات ہوتی ہیں ان میں براہ راست گناہ کا کام نہیں ہوتا لیکن چونکہ اس عمل کو کسی اتھارٹی کے بغیر دین کے اندر شامل کر دیا گیا، اس عمل کے بارے میں ہمارے پاس قرآن کی اور سنت کی کوئی اتھارٹی نہیں تھی، بلکہ ہم نے اپنی طرف سے اس کو دین میں داخل کر دیا، اس لیے وہ بدعت بن گئی۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۶، ۲۲۶]

بدعت کی سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ آدمی خود دین کا موجد بن جاتا ہے، حالانکہ دین کا موجد کون ہے؟ صرف اللہ تعالی، اللہ تعالی نے ہمارے لیے جو دین بنایا وہ ہمارے لیے قابل اتباع ہے، لیکن بدعت کرنے والا خود دین کا موجد بن جاتا ہے، اور یہ سمجھتا ہے کہ دین کا راستہ میں بنا رہا ہوں، اور در پردہ وہ اس بات کا دعوی کرتا ہے کہ جو میں کہوں وہ دین ہے، اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے دین کا جو راستہ بتایا اور جس پر صحابہ کرام نے عمل کیا، میں ان سے بڑھ کر دین دار ہوں، میں دین کو ان سے زیادہ جانتا ہوں، تو یہ شریعت کی اتباع نہیں، بلکہ اپنی خواہش نفس کی اتباع ہے۔ [اصلاحی خطبات ج ا،ص ۲۱۷]

بدعت کے ارتکاب کا وبال سنت سے محرومی

ایک بات ہمیشہ یاد رکھنے کی ہے، وہ یہ کہ میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ بدعات کی خاصیت یہ ہے کہ جب آدمی بدعات کے اندر مبتلا ہو جاتا ہے، تو اس کے بعد پھر اصل سنت کاموں کی توفیق کم ہو جاتی ہے، چنانچہ آپ نے دیکھا ہوگا کہ جو لوگ صلوۃ التسبیح کی جماعت میں دیر تک کھڑے رہتے ہیں، وہ لوگ پانچ وقت کی فرض جماعتوں میں کم نظر آئیں گے، اور جو لوگ بدعات کرنے کے عادی ہوتے ہیں، مثلاً حلوہ مانڈا کرنے اور کونڈے میں لگے ہوئے ہیں وہ فرائض سے غافل ہوتے ہیں،

نمازیں قضا ہو رہی ہیں، جماعتیں چھوٹ رہی ہیں، اس کی تو کوئی فکر نہیں لیکن یہ سب کچھ ہو رہا ہے۔

اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو سب سے زیادہ تاکید اس کی فرمائی تھی کہ جب کسی کا انتقال ہو جائے تو اس کی میراث شریعت کے مطابق جلدی تقسیم کرو، لیکن اب یہ ہو رہا ہے کہ میراث تقسیم کرنے کی طرف تو دھیان نہیں ہے، مگر تیجہ ہو رہا ہے، دسواں ہو رہا ہے، چالیسواں ہو رہا ہے، برسی ہو رہی ہے، لہذا بدعات کی خاصیت یہ ہے کہ جب انسان اس کے اندر مبتلا ہوتا ہے تو سنت سے دور ہوتا چلا جاتا ہے، اور سنت والے اعمال کرنے کی توفیق نہیں ہوتی، اللہ تعالی ہمیں محفوظ رکھے، آمین، بہر حال ان فضولیات اور بدعات سے تو بچنا چاہیے، باقی یہ رات فضیلت کی رات ہے، اور اس رات کے بارے میں بعض لوگوں نے جو خیال ظاہر کیا ہے کہ اس رات میں کوئی فضیلت ثابت نہیں، تو یہ خیال صحیح نہیں ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۲۷۲]

تیجہ، دسواں اور چالیسواں کیوں غلط ہے؟

ایک بات اور عرض کر دوں جس کے بارے میں لوگ بکثرت پوچھا کرتے ہیں، وہ یہ ہے کہ جب ہر نئی بات گمراہی ہے تو یہ پنکھا بھی گمراہی ہے، یہ ٹیوب لائٹ بھی گمراہی ہے، یہ بس بھی یہ موٹر بھی گمراہی ہے، اس لیے کہ یہ چیزیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھیں، بعد میں پیدا ہوئی ہیں، ان کے استعمال کو بدعت کیوں نہیں کہتے؟

خوب سمجھ لیجیے! اللہ تعالی نے بدعت کو جو ناجائز اور حرام قرار دیا، یہ وہ بدعت ہے جو دین کے اندر کوئی نئی بات نکالی جائے، دین کا جز اور دین کا حصہ بنالیا جائے کہ یہ بھی دین کا حصہ ہے، مثلا لوگوں کا یہ کہنا کہ ایصال ثواب اس طرح ہوگا جس طرح ہم نے بتادیا، یعنی تیسرے دن تیجہ ہوگا، پھر دسواں ہوگا، پھر چہلم ہوگا اور جو اس طریقے سے ایصال ثواب نہ کرے وہ مردود ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ اگر کسی کے گھر میں صدمہ ہو تو دوسرے لوگوں کو چاہیے کہ اس کے گھر میں کھانا تیار کر کے بھیجیں، حضرت جعفر بن ابی طالب رضی اللہ عنہ غزوہ موتہ کے موقع پر شہید ہوئے تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنے گھر والوں سے فرمایا کہ:

"اصنعوا لآل ابی جعفر طعاما فإنه قد أتاهم أمر شغلهم" [ابوداود، کتاب الجنائز]

یعنی جعفر کے گھر والوں کے لیے کھانا بنا کر بھیجو اس لیے کہ وہ بے چارے مشغول ہیں اور صدمہ کے اندر ہیں تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم یہ ہے کہ اس کے لیے کھانا بناؤ جس کے گھر صدمہ ہو گیا تاکہ وہ کھانا پکانے میں مشغول نہ ہو، ان کو صدمہ ہے۔

آج کل اُلٹی گنگا یہ بہتی ہے کہ جس کے گھر صدمہ ہے، وہ کھانا تیار کرے، اور نہ صرف یہ کہ کھانا تیار کرے بلکہ دعوت کرے، شامیانے لگائے، دیگیں چڑھائے، اور اگر دعوت نہیں دے گا تو برادری میں ناک کٹ جائے گی، یہاں تک سننے میں آیا ہے کہ جو بے چارہ مر گیا ہے اس کو بھی نہیں بخشتے، اس کو بھی بُرا بھلا کہنا

شروع کردیتے ہیں، مثلاً یہ کہا جاتا ہے کہ:

مر گیا مردود ، نہ فاتحہ نہ درود

اگر مرنے والے کے گھر میں دعوت نہ ہوئی تو پھر اس کی بخشش نہیں ہوگی، معاذ اللہ! اور پھر وہ دعوت بھی مرنے والے کے ترکے سے ہوگی، جس میں اب سارے ورثاء کا حق ہو گیا، ان میں نابالغ بھی ہوتے ہیں، اور نابالغ کے مال کو ذرہ برابر چھونا شرعاً حرام ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کے سراسر خلاف ہے، پھر بھی یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور جو شخص یہ سب نہ کرے وہ مردود ہے، لہٰذا دین کا حصہ بنا کر، لازم اور ضروری قرار دے کر دین میں کوئی چیز ایجاد کی جائے وہ بدعت ہے، ہاں! اگر کوئی چیز دین کا حصہ نہیں ہے بلکہ کسی نے اپنے استعمال اور آرام کے لیے کوئی چیز اختیار کر لی، مثلاً ہوا حاصل کرنے کے لیے پنکھا بنا لیا، روشنی حاصل کرنے کے لیے بجلی استعمال کر لی، سفر کرنے کے لیے کار استعمال کر لی، یہ کوئی بدعت نہیں، کیونکہ دنیا کے کاموں میں اللہ تعالیٰ نے چھوٹ دے رکھی ہے کہ مباحات کے دائرے میں رہتے ہوئے جو چاہو کرو، لیکن دین کا حصہ بنا کر، یا کسی غیر مستحب کو مستحب قرار دے کر، یا کسی غیر سنت کو سنت کہہ کر، یا کسی غیر واجب کو واجب کہہ کر جب کوئی چیز ایجاد کی جائے گی تو وہ بدعت ہوگی اور حرام ہوگی۔ [اصلاحی خطبات ج ۱ ص ۲۲۳]

اسی طرح ہر دن ایصال ثواب کرنا جائز تھا، پہلے دن بھی، دوسرے دن بھی اور تیسرے دن بھی، فرض کرو کہ ایک شخص تیسرے دن گھر پر بیٹھے ایصال ثواب کر رہا ہے تو اس میں کوئی حرج نہیں، جائز ہے، لیکن اگر کوئی یہ کہے کہ یہ تیسرا دن خاص طور پر ایصال ثواب کے لیے مقرر ہے اور اس تیسرے دن میں ایصال ثواب کرنا زیادہ فضیلت کا باعث ہے یا یہ سنت ہے، یا یہ کہے کہ اگر کوئی شخص تیسرے دن ایصال ثواب نہیں کرے گا تو اس کو ناواقفوں کی لعنت و ملامت کا شکار ہونا پڑے گا، اب یہ ایصال ثواب بدعت ہو جائے گا، اس لیے کہ اس عمل کو اپنی طرف سے ایک خاص دن میں لازم اور ضروری قرار دے دیا۔

بہر حال! میں یہ جو عرض کر رہا تھا کہ یہ تیجہ، دسواں، بیسواں اور چالیسواں جائز نہیں ہے، یہ اس لیے کہ لوگوں نے ان دنوں کو ایصال ثواب کے لیے مخصوص کر دیا ہے، لیکن اگر کوئی شخص ایصال ثواب کے لیے کوئی دن مخصوص نہ کرے بلکہ اتفاقاً وہ تیسرے دن ایصال ثواب کر لے تو اس میں بھی کوئی خرابی نہیں، البتہ چونکہ آجکل تیسرے ہی دن کو بعض لوگوں نے لازم سمجھ رکھا ہے اس لیے ان کی مشابہت سے بچنے کے لیے بطور خاص تیسرے دن یہ کام نہ کرے تو زیادہ بہتر ہے۔ [اصلاحی خطبات ج ۱ ص ۲۲۹، ۲۳۱]

تیجہ کی رسم کرنا گناہ کیوں ؟

لیکن لوگوں نے یہ طریقہ اپنی طرف سے مقرر کر لیا کہ مرنے کے تیسرے دن سب کا جمع ہونا ضروری ہے، اس دن سب مل کر قرآن خوانی کریں گے، اور جس جگہ تیجہ ہوگا وہاں کھانے کی دعوت بھی ہوگی،

اگر ویسے ہی پہلے دن یا دوسرے دن یا تیسرے دن قرآن شریف اکیلے پڑھ لیتے، لوگوں کے آنے کی وجہ سے جمع ہوکر پڑھ لیتے تو یہ طریقہ اصلا جائز تھا، لیکن یہ تخصیص کرنا کہ تیسرے دن ہی قرآن خوانی ہوگی اور سب مل کر ہی کریں گے، اور اس میں دعوت ضرور ہوگی اور جو ایسا نہ کرے وہ وہابی ہے، جب اس مخصوص طریقہ کو دین کا لازمی حصہ قرار دے دیا کہ اس کے بغیر دین مکمل نہیں اور اگر کوئی عمل نہ کرے تو عمل نہ کرنے کے نتیجے میں اسی کو مطعون کیا جائے، اس کو گناہ گار قرار دیا جائے، تو یہی چیز اس عمل کو بدعت بنا دیتی ہے، یہاں تک کہ اگر کسی میت کا تیجہ نہ ہوا تو کہنے والے اس میت کو طعنہ دیتے ہیں کہ:

مر گیا مردود! نہ فاتحہ نہ درود

اسی طرح اس میت پر طعنہ ہو رہا ہے، جو بے چارہ دنیا سے چلا گیا، بس لازمی سمجھنے اور طعنہ دینے نے اس عمل کو بدعت بنا دیا، ورنہ ضروری سمجھے بغیر جس دن چاہو ایصال ثواب کرلو، پہلے دن کرلو، دوسرے دن کرلو، تیسرے دن کرلو، چوتھے دن کرلو، پانچویں دن کرلو، مگر یہ تیجہ، دسواں، چالیسواں یہ سب بدعت ہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۶، ۲۳۴]

جب لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ تیجہ کرنا بدعت ہے، چالیسواں کرنا بدعت ہے تو جواب میں عام طور پر لوگ یہی کہتے ہیں کہ ہم تو کوئی گناہ کا کام نہیں کر رہے، بلکہ ہم تو قرآن شریف پڑھ رہے ہیں اور لوگوں کی دعوت کر رہے ہیں اور نہ قرآن شریف پڑھنا گناہ ہے، اور نہ لوگوں کی دعوت کرنا گناہ ہے، بیشک یہ دونوں گناہ نہیں، بشرطیکہ ان کو لازم مت سمجھو، اور اگر کوئی شخص اس میں شریک نہ ہو تو اس کو طعنہ مت دو، اور اس عمل کو دین کا حصہ مت سمجھو، تو پھر یہ عمل بیشک جائز ہے، جو آیت کریمہ میں نے تلاوت کی، اس کے معنی یہ ہیں کہ اللہ اور اللہ کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو، اس مفہوم میں یہ سب بدعات بھی داخل ہیں کہ اپنی طرف سے کوئی طریقہ گھڑ کر اس کو لازمی قرار دے دیا جائے اور جو شخص وہ طریقہ اختیار نہ کرے اس کو مطعون کیا جائے۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۶، ۲۳۶]

سوئم ، دسواں یا چھلم کر لیا تو کونسا گناہ کیا ؟

بدعت اور سنت کے درمیان بھی یہی امتیاز اور فرق ہے کہ سنت باعث اجر وثواب ہے اور بدعت کی اللہ تبارک وتعالی کے یہاں کوئی قیمت نہیں، لوگ کہتے ہیں کہ صاحب! اگر ہم نے تیجہ کرلیا، دسواں کرلیا، چالیسواں کرلیا تو ہم نے کونسا گناہ کا کام کرلیا؟ بلکہ یہ ہوا کہ لوگ جمع ہوئے انہوں نے قرآن شریف پڑھا اور قرآن شریف پڑھنا تو بڑی عبادت کی بات ہے اور اس میں کیا خرابی کیا بات ہوئی؟ ارے بھائی! اس میں خرابی یہ ہوئی کہ قرآن شریف اپنی طرف سے پڑھا اور اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں پڑھا، قرآن شریف پڑھنا اس وقت باعث اجر وثواب ہے جب وہ اللہ اور اللہ کے

رسول کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو، اگر اس کے خلاف ہو تو اس میں کوئی اجر وثواب نہیں۔

میں اس کی مثال دیا کرتا ہوں کہ مغرب کی تین رکعت پڑھنا فرض ہے، اب ایک شخص کہے کہ (معاذ اللہ) یہ تین کا عدد بے تکا سا ہے، چار رکعت پوری کیوں نہ پڑھیں؟ اب وہ شخص تین رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھتا ہے، بتایئے! اس نے کیا گناہ کیا؟ کیا اس نے شراب پی لی؟ کیا چوری کرلی؟ یا ڈاکہ ڈالا؟ یا کسی گناہ کا ارتکاب کرلیا؟ صرف اتنا ہی تو کیا کہ ایک رکعت زیادہ پڑھ لی، جس میں قرآن کریم زیادہ پڑھا، ایک رکوع زیادہ کیا اور دو سجدے زیادہ کیے اور اللہ کا نام لیا، اب اس میں اس نے کیا گناہ کرلیا؟ لیکن ہوگا یہ کہ چوتھی رکعت جو اس نے زیادہ پڑھی نہ صرف یہ کہ زیادہ اجر وثواب کا موجب نہیں ہوگی بلکہ ان پہلی تین رکعتوں کو بھی لے ڈوبے گی اور ان کو بھی خراب کردے گی، کیوں؟ اس لیے کہ اللہ تعالی اور اللہ کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں ہے، سنت اور بدعت میں یہی فرق ہے کہ جو طریقہ بتایا ہوا ہے وہ سنت ہے اور جو بتایا ہوا طریقہ نہیں ہے بلکہ اپنی طرف سے گھڑا ہوا ہے اور دیکھنے میں بہت اچھا معلوم ہوتا ہے، لیکن اس کا کوئی فائدہ کوئی اجر وثواب نہیں۔

ایصال ثواب کا صحیح طریقہ کیا ھے؟

کسی مردہ کو ایصال ثواب کرنا بڑی فضیلت کی چیز ہے، جو شخص کسی مرنے والے کو ایصال ثواب کرے تو اس کو دگنا ثواب ملتا ہے، ایک اس عمل کے کرنے کا ثواب، اور دوسرے ایک مسلمان کے ساتھ ہم دردی کرنے کا ثواب، لیکن شریعت نے ایصال ثواب کے لیے کوئی طریقہ مقرر نہیں کیا کہ ایصال ثواب صرف قرآن شریف پڑھ کر ہی کرو، یا صدقہ کرکے کرو، یا نماز پڑھ کر کرو، بلکہ جس وقت جس نیک کام کی توفیق ہو جائے اس نیک کام کا ایصال ثواب جائز ہے، تلاوت کلام پاک کا ایصال ثواب کرسکتے ہیں، صدقہ کا بھی کرسکتے ہیں، ذکر وتسبیح کا بھی کرسکتے ہیں، یہاں تک کہ اگر کوئی کتاب لکھی ہے، اور کوئی تصنیف وتالیف کی ہے ، اس کا بھی ایصال ثواب کیا جاسکتا ہے، اگر وعظ ونصیحت کی ہے تو اس کا بھی ایصال ثواب کیا جاسکتا ہے، غرض یہ کہ جتنے بھی نیک کام ہیں، سب کا ایصال ثواب کیا جاسکتا ہے اور اسی طرح شریعت نے ایصال ثواب کے لیے کوئی دن مقرر نہیں کیا کہ فلاں دن کرو، اور فلاں دن نہ کرو، بلکہ جس وقت اس شخص کا انتقال ہوا ہے، اس کے بعد جس وقت چاہیں ایصال ثواب کرسکتے ہیں، چاہے پہلے دن کرے، چاہے دوسرے دن کرے، چاہے تیسرے دن کرے، جب چاہے کرے، کوئی دن مقرر نہیں ہے، اگر کوئی شخص ایصال ثواب کا کوئی بھی طریقہ اختیار کرے جس کی شریعت نے اجازت دی ہے تو اس میں کوئی خرابی نہیں۔ [اصلاحی خطبات ج ا، ص ۲۲۸]

یا مثلاً شریعت نے اس بات کی اجازت دی ہے کہ اگر کسی شخص کا انتقال ہوجائے تو اس کے عزیز واقارب اس کے لیے ایصال ثواب کریں، کوئی بھی نیک عمل کرکے اس کا ثواب اس کو پہنچائیں، اتنی بات نبی

کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی حدیث سے ثابت ہے، مثلاً تلاوت قرآن کریم کے ذریعے کسی کو ثواب پہنچائیں، نفلیں پڑھ کر پہنچائیں، تسبیحات پڑھ کر پہنچائیں، حج کر کے ثواب پہنچائیں، روزہ رکھ کر پہنچائیں، طواف کر کے ثواب پہنچائیں، عمرہ کر کے ثواب پہنچائیں، یہ سب جائز ہیں، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس طرح ایصال کرنا ثابت ہے، لیکن اس ایصال ثواب کے لیے شریعت نے کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کیا کہ بس اسی طریقے سے کرنا ہوگا، بلکہ سہولت کے ساتھ آدمی کو جس عبادت کا موقع ہو، اس عبادت کے ذریعہ ایصال ثواب کردے، مثلاً کسی کو تلاوت کے ذریعہ ایصال ثواب کرنے کا موقع ہے، وہ تلاوت کے ذریعہ ایصال کردے، اگر نفلیں پڑھ کر ایصال ثواب کرنے کا موقع ہو تو نفلیں پڑھ کر ایصال ثواب کردے، بس اخلاص کے ساتھ ایصال ثواب کردے، شرعاً ایصال ثواب کے لیے نہ تو دن مقرر ہے، نہ وقت مقرر ہے، نہ اس کے لیے کوئی طریقہ مقرر ہے، نہ تقریب مقرر ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۶، ۲۳۳]

کیا زندہ لوگوں کے لیے بھی ایصال ثواب کیا جاسکتا ہے؟

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایصال ثواب صرف مُردوں کو ہوسکتا ہے جو دنیا سے جاچکے، زندوں کو نہیں ہوسکتا، یہ خیال غلط ہے، ایصال ثواب تو زندہ آدمی کو بھی کیا جاسکتا ہے، لہٰذا عبادت کر کے، تلاوت کر کے اس کا ثواب ایسے لوگوں کو پہنچا دو جن کو آپ کی ذات سے کبھی کوئی تکلیف پہنچی ہو، اس کے نتیجے میں تم نے اس کے ساتھ جو زیادتی کی ہے ان شاء اللہ اس کی تلافی ہو جائے گی۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۱، ص۳۱۸]

قبروں پر پھولوں کی چادر چڑھانا

اسی طرح قبروں پر پھولوں کی چادریں چڑھانا بدعت میں داخل ہے، دیکھیے! ویسے ہی آپ کا دل چاہا کہ میں اپنے باپ کی قبر پر چادر چڑھاؤں، چنانچہ اس کو دین کا حصہ اور ثواب سمجھے بغیر آپ نے قبر پر چادر چڑھادی تو یہ جائز ہے، لیکن اس کو دین کا حصہ قرار دینا اور باعث اجر و ثواب قرار دینا اور اگر کوئی شخص نہ چڑھائے تو اس پر طعنہ دینا اور یہ کہنا کہ اس نے میت کی تعظیم میں کوتاہی کا ارتکاب کیا ہے، یہ چیزیں اس عمل کو بدعت بنا دیتی ہیں، جو چیز جس حد میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مقرر فرمائی ہے اس کو اس کی حد سے آگے بڑھانا، مثلاً جو عمل مستحب ہے، اس کو سنت کا درجہ دینا اور جو عمل سنت ہے اس کو واجب کا درجہ دینا یہ سب بدعات میں داخل ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۶، ۲۳۷]

عید کے روز گلے ملنا کب اور کیوں بدعت ہے؟

عید کے دن آپ نے عید کی نماز پڑھی اور عید کی نماز کے بعد دو مسلمان بھائیوں نے خوشی کے جذبے میں آکر آپس میں ایک دوسرے سے گلے مل لیے تو اصلاً گلے ملنا کوئی ناجائز فعل نہیں، یا مثلاً ابھی آپ

یہاں مجلس سے اٹھے اور کسی سے گلے مل لیے تو کوئی گناہ کی بات نہیں، جائز ہے، لیکن اگر کوئی شخص یہ سوچے کہ عید کی نماز کے بعد گلے ملنا عید کی سنت ہے اور یہ بھی عید کی نماز کا حصہ ہے اور جب تک گلے نہیں ملیں گے اس وقت تک عید نہیں ہوگی، تو یہی عمل اس وقت بدعت بن جائے، اس لیے کہ ایک ایسی چیز کو سنت قرار دیا جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے سنت قرار نہیں دیا اور صحابہ کرام نے اس کو نہ سنت قرار دیا اور نہ اس کی پابندی کی، اب اگر کوئی شخص گلے ملنے سے انکار کر دے کہ میں تو نہیں ملتا اور آپ اس سے کہیں کہ آج عید کا دن ہے، کیوں گلے نہیں ملتے؟ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے عید کے دن گلے ملنے کو لازمی قرار دے دیا اور از خود لازمی قرار دے لینا ہی اس کو بدعت بنا دیتا ہے، لیکن ویسے ہی اتفاقی طور پر گلے ملنے کو دل چاہا اور گلے مل لیے تو یہ بذات خود بدعت نہیں، بہر حال! کسی بھی مباح عمل کو لازم قرار دینے یا اس کو سنت یا واجب قرار دینے سے وہ بدعت بن جاتی ہے۔ [اصلاحی خطبات ج ۱ ص ۲۳۲]

کیا ”تبلیغی نصاب“ (فضائل اعمال) پڑھنا بدعت ہے؟

ایک صاحب مجھ سے پوچھنے لگے کہ یہ تبلیغی جماعت والے تبلیغی نصاب پڑھتے ہیں اور لوگ اس پر اعتراض کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں اور صحابہ کرام کے زمانے میں تبلیغی نصاب کون پڑھتا تھا؟ اور خلفائے راشدین کے زمانے میں کون پڑھتا تھا؟ لہذا یہ تبلیغی نصاب پڑھنا بھی بدعت ہو گیا، لیکن میں نے آپ کے سامنے جو تفصیل بیان کی اس سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ علم اور دین کی بات کہنا اور اس کی تبلیغ کرنا ہر وقت اور ہر آن جائز ہے، مثلاً ہم اور آپ جمعہ کے روز عصر کے بعد یہاں جمع ہوتے ہیں اور دین کی بات سنتے اور سناتے ہیں، اب اگر کوئی شخص یہ کہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے میں تو ایسا نہیں ہوتا تھا کہ لوگ خاص طور پر جمعہ کے روز عصر کے بعد جمع ہوتے ہوں اور پھر ان کے سامنے دین کی بات کی جاتی ہو، لہذا یہ ہمارا جمع ہونا بھی بدعت ہے، خوب سمجھ لیجیے! کہ یہ اس لیے بدعت نہیں کہ دین کی تعلیم و تبلیغ ہر وقت اور ہر آن جائز ہے، لیکن اگر ہم میں سے کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ جمعہ کے دن عصر کے بعد مسجد البیت المکرم ہی میں یہ اجتماع مسنون ہے اور اگر کوئی شخص اس اجتماع میں شریک نہ ہو تو اس کو تو دین کا شوق نہیں ہے، اس کے دل میں دین کی عظمت اور محبت نہیں ہے، اس لیے کہ البیت المکرم میں جمعہ کے دن نہیں آتا، تو اس صورت میں یہی اجتماع کا عمل جو ہم اور آپ کر رہے ہیں بدعت بن جائے گا، اللہ تعالیٰ محفوظ رکھے۔ اب ایک آدمی یہاں آنے کے بجائے کسی دوسری جگہ پر چلا جاتا ہے اور وہاں جا کر دین کی بات سن لیتا ہے تو وہ بھی ثواب کا کام کر رہا ہے، اب اگر کوئی شخص اس سے کہے کہ البیت المکرم ہی میں دین کی باتیں سننے کے لیے آئے اور جمعہ کے دن ہی آئے اور عصر کے بعد ہی آئے اور بیان بھی فلاں شخص ہی کا ہو تو اس صورت میں یہی عمل بدعت بن جائے گا، اسی طرح لوگ تبلیغی نصاب پڑھتے ہیں اور دینی اعمال کی فضیلتیں سناتے ہیں، یہ بڑے ثواب کا کام ہے، اب

اگر کوئی اس کو متعین کرے کہ تبلیغی نصاب ہی پڑھنا ضروری ہے اور یہی سنت ہے اور اس کے علاوہ اگر کوئی دوسری کتاب پڑھی جائے گی تو وہ مقبول نہیں، تو اس صورت میں یہ تبلیغی نصاب پڑھنا بھی بدعت بن جائے گا ،لہذا کسی بھی عمل مباح کو یا اجر وثواب والے عمل کو خاص وقت اور خاص حالات کے ساتھ مربوط کر کے لازم قرار دے دیا جائے تو وہی بدعت بنا دیتا ہے۔ [اصلاحی خطبات ج ا ص ۲۳۳]

خاص جمعہ کے دن روزہ رکھنا کیوں منع ہے؟

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جمعہ کے دن کی کتنی فضیلت بیان فرمائی ہے اور حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ: "قل ما كان يفطر يوم الجمعة" [ترمذی، کتاب الصوم]

یعنی بہت کم ایسا ہوتا تھا کہ جمعہ کے روز آپ نے روزہ نہ رکھا ہو، بلکہ اکثر جمعہ کے دن روزہ رکھا کرتے تھے اس لیے کہ یہ فضیلت والا دن روزے کے ساتھ گذرے تو اچھا ہے، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وسلم کو دیکھ کر رفتہ رفتہ لوگوں نے بھی جمعہ کے دن روزہ رکھنا شروع کر دیا اور جمعہ کے دن کو روزے کے ساتھ اس طرح مخصوص کر دیا جس طرح یہودی لوگ ہفتہ کے دن کو مخصوص کرتے ہیں، اس لیے یہودیوں کے ہاں ہفتہ کے دن روزہ رکھا جاتا تھا اور ان کے ذہنوں میں ہفتہ کے دن روزہ رکھنے کی خاص فضیلت اور اہمیت تھی ، چنانچہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دیکھا تو آپ نے جمعہ کے دن روزہ رکھنے سے صحابہ کرام کو منع فرمادیا اور باقاعدہ حدیث میں آتا ہے کہ آپ نے فرمایا کہ جمعہ کے روز کوئی شخص روزہ نہ رکھے، یہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس لیے فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ جس دن کو اللہ تعالی نے روزہ کے لیے متعین نہیں کیا، لوگ اس کو اپنی طرف سے متعین کر دیں، اور وہ عمل دوسروں کی نظر میں ضروری نہ سمجھا جانے لگے، اس لیے آپ نے روزے کے لیے جمعہ کی تعیین کر لینے سے منع فرمادیا کیونکہ خود آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم اس کو ضروری اور لازمی نہیں سمجھتے تھے، نہ دوسروں کے لیے اس طرح کا کوئی اہتمام والتزام جاری کرانا چاہتے تھے۔ [اصلاحی خطبات ج ا ص ۲۳۰]

مجالس سیرت کب اور کیوں بدعت ہیں ؟

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت بیان کرنا کتنے اجر وفضیلت کا کام ہے، وہ لمحات جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر کسی بھی حیثیت سے ہو وہ حاصل زندگی ہے:

اوقات ہمہ بود کہ بیان بسر کرد

حقیقت میں قابل قدر اوقات تو وہی ہیں جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک میں صرف ہو جائیں، لیکن اگر کوئی شخص اس کے لیے کوئی خاص طریقہ متعین کر دے، خاص دن متعین کر دے، یا خاص مجلس متعین کر لے اور یہ کہے کہ اسی خاص دن اور صورت ہی میں اجر وثواب منحصر ہے تو یہی قیودات اس جائز اور مبارک عمل کو بدعت بنا دیں گی۔

اس کی آسان سی مثال سمجھیے کہ ہمیں نماز میں التحیات پڑھنے کے بعد یہ درود شریف پڑھنے کی تلقین کی گئی ہے: "اللهم صل على محمد وعلى آل محمد كما صليت على إبراهيم وعلى آل إبراهيم إنك حميد مجيد"

یہ درود شریف پڑھنا حضور اقدس ﷺ نے ہمیں سکھادیا، اس کو پڑھنا جائز اور مسنون ہے، اب اگر کوئی شخص دوسرا درود شریف پڑھے جس کے الفاظ اس سے مختلف ہوں، مثلاً:

"اللهم صل على محمدن النبي الأمي وعلى آله وصحبه وبارك وسلم"

پڑھے تو یہ بھی جائز ہے، کوئی گناہ نہیں، اور درود شریف پڑھنے کی سنت ادا ہوجائے گی، لیکن اگر کوئی شخص یہ کہے کہ وہ درود شریف نہ پڑھو بلکہ یہ دوسرا والا درود شریف پڑھو اور یہی پڑھنا سنت ہے تو اس صورت میں درود شریف پڑھنا جو بڑی فضیلت والا عمل تھا بدعت بن جائے گا۔ [اصلاحی خطبات ج۱ص ۲۳۴]

انگوٹھے چومنا کیوں بدعت ہے ؟

آپ نے مسجد سے اذان کی آواز سنی اور اذان کے اندر جب "أشهد أن محمدا رسول الله" سنا ، آپ کے دل میں حضور اقدس ﷺ کی محبت کا داعیہ پیدا ہوا اور محبت سے بے اختیار ہو کر آپ نے انگوٹھے چوم کر آنکھوں سے لگا لیے تو بذات خود یہ عمل کوئی گناہ اور بدعت نہیں، اس لیے کہ اس نے یہ عمل بے اختیار سرکار دو عالم ﷺ کی محبت میں کیا، اور سرکار دو عالم ﷺ کی محبت اور عظمت ایک قابل تعریف چیز ہے اور ایمان کی علامت ہے، اور ان شاء اللہ اسی محبت پر اجر و ثواب ملے گا، لیکن اگر کوئی شخص ساری دنیا کے لوگوں سے یہ کہنا شروع کردے کہ جب کبھی اذان میں "أشهد أن محمدا رسول الله" پڑھا جائے تو تم سب اس وقت اپنے انگوٹھوں کو چوما کرو اس لیے کہ اس وقت انگوٹھوں کو چومنا مستحب یا سنت ہے اور جو شخص انگوٹھوں کو نہ چومے وہ حضور اقدس ﷺ سے محبت کرنے والا نہیں ہے، تو وہی عمل جو محبت کے جذبے سے بالکل جائز تھا اب بدعت بن گیا، اس میں باریک فرق ہے کہ اگر یہ جائز عمل صحیح جذبے سے کیا جارہا ہے اور اس میں خود ساختہ کوئی قید نہیں ہے تو وہ بدعت نہیں ہے، اور جب اسی عمل کو اپنے اوپر لازم کرلیا یا اس کو سنت سمجھ لیا اور اگر کوئی دوسرا شخص وہ عمل نہ کرے تو اس کو مطعون کرنا شروع کردیا بس وہی عمل بدعت بن جائے گا۔ [اصلاحی خطبات ج۱ص۲۳۱]

یارسول اللہ ! کہنا کب اور کیوں بدعت ہے ؟

میں تو یہاں تک کہتا ہوں کہ ایک شخص کے سامنے کسی مجلس میں حضور اقدس ﷺ کا نام گرامی آیا اور اس کو بے اختیار یہ تصور آیا کہ حضور اقدس ﷺ سامنے موجود ہیں اور اس نے یہ تصور کرکے کہہ دیا کہ "الصلوۃ والسلام علیک یارسول اللہ!" اور حاضر ناظر کا عقیدہ اس کے دل میں نہیں تھا بلکہ جس طرح ایک آدمی

غائب چیز کا تصور کر لیتا ہے کہ یہ چیز میرے سامنے موجود ہے تو اس تصور کرنے میں اور یہ الفاظ کہنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔

لیکن اگر کوئی شخص یہ الفاظ اس عقیدے کے ساتھ کہے کہ حضور اقدس ﷺ یہاں پر اس طرح حاضر و ناظر ہیں جس طرح اللہ تعالی حاضر و ناظر ہیں تو یہ شرک ہو جائے گا، معاذ اللہ۔ اور اگر اس عقیدے کے ساتھ تو نہیں کہے لیکن یہ سوچا کہ "الصلوۃ والسلام علیك یارسول اللہ!" کہنا سنت ہے اور اس طرح درود پڑھنا ضروری ہے اور جو شخص اس طرح یہ الفاظ نہ کہے گویا اس کے دل میں حضور اقدس ﷺ کی محبت نہیں ہے تو پھر یہی عمل بدعت، ضلالت اور گمراہی ہے۔

لہذا عقیدے اور عمل کے ذرا سے فرق سے ایک جائز چیز ناجائز اور بدعت بن جاتی ہے، آپ جتنی بدعتیں دیکھیں گے ان میں سے اکثر ایسی ہیں جو بذات خود مباح تھیں اور جائز تھیں لیکن جب اسے فرض کی طرح لازم کر لیا گیا تو اس سے وہ بدعت بن گئیں۔ [اصلاحی خطبات ج ۱ ص ۲۳۲]

پریشانیوں میں درود شریف کی کثرت میں کیا حکمت ہے ؟

ایک مرتبہ ہمارے حضرت ڈاکٹر عبدالحئی صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے ارشاد فرمایا کہ جب تم کسی مشکل اور پریشانی میں ہو تو اس وقت درود شریف کثرت سے پڑھا کرو، پھر اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے فرمایا کہ میرے ذوق میں ایک بات آتی ہے وہ یہ کہ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کا امتی جب بھی حضور ﷺ پر درود بھیجتا ہے تو وہ درود شریف حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں فرشتے پہنچاتے ہیں، اور جا کر عرض کرتے ہیں کہ آپ کے فلاں امتی نے آپ کی خدمت میں درود شریف کا یہ ہدیہ بھیجا ہے، اور دوسری طرف زندگی میں حضور اقدس ﷺ کی سنت یہ تھی کہ جب کبھی کوئی شخص آپ کی خدمت میں کوئی ہدیہ پیش کرتا تو آپ اس کی مکافات ضرور فرماتے تھے، اس کے بدلے میں اس کے ساتھ کوئی نیکی ضرور فرماتے تھے، ان دونوں باتوں کے ملانے سے یہ سمجھ میں آتا ہے کہ جب تم حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں درود بھیجو گے تو یہ ممکن نہیں ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ اس کا بدلہ نہ دیں، بلکہ ضرور بدلہ دیں گے اور وہ بدلہ یہ ہوگا کہ آپ اس امتی کے حق میں دعا کریں گے کہ اے اللہ! یہ میرا امتی جو مجھ پر درود بھیج رہا ہے، وہ فلاں مشکل اور پریشانی میں مبتلا ہے، اے اللہ! اس کی مشکل دور فرما دیجیے، تو اس دعا کی برکت سے انشاء اللہ، اللہ تعالی تمہیں اس مشکل سے نجات عطا فرمائیں گے، اس لیے جب کبھی کوئی پریشانی آئے تو اس وقت حضور اقدس ﷺ پر درود شریف کی کثرت کریں۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۱۷۹]

درود شریف کے الفاظ کیا ہوں؟

من گھڑت درود شریف نہ پڑھیں

ایک بات اور سمجھ لیں، یہ درود شریف پڑھنا ایک عبادت بھی ہے اور ایک دعا بھی ہے جو اللہ تعالیٰ کے حکم پر کی جارہی ہے، اس لیے درود شریف کے لیے وہی الفاظ اختیار کرنے چاہئیں جو اللہ نے اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم نے بتائے ہیں، اور علماء کرام نے اس پر مستقل کتابیں لکھ دی ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کونسے کونسے درود ثابت اور منقول ہیں، مثلاً حافظ سخاویؒ نے ایک کتاب عربی میں لکھی ہے "القول البدیع فی الصلاۃ علی الحبیب الشفیع" جس میں تمام درود شریف جمع کر دیے ہیں، اسی طرح حضرت تھانویؒ نے ایک رسالہ لکھا ہے، جس کا نام ہے "زاد السعید" جس میں حضرت تھانویؒ نے درود شریف کے وہ تمام الفاظ اور صیغے جمع فرما دیے ہیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہیں، اور ان کی فضیلتیں بیان فرمائی ہیں۔

لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے اتنی کثرت سے درود شریف منقول ہونے کے باوجود لوگوں کو یہ شوق ہو گیا ہے کہ ہم اپنی طرف سے درود بنا کر پڑھیں گے، چنانچہ کسی نے "درود تاج" گھڑ لیا، کسی نے درود لکھی گھڑ لیا، وغیرہ وغیرہ، اور ان کے فضائل بھی اپنی طرف سے بنا کر پیش کر دیے کہ اس کو پڑھو گے تو یہ ہو جائے گا، حالانکہ نہ تو یہ الفاظ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، اور نہ ان کے یہ فضائل منقول ہیں، بلکہ بعض کے تو الفاظ بھی خلاف شرع ہیں، حتی کہ بعض میں شرکیہ کلمات بھی درج ہیں، اس لیے صرف وہ درود شریف پڑھنے چاہئیں جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہیں، دوسرے درود نہیں پڑھنے چاہئیں، لہٰذا حضرت تھانویؒ کی کتاب "زاد السعید" ہر شخص کو اپنے گھر میں رکھنی چاہیے اور اس میں بیان کیے ہوئے درود شریف پڑھنے چاہئیں، اسی طرح شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحبؒ کا ایک رسالہ ہے "فضائل درود شریف" وہ بھی اپنے گھر میں رکھیں اور پڑھیں اور درود شریف کو اپنے لیے بہت بڑی نعمت سمجھ کر اس کو وظیفہ بنائیں۔

[اصلاحی خطبات، ج ۶، ص ۹۴]

درود شریف میں نئے طریقے ایجاد کرنا

ویسے تو درود شریف کی کثرت افضل ترین عمل ہے، لیکن ہر کام اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو اسی وقت تک پسندیدہ ہے، جب تک ان کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو، لیکن اگر کسی کام کے اندر اپنی طرف سے کوئی طریقہ ایجاد کر لیا، اور اس کے مطابق کام شروع کر دیا، تو اس سے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو کوئی خوشی حاصل نہیں ہوگی، چنانچہ درود شریف کے بارے میں آج کل بہت سے ایسے طریقے چل پڑے ہیں جو اپنی طرف سے گھڑے ہوئے ہیں، اللہ اور اللہ کے رسول کے بتائے ہوئے طریقے نہیں ہیں، اس صورت میں انسان یہ سمجھتا ہے کہ میں اچھا کام کر رہا ہوں، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا اظہار کر رہا

ہوں، لیکن چونکہ وہ طریقہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق نہیں ہیں اس لیے حقیقت میں ان کا کوئی فائدہ حاصل نہیں ہوگا۔

مثلاً آج کل درود وسلام بھیجنے کا مطلب یہ ہوگیا کہ درود وسلام کی نمائش کرو، چنانچہ بہت سے آدمی مل کر کھڑے ہوکر لاؤڈ اسپیکر پر زور زور سے ترنم کے ساتھ پڑھتے ہیں:

الصلاة والسلام عليك يارسول الله

اور یہ سمجھتے ہیں کہ درود وسلام کے بھیجنے کا یہی طریقہ ہے، چنانچہ اگر کوئی شخص گوشہ تنہائی میں بیٹھ کر درود وسلام پڑھتا ہے تو اس کو درست نہیں سمجھتے، اور اس کی اتنی قدر ومنزلت نہیں کرتے، حالانکہ پوری سیرت طیبہ میں اور صحابہ کرام کی زندگی میں کہیں بھی یہ مروجہ طریقہ نہیں ملتا، جبکہ صحابہ کرام میں سے ہر شخص مجسم درود تھا، اور صبح سے لے کر شام تک نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر درود شریف بھیجتا تھا۔

اس سے بھی بڑی بات یہ ہے کہ اگر کوئی شخص اس طریقے میں شامل نہ ہو تو اس کو یہ طعنہ دیا جاتا ہے کہ اس کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے محبت نہیں، یہ درود وسلام کا منکر ہے وغیرہ وغیرہ، یہ طعنہ دینا اور زیادہ بری بات ہے، خوب سمجھ لیجیے، درود بھیجنے کا کوئی طریقہ اس طریقے سے زیادہ بہتر نہیں ہوسکتا جو طریقہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بتایا ہو، وہ طریقہ یہ ہے کہ ایک صحابی نے سوال کیا کہ یارسول اللہ! آپ پر درود بھیجنے کا کیا طریقہ ہے؟ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جواب میں درود ابراہیمی پڑھا اور فرمایا کہ اس طریقے سے درود شریف پڑھا کرو۔ [اصلاحی خطبات، ج۶ص ۱۰۷]

کیا درود و سلام کے وقت حضور ﷺ تشریف لاتے ہیں؟

اور یہ طریقہ اس وقت اور زیادہ غلط ہوگیا جب اس کے ساتھ ایک خراب عقیدہ بھی لگ گیا ہے، وہ یہ ہے کہ جب ہم درود شریف پڑھتے ہیں تو اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لاتے ہیں، یا آپ کی روح مبارک تشریف لاتی ہے، اور جب آپ تشریف لا رہے ہیں تو ظاہر ہے کہ آپ کی تعظیم اور تکریم میں کھڑے ہونا چاہیے، اس لیے ہم کھڑے ہوجاتے ہیں۔

بتایئے یہ بات کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لاتے ہیں، یہ کہاں سے ثابت ہے؟ کیا قرآن کریم کی آیت سے؟ یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی کسی حدیث سے؟ یا کسی صحابی کے قول سے ثابت ہے؟ کہیں بھی کوئی ثبوت نہیں، یہ حدیث جو ابھی میں نے آپ کے سامنے پڑھی، اس کو اگر غور سے پڑھ لیں تو بات سمجھ میں آجائے گی، وہ یہ کہ: "إن لله تعالى ملائكة سياحين فى الأرض يبلغونى من أمتى السلام"۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ روایت کرتے ہیں کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اللہ تعالی کے کچھ فرشتے ایسے ہیں جو ساری زمین کا چکر لگاتے رہتے ہیں، اور ان کا کام یہ ہے کہ جو شخص میری امت میں سے

مجھ پر درود و سلام بھیجتا ہے وہ مجھ تک پہنچاتے ہیں۔

دیکھیے! اس حدیث میں یہ تو بیان فرمایا کہ فرشتے مجھ تک درود شریف پہنچاتے ہیں، لیکن کسی حدیث میں یہ نہیں آیا کہ جہاں کہیں درود پڑھا جارہا ہوتا ہے تو میں وہاں پہنچ جاتا ہوں۔

پھر ذرا غور تو کریں کہ یہ درود شریف کیا چیز ہے؟ یہ درود شریف ایک ہدیہ اور تحفہ ہے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پیش کیا جارہا ہے، اور جب کسی بڑے کو کوئی ہدیہ دیا جاتا ہے تو کیا اس کو یہ کہا جاتا ہے کہ آپ ہمارے گھر تشریف لائیں، ہم آپ کی خدمت میں تحفہ پیش کریں گے؟ یا اس کے گھر بھیجا جاتا ہے؟ ظاہر ہے کہ جس شخص کے دل میں اپنے بڑے کی عزت اور احترام ہوگا، وہ کبھی اس بات کو گوارہ نہیں کرے گا کہ وہ بڑے سے یہ کہے کہ آپ ہدیہ قبول کرنے کے لیے میرے گھر آئیں، وہاں آکر ہدیہ لے لیں، بلکہ وہ شخص ہمیشہ یہ چاہے گا کہ یا تو میں خود جاکر اس کو ہدیہ پیش کروں، یا کسی اپنے نمائندے کو بھیجے گا کہ وہ ادب اور احترام کے ساتھ اس کی خدمت میں یہ ہدیہ پہنچادے، چنانچہ اللہ تعالی نے تو اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں درود شریف پہنچانے کے لیے یہ طریقہ مقرر فرمایا کہ آپ کا امتی جہاں کہیں بھی ہے، اس کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں ہدیہ پیش کرے، اور پھر اس درود شریف کو وصول کرکے آپ تک پہنچانے کے لیے اللہ تعالی نے اپنے فرشتے مقرر کر رکھے ہیں، جو نام لے کر پہنچاتے ہیں کہ آپ کے فلاں امتی نے جو فلاں جگہ رہتا ہے آپ کی خدمت میں یہ ہدیہ بھیجا ہے۔

لیکن اس کے برخلاف ہم نے اپنی طرف سے یہ طریقہ مقرر کرلیا ہے کہ ہم درود شریف وہاں تک نہیں پہنچائیں گے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہدیہ لینے کے لیے خود ہماری خدمت میں آنا ہوگا، جب آپ ہماری مسجد میں تشریف لائیں گے تو اس وقت ہم ہدیہ پیش کریں گے، حالانکہ یہ ادب اور تعظیم کے خلاف ہے کہ اپنے بڑے کو ہدیہ وصول کرنے کے لیے گھر بلایا جائے کہ یہاں آکر مجھ سے ہدیہ وصول کرلو۔

لہذا یہ تصور کہ جب ہم یہاں بیٹھ کر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں درود بھیجتے ہیں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس درود شریف کو لینے کے لیے خود تشریف لاتے ہیں، اور چونکہ خود ہماری محفل میں تشریف لاتے ہیں تو ہم ان کی تعظیم کے لیے کھڑے ہوجاتے ہیں، یہ تصور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت شان کے بالکل مطابق نہیں، اس لیے درود شریف بھیجنے کا یہ تصور اور یہ طریقہ درست نہیں، جو طریقہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بتایا ہے وہ طریقہ اختیار کرنا چاہیے۔

آج کل فرقہ بندیاں ہوگئی ہیں، اور اس فرقہ بندیوں کی وجہ سے یہ صورت حال ہوگئی ہے کہ اگر کوئی صحیح بات کہے تو بھی کان اس کو سننے کے لیے تیار نہیں ہوتے، یہ بات میں کوئی عیب جوئی کے طور پر نہیں کہہ رہا ہوں، بلکہ دردمندی کے ساتھ، دل سوزی کے ساتھ حقیقت حال بیان کرنے کے لیے کہہ رہا ہوں، اس لیے اس حقیقت کو سمجھنے کی ضرورت ہے، محض طعنہ دے دینا کہ فلاں فرقہ تو درود شریف کا منکر ہے، ان کے دل میں تو

حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت نہیں ہے، اس طرح طعنہ دینے سے بات نہیں بنتی، اگر ذرا کان کھول کر بات سنی جائے اور یہ دیکھا جائے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی محبت کا تقاضا کیا ہے؟ تب جا کر حقیقت حال واضح ہوگی۔

[اصلاحی خطبات، ج٦ص١٠٨]

حضور اقدس ﷺ پر درود وسلام کا صحیح طریقه اور حاضر و ناظر کے عقیدے سے پکارنا

ہمیں یہ حکم دیا گیا کہ جب تم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے روضہ اقدس پر جاؤ تو وہاں جا کر کہو:

"الصلاۃ والسلام علیك یارسول اللہ"

یعنی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خطاب کر کے سلام پیش کرو، لیکن جب تم روضہ اقدس سے دور ہو تو پھر تم یوں کہو: اللھم صلی علی محمد و علی ال محمد

لہذا اس آیت کی رو سے روضہ اقدس سے دور ہونے کی صورت میں "الصلوۃ والسلام علیک یا رسول اللہ" کہنا درست نہیں، کیونکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دور سے پکارنا بے ادبی کی بات ہے اور یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم کے خلاف ہے۔

خاص طور پر "الصلاۃ والسلام علیك یارسول اللہ" کے الفاظ سے اس عقیدے سے پکارنا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہر جگہ موجود ہیں، اور آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حاضر وناظر ہیں، اللہ بچائے، یہ عقیدہ انسان کو بعض اوقات شرک تک پہنچا دیتا ہے، اور اگر اس عقیدے سے یہ الفاظ کسی نے کہے کہ جب ہم "الصلوۃ والسلام علیک یارسول اللہ" کہہ کر درود بھیجتے ہیں تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح مبارک تشریف لاتی ہے، خوب سمجھ لیجیے یہ بات احادیث میں کہیں ثابت نہیں، دوسری طرف یہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعظیم کے بھی خلاف ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دور سے سلام کریں اور سلام لینے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خود تشریف لائیں، آپ ذرا اندازہ کریں کہ ہم تو یہاں بیٹھ کر پکار رہے ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روح مبارک ہم سے سلام لینے کے لیے تشریف لائے، یہ کوئی ادب کی بات ہے؟ یہ کوئی تعظیم اور محبت کی بات ہے؟ صحیح طریقہ وہ ہے جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خود بیان فرما دیا، وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص میری قبر پہ آ کر مجھے سلام کرے گا، میں اس کا جواب دوں گا، اور جو شخص دور سے مجھ پر درود بھیجے گا تو وہ درود مجھ تک فرشتوں کے ذریعہ پہنچایا جاتا ہے کہ آپ کے فلاں امتی نے درود شریف کا یہ تحفہ پیش کیا ہے، یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے جو حدیث میں منقول ہے۔

لہذا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ظاہری زندگی میں جس طرح یہ حکم تھا کہ جو شخص بھی آپ سے خطاب کرے وہ قریب جا کر کرے، دور سے نہ کرے، اسی طرح آپ کی وفات کے بعد جبکہ آپ کو قبر مبارک میں دوسری حیات طیبہ حاصل ہے، وہاں بھی یہی حکم ہے کہ قریب جا کر ان الفاظ سے سلام کرو کہ:

"الصلاة والسلام علیك یارسول الله"

لیکن دور سے کہنا ہے تو درود شریف پڑھو، ان الفاظ سے سلام کہنا آپ کی تعظیم اور ادب کے خلاف ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج١٦، ٢٥٧]

نبی کریم ﷺ کے اسم گرامی کے ساتھ "صلعم" یا صرف "ص" لکھنا درست نہیں

بہت سے حضرات کو صلی اللہ علیہ وسلم بھی طویل لگتا ہے، معلوم نہیں حضور اقدس ﷺ کا اسم گرامی لکھنے کے بعد ﷺ لکھنے میں ان کو گھبراہٹ ہوتی ہے، یا وقت زیادہ لگتا ہے، یا روشنائی زیادہ خرچ ہوتی ہے، چنانچہ ﷺ لکھنے کے بجائے "صلعم" لکھ دیتے ہیں، یا بعض لوگ صرف "ص" لکھ دیتے ہیں، دنیا کے دوسرے سارے کاموں میں اختصار کی فکر نہیں ہوتی، سارا اختصار حضور اقدس ﷺ کے نام کے ساتھ درود شریف لکھنے میں آتا ہے، یہ کتنی بڑی محرومی اور بخل کی بات ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج٦، ص٨٨]

جشن عید میلاد النبی حقیقت اور پس منظر!

١٢ ربیع الاول ہمارے معاشرے، ہمارے ملک اور خاص کر برصغیر میں باقاعدہ ایک جشن اور ایک تہوار کی شکل اختیار کر گئی ہے، جب ربیع الاول کا مہینہ آتا ہے تو سارے ملک میں سیرت النبی اور میلاد النبی کا ایک غیر متناہی سلسلہ شروع ہو جاتا ہے، ظاہر ہے کہ حضور نبی کریم ﷺ کا مبارک تذکرہ اتنی بڑی سعادت ہے کہ اس کے برابر کوئی اور سعادت نہیں ہو سکتی، لیکن مشکل یہ ہے کہ ہمارے معاشرے میں آپ کے مبارک تذکرہ کو اس ماہ ربیع الاول کے ساتھ بلکہ صرف ١٢ ربیع الاول کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے اور یہ کہا جاتا ہے کہ چونکہ ١٢ ربیع الاول کو حضور نبی کریم ﷺ کی ولادت ہوئی اس لیے آپ کا یوم ولادت منایا جائے گا اور اس میں آپ کی سیرت اور ولادت کا بیان ہوگا، لیکن یہ سب کچھ کرتے وقت ہم یہ بات بھول جاتے ہیں کہ جس ذات اقدس کی سیرت کا یہ بیان ہو رہا ہے اور جس ذات اقدس کی ولادت کا یہ جشن منایا جا رہا ہے، خود اس ذات اقدس کی تعلیم کیا ہے؟ اور اس تعلیم کے اندر اس قسم کا تصور موجود ہے یا نہیں؟

اس میں کسی مسلمان کو شبہ نہیں ہو سکتا کہ آنحضرت ﷺ کا اس دنیا میں تشریف لانا، تاریخ انسانیت کا اتنا عظیم واقعہ ہے کہ اس سے زیادہ عظیم، اس سے زیادہ پر مسرت، اس سے زیادہ مبارک اور مقدس واقعہ اس روئے زمین پر پیش نہیں آیا، انسانیت کو نبی کریم ﷺ کی تعلیمات کا نور ملا، آپ کی مقدس شخصیت کی برکات نصیب ہوئیں، یہ اتنا بڑا واقعہ ہے کہ تاریخ کا اور کوئی واقعہ اتنا بڑا نہیں ہو سکتا، اور اگر اسلام میں کسی کی یوم پیدائش منانے کا کوئی تصور ہوتا تو سرکار دو عالم ﷺ کی یوم پیدائش سے زیادہ کوئی دن اس بات کا مستحق نہیں تھا کہ اس کو منایا جائے اور اس کو عید قرار دیا جائے، لیکن نبوت کے بعد آپ ﷺ ٢٣ سال اس

دنیا میں تشریف فرما رہے اور ہر سال ربیع الاول کا مہینہ آتا تھا، لیکن نہ صرف یہ کہ آپ نے ۱۲ ربیع الاول کو یوم پیدائش نہیں منایا بلکہ آپ کے کسی صحابی کے حاشیہ خیال میں بھی یہ نہیں گذرا کہ چونکہ ۱۲ ربیع الاول آپ کی پیدائش کا دن ہے، اس لیے اس کو کسی خاص طریقے سے منانا چاہیے۔

اس کے بعد سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا سے تشریف لے گئے اور تقریباً سوا لاکھ صحابہ کرام کو اس دنیا میں چھوڑ گئے، وہ صحابہ کرام ایسے تھے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک سانس کے بدلے اپنی پوری جان نچھاور کرنے کے لیے تیار تھے، آپ کے جانثار، آپ پر فدا کار، آپ کے عاشق زار تھے، لیکن کوئی ایک صحابی ایسا نہیں ملے گا جس نے اہتمام کر کے یہ دن منایا ہو، یا اس دن کوئی جلسہ منعقد کیا ہو، یا کوئی جلوس نکالا ہو، یا کوئی چراغاں کیا ہو، یا کوئی جھنڈیاں سجائی ہوں، صحابہ کرام نے ایسا کیوں نہیں کیا؟ اس لیے کہ اسلام کوئی رسموں کا دین نہیں ہے، جیسا کہ دوسرے اہل مذاہب ہیں کہ ان کے ہاں چند رسومات ادا کرنے کا نام دین ہے، جب وہ رسمیں ادا کر لیں تو بس پھر چھٹی ہو گئی، بلکہ اسلام عمل کا دین ہے، اور یہ تو جنم کا روگ ہے، یہ پیدائش سے لے کر مرتے دم تک ہر انسان اپنی اصلاح کی فکر میں لگا رہے اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت کی اتباع میں لگا رہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۲، ص ۱۵۲]

اللہ تعالی انسان کی نفسیات اور اس کی کمزوریوں سے واقف ہیں، اللہ تعالی یہ جانتے تھے کہ اگر اس کو ذرا سا شوشہ دیا گیا تو یہ کہاں سے کہاں بات کو پہنچائے گا، اس واسطے کسی کے دن منانے کا کوئی تصور ہی نہیں رکھا، جس طرح کرسمس کے ساتھ ہوا، اسی طرح یہاں بھی ہوا کہ کسی بادشاہ کے دل میں خیال آ گیا کہ جب عیسائی لوگ حضرت عیسی علیہ السلام کا یوم پیدائش مناتے ہیں تو ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم پیدائش کیوں نہ منائیں؟ چنانچہ یہ کہہ کر اس بادشاہ نے میلاد کا سلسلہ شروع کر دیا، شروع میں یہاں بھی یہی ہوا کہ میلاد ہوا جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کا بیان ہوا اور کچھ نعتیں پڑھی گئیں، لیکن اب آپ دیکھ لیں کہ کہاں تک نوبت پہنچ چکی ہے۔

یہ تو حضرت اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا معجزہ ہے کہ چودہ سو سال گذرنے کے باوجود الحمدللہ وہاں تک ابھی نوبت نہیں پہنچی جس طرح عیسائیوں کے ہاں پہنچ چکی ہے، لیکن اب بھی دیکھ لیں کہ سڑکوں پر کیا ہو رہا ہے! کس طرح روضہ اقدس کی شبیہیں کھڑی کی ہوئی ہیں! کس طرح کعبہ شریف کی شبیہیں کھڑی کی ہوئی ہیں! کس طرح لوگ اس کے ارد گرد طواف کر رہے ہیں! کس طرح اس کے چاروں طرف ریکارڈنگ ہو رہی ہے! کس طرح چراغاں کیا جا رہا ہے! اور کس طرح جھنڈیاں سجائی جا رہی ہیں! معاذ اللہ، ایسا معلوم ہو رہا ہے کہ یہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا کوئی جشن نہیں ہے بلکہ جیسے ہندوؤں اور عیسائیوں کے عام جشن ہوتے ہیں اس طرح کا کوئی جشن ہے اور رفتہ رفتہ ساری خرابیاں اس میں جمع ہو رہی ہیں۔

سب سے بڑی خرابی یہ ہے کہ یہ سب کچھ دین کے نام پر ہو رہا ہے اور یہ سب کچھ حضور اقدس

صلی اللہ علیہ وسلم کے مقدس نام پر ہو رہا ہے اور سب کچھ یہ سوچ کر ہو رہا ہے کہ یہ بڑے اجر و ثواب کا کام ہے، اور یہ خیال کر رہے ہیں کہ آج ۱۲ ربیع الاول کو چراغاں کر کے اور اپنی عمارتوں کو روشن کر کے اور اپنے راستوں کو سجا کر ہم نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ محبت کا حق ادا کر دیا اور اگر ان سے پوچھا جائے کہ آپ دین پر عمل نہیں کرتے؟ تو جواب دیتے ہیں کہ ہمارے ہاں تو میلاد ہوتا ہے، ہمارے ہاں تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی یوم پیدائش پر چراغاں ہوتا ہے، اس طرح دین کا حق ادا ہو رہا ہے، حالانکہ یہ طریقہ اسلام کا طریقہ نہیں ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا طریقہ نہیں ہے، آپ کے صحابہ کرام کا طریقہ نہیں ہے اور اگر اس طریقے میں خیر و برکت ہوتی تو ابو بکر صدیق، فاروق اعظم، عثمان غنی اور علی مرتضی رضی اللہ عنہم اس سے چوکنے والے نہیں تھے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۲، ص ۱۵۵]

بزرگان محترم و برادران عزیز! ربیع الاول کا مہینہ چل رہا ہے، اس لئے خیال آیا کہ اس مہینے سے متعلق کچھ باتیں آپ حضرات کی خدمت میں عرض کی جائیں، جب ربیع الاول کا مہینہ آتا ہے تو ہمارے ملک میں سیرت النبی کی محفلوں کی ایک بہار آجاتی ہے، گلی گلی، محلے محلے سیرت طیبہ کے اجتماعات منعقد ہوتے ہیں، اور ان میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کا بیان ہوتا ہے، حضور اقدس، سید الاولین والآخرین، رحمۃ للعالمین صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک جس وقت بھی ہو، وہ انسان کی عظیم سعادت، اور بڑی عظیم خوش نصیبی ہے، اور بڑے اونچے درجے کی عبادت ہے، اس لئے جو مسلمان ان محفلوں میں شریک ہوتے ہیں، وہ عبادت اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے مبارک تذکرے کو سننے کے لئے جمع ہوتے ہیں۔

لیکن اس سلسلے میں چند باتیں سمجھنے کی ہیں، پہلی بات تو یہ ہے کہ یہ اجتماعات عام طور پر ربیع الاول کے مہینے میں اس لئے منعقد کئے جاتے ہیں کہ اس مہینے میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی، اور اسی مہینے میں آپ اس دنیا سے تشریف لے گئے، جس دن حضور اقدس سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم اس دنیا میں تشریف لائے تھے، بلا خوف تردید کہا جاسکتا ہے کہ کائنات کی ابتدائی تخلیق سے لے کر قیامت تک اس سے بڑا عظیم سعادت کا دن کوئی اور نہیں، اس لئے کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس دن اس کائنات کو اپنی تخلیق کا مقصد حاصل ہوا، اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تشریف آوری سے پوری انسانیت کو ہدایت کا راستہ ملا، لہٰذا کسی صاحب ایمان کے لئے اس سے بڑا کوئی اور دن خوشی کا نہیں ہوسکتا۔

اور اگر اسلام میں کسی کا یوم ولادت منانا مشروع ہوتا، اور اسلام اس کو پسند کرتا تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولاست سے زیادہ کوئی دن ایسا نہیں تھا، جو عید منانے کا مستحق ہو، لیکن اللہ جل شانہ نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو دین ہمیں عطا فرمایا، اس دین کی عجیب خاصیتیں ہیں، اس دین کے اندر دوسرے مذاہب کے برعکس یوم ولادت منانے کا کوئی تصور نہیں، پورے قرآن کریم میں، پورے ذخیرہ حدیث میں، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات میں، صحابہ کرام کے تعامل میں، تابعین کے طرز عمل

میں کسی کے یوم ولادت، یا یوم وفات منانے کا کوئی ذکر نہیں۔

وجہ اس کی یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو دین ہمیں عطا فرمایا ہے، وہ رسمیات سے بالاتر ہے، اس میں دین کے پیروکاروں کو یہ بات سکھائی گئی ہے کہ اصل کام وہ ہے جس کے لئے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم تشریف لائے، اگر تم وہ کام کرتے ہو، اور آپ کی تعلیمات کو اپنی زندگی میں اپناتے ہو، تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم سے تم محبت رکھنے والے ہو، اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی برکات تمہیں حاصل ہونے والی ہیں، اور اگر تم آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو پس پشت ڈال دیا ہے، تو تم خواہ کتنے یوم ولادت مناتے رہو، اس کے ذریعہ تمہاری نجات نہیں ہوگی۔

دوسرے مذاہب میں یہ ہوا کہ انہوں نے اپنے مذہبی پیشواؤں کا یوم ولادت منانا شروع کیا تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ جس دن ان کا یوم ولادت منایا، اس دن کے فضائل ومناقب بیان کردیے، ان کے حالات زندگی پر ایک تقریر ہوگئی، اور پھر جب لوگ اس محفل سے اٹھے تو اپنے دامن جھاڑ کر اٹھے، دیکھئے! حضرت عیسی علیہ السلام کی یوم پیدائش کا دن عیسائی لوگ ''کرسمس'' کے نام سے ۲۵ ردسمبر کو ہر سال مناتے ہیں، اس دن کے منانے کا سلسلہ بھی حضرت عیسی علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے تقریباً تین سو یا چار سو سال بعد شروع ہوا، اس سے پہلے چار سو سال تک حضرت عیسی علیہ السلام کے یوم پیدائش منانے کا کوئی تصور نہیں تھا، چار سو سال کے بعد کسی بادشاہ نے اس کو شروع کیا، اور یہ بھی صحیح پتہ نہیں کہ حضرت عیسی علیہ السلام کی پیدائش ۲۵ ردسمبر کو ہوئی تھی؟ یا کسی اور دن ہوئی تھی؟ شروع میں یہ کہا گیا کہ یہ دن اس لئے منایا جارہا ہے تا کہ آپ کی یاد منائی جائے، اور آپ کی تعلیمات کو تازہ کیا جائے، لیکن رفتہ رفتہ وہ خوشی کا دن اور عید کا دن بن گیا، اور جب عید کا دن بن گیا، اور لوگوں کے خوشی منانے کے نئے نئے طریقے ایجاد کئے تو اس میں رقص وسرود اور اس میں گانا بجانا، اس میں موسیقی، اور دنیا بھر کی ساری خرافات اس میں شامل ہوگئیں۔

اسلام چونکہ دین فطرت ہے، اور انسان کے نفس کی چوریوں سے واقف ہے، اس وجہ سے اسلام میں جو دو عیدیں رکھی گئی ہیں، ایک عید الفطر، اور ایک عید الاضحیٰ، یہ دونوں عیدیں نہ کسی کا یوم ولادت ہے، اور نہ ہی کسی کا یوم وفات ہے، بلکہ عید الفطر ایک ایسے موقع پر رکھی گئی ہے جب مسلمان ایک عظیم عبادت یعنی رمضان کے روزوں سے فارغ ہوتے ہیں، اور عید الاضحیٰ اس موقع پر رکھی گئی ہے جب دوسری عظیم الشان عبادت یعنی حج سے فارغ ہوتے ہیں، اس کے ذریعے یہ بتلانا مقصود ہے کہ تمہیں خوشی ماننے کا حق درحقیقت تمہارے اس عمل پر ہے جو تم انجام دے رہے ہو، تمہارے آباؤ اجداد نے جو کارنامے انجام دیے، بیشک ان کی یاد اس لحاظ سے ضرور منانی چاہئے تا کہ ان کی تقلید کی جائے، لیکن صرف ان کی یاد منانے پر اکتفا کرتے ہوئے ہاتھ پر ہاتھ رکھ کر بیٹھ جانا، یہ اسلام میں پسندیدہ نہیں ہے۔

چنانچہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ میں ہر سال ماہ ربیع الاول آتا تھا، لیکن

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی یہ دن نہیں منایا، اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین، جن کے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ عشق ومحبت کا حال یہ تھا کہ کافروں نے اس بات کی گواہی دی کہ ہم نے جا کر دیکھا کہ جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وضو کرتے ہیں تو آپ کے وضو کا پانی زمین پر نہیں گرتا، کوئی صحابی آ کر اس پانی کو اپنے ہاتھ میں لے لیتا ہے، کوئی صحابی اس کو منہ پر مل لیتا ہے، کوئی اپنے جسم پر مل لیتا ہے، ایسے جانثار صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین تھے، اور حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے اس دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد نوے سال تک صحابہ کرام دنیا میں رہے، اس نوے سال کے عرصہ میں ہر سال ماہ ربیع الاول آتا تھا، کسی صحابی نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا یوم ولادت نہیں منایا۔

کیوں؟ اس لئے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت وتعلیمات ہر وقت ان کے سامنے تھی، کوئی دن ان کے لئے خاص نہیں تھا، بلکہ ہر دن رات ان کے سامنے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کا چرچا رہتا تھا، اسی کا ذکر اور اسی کی فکر تھی، اور اسی پر عمل کرنے کی توفیق تھی، اسی راستے میں جدوجہد تھی، لیکن کوئی خاص دن مقرر نہیں تھا، اگر اسلام میں کسی کے یوم ولادت منانے کا کوئی تصور ہوتا تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے یوم ولادت سے زیادہ کوئی دن اس کا مستحق نہیں تھا، لیکن چونکہ اسلام میں اس کا کوئی تصور ہے ہی نہیں، اس لئے صحابہ کرام نے اس دن کے منانے کا کوئی اہتمام نہیں کیا، بلکہ صحابہ کرام کے بارہ مہینے، اور مہینے کے تیس دن، اور دن کے چوبیس گھنٹے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں ڈھلے ہوئے تھے۔

عرض کرنا یہ ہے کہ یہ تصور کرنا کہ جس طرح عیسائی لوگ ''کرسمس'' کا دن مناتے ہیں، اسی طرح ہم مسلمان بھی عید میلاد النبی منالیں، یاد رکھئے! اسلام کا یہ طریقہ نہیں، ہاں! جو مطلوب ہے وہ یہ کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت اور تعلیمات کو ہر وقت تازہ رکھو، ربیع الاول کی خصوصیت نہیں، بلکہ ہر سال کے ہر مہینے میں، اور مہینے کے ہر دن میں، اور دن کے ہر گھنٹے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات تازہ رکھو، اور اس پر عمل کی کوشش کرو۔ لہٰذا ہمارے معاشرے میں یہ جو ۱۲/ربیع الاول کا جو تصور پھیل گیا ہے، یہ شریعت کے اصول کے مطابق نہیں۔ [خطبات عثمانی، ج ۳، ص ۱۹۷ تا ۲۰۳]

کرسمس کی ابتداکس طرح ہوئی؟

یوم پیدائش منانے کا یہ تصور ہمارے یہاں عیسائیوں سے آیا ہے، حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا یوم پیدائش کرسمس کے نام سے ۲۵ دسمبر کو منایا جاتا ہے، تاریخ اٹھا کر دیکھیں گے تو معلوم ہوگا کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے آسمان پر اٹھائے جانے کے تقریباً تین سو سال تک حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے یوم پیدائش منانے کا کوئی تصور نہیں تھا، آپ کے حواریین اور صحابہ کرام میں سے کسی نے یہ دن نہیں منایا، تین سو سال کے بعد کچھ

لوگوں نے یہ بدعت شروع کردی اور یہ کہا کہ ہم حضرت عیسی علیہ السلام کا یوم پیدائش منائیں گے اس وقت بھی جو لوگ دین عیسوی پر پوری طرح عمل پیرا تھے انہوں نے ان سے کہا کہ تم نے یہ سلسلہ کیوں شروع کیا ہے ؟ حضرت عیسی علیہ السلام کی تعلیمات میں تو یوم پیدائش منانے کا کوئی ذکر نہیں ہے، انہوں نے جواب دیا کہ اس میں کیا حرج ہے؟ یہ کوئی ایسی بری بات تو نہیں ہے، بس ہم اس دن جمع ہوجائیں گے اور حضرت عیسی علیہ السلام کا ذکر کریں گے، ان کی تعلیمات کو یاد دلائیں گے اور اس کے ذریعہ سے لوگوں میں ان کی تعلیمات پر عمل کرنے کا شوق پیدا ہوگا، اس لیے ہم کوئی گناہ کا کام تو نہیں کر رہے ہیں، چنانچہ یہ کہہ کر یہ سلسلہ شروع کر دیا۔

چنانچہ شروع شروع میں تو یہ ہوا کہ جب ۲۵ دسمبر کی تاریخ آتی تو چرچ میں ایک اجتماع ہوتا، ایک پادری صاحب کھڑے ہو کر حضرت عیسی علیہ السلام کی تعلیمات اور آپ کی سیرت بیان کر دیتے، اس کے بعد اجتماع برخواست ہو جاتا، گویا کہ بے ضرر اور معصوم طریقے پر یہ سلسلہ شروع ہوا، لیکن کچھ عرصہ گذرنے کے بعد انہوں نے سوچا کہ ہم پادری کی تقریر تو کرا دیتے ہیں، مگر وہ خشک قسم کی تقریر ہوتی ہے، جس کا نتیجہ یہ ہے کہ نوجوان اور شوقین مزاج لوگ تو اس میں شریک نہیں ہوتے ، اس لیے اس کو ذرا دلچسپ بنانا چاہیے، تا کہ لوگوں کے لیے دل کش ہو اور اس کو دلچسپ بنانے کے لیے اس میں موسیقی ہونی چاہیے، چنانچہ اس کے بعد موسیقی پر نظمیں پڑھی جانے لگیں، پھر انہوں نے دیکھا کہ موسیقی سے بھی کام نہیں چل رہا ہے، اس لیے اس میں ناچ گانا بھی ہونا چاہیے، چنانچہ پھر ناچ گانا بھی اس میں شامل ہو گیا، پھر سوچا کہ اس میں کچھ تماشے بھی ہونے چاہئیں، چنانچہ ہنسی مذاق کے کھیل تماشے شامل ہو گئے، چنانچہ ہوتے ہوتے یہ ہوا کہ وہ کرسمس جو حضرت عیسی علیہ السلام کی تعلیمات بیان کرنے کے نام پر شروع ہوا تھا، اب وہ عام جشن کی طرح ایک جشن بن گیا، اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ناچ گانا اس میں، موسیقی اس میں، شراب نوشی اس میں، قمار بازی اور جوا اس میں، گویا کہ اب دنیا بھر کی ساری خرافات کرسمس میں شامل ہو گئیں اور حضرت عیسی علیہ السلام کی تعلیمات پیچھے رہ گئیں۔

اب آپ دیکھ لیجیے کہ مغربی ممالک میں جب کرسمس کا دن آتا ہے تو اس میں کیا طوفان برپا ہوتا ہے، اس ایک دن میں اتنی شراب پی جاتی ہے کہ پورے سال اتنی شراب نہیں پی جاتی، اس ایک دن میں اتنے حادثات ہوتے ہیں کہ پورے سال اتنے حادثات نہیں ہوتے، اسی ایک دن میں عورتوں کی عصمت دری اتنی ہوتی ہے کہ پورے سال اتنی نہیں ہوتی، اور یہ سب کچھ حضرت عیسی علیہ السلام کے یوم پیدائش کے نام پر ہو رہا ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۲، ص ۱۵۳]

مروجه محافل میلاد کیوں صحیح نہیں؟

اول تو تاریخی اعتبار سے یہ بات مشکوک ہے کہ سرکار دو عالم ﷺ کی ولادت یا وفات ۱۲ ربیع الاول کو ہوئی تھی، اس لئے کہ بہت سے مؤرخین اور محققین نے کہا ہے کہ ۱۲ ربیع الاول کی تاریخ درست نہیں،

بلکہ بعض حضرات نے کہا ۱۳ / ربیع الاول، اور بعض نے کہا ۲ / ربیع الاول، اور بعض حضرات نے کہا کہ یکم ربیع الاول بنتی ہے، بہر حال! روایتوں میں اختلاف ہے، اس سے یہ بھی پتہ چلا کہ صحابہ کرام نے اور امت محمدیہ نے تاریخ کو محفوظ کرنے کا اہتمام اس لئے نہیں کیا کہ یوم ولادت منانے کا اس وقت تک کوئی تصور ہی نہیں تھا، لیکن بہر حال! نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر مبارک کسی وقت بھی ہو، وہ ایک عظیم سعادت اور ایک عظیم عبادت ہے، یہ مت سمجھو کہ یہ عبادت ربیع الاول کے ساتھ خاص ہے، بلکہ جس وقت بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر ہو وہ انسان کے لئے سعادت ہی سعادت ہے، عبادت ہی عبادت ہے۔ [خطبات عثمانی، ج ۳، ص ۲۰۳]

نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر مبارک انسان کی عظیم ترین سعادت ہے اور اس روئے زمین پر کسی بھی ہستی کا تذکرہ اتنا باعث اجر وثواب، اتنا باعث خیر وبرکت نہیں ہوسکتا جتنا سرور کائنات حضرت محمد مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا تذکرہ ہوسکتا ہے، لیکن تذکرہ کے ساتھ ساتھ ان سیرت طیبہ کی محفلوں میں ہم نے بہت سی ایسی غلط باتیں شروع کردی ہیں جن کی وجہ سے ذکر مبارک کا صحیح فائدہ اور صحیح ثمرہ ہمیں حاصل نہیں ہورہا ہے۔

ان غلطیوں میں سے ایک غلطی یہ ہے کہ ہم نے سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر مبارک صرف ایک مہینے یعنی ربیع الاول کے ساتھ خاص کردیا ہے، اور ربیع الاول کے بھی صرف ایک دن اور ایک دن میں بھی صرف چند گھنٹے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ذکر کرکے ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا حق ادا کردیا ہے، یہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیرت طیبہ کے ساتھ اتنا بڑا ظلم ہے کہ اس سے بڑا ظلم سیرت طیبہ کے ساتھ کوئی اور نہیں ہوسکتا۔

صحابہ کرامؓ کی پوری زندگی میں کہیں یہ بات آپ کو نظر نہیں آئے گی اور نہ آپ کو اس کی ایک مثال ملے گی کہ انہوں نے ۱۲ ربیع الاول کو خاص جشن منایا ہو، عید میلاد النبی کا اہتمام کیا ہو، یا اس خاص مہینے کے اندر سیرت طیبہ کی محفلیں منعقد کی ہوں، اس کے بجائے صحابہ کرام کا طریقہ یہ تھا کہ ان کی زندگی کا ایک ایک لمحہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تذکرہ کی حیثیت رکھتا تھا، جہاں دو صحابہ لے انہوں نے آپ کی احادیث اور آپ کے ارشادات، آپ کی دی ہوئی تعلیمات کا آپ کی حیات طیبہ کے مختلف واقعات کا تذکرہ شروع کردیا، اس لیے ان کی ہر محفل سیرت طیبہ کی محفل تھی، ان کی ہر نشست سیرت طیبہ کی نشست تھی، اس کا نتیجہ یہ تھا کہ ان کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ محبت اور تعلق کے اظہار کے لیے رسمی مظاہروں کی ضرورت نہ تھی کہ عید میلاد النبی منائی جارہی ہے اور جلوس نکالے جارہے ہیں، جلسے ہورہے ہیں، چراغاں کیا جارہا ہے، اس قسم کے کاموں کی صحابہ کرام، تابعین اور تبع تابعین کے زمانے میں ایک مثال بھی پیش نہیں کی جاسکتی۔

بات درحقیقت یہ تھی کہ رسمی مظاہرہ کرنا صحابہ کرام کی عادت نہیں تھی، وہ اس کی رُوح کو اپنائے ہوئے تھے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس دنیا میں کیوں تشریف لائے تھے؟ آپ کا کیا پیغام تھا؟ آپ کی کیا تعلیم تھی؟ آپ دنیا سے کیا چاہتے تھے؟ اس کام کے لیے انہوں نے اپنی ساری زندگی کو وقف کردیا، لیکن اس قسم کے رسمی مظاہرے نہیں کیے، اور یہ طریقہ ہم نے غیر مسلموں سے لیا ہے، ہم نے دیکھا کہ غیر مسلم اقوام

اپنے بڑے بڑے لیڈروں، کے دن منایا کرتی ہیں، اور ان دنوں میں خاص جشن اور خاص محفل منعقد کرتی ہیں اور ان کی دیکھا دیکھی ہم نے سوچا کہ ہم بھی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے تذکرہ کے لیے عید میلاد النبی منائیں گے، اور یہ نہیں دیکھا کہ جن لوگوں کے نام پر کوئی دن منایا جاتا ہے، درحقیقت یہ وہ لوگ ہوتے ہیں جن کی زندگی کے تمام لمحات کو قابل اقتدا اور قابل تقلید نہیں سمجھا جا سکتا، بلکہ یا تو وہ سیاسی لیڈر ہوتا ہے، یا کسی اور دنیاوی معاملے میں لوگوں کا قائد ہوتا ہے، تو صرف اس کی یاد تازہ کرنے کے لیے اس کا دن منایا گیا، لیکن اس قائد کے بارے میں یہ نہیں کہا جا سکتا کہ اس کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قابل تقلید ہے، اور اس نے دنیا میں جو کچھ کیا، وہ صحیح کیا ہے، وہ معصوم اور غلطیوں سے پاک تھا، لہٰذا اس کی ہر چیز کو اپنایا جائے، ان میں سے کسی کے بارے میں بھی یہ نہیں کہا جا سکتا۔ [اصلاحی خطبات، ج ۲، ص ۱۷۶]

محفل سیرت النبی ﷺ اور خلاف سنت کام

لیکن نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کی محفل کے کچھ آداب ہیں، ان آداب کا لحاظ رکھنا ضروری ہے، اس لئے کہ یہ کسی سیاسی لیڈر کا تذکرہ نہیں ہے، یہ کسی دنیاوی رہنما کا تذکرہ نہیں ہے، بلکہ سید الاولین والآخرین، رحمۃ للعالمین اور باعث تخلیق کائنات، سرکار دو عالم جناب محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر مبارک ہے، لہٰذا اس کا پہلا ادب یہ ہے کہ جس مجلس میں یہ تذکرہ ہو رہا ہے، وہ مجلس کم از کم سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کی آئینہ دار ہو، اور اس مجلس میں کوئی کام آپ کی تعلیمات کے خلاف نہ ہو، افسوس یہ ہے کہ ہمارے ماحول میں ان آداب کا لحاظ نہیں رکھا جاتا، سیرت طیبہ کے تذکرہ کی محفل ہے، اور اس میں مرد بھی بیٹھے ہیں، اور بے پردہ خواتین بھی موجود ہیں، گویا کہ مخلوط اجتماع ہے، مرد وعورت کا اختلاط اور آزادانہ میل جول جس کو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے منع فرمایا تھا، اور اس پر پابندیاں عائد فرمائی تھیں، وہ کام عین سیرت طیبہ کی محفل میں ہو رہا ہے، یہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے ساتھ کتنا بڑا ظلم ہے، اس کے ذریعہ سیرت طیبہ کی محفل کو داغ دار کیا جا رہا ہے، اور سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات کو پامال کیا جا رہا ہے، اس سے بڑی گستاخی نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شان میں اور کیا ہوگی؟

اسی طرح سیرت طیبہ کی محفل منعقد ہے، لیکن اس کے انتظامات اور کاموں کے نتیجے میں فرض نمازیں چھوڑی جا رہی ہیں، نماز کا وقت ہے، اذان ہو چکی ہے، مسجد میں جماعت تیار ہے، اور محفل کے منتظمین جماعت سے غافل ہیں، اور اس کے انتظامات میں لگے ہیں، اور نمازیں فوت ہو رہی ہیں، بتائیے! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جماعت سے نماز پڑھنے کی کتنی تاکید فرمائی ہے، لیکن ہم آپ کے مبارک تذکرہ کے لئے محفلیں منعقد کریں، اور اس میں نمازیں قضا کریں، اور نماز کی جماعت چھوڑ دیں، یہ کتنا بڑا ظلم ہے اور کتنی بڑی گستاخی ہے۔

سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے تصویروں کو منع فرمایا تھا، لیکن سیرت طیبہ کی محفل میں تصویریں بنائی جارہی ہیں، تو سیرت طیبہ کی عین محفل میں آپ کے حکم کی خلاف ورزی کی جارہی ہے، لہٰذا سیرت طیبہ کی محفل کا پہلا ادنیٰ سے ادنیٰ تو یہ ہونا چاہئے کہ کم از کم اس محفل میں تو سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کی خلاف ورزی نہ ہو، لیکن ہو رہی ہے، اور اب تو باقاعدہ موسیقی اور میوزک پر نعتیں پڑھی جانی لگی ہیں، سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا مبارک تذکرہ نعت میں ہے، لیکن اس کو موسیقی کے ذریعہ داغ دار کیا جارہا ہے، جبکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک حدیث میں فرمایا تھا کہ میں ان آلات موسیقی کو توڑنے کے لئے آیا ہوں، یہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت طیبہ کے ساتھ ظلم نہیں تو اور کیا ہے، یہی وجہ ہے کہ ان سیرت طیبہ کی محفلوں کا فائدہ معاشرے میں حاصل نہیں ہو رہا ہے، کیونکہ ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ذکر مبارک کے آداب کا لحاظ نہیں کررہے ہیں، بلکہ اس کی خلاف ورزی کررہے ہیں۔

دوسرا ادب جو انتہائی ناگزیر ہے وہ یہ کہ سیرت طیبہ۔العیاذ باللہ۔کوئی قصہ یا کہانی نہیں ہے، بلکہ یہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حیات طیبہ تذکرہ ہے، جس کا ایک ایک لمحہ ہمارے اور آپ کے مشعل راہ ہے، اور قابل تقلید ہے، لہٰذا سیرت طیبہ کی محفل میں جانے کا مقصد یہ ہونا چاہئے کہ سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی جو بات ہم سیکھیں، یا معلوم کریں، اس کو اپنی زندگی میں اپنائیں، لیکن عام طور سے یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک دو گھنٹے کے لئے محفل میں شریک ہوئے، جب وہاں سے اٹھے تو دامن جھاڑ کر اٹھے، زندگی کا پہیہ اسی ڈھب پر بدستور گھوم رہا ہے، جو حالت سیرت طیبہ کی محفل میں شرکت سے پہلے تھی، وہی حالت بعد میں بھی، پہلے بھی جھوٹ بولتے تھے، اب بھی جھوٹ بولتے ہیں، پہلے بھی رشوت لیتے تھے، اب بھی رشوت لیتے ہیں، پہلے بھی دھوکہ دیتے تھے، اب بھی دھوکہ دیتے ہیں، پہلے نماز نہیں پڑھتے تھے، اب بھی نہیں پڑھتے، پہلے بھی گناہ کرتے تھے، اب بھی گناہ کرتے ہیں۔

کوئی شخص ان محفلوں میں یہ ارادہ کر کے نہیں جاتا کہ جو بات یہاں سیکھوں گا اس پر عمل کروں گا، کوئی اس بات کا جائزہ نہیں لیتا کہ ان محفلوں میں جانے سے پہلے میں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی جتنی سنتوں پر عمل کرتا تھا، ان محفلوں میں شرکت کے بعد کتنی سنتوں پر عمل کرنا شروع کیا، یہ وہی سیرت ہے جس نے کائنات میں ایک عالمگیر انقلاب برپا کیا، جاہلیت میں ڈوبی ہوئی انسانیت کو صلاح وفلاح کا راستہ دکھایا، ظلم وستم میں پسی ہوئی انسانیت کو عدل وانصاف سے ہم کنار کیا، اور جس جگہ عداوت اور بغض کے شعلے بھڑک رہے تھے، وہاں سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت کی بدولت امن ومحبت کے پھول کھلنے لگے، اتنا بڑا عظیم انقلاب ۲۳ رسال کی مدت میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے برپا فرمایا۔

یہ انقلاب کس طرح برپا ہوا؟ وہ اس طرح کہ جو سیرت تھی، وہ عمل کا حصہ تھا، اور جو بات آپ کی زبان مبارک سے نکلتی تھی، صحابہ کرام اپنی زندگی میں اس کو اپناتے تھے، لیکن آج سیرت طیبہ گلی گلی سنانے کے

باوجود، محلے محلے اس کی محفلیں منعقد کرنے کے باوجود معاشرے پر اس کا کوئی اثر نظر نہیں آتا، کیوں؟ اس واسطے کہ ذہن میں یہ بات ہے کہ صرف رسم پوری کرنے کے لئے ایک گھنٹہ کے لئے جلسہ میں چلے جائیں گے، باقی سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کو اپنی زندگی میں اپنانے کا جذبہ موجود نہیں، اگر آج یہ جذبہ دلوں میں پیدا ہو جائے تو میں اللہ تعالیٰ کے بھروسہ پر قسم کھا کر کہتا ہوں اس عالم اسلام کی تمام مشکلات کا حل نکل آئے۔

درحقیقت ہم نے سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں سے بغاوت کی ہوئی ہے، ہم نے آپ کی سنتوں کو پس پشت ڈال رکھا ہے، اور جو لوگ اسلام کے دشمن ہیں، جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں کے دشمن ہیں، جو آپ کے دین کے دشمن ہیں، آج ہم نے ان کو اپنا مقتدا، ملجاو ماوا بنایا ہوا ہے، آج ہم انہی کی تقلید کرتے ہیں، انہی کی نقلیں اتارتے ہیں، اور انہی جیسا بننے کی کوشش کرتے ہیں، اور انہی کی خوشامد میں لگے ہوئے ہیں، اور جن کے جیسا بننے کی کوشش کر رہے ہیں، آج ان سب قوموں کو اللہ تعالیٰ نے تم پر مسلط کر دیا ہے، روزانہ تمہاری پٹائی ہو رہی ہے، کبھی فلسطین میں پٹائی ہو رہی ہے، کبھی کشمیر میں، کبھی افغانستان میں اور کبھی چیچنیا میں پٹائی ہو رہی ہے۔ [خطبات عثمانی، ج ۳، ص ۲۰۳ تا ۲۰۸]

شب معراج شب براءت و عاشوراء

کیا شب معراج امت کے حق میں شب قدر کی طرح فضیلت والی ہے ؟

۲۷ رجب کی شب کے بارے میں یہ مشہور ہوگیا ہے کہ یہ شب معراج ہے، اور اس شب کو ابھی اسی طرح گذارنا چاہیے جس طرح شب قدر گذاری جاتی ہے، اور جو فضیلت شب قدر کی ہے، کم وبیش شب معراج کی بھی وہی فضیلت سمجھی جاتی ہے، بلکہ میں نے تو ایک جگہ یہ لکھا ہوا دیکھا کہ ''شب معراج کی فضیلت شب قدر سے بھی زیادہ ہے'' اور پھر اس رات میں لوگوں نے نمازوں کے بھی خاص خاص طریقے مشہور کر دیے کہ اس رات میں اتنی رکعات پڑھی جائیں، اور ہر رکعت میں فلاں فلاں خاص سورتیں پڑھی جائیں، خدا جانے کی کیا تفصیلات اس نماز کے بارے میں لوگوں میں مشہور ہوگئیں، خوب سمجھ لیجیے! یہ سب بے اصل باتیں ہیں، شریعت میں ان کی کوئی اصل اور کوئی بنیاد نہیں۔

کیا شب معراج کی تاریخ ۲۷ رجب ہی ہے ؟

سب سے پہلی بات تو یہ ہے کہ ۲۷ رجب کے بارے میں یقینی طور پر نہیں کہا جاسکتا کہ یہ وہی رات ہے جس میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے تھے، کیونکہ اس باب میں مختلف روایتیں ہیں، بعض روایتوں سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ربیع الاول کے مہینے میں تشریف لے گئے تھے، بعض روایتوں میں رجب کا ذکر ہے، اور بعض روایتوں میں کوئی اور مہینہ بیان کیا گیا ہے، اس لیے پورے یقین کے ساتھ نہیں کہا جاسکتا کہ کونسی رات صحیح معنی میں معراج کی رات تھی، جس میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم معراج پر تشریف لے گئے۔

اس سے آپ خود اندازہ کر لیں کہ اگر شب معراج بھی شب قدر کی طرح کوئی مخصوص رات ہوتی اور اس کے بارے میں کوئی خاص احکام ہوتے جس طرح شب قدر کے بارے میں ہیں تو اس کی تاریخ اور مہینہ محفوظ رکھنے کا اہتمام کیا جاتا، لیکن چونکہ شب معراج کی تاریخ محفوظ نہیں تو اب یقینی طور سے ۲۷ رب کو شب معراج قرار دینا درست نہیں۔

اور اگر بالفرض یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ۲۷ رجب ہی کو معراج کے لیے تشریف لے گئے تھے، جس میں یہ عظیم الشان واقعہ پیش آیا، اور جس میں اللہ تعالی نے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ مقام قرب عطا فرمایا، اور اپنی بارگاہ میں حاضری کا شرف بخشا، اور امت کے لیے نمازوں کا تحفہ بھیجا تو بے شک وہی ایک رات بڑی فضیلت والی تھی، کسی مسلمان کو اس کی فضیلت میں کیا شبہ ہوسکتا ہے! لیکن یہ فضیلت ہر سال آنے والی ۲۷ رجب کی شب کو حاصل نہیں۔

شب معراج کے متعلق امت کے لیے احادیث میں کیا حکم بیان کیا گیا؟

پھر دوسری بات یہ ہے کہ یہ واقعہ معراج سن ۵ نبوی میں پیش آیا، یعنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نبی بننے کے پانچویں سال یہ شب معراج پیش آئی، جس کا مطلب یہ ہے کہ اس واقعہ کے بعد ۱۸ سال تک آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دنیا میں تشریف فرما رہے، لیکن ان اٹھارہ سال کے دوران یہ کہیں ثابت نہیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے شب معراج کے بارے میں کوئی خاص حکم دیا ہو، یا اس کو منانے کا اہتمام فرمایا ہو، یا اس کے بارے میں یہ فرمایا ہو کہ اس رات میں شب قدر کی طرح جاگنا زیادہ اجر وثواب کا باعث ہے، نہ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ایسا کوئی ارشاد ثابت ہے، اور نہ آپ کے زمانے میں اس رات میں جاگنے کا اہتمام ثابت ہے، نہ خود حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جاگے اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو اس کی تاکید فرمائی، اور نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے اپنے طور پر اس کا اہتمام فرمایا۔

پھر سرکار دوعالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دنیا سے تشریف لے جانے کے بعد سو سال تک صحابہ کرام رضی اللہ عنہم دنیا میں موجود رہے، اس پوری صدی میں کوئی ایک واقعہ ایسا ثابت نہیں ہے جس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ۲۷ رجب کو خاص اہتمام کر کے منایا ہو، لہذا جو چیز حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نہیں کی، اور جو آپ کے صحابہ کرام نے نہیں کی، اس کو دین کا حصہ قرار دینا، یا اس کو سنت قرار دینا، یا اس کے ساتھ سنت جیسا معاملہ کرنا بدعت ہے، اگر کوئی شخص یہ کہے کہ میں (معاذ اللہ) حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے زیادہ جانتا ہوں کہ کون سی رات زیادہ فضیلت والی ہے، یا کوئی شخص یہ کہے کہ صحابہ کرام سے زیادہ مجھے عبادت کا ذوق ہے، اگر صحابہ کرام نے یہ عمل نہیں کیا تو میں اس کو کروں گا تو اس کے برابر کوئی احمق نہیں۔

شب معراج میں عبادت کا خاص اہتمام اور ۲۷ رجب کے روزہ کا کیا حکم ہے ؟

اس رات میں عبادت کے لیے خاص اہتمام کرنا بدعت ہے، یوں تو ہر رات میں اللہ تعالی جس عبادت کی توفیق دے دیں وہ بہتر ہی بہتر ہے، لہذا آج کی رات بھی جاگ لیں، کل کی رات بھی جاگ لیں، اسی طرح پھر ستائیسویں رات کو بھی جاگ لیں، لیکن اس رات میں اور دوسری راتوں میں کوئی فرق اور کوئی

نمایاں امتیاز نہیں ہونا چاہیے۔

اسی طرح ستائیس رجب کا روزہ ہے، بعض لوگ ستائیس رجب کے روزے کو فضیلت والا سمجھتے ہیں، جیسے کہ عاشورہ اور عرفہ کا روزہ فضیلت والا ہے، اسی طرح ستائیس رجب کے روزے کو بھی فضیلت والا روزہ خیال کیا جاتا ہے، بات یہ ہے کہ ایک یا دو ضعیف روایتیں تو اس کے بارے میں ہیں، لیکن صحیح سند سے کوئی روایت ثابت نہیں۔

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے زمانے میں بعض لوگ ۲۷ رجب کو روزہ رکھنے لگے، جب حضرت فاروق اعظمؓ کو پتہ چلا کہ ۲۷ رجب کا خاص اہتمام کر کے لوگ روزہ رکھ رہے ہیں تو چونکہ ان کے یہاں دین سے ذرا ادھر ادھر ہونا ممکن نہیں تھا، چنانچہ وہ فوراً گھر سے نکل پڑے اور ایک ایک شخص کو جا کر زبردستی فرماتے کہ تم میرے سامنے کھانا کھاؤ، اور اس بات کا ثبوت دو کہ تمہارا روزہ نہیں ہے، باقاعدہ اہتمام کر کے لوگوں کو کھانا کھلایا تا کہ لوگوں کو یہ خیال نہ کہ آج کا روزہ زیادہ فضیلت کا ہے، بلکہ جیسے اور دنوں میں نفلی روزے رکھے جاسکتے ہیں، اسی طرح اس دن کا بھی نفلی روزہ رکھا جاسکتا ہے، دونوں میں کوئی فرق نہیں، آپؓ نے یہ اہتمام اس لیے فرمایا تا کہ بدعت کا سد باب ہو، اور دین کے اندر اپنی طرف سے زیادتی نہ ہو۔

شب معراج میں جاگ کر کونسی برائی کرلی؟

بعض لوگ جو یہ خیال کرتے ہیں کہ اگر ہم نے اس رات میں جاگ کر عبادت کرلی اور دن میں روزہ رکھ لیا تو کونسا گناہ کرلیا؟ کیا ہم نے چوری کرلی؟ یا شراب پی لی؟ یا ڈاکہ ڈالا؟ ہم نے رات میں عبادت ہی تو کی ہے اور اگر دن میں روزہ رکھ لیا تو کیا خرابی کا کام کیا؟

حضرت فاروق اعظم رضی اللہ عنہ نے یہ بتلا دیا کہ خرابی یہ ہوئی کہ اس دن کے اندر روزہ رکھنا اللہ تعالی نے نہیں بتایا اور خود ساختہ اہتمام والتزام ہی اصل خرابی ہے، میں یہ کئی بار عرض کر چکا ہوں کہ سارے دین کا خلاصہ ''اتباع'' ہے کہ ہمارا حکم مانو، نہ روزہ رکھنے میں کچھ رکھا ہے، نہ افطار کرنے میں کچھ رکھا ہے اور نہ نماز پڑھنے میں کچھ رکھا ہے، جب ہم کہیں کہ نماز پڑھو تو نماز پڑھنا عبادت ہے اور جب ہم کہیں کہ نماز نہ پڑھو تو نماز نہ پڑھنا عبادت ہے، جب ہم کہیں کہ روزہ رکھو تو روزہ رکھنا عبادت ہے اور جب ہم کہیں کہ روزہ نہ رکھو تو روزہ نہ رکھنا عبادت ہے، اگر اس وقت روزہ رکھو گے تو یہ دین کے خلاف ہوگا، تو دین کا سارا کھیل ''اتباع'' میں ہے، اگر اللہ تعالی یہ حقیقت دل میں اتار دے تو ساری بدعتوں کی خود ساختہ التزامات کی جڑ کٹ جائے، اب اگر کوئی شخص اس روزے کا زیادہ اہتمام کرے تو وہ شخص دین میں اپنی طرف سے زیادتی کر رہا ہے اور دین کو اپنی طرف سے گھڑ رہا ہے، لہذا اس نقطہ نظر سے روزہ رکھنا جائز نہیں، ہاں! البتہ اگر کوئی شخص عام

دنوں کی طرح اس میں بھی روزہ رکھنا چاہتا ہے تو رکھ لے، اس کی ممانعت نہیں، لیکن اس کی زیادہ فضیلت سمجھ کر، اس کو سنت سمجھ کر، اس کو زیادہ مستحب اور زیادہ اجر وثواب کا موجب سمجھ کر اس دن روزہ رکھنا یا اس رات میں جاگنا درست نہیں بلکہ بدعت ہے۔

رجب کے کونڈوں کی شرعا کیا حقیقت ہے؟

'شب معراج کی تو پھر بھی کچھ اصل ہے کہ اس رات میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اتنے اعلیٰ مقام پر تشریف لے گئے تھے، لیکن اس سے بھی زیادہ آج کل معاشرے میں فرض وواجب کے درجے میں جو چیز پھیل گئی ہے وہ کونڈے ہیں، اگر آج کسی نے کونڈے نہیں کیے تو وہ مسلمان ہی نہیں، نماز پڑھے یا نہ پڑھے، روزے رکھے یا نہ رکھے، گناہوں سے بچے یا نہ بچے، لیکن کونڈے ضرور کرے، اور اگر کوئی شخص نہ کرے، یا کرنے والوں کو منع کرے تو اس پر لعنت اور ملامت کی جاتی ہے، خدا جانے یہ کونڈے کہاں سے نکل آئے؟ نہ قرآن وحدیث سے ثابت ہیں، نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے، نہ تابعین رحمہم اللہ سے، نہ تبع تابعین رحمہم اللہ سے، اور نہ بزرگان دین سے، کہیں سے اس کی کوئی اصل ثابت نہیں، اور اس کو اتنا ضروری سمجھا جاتا ہے کہ گھر میں دین کا کوئی دوسرا کام ہو یا نہ ہو، لیکن کونڈے ضرور ہوں گے، اس کی وجہ یہ ہے کہ اس میں ذرا مزہ اور لذت آتی ہے، اور ہماری قوم لذت اور مزہ کی خوگر ہے، کوئی میلہ ٹھیلہ ہونا چاہیے، اور کوئی حظ نفس کا سامان ہونا چاہیے، اور ہوتا یہ ہے کہ جناب! پوریاں پک رہی ہیں، حلوہ پک رہا ہے، اور ادھر سے ادھر جا رہی ہیں، اور ادھر سے ادھر آ رہی ہیں اور ایک میلہ لگا ہوا ہے، تو چونکہ یہ بڑے مزے کا کام ہے، اس واسطے شیطان نے اس میں مشغول کر دیا کہ نماز پڑھو یا نہ پڑھو، وہ کوئی ضروری نہیں، مگر یہ کام ضرور ہونا چاہیے۔

بھائی ان چیزوں نے ہماری امت کو خرافات میں مبتلا کر دیا ہے:

حقیقت روایات میں کھو گئی
یہ امت خرافات میں کھو گئی

[اصلاحی خطبات، ج ۱، ص ۴۸ تا ۵۴]

شب براءت

جیسا کہ شب معراج کے بارے میں عرض کر چکا ہوں کہ شب معراج (۲۷ رجب) میں کسی خاص عبادت کا ذکر قرآن وسنت میں موجود نہیں ہے۔

لیکن واقعہ یہ ہے کہ شب برات (پندرہ شعبان) کے بارے میں یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ اس کی کوئی فضیلت حدیث سے ثابت نہیں، حقیقت یہ ہے کہ دس صحابہ کرام ؓ سے احادیث مروی ہیں، جن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس رات کی فضیلت بیان فرمائی، ان میں سے بعض احادیث سند کے اعتبار سے بیشک کچھ

کمزور ہیں، اور ان احادیث کے کمزور ہونے کی وجہ سے بعض علماء نے یہ کہہ دیا کہ اس رات کی فضیلت بے اصل ہے، لیکن حضرات محدثین اور فقہاء کا یہ فیصلہ ہے کہ اگر ایک روایت سند کے اعتبار سے کمزور ہو، لیکن اس کی تائید بہت سی احادیث سے ہو جائے تو اس کی کمزوری دور ہو جاتی ہے، اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ دس صحابہ کرام سے اس کی فضیلت میں روایات موجود ہیں، لہٰذا جس رات کی فضیلت میں دس صحابہ کرام سے روایات مروی ہوں، اس کو بے بنیاد اور بے اصل کہنا بالکل غلط ہے۔

شب براءت اور خیر القرون

امت مسلمہ کے جو خیر القرون ہیں، یعنی صحابہ کرام کا دور، تابعین کا دور، تبع تابعین کا دور، اس میں بھی اس رات کی فضیلت سے فائدہ اٹھانے کا اہتمام کیا جاتا رہا ہے، لوگ اس رات کے اندر عبادت کا خصوصی اہتمام کرتے رہے ہیں، لہٰذا اس کو بدعت کہنا، یا بے بنیاد اور بے اصل کہنا درست نہیں، صحیح بات یہی ہے کہ یہ فضیلت والی رات ہے، اس رات میں جاگنا، اس میں عبادت کرنا باعث اجر و ثواب ہے اور اس کی خصوصی اہمیت ہے۔

شب براءت میں کوئی خاص عبادت مقرر نہیں

البتہ یہ بات درست ہے کہ اس رات میں عبادت کا کوئی خاص طریقہ مقرر نہیں کہ فلاں فلاں طریقہ سے عبادت کی جائے، جیسے بعض لوگوں نے اپنی طرف سے ایک طریقہ گھڑ کر یہ کہہ دیا کہ شب برات میں اس خاص طریقے سے نماز پڑھی جاتی ہے، مثلاً پہلی رکعت میں فلاں سورت اتنی مرتبہ پڑھی جائے، دوسری رکعت میں فلاں سورت اتنی مرتبہ پڑھی جائے، وغیرہ وغیرہ، اس کا کوئی ثبوت نہیں، یہ بالکل بے بنیاد بات ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۲۶۴]

شب براءت میں کیا عبادات کی جائیں ؟

بلکہ نفلی عبادات جس قدر ہو سکے، وہ اس رات میں انجام دی جائے، نفلی نماز پڑھیں، قرآن کریم کی تلاوت کریں، ذکر کریں، تسبیح پڑھیں، دعائیں کریں، یہ ساری عبادتیں اس رات میں کی جا سکتی ہیں، لیکن کوئی خاص طریقہ ثابت نہیں۔

شب براءت میں قبرستان جانا

اس رات میں ایک اور عمل ہے، جو ایک روایت سے ثابت ہے وہ یہ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جنت البقیع میں تشریف لے گئے، اب چونکہ حضور اس رات میں جنت البقیع تشریف لے گئے تھے، اس لیے مسلمان اس بات کا اہتمام کرنے لگے کہ شب برات میں قبرستان جائیں، لیکن میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ ایک بڑی کام کی بات بیان فرمایا کرتے تھے، ہمیشہ یاد رکھنی چاہیے، فرماتے تھے کہ جو چیز

رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جس درجے میں ثابت ہو، اسی درجہ میں اسے رکھنا چاہیے، اس سے آگے نہیں بڑھانا چاہیے، لہذا ساری حیات طیبہ میں رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ایک مرتبہ جنت البقیع جانا مروی ہے، کہ آپ شب برات میں جنت البقیع تشریف لے گئے، چونکہ ایک مرتبہ جانا مروی ہے، اس لیے تم بھی اگر زندگی میں ایک مرتبہ چلے جاؤ تو ٹھیک ہے، لیکن ہر شب برات میں جانے کا اہتمام کرنا، التزام کرنا، اور اس کو ضروری سمجھنا، اور اس کو شب برات کے ارکان میں داخل کرنا، اور اس کو شب برات کا لازمی حصہ سمجھنا، اور اس کے بغیر یہ سمجھنا کہ شب برات نہیں ہوئی، یہ اس کو اس کے درجے سے آگے بڑھانے والی بات ہے، لہذا اگر کبھی کوئی شخص اس نقطہ نظر سے قبرستان چلا گیا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف لے گئے تھے، میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع میں جا رہا ہوں، تو ان شاء اللہ اجر و ثواب ملے گا، لیکن اس کے ساتھ یہ کرو کہ کبھی نہ بھی جاؤ، لہذا اہتمام اور التزام نہ کرو، پابندی نہ کرو، یہ درحقیقت دین کی سمجھ کی بات ہے، کہ جو چیز جس درجہ میں ثابت ہو اس کو اسی درجہ میں رکھو، اس سے آگے مت بڑھاؤ، اور اس کے علاوہ دوسری نفل عبادت ادا کرلو۔ [اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۲۶۴]

شب برأت میں سو رکعت نفل پڑھنا

مثلاً بعض لوگوں نے پندرہ شعبان کی رات یعنی شب برأت میں لوگوں کے لیے نماز کا ایک خاص طریقہ مقرر کر دیا، وہ یہ کہ ایک ہی تحریمہ اور ایک سلام کے ساتھ سو رکعتیں نفل پڑھیں، اور ہر رکعت میں خاص خاص سورتوں کا پڑھنا مقرر کر دیا کہ پہلی رکعت میں فلاں سورت، دوسری میں فلاں سورت اور تیسری میں فلاں سورت وغیرہ، ایک زمانے میں یہ طریقہ اتنی شہرت اختیار کر گیا تھا کہ جگہ جگہ باقاعدہ جماعت کے ساتھ سو رکعتیں پڑھی جا رہی تھی، اگر کوئی شخص یہ سو رکعتیں نہیں پڑھتا تو اس کو برا کہا جاتا ہے کہ اس نے شب برأت نہیں منائی، اب آپ دیکھیں کہ جو شخص شب برأت میں سو رکعتیں پڑھ رہا ہے، کیا وہ کوئی چوری کر رہا ہے، یا ڈاکہ ڈال رہا ہے، یا وہ بدکاری کر رہا ہے، نہیں! بلکہ وہ تو اللہ تعالیٰ کے سامنے کھڑا ہو کر اللہ کا ذکر کر رہا ہے، رکوع، سجدے کر رہا ہے، لیکن تمام علماء امت نے فرمایا کہ یہ عمل گناہ ہے اور بدعت ہے، ناجائز ہے، اس لیے کہ اس نے اپنی طرف سے دین میں ایک چیز کا اضافہ کر دیا، جو دین کا حصہ نہیں تھا، لہذا یہ عمل بدعت ہو گیا اور گناہ ہو گیا۔

ہم کوئی گناہ کا کام تو نہیں کر رہے!

اگر ان سے پوچھا جائے کہ بھائی تم یہ جو عمل کر رہے ہو، اس کا نہ تو قرآن کریم میں کہیں ذکر ہے، نہ حدیث شریف میں اس کا کہیں ذکر ہے، یہ عمل تو بدعت ہے، یہ کیسے جائز ہو گیا؟ وہ لوگ جواب میں کہتے ہیں کہ ہم کوئی گناہ کر رہے ہیں، یا ہم چوری ڈاکہ ڈال رہے ہیں؟ بلکہ ہم تو قرآن کریم پڑھ رہے ہیں، اللہ تعالیٰ کے سامنے سجدے کر رہے ہیں، ہم اللہ تعالیٰ کی تسبیح کر رہے ہیں، کوئی گناہ کا کام تو نہیں کر رہے ہیں۔

خوب سمجھ لیجیے کہ کوئی بھی عبادت اس وقت تک عبادت کہلانے کی مستحق نہیں جب تک اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے اس کی سند موجود نہ ہو، ورنہ وہ عبادت بدعت ہے، اس کی مثال یوں سمجھیں کہ اللہ تعالیٰ نے ہم پر پانچ نمازیں فرض فرمائی ہیں، اور ہر نماز کی رکعتوں کی تعداد متعین فرمائی ہے کہ فجر میں دو رکعت فرض پڑھو اور ظہر، عصر اور عشا میں چار چار رکعت فرض پڑھو اور مغرب میں تین رکعت پڑھو، اب اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ یہ تین رکعتوں کی تعداد تو اچھی معلوم نہیں ہوتی، لہذا مغرب میں تین کے بجائے چار رکعت پڑھوں گا، اب اگر کوئی شخص مغرب کی تین رکعت کے بجائے چار رکعت پڑھ لے تو کیا اس نے کوئی ڈاکہ ڈالا، کوئی چوری کی، کیا اس نے بدکاری کی؟ کیا اس نے شراب پی لی؟ نہیں! بلکہ اس نے تو ایک رکعت زیادہ پڑھ لی، اس میں اللہ تعالیٰ کی حمد وثنا کی، ایک رکوع زیادہ کیا، دو سجدے زیادہ کیے، اور اس میں اللہ تعالیٰ کی تسبیح زیادہ کی، لیکن اس شخص نے یہ جو چوتھی رکعت اپنی طرف سے زیادہ پڑھ لی، اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ثواب زیادہ ملنے کے بجائے یہ ایک رکعت پہلی تین رکعتوں کو بھی لے ڈوبے گی اور اس کی نماز نہیں ہوگی، اس لیے کہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی طرف سے مغرب کی نماز کا جو طریقہ بتایا گیا تھا، اس طریقہ سے ہٹ کر اس نے اپنے طریقے پر نماز پڑھ لی، اور اس طریقہ کو دین کا حصہ سمجھ کر اس کو دین میں داخل کر لیا، اسی کا نام بدعت ہے، یاد رکھیے! دین نام ہے اس بات کا کہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جس کام کا جس درجہ میں حکم دیا ہے، بس اسی درجہ میں اس کی اتباع کی جائے اور اس پر عمل کیا جائے، اگر اس سے آگے یا پیچھے ہٹو گے تو وہ دین نہیں، اور اگر دین سمجھ کر اس کو اختیار کر رہے ہو تو وہ بدعت ہے۔

یا مثلاً سفر کی حالت میں اللہ تعالیٰ نے رکعتوں کی تعداد کم فرما دی اور یہ حکم دیا کہ شرعی سفر کے دوران چار فرضوں کے بجائے دو فرض پڑھو، اب اگر کوئی آدمی یہ سوچے کہ اللہ تعالیٰ نے بیشک میرے لیے رکعتوں کی تعداد میں کمی کر دی ہے، لیکن میرا دل نہیں مان رہا ہے، میں تو پوری چار رکعت ہی پڑھوں گا، ایسا کرنا اس کے لیے جائز نہیں، حالانکہ اگر وہ شخص دو رکعتیں زائد پڑھ رہا ہے تو وہ کوئی گناہ نہیں کر رہا ہے، بلکہ اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اضافہ کر رہا ہے، لیکن چونکہ وہ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم کے خلاف عبادت کر رہا ہے اس وجہ سے ناجائز اور گناہ ہے، اور اللہ تعالیٰ کے یہاں پر پکڑ ہو جائے گی کہ ہم نے تم سے دو رکعتیں پڑھنے کو کہا تھا، تم نے چار کیوں پڑھیں؟ معلوم ہوا کہ دین نام ہے اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کا، وہ جب کم پڑھنے کا حکم دیں تو کم پڑھو، وہ جب زیادہ کا حکم دیں تو زیادہ پڑھو، لیکن اپنی طرف سے اس کے اندر کمی زیادتی تمہارے لیے جائز نہیں۔

یہ نکتہ اس لیے سمجھنا ضروری ہے کہ آج ہمارے معاشرے میں بے شمار طریقے دین کے نام پر جاری کر دیے گئے ہیں اور اس طرح جاری کر دیے گئے ہیں کہ گویا کہ وہ دین کا لازمی حصہ ہیں، اگر کوئی شخص وہ کام نہ کرے تو وہ ملامتی ہے، اس پر لعنت وملامت کی جاتی ہے، اس پر طعن وتشنیع کی جاتی ہے، اس کو برا سمجھا

جاتا ہے، اور اس کو ایک طرح سے مسلمانوں کی برادری سے خارج سمجھا جاتا ہے، وہ تمام طریقے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت نہیں ہیں، صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے ثابت نہیں ہیں اور ان کو دین کا حصہ بنالیا گیا ہے، وہ سب بدعات کی فہرست میں شامل ہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۶، ۲۲۷ تا ۲۳۲]

شب برأت کا حلوہ اور رجب کے کونڈے کیوں غلط ہیں؟

مثلاً شب برأت میں حلوہ پکنا چاہیے، اور یہ حلوہ شب برأت کا لازمی حصہ بن گیا ہے، اگر حلوہ نہیں پکا تو شب برأت ہی نہیں ہوئی، یا مثلاً رجب میں کونڈے ہوتے ہیں، اگر کوئی شخص کونڈے نہ کرے تو وہ ملامتی ہے، وہ وہابی ہے، اس پر طرح طرح کی طعن و تشنیع کی جاتی ہے، اب اگر ان سے پوچھا جائے کہ کیا کونڈے کا حکم قرآن کریم میں کہیں آیا ہے؟ یا حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حدیث میں ارشاد فرمایا؟ یا صحابہ کرام نے اس پر عمل کیا تھا؟ کوئی ثبوت نہیں، بس اپنی طرف سے ایک طریقہ جاری کر کے اس کو اس طرح لازمی قرار دے دیا گیا کہ اگر کوئی نہ کرے تو وہ لعنت و ملامت کا مستحق ہے، اس کو بدعت کہتے ہیں، اب اگر ان سے یہ کہا جائے کہ یہ عمل تو بدعت ہے، تو جواب میں یہ کہا جاتا ہے کہ ہم کوئی گناہ کا کام کر رہے ہیں؟ ہم کوئی چوری ڈاکہ ڈال رہے ہیں؟ بلکہ اپنے گھر کے ہی آٹے سے یہ پوریاں بنائیں اور یہ حلوہ بنایا اور اس کو محلہ میں تقسیم کر دیا، اس میں گناہ کی کیا بات ہوئی؟ ارے بھائی! تم روزانہ پوری بناؤ، روزانہ حلوہ بناؤ اور اس کو تقسیم کرو، کوئی گناہ کی بات نہیں، لیکن اس کو دین کا لازمی حصہ قرار دینا اور یہ کہنا کہ جو شخص یہ کام نہیں کر رہا وہ ملامت کا مستحق ہے، تمہارا یہ طرز عمل اس کام کو بدعت بنا دیتا ہے، جس کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ: کل محدثة بدعة و کل بدعة ضلالة

اور جو شخص اس عمل کو کسی اتھارٹی کے بغیر دین کا حصہ بناتا ہے وہ شخص اپنے آپ کو اللہ اور اور اس کے رسول سے آگے بڑھانے کی کوشش کر رہا ہے جس کی قرآن میں ممانعت کی گئی ہے کہ اللہ اور اس کے رسول سے آگے بڑھنے کی کوشش مت کرو۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۶، ۲۳۲]

شب برات میں حلوہ یا میٹھی چیز ضروری سمجھنا غلط ہے

بہر حال یہ شب برات الحمد للہ فضیلت کی رات ہے، اور اس رات میں جتنی عبادت کی توفیق ہو، اتنی عبادت کرنی چاہیے، باقی جو اور فضولیات اس رات میں حلوہ وغیرہ پکانے کی شروع کر لی گئی ہیں، ان کو بیان کرنے کی ضرورت نہیں، اس لیے کہ شب برات کا حلوہ سے کوئی تعلق نہیں، اصل بات یہ ہے کہ شیطان ہر جگہ اپنا حصہ لگا لیتا ہے، اس نے سوچا کہ اس شب برات میں مسلمانوں کے گناہوں کی مغفرت کی جائے گی، چنانچہ ایک روایت میں آتا ہے کہ اس رات میں اللہ تعالیٰ اتنے انسانوں کی مغفرت فرماتے ہیں جتنے قبیلہ کلب کی بکریوں کے جسم پر بال ہیں۔

شیطان نے سوچا کہ اگر اتنے سارے آدمیوں کی مغفرت ہوگئی، پھر تو میں لُٹ گیا، اس لیے اس نے اپنا حصہ لگادیا، چنانچہ اس نے لوگوں کو یہ سکھادیا کہ شب برات آئے تو حلوہ پکایا کرو، ویسے تو سارے سال کے کسی دن بھی حلوہ پکانا جائز اور حلال ہے، جس شخص کا جب دل چاہے، پکا کر کھالے، لیکن شب برات سے اس کا کیا تعلق؟ نہ قرآن میں اس کا ثبوت ہے، نہ حدیث میں اس کے بارے میں کوئی روایت، نہ صحابہ کے آثار، نہ تابعین کے عمل میں اور بزرگان دین کے عمل میں کہیں اس کا کوئی تذکرہ نہیں، لیکن شیطان نے لوگوں کو حلوہ پکانے میں لگادیا، چنانچہ سب لوگ پکانے اور کھانے میں لگ گئے، اب یہ حال ہے کہ عبادت کا اتنا اہتمام نہیں، جتنا اہتمام حلوہ پکانے کا ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۲۷۲]

شب برات اور شب قدر میں صلوۃ التسبیح اور نفل کی جماعت

میں نے سنا ہے کہ بعض لوگ اس رات میں اور شب قدر میں نفلوں کی جماعت کرتے ہیں، پہلے صرف شبینہ باجماعت ہوتا تھا، اب سنا ہے کہ صلوۃ التسبیح کی بھی جماعت ہونے لگی ہے، یہ صلوۃ التسبیح کی جماعت کسی طرح بھی ثابت نہیں، ناجائز ہے، اس کے بارے میں ایک اصول سن لیجیے جو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمایا کہ فرض نماز کے علاوہ، اور ان نمازوں کے علاوہ جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے باجماعت ادا کرنا ثابت ہیں، مثلاً تراویح، کسوف اور استسقاء کی نماز، ان کے علاوہ ہر نماز کے بارے میں افضل یہ ہے کہ انسان اپنے گھر میں ادا کرے، صرف فرض نماز کی خصوصیت یہ ہے کہ اس کے اندر صرف افضل نہیں، بلکہ سنت موکدہ قریب بواجب ہے کہ اس کو انسان اپنے گھر میں ادا کرے، لیکن جب فقہاء نے یہ دیکھا کہ لوگ گھر جا کر بعض اوقات سنتوں کو ترک کردیتے ہیں، اس لیے انہوں نے یہ بھی فرمادیا کہ اگر سنتیں چھوٹنے کا خوف ہو تو مسجد ہی میں پڑھ لیا کریں، تاکہ چھوٹ نہ جائیں، ورنہ اصل قاعدہ یہی ہے کہ گھر میں جا کر ادا کریں، اور نفل کے بارے میں تمام فقہاء کا اس پر اجماع ہے کہ نفل نماز میں افضل یہ ہے کہ اپنے گھر میں ادا کرے، اور نفلوں کی جماعت حنفیہ کے نزدیک مکروہ تحریمی اور ناجائز ہے، یعنی اگر جماعت سے نفل پڑھ لیے تو ثواب تو کیا ملے گا، الٹا گناہ ملے گا۔

[اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۲۶۶]

پندرہ شعبان کا روزہ

ایک مسئلہ شب برات کے بعد والے دن یعنی پندرہ شعبان کے روزے کا ہے، اس کو بھی سمجھ لینا چاہیے، وہ یہ کہ سارے ذخیرہ حدیث میں اس روزے کے بارے میں صرف ایک روایت ملتی ہے کہ شب برات کے بعد والے دن روزہ رکھو، لیکن یہ روایت ضعیف ہے، لہٰذا اس روایت کی وجہ سے خاص اس پندرہ شعبان کے روزے کو سنت یا مستحب قرار دینا بعض علماء کے نزدیک درست نہیں، البتہ پورے شعبان کے مہینے میں روزہ رکھنے کی فضیلت ثابت ہے، یعنی یکم شعبان سے ستائیس شعبان تک روزہ رکھنے کی فضیلت ثابت ہے،

لیکن ۲۸ ,اور ۲۹ شعبان کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے روزہ رکھنے سے منع فرمایا ہے کہ رمضان سے ایک دو روز پہلے روزہ مت رکھو، تا کہ رمضان کے روزوں کے لیے انسان نشاط کے ساتھ تیار رہے، لیکن یکم شعبان سے ۲۷ شعبان تک ہر دن روزہ رکھنے میں فضیلت ہے، دوسرے یہ کہ پندرہ تاریخ ایام بیض میں سے بھی ہے، اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم اکثر ہر ماہ کے ایام بیض میں تین دن روزہ رکھا کرتے تھے، یعنی ۱۳, ۱۴, ۱۵ تاریخ کو، لہذا اگر کوئی شخص ان دو وجہ سے ۱۵ تاریخ کا روزہ رکھے، ایک اس وجہ سے کہ یہ شعبان کا دن ہے، دوسرے اس وجہ سے کہ یہ ۱۵ تاریخ ایام بیض میں داخل ہے، اگر اس نیت سے روزہ رکھ لے تو ان شاء اللہ موجب اجر ہوگا، لیکن خاص پندرہ تاریخ کی خصوصیت کے لحاظ سے اس روزے کو سنت قرار دینا بعض علماء کے نزدیک درست نہیں، اسی وجہ سے اکثر فقہاء کرام نے جہاں مستحب روزوں کا ذکر کیا ہے وہاں محرم کی دس تاریخ کے روزے کا ذکر کیا ہے، یوم عرفہ کے روزے کا ذکر کیا ہے، لیکن پندرہ شعبان کے روزے کا علیحدہ سے ذکر نہیں کیا، بلکہ یہ فرمایا ہے کہ شعبان کے کسی بھی دن میں روزہ رکھنا افضل ہے، بہر حال اگر نقطہ نظر سے کوئی شخص روزہ رکھ لے تو ان شاء اللہ اس پر ثواب ہوگا، باقی کسی دن کی کوئی خصوصیت نہیں، جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا تھا کہ ہر معاملے کو اس کی حد کے اندر رکھنا ضروری ہے، ہر چیز کو اس کے درجہ کے مطابق رکھنا ضروری ہے، دین اصل میں حدود کی حفاظت ہی کا نام ہے، اپنی طرف سے عقل لڑا کر آگے پیچھے کرنے کا نام دین نہیں، لہذا اگر ان حدود کی رعایت کرتے ہوئے کوئی شخص روزہ رکھے تو بہت اچھی بات ہے، ان شاء اللہ اس پر اجر و ثواب ملے گا، لیکن اس روزے کو باقاعدہ سنت قرار دینے سے پرہیز کرنا چاہیے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۲۷۳]

عاشوراء یعنی دس محرم کے دن کی فضیلت کی وجہ
رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے عاشوراء کا روزہ فرض تھا

محرم کی دسویں تاریخ جس کو عام طور پر ''عاشوراء'' کہا جاتا ہے، جس کے معنی ہیں دسواں دن، یہ دن اللہ تعالی کی رحمت و برکت کا خصوصی طور پر حامل ہے، جب تک رمضان کے روزے فرض نہیں ہوئے تھے ، اس وقت تک عاشوراء کا روزہ رکھنا مسلمانوں پر فرض قرار دیا گیا تھا، بعد میں جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو اس وقت عاشوراء کے روزے کی فرضیت منسوخ ہو گئی، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے عاشوراء کے دن روزہ رکھنے کو سنت اور مستحب قرار دیا، ایک حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ مجھے اللہ جل شانہ کی رحمت سے یہ امید ہے کہ جو شخص عاشوراء کے دن روزہ رکھے تو اس کے پچھلے ایک سال کے گناہوں کا کفارہ ہو جائے گا، عاشوراء کے روزے کی اتنی بڑی فضیلت آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ عاشوراء کے دن کی فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ اس دن میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم

کے مقدس نواسے حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ پیش آیا، اس شہادت کے پیش آنے کی وجہ سے عاشوراء کا دن مقدس اور حرمت والا بن گیا ہے، یہ بات صحیح نہیں، خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک میں عاشوراء کا دن مقدس سمجھا جاتا تھا، اور آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کے بارے میں احکام بیان فرمائے تھے اور قرآن کریم نے بھی اس کی حرمت کا اعلان فرمایا تھا، جبکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا واقعہ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے تقریباً ساٹھ سال بعد پیش آیا، لہذا یہ بات درست نہیں کہ عاشوراء کی حرمت اس واقعہ کی وجہ سے ہے، بلکہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی شہادت کا اس روز واقع ہونا یہ حضرت حسین رضی اللہ عنہ کی مزید فضیلت کی دلیل ہے کہ اللہ تعالی نے ان کو شہادت کا مرتبہ اس دن میں عطا فرمایا جو پہلے ہی سے مقدس اور محترم چلا آرہا تھا، بہرحال یہ عاشوراء کا دن ایک مقدس دن ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۴، ص ۷۸]

آزادی وحقوق نسواں

کیا اسلام نے عورت کی مذمت یا برائی کی ہے ؟
عورت کی پیدائش ٹیڑھی پسلی سے ہونے کا مطلب

بعض لوگوں نے اس کی تشریح یہ کی ہے کہ اللہ تعالی نے سب سے پہلے حضرت آدم علیہ السلام کو پیدا فرمایا، اس کے بعد حضرت حوا علیہا السلام کوانہی کی پسلی سے پیدا کیا گیا، اور بعض علما نے اس کی دوسری تشریح یہ بھی کی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم عورت کوتشبیہ دیتے ہوئے فرمارہے ہیں کہ عورت کی مثال پسلی کی سی ہے کہ جس طرح پسلی دیکھنے میں ٹیڑھی معلوم ہوتی ہے لیکن پسلی کا حسن اوراس کی صحت اس کے ٹیڑھا ہونے میں ہی ہے ،چنانچہ کوئی شخص اگر یہ چاہے کہ پسلی ٹیڑھی ہے اس کوسیدھا کردوں تو جب اسے سیدھا کرنا چاہے گاتو وہ سیدھی تونہیں ہوگی البتہ ٹوٹ جائے گی، وہ پھر پسلی نہیں رہے گی، اب دوبارہ پھراس کوٹیڑھا کر کے پلستر کے ذریعہ جوڑنا پڑے گا، اسی طرح حدیث شریف میں عورت کے بارے میں بھی یہی فرمایا کہ:

"إن ذهبت تقيمها كسرتها"

اگرتم اسی پسلی کوسیدھا کرنا چاہوگےتو وہ پسلی ٹوٹ جائے گی

"وإن استمتعت بها استمتعت بها وفيها عوج"

اوراگراس سے فائدہ اٹھانا چاہوتواس کے ٹیڑھے ہونے کے باوجودفائدہ اٹھاؤگے، یہ بڑی عجیب وغریب اورحکیمانہ تشبیہ حضوراقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بیان فرمائی کہ اس کی صحت ہی اس کے ٹیڑھے ہونے میں ہے اگروہ سیدھی ہوگی تووہ بیمارہے صحیح نہیں ہے۔

بعض لوگ اس تشبیہ کوعورت کی مذمت میں استعمال کرتے ہیں کہ عورت ٹیڑھی پسلی سے پیدا کی گئی ہے، لہذا اس کی اصل ٹیڑھی ہے، چنانچہ میرے پاس بہت سے لوگوں کے خطوط آتے ہیں جس میں کئی لوگ یہ لکھتے ہیں کہ یہ عورت ٹیڑھی پسلی کی مخلوق ہے، گویا کہ اس کو مذمت اور برائی کے طور پر استعمال کرتے ہیں، حالانکہ خود نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد کا یہ منشانہیں ہے۔

بات یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مرد کو کچھ اور اوصاف دے کر پیدا فرمایا ہے اور عورت کو کچھ اور اوصاف دے کر پیدا فرمایا، دونوں کی فطرت اور سرشت میں فرق ہے، سرشت میں فرق ہونے کی وجہ سے مرد عورت کے بارے میں یہ محسوس کرتا ہے کہ یہ میری طبیعت اور فطرت کے خلاف ہے، حالانکہ عورت کا تمہاری طبیعت کے خلاف ہونا یہ کوئی عیب نہیں ہے، کیونکہ یہ ان کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ وہ ٹیڑھی ہو، کوئی شخص پسلی کے بارے میں یہ کہے کہ پسلی کے اندر جو ٹیڑھا پن ہے وہ اس کے اندر عیب ہے، ظاہر ہے کہ وہ نہیں بلکہ اس کی فطرت کا تقاضہ ہے کہ ٹیڑھی ہو، اس لیے آنحضرت ﷺ یہ ارشاد فرمارہے ہیں کہ اگر تمہیں عورت میں کوئی ایسی بات نظر آتی ہے جو تمہاری طبیعت کے خلاف ہو، اور اس کی وجہ سے تم اس کو ٹیڑھا سمجھ رہے ہو تو اس کو اس بنا پر کنڈم نہ کرو، بلکہ یہ سمجھو کہ اس کی فطرت کا مقتضا یہ ہے، اور اگر تم اس کو سیدھا کرنا چاہو گے تو وہ ٹوٹ جائے گی اور اگر فائدہ اٹھانا چاہو گے تو ٹیڑھا ہونے کی حالت میں فائدہ بھی اٹھا سکو گے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۲، ص ۳۵]

اب بعض حضرات یہ سمجھتے ہیں کہ جب حضور اقدس ﷺ نے اس کو ٹیڑھی پسلی کہہ دیا تو اس کی مذمت بیان فرمادی، چنانچہ بعض لوگ اس کو اس کی مذمت اور برائی کے معنی میں استعمال کرتے ہیں، اور جب ان کا بیوی سے جھگڑا ہوتا ہے تو وہ بیوی سے خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ ''اے ٹیڑھی پسلی! میں تجھے سیدھا کر کے رہوں گا''، حالانکہ ان لوگوں نے یہ غور نہیں کیا کہ حضور اقدس ﷺ پسلی کو ٹیڑھی کہہ رہے ہیں، پسلی اگر ٹیڑھی نہ ہو بلکہ سیدھی ہو جائے تو وہ پسلی کہلانے کے لائق نہیں، پسلی کا حسن اور صحت یہ ہے کہ وہ ٹیڑھی ہو، اگر وہ پسلی سیدھی ہو جائے تو وہ بیمار ہے۔

درحقیقت اس حدیث کے ذریعے حضور اقدس ﷺ یہ بتلانا چاہ رہے ہیں کہ ٹیڑھا ہونا اور سیدھا ہونا ایک اضافی چیز ہے، جس کا مطلب یہ ہے کہ ایک چیز کو ایک نگاہ سے دیکھو تو وہ سیدھی ہے اور دوسری نگاہ سے دیکھو تو وہ ٹیڑھی ہے، دیکھیے! سامنے مسجد کے باہر جو سڑک ہے، اگر مسجد کے اندر سے دیکھو تو وہ یہ نظر آئے گا کہ یہ سڑک ٹیڑھی ہے، اس لیے کہ مسجد کی نسبت سے سڑک ٹیڑھی ہے، اور اگر سڑک پر کھڑے ہو کر دیکھو تو یہ نظر آئے گا کہ سڑک سیدھی ہے اور مسجد ٹیڑھی ہے، حالانکہ نہ سڑک ٹیڑھی ہے، نہ مسجد ٹیڑھی ہے، اس لیے کہ مسجد کے لیے یہ ضروری تھا کہ وہ قبلہ رخ ہو، لہٰذا کسی چیز کا سیدھا اور ٹیڑھا ہونا اضافی صفت ہے، ایک چیز ایک لحاظ سے ٹیڑھی ہے اور دوسرے لحاظ سے سیدھی ہے۔

بہر حال اس حدیث کے ذریعہ یہ بتانا مقصود ہے کہ چونکہ تمہاری طبیعت عورت کی طبیعت سے مختلف ہے، لہٰذا تمہارے لحاظ سے وہ ٹیڑھی ہے، لیکن حقیقت میں وہ ٹیڑھا پن اس کی فطرت کا حصہ ہے، جس طرح پسلی کی فطرت کا حصہ یہ ہے کہ وہ ٹیڑھی ہو، اگر پسلی سیدھی ہو جائے تو اس کو عیب کہا جائے گا اور ڈاکٹر اس کو دوبارہ ٹیڑھی کرنے کی کوشش کرے گا، اس لیے کہ اس کی فطرت کے اندر ٹیڑھا پن موجود ہے، لہٰذا اس

حدیث کے ذریعہ عورت کی برائی بیان نہیں کی جارہی ہے، بلکہ یہ کہا جارہا ہے کہ چونکہ عورت کی طبیعت تمہاری طبیعت کے لحاظ سے مختلف ہے، اس لیے تمہیں ٹیڑھی معلوم ہوتی ہے، اس لیے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ اس کو سیدھا کرنے کی فکرمت کرنا، کیونکہ اس کو سیدھا کرنا ایسا ہی ہوگا جیسے پسلی کو سیدھا کرنا، اور اگر تم اس کو سیدھا کرنے کی کوشش کروگے تو اس کو توڑ ڈالوگے، اور اگر تم اس کو اس کی حالت پر چھوڑ دوگے تو اس کے ٹیڑھا ہونے کے باوجود تم اس سے فائدہ اٹھاؤ گے۔

عربی سکھانے کی ایک کتاب ''مفید الطالبین'' میں ایک قصہ لکھا ہے کہ بادشاہ کا ایک عقاب اڑ کر ایک بڑھیا کے پاس پہنچ گیا، اس بڑھیا نے اس کو پکڑ کر اس کو پالنا شروع کیا، جب بڑھیا نے یہ دیکھا کہ اس کی چونچ ٹیڑھی ہے اور اس کے پنجے ٹیڑھے ہیں، تو بڑھیا کو اس پر بڑا ترس آیا کہ یہ بے چارہ پرندہ ہے، اللہ کی مخلوق ہے، جب اس کو کھانے کی ضرورت ہوتی ہوگی تو یہ کیسے کھاتا ہوگا؟ کیونکہ اس کی چونچ ٹیڑھی ہے، اور جب اس کو چلنے کی ضرورت ہوتی ہوگی تو یہ چلتا کیسے ہوگا؟ اس لیے کہ اس کے پنجے ٹیڑھے ہیں، اس بڑھیا نے سوچا کہ میں اس کی یہ مشکل آسان کردوں، چنانچہ قینچی سے پہلے اس کی چونچ کاٹی، اور پھر اس کے پنجے کاٹے، جس کے نتیجے میں اس کا خون بہنے لگا اور وہ زخمی ہوگیا، جتنا پہلے چل سکتا تھا اس سے بھی وہ معذور ہوگیا، یہ واقعہ نادان کی محبت کی مثال میں پیش کیا جاتا ہے، کیونکہ اس بڑھیا نے اس عقاب کے ساتھ محبت تو کی، لیکن نادانی اور بے عقلی کے ساتھ محبت کی، اور یہ نہ سوچا کہ اس کی چونچ اور اس کے پنجوں کا ٹیڑھا ہونا اس کی فطرت کا حصہ ہے، اور اس کا حسن اس کے ٹیڑھے پن میں ہے، اگر اس کے یہ اعضاء ٹیڑھے نہ ہوں تو یہ عقاب کہلانے کا مستحق نہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۱، ص ۲۳۰]

کیا عورت محکوم اور مرد حاکم ہے؟

آج کی دنیا میں جہاں مرد وعورت کی مساوات، ان کی برابری اور آزادی نسواں کا بڑا زور وشور ہے، ایسی دنیا میں لوگ یہ بات کرتے ہوئے شرماتے ہیں کہ شریعت نے مرد کو حاکم بنایا ہے اور عورت کو محکوم بنایا ہے، اس لیے کہ آج کی دنیا میں یہ پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ مرد کی عورت پر بالادستی قائم کردی گئی ہے اور عورت کو محکوم بنا کر اس کے ہاتھ میں قید کردیا گیا ہے اور اس کو چھوٹا قرار دے دیا گیا ہے، لیکن حقیقت حال یہ ہے کہ مرد اور عورت زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں، زندگی کا سفر دونوں کو ایک ساتھ طے کرنا ہے، اب زندگی کے سفر کے طے کرنے میں انتظام کے خاطر یہ لازمی بات ہے کہ دونوں میں سے کوئی ایک شخص سفر کا ذمہ دار ہو، حدیث میں نبی کریم سرور دو عالم ﷺ نے یہ حکم دیا کہ جب بھی دو آدمی کوئی سفر کررہے ہوں، چاہے وہ سفر چھوٹا سا کیوں نہ ہو، اس سفر میں اپنے میں سے ایک کو امیر بنالو، امیر بنائے بغیر سفر نہیں کرنا چاہیے، تاکہ سفر کے جملہ انتظامات اور پالیسی اس امیر کے فیصلے کے تابع ہو، اگر امیر نہیں بنائیں گے تو ایک بدنظمی ہوجائے گی۔

[ابو داود، کتاب الجہاد، باب فی القوم یسافرون یؤمرون احدھم]

لہٰذا جب ایک چھوٹے سے سفر میں امیر بنانے کی تاکید کی گئی ہے تو زندگی کا یہ طویل سفر جو ایک ساتھ گذارنا ہے اس میں یہ تاکید کیوں نہیں ہوگی کہ اپنے میں سے ایک کو امیر بنالو، تاکہ بدنظمی پیدا نہ ہو، بلکہ انتظام قائم رہے، اس انتظام کو قائم کرنے کے لیے کسی ایک کو امیر بنانا ضروری ہے۔

اب دو راستے ہیں، یا تو مرد کو اس زندگی کے سفر کا امیر بنادیا جائے، یا عورت کو امیر بنادیا جائے، اور مرد کو اس کا محکوم بنادیا جائے، تیسرا کوئی راستہ نہیں ہے، اب انسانی خلقت، فطرت، قوت اور صلاحیتوں کے لحاظ سے بھی اور عقل کے ذریعہ انسان غور کرے تو یہی نظر آئے گا کہ اللہ تعالیٰ نے جو قوت مرد کو عطا کی ہے، بڑے بڑے کام کرنے کی جو صلاحیت مرد کو عطا فرمائی ہے وہ عورت کو عطا نہیں کی، لہٰذا اِس امارت اور اس سربراہی کا کام صحیح طور پر مرد ہی انجام دے سکتا ہے اور اس کے لیے اپنی عقل سے فیصلہ کرنے کے بجائے اس ذات سے پوچھا جائے جس نے ان دونوں کو بنایا اور پیدا کیا کہ آپ نے دونوں کو سفر پر روانہ کیا، اب آپ ہی بتائیں کس کو امیر بنائیں؟ اور کس کو مامور بنائیں؟ اور سوائے اس کے فیصلے کے کسی اور کا فیصلہ قابل قبول نہیں ہوسکتا، خواہ وہ فیصلہ عقلی دلائل سے آراستہ ہو، اور اللہ تعالیٰ نے یہ فیصلہ فرمادیا کہ اس زندگی کے سفر کو طے کرنے کے لیے مرد ''قوام، حاکم اور منتظم'' ہیں، اگر تم اس فیصلے کو صحیح جانتے ہو اور مانتے ہو تو اسی میں تمہاری سعادت اور کامیابی ہے اور اگر نہیں مانتے بلکہ اس فیصلے کی خلاف ورزی کرتے ہو اور اس کے ساتھ بغاوت کرتے ہو تو پھر تم جانو اور تمہاری زندگی جانے، اب تمہاری زندگی خراب ہوگی، اور ہو رہی ہے، جن لوگوں نے اس فیصلے کے خلاف بغاوت کی، ان کا انجام دیکھ لیجیے کہ کیا ہوا!!!۔

اللہ تعالیٰ نے جو لفظ قرآن میں استعمال فرمایا اس کو سمجھ لیجیے، اللہ تعالیٰ نے ''امیر''، ''حاکم''، ''آقا'' اور ''بادشاہ'' کا لفظ استعمال نہیں کیا، بلکہ ''قوام'' کا لفظ استعمال کیا، اور قوام کے معنی وہ شخص جو کسی کام کا ذمہ دار ہو اور ذمہ دار ہونے کے معنی یہ ہیں کہ بحیثیت مجموعی زندگی گذارنے کی پالیسی وہ طے کرے گا، اور پھر اس پالیسی کے مطابق زندگی گذاری جائے گی، لیکن قوام ہونے کے یہ معنی ہرگز نہیں کہ وہ آقا ہے اور بیوی اس کی کنیز ہے، یا بیوی اس کی نوکرانی ہے، بلکہ دونوں کے درمیان امیر اور مامور کا رشتہ ہے، اور اسلام میں امیر کا تصور یہ نہیں ہے کہ وہ تخت پر بیٹھ کر حکم چلائے، بلکہ اسلام میں امیر کا وہ تصور ہے جو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ:

سیّد القوم خادمهم [کنز العمال، حدیث نمبر ۱۷۵۱۷]

قوم کا سردار (امیر) ان کا خادم ہوتا ہے۔

آج ذہن میں جب امیر کا تصور آتا ہے تو وہ بادشاہوں اور بڑے سربراہوں کی صورت میں آتا ہے، جو اپنے رعایا کے ساتھ بات کرنا بھی گوارا نہیں کرتے، لیکن قرآن وحدیث کا تصور یہ ہے کہ امیر وہ شخص

ہے جو خدمت کرے، جو خادم ہو، امیر کے یہ معنی نہیں ہے کہ اس کو بادشاہ بنادیا گیا ہے، اب وہ حکم چلایا کرے گا اور دوسرے اس کے ماتحت نوکر اور غلام بن کر رہیں گے، بلکہ امیر کے معنی یہ ہیں کہ بیشک فیصلہ اس کا معتبر ہوگا، ساتھ ہی وہ فیصلہ ان کی خدمت کے لیے ہوگا، ان کی راحت اور خیر خواہی کے لیے ہوگا۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ مردوں کو یہ آیت تو یاد رہتی ہے کہ "الرجال قوامون علی النساء" یعنی مرد عورتوں پر قوام ہیں، اب بیٹھ کر عورتوں پر حکم چلا رہے ہیں، اور ذہن میں یہ بات ہے کہ عورت کو ہر حال میں تابع اور فرمانبردار ہونا چاہیے اور ہمارا ان کے ساتھ آقا اور نوکر جیسا رشتہ ہے (معاذ اللہ) لیکن قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور آیت بھی نازل فرمائی ہے وہ آیت مردوں کو یاد نہیں رہتی، وہ آیت یہ ہے کہ:

﴿ومن آياته ان خلق لكم من انفسكم أزواجا لتسكنوا إليها وجعل بينكم مودة ورحمة﴾ [الروم:۲۱]

ترجمہ: اور اسی کی نشانیوں میں سے یہ ہے کہ اس نے تمہارے لیے تمہارے جنس کی بیویاں بنائیں تاکہ تم کو ان کے پاس آرام ملے اور تم دونوں میاں بیوی میں محبت اور ہمدردی پیدا کی۔

حضرت تھانویؒ فرماتے ہیں کہ بیشک مرد عورت کے لیے قوام ہے لیکن ساتھ میں دوستی کا تعلق بھی ہے، انتظامی طور پر تو قوام ہے لیکن باہمی تعلق دوستی جیسا ہے، ایسا تعلق نہیں ہے جیسا آقا اور کنیز کے درمیان ہوتا ہے، اس کی مثال ایسی ہے جیسے دو دوست کہیں سفر پر جا رہے ہوں اور ایک دوست نے دوسرے دوست کو امیر بنالیا ہو، لہٰذا شوہر اس لحاظ سے تو امیر ہے کہ ساری زندگی کا فیصلہ کرنے کا وہ ذمہ دار ہے، لیکن اس کا مطلب یہ نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ ایسا معاملہ کرے جیسے نوکروں اور غلاموں کے ساتھ کیا جاتا ہے، بلکہ اس دوستی کے تعلق کے کچھ آداب اور کچھ تقاضے ہیں، ان آداب اور تقاضوں میں ناز کی باتیں بھی ہوتی ہیں جن کو حاکم ہونے کے خلاف نہیں کہا جاسکتا۔ [اصلاحی خطبات، ج۲، ص۷۹]

کیا عورتوں کو مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا چاہیے؟

یہ نعرہ آج بہت زور وشور سے لگایا جاتا ہے کہ عورتوں کو بھی مردوں کے شانہ بشانہ کام کرنا چاہیے اور مغربی افکار نے یہ پروپیگنڈہ ساری دنیا میں کر دیا ہے، لیکن یہ نہیں دیکھا کہ اگر مرد اور عورت دونوں ایک ہی جیسے کام کے لیے پیدا ہوئے تھے تو پھر دونوں کو جسمانی طور پر الگ الگ پیدا کرنے کی کیا ضرورت تھی؟ مرد کا جسمانی نظام اور ہے، عورت کا جسمانی نظام اور ہے، مرد کا مزاج اور ہے، عورت کا مزاج اور ہے، مرد کی صلاحیتیں اور ہیں، عورت کی صلاحیتیں اور ہیں، اللہ تعالیٰ نے دونوں صنفیں اس طرح بنائی ہیں کہ دونوں کی تخلیقی ساخت اور اس کے نظام میں بنیادی فرق پایا جاتا ہے، لہٰذا یہ کہنا کہ مرد اور عورت میں کسی طرح کا کوئی فرق

نہیں ہے یہ خود فطرت کے خلاف بغاوت ہے اور مشاہدہ کا انکار ہے، اس لیے کہ یہ تو آنکھوں سے نظر آرہا ہے کہ مرد اور عورت کی ساخت میں فرق ہے، نئے فیشن نے مرد اور عورت کے اس فطری فرق کو مٹانے کی کتنی کوششیں کر دیکھیں، چنانچہ عورتوں نے مردوں جیسا لباس پہننا شروع کر دیا اور مردوں نے عورتوں جیسا لباس پہننا شروع کر دیا، عورتوں نے مردوں جیسے بال رکھنے شروع کر دیے اور مردوں نے عورتوں جیسے بال رکھنے شروع کر دیے، لیکن اس بات سے انکار اب بھی نہیں کیا جا سکتا کہ مرد اور عورت دونوں کا جسمانی نظام مختلف ہے، دونوں مختلف صنفیں ہیں، دونوں کے انداز زندگی مختلف ہیں اور دونوں کی صلاحیتیں مختلف ہیں۔

قرآن کریم کی تعلیمات اور رسول کریم ﷺ کی تعلیمات سے کسی ادنیٰ شبہ کے بغیر یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ درحقیقت انسانی زندگی دو مختلف شعبوں پر منقسم ہے، ایک گھر کے اندر کا شعبہ ہے اور ایک گھر کے باہر کا شعبہ ہے، یہ دونوں شعبے ایسے ہیں کہ ان دونوں کو ساتھ لیے بغیر ایک متوازن اور معتدل زندگی نہیں گذاری جا سکتی، گھر کا انتظام بھی ضروری ہے اور گھر کے باہر کا انتظام یعنی کسب معاش اور روزی کمانے کا انتظام بھی ضروری ہے، جب دونوں کام ایک ساتھ اپنی اپنی جگہ پر ٹھیک ٹھیک چلیں گے تب انسان کی زندگی استوار ہوگی اور اگر ان میں سے ایک انتظام بھی ختم ہو گیا یا ناقص ہو گیا تو اس سے انسان کی زندگی میں توازن (Balance) ختم ہو جائے گا۔

ان دونوں شعبوں میں اللہ تعالیٰ نے یہ تقسیم فرمائی کہ مرد کے ذمے گھر کے باہر کے کام لگائے، مثلاً کسب معاش اور روزی کمانے کا کام، اور سیاسی اور سماجی کام وغیرہ، یہ سارے کام درحقیقت مرد کے ذمے عائد کیے ہیں، اور گھر کے اندر کا شعبہ اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ نے عورتوں کے حوالے کیا ہے، وہ اس کو سنبھالیں، اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ حکم آ جاتا کہ عورت باہر کا انتظام کرے گی اور مرد گھر کا انتظام کرے گا تو بھی کوئی چوں و چرا کی مجال نہیں تھی، لیکن اگر عقل کے ذریعے انسان کی فطری تخلیق کا جائزہ لیں تو بھی اس کے سوا اور کوئی انتظام نہیں ہو سکتا کہ مرد گھر کے باہر کا کام کرے اور عورت گھر کے اندر کا کام کرے، اس لیے کہ مرد اور عورت کے درمیان اگر تقابل کر کے دیکھا جائے تو ظاہر ہوگا کہ جسمانی قوت جتنی مرد میں ہے، اتنی عورت میں نہیں، اور کوئی شخص بھی اس سے انکار نہیں کر سکتا، اللہ تعالیٰ نے مرد میں عورت کی نسبت جسمانی قوت زیادہ رکھی ہے، اور گھر کے باہر کے کام قوت کا تقاضہ کرتے ہیں، محنت کا تقاضہ کرتے ہیں، وہ کام قوت اور محنت کے بغیر انجام نہیں دیے جا سکتے، لہٰذا اس فطری تخلیق کا بھی تقاضہ یہی تھا کہ گھر کے باہر کا کام مرد انجام دے اور گھر کے اندر کے کام عورت کے سپرد ہوں۔

ابتدا میں جو آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی، اس میں اللہ تعالیٰ نے آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کو براہ راست خطاب فرمایا، اور ان کے واسطے سے ساری مسلمان خواتین سے خطاب فرمایا، وہ یہ ہے کہ: ﴿وقرن في بيوتكن﴾

یعنی تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو، اس میں صرف اتنی بات نہیں کہ عورت کو ضرورت کے بغیر گھر سے باہر نہیں جانا چاہیے، بلکہ اس آیت میں ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے، وہ یہ کہ ہم نے عورت کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ گھر میں قرار سے رہ کر گھر کے انتظام کو سنبھالے۔

حضرت علی اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہما نے بھی اپنے درمیان یہ تقسیم کار فرما رکھی تھی کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ گھر کے باہر کے کام انجام دیتے اور حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا گھر کے اندر کا انتظام سنبھالتیں، چنانچہ گھر کی جھاڑو دیتیں، چکی چلا کر آٹا پیستیں، پانی بھرتیں، کھانا پکاتیں۔ [اصلاحی خطبات، ج۱، ص۱۴۱ تا ۱۴۴]

یہ اصولی ہدایت اس طرح ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو صنفیں پیدا فرمائی ہیں، ایک مرد اور ایک عورت، دونوں مختلف صنفیں ہیں، اور اللہ تعالیٰ نے دونوں کی تخلیق مختلف طریقے سے کی ہے، مرد کی جسمانی ساخت کچھ اور ہے، عورت کی جسمانی ساخت کچھ اور ہے، مرد کی صلاحیتیں کچھ ہیں، عورت کی صلاحیتیں کچھ اور ہیں، مرد کے دل میں پیدا ہونے والے افکار کچھ اور ہیں، عورت کے دل میں پیدا ہونے والے افکار کچھ اور ہیں، اللہ تعالیٰ نے دونوں کے اندر یہ اختلاف اس لیے رکھا ہے کہ دونوں کے وظیفہ زندگی الگ الگ ہیں، لیکن آج ''مساوات مرد وزن'' کا نعرہ لگایا جاتا ہے کہ جو کام مرد کرے وہ کام عورت بھی کرے، یہ مساوات کا نعرہ درحقیقت فطرت سے بغاوت ہے، اللہ تعالیٰ نے ان دونوں صنفوں میں اس لیے اختلاف رکھا ہے کہ دونوں کا وظیفہ زندگی بھی مختلف ہے، دونوں کا دائرہ کار بھی مختلف ہے۔

دیکھیے! انسان کو اپنی زندگی گذارنے کے لیے دو چیزوں کی ضرورت ہوتی ہے، ایک گھر کے باہر کی ذمہ داری کہ وہ گھر سے باہر وہ اپنی روزی کمانے کا کام انجام دے، تجارت کرے، زراعت کرے، ملازمت کرے، مزدوری کرے اور اس کے ذریعہ پیسہ کمائے اور اپنے لیے روزی کا سامان مہیا کرے، ایک ضرورت یہ ہے، دوسری گھر کے اندر کی ذمہ داری کہ اس کے گھر کا نظام صحیح ہو، اور گھر کے نظام کے اندر اگر بچے ہیں تو ان کی تربیت درست ہو، گھر کی صفائی ستھرائی ٹھیک ہو، اور گھر کے اندر چین وسکون کی زندگی گذاریں، اور گھر کے اندر کھانے پینے کا بندوبست ہو، لہذا گھر کے باہر کی ذمہ داریاں بھی ہیں اور گھر کے اندر کی بھی ذمہ داریاں ہیں۔

اللہ تبارک وتعالیٰ نے جو فطری نظام بنایا تھا اس پر ہزارہا سالوں سے عمل ہوتا چلا آرہا تھا، بلا قید مذہب وملت، دنیا کی ہر قوم، ہر مذہب اور ہر ملت میں یہی طریقہ رائج تھا کہ مرد گھر کے باہر کی ذمہ داریاں پوری کرے گا اور عورت گھر کے اندر کا انتظام کرے گی، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے جب اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نکاح حضرت علی رضی اللہ عنہ سے کیا تو ان کے درمیان بھی یہی تقسیم کار فرمائی کہ حضرت علیؓ سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا کام کمانا ہے، جاؤ، باہر جا کر کماؤ اور حضرت فاطمہؓ سے

فرمایا کہ تم گھر کے اندر رہ کر گھر کی ذمہ داریاں سنبھالو، یہ فطری تقسیم ان دونوں کے درمیان فرمائی جو ہزاروں سال سے چلی آرہی تھی۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۵،ص۱۹۰]

مغربی معاشرے میں عورت گھر سے باہر کیوں نکلی؟

سولہویں صدی عیسوی کے بعد جب یورپ میں صنعتی انقلاب آیا تو تجارتوں کا میدان وسیع ہوا تو ایک مسئلہ یہ پیدا ہوا کہ مرد کو پیسے کمانے کے لیے لمبے لمبے عرصے تک اپنے گھروں سے باہر رہنا پڑتا تھا، سفروں پر رہنا پڑتا تھا، جس کی وجہ سے وہ اپنی بیوی سے دور رہتا، دوسرا مسئلہ یہ ہوا کہ صنعتی انقلاب کے نتیجے میں زندگی گراں ہوگئی ،جس کی وجہ سے مرد کو یہ بات گراں معلوم ہوئی کہ میں اپنی بیوی کا خرچہ بھی اٹھاؤں، ان دو مسئلوں کا حل یورپ کے مرد نے یہ تلاش کیا کہ اس عورت سے کہا کہ تمہیں خواہ مخواہ ہزاروں سال سے گھر کے اندر قید رکھا ہوا ہے، لہٰذا تم بھی گھر سے باہر نکلو اور مردوں کے شانہ بشانہ کام کرو، اور دنیا کی جتنی ترقیاں ہیں وہ سب تم حاصل کرو، اس کے ذریعہ یورپ کے مرد کا اصل مقصد یہ تھا کہ عورت کے اخراجات کی جو ذمہ داری مرد کے کندھے پر تھی، وہ ذمہ داری عورت ہی کے کندھے پر ڈال دے، دوسرا مقصد یہ تھا کہ جب عورت بازار میں اور سڑکوں پر آجائے گی تو پھر اس کو بہلا پھسلا کر اپنا مطلب پورا کرنے کی پوری گنجائش ہر جگہ میسر ہوگی۔

لہٰذا اب یورپ میں یہ قصہ ختم ہوگیا کہ بیوی اکیلی گھر میں بیٹھی ہے اور مرد کو لمبے لمبے سفر پر جانا ہے ،اور وہ اتنے لمبے عرصہ تک اس بیوی کے قرب سے لطف اندوز نہیں ہو سکے گا، یہ بات ختم ہو چکی، اب تو قدم قدم پر عورت موجود ہے، دفتروں میں عورت موجود، بازاروں میں عورت موجود، ریلوں میں عورت موجود، جہازوں میں عورت موجود اور ساتھ میں یہ قانون بھی بنا دیا گیا کہ اگر دو مرد و عورت آپس میں رضامندی سے جنسی تسکین کرنا چاہیں تو ان پر کوئی رکاوٹ عائد نہیں ہے، نہ قانون کی رکاوٹ ہے، نہ اخلاقی رکاوٹ ہے، اب عورت ہر جگہ موجود ہے، اور اس سے فائدہ اٹھانے کے راستے چوپٹ کھلے ہوئے ہیں اور مرد کے سر پر عورت کی کوئی ذمہ داری بھی نہیں ہے، بلکہ عورت سے یہ کہہ دیا گیا کہ تم کماؤ بھی اور قدم قدم پر ہمارے لیے لذت حاصل کرنے کے اسباب بھی مہیا کرو۔

نام نہاد آزادیِ نسواں کے نتائج

عورت کے ساتھ یہ فراڈ کھیلا گیا اور اس کو دھوکہ دیا گیا، اور اس کا نام ''تحریک آزادیِ نسواں'' رکھا گیا ،یعنی عورتوں کی آزادی کی تحریک، اس فراڈ کے ذریعہ عورت کو گھر سے باہر نکال دیا، تو اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ صبح اٹھ کر شوہر صاحب اپنے کام پر چلے گئے اور بیوی صاحبہ اپنے کام پر چلی گئیں اور گھر میں تالا ڈال دیا اور اگر بچہ پیدا ہوا تو اس کو کسی چائلڈ کیئر کے سپرد کر دیا گیا، جہاں پر اس کو انائیں تربیت دیتی رہیں، باپ کی شفقت اور ماں کی مامتا سے محروم وہ بچہ چائلڈ کیئر میں پرورش پا رہا ہے، جو بچہ ماں باپ کی شفقت اور محبت سے محروم ہوکر

دوسروں کے ہاتھوں میں پلے گا، اس کے دل میں باپ کی کیا عظمت ہوگی اور ماں کی محبت کیا ہوگی۔

آج مغرب کا یہ حال ہے کہ وہاں خاندانی نظام تباہ ہو چکا ہے، ماں باپ کے رشتوں کی جو مٹھاس تھی وہ فنا ہو چکی، بھائی بہن کے تعلقات ملیا میٹ ہو چکے، ایک طرف تو خاندانی نظام تباہ ہو چکا اور دوسری طرف وہ عورت ایک کھلونا بن گئی، چاروں طرف اس کی تصویر دکھا کر اس کے ایک ایک عضو کو برسر بازار برہنہ کر کے اس کے ذریعہ تجارت چمکائی جارہی ہے، اس کے ذریعہ پیسے کمانے کا انتظام کیا جارہا ہے۔

اس عورت سے یہ کہا گیا تھا کہ تمہیں گھروں کے اندر قید کر دیا گیا ہے، تمہیں باہر اس لیے نکالا جارہا ہے تاکہ تم ترقی کرو، تم سربراہ مملکت بن جانا، تم وزیر بن جانا، تم فلاں فلاں بڑے عہدوں پر پہنچ جانا، آج امریکہ کی تاریخ اٹھا کر دیکھ لیجیے کہ پوری تاریخ میں کتنی عورتیں امریکہ کی صدر بنیں؟ یا سربراہ بنیں؟ یا وزراء بنیں؟ ایک خاتون بھی صدر نہیں بنی، صرف دو چار عورتیں وزراء بنیں، لیکن ان دو چار عورتوں کی خاطر لاکھوں عورتوں کو سڑکوں پر گھسیٹ لیا گیا، آج وہاں جا کر دیکھ لیجیے، دنیا کا ذلیل ترین کام عورت کے سپرد ہے، سڑکوں پر جھاڑو دے گی تو عورت دے گی، ہوٹلوں میں ویٹرس کا کام عورت کرے گی، بازاروں میں سیلز گرل کا کام عورت کرے گی، ہوٹلوں میں بستروں کی چادر عورت تبدیل کرے گی، اور جہازوں میں کھانا عورت سرو کرے گی، وہ عورت جو اپنے گھر میں اپنے شوہر کو، اپنے بچوں کو، اور اپنے ماں باپ کو کھانا سرو کر رہی تھی، وہ اس کے لیے دقیانوسیت تھی، وہ رجعت پسندی تھی، وہ عورت کے لیے قید تھی، اور وہی عورت بازاروں کے اندر، ہوٹلوں کے اندر، ہوائی جہازوں کے اندر سینکڑوں انسانوں کو کھانا سرو کرتی ہے، اور ان کی ہوس ناک نگاہوں کا نشانہ بنتی ہے تو یہ عزت ہے اور یہ آزادی ہے:

خرد کا نام جنوں رکھ دیا، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

ایک طرف تو عورت کا حشر کیا یہ، اور دوسری طرف وہ لوگ جو آزادی نسواں کے علم بردار کہلاتے ہیں، انہوں نے عورت پر جو ظلم کیا ہے تاریخ انسانیت میں اس سے بڑا ظلم نہیں ہوا، آج اس کے ایک ایک عضو کو بیچا جارہا ہے، اور اس کی عزت اور تکریم کی دھجیاں بکھیری جارہی ہیں، اور پھر بھی یہ کہتے ہیں کہ ہم عورت کے وفادار ہیں، اور عورت کی آزادی کے علم بردار ہیں، اور جس نے عورت کے سر پر عفت وعصمت کا تاج رکھا تھا اور اس کے گلے میں احترام کے ہار ڈالے تھے، اس کے بارے میں یہ کہا جارہا ہے کہ انہوں نے عورت کو قید کر دیا، اور یہ عورت ایسی مخلوق اللہ تعالیٰ نے بنائی ہے کہ جو چاہے ان کو بہکا دے، اور اپنا اُلّو سیدھا کرلے، چنانچہ آج ہماری مسلمان خواتین نے بھی ان ہی کی لے میں لے ملانی شروع کر دی۔

آپ کو یاد ہوگا کچھ دن پہلے ہمارے ملک کے ایک معروف رہنما نے یہ کہہ دیا تھا کہ "مردوں کو چاہیے کہ وہ عورتوں کے خرچ کا انتظام کریں، عورتوں کو بلاوجہ گھر سے باہر نکل کر اپنے معاش کا انتظام کرنا ٹھیک

نہیں ہے''، اس کے جواب میں جو خواتین ماڈرن کہلاتی ہیں اور اپنے آپ کو خواتین کے حقوق کی علم بردار کہتی ہیں، انہوں نے ان صاحب کے خلاف ایک جلوس نکالا، اور یہ کہا کہ ان صاحب نے ہمارے خلاف یہ بات کہی ہے، اب دیکھیے! کہ ایک آدمی یہ کہتا ہے کہ آپ کو اپنے معاش کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے، دوسرے لوگ آپ کے لیے یہ خدمت انجام دینے کو تیار ہیں، اس پر عورتوں کو خوش ہونا چاہیے، مگر جھوٹ کا یہ پروپیگنڈہ ساری دنیا میں عالمی طور پر پھیلا گیا ہے، اس لیے خوش ہونے کے بجائے یہ کہا جا رہا ہے کہ یہ صاحب خواتین کے حقوق تلف کرنا چاہتے ہیں اور جلوس نکالنے والی وہ عورتیں ہیں جنہوں نے خواتین کے حقیقی مسائل سمجھنے کی زحمت ہی گوارہ نہیں کی، ان خواتین نے ائیر کنڈیشنر عمارت میں پرورش پائی ہے، دیہات میں جو عورت بستی ہے اس کے کیا مسائل ہیں، اس کو کن مسائل کا سامنا کرنا پڑتا ہے، اس سے کوئی تعرض نہیں کیا، کبھی ان کے مسائل کو جاننے کی کوشش نہیں کی، ان کے نزدیک صرف مسئلہ یہ ہے کہ ہمیں مغرب کے لوگ یورپ اور امریکہ کے لوگ یہ کہہ دیں کہ ''ہاں! تم لوگ روشن خیال ہو'' اور تم لوگ اکیسویں صدی کے ساتھ چلنے والے ہو، بس یہ مسئلہ ہے، ان کے نزدیک کوئی اور مسئلہ نہیں ہے۔

بہر حال! آج یہ پروپیگنڈہ ساری دنیا میں پھیلا ہوا ہے کہ یہ مسلمان یہ مولوی لوگ عورتوں کو گھروں میں بند کرنا چاہتے ہیں، جبکہ حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالی نے زندگی کے دو مختلف دائرہ کار تجویز کیے ہیں، مرد کے لیے الگ، عورت کے لیے الگ، اس لیے مرد کی جسمانی ساخت اور ہے، اور عورت کی جسمانی ساخت اور ہے، مرد کی صلاحیتیں اور ہیں، عورت کی صلاحیتیں اور ہیں، لہذا مساوات کا یہ نعرہ لگانا کہ عورت بھی وہی سب کام کرے جو کام مرد کرتا ہے تو یہ فطرت سے بغاوت ہے، اور اس کے نتیجے میں خاندانی نظام تباہ ہو چکا ہے، اگر ہم اپنے معاشرے میں خاندانی نظام کو بچانا چاہتے ہیں تو اس کے لیے خواتین کو پردہ میں رکھنا ہوگا، اور مغرب کے پروپیگنڈہ کے اثرات کو اپنے معاشرے سے نکالنا ہوگا، اللہ تعالی ہمارے معاشرے کو مغربی آفات سے محفوظ فرمائے اور چین وسکون کی زندگی ہم سب کو عطا فرمائے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۵، ص ۱۹۲ تا ۱۹۸]

خواتین کی آزادی کی حقیقت اور پس منظر

عورت کو کس لالچ پر گھر سے باہر نکالا گیا؟

جس ماحول میں معاشرے کی پاکیزگی کوئی قیمت ہی نہ رکھتی ہو اور جہاں عفت وعصمت کے بجائے اخلاقی باختگی اور حیا سوزی کو منتہائے مقصود سمجھا جاتا ہو، ظاہر ہے کہ وہاں اس تقسیم کار اور پردہ اور حیا کو نہ صرف غیر ضروری بلکہ راستے کی رکاوٹ سمجھا جائے گا، چنانچہ جب مغرب میں تمام اخلاقی اقدار سے آزادی کی ہوا چلی تو مرد نے عورت کے گھر میں رہنے کو اپنے لیے دوہری مصیبت سمجھا، ایک طرف تو اس کی ہوسناک

طبیعت عورت کی کوئی ذمہ داری قبول کیے بغیر قدم قدم پر اس سے لطف اندوز ہونا چاہتی تھی اور دوسری طرف وہ اپنی قانونی بیوی کی معاشی کفالت کو بھی ایک بوجھ تصور کرتا تھا، چنانچہ اس نے دونوں مشکلات کا جو عیّارانہ حل نکالا اس کا خوب صورت اور معصوم نام ''تحریک آزادیٔ نسواں'' ہے، عورت کو یہ پڑھایا گیا کہ تم اب تک گھر کی چار دیواری میں قید رہی ہو، اب آزادی کا دور ہے اور تمہیں اس قید سے باہر آ کر مردوں کے شانہ بشانہ زندگی کے ہر کام میں حصہ لینا چاہیے، اب تک تمہیں حکومت وسیاست کے ایوانوں سے بھی محروم رکھا گیا ہے، اب تم باہر آ کر زندگی کی جدوجہد میں برابر کا حصہ لو تو دنیا بھر کے اعزازات اور اونچے اونچے منصب تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔

عورت بے چاری ان دل فریب نعروں سے متاثر ہو کر گھر سے باہر آ گئی اور پروپیگنڈے کے تمام وسائل کے ذریعے شور مچا مچا کر اسے یہ باور کرا دیا گیا کہ اسے صدیوں کی غلامی کے بعد آج آزادی ملی ہے اور اب اس کے رنج ومحن کا خاتمہ ہو گیا ہے، ان دلفریب نعروں کی آڑ میں عورت کو گھسیٹ کر سڑکوں پر لایا گیا، اسے دفتر میں ''کلرکی'' عطا کی گئی، اسے اجنبی مردوں کی ''پرائیوٹ سیکریٹری'' کا منصب بخشا گیا، اسے ''اسٹینو ٹائپسٹ'' بننے کا اعزاز دیا گیا، اسے تجارت چمکانے کے لیے ''سیلز گرل'' اور ''ماڈل گرل'' بننے کا شرف بخشا گیا اور اس کے ایک ایک عضو کو برسر بازار رُسوا کر کے گاہکوں کو دعوت دی گئی کہ آؤ اور ہم سے مال خریدو، یہاں تک کہ وہ عورت جس کے سر پر دین فطرت نے عزت وآبرو کا تاج رکھا تھا اور جس کے گلے میں عفت وعصمت کے ہار ڈالے تھے تجارتی اداروں کے لیے ایک ''شوپیس'' اور مرد کی ''تھکن'' دور کرنے کے لیے ایک ''تفریح'' کا سامان بن کر رہ گئی۔

نام یہ لیا گیا کہ عورت کو ''آزادی'' دے کر سیاست وحکومت کے ایوان اس کے لیے کھولے جا رہے ہیں، لیکن ذرا جائزہ لے کر تو دیکھیے کہ اس عرصے میں خود مغربی ممالک کی کتنی عورتیں صدر یا وزیر اعظم بن گئیں؟ کتنی خواتین کو جج بنایا گیا؟ کتنی عورتوں کو دوسرے بلند مناصب کا اعزاز نصیب ہوا؟ اعداد وشمار جمع کیے جائیں تو ایسی عورتوں کا تناسب بمشکل چند فی لاکھ ہو گا، ان گنی چُنی خواتین کو کچھ مناصب دینے کے نام پر باقی لاکھوں عورتوں کو جس بے دردی کے ساتھ سڑکوں اور بازاروں میں گھسیٹ کر لایا گیا ہے وہ ''آزادیٔ نسواں'' کے فراڈ کا المناک ترین پہلو ہے، آج یورپ اور امریکہ میں جا کر دیکھیے تو دنیا بھر کے تمام نچلے درجے کے کام عورت کے سپرد ہیں، ریستورانوں میں کوئی مرد ویٹر شاذ ونادر ہی کہیں نظر آئے گا، ورنہ یہ خدمات تمام تر عورتیں انجام دے رہی ہیں، ہوٹلوں میں مسافروں کے کمرے صاف کرنے، ان کے بستر کی چادریں بدلنے اور ''روم اٹنڈنٹ'' کی خدمات تمام تر عورتوں کے سپرد ہیں، دوکانوں پر مال بیچنے کے لیے مرد خال خال نظر آئیں گے، یہ کام بھی عورتوں ہی سے لیا جا رہا ہے، دفاتر کے استقبالیوں پر عام طور پر عورتیں ہی تعینات ہیں اور بیرے سے لے کر کلرک تک کے تمام ''مناصب'' زیادہ تر اسی صنف نازک کے حصے میں آئے

ہیں جسے ''گھر کی قید سے آزادی'' عطا ن گئی ہے۔

پروپیگنڈے کی قوتوں نے یہ عجیب وغریب فلسفہ ذہنوں پر مسلط کردیا ہے کہ عورت اگر اپنے گھر میں اپنے اور اپنے شوہر، اپنے ماں باپ، بہن بھائیوں اور اولاد کے لیے خانہ داری کا انتظام کرے تو یہ قید اور ذلت ہے، لیکن وہی عورت اجنبی مردوں کے لیے کھانا پکائے، ان کے کمروں کی صفائی کرے، ہوٹلوں اور جہازوں میں ان کی میز بانی کرے، دوکانوں پر اپنی مسکراہٹوں سے گاہکوں کو متوجہ کرے اور دفاتر میں اپنے افسروں کی ناز برداری کرے تو یہ ''آزادی'' اور ''اعزاز'' ہے، انا للہ وانا الیہ راجعون۔

پھر ستم ظریفی کی انتہا یہ ہے کہ عورت کسب معاش کے آٹھ آٹھ گھنٹے کی یہ سخت اور ذلت آمیز ڈیوٹیاں ادا کرنے کے باوجود اپنے گھر کے کام دھندوں سے اب بھی فارغ نہیں ہوئی، گھر کی تمام خدمات آج بھی پہلے کی طرح اسی کے ذمے ہیں اور یورپ اور امریکہ میں اکثریت ان عورتوں کی ہے جن کو آٹھ گھنٹے کی ڈیوٹی دینے کے بعد اپنے گھر پہنچ کر کھانا پکانے، برتن دھونے اور گھر کی صفائی کا کام بھی کرنا پڑتا ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱ ص ۱۴۴ تا ۱۴۷]

کیا عورتیں اگر گھر میں رہیں گی تو معاشرے کی نصف آبادی بیکار ہوجائے گی؟

عورتوں کو گھر سے باہر نکالنے کے لیے آج کل ایک چلتا ہوا استدلال یہ پیش کیا جاتا ہے کہ ہم اپنی نصف آبادی کو عضو معطل بنا کر قومی تعمیر وترقی کے کام میں نہیں ڈال سکے، یہ بات اس شان سے کہی جاتی ہے کہ گویا ملک کے تمام مردوں کو کسی نہ کسی پر لگا کر مردوں کی حد تک ''مکمل روزگار'' کی منزل حاصل کرلی گئی ہے، اب نہ صرف یہ کہ کوئی مرد بے روزگار نہیں رہا بلکہ ہزار ہا کام ''مین پاور'' کے انتظار میں ہیں۔

حالانکہ یہ بات ایک ایسے ملک میں کہی جارہی ہے جہاں اعلیٰ صلاحیتوں کے حامل مرد سڑکوں پر جوتیاں چٹخاتے پھر رہے ہیں، جہاں کوئی چپراسی یا ڈرائیور کی آسامی نکلتی ہے تو اس کے لیے دسیوں گریجویٹ اپنی درخواستیں پیش کردیتے ہیں اور اگر کوئی کلرک کی جگہ نکلتی ہے تو اس کے لیے دسیوں ماسٹر اور ڈاکٹر تک کی ڈگریاں رکھنے والے اپنی درخواستیں پیش کردیتے ہیں، پہلے مردوں کی ''نصف آبادی'' ہی کو ملکی تعمیر وترقی کے کام میں پورے طور پر لگا لیجیے، اس کے بعد باقی نصف آبادی کے بارے میں سوچیے کہ وہ عضو معطل ہے یا نہیں؟

اللہ تعالیٰ نے عورت کو گھر کی ذمہ دار بنایا تھا، گھر کی منتظمہ بنایا تھا کہ وہ فیملی سسٹم استوار رکھ سکے، لیکن جب وہ گھر سے باہر آ گئی تو یہ ہوا کہ باپ بھی باہر اور ماں بھی باہر اور بچے اسکول میں یا نرسری میں اور گھر پر تالا پڑ گیا، اب وہ فیملی سسٹم تباہ اور برباد ہوکر رہ گیا، عورت کو تو اس لیے بنایا تھا کہ جب وہ گھر میں رہے گی تو گھر کا انتظام بھی کرے گی اور بچے اس کی گود میں تربیت پائیں گے، ماں کی گود بچے کی سب سے پہلی تربیت

گاہ ہوتی ہے، وہیں سے وہ اخلاق سیکھتے ہیں، وہیں سے وہ کردار سیکھتے ہیں، وہیں سے زندگی گذارنے کے صحیح طریقے سیکھتے ہیں، لیکن آج مغربی معاشرے میں فیملی سسٹم تباہ ہو کر رہ گیا ہے، بچوں کو ماں اور باپ کی شفقت میسر نہیں ہے، اور جب عورت دوسری جگہ کام کر رہی ہے اور مرد دوسری جگہ کام کر رہا ہے اور دونوں کے درمیان دن بھر میں کوئی رابطہ نہیں ہے اور دونوں جگہ پر آزادانہ سوسائٹی کا ماحول ہے تو بسا اوقات ان دونوں میں آپس کا رشتہ کمزور پڑ جاتا ہے اور ٹوٹنے لگتا ہے اور اس کی جگہ ناجائز رشتے پیدا ہونے شروع ہو جاتے ہیں اور اس کی وجہ سے طلاق تک نوبت پہنچتی ہے اور گھر برباد ہو جاتا ہے۔

اور پھر ان کا یہ کہنا کہ ''آدھی آبادی بے کار ہو جائے گی''، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کے نزدیک کام ہو ہے جس کے ذریعہ پیسہ حاصل ہو، لیکن اگر کوئی شخص خاندانی نظام کو درست کرنے کے لیے اور گھر کے ماحول کو پاکیزہ بنانے کے لیے کام کر رہا ہے تو وہ ان کے نزدیک کوئی کام نہیں ہے، حالانکہ گھر کے ماحول کو سدھارنا اور فیملی سسٹم کو برقرار رکھنا، ایک بہت بڑا کام ہے جو ایک عورت کر رہی ہے، لہٰذا وہ ایک عظیم فریضہ انجام دے رہی ہے اور بہت بڑا کردار ادا کر رہی ہے جس کے نتیجے میں ایک بہترین معاشرہ وجود میں آتا ہے۔

اگر یہ باتیں صرف میں کہتا تو کوئی کہہ سکتا تھا کہ یہ سب باتیں آپ تعصب کی بنا پر کہہ رہے ہیں، لیکن اب سے چند سال پہلے سوویت یونین کے آخری صدر ''میخائل گورباچوف'' نے ایک کتاب لکھی ہے ''پروسٹرائیکا''، آج یہ کتاب ساری دنیا میں مشہور ہے اور شائع شدہ شکل میں موجود ہے، اس کتاب میں گورباچوف نے عورتوں کے بارے میں (Status of Women) کے نام سے ایک باب قائم کیا ہے، اس میں اس نے صاف اور واضح لفظوں میں یہ بات لکھی ہے کہ:

> ''ہماری مغرب کی سوسائٹی میں عورت کو گھر سے باہر نکالا گیا اور اس کو گھر سے باہر نکالنے کے نتیجے میں بیشک ہم نے کچھ معاشی فوائد حاصل کیے اور پیداوار میں کچھ اضافہ ہوا، اس لیے کہ مرد بھی کام کر رہے ہیں اور عورتیں بھی کام کر رہی ہیں، لیکن پیداوار کے زیادہ ہونے کے باوجود اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوا کہ ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو گیا اور اس فیملی سسٹم کے تباہ ہونے کے نتیجے میں ہمیں جو نقصانات اٹھانے پڑے ہیں وہ نقصانات ان فوائد سے زیادہ ہیں جو پروڈکشن کے اضافے کے نتیجے میں ہمیں حاصل ہوئے، لہٰذا میں اپنے ملک میں ''پروسٹرائیکا'' کے نام سے ایک تحریک شروع کر رہا ہوں، اس میں میرا ایک بڑا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ عورت جو گھر سے باہر نکل چکی ہے اس کو واپس گھر میں کیسے لایا جائے؟ اس کے طریقے سوچنے پڑیں گے، ورنہ جس طرح ہمارا فیملی سسٹم تباہ ہو چکا ہے اسی طرح ہماری پوری قوم تباہ ہو جائے گی۔''

یہ الفاظ میخائل گورباچوف نے اپنی کتاب میں لکھے ہیں، وہ کتاب آج بھی بازار میں دستیاب ہے،

جس کا جی چاہے دیکھ لے۔

اس فیملی سسٹم کی تباہ کاری کی بنیادی وجہ یہ ہے کہ ہم نے عورت کی مقصد تخلیق کو نہیں جانا کہ عورت کو کیوں پیدا کیا گیا ہے؟ اللہ تعالی نے عورت کو اس لیے پیدا کیا تھا کہ وہ گھر کے نظام اور فیملی سسٹم کو استوار کرے، آج کے معاشی دور کی ساری کوششوں کا حاصل یہ ہے کہ روپیہ پیسہ زیادہ ہو جائے، لیکن یہ بتاؤ کہ کیا یہ روپیہ پیسہ بذات خود کچھ فائدہ پہنچا سکتا ہے؟ اگر آپ کو بھوک لگ رہی ہو اور آپ کے پاس پیسے موجود ہوں تو کیا آپ اس کو کھا کر بھوک مٹا لیں گے؟ ظاہر ہے کہ نہیں! تو معلوم ہوا کہ پیسہ بذات خود کوئی چیز نہیں، جب تک کہ اس کے ذریعہ ضرورت کی چیزیں مہیا کر کے آدمی سکون حاصل نہ کرے۔ [اصلاحی خطبات، ج۱، ص۱۴۷ تا ۱۵۰]

آج کی دنیا یہ کہتی ہے کہ اگر عورت کو گھر سے باہر نکالیں گے تو ہمیں ورکرز مہیا ہوں گے اور اس کے نتیجے میں پروڈکشن زیادہ ہوگی اور دولت زیادہ ہوگی، تو یہ بات ٹھیک ہے کہ گنتی میں تو دولت زیادہ ہو جائے گی لیکن جب تمہارا فیملی سسٹم تباہ ہو گیا اور اس کے نتیجے میں تمہاری قومی ترقی کا راستہ بند ہو گیا تو یہ کتنا بڑا نقصان ہو گیا۔

اللہ تبارک وتعالی نے آنحضرت ﷺ کی ازواج مطہرات کو براہ راست خطاب فرمایا اور ان کے واسطے سے ساری مسلمان خواتین سے خطاب فرمایا وہ یہ ہے کہ: ﴿وقرن فی بیوتکنّ﴾

یعنی تم اپنے گھروں میں قرار سے رہو، اس میں صرف اتنی بات نہیں کہ عورت کو ضرورت کے بغیر گھر سے باہر نہیں جانا چاہیے بلکہ اس آیت میں ایک بنیادی حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا گیا ہے وہ یہ کہ ہم نے عورت کو اس لیے پیدا کیا ہے کہ وہ گھر میں قرار سے رہ کر گھر کے انتظام کو سنبھالے، اس آیت میں اللہ تعالی نے اشارہ فرمایا کہ ہم نے عورت کو اس لیے پیدا کیا کہ وہ زندگی کی یہ اہم ترین خدمت انجام دے کر اپنے فیملی سسٹم کو استوار کرے اور اپنے گھر کو سنبھالے، اس کے تو کوئی معنی نہیں ہیں کہ گھر کا گھر اجڑا پڑا ہے اور ساری توجہ باہر کے کاموں میں صرف ہو رہی ہے، باہر رہ کر انسان جو کچھ کماتا ہے وہ تو اس لیے کماتا ہے کہ گھر کے اندر سکون حاصل کرے، لیکن اگر گھر کا سکون تباہ ہے تو پھر اس نے جتنی کچھ کمائی کی ہو وہ کمائی بیکار ہے، اس کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۱، ص۱۵۱، ۱۵۲]

مغرب کے اُلٹے پروپیگنڈے نے اور مغرب کی اندھی تقلید نے ہمارے معاشرے کی خواتین سے اولاد کی دینی تربیت کی فکر کو رفتہ رفتہ ختم کرنا شروع کر دیا ہے اور جو خواتین اپنے گھروں میں بیٹھی ہیں وہ بھی کبھی کبھی یہ سوچنے لگتی ہیں کہ واقعتہ یہ لوگ درست کہتے ہیں کہ ہم گھر کی چار دیواری میں مقید اور بند ہو گئے ہیں اور جو خواتین گھروں سے باہر نکل رہی ہیں شاید یہ ہم سے زیادہ ترقی یافتہ ہیں، لیکن خوب سمجھ لیں! کہ عورت جو خدمت اپنے گھر میں بیٹھ کر انجام دے رہی ہے، یاد رکھو! اس کا کوئی بدل نہیں ہے اور وہ خدمت گھر سے باہر نکل کر، بازاروں میں جا کر، دوکانوں پر بیٹھ کر نہیں انجام دی جا سکتی جو گھر میں بیٹھ کر انجام دی جا سکتی ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج۱، ص۱۵۳، ۱۵۴]

کیا عورت ضرورت کے وقت بھی گھر سے باہر نہیں جاسکتی؟

البتہ ایک سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آخر عورت بھی ایک انسان ہے، اس کو بھی گھر سے باہر جانے کی ضرورت پیش آسکتی ہے، اس کے دل میں بھی گھر سے باہر نکلنے کی خواہش ہوتی ہے تاکہ وہ اپنے عزیزوں اور رشتہ داروں سے ملاقات کرے اور بعض اوقات اپنی ذاتی ضرورتیں پوری کرنے کے لیے بھی باہر نکلنے کی ضرورت ہوتی ہے اور بعض اوقات اس کو جائز تفریح کی بھی ضرورت ہوتی ہے، اس لیے اس کو ان کاموں کے لیے گھر سے باہر جانے کی اجازت ہونی چاہیے۔

خوب سمجھ لیجیے! کہ یہ جو حکم ہے کہ گھر میں قرار سے رہو، اس کا یہ مطلب نہیں کہ گھر میں تالہ لگا کر عورت کو اندر بند کر دیا جائے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ عورت بلاضرورت گھر سے نہ نکلے، البتہ ضرورت کے وقت وہ گھر سے باہر بھی جاسکتی ہے، ویسے تو اللہ تعالیٰ نے عورت پر کسی زمانے میں بھی روزی کمانے کی ذمہ داری نہیں ڈالی، شادی سے پہلے اس کی مکمل کفالت باپ کے ذمے ہے اور شادی کے بعد اس کی تمام کفالت شوہر کے ذمے ہے، لیکن جس عورت کا نہ باپ ہو، نہ شوہر ہو اور نہ معاشی کفالت کا کوئی ذریعہ موجود ہو تو ظاہر ہے کہ اس کو معاشی ضرورت کے لیے گھر سے باہر جانا پڑے گا، اس صورت میں باہر جانے کی اجازت ہے، بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ جائز تفریح کے لیے بھی گھر سے باہر جانے کی اجازت ہے، آنحضرت ﷺ بعض اوقات حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو اپنے ساتھ گھر سے باہر بھی لے کر گئے، مدینہ طیبہ سے باہر کچھ فاصلے پر ایک بستی میں دعوت تھی، آنحضرت ﷺ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کو ساتھ لے کر چلے، راستے میں ایک کھلا میدان آیا، جس میں کوئی دوسرا شخص موجود نہیں تھا، اس وقت آنحضرت ﷺ نے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے ساتھ دوڑ لگائی، اب ظاہر ہے کہ دوڑ لگانا ایک جائز تفریح تھی، اس جائز تفریح کا بھی آنحضرت ﷺ نے اہتمام فرمایا، کیونکہ ایک خاتون کو جائز تفریح کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور اس قسم کی تفریح کی اجازت ہے بشرطیکہ جائز حدود میں ہو، بے پردگی کے ساتھ نہ ہو اور غیر محرموں کے ساتھ نہ ہو۔

اس سے معلوم ہوا کہ بوقت ضرورت عورتوں کو گھر سے باہر نکلنے کی بھی شریعت نے اجازت دی ہے، مگر باہر نکلنے کے لیے یہ شرط لگادی کہ پردے کی پابندی ہونی چاہیے اور اپنے جسم کی نمائش نہیں ہونی چاہیے، اسی لیے قرآن کریم میں اللہ تعالیٰ نے اگلا جملہ یہ ارشاد فرمایا: ﴿ولا تبرّجن تبرّج الجاهلية الأولى﴾

یعنی اگر کبھی نکلنے کی ضرورت ہو تو اس طرح زیب وزینت کے ساتھ نمائش کرتی ہوئی نہ نکلو جیسا کہ جاہلیت کی عورتیں نکلا کرتی تھیں اور ایسی آرائش اور زیب وزینت کے ساتھ نہ نکلو جس سے لوگوں کی توجہ ان کی طرف مبذول ہو، بلکہ حجاب کی پابندی کے ساتھ پردہ کر کے نکلو اور جسم ڈھیلے ڈھالے لباس میں چھپا ہوا ہو، ہمارے زمانے میں تو برقع کا رواج ہے اور حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں چادریں استعمال ہوتی تھیں اور وہ چادریں سر سے لے کر پاؤں تک پورے جسم کو چھپا لیتی تھیں، خلاصہ یہ ہے کہ ضرورت کے وقت

عورت کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت تو دی گئی، لیکن اس کے باہر نکلنے سے فتنے کا اندیشہ ہے اور اس فتنے کا سد باب پردہ کے ذریعہ ہوجائے گا اس لیے حجاب کا حکم عائد کیا گیا۔

[اصلاحی خطبات، ج ا، ص ۱۶۳، ۱۶۶]

باہر نکلتے وقت عورت کی ہیئت کیسی ہو؟

دوسرا حکم یہ دیا ہے کہ جب وہ گھر سے باہر نکلے یا نامحرم مردوں کے سامنے آئے تو اس وقت اس کے پورے جسم پر کوئی چیز ہونی چاہیے، چاہے وہ چادر ہو یا برقع ہو جو اس کے پورے جسم کو ڈھانپ رہا ہو، تا کہ وہ لوگوں کے لیے فتنے کا باعث نہ بنے اور اس کے ذریعے معاشرے کے اندر فتنہ نہ پھیلے، اور ایک حکم یہ بھی دیا ہے کہ کوئی خاتون ایسا زیور پہن کر گھر سے باہر نہ نکلے جو بجنے والے ہوں، کیونکہ اس کی آواز سے لوگوں کی توجہ اس کی طرف مبذول ہوگی، اور ایک حکم یہ بھی دیا ہے کہ کوئی خاتون خوشبو لگا کر گھر سے باہر نہ نکلے، کیونکہ خوشبو کے ذریعہ لوگوں کی توجہ اس کی طرف ہوگی، حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جب کوئی خاتون خوشبو لگا کر گھر سے باہر نکلتی ہے تو شیطان اس کی تاک جھانک میں لگ جاتا ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۵، ص ۲۰۷]

پردہ و حجاب

کیا پردہ (حجاب) کا حکم صرف ازواج مطہرات کے لیے خاص تھا؟

بعض حضرات یہ کہتے ہیں کہ پردہ کا حکم صرف ازواج مطہرات کے لیے تھا اور یہ حکم ان کے علاوہ دوسری عورتوں کے لیے نہیں ہے اور اسی مندرجہ بالا آیت ہی سے استدلال کرتے ہیں کہ اس آیت میں خطاب صرف ازواج مطہرات کو کیا جارہا ہے۔

یادرکھو! یہ بات نقلی اور عقلی ہر اعتبار سے غلط ہے، اس لیئے کہ ایک طرف تو اس آیت میں شریعت کے بہت سے احکام دیے گئے ہیں، مثلا ایک حکم تو یہی ہے کہ: ﴿ولا تبرّجن تبرّج الجاهلية الأولى﴾

ترجمہ: جاہلیت کی عورتوں کی طرح خوب زیب وزینت اور آرائش کر کے باہر نہ نکلو۔

تو کیا یہ حکم صرف ازواج مطہرات کو ہے؟ اور دوسری عورتوں کو اس کی اجازت ہے کہ جاہلیت کی عورتوں کی طرح زیب وزینت کر کے باہر نکلا کریں؟ ظاہر ہے کہ دوسری عورتوں کو بھی اجازت نہیں، اور آگے ایک حکم یہ دیا کہ: ﴿وأقمن الصلوة﴾

ترجمہ: اور نماز قائم کرو۔

تو کیا نماز قائم کرنے کا حکم ازواج مطہرات کے لیے ہے؟ اور دوسری عورتوں کو نماز کا حکم نہیں؟ اور اس کے بعد ایک حکم یہ دیا گیا کہ: ﴿وأتين الزكوة﴾

ترجمہ: اور زکوۃ ادا کرو۔

تو کیا زکوۃ کا حکم صرف ازواج مطہرات کو ہے؟ دوسری عورتوں کو نہیں؟

اور آگے فرمایا کہ: ﴿وأطعن الله ورسوله﴾

ترجمہ: اور اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کرو۔

تو کیا اللہ اور اس کے رسول کی اطاعت کا حکم صرف ازواج مطہرات کو ہے؟ دوسری عورتوں کو نہیں ہے؟ پوری آیت کا سیاق وسباق یہ بتا رہا ہے کہ اس آیت میں جتنے احکام ہیں وہ سب کے لیے عام

ہیں، اگرچہ براہ راست خطاب ازواج مطہرات کو ہے لیکن ان کے واسطے سے پوری امت کی عورتوں کو خطاب ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ حجاب اور پردے کا مقصد یہ تھا کہ معاشرے کے اندر بے پردگی کے نتیجے میں جو فتنہ پیدا ہوسکتا ہے اس کا سد باب کیا جائے، اب سوال یہ ہے کہ کیا فتنہ صرف ازواج مطہرات کے باہر نکلنے سے پیدا ہوگا؟ معاذ اللہ! وہ ازواج مطہرات کہ ان جیسی پاکیزہ خواتین اس روئے زمین پر پیدا نہیں ہوئیں، کیا انہیں سے فتنے کا خطرہ تھا؟ کیا دوسری عورتوں کے نکلنے سے فتنے کا اندیشہ نہیں ہے؟ تو جب ازواج مطہرات کو یہ حکم دیا جارہا ہے کہ تم پردہ کے ساتھ نکلو تو دوسری عورتوں کو یہ حکم بطریق اولی دیا جائے گا، اس لیے کہ ان سے فتنہ کا اندیشہ زیادہ ہے۔

اس کے علاوہ دوسری آیت میں پوری امت مسلمہ سے خطاب ہے، فرمایا:

﴿یا أیها النبی قل لأزواجك و بناتك ونساء المؤمنین یدنین علیهن من جلابیبهن﴾

ترجمہ: اے نبی! اپنی بیویوں سے بھی کہہ دو اور اپنی بیٹیوں سے بھی کہہ دو اور تمام مؤمنوں کی عورتوں سے بھی کہہ دو کہ وہ اپنے چہروں پر اپنی چادریں لٹکا لیا کریں۔

اس سے زیادہ صاف اور واضح حکم کوئی اور نہیں ہوسکتا، ''جلابیب'' جمع ہے ''جلباب'' کی اور ''جلباب'' اس چادر کو کہا جاتا ہے جس میں سر سے پاؤں تک عورت کا پورا جسم اس میں چھپا ہوا ہو اور پھر قرآن کریم نے صرف چادر پہننے کا حکم نہیں دیا بلکہ لفظ ''یدنین'' لائے، جس کے معنی یہ ہیں کہ وہ چادر آگے ڈھلکا لیں تاکہ چہرہ بھی نمایاں نہ ہو اور اس چادر میں چھپ جائے، اب اس سے زیادہ واضح اور کیا حکم ہوسکتا ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱، ص ۱۶۷ تا ۱۷۰]

چھرہ پردے میں داخل ھے یا نھیں؟

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ باقی جسم کا پردہ تو ہے لیکن چہرے کا پردہ نہیں ہے، خوب اچھی طرح سمجھ لیں کہ اول تو چہرے کا پردہ ہے، قرآن کریم نے عورتوں سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

﴿یدنین علیهن من جلابیبهن﴾ [الاحزاب:٥٩]

اس آیت میں ''جلابیب'' کا لفظ اختیار فرمایا ہے، یہ جمع ہے ''جلباب'' کی اور جلباب اس چادر کو کہا جاتا ہے جو سر سے لے کر پاؤں تک پورے جسم کو ڈھانپ لے، اس میں اور برقع میں فرق صرف یہ ہے کہ برقع سلا ہوا ہوتا ہے اور جلباب سلی ہوئی نہیں ہوتی اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں خواتین جلباب ہی استعمال کیا کرتی تھیں، اس آیت میں فرمایا کہ ''آپ تمام مؤمن عورتوں سے کہہ دیجیے کہ وہ اپنی جلبابیں اپنے

اوپر جھکالیں''، اس آیت میں جھکانے کا حکم دیا ہے، تاکہ عورت کے چہرے کو اس طرح منظر عام پر نہ لایا جائے جو فتنے کا سبب بنے لہذا اول تو چہرے کا پردہ ہے اور قرآن کریم کے حکم کے مطابق ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۵، ص ۲۰۸]

چہرے کے پردے کا انکار کرنے والوں کی عجیب منطق

لیکن میں کہتا ہوں کہ جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ چہرے کا پردہ نہیں ہے، وہ لوگ درحقیقت پردہ ہی سے اپنے کو آزاد کرنا چاہتے ہیں، کیونکہ جو لوگ چہرے کے پردے کا انکار کرتے ہیں، انہوں نے آج تک کبھی ان عورتوں پر نکیر نہیں کی کہ جو باہر نکلتی ہیں تو ان کا چہرہ تو درکنار بلکہ ان کا سینہ کھلا ہوا ہوتا ہے، ان کا گلا کھلا ہوا ہوتا ہے، ان کے بازو کھلے ہوئے ہوتے ہیں، ان کی پنڈلیاں کھلی ہوئی ہوتی ہیں اور ان خواتین نے ایسا چست اور تنگ لباس پہنا ہوا ہوتا ہے جو فتنے کا سبب ہے، لیکن یہی لوگ ایسی خواتین پر نکیر نہیں کرتے، ہاں! اس مسئلے پر بحث کرنے کے لیے تیار ہیں کہ چہرے کا پردہ ہے یا نہیں!۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۵، ص ۲۰۹]

حجاب اور پردہ کی کیا حد ہے؟

''حجاب'' کے بارے میں اتنی بات ضرور عرض کردوں کہ ''حجاب'' میں اصل بات یہ ہے کہ سر سے لے کر پاؤں تک پورا جسم چادر سے یا برقع سے یا کسی ڈھیلے ڈھالے گاؤن سے ڈھکا ہوا ہو اور بال بھی ڈھکے ہوئے ہوں اور چہرے کا حکم یہ ہے کہ اصلاً چہرے کا بھی پردہ ہے، اس لیے چہرے پر بھی نقاب ہونا چاہیے، اور یہ جو آیت میں نے ابھی تلاوت کی کہ: ﴿يدنين عليهن من جلابيبهن﴾

اس آیت کی تفسیر میں حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ اس زمانے میں خواتین یہ کرتی تھیں کہ چادر اپنے اوپر ڈال کر اس کا ایک پلہ چہرے پر ڈال لیتی تھیں اور صرف آنکھیں کھلی رہتی تھیں اور باقی چہرہ چادر کے اندر ڈھکا ہوتا تھا، تو ''حجاب'' کا اصل طریقہ یہ ہے، البتہ چونکہ ضروریات بھی پیش آتی ہیں اس لیے اللہ تعالی نے چہرے کی حد تک یہ گنجائش دی ہے کہ جہاں چہرہ کھولنے کی شدید ضرورت داعی ہو اس وقت صرف چہرہ کھولنے اور ہاتھوں کو گٹوں تک کھولنے کی اجازت ہے، ورنہ اصل حکم یہی ہے کہ چہرہ سمیت پورا جسم ڈھکا ہونا چاہیے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱، ص ۱۷۶]

اور خواتین یہ نہ سمجھیں کہ یہ پردہ ہمارے لیے دشواری کا سبب ہے، بلکہ عورت کی فطرتؑ میں پردہ داخل ہے اور ''عورت'' کے معنی ہی ''چھپانے والی چیز'' کے ہیں اور پردہ عورت کی سرشت میں داخل ہے، اگر فطرت مسخ ہو جائے تو اس کا تو کوئی علاج نہیں، لیکن جو تسکین اور راحت پردہ کی حالت میں ہوگی وہ تسکین بے پردگی اور کھلم کھلا اور علانیہ رہنے کی حالت میں نہیں ہوگی، لہذا پردہ کا تحفظ حیاء کا ایک لازمی حصہ ہے۔

ایسا معلوم ہوتا ہے کہ حضور اقدس ﷺ کی نگاہیں آج کے حالات دیکھ رہی تھیں، آپ ﷺ نے فرمایا کہ:

''قیامت کے قریب ایسی عورتیں ہوں گی کہ ان کے سر کے بال لاغر اونٹ کی کوہان کی طرح ہوں گے''

، اونٹ کے کوہان کی طرح بال بنانے کا حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں تصور بھی نہیں آسکتا تھا ،آج دیکھ لیں کہ عورتیں اونٹوں کے کوہان کی طرح بال بنا رہی ہیں۔

اور فرمایا کہ وہ عورتیں بظاہر تو لباس پہنی ہوئی ہوں گی لیکن وہ لباس ایسے ہوں گے کہ جن سے ستر کا مقصد حاصل نہیں ہوگا، اس لیے کہ وہ لباس اتنا باریک ہوگا یا وہ لباس اتنا چست ہوگا کہ اس کی وجہ سے جسم کے تمام نشیب وفراز عیاں ہوجائیں گے اور یہ سب حیاء کے ختم ہونے کا نتیجہ ہوگا، آج سے پہلے اس کا تصور اور خیال بھی نہیں آسکتا تھا کہ عورت ایسا لباس پہنے گی، اس لیے کہ اس کے دل میں حیا تھی اور اس کی طبیعت ایسی تھی کہ وہ ایسا لباس پہننا پسند نہیں کرتی تھی، لیکن آج سینہ کھلا ہوا ہے، گلا کھلا ہوا ہے، بازو کھلے ہیں، یہ کیسا لباس ہے؟ لباس تو ستر پوشی کے لیے تھا جو عورت کو اس کی اصل فطرت کی طرف لوٹانے کے لیے تھا، وہ لباس ستر پوشی کا کام دینے کے بجائے جسم کو اور زیادہ نمایاں کرنے کا کام انجام دے رہا ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج۱،ص ۱۵۴]

مرد حجاب کے راستے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں

واقعہ یہ ہے کہ ایک عورت کی پاکیزہ اور پارسا زندگی کے لیے حجاب ایک بنیادی اہمیت رکھتا ہے ،لہٰذا مردوں کا فرض ہے کہ وہ خواتین کو اس پر آمادہ کریں اور خواتین کا فرض ہے کہ وہ اس کی پابندی کریں، اس وقت بہت زیادہ افسوس ہوتا ہے جب بعض اوقات خواتین حجاب کرنا چاہتی ہیں لیکن مرد راستے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں، اکبر الہ آبادی مرحوم نے بڑا اچھا قطعہ کہا ہے کہ:

بے پردہ کل جو نظر آئیں چند بیبیاں
اکبر زمین میں غیرت قومی سے گڑ گیا
پوچھا جو ان سے پردہ تمہارا وہ کیا ہوا
کہنے لگیں عقل پہ مردوں کی پڑ گیا

آج حقیقت میں پردہ مردوں کی عقلوں پر پڑ گیا ہے، وہ پردے کے راستے میں رکاوٹ بن رہے ہیں، اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ہم سب کو غلط خیالات سے نجات عطا فرمائے اور اللہ اور اللہ کے رسول ﷺ کے احکام کے مطابق زندگی گذارنے کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

[اصلاحی خطبات، ج۱،ص ۱۷۷]

خواتین حالت احرام میں کس طرح پردہ کریں ؟

آپ کو معلوم ہے کہ حج کے موقع پر احرام کی حالت میں عورت کے لیے کپڑے کو چہرے پر لگانا جائز نہیں، مرد سر نہیں ڈھک سکتے اور عورتیں چہرہ نہیں ڈھک سکتیں، تو جب حج کا موسم آیا اور آنحضرت ﷺ ازواج مطہرات کو حج کرانے کے لیے تشریف لے گئے، اس وقت یہ مسئلہ پیش آیا کہ ایک طرف تو پردہ کا حکم ہے اور دوسری طرف یہ حکم ہے کہ حالت احرام میں کپڑا منہ پر نہ لگنا چاہیے، حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فرماتی ہیں کہ جب ہم حج کے سفر پر اونٹ پر بیٹھ کر جارہی تھیں تو ہم نے اپنے ماتھے پر ایک لکڑی لگائی ہوئی تھی تو راستے میں جب سامنے کوئی اجنبی نہ ہوتا تو ہم اپنے نقاب الٹے رہنے دیتیں اور جب کوئی قافلہ یا اجنبی مرد سامنے آتا دکھائی دیتا تو ہم اپنا نقاب اس لکڑی پر ڈال دیتیں تاکہ وہ نقاب چہرہ پر نہ لگے اور پردہ بھی ہوجائے، اس روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ احرام کی حالت میں بھی ازواج مطہرات نے پردہ کو ترک نہیں فرمایا۔

[ابو داود، کتاب الحج، باب فی المحرمة تغطی وجها]

ابوداود کی روایت ہے کہ ایک خاتون کا بیٹا حضور اقدس ﷺ کے ساتھ ایک غزوہ میں گیا ہوا تھا، جنگ کے بعد تمام مسلمان واپس آئے، لیکن اس کا بیٹا واپس نہیں آیا، اب ظاہر ہے کہ اس وقت ماں کی بے تابی کی کیا کیفیت ہوگی اور اس بے تابی کے عالم میں حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں یہ پوچھنے کے لیے دوڑیں کہ میرے بیٹے کا کیا بنا؟ اور جاکر حضور اقدس ﷺ سے پوچھا کہ یا رسول اللہ! میرے بیٹے کا کیا ہوا؟ صحابہ کرام رضی اللہ عنہ نے جواب دیا کہ تمہارا بیٹا تو اللہ کے راستے میں شہید ہوگیا، اب بیٹے کے مرنے کی اطلاع اس پر بجلی بن کر گری، اس اطلاع پر اس نے جس صبر وضبط سے کام لیا وہ اپنی جگہ ہے، لیکن اسی عالم میں کسی شخص نے اس خاتون سے یہ پوچھا کہ اے خاتون! تم اتنی پریشانی کے عالم میں اپنے گھر سے نکل کر حضور اقدس ﷺ کی خدمت میں آئیں اس حالت میں بھی تم نے اپنے چہرے پر نقاب ڈالا ہوا ہے؟ اور اس وقت بھی نقاب ڈالنا نہیں بھولیں؟ جواب میں اس خاتون نے کہا:

"إن أزرأ ابني فلن أزرأ حيائی"

میرا بیٹا تو فوت ہوا ہے لیکن میری حیا تو فوت نہیں ہوئی۔

یعنی میرے بیٹے کا جنازہ نکلا ہے لیکن میری حیا کا جنازہ تو نہیں نکلا، تو اس حالت میں بھی پردہ کا اتنا اہتمام فرمایا۔ [ابوداود، کتاب الجهاد، باب فضل قتال الروم وعلی غيرهم من الأمم]

[اصلاحی خطبات، ج ۱، ص ۱۷۰]

کیا اسلام نے عورتوں کے ساتھ ظالمانہ سلوک کیا کہ ان کو گھروں میں قید کردیا اور ان کے چہروں پر نقاب ڈال دی اور ان کو کارٹون بنادیا ؟

اب اہل مغرب نے یہ پروپیگنڈہ شروع کردیا کہ مسلمانوں نے عورتوں کے ساتھ بڑا ظالمانہ سلوک کیا ہے کہ ان کو گھروں میں بند کردیا، ان کے چہروں پر نقاب ڈال دی اور ان کو ایک کارٹون بنادیا، تو کیا مغرب کے اس مذاق اور پروپیگنڈے کے نتیجے میں ہم اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان احکام کو چھوڑ دیں؟

یاد رکھو! جب ہمارے اپنے دلوں میں یہ ایمان اور اعتماد پیدا ہو جائے کہ ہم نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے جو طریقہ سیکھا ہے وہی طریقہ برحق ہے تو پھر اہل مغرب کے طعنوں کی پرواہ نہیں، کوئی مذاق اڑاتا ہے تو اڑایا کرے، کوئی طعنے دیتا ہے تو دیا کرے، یہ طعنے تو مسلمان کے گلے کا زیور ہیں، انبیاء علیہم السلام جو اس دنیا میں تشریف لائے کیا انہوں نے کچھ کم طعنے سہے؟ جتنے انبیاء علیہم السلام اس دنیا میں تشریف لائے ان کو یہ طعنے دیے گئے کہ یہ تو پس ماندہ لوگ ہیں، یہ دقیانوس اور رجعت پسند ہیں، یہ ہمیں زندگی کی راحتوں سے محروم کرنا چاہتے ہیں، یہ سارے طعنے انبیاء کو دیے گئے اور تم جب مؤمن ہو تو انبیاء کے وارث ہو اور جس طرح وراثت میں دوسری چیزیں ملتی ہیں یہ طعنے بھی ملیں گے، کیا اس وراثت سے گھبرا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طریقہ کار کو چھوڑ دو گے؟ اگر اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر ایمان ہے تو پھر ان طعنوں کو سننے کے لیے کمر کو مضبوط کر کے بیٹھنا ہوگا۔

اور اگر فرض کرو کہ ان طعنوں کے نتیجے میں ان کے کہنے پر عمل کرلیا پھر بھی تیسرے درجے کے شہری رہو گے، وہ کہتے ہیں کہ عورتوں کو گھر میں مت بٹھاؤ اور ان کو پردہ نہ کراؤ، حجاب نہ کراؤ، اب آپ نے ان کی بات مانتے ہوئے اس پر عمل کرلیا اور عورتوں کو گھر سے باہر نکال دیا، ان کا پردہ بھی اتار دیا، دوپٹہ بھی اتار دیا، سبھی کچھ کرلیا، لیکن کیا انہوں نے یہ مان لیا کہ تم ہمارے ہو؟ اور کیا انہوں نے تمہیں وہی حقوق دے دیے؟ کیا تمہیں وہی عزت دی؟ نہیں! بلکہ اب بھی تم رجعت پسند اور دقیانوس ہو، اور اب بھی جب تمہارا نام آئے گا تو طعنوں کے ساتھ آئے گا، اگر تم نے سر سے لے کر پاؤں تک ہر چیز میں ان کی بات مان لی پھر بھی تم تیسرے درجے کے شہری رہو گے۔

[اصلاحی خطبات، ج۱،ص ۱۷۱ تا ۱۷۳]

یاد رکھو! جو شخص اس کام کے لیے ہمت کر کے اپنی کمر باندھ لیتا ہے، وہی شخص دنیا سے اپنی عزت بھی کراتا ہے، عزت درحقیقت اسلام کو چھوڑنے میں نہیں ہے بلکہ اسلام کو اختیار کرنے میں ہے، حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے فرمایا تھا کہ: "إنّ الله قد أعزّنا بالإسلام"

اللہ تعالی نے ہمیں جو کچھ عزت دی ہے وہ اسلام کی بدولت ہے۔

اگر ہم اسلام کو چھوڑ دیں گے تو اللہ تعالیٰ ہمیں عزت کے بجائے ذلت سے ہمکنار کریں گے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱، ص ۱۷۴]

آج کل پروپیگنڈے کا ایک طوفان اُمڈ رہا ہے، اور یہ پروپیگنڈہ غیر مسلموں کی طرف سے تھا، اب نام نہاد مسلمانوں کی طرف سے بھی پروپیگنڈے کا ایک طوفان ہے، وہ پروپیگنڈہ یہ ہے کہ اسلام نے اور ان مولویوں نے عورت کو گھر کی چاردیواری میں مقید کر دیا ہے اور اس کو گھر سے باہر نکلنے کی اجازت نہیں، آج کی دنیا پروپیگنڈے کی دنیا ہے، جس میں بد سے بدترین جھوٹ کو پروپیگنڈے کی طاقت سے لوگوں کے دلوں میں اس طرح بٹھا دیا جاتا ہے جیسے کہ یہ پکی اور سچی حقیقت ہے، جرمنی کا مشہور سیاست دان گذرا ہے جس کا نام تھا گوئیرنگ، اس کا یہ مقولہ مشہور ہے کہ دنیا میں جھوٹ اتنی شدت کے ساتھ پھیلاؤ کہ دنیا اس کو سچ سمجھنے لگے، یہی اس کا فلسفہ ہے، آج چاروں طرف اسی فلسفہ پر عمل ہو رہا ہے۔

چنانچہ آج یہ پروپیگنڈہ کیا جا رہا ہے کہ یہ اکیسویں صدی ہے، اس میں عورتوں کو گھر کی چاردیواری مین مقید کر دینا پرلے درجے کی دقیانوسیت ہے اور رجعت پسندی ہے، اور زمانہ کی ترقی کے ساتھ قدم ملا کر چلنے والی بات نہیں ہے، غور سے یہ بات سن لیں کہ قرآن کریم عورتوں سے یہ جو کہہ رہا ہے کہ اپنے گھروں میں قرار سے رہو، ایک بڑی اصولی ہدایت ہے، جو اللہ جل شانہ نے عطا فرمائی ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۵، ص ۱۸۹]

نکاح و شادی

منگنی شریعت میں کیا حیثیت رکھتی ہے؟

کسی شخص نے منگنی کرلی، اور کسی سے رشتہ کرنے کے بارے میں طے کرلیا تو یہ منگنی ایک وعدہ ہے، اس لیے حتی الامکان اس کو نبھانا چاہیے، لیکن اگر کوئی عذر پیش آجائے، مثلاً منگنی کرنے کے بعد معلوم ہوا کہ ان دونوں کے درمیان اتفاق واتحاد قائم نہیں رہے گا، طبیعتوں اور مزاجوں میں فرق ہے، اور کچھ حالات ایسے سامنے آئے جو پہلے معلوم نہیں تھے، اس صورت میں اس کو بتادے کہ ہم نے آپ سے شادی کا وعدہ اور منگنی کی تھی، لیکن اب فلاں عذر کی وجہ سے ہم اس کو پورا نہیں کر سکتے، لیکن جب تک عذر نہ ہو، اس وقت تک وعدہ کو نبھانا اور اس وعدہ کو پورا کرنا شرعاً واجب ہے، اور اگر وعدہ پورا نہیں کرے گا گناہ گار ہوگا۔

[اصلاحی خطبات، ج ۳، ص ۱۶۰]

شادی بیاہ کی تقریبات اور دعوتیں
کیا اسلام میں خوشی منانے پر پابندی ہے

خوشی کے مواقع پر اعتدال کے ساتھ خوشی منانے پر شریعت نے کوئی پابندی نہیں لگائی، لیکن خوشی منانے کے نام پر ہم نے اپنے آپ کو جن بے شمار رسموں کو جکڑ لیا ہے، ان کا نتیجہ یہ ہے کہ خوشی، جو دل کی فرحت کا نام تھا، وہ تو پیچھے چلی گئی ہے، اور رسموں کے لگے بندھے قواعد آگے آگئے ہیں، جن کی ذرا خلاف ورزی ہو تو شکوے شکایتوں اور طعن وتشنیع کا طوفان کھڑا ہوجاتا ہے، لہٰذا شادی کی تقریبات رسموں کی خانہ پری کی نذر ہوجاتی ہیں، جس میں پیسہ تو پانی کی طرح بہتا ہی ہے، دل ودماغ ہر وقت رسمی قواعد کے بوجھ تلے دبے رہتے ہیں، شادی کے انتظامات کرنے والے تھک کر چور ہوجاتے ہیں، پھر بھی کہیں نہ کہیں کوئی نہ کوئی شکایت کا سامان پیدا ہی ہوجاتا ہے، جس کے نتیجے میں بعض اوقات لڑائی جھگڑوں تک بھی نوبت پہنچ جاتی ہے۔

زبان سے اس صورت حال کو ہم سب قابل اصلاح سمجھتے ہیں، لیکن جب عمل کی نوبت آتی ہے تو عموماً پرنالہ وہیں گرتا ہے، اور ایک ایک کر کے رسموں کے آگے ہتھیار ڈالتے چلے جاتے ہیں۔

اس صورت حال کا کوئی حل اس کے سوانہیں ہے کہ اول تو بااثر اور خوش حال لوگ بھی اپنی شادیوں کی تقریبات میں حتی الامکان سادگی اختیار کریں،، اور ہمت کر کے ان رسموں کو توڑیں جنہوں نے شادی کو ایک عذاب بنا کر رکھ دیا ہے، دوسرے اگر دولت مند افراد اس طریقہ کار کو نہیں چھوڑتے تو کم از کم محدود آمدنی والے حضرات یہ طے کر لیں کہ وہ دولت مندوں کی حرص میں اپنا پیسہ اور توانائیاں ضائع کرنے کے بجائے اپنی چادر کے مطابق پاؤں پھیلائیں گے، اور اپنی استطاعت کی حدود سے آگے نہیں بڑھیں گے۔

اس سلسلے میں اگر ہم مندرجہ ذیل باتوں کا خاص طور پر اہتمام کر لیں تو امید ہے کہ مذکورہ بالا خرابیوں میں انشاء اللہ نمایاں کمی واقع ہوگی:۔

① خاص نکاح اور ولیمہ کی تقریبات کے علاوہ جو تقریبات منگنی، مہندی ابٹن اور چوتھی وغیرہ کے نام سے رواج پا گئی ہیں، ان کو یکسر ختم کیا جائے اور یہ طے کر لیا جائے کہ ہماری شادیوں میں یہ تقریبات نہیں ہوں گی، فریقین اگر واقعی محبت اور خوش دلی سے ایک دوسرے کو کوئی تحفہ دینا یا بھیجنا چاہتے ہیں وہ کسی باقاعدہ تقریب اور لاؤلشکر کے بغیر سادگی سے پیش کر دیں گے۔

② اظہار مسرت کے کسی بھی مخصوص طریقے کو لازمی اور ضروری نہ سمجھا جائے بلکہ ہر شخص اپنے حالات اور وسائل کے مطابق بے تکلفی سے جو طرز عمل اختیار کرنا چاہے کر لے، نہ وہ خود کسی کی حرص کا شکار یا رسموں کا پابند ہو، نہ دوسرے اسے مطعون کریں۔

③ نکاح اور ولیمے کی تقریبات بھی حتی الامکان سادگی سے اپنے وسائل کی حد میں رہتے ہوئے منعقد کی جائیں، اور صاحب تقریب کا یہ حق تسلیم کیا جائے کہ وہ اپنے حالات کے مطابق جس کو چاہے دعوت دے، اور جس کو چاہے دعوت نہ دے، اس معاملے میں بھی کسی کو کوئی سنجیدہ شکایت نہیں ہونی چاہئے۔

④ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد ہمیشہ سامنے رہے کہ ''سب سے زیادہ برکت والا نکاح وہ ہے جس میں زیر باری کم سے کم ہو'' یعنی جس میں انسان نہ مالی طور پر زیر بار ہو، اور نہ بیجا مشقت و محنت کے کسی بوجھ میں میں مبتلا ہو۔ [ذکر و فکر، ص ۲۶۹]

مَردوں اور عورتوں کی مخلوط بے پردہ تقریبات

شادی بیاہ کی تقریبات میں بے حیائی کے مناظر ان گھرانوں میں بھی نظر آنے لگے ہیں جو اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں، جن کے مرد مسجد میں صف اول میں نماز پڑھتے ہیں، ان کے گھرانوں کی شادی بیاہ کی تقریبات میں جا کر دیکھو کہ کیا ہو رہا ہے؟ ایک زمانہ وہ تھا جس میں اس بات کا خیال اور تصور نہیں آ سکتا تھا کہ شادی بیاہ کی تقریبات میں مردوں اور عورتوں کا مخلوط اجتماع ہوگا، لیکن اب تو مرد و عورت کی مخلوط دعوتوں کا ایک سیلاب ہے اور عورتیں بن سنور کر، سنگھار پٹار کر کے، زیب و زینت سے آراستہ ہو کر ان مخلوط

دعوتوں میں شریک ہوتی ہیں، نہ پردہ کا کوئی تصور ہے، نہ حیاء کا کوئی خیال ہے۔

اور پھر ان تقریبات کی ویڈیو فلمیں بن رہی ہیں تا کہ جو کوئی اس تقریب میں شریک نہ ہو سکا اور اس نظارے سے لطف اندوز نہیں ہو سکا اس کے لیے اس نظارہ سے لطف اندوز ہونے کے لیے ویڈیو فلم تیار ہے ،اس کے ذریعہ وہ اس کا نظارہ کر سکتا ہے، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن پھر بھی دیندار ہیں، پھر بھی نمازی پرہیز گار ہیں، یہ سب کچھ ہو رہا ہے، لیکن کان پر جوں نہیں رینگتی اور ماتھے پر شکن نہیں آتی اور دل میں اس کو ختم کرنے کا داعیہ پیدا نہیں ہوتا، بتایئے! کیا پھر بھی یہ فتنے نہ آئیں؟ کیا پھر بھی بدامنی اور بے سکونی پیدا نہیں ہو؟ اور آج کل ہر ایک کی جان و مال وعزت آبرو خطرے میں ہے، یہ سب کیوں نہ ہو! یہ تو اللہ تعالی کی طرف سے غنیمت ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی برکت ہے کہ ایسا قہر ہم پر نازل نہیں ہوتا کہ ہم سب ہلاک ہو جائیں ورنہ ہمارے اعمال تو سارے ایسے ہیں کہ ایک قہر اور ایک عذاب کے ذریعہ سب کو ہلاک کر دیا جاتا۔

”ابھی تو نوجوان ہیں لگے رہنے دو ان کے کاموں میں رکاوٹ نہ ڈالو“

اور یہ سب گھر کے بڑوں کی غفلت اور بے حسی کا نتیجہ ہے کہ ان کے دل سے احساس ختم ہو گیا، کوئی کہنے والا اور کوئی ٹوکنے والا نہیں رہا، بچے جہنم کی طرف دوڑے ہوئے جا رہے ہیں، کوئی ان کا ہاتھ پکڑ کر روکنے والا نہیں ہے، کسی باپ کے دل میں یہ خیال نہیں آتا کہ ہم اپنی اولاد کو کس گڑھے میں دھکیل رہے ہیں اور دن رات سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں، اب اگر کوئی ان کو سمجھاتا ہے تو ان بڑوں کا یہ جواب ہوتا ہے کہ ارے بھائی! یہ تو نوجوان ہیں، لگے رہنے دو، ان کے کاموں میں رکاوٹ نہ ڈالو، اس طرح ان اولاد کے سامنے ہتھیار ڈال کر نتیجہ یہاں تک پہنچ گیا۔

اب بھی وقت ہاتھ سے نہیں گیا، اب بھی اگر گھر کے سربراہ اور گھر کے ذمہ دار اس بات کا تہیہ کرلیں کہ یہ چند کام نہیں کرنے دیں گے، ہمارے گھر میں مرد وعورت کا مخلوط اجتماع نہیں ہوگا، ہمارے گھر میں کوئی تقریب عورتوں کی بے پردگی کے ساتھ نہیں ہوگی، ویڈیو فلم نہیں بنے گی، اگر گھر کے بڑے ان باتوں کا تہیہ کرلیں تو اب بھی اس سیلاب پر بند باندھا جا سکتا ہے، ایسا نہیں ہے کہ یہ سیلاب قابو سے باہر ہوا ہو، لیکن اس وقت سے ڈرو کہ جب کوئی کہنے والا خیر خواہ اس صورت حال کو تبدیل کرنے کی کوشش کرے گا اور نہیں کر سکے گا ،کم از کم وہ گھرانے جو اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں، جو دین اور اسلام کے نام لیوا ہیں اور بزرگوں سے تعلق رکھنے والے ہیں، وہ تو کم از کم اس بات کا تہیہ کرلیں کہ ہم یہ مخلوط اجتماع نہیں ہونے دیں گے۔

ہمارے بزرگوں نے بائیکاٹ وغیرہ کرنے کے طریقے نہیں سکھائے، لیکن یاد رکھو! ایک مرحلہ ایسا آتا ہے جہاں انسان کو یہ فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ یا تو ہماری یہ بات مانی جائے گی، ورنہ اس تقریب میں ہماری شرکت نہیں ہوگی، اگر شادی کی تقریبات ہو رہی ہیں اور مخلوط اجتماعات ہو رہے ہیں اور آپ سوچ رہے ہیں کہ

اگر اس دعوت میں نہیں جاتے تو خاندان والوں کو شکایت ہو جائے گی کہ آپ اس مخلوط دعوت میں شریک کیوں نہیں ہوئے؟ ارے! یہ تو سوچو کہ ان کی شکایت کی تو آپ کو پرواہ ہے لیکن ان کو آپ کی شکایت کی پرواہ نہیں، اگر تم پردہ نشین خاتون ہو اور وہ تم کو دعوت میں بلانا چاہتے ہیں تو انہوں نے تمہارے لیے پردہ کا انتظام کیوں نہیں کیا؟ جب انہوں نے تمہارا اتنا خیال نہیں کیا تو پھر تم پر بھی ان کا خیال کرنا واجب نہیں ہے، ان سے صاف صاف کہہ دو کہ ہم ایسی تقریب میں شریک نہیں ہوں گی، جب تک کچھ خواتین ڈٹ کر یہ فیصلہ نہیں کریں گی یقین رکھو کہ اس وقت تک یہ سیلاب بند نہیں ہوگا، کب تک ہتھیار ڈالتے جاؤ گے؟ کب تک ان کے آگے سپر ڈالتے جاؤ گے؟ یہ سیلاب کہاں تک پہنچے گا؟

"اگر ہم مخلوط تقریبات میں شرکت نہ کریں تو دنیا والے کیا کہیں گے؟"

ہمارے بزرگ حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی رحمۃ اللہ علیہ (اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے، آمین) اس دور کے اندر اللہ تعالیٰ نے جنتی بزرگ پیدا فرمائے تھے، ان کے گھر کی بیٹھک میں فرشی نشست تھی، گھر کی خواتین کے دل میں یہ خیال آیا کہ اب زمانہ بدل گیا ہے، فرشی نشست کا زمانہ نہیں رہا، اس لیے آکر مولانا سے کہا کہ اب آپ یہ فرشی نشست ختم کر دیں اور صوفے وغیرہ لگا دیں، حضرت مولانا نے فرمایا کہ مجھے تو نہ صوفے کا شوق ہے اور نہ مجھے اس پر آرام ملتا ہے، مجھے فرش پر بیٹھ کر آرام ملتا ہے، میں تو اسی پر بیٹھ کر کام کروں گا، خواتین نے کہا کہ آپ کو اس پر آرام ملتا ہے مگر دنیا والوں کا کچھ خیال کر لیا کریں جو آپ کے پاس ملنے کے لیے آتے ہیں ان کا ہی کچھ خیال کر لیں، اس پر حضرت مولانا نے کیا عجیب جواب دیا، فرمایا: بی بی! دنیا والوں کا تو میں خیال کر لوں لیکن یہ تو بتاؤ کہ دنیا والوں نے میرا کیا خیال کر لیا؟ میری وجہ سے کسی نے اپنے طرز زندگی میں یا کسی نے اپنے کسی کام میں کوئی تبدیلی لائی؟ جب انہوں نے میرا خیال نہیں کیا تو میں ان کا کیوں خیال کروں؟

لہٰذا جس کے دل میں تمہارے پردے کا احترام نہیں، جس کے دل میں تمہارے پردے کی وقعت اور عظمت نہیں، وہ اگر تمہارا خیال نہیں کرتا تو تم ان کا خیال کیوں کرتی ہو؟ حالانکہ اگر ایک بے پردہ عورت، عورتوں کے لیے علیحدہ انتظام کی ہوئی جگہ میں آکر بیٹھ جائے اور مردوں کے سامنے نہ آئے تو اس میں اس کا کوئی نقصان اور کوئی خرابی نہیں، لیکن اگر پردہ دار عورت مردوں کے سامنے چلی جائے تو اس پر قیامت گذر جائے گی، اگر پردہ کا انتظام نہ ہونے کے باوجود تم صرف اس لیے جاتی ہو تا کہ وہ برا نہ مانیں، کہیں ان کو برا نہ لگ جائے، ارے! کبھی تم بھی تو برا مانا کرو کہ ہم اس بات کو برا مانتے ہیں کہ ہمیں ایسی دعوت میں کیوں بلایا جا رہا ہے؟ ہمارے لیے ایسی دعوتیں کیوں کی جاتی ہیں جس میں پردہ کا انتظام نہیں ہے، یاد رکھو!

جب تک یہ نہیں کریں گے یہ سیلاب نہیں رکے گا۔

جہاں تقریبات میں بظاہر خواتین کا انتظام علیحدہ بھی ہے، مردوں کے لیے علیحدہ شامیانے ہیں اور عورتوں کے لیے علیحدہ، لیکن اس میں بھی یہ ہوتا ہے کہ عورتوں والے حصے میں بھی مردوں کا ایک طوفان ہوتا ہے، مرد آرہے ہیں، جارہے ہیں، ہنسی مذاق ہو رہا ہے، دل لگی ہو رہی ہے، فلمیں بن رہی ہیں، یہ سب کچھ ہو رہا ہے اور بظاہر دیکھنے میں الگ انتظام ہے، ایسے موقع پر خواتین کھڑے ہوکر کیوں یہ نہیں کہتیں کہ مرد یہاں کیوں آرہے ہیں؟ ہم پردہ نشین خواتین ہیں لہذا اِن مردوں کو باہر نکالا جائے۔

شادی بیاہ میں بہت سے معاملات پر لڑائی جھگڑے ہوجاتے ہیں اور اس بات پر ناراضگیاں ہوجاتی ہیں کہ ہمارا فلاں جگہ پر خیال نہیں کیا! اور ہمارا فلاں جگہ پر خیال نہیں کیا! اسی پر لڑائی جھگڑے کھڑے ہوجاتے ہیں اور ایک دوسرے کے ساتھ تلخیاں پیدا ہوجاتی ہیں، تم اگر پردہ نشین خاتون ہوتو اور چیزوں پر ناراضگی کا اظہار نہ کرو لیکن جب تمہارے دین پر ڈاکہ ڈالا جائے تو وہاں تمہارے لیے خاموش رہنا جائز نہیں، کھڑے ہوکر بھری تقریب میں کہہ دو کہ یہ چیز ہمارے لیے ناقابل برداشت ہے، جب تک کچھ مرد اور خواتین اس بات کا تہیہ نہیں کرلیں گے اس وقت تک یاد رکھو! حیاء کا تحفظ نہیں ہوسکے گا اور یہ سیلاب بڑھتا چلا جائے گا۔

بہرحال! ہم لوگ جو کم از کم دین کا نام لیتے ہیں جب تک اس کا عزم اور تہیہ نہیں کرلیں گے اس وقت تک یہ سیلاب نہیں رکے گا، خدا کے لیے اس کا عزم کرلیں، ورنہ پھر اللہ کے عذاب کے لیے تیار رہیں، کسی کے اندر اگر اس عذاب کے سہارنے کی ہمت ہے تو وہ اس کے لیے تیار ہوجائے یا پھر اس کا عزم کرلیں۔

[اصلاحی خطبات، ج ا، ص ۱۵۵ تا ۱۶۰]

کیا بتیس روپے مہر شرعی ہے؟

پچھلے دنوں ایک نکاح نامہ میری نظر سے گذرا جس میں ''مہر'' کے خانے میں یہ عبارت لکھی ہوئی تھی: ''مبلغ بتیس روپیہ مہر شرعی'' اس سے پہلے بھی کئی مرتبہ لوگوں سے بات چیت کے دوران یہ اندازہ ہوا کہ وہ خدا جانے کس وجہ سے بتیس روپے کو مہر شرعی سمجھتے ہیں اور یہ تاثر تو بہت زیادہ پھیلا ہوا ہے کہ مہر جتنا کم سے کم رکھا جائے شریعت کی نگاہ میں اتنا ہی مستحسن ہے، اس کے علاوہ بھی مہر کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں لوگوں میں پائی جاتی ہیں جن کا ازالہ ضروری ہے۔ [ذکر وفکر، ص ۲۷۶]

جن لوگوں نے آج کے دور میں بتیس روپیہ مہر باندھ کر اسے مہر شرعی قرار دیا، انھوں نے دو غلطیاں کیں، ایک غلطی تو یہ کی کہ دس درہم کی قیمت کسی زمانے میں بتیس رہی ہوگی، انہوں نے اسے ہمیشہ کے لیے بتیس روپیہ ہی سمجھ لیا، دوسری غلطی یہ کی کہ شریعت نے مہر کی جو کم سے کم مقدار مقرر کی تھی، اس کا مطلب یہ

سمجھ لیا کہ شرعا پسندیدہ ہی یہ ہے کہ اس سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے، حالانکہ یہ تصور قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔
[ذکر وفکر، ص ۲۷۸]

مہر کی حقیقت اور شریعت میں اس کی حیثیت

''مہر'' دراصل ایک اعزازیہ (Honorarium) ہے جو ایک شوہر اپنی بیوی کو پیش کرتا ہے، اور اس کا مقصد عورت کا اعزاز واکرام ہے، نہ تو یہ عورت کی قیمت ہے جسے ادا کر کے یہ سمجھا جائے کہ وہ شوہر کے ہاتھوں بِک گئی، اور اب اس کی حیثیت ایک کنیز کی ہے، اور نہ یہ محض ایک فرضی کاروائی ہے جس کے بارے میں یہ سمجھا جائے کہ اسے عملاً ادا کرنے کی ضرورت نہیں، شوہر کے ذمے بیوی کا مہر لازم کرنے سے شریعت کا منشا یہ ہے کہ جب کوئی شخص بیوی کو اپنے گھر میں لائے تو اس کا مناسب اکرام کرے، اور اسے ایک ایسا ہدیہ پیش کرے جو اس کے اعزاز واکرام کے مناسب ہو، لہذا شریعت کا تقاضا یہ ہے کہ مہر کی رقم نہ تو اتنی کم رکھی جائے جس میں اعزاز واکرام کا یہ پہلو بالکل مفقود ہو، اور نہ اتنی زیادہ رکھی جائے کہ شوہر اسے ادا کرنے پر قادر نہ ہو، اور بالآخر یا تو مہر ادا کیے بغیر دنیا سے رخصت ہو جائے یا آخر میں بیوی سے معاف کرانے پر مجبور ہو۔

''مہر مثل'' کسے کہتے ہیں؟

شرعی نقطہ نظر سے ہر عورت کا اصل حق یہ ہے کہ اسے ''مہر مثل'' ادا کیا جائے، مہر مثل کا مطلب مہر کی وہ مقدار ہے جو اس عورت کے خاندان میں عام طور سے اس جیسی خواتین کے نکاح کے وقت مقرر کی جاتی رہی ہو، اور اگر اس عورت کے خاندان میں دوسری عورتیں نہ ہوں تو خاندان سے باہر اس کے ہم پلہ خواتین کا جو مہر عام طور سے مقرر کیا جاتا ہو وہ اس عورت کا مہر مثل ہے، اور شرعی اعتبار سے بیوی مہر مثل وصول کرنے کی حق دار ہے، یہی وجہ ہے کہ اگر نکاح کے وقت باہمی رضامندی سے مہر کا تعین نہ کیا گیا ہو، یا مہر کا ذکر کیے بغیر نکاح کر لیا گیا ہو تو مہر مثل خود بخود لازم سمجھا جاتا ہے، البتہ اگر بیوی خود مہر مثل سے کم پر خوش دلی سے راضی ہو جائے یا شوہر خوش دلی سے مہر مثل سے زیادہ مہر مقرر کر لے تو باہمی رضامندی سے مہر مثل سے کم یا زیادہ مقرر کر لینا بھی شرعاً جائز ہے، لیکن یہاں بھی شریعت نے زیادہ سے زیادہ مہر کی تو کوئی حد مقرر نہیں کی۔

شریعت میں مہر کی کم سے کم حد کیا ہے؟

البتہ شریعت نے کم سے کم مہر کی حد مقرر کر دی ہے، اور وہ حد (حنفی موقف کے مطابق) دس درہم ہے، دس درہم کا مطلب دو تولہ ساڑھے سات ماشہ چاندی ہے (موجودہ قیمت بازار سے معلوم کر لی جائے) اس کم سے کم مقدار کا مطلب یہ نہیں ہے کہ اتنا مہر رکھنا شرعاً پسندیدہ ہے، بلکہ مطلب یہ ہے کہ اس سے کم مہر پر اگر خود عورت بھی راضی ہو جائے تو شریعت راضی نہیں ہے، کیونکہ اس سے مہر کا مقصد، یعنی عورت کا اعزاز واکرام پورا نہیں ہوتا، یہ کم سے کم حد بھی ان لوگوں کا خیال کر کے رکھی گئی ہے جو مالی اعتبار سے کمزور ہیں، اور

زیادہ رقم خرچ کرنے کے متحمل نہیں، ان کے لیے یہ گنجائش پیدا کردی گئی ہے کہ اگر عورت راضی ہوتو کم از کم اس مقدار پر نکاح ہوسکتا ہے، لیکن اس کا یہ مطلب لینا کسی طرح درست نہیں ہے کہ شریعت کو منظور ہی یہ ہے کہ مہر کی مقدار یہی رکھی جائے اور اسے اس معنی میں مہر شرعی قرار دیا جائے، جن لوگوں نے آج کے دور میں بتیس روپیہ مہر باندھ کر اسے مہر شرعی قرار دیا، انہوں نے دو غلطیاں کیں، ایک غلطی تو یہ کی کہ دس درہم کی قیمت کسی زمانے میں بتیس رہی ہوگی، انہوں نے اسے ہمیشہ کے لیے بتیس روپیہ ہی سمجھ لیا، دوسری غلطی یہ کی کہ شریعت نے مہر کی جو کم سے کم مقدار مقرر کی تھی، اس کا مطلب یہ سمجھ لیا کہ شرعاً پسندیدہ ہی یہ ہے کہ اس سے زیادہ مہر مقرر نہ کیا جائے، حالانکہ یہ تصور قطعی طور پر بے بنیاد ہے۔

مہر فاطمی کسے کہتے ہیں ؟

آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہؓ کا مہر پانچ سو درہم مقرر فرمایا تھا، جو ۱۳۱ تولہ تین ماشہ چاندی کے برابر ہوتا ہے (موجودہ قیمت بازار سے معلوم کرلی جائے)، خود آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی متعدد ازواج مطہرات کا مہر بھی اس کے قریب قریب ہی مقرر فرمایا، جو اوسط درجے کے لحاظ سے ایک قابل لحاظ مقدار ہے۔

کیا مہر فاطمی ہی مہر شرعی ہوتا ہے ؟

بعض حضرات اس مہر فاطمی ہی کو مہر شرعی کے الفاظ سے تعبیر کرتے ہیں اور غالباً ان کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ شرعی اعتبار سے اس سے کم یا زیادہ مہر مقرر کرنا پسندیدہ نہیں، یہ تصور بھی صحیح نہیں ہے، اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر فریقین مہر فاطمی کے برابر مہر مقرر کریں اور نیت یہ ہو کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی مقرر کی ہوئی مقدار بابرکت اور معتدل ہوگی، نیز یہ کہ اس سے اتباع سنت کا اجر ملنے کی توقع ہے، تو یقیناً یہ جذبہ بہت مبارک اور مستحسن ہے، لیکن یہ سمجھنا درست نہیں ہے کہ یہ مقدار اس معنی میں مہر شرعی ہے کہ اس سے کم یا زیادہ مقرر کرنا شرعاً ناپسندیدہ ہے، بلکہ واقعہ یہ ہے کہ اس سے کم یا زیادہ مہر مقرر کرنے میں شرعاً کوئی قباحت نہیں ہے، ہاں! یہ اصول مدنظر رکھنا ضروری ہے کہ مہر اتنا ہو جس سے بیوی کا اعزاز و اکرام بھی ہو اور وہ شوہر کی استطاعت سے باہر بھی نہ ہو۔

مہر معجل کسے کہتے ہیں ؟

جب مہر کا ذکر چل نکلا تو ایک اور نکتے کی وضاحت بھی ہوجائے، مہر کی دو قسمیں مشہور ہیں :

مہر معجّل اور مہر مؤجل

یہ الفاظ چونکہ صرف نکاح کی مجلس ہی میں سنائی دیتے ہیں اس لیے بہت سے لوگوں کو ان کا مطلب معلوم نہیں ہوتا، شرعی اعتبار سے مہر معجّل اس مہر کو کہتے ہیں جو نکاح ہوتے ہی شوہر کے ذمے لازم ہوجاتا ہے،

اور یہ اس کا فریضہ ہے کہ یا تو نکاح کے وقت ہی بیوی کو ادا کردے، یا اس کے بعد جتنی جلد ممکن ہو، عورت کو بھی ہر وقت یہ حق حاصل ہے کہ وہ جب چاہے اس کا مطالبہ کر لے، چونکہ ہمارے معاشرے میں خواتین عام طور سے مطالبہ نہیں کرتیں، اس لیے اس سے یہ نہ سمجھنا چاہیے کہ اس کی ادائیگی ہمارے لیے ضروری نہیں، بلکہ شوہر کا یہ فرض ہے کہ وہ عورت کے مطالبے کا انتظار کیے بغیر بھی جس قدر جلد ممکن ہو اس فرض سے سبک دوش ہو جائے۔

مہر مؤجل کسے کہتے ہیں ؟

مہر مؤجل اس مہر کو کہا جاتا ہے جس کی ادائیگی کے لیے فریقین نے آئندہ کی کوئی تاریخ متعین کر لی ہو، جو تاریخ اس طرح متعین کر لی جائے، اس سے پہلے اس کی ادائیگی شوہر کے ذمے لازم نہیں ہوتی، نہ بیوی اس سے پہلے مطالبہ کر سکتی ہے، لہٰذا مہر کے موجل ہونے کا اصل مطلب تو یہی ہے کہ اس کی ادائیگی کے لیے کوئی تاریخ نکاح کے وقت ہی مقرر کر لی جائے، لیکن ہمارے معاشرے میں عام طور سے کوئی تاریخ مقرر کیے بغیر صرف یہی کہہ دیا جاتا ہے کہ اتنا مہر مؤجل ہے، اور ہمارے معاشرے کے رواج کے مطابق اس کا مطلب یہ سمجھا جاتا ہے کہ مہر کی یہ مقدار اس وقت واجب الادا ہوگی جب نکاح ختم ہو جائے گا، چنانچہ اگر طلاق ہو جائے تب مہر مؤجل کی ادائیگی لازم ہوگی، یا میاں بیوی میں سے کسی کا انتقال ہو جائے تب اس کی ادائیگی لازم سمجھی جاتی ہے۔ [ذکر و فکر، ص ۲۷۶ تا ۲۸۱]

جہیز کی حقیقت اور حیثیت

ہمارے معاشرے میں جہیز کو جس طرح بیٹی کی شادی کا ایک ناگزیر حصہ قرار دے لیا گیا ہے، اس کے بارے میں عالم اسلام کے دوسرے علاقوں کا کیا نقطہ نظر ہے؟ شرعی اعتبار سے بھی جہیز کی حقیقت صرف اتنی ہے کہ اگر کوئی باپ اپنی بیٹی کو رخصت کرتے وقت اسے کوئی تحفہ اپنی استطاعت کے مطابق دینا چاہے تو دیدے، اور ظاہر ہے کہ تحفہ دیتے وقت لڑکی کی آئندہ ضروریات کو مدنظر رکھا جائے تو زیادہ بہتر ہے، لیکن وہ نہ شادی کے لئے کوئی لازمی شرط ہے، نہ سسرال والوں کو کوئی حق پہنچتا ہے کہ وہ اس کا مطالبہ کریں، اور اگر کسی لڑکی کو جہیز نہ دیا جائے یا کم دیا جائے تو اس پر برا منائیں یا لڑکی کو مطعون کریں، اور نہ یہ کوئی دکھاوے کی چیز ہے کہ شادی کے موقع پر اس کی نمائش کر کے اپنی شان و شوکت کا اظہار کیا جائے۔ [ذکر و فکر، ص ۲۸۳]

جہیز کے بارے میں معاشرے میں پھیلے ہوئے غلط تصورات

اس سلسلے میں ہمارے معاشرے میں جو غلط تصورات پھیلے ہوئے ہیں وہ مختصراً درج ذیل ہیں:

① جہیز کو لڑکی کی شادی کے لئے ایک لازمی شرط سمجھا جاتا ہے، چنانچہ جب تک جہیز دینے کے لئے پیسے نہ ہوں، لڑکی کی شادی نہیں کی جاتی، ہمارے معاشرے میں نہ جانے کتنی لڑکیاں اسی وجہ سے بن بیاہی

رہتی ہیں کہ باپ کے پاس انہیں دینے کے لئے جہیز نہیں ہوتا، اور جب شادی سر پر ہی آجائے تو جہیز کی شرط پوری کرنے کے لئے باپ کو بعض اوقات روپیہ حاصل کرنے کے لئے ناجائز ذرائع اختیار کرنے پڑتے ہیں، اور وہ رشوت، جعلسازی، دھوکہ فریب اور خیانت جیسے جرائم کے ارتکاب پر آمادہ ہوجاتا ہے، اور اگر کوئی باپ اتنا باضمیر ہے کہ ان ناجائز ذرائع کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تو کم از کم اپنے آپ کو قرض ادھار کے شکنجے میں جکڑنے پر مجبور ہوتا ہے۔

② جہیز کی مقدار اور اس کی لازمی اشیاء کی فہرست میں بھی روز بروز اضافہ ہوتا جارہا ہے، اب جہیز محض ایک بیٹی کے لئے باپ کا تحفہ نہیں ہے جو وہ اپنی خوش دلی سے اپنی استطاعت کی حد میں رہ کر دے، بلکہ معاشرے کا ایک جبر ہے، چنانچہ اس میں صرف بیٹی کی ضروریات ہی داخل نہیں، بلکہ اس کے شوہر کی ضروریات پوری کرنا اور اس کے گھر کو مزین کرنا بھی ایک لازمی حصہ ہے، خواہ لڑکی کے باپ کا دل چاہے یا نہ چاہے، اسے یہ تمام لوازم پورے کرنے پڑتے ہیں۔

③ بات صرف اتنی نہیں ہے کہ لڑکی کی ضروریات پوری کرکے اس کا دل خوش کیا جائے، بلکہ جہیز کی نمائش کی رسم نے یہ بھی ضروری قرار دیدیا ہے کہ جہیز ایسا ہو جو ہر دیکھنے والے کو خوش کرسکے، اور ان کی تعریف حاصل کرسکے۔

④ جہیز کے سلسلے میں سب سے گھٹیا بات یہ ہے کہ لڑکی کا شوہر یا اس کی سسرال کے لوگ جہیز پر نظر رکھتے ہیں، بعض جگہ تو شاندار جہیز کا مطالبہ پوری ڈھٹائی سے کیا جاتا ہے اور بعض جگہ اگر صریح مطالبہ نہ ہو تب بھی توقعات یہ باندھی جاتی ہیں کہ دلہن اچھا سا جہیز لے کر آئے گی، اور اگر یہ توقعات پوری نہ ہوں تو لڑکی کو طعنے دے دے کر اس کے ناک میں دم کردیا جاتا ہے۔

جہیز کے ساتھ اس قسم کی جو رسمیں اور تصورات نتھی کردیئے گئے ہیں اور ان کی وجہ سے جو معاشرتی خرابیاں جنم لیتی رہی ہیں، ان کا احساس ہمارے معاشرے کے اہل فکر میں مفقود نہیں، اس موضوع پر بہت کچھ لکھا بھی گیا ہے، بعض تجاویز بھی پیش کی گئی ہیں، بلکہ سرکاری سطح پر بعض قوانین بھی بنائے گئے ہیں، اور ان کوششوں کا یہ اثر بحمدللہ یہ ضرور ہوا ہے کہ اب جہیز کے بارے میں لوگوں کے بہت سے تصورات میں تبدیلی آئی ہے، جہیز کی نمائش کا سلسلہ کم ہوا ہے، بین الممالک شادیوں میں جہیز کی پابندی حالات کے جبر نے ترک کرادی ہے، لیکن ابھی تک معاشرے کے ایک بڑے حصے میں ان غلط تصورات کی حکمرانی ختم نہیں ہوئی۔

[ذکر و فکر، ص ۲۸۳]

کیا جہیز پر قانونی پابندی نہیں لگائی جاسکتی؟

بعض حضرات یہ تجویز پیش کرتے ہیں کہ جہیز کو قانوناً بالکل ممنوع قرار دیدیا جائے، لیکن دراصل یہ ایک معاشرتی مسئلہ ہے اور اس قسم کے مسائل صرف قانون کی جکڑ بند سے حل نہیں ہوتے، اور نہ ایسے قوانین

پرعمل کرناممکن ہوتا ہے،اس کے لئے تعلیم وتربیت اورذرائع ابلاغ کے ذریعے ایک مناسب ذہنی فضاتیارکرنے کی ضرورت ہے، بذات خوداس بات میں کوئی شرعی یااخلاقی خرابی بھی نہیں ہے، کہ ایک باپ اپنی بیٹی کورخصت کرتے وقت اپنے دل کے تقاضے سے اسے ایسی چیزوں کاتحفہ پیش کرے جواسے آئندہ زندگی میں کارآمدہوں،خودحضوراقدسﷺ نے اپنی صاحبزادی حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہاسادگی کے ساتھ کچھ جہیزعطافرمایاتھا،شرعی اعتبار سے اس قسم کے جہیز کے لئے کوئی مقدار بھی مقررنہیں ہے، اگردوسرے مفاسدنہ ہوں توباپ اپنے دلی تقاضے کے تحت جوکچھ دیناچاہے دے سکتا ہے،لیکن خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ اول تواسے نمودونمائش کاذریعہ بنایاجاتا ہے،اوردوسرے لڑکے والے عملاً اسے اپناحق سمجھتے ہیں، زیادہ سے زیادہ جہیزکی امیدیں باندھتے ہیں، اورانتہائی گھٹیابات یہ ہے کہ اس کی کمی کی وجہ سےلڑکی اوراس کے گھروالوں کومطعون کرتے ہیں،جہیزکی ان خرابیوں کوختم کرنے کے لئے معاشرے کے تمام طبقات کوان تصورات کے خلاف جہادکرناپڑے گا،تعلیم وتربیت، ذرائع ابلاغ اوروعظ ونصیحت کے ذریعے ان تصورات کی قباحتیں مختلف اندازواسلوب سے متواتربیان کرنے اورکرتے رہنے کی ضرورت ہے،یہاں تک کہ یہ گھٹیاباتیں ہرکس وناکس کی نظرمیں ایک ایساعیب بن جائیں جس کی طرف اپنی نسبت سے لوگ شرمانے لگیں، کسی بھی معاشرے میں پھیلے ہوئے غلط تصورات یابری عادتیں اسی طرح رفتہ رفتہ دورہوتی ہیں کہ اس معاشرے کے اہل اقتدار، اہل علم ودانش اوردوسرے بارسوخ طبقےمل جل کرایک ذہنی فضاتیارکرتے ہیں، یہ ذہنی فضارفتہ رفتہ فروغ پاتی ہے، اورلوگوں کی تربیت کرتی ہے،لیکن اس کے لئے دردمنددل اورانتھک جدوجہددرکارہے،افسوس ہے کہ ہمارے ان طبقوں کے بیشترافرادکچھ ایسے مسائل میں الجھ گئے ہیں کہ معاشرے کی اصلاح وتربیت کاکام، جوکسی بھی قوم کی تعمیرکے لئے سنگِ بنیادکی حیثیت رکھتا ہے، کسی شمارقطارمیں نظرنہیں آتا، ذہنی تربیت اورکردارسازی کاکام سیاست اورفرقہ واریت کی ہاؤہُومیں ایساگم ہواکہ اب اس کانام بھی ایک مذاق معلوم ہونے لگاہے،لیکن اس صورت حال میں مایوس ہوکربیٹھ جانابھی درست نہیں، ایک داعیٔ حق کاکام یہ ہے کہ وہ اپنی بات کہنے سے نہ اکتائے، اپنے دائرے کی حدتک کام کرنے سے نہ تھکے۔ بالآخرایک وقت آتا ہے کہ حق وصداقت کی کشش دوسروں کوبھی اپنی طرف کھینچناشروع کردیتی ہے، اورقوموں کی نہ صرف سوچ میں بلکہ عمل میں بھی انقلاب آجاتا ہے۔ [ذکروفکر،ص ۲۸۵]

کیا جہیز دینے کے بعد وراثت سے بیٹی کا حصہ ختم ہوجاتا ہے؟

یہ عرض کیاجاچکا ہے کہ جہیزہرگزنکاح کاکوئی ضروری حصہ نہیں ہے، اوراس کی استطاعت نہ ہونے کی صورت میں لڑکی کونکاح کے بغیربٹھائے رکھناہرگزجائزنہیں، کوئی باپ اپنی بیٹی کورخصت کرتے وقت اپنی استطاعت کی حدودمیں رہتے ہوئے خوشی سے بیٹی کوکوئی تحفہ دیناچاہےتووہ بےشک دے سکتا ہے،لیکن نہ اس

کو نکاح کی لازمی شرط سمجھنے کی گنجائش ہے، نہ اس میں نام ونمود کا کوئی پہلو ہونا چاہئے، اور نہ شوہر یا اس کے گھر والوں کے لئے جائز ہے کہ وہ جہیز کا مطالبہ کریں، یا اس کی توقعات باندھیں۔

اب مکتوب نگار نے جو نئی بات ذکر کی ہے وہ یہ ہے کہ "کیا جہیز دینے کے بعد ماں باپ کو اپنی وراثت سے حصہ دینا ضروری نہیں رہتا؟" واقعی یہ غلط فہمی بعض حلقوں میں خاصی عام ہے، اس سلسلے میں عرض یہ ہے کہ جہیز کا وراثت سے قطعاً کوئی تعلق نہیں ہے، اگر کسی باپ نے اپنی بیٹی پر جہیز کی صورت میں اپنی ساری کائنات بھی لوٹا دی ہو تب بھی لڑکی کا حق وراثت ختم نہیں ہوتا، باپ کے انتقال کے بعد وہ اپنے باپ کے ترکے میں ضرور حصہ دار ہوگی، اور اس کے بھائیوں کے لئے ہرگز جائز نہیں ہے کہ وہ سارا ترکہ خود لے بیٹھیں، اور اپنی بہن کو اس بنیاد پر محرم کر دیں کہ اسے جہیز میں بہت کچھ مل چکا ہے، لڑکا ہو یا لڑکی، ان کے باپ نے اپنی زندگی میں انہیں جو کچھ دیا ہو، اس سے ان کے وراثت کے حصے میں کوئی کمی نہیں آتی، البتہ باپ کو اس بات کا حتی الامکان خیال رکھنا چاہئے کہ اپنی زندگی میں وہ اپنی اولاد کو جو کچھ دے، وہ قریب قریب برابر ہو، اور کسی ایک لڑکے یا لڑکی پر دولت کی بارش برسا کر دوسروں کو محروم نہ کرے، لیکن یہ ایک مستقل مسئلہ ہے جس کی تفصیل انشاء اللہ کسی اور موقع پر عرض کروں گا، بہر حال! یہ طے شدہ بات ہے، اور اس میں شرعی اعتبار سے کوئی ادنی شابہ نہیں، کہ لڑکی کو جہیز دینے سے اس کا حق وراثت ختم نہیں ہوتا، بلکہ جہیز میں دی ہوئی مالیت کو اس کی حصہ وراثت سے منہا بھی نہیں کیا جا سکتا، اسے بہر صورت ترکے سے اپنا پورا حصہ ملنا ضروری ہے۔ [ذکر وفکر، ص ۲۸۸]

رخصتی اور برات کے کھانے کی شرعی حیثیت کیا ہے؟

مکتوب نگار نے دوسرا مسئلہ یہ اٹھایا ہے کہ "لڑکی کے والدین برات کو جو کھانا کھلاتے ہیں، اس کی شرعی حیثیت کیا ہے؟" اس معاملے میں بھی ہمارے معاشرے میں افراط وتفریط پر مبنی تصورات پھیلے ہوئے ہیں، بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جس طرح لڑکے کے لئے نکاح کے بعد ولیمہ کرنا سنت ہے، اسی طرح لڑکی کے باپ کے لئے بھی نکاح کے وقت دعوت کرنا سنت یا کم از کم شرعی طور پر پسندیدہ ہے، حالانکہ یہ خیال بالکل بے بنیاد ہے، لڑکی والوں کی طرف سے کسی دعوت کا اہتمام نہ سنت ہے، نہ مستحب ہے، بلکہ اگر دوسری خرابیاں نہ ہوں تو صرف جائز ہے، یہی معاملہ بارات کا ہے، نکاح کے وقت دولہا کی طرف سے بارات لے جانا کوئی سنت نہیں، نہ نکاح کو شریعت نے اس پر موقوف کیا ہے، لیکن اگر دوسری خرابیاں نہ ہوں تو بارات لے جانا کوئی گناہ بھی نہیں، لہٰذا بعض حضرات جو بارات لے جانے اور لڑکی والوں کی طرف سے ان کی دعوت کو ایسا گناہ سمجھتے ہیں جیسے قرآن وسنت نے اس سے خاص طور پر منع کیا ہو، ان کا یہ تشدد بھی مناسب نہیں، حقیقت یہ ہے کہ اگر اعتدال کے ساتھ کچھ لوگ نکاح کے موقع پر لڑکی کے گھر چلے جائیں، (جس میں لڑکی کے باپ پر کوئی بار نہ ہو) اور لڑکی کے والدین اپنی بچی کے نکاح کے فریضے سے سبکدوش ہونے کی خوشی میں اپنی دلی خواہش

سے ان کی اور اپنے دوسرے عزیزوں دوستوں کی دعوت کردیں تو اس میں بذات خود کوئی گناہ نہیں ہے، لیکن ان تمام چیزوں میں خرابی یہاں سے پیدا ہوتی ہے کہ ان تقریبات کو نکاح کا لازمی حصہ سمجھ لیا جاتا ہے، اور جو شخص انہیں انجام دینے کی استطاعت نہ رکھتا ہو، وہ بھی خواہی نخواہی ان پر مجبور ہو جاتا ہے، اور اس غرض کے لئے بعض اوقات ناجائز ذرائع اختیار کرتا ہے، اور بعض اوقات قرض ادھار کا بوجھ اپنے سر لیتا ہے، اور اگر کوئی شخص اپنے مالی حالات کی وجہ سے یہ کام نہ کرے تو اسے معاشرے میں مطعون کیا جاتا ہے۔

کسی شخص کو کوئی ہدیہ تحفہ دینا اس کی دعوت کرنا اگر دل کے تقاضے اور محبت سے ہو تو نہ صرف یہ کہ کوئی گناہ نہیں، بلکہ باعث برکت ہے، بالخصوص جب نئے رشتے قائم ہو رہے ہوں، تو ایسا کرنے سے باہمی محبت میں اضافہ ہوتا ہے، بشرطیکہ یہ سب کچھ خلوص سے ہو، اور اپنی استطاعت کی حدود میں رہ کر ہو، لیکن جب یہ چیز نام ونمود اور دکھاوے کا ذریعہ بن جائے یا اس میں بدلے کی طلب شامل ہو جائے، یا یہ کام خوش دلی کے بجائے معاشرے اور ماحول کے جبر کے تحت انجام دیئے جائیں، یعنی اندر سے دل نہ چاہ رہا ہو، لیکن ناک کٹنے کے خوف سے زبردستی تحفے دیئے جائیں یا دعوتیں کی جائیں تو یہی کام جو باعث برکت ہو سکتے تھے الٹے گناہ، بے برکتی اور نحوست کا سبب بن جاتے ہیں، اور ان کی وجہ سے معاشرہ طرح طرح کی اخلاقی برائیوں میں مبتلا ہو جاتا ہے، ہماری شامت اعمال یہ ہے کہ ہم نے اپنے آپ کو خود ساختہ رسموں میں جکڑ کر اچھے کاموں کو بھی اپنے لئے ایک عذاب بنا لیا ہے، اگر یہی کام سادگی بیساختگی اور بے تکلفی سے کئے جائیں تو ان میں کوئی خرابی نہیں، لیکن اگر رسموں کی پابندی، نام ونمود اور معاشرتی جبر کے تحت انجام دیئے جائیں تو یہ بہت بڑی برائی ہے۔

لہٰذا اصل بات یہ ہے کہ اگر کسی لڑکی کا باپ اپنی بیٹی کے نکاح کے وقت اپنی خوش دلی سے اس کی سسرال کے لوگوں کو، یا اپنے اعزہ واحباب کو جمع کر کے ان کی دعوت کر دیتا ہے اور اسے نکاح کا لازمی حصہ یا سنت نہیں سمجھتا تو اس میں کوئی حرج کی بات نہیں ہے، اور اگر کوئی شخص ایسا نہیں کرتا تو اس میں بھی کوئی ایسی بات نہیں ہے، جس کی شکایت کی جائے یا جس کی وجہ سے اسے مطعون کیا جائے، بلکہ اس کا عمل سادگی کی سنت سے زیادہ قریب ہے، اس لئے اس کی تعریف کرنی چاہئے۔

اس کی مثال یوں سمجھئے کہ بعض لوگ اپنی اولاد کے امتحان میں کامیاب ہونے پر یا انہیں اچھی ملازمت ملنے پر خوشی کے اظہار کے لئے اپنے خاص خاص ملنے والوں کی دعوت کر دیتے ہیں، اس دعوت میں ہرگز کوئی حرج نہیں، دوسری طرف بہت سے لوگوں کے بچے امتحان میں پاس ہوتے رہتے ہیں، یا انہیں اچھی ملازمتیں ملتی رہتی ہیں، لیکن وہ اس خوشی میں کوئی دعوت نہیں کرتے، ان لوگوں پر بھی معاشرے کی طرف سے کوئی اعتراض نہیں کیا جاتا، نہ انہیں اس بات پر مطعون کیا جاتا ہے کہ انہوں نے دعوت کیوں نہیں کی؟ اگر یہی طرز عمل نکاح کی دعوت میں بھی اختیار کر لیا جائے تو کیا مضائقہ ہے؟

یعنی جس کا دل چاہے دعوت کرے اور جس کا دل نہ چاہے نہ کرے، لیکن خرابی یہاں سے پیدا ہوتی

ہے کہ نکاح میں اگر کوئی دعوت نہ کرے تو سسرال والوں کی طرف سے باقاعدہ مطالبہ ہوتا ہے، اور یوں سمجھا جاتا ہے جیسے شادی ہوئی ہی نہیں، جن بزرگوں نے بارات لے جانے اور اس کے اہتمام سے روکا، درحقیقت ان کے پیش نظر یہی خرابیاں تھیں، انہوں نے اس بات کی ترغیب دی کہ کم از کم کچھ بارسوخ ان دعوتوں کے بغیر نکاح کریں گے تو ان لوگوں کو حوصلہ ہوگا جو ان کی استطاعت نہیں رکھتے، اور صرف معاشرے کی مجبوری سے انہیں یہ کام کرنے پڑتے ہیں۔ [ذکر و فکر، ص ۲۸۹]

تقریبات میں رسم کے طور پر یا بدلے (نیوتہ) کی غرض سے تحفہ دینا

اگر کوئی شخص کسی دوسرے کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، یا کوئی نیکی کرے، تو اس کو چاہیے کہ جس نے اس کے ساتھ نیکی کی ہے، اس کو اس کا کچھ نہ کچھ بدلہ دے، دوسری حدیث میں اسی بدلہ کو "مکافات" سے تعبیر فرمایا ہے، یہ بدلہ جس کا ذکر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے ہیں، اس کا مطلب یہ ہے کہ آدمی اس احساس کے ساتھ دوسرے سے اچھا برتاؤ کرے کہ اس نے چونکہ میرے ساتھ نیکی کی ہے تو میں بھی اس کے ساتھ کوئی نیک سلوک کروں، یہ بدلہ دینا تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، اس لیے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی شخص آپ کے ساتھ اچھا معاملہ کرتا، یا کوئی ہدیہ پیش کرتا تو آپ اس کو بدلہ دیا کرتے تھے اور اس کے ساتھ بھی اچھائی کا معاملہ کیا کرتے تھے، اس لیے یہ بدلہ تو باعث اجر و ثواب ہے۔

ایک بدلہ وہ ہے جو آج ہمارے معاشرے میں پھیل گیا ہے وہ یہ کہ کسی کو بدلہ دینے کو دل تو نہیں چاہ رہا ہے لیکن اس غرض سے دے رہا ہے کہ اگر میں نہیں دوں گا تو معاشرے میں میری ناک کٹ جائے گی، یا اس نیت سے دے رہا ہے کہ اس وقت دے رہا ہوں تو میرے یہاں شادی بیاہ کے موقع پر یہ دے گا، جس کو نیوتہ کہا جاتا ہے، حتیٰ کہ بعض علاقوں خاندانوں میں یہ رواج ہے کہ شادی بیاہ کے موقع پر کوئی کسی کو دیتا ہے تو باقاعدہ اس کی فہرست بنتی ہے کہ فلاں شخص نے اتنے دیے، فلاں شخص نے اتنے دیے، پھر اس فہرست کے محفوظ رکھا جاتا ہے اور پھر جب اس شخص کے یہاں شادی بیاہ کا موقع آتا ہے جس نے دیا تھا تو اس کو پوری توقع ہوتی ہے کہ میں نے اس کو جتنا دیا تھا یہ کم از کم اتنا ہی مجھے واپس دے گا اور اگر اس سے کم دے تو پھر گلے شکوے، لڑائیاں شروع ہو جاتی ہیں، یہ بدلہ بہت خراب ہے اور اسی کو قرآن کریم میں سورۃ روم میں سود سے تعبیر فرمایا ہے: ﴿وما اتيتم من ربا ليربوا في أموال الناس فلا يربوا عند الله وما اتيتم من زكوة تريدون وجه الله فاولئك هم المضعفون﴾ [سورۃ روم: ۳۹]

یعنی تم لوگ جو سود دیتے ہو تا کہ لوگوں کے مالوں کے ساتھ مل اس میں اضافہ ہو جائے تو یاد رکھو اللہ تعالیٰ کے نزدیک اس میں اضافہ نہیں ہوتا اور جو تم اللہ تعالیٰ کی خاطر زکوۃ دیتے ہو تو یہی لوگ اپنے مالوں میں

اضافہ کرانے والے ہیں۔

اس آیت میں اس نیوتہ کو سود سے تعبیر کیا ہے، لہٰذا اگر کوئی شخص دوسرے کو اس نیت سے دے کہ چونکہ اس نے مجھے شادی کے موقع پر دیا تھا، اب میرے ذمے فرض ہے کہ میں بھی اس کو ضرور دوں، اگر میں نہیں دوں گا تو معاشرے میں میری ناک کٹ جائے گی اور یہ مجھے مقروض سمجھے گا، یہ دینا گناہ میں داخل ہے ،اس میں کبھی مبتلا نہیں ہونا چاہیے، اس میں نہ دنیا کا کوئی فائدہ ہے اور نہ ہی آخرت کا کوئی فائدہ ہے۔

لیکن ایک وہ بدلہ جس کی تلقین حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم فرمارہے ہیں یعنی دینے والے کے دل میں یہ خیال پیدا نہ ہو کہ جو میں دے رہا ہوں اس کا بدلہ مجھے ملے گا بلکہ اس نے محض محبت کی خاطر اللہ کو راضی کرنے کے لیے اپنے بہن یا بھائی کو کچھ دیا ہو، جیسا کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا ارشاد ہے: ’’تھادوا فتحابوا‘‘

یعنی آپس میں ایک دوسرے کو ہدیے دیا کرو، اس سے آپس میں محبت پیدا ہوگی، لہٰذا اگر ایک آدمی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد پر عمل کرنے کے لیے اپنے دل کے تقاضے سے دے رہا ہے، اور اس کے دل میں دور دور یہ خیال نہیں ہے کہ اس کا بدلہ مجھے ملے گا، تو یہ دینا بڑی برکت کی چیز ہے، اور جس شخص کو وہ ہدیہ دیا گیا وہ بھی یہ سمجھ کر نہ لے کہ یہ نیوتہ ہے اور اس کا بدلہ مجھے ادا کرنا ہے، بلکہ وہ یہ سوچے کہ یہ میرا بھائی ہے ،اس نے میرے ساتھ ایک اچھائی کی ہے، تو میرا دل چاہتا ہے کہ میں بھی اس کے ساتھ اچھائی کروں اور میں بھی اپنی طاقت کے مطابق اس کو ہدیہ دے کر اس کا دل خوش کروں، تو اس کا نام ہے ’’مکافات‘‘ جس کی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تاکید فرمائی ہے، یہ محمود ہے اور اس کی کوشش کرنی چاہیے۔

اس مکافات کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جب دوسرا شخص تمہارے ہدیہ کا بدلہ دے گا تو اس بدلہ میں اس کا لحاظ نہیں ہوگا کہ جتنا قیمتی ہدیہ اس نے دیا تھا اتنا ہی قیمتی ہدیہ میں بھی دوں گا، بلکہ مکافات کرنے والا یہ سوچے کہ اس نے اپنی استطاعت کے مطابق بدلہ دیا تھا، میں اپنی استطاعت کے مطابق بدلہ دوں، مثلاً کسی نے آپ کو بہت قیمتی تحفہ دے دیا تھا، اب آپ کی استطاعت قیمتی تحفہ دینے کی نہیں ہے تو آپ چھوٹا اور معمولی تحفہ دیتے وقت شرمائیں نہیں، اس لیے کہ اس کا مقصد بھی آپ کا دل خوش کرنا تھا اور آپ کا مقصد بھی اس کا دل خوش کرنا ہے، اور دل چھوٹی چیز سے بھی خوش ہو جاتا ہے، یہ نہ سوچیں کہ جتنا قیمتی تحفہ اس نے مجھے دیا تھا ،میں بھی اتنا ہی قیمتی تحفہ اس کو دوں، چاہے اس مقصد کے لیے مجھے قرض لینا پڑے، چاہے رشوت لینی پڑی، یا اس کے لیے مجھے ناجائز ذرائع آمدنی اختیار کرنی پڑے، ہرگز نہیں! بلکہ جتنی استطاعت ہو اس کے مطابق تحفہ دو، بلکہ حدیث میں یہاں تک فرمادیا کہ اگر تمہارے پاس ہدیہ کا بدلہ دینے کے لیے کچھ نہیں ہے تو پھر مکافات کا ایک طریقہ یہ بھی ہے کہ تم اس کی تعریف کرو اور لوگوں کو بتاؤ کہ میرے بھائی نے میرے ساتھ اچھا سلوک کیا اور مجھے ہدیہ میں یہ ضرورت کی چیز دے دی، یہ کہہ کر اس کا دل خوش کر دینا بھی ایک طرح کا بدلہ ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۰، ص ۱۷۴]

لڑکی کے والد کا دولہا سے رقم اور پیسے کا مطالبہ کرنا

مکتوب نگار نے آخری بات یہ پوچھی ہے کہ بعض علاقوں میں لڑکی کا باپ دولہا سے نکاح کے اخراجات کے علاوہ مزید کچھ رقم کا بھی مطالبہ کرتا ہے، اور اس کے بغیر اسے اپنی لڑکی کا رشتہ دینے پر تیار نہیں ہوتا، بے شک یہ بے بنیاد رسم بھی ہمارے معاشرے کے بعض حصوں میں خاصی رائج ہے، اور یہ شرعی اعتبار سے بالکل ناجائز رسم ہے، اپنی لڑکی کا رشتہ دینے کے لئے دولہا سے رقم لینے کو ہمارے فقہاء کرامؒ نے رشوت قرار دیا ہے، اور اس کا گناہ رشوت لینے کے گناہ کے برابر ہے، بلکہ اس میں ایک پہلو بے غیرتی کا بھی ہے، اور یہ عمل اپنی لڑکی کو فروخت کرنے کے مشابہ ہے، اور بعض جگہ جہاں یہ رسم پائی جاتی ہے، اسی وجہ سے شوہر اس کے ساتھ زرخرید کنیز جیسا سلوک کرتا ہے، لہٰذا یہ رسم شرعی اور اخلاقی لحاظ سے انتہائی غلط رسم ہے اور واجب الترک ہے۔ [ذکر وفکر، ص ۲۹۲]

ولیمہ کی دعوت کس انداز کی ہو؟

شادی کی تقریبات میں ''ولیمہ'' ایک ایسی تقریب ہے جو باقاعدہ سنت ہے، اور آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صراحۃً اس کی ترغیب دی ہے، لیکن اول تو یہ یاد رکھنا چاہئے کہ یہ دعوت کوئی فرض یا واجب نہیں جس کے چھوڑنے سے نکاح پر کوئی اثر پڑتا ہو، ہاں یہ سنت ہے اور حتی الامکان اس پر ضرور عمل کرنا چاہئے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اس سنت کی ادائیگی کے لئے شرعاً نہ مہمانوں کی کوئی تعداد مقرر ہے نہ کھانے کا کوئی معیار، بلکہ ہر شخص اپنی استطاعت کی حد میں رہتے ہوئے جس پیمانہ پر چاہے ولیمہ کر سکتا ہے، صحیح بخاری میں ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے ایک ولیمہ ایسا کیا جس میں صرف دو سیر جَو خرچ ہوئے، حضرت صفیہ رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر ولیمہ سفر میں ہوا، اور اس طرح ہوا کہ دسترخوان بچھا دیا گیا اور اس پر کچھ کھجوریں، کچھ پنیر اور کچھ گھی رکھ دیا گیا، بس ولیمہ ہو گیا، البتہ حضرت زینب رضی اللہ عنہا کے نکاح کے موقع پر روٹی اور بکری کے گوشت سے دعوت کی گئی، لہٰذا ولیمہ کے بارے میں یہ سمجھنا درست نہیں کہ اس میں مہمانوں کی کوئی بڑی تعداد ضروری ہے، یا کوئی اعلیٰ درجے کا کھانا ضرور ہونا چاہئے، اور اگر کسی شخص کے پاس خود گنجائش نہ ہو تو وہ قرض ادھار کر کے ان چیزوں کا اہتمام کرے، بلکہ شرعی اعتبار سے مطلوب یہی ہے کہ جس شخص کے پاس خود اپنے وسائل کم ہوں، وہ اپنی استطاعت کے مطابق اختصار سے کام لے، ہاں اگر استطاعت ہو تو زیادہ مہمان مدعو کرنے اور اچھے کھانے کا اہتمام کرنے میں بھی کچھ حرج نہیں، بشرطیکہ مقصد نام ونمود اور دکھاوا نہ ہو۔

ان حدود میں رہتے ہوئے ولیمہ بیشک مسنون ہے، اور اس لحاظ سے کار ثواب بھی، لہٰذا اس کے تقدس کو طرح طرح کے گناہوں سے مجروح کرنا اس کی ناقدری، بلکہ توہین کے مترادف ہے، محض شان وشوکت کے اظہار اور نام نمود کے اقدامات، تقریب کی مصروفیات میں نمازوں کا ضیاع، سجے بنے مردوں

عورتوں کا بے حجاب میل جول، ان کی فلم بندی، اور اس قسم کے دوسرے منکرات اس قسم کی تقریب کی پر پانی پھر دیتے ہیں، جن سے اس بابرکت تقریب کو بچانا چاہئے۔ [ذکر وفکر ص ۹۳]

کیا مسنون ولیمہ کے لیے دولھا، دلھن کے درمیان تعلقات قائم ہونا ضروری ہے؟

ولیمہ کے بارے میں ایک اور غلط فہمی خاصی پھیلی ہوئی ہے، جس کی وجہ سے بہت سے لوگ پر رہتے ہیں، ایک صاحب نے خاص طور پر اپنی پریشانی کا ذکر کرتے ہوئے اس نکتے کی وضاحت چاہی ہے: غلط فہمی یہ ہے کہ اگر دولہا دلہن کے درمیان تعلقات زن وشو قائم نہ ہو پائے ہوں تو ولیمہ صحیح نہیں ہوتا۔

واقعہ یہ ہے کہ ولیمہ نکاح کے وقت سے لیکر رخصتی کے بعد تک کسی بھی وقت ہوسکتا ہے، البتہ مستحب یہ ہے کہ رخصتی کے بعد ہو، اور رخصتی کا مطلب رخصتی ہی ہے، اس سے زیادہ کچھ نہیں، یعنی یہ کہ دلہن دولہا کے گھر آجائے، اور دونوں کی تنہائی میں ملاقات ہوجائے، اور بس۔ لہٰذا اگر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان تعلقات زن وشو قائم نہ ہوا ہو تو اس سے ولیمہ کی صحت پر کوئی اثر نہیں پڑتا۔ نہ ولیمہ ناجائز ہوتا ہے، نہ نفلی قرار پاتا ہے، اور نہ یہ سمجھنا چاہئے کہ اس طرح ولیمہ کی سنت ادا نہیں ہوتی، بلکہ ولیمہ اگر رخصتی ہی سے پہلے منعقد کرلیا جائے تب بھی ولیمہ ادا ہوجاتا ہے، صرف اس کا مستحب وقت حاصل نہیں ہوتا، (یہاں دلائل کی تفصیل میں جانے کا موقع نہیں ہے، جو حضرات دلائل سے دلچسپی رکھتے ہوں وہ علامہ ابن حجرؒ کی فتح الباری میں صفحہ ۲۳۱ جلد ۹ پر باب الولیمہ کے تحت حدیث نمبر ۵۱۶۶ کی تشریحات ملاحظہ فرمالیں)۔

[ذکر وفکر ص ۲۹۵]

کیا دلھن کا زبان سے "قبول ھے" کھنا ضروری ہے یا نکاح نامے پر دستخط کردینا ھی کافی ہے؟

ایک صاحب نے ایک اور سوال کیا ہے اور وہ یہ کہ نکاح کے وقت جب لڑکی کے گھر والے لڑکی سے ایجاب وقبول کراتے ہیں، تو کیا لڑکی کا اپنی زبان سے منظوری کا کہنا ضروری ہے یا نکاح نامے پر دستخط کردینا کافی ہے؟ اس سلسلے میں عرض ہے کہ ہمارے یہاں شادیاں عموماً اس طرح ہوتی ہیں کہ دلہن خود نکاح کی محفل میں موجود نہیں ہوتی، بلکہ دلہن کے گھر والوں میں سے کوئی نکاح سے پہلے اس سے اجازت لیتا ہے، جو دلہن کی طرف سے وکیل کی حیثیت رکھتا ہے، اور نکاح نامے میں بھی اس کا نام وکیل کے خانے میں درج ہوتا ہے، جب یہ وکیل لڑکی سے اجازت لینے جاتا ہے تو یہ نکاح کا ایجاب وقبول نہیں ہوتا، بلکہ محض لڑکی سے نکاح کی اجازت لی جاتی ہے، اس میں اجازت لینے والے کو لڑکی سے یہ کہنا چاہئے کہ میں تمہارا نکاح فلاں ولد فلاں سے اتنے مہر پر کرنا چاہتا ہوں، کیا تمہیں یہ منظور ہے؟ اگر لڑکی کنواری ہے تو زبان سے اس

کا منظور ہے کہنا ضروری نہیں بلکہ اتنا بھی کافی ہے کہ وہ انکار نہ کرے، البتہ زبان سے منظوری کا اظہار کر دے تو اور اچھا ہے، اور اگر صرف نکاح نامے پر دستخط کر دے تو بھی اجازت ہو جاتی ہے، البتہ اگر کوئی عورت پہلے شادی شدہ رہ چکی ہے اور اب یہ اس کی دوسری شادی ہے تو اس کا زبان سے منظوری کا اظہار ضروری ہے، بصورت دیگر اسے منظوری نہیں سمجھا جائے گا۔

جب لڑکی سے اس طرح اجازت لے لی جائے تو جس شخص نے اجازت لی ہے وہ بحیثیت وکیل نکاح کرنے کا اختیار نکاح خواں کو دیدیتا ہے، اور پھر نکاح خواں جو الفاظ دولہا سے کہتا ہے وہ نکاح کا ایجاب ہے، اور دولہا جو جواب دیتا ہے قبول اور ان دونوں کلمات سے نکاح کی تکمیل ہو جاتی ہے۔

[ذکر و فکر، ص ۲۹۵]

نکاح میں لڑکے لڑکی اور دونوں کے خاندان میں برابری اور کفو کا کیا معیار ہے؟

یہ واقعہ تو انتہائی سنگین نوعیت کا ہے، لیکن یہ بات اکثر دیکھنے سننے میں آتی ہے کہ لوگ برادری میں نکاح کرنے کے بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیوں کا شکار ہیں، یہ درست ہے کہ شریعت نے نکاح کے معاملے میں ایک حد تک کفو کی رعایت رکھی ہے، لیکن اس کا مقصد یہ ہے کہ نکاح چونکہ زندگی بھر کا ساتھ ہوتا ہے اس لئے میاں بیوی اور دونوں خاندانوں کے درمیان طبعی ہم آہنگی ہو، ان کے رہن سہن، ان کے طرز فکر اور ان کے مزاج میں اتنی دوری نہ ہو کہ ایک دوسرے کے ساتھ نباہ کرنے میں مشکل پیش آئے، لیکن اول تو کفو کی اس رعایت کا یہ مطلب ہرگز نہیں ہے کہ اگر کفو میں کوئی رشتہ نہ ملے تو یہ قسم کھالی جائے کہ اب زندگی بھر شادی ہی نہیں ہو سکے گی، دوسرے کفو کا یہ مطلب نہیں ہے کہ خاص اپنی برادری ہی میں رشتہ کیا جائے، اور برادری کے باہر سے جو بھی رشتے آئیں انہیں غیر کفو قرار دیا جائے، اس سلسلے میں مندرجہ ذیل باتیں اچھی طرح سمجھ لینی چاہئیں، جنہیں نظر انداز کرنے سے ہمارے معاشرے میں بڑی غلط فہمیاں پھیلی ہوئی ہیں:

① ہر وہ شخص کسی لڑکی کا کفو ہے جو اپنے خاندانی حسب نسب، دین داری اور پیشے کے لحاظ سے لڑکی اور اس کے خاندان کا ہم پلہ ہو، یعنی کفو میں ہونے کے لئے اپنی برادری کا فرد ہونا ضروری نہیں، بلکہ اگر کوئی شخص کسی اور برادری کا ہے، لیکن اس کی برادری بھی لڑکی کی برادری کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہے، تو وہ بھی لڑکی کا کفو ہے، کفو سے باہر نہیں ہے، مثلاً سید، صدیقی، فاروقی، عثمانی، علوی بلکہ تمام قریشی برادریاں آپس میں ایک دوسری کے لئے کفو ہیں، اسی طرح جو مختلف عجمی برادریاں ہمارے ملک میں پائی جاتی ہیں مثلاً راجپوت، خان وغیرہ وہ بھی اکثر ایک دوسری کے ہم پلہ سمجھی جاتی ہیں، اور ایک دوسری کے لئے کفو ہیں۔

② بعض احادیث وروایات میں یہ ترغیب ضرور دی گئی ہے کہ نکاح کفو میں کرنے کی کوشش کی جائے، تاکہ دونوں خاندانوں کے مزاج آپس میں میل کھا سکیں، لیکن یہ سمجھنا غلط ہے کہ کفو سے باہر نکاح کرنا شرعاً بالکل ناجائز ہے، یا یہ کہ کفو سے باہر نکاح شرعاً درست نہیں ہوتا، حقیقت یہ ہے کہ اگر لڑکی اور اس کے اولیاء کفو سے باہر نکاح کرنے پر راضی ہوں، تو کفو سے باہر کیا ہوا نکاح بھی شرعاً منعقد ہو جاتا ہے، اور اس میں نہ کوئی گناہ ہے، نہ کوئی ناجائز بات ہے، لہٰذا اگر کسی لڑکی کا رشتہ کفو میں میسر نہ آرہا ہو، اور کفو سے باہر کوئی مناسب رشتہ مل جائے تو وہاں شادی کردینے میں کوئی حرج نہیں ہے، کفو میں رشتہ نہ ملنے کی وجہ سے لڑکی کو عمر بھر بغیر شادی کے بٹھائے رکھنا کسی طرح جائز نہیں۔

③ شریعت نے یہ ہدایت ضرور دی ہے کہ لڑکی کو نکاح بغیر ولی کے نہیں کرنا چاہئے (خاص طور سے اگر کفو سے باہر نکاح کرنا ہو تو ایسا نکاح اکثر فقہاء کے نزدیک بغیر ولی کے درست نہیں ہوتا) لیکن ولی کو بھی یہ چاہئے کہ وہ کفو کی شرط پر اتنا زور نہ دے جس کے نتیجے میں لڑکی عمر بھر شادی سے محروم ہو جائے، اور برادری کی شرط پر اتنا زور دینا تو اور بھی زیادہ بے بنیاد اور لغو حرکت ہے، جس کا کوئی جواز نہیں ہے۔

ایک حدیث میں حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے:

”اذا جاء کم من ترضون دینه وخلقه فزوجوه الا تفعلوا تکن فتنة فی الارض وفساد کبیر“

جب تمہارے پاس کوئی ایسا شخص رشتہ لے کر آئے جس کی دینداری اور اخلاق تمہیں پسند ہوں تو اس سے (اپنی لڑکی کا) نکاح کردو، اگر تم ایسا نہیں کرو گے تو زمین میں بڑا فتنہ وفساد برپا ہوگا۔ [ذکر وفکر، ص ۳۱۶]

کیا سید کی شادی غیر سید سے نہیں ہوسکتی؟

④ اسی ضمن میں یہ غلط فہمی بھی بہت سے لوگوں میں عام ہے کہ سید لڑکی کا نکاح غیر سید گھرانے میں نہیں ہوسکتا، یہ بات بھی شرعی اعتبار سے درست نہیں ہے، ہمارے عرف میں ”سید“ ان حضرات کو کہتے ہیں جن کا نسب بنی ہاشم سے جاملتا ہو، چونکہ حضور سرور کونین صلی اللہ علیہ وسلم بنی ہاشم سے تعلق رکھتے تھے، اس لئے بلاشبہ اس خاندان سے نسبی وابستگی ایک بہت بڑا اعزاز ہے، لیکن شریعت نے ایسی کوئی قید نہیں لگائی کہ اس خاندان کی کسی لڑکی کا نکاح باہر نہیں ہوسکتا، بلکہ جیسا میں نے اوپر عرض کیا، نہ صرف شیوخ، بلکہ تمام قریشی نسب کے لوگ بھی شرعی اعتبار سے سادات کے کفو ہیں، اور ان کے درمیان نکاح کا رشتہ قائم کرنے میں کوئی شرعی رکاوٹ نہیں ہے، بلکہ قریشی سے باہر کے خاندانوں میں بھی باہمی رضامندی سے نکاح ہوسکتا ہے۔

[ذکر وفکر، ص ۳۱۸]

کیا گھریلو کام کاج بیوی کی ذمہ داری نہیں ہے؟
میاں بیوی کا تعلق احسان پر مبنی ہے

یہ جو میں نے کہا کہ عورت کے ذمے کھانا پکانے کی اور ساس سسر کی خدمت کی ذمہ داری نہیں ہے یہ ایک قانون کی بات تھی، لیکن زندگی قانون کے خشک تعلق سے نہیں چلا کرتی، لہٰذا جس طرح قانوناً عورت کے ذمہ کھانا پکانا نہیں ہے اسی طرح اگر عورت بیمار ہو جائے تو قانوناً شوہر کے ذمہ اس کا علاج کرانا، یا علاج کے لیے خرچہ دینا بھی ضروری نہیں اور قانوناً شوہر کے ذمہ یہ بھی نہیں ہے کہ وہ عورت کو اس کے والدین کے گھر ملاقات کے لیے لے جایا کرے اور نہ یہ ضروری ہے کہ جب عورت کے ماں باپ اپنی بیٹی سے ملاقات کے لیے آئیں تو ان کو اپنے گھر میں بٹھائے، بلکہ فقہاء کرام نے یہاں تک لکھا ہے کہ ہفتہ میں صرف ایک دن بیوی کے ماں باپ آئیں اور دور سے ملاقات اور زیارت کر کے چلے جائیں، گھر میں بٹھا کر ملاقات کرانا شوہر کے ذمہ ضروری نہیں، لہٰذا اگر قانون کے خشک تعلق کی بنیاد پر اگر زندگی بسر ہونی شروع ہو جائے تو دونوں کا گھر برباد ہو جائے، بات جب چلتی ہے کہ جب دونوں میاں بیوی قانون کی بات سے آگے بڑھ کر سنت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اتباع کریں اور بیوی ازواج مطہرات کی سنت کی اتباع کرے، اگر بیوی خوش دلی سے اپنی سعادت مندی سمجھ کر اپنے شوہر کے والدین کی جتنی خدمت کرے گی ان شاء اللہ اس کے اجر میں بہت اضافہ ہوگا اور بہو کو ایسا کرنا بھی چاہیے تاکہ گھر کی فضا خوشگوار رہے۔

کیا بیوی سے مہر معاف کرانا یا نفقہ (خرچ) میں کمی کرنا صحیح ہے؟

ساری زندگی میں بے چاری عورت کا ایک ہی مالی حق شوہر کے ذمے واجب ہوتا ہے، وہ ہے مہر، وہ بھی شوہر ادا نہیں کرتا، ہوتا یہ ہے کہ ساری زندگی تو مہر ادا نہیں کیا، جب مرنے کا وقت قریب آیا تو بستر مرگ پر پڑے ہیں، دنیا سے جانے والے ہیں، رخصتی کا منظر ہے، اس وقت بیوی سے کہتے ہیں کہ مہر معاف کر دو، اب اس موقع پر بیوی کیا کرے؟ کیا رخصت ہونے والے شوہر سے یہ کہہ دے کہ میں معاف نہیں کرتی، چنانچہ اس کو مہر معاف کرنا پڑتا ہے، ساری عمر اس سے فائدہ اٹھایا، ساری عمر تو اس سے حقوق طلب کیے، لیکن اس کا حق دینے کا وقت آیا تو اس میں ڈنڈی مار گئے۔

یہ تو مہر کی بات تھی، نفقہ کے اندر شریعت کا یہ حکم ہے کہ اس کو اتنا نفقہ دیا جائے کہ وہ آزادی اور اطمینان کے ساتھ گذارہ کر سکے، اگر اس میں کمی کرے گا تو یہ بھی کم ناپنے اور کم تولنے کے اندر داخل ہے، اور حرام ہے، خلاصہ یہ کہ جس کسی کا کوئی حق دوسرے کے ذمے واجب ہو وہ اس کو پورا ادا کرے، اس میں کمی نہ کرے۔

طلاق

طلاق دینے کا صحیح طریقہ کیا ہے؟

میرا مختلف حیثیتوں میں عام مسلمانوں کے خاندانی، بالخصوص ازدواجی تنازعات سے کافی واسطہ رہا ہے، اور یہ دیکھ دیکھ کر دکھ ہوتا رہا ہے کہ ہمارے معاشرے میں اسلامی تعلیمات سے ناواقفیت اتنی بڑھ گئی ہے کہ جو سامنے کی باتیں پہلے بچے بچے کو معلوم ہوتی تھیں، اب بڑے بڑوں کو بھی معلوم نہیں ہوتیں، اس لئے چند ماہ پہلے میں نے اس کالم میں شادی بیاہ کے مسائل اور اس سے متعلق بنیادی شرعی احکام کی وضاحت شروع کی تھی، جو مختلف عنوانات کے تحت کئی ہفتے جاری رہی، جب نکاح کا ذکر چھڑا تو مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ''طلاق'' کے بارے میں کچھ گزارشات پیش کردی جائیں، کیونکہ طلاق کے بالکل ابتدائی احکام سے بھی عام لوگ ناواقف ہو چکے ہیں، اور اس بارے میں طرح طرح کی غلط فہمیاں عام ہو چکی ہیں۔

سب سے پہلی غلطی تو یہ ہے کہ بہت سے لوگوں نے طلاق کو غصہ نکالنے کا ایک ذریعہ سمجھا ہوا ہے، جہاں میاں بیوی میں کوئی اختلاف پیش آیا، اور نوبت غصے اور اشتعال تک پہنچی، شوہر نے فوراً طلاق کے الفاظ زبان سے نکال دیئے، حالانکہ طلاق کوئی گالی نہیں ہے جو غصہ ٹھنڈا کرنے کے لئے دیدی جائے، یہ نکاح کا رشتہ ختم کرنے کا وہ انتہائی اقدام ہے جس کے نتائج بڑے سنگین ہیں، اس سے صرف نکاح کا رشتہ ہی ختم نہیں ہوتا، بلکہ خاندانی زندگی کے بہت سے مسائل کھڑے ہوجاتے ہیں، میاں بیوی ایک دوسرے کے لئے اجنبی بن جاتے ہیں، بچوں کی پرورش کا نظام درہم برہم ہوجاتا ہے، املاک کی تقسیم میں پیچیدگی پیدا ہوتی ہے، مہر، نفقہ اور عدت کے معاملات پر اس کا اثر پڑتا ہے، غرض نہ صرف میاں بیوی، بلکہ ان کی اولاد، بلکہ پورے خاندان پر اس کے دوررس اثرات پڑتے ہیں۔

یہی وجہ ہے کہ اسلام نے جہاں طلاق کی اجازت دی ہے، وہاں اسے ''اَبغض المباحات'' قرار دیا ہے، یعنی یہ وہ چیز ہے جو جائز کاموں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ مبغوض اور ناپسندیدہ ہے، عیسائی مذہب کا اصل تصور یہ تھا کہ میاں بیوی جب ایک مرتبہ نکاح کے رشتے میں بندھ جائیں تو اب طلاق دینے یا لینے کا کوئی راستہ نہیں ہے، بائبل میں تو طلاق کو بدکاری کے برابر قرار دیا گیا ہے، اسلام چونکہ دین فطرت ہے

اس لئے اس نے طلاق کے بارے میں یہ سخت موقف تو اختیار نہیں کیا، اس لئے کہ میاں بیوی کی زندگی میں بعض اوقات ایسے مرحلے پیش آجاتے ہیں، جب دونوں کے لئے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں رہتا کہ وہ شرافت کے ساتھ ایک دوسرے سے الگ ہوجائیں، ایسے موقع پر نکاح کے رشتے کو ان پر زبردستی تھوپے رکھنا دونوں کی زندگی کو عذاب بنا سکتا ہے۔ (یہی وجہ ہے کہ عیسائی مذہب طلاق کے بارے میں اپنے اس قدیم موقف پر قائم نہیں رہ سکا، جس کی داستان بڑی طویل اور عبرتناک ہے) اس لئے اسلام نے طلاق کو ناجائز یا حرام تو قرار نہیں دیا، اور نہ اس کے ایسے لگے بندھے اسباب متعین کئے جو علیحدگی کے معاملے میں میاں بیوی کے ہاتھ پاؤں باندھ کر ڈال دیں، لیکن اول تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے صاف صاف فرمادیا کہ مباح (جائز) چیزوں میں اللہ تعالیٰ کو سب سے زیادہ ناپسند طلاق ہے، دوسرے میاں بیوی کو ایسی ہدایات دی ہیں کہ ان پر عمل کیا جائے تو طلاق کی نوبت کم سے کم آئے، تیسرے اگر طلاق کی نوبت آہی جائے تو اس کا ایسا طریقہ بتایا ہے جس میں خرابیاں کم سے کم ہوں، آج اگر لوگ ان ہدایات واحکام کو اچھی طرح سمجھ لیں ، اور ان پر عمل کریں تو نہ جانے کتنے گھریلو تنازعات اور خاندانی مسائل خود بخود حل ہوجائیں۔

جہاں تک ان ہدایات کا تعلق ہے جو طلاق کے سدباب کے لئے دی گئی ہیں ان میں سب سے پہلی ہدایت تو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ دی ہے کہ اگر کسی شوہر کو اپنی بیوی کی کوئی بات ناپسند ہے، تو اسے اس کی اچھی باتوں پر بھی غور کرنا چاہئے، مقصد یہ ہے کہ دنیا میں کوئی شخص بے عیب نہیں ہوتا، اگر کسی میں ایک خرابی ہے تو دس اچھائیاں بھی ہوسکتی ہیں، ایک خرابی کو لے بیٹھنا اور دس اچھائیوں سے آنکھ بند کرلینا انصاف کے بھی خلاف ہے اور اس سے کوئی مسئلہ حل بھی نہیں ہوسکتا، بلکہ قرآن کریم نے تو یہاں تک فرمادیا کہ ''اگر تمہیں اپنی بیوی کی کوئی بات ناپسند ہے تو (یہ سوچو) کہ شاید تم جس چیز کو برا سمجھ رہے ہو، اللہ تعالیٰ نے اس میں تمہارے لئے کوئی بڑی بھلائی رکھی ہو''۔[سورۃ النساء:۱۹]

دوسری ہدایت قرآن کریم نے یہ دی ہے کہ جب میاں بیوی آپس میں اپنے اختلافات طے نہ کرسکیں اور نرم وگرم ہر طریقہ آزمانے کے بعد بھی تنازعہ برقرار رہے تو فوراً علیحدگی کا فیصلہ کرنے کے بجائے دونوں کے خاندان والے ایک ایک شخص کو ثالث بنائیں، اور یہ دونوں طرف کے نمائندے آپس میں ٹھنڈے دل سے حالات کا جائزہ لے کر میاں بیوی کے درمیان تنازعہ ختم کرنے کی کوشش کریں، ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے یہ بھی فرمادیا کہ اگر یہ دونوں نیک نیتی سے اصلاح کی کوشش کریں گے، تو اللہ تعالیٰ ان کے درمیان موافقت پیدا فرمادے گا۔[سورہ نساء:۳۵]

لیکن اگر یہ تمام کوششیں بالکل ناکام ہوجائیں، اور طلاق ہی کا فیصلہ کرلیا جائے تو اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم میں یہ حکم دیا ہے کہ شوہر اس کے لئے مناسب وقت کا انتظار کرے، مناسب وقت کی تشریح آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ فرمائی ہے کہ طلاق اس وقت دی جائے جب بیوی طہر کی حالت میں ہو، یعنی

اپنے ماہانہ نسوانی دورے سے فارغ ہوچکی ہو، اور فراغت کے بعد دونوں کے درمیان وظیفہ زوجیت ادا کرنے کی نوبت نہ آئی ہو، لہٰذا اگر عورت طہر کی حالت میں نہ تو ایسے وقت طلاق دینا شرعاً گناہ ہے، نیز اگر طہر ایسا ہو کہ اس میں میاں بیوی کے درمیان ازدواجی قربت ہوچکی ہو، تب بھی طلاق دینا شرعاً نہیں، ایسی صورت میں طلاق دینے کے لئے شوہر کو اگلے مہینے تک انتظار کرنا چاہئے۔ [ذکر و فکر، ص ۳۱۹]

صحیح طریقہ سے طلاق دینے میں کیا مصلحت اور فائدہ ہے؟

اس طریق کار میں یوں تو بہت سی مصلحتیں ہیں، لیکن ایک مصلحت یہ بھی ہے کہ طلاق کسی وقتی منافرت یا جھگڑے کا نتیجہ نہ ہو، شوہر کو مناسب وقت کے انتظار کا حکم اس لئے بھی دیا گیا ہے کہ اس عرصے میں وہ تمام حالات پر اچھی طرح غور کر لے، اور جس طرح نکاح سوچ سمجھ کر ہوا تھا، اسی طرح طلاق بھی سوچ سمجھ کر ہی دی جائے، چنانچہ عین ممکن ہے کہ انتظار کے نتیجے میں دونوں کی رائے بدل جائے، حالات بہتر ہوجائیں، اور طلاق کی نوبت ہی نہ آئے۔

پھر اگر مناسب وقت آجانے پر بھی طلاق کا ارادہ برقرار رہے تو شریعت نے طلاق دینے کا صحیح طریقہ یہ بتلایا ہے کہ شوہر صرف ایک طلاق دے کر خاموش ہوجائے، اس طرح ایک رجعی طلاق ہوجائے گی جس کا حکم یہ ہے کہ عدت گزر جانے پر نکاح کا رشتہ شرافت کے ساتھ خود بخود ختم ہوجائے گا، اور دونوں اپنے اپنے مستقبل کے لئے کوئی فیصلہ کرنے میں آزاد ہوں گے۔

اس طریقے میں فائدہ یہ ہے کہ طلاق دینے کے بعد اگر مرد کو اپنی غلطی کا احساس ہو، اور وہ یہ سمجھے کہ حالات اب بہتر ہوسکتے ہیں، تو وہ عدت کے دوران اپنی دی ہوئی طلاق سے رجوع کرسکتا ہے، جس کے لئے زبان سے اتنا کہہ دیا کافی ہے کہ ''میں نے طلاق سے رجوع کرلیا'' اس طرح نکاح کا رشتہ خود بخود تازہ ہوجائے گا، اور اگر عدت بھی گزر گئی ہو اور دونوں میاں بیوی یہ سمجھیں کہ اب انہوں نے سبق سیکھ لیا ہے، اور آئندہ وہ مناسب طریقے پر زندگی گزار سکتے ہیں، تو ان کے یہ راستہ کھلا ہوا ہے کہ وہ باہمی رضامندی سے دوبارہ از سر نو نکاح کرلیں (جس کے لئے نیا ایجاب وقبول، گواہ اور مہر سب ضروری ہے)۔

اگر مذکورہ سہولت سے فائدہ اٹھاتے ہوئے میاں بیوی نے پھر سے نکاح کا رشتہ تازہ کرلیا ہو، اور پھر کسی وجہ سے دونوں کے درمیان تنازعہ کھڑا ہوجائے، تب بھی دوسری طلاق دینے میں جلدی نہ کرنی چاہئے، بلکہ ان تمام ہدایات پر عمل کرنا چاہئے جو اوپر بیان ہوئیں، ان تمام ہدایات پر عمل کے باوجود اگر شوہر پھر طلاق ہی کا فیصلہ کرے تو اس مرتبہ بھی ایک ہی طلاق دینی چاہئے، اب مجموعی طور پر دو طلاقیں ہوجائیں گی، لیکن معاملہ اس کے باوجود میاں بیوی کے ہاتھ میں رہے گا۔

یعنی عدت کے دوران شوہر پھر رجوع کرسکتا ہے اور عدت گزرنے کے بعد دونوں باہمی رضامندی

سے پھر تیسری بار نکاح کر سکتے ہیں۔

یہ ہے طلاق کا وہ طریقہ جو قرآن وحدیث میں بیان ہوا ہے، اور اس سے اندازہ ہوسکتا ہے کہ قرآن وسنت نے نکاح کے رشتے کو برقرار رکھنے اور اسے ٹوٹنے سے بچانے کے لئے درجہ بدرجہ کتنے راستے رکھے ہیں، ہاں اگر کوئی شخص ان تمام درجوں کو پھلانگ جائے تو پھر نکاح وطلاق آنکھ مچولی کا کوئی کھیل نہیں ہے، جو غیر محدود زمانے تک جاری رکھا جائے، لہٰذا جب تیسری طلاق بھی دیدی جائے تو شریعت کا حکم یہ ہے کہ اب نکاح کو تازہ کرنے کا کوئی راستہ نہیں، اب نہ شوہر رجوع کرسکتا ہے نہ میاں بیوی باہمی رضامندی سے نیا نکاح کرسکتے ہیں، اب دونوں کو علیحدہ ہونا ہی پڑے گا۔ [ذکر وفکر، ص ۳۲۲]

کیا علیحدگی کے لیے تین طلاق دینا ضروری ہے یا ایک طلاق ہی کافی ہے؟

ہمارے معاشرے میں طلاق کے بارے میں انتہائی سنگین غلط فہمی یہ پھیل گئی ہے کہ تین سے کم طلاقوں کو طلاق ہی نہیں سمجھا جاتا، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر طلاق کا لفظ ایک یا دو مرتبہ لکھا جائے تو اس سے طلاق ہی نہیں ہوتی، چنانچہ جب کبھی طلاق کی نوبت آتی ہے تو لوگ تین طلاقوں سے کم پر بس نہیں کرتے، اور کم سے کم تین مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنا ضروری سمجھتے ہیں، حالانکہ جیسا کہ اوپر عرض کیا گیا طلاق صرف ایک مرتبہ کہنے سے بھی ہوجاتی ہے، بلکہ شریعت کے مطابق طلاق کا صحیح اور احسن طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک مرتبہ طلاق کا لفظ کہا یا لکھا جائے، اس طرح طلاق تو ہوجاتی ہے، لیکن اگر بعد میں سوچ سمجھ کر نکاح کا رشتہ تازہ کرنا ہو تو اس کے دروازے کسی کے نزدیک مکمل طور پر بند نہیں ہوتے، بلکہ ایک ساتھ تین مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنا شرعاً گناہ ہے، اور حنفی، شافعی، مالکی اور حنبلی چاروں فقہی مکاتب فکر کے نزدیک اس گناہ کی ایک سزا یہ ہے کہ اس کے بعد رجوع یا نئے نکاح کا کوئی راستہ باقی نہیں رہتا، اور جو لوگ ان فقہی مکاتب فکر سے تعلق رکھتے ہیں ان کو اکثر تین طلاقیں ایک ساتھ دینے کے بعد شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑتا ہے، لہٰذا طلاق کے معاملے میں سب سے پہلے تو یہ غلط فہمی دور کرنے کی ضرورت ہے کہ ایک مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کرنے سے طلاق نہیں ہوتی، اور یہ بات اچھی طرح لوگوں میں عام کرنی ضروری ہے کہ طلاق کا صحیح اور احسن طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک مرتبہ طلاق کا لفظ استعمال کیا جائے، اس سے زیادہ نہیں، اگر عدت کے دوران شوہر کے رجوع کا حق ختم کرنا مقصود ہو تو ایک طلاق بائن دیدی جائے، یعنی طلاق کے ساتھ بائن کا لفظ بھی ملا لیا جائے تو شوہر کو یک طرفہ طور پر رجوع کا حق نہیں رہے گا، البتہ باہمی رضامندی سے دونوں میاں بیوی جب چاہیں نیا نکاح کرسکیں گے۔ یہ بات کہ طلاق کا احسن طریقہ یہی ہے کہ صرف ایک طلاق دی جائے، پوری امت میں مسلم ہے، اور اس میں کسی مکتب فکر کا اختلاف نہیں ہے، ضرورت ہے کہ علماء کرام اپنے خطبوں میں اس مسئلے کو عوام کے سامنے واضح کریں، اور ذرائع ابلاغ کے ذریعے بھی طلاق کے یہ احکام لوگوں تک پہنچائے جائیں۔ [ذکر وفکر، ص ۳۲۳]

لباس

کیا لباس کا تعلق قوم اور ملک کے حالات سے ہے ؟
موجودہ دور کا پروپیگنڈہ

آج کل ہمارے دور میں یہ پروپیگنڈہ بڑی کثرت سے کیا گیا ہے کہ لباس تو ایسی چیز ہے جس کا ہر قوم اور ہر وطن کے حالات سے تعلق ہوتا ہے، اس لیے آدمی اگر اپنی مرضی اور ماحول کے مطابق کوئی لباس اختیار کرلے تو اس کے بارے میں شریعت کو بیچ میں لانا اور شریعت کے احکام سنانا تنگ نظری کی بات ہے، اور یہ جملہ تو لوگوں سے بکثرت سننے میں آتا ہے کہ ان مولویوں نے اپنی طرف سے قیدیں شرطیں لگادی ہیں، ورنہ دین میں تو بڑی آسانی ہے، اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو دین میں اتنی پابندیاں نہیں لگائی ہیں، مگر ان ملاؤں نے اپنی طرف سے گھڑ کر یہ پابندی عائد کررکھی ہیں، اور یہ ان ملاؤں کی تنگ نظری کی دلیل ہے، اور اس تنگ نظری کے نتیجے میں انہوں نے خود بھی بہت سی باتوں کو چھوڑ رکھا ہے اور دوسروں سے بھی چھڑا رکھا ہے۔

خوب سمجھ لیجیے! لباس کا معاملہ اتنا سادہ اور اتنا آسان نہیں ہے کہ آدمی جو چاہے لباس پہنتا رہے اور اس لباس کی وجہ سے اس کے دین پر اور اس کے اخلاق پر، اس کی زندگی پر، اس کے طرز عمل پر کوئی اثر واقع نہ ہو، یہ ایک مسلم حقیقت ہے، جس کو شریعت نے تو ہمیشہ بیان فرمایا، اور اب نفسیات اور سائنس کے ماہرین بھی اس حقیقت کو تسلیم کرنے لگے ہیں کہ انسان کے لباس کا اس کی زندگی پر، اس کے اخلاق پر، اس کے کردار پر بڑا اثر واقع ہوتا ہے، لباس محض ایک کپڑا نہیں ہے، جو انسان نے اٹھا کر پہن لیا، بلکہ یہ لباس انسان کے طرز فکر پر، اس کی سوچ پر، اس کی ذہنیت پر اثر انداز ہوتا ہے، اس لیے اس لباس کو معمولی نہیں سمجھنا چاہیے۔

[اصلاحی خطبات، ج۵، ص۲۶۰]

کہتے ہیں : ”ظاہری لباس میں کیا رکھا ہے ؟ دل صاف ہونا چاہیے !“

آج کل یہ جملہ بھی بہت کثرت سے سننے میں آتا ہے کہ صاحب! اس ظاہری لباس میں کیا رکھا ہے، دل صاف ہونا چاہیے، اور ہمارا دل صاف ہے، ہماری نیت اچھی ہے، اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہمارا تعلق قائم

ہے، سارے کام تو ہم ٹھیک کرر ہے ہیں، اب اگر ذرا سالباس بدل دیا تو اس میں کیا حرج ہے؟ اس لیے دین ظاہر کا نام نہیں، باطن کا نام ہے، دین جسم کا نام نہیں، روح کا نام ہے، شریعت کی روح دیکھنی چاہیے، دین کی روح کو سمجھنا چاہیے، آج کل اس قسم کے جملے بہت کثرت سے پھیلے ہوئے ہیں اور پھیلائے جارہے ہیں اور فیشن بن گئے ہیں۔

شریعت میں ظاہر اور باطن دونوں مطلوب ہیں

خوب یادرکھیے! دین کے احکام روح پر بھی ہیں، جسم پر بھی ہیں، باطن پر بھی ہیں اور ظاہر پر بھی ہیں، قرآن کریم کا ارشاد ہے:﴿وذروا ظاهر الاثم و باطنه﴾ [سورۃ الانعام:۱۲۰]

یعنی ظاہر کے گناہ بھی چھوڑ دو اور باطن کے گناہ بھی چھوڑ دو، صرف یہ نہیں کہا کہ باطن کے گناہ چھوڑ دو، خوب یادرکھیے! جب تک ظاہر خراب ہے تو پھر یہ شیطان کا دھوکہ ہے کہ باطن ٹھیک ہے، اس لیے کہ ظاہر اسی وقت خراب ہوتا ہے جب اندر سے باطن خراب ہوتا ہے، اگر باطن خراب نہ ہو تو ظاہر بھی خراب نہیں ہوگا۔

ہمارے ایک بزرگ ایک مثال دیا کرتے تھے کہ جب کوئی پھل اندر سے سڑ جاتا ہے تو اس کے سڑنے کے آثار چھلکے پر داغ کی شکل میں نظر آنے لگتے ہیں اور اگر اندر سے وہ پھل سڑا ہوا نہیں ہے تو چھلکے پر خرابی نظر نہیں آئے گی، چھلکے پر اسی وقت خرابی ظاہر ہوتی ہے جب اندر سے خراب ہو، اسی طرح جس شخص کا ظاہر خراب ہے تو یہ اس بات کی علامت ہے کہ باطن میں بھی کچھ نہ کچھ خرابی ضرور ہے، ورنہ ظاہر خراب ہوتا ہی نہیں، لہٰذا یہ کہنا کہ ہمارا ظاہر اگر خراب ہے تو کیا ہوا؟ باطن ٹھیک ہے، یادرکھیے! اس صورت میں باطن بھی ٹھیک ہو ہی نہیں سکتا۔

دنیا کے سارے کاموں میں تو ظاہر بھی مطلوب ہے اور باطن بھی مطلوب ہے، ایک بے چارہ دین ہی ایسا رہ گیا ہے جس کے بارے میں یہ کہہ دیا جاتا ہے کہ ہمیں اس کا باطن چاہیے، ظاہر نہیں چاہیے، مثلاً دنیا کے اندر جب آپ مکان بناتے ہیں تو مکان کا باطن تو یہ ہے کہ چار دیواری کھڑی کر کے اوپر سے چھت ڈال دی تو باطن حاصل ہو گیا، اب اس پر پلاستر کی کیا ضرورت ہے؟ اور رنگ وروغن کی کیا ضرورت ہے؟ اس لیے کہ مکان کی روح تو حاصل ہو گئی ہے، وہ مکان رہنے کے قابل ہو گیا، مگر مکان کے اندر تو یہ فکر ہے کہ صرف چار دیواری اور چھت کافی نہیں، بلکہ پلاستر بھی ہو، رنگ وروغن بھی ہو، اس میں زیب وزینت کا سارا سامان موجود ہو، یہاں کبھی صرف باطن ٹھیک کر لینے کا فلسفہ نہیں چلتا، یا مثلاً گاڑی ہے، ایک اس کا باطن ہے اور ایک ظاہر ہے، گاڑی کا باطن یہ ہے کہ ایک ڈھانچہ لے کر اس میں انجن [اور ٹائر] لگا لو، تو اب باطن حاصل ہے، اس لیے کہ انجن لگا ہوا ہے، وہ سواری کرنے کے قابل ہے، لہٰذا اب نہ باڈی کی ضرورت ہے، نہ رنگ وروغن کی ضرورت ہے، وہاں تو کسی شخص نے آج تک یہ نہیں کہا کہ مجھے گاڑی کا باطن حاصل ہے، اب ظاہر کی ضرورت نہیں، بلکہ وہاں تو ظاہر بھی مطلوب ہے اور باطن بھی مطلوب ہے، ایک بے چارہ دین ہی ایسا مسکین رہ گیا کہ

اس میں صرف باطن مطلوب ہے، ظاہر مطلوب نہیں۔

یاد رکھیے! یہ شیطان کا دھوکہ اور فریب ہے، لہٰذا ظاہر بھی درست کرنا ضروری ہے اور باطن بھی درست کرنا ضروری ہے، چاہے لباس ہو، یا کھانا ہو، یا آداب معاشرت ہوں، اگر چہ ان سب کا تعلق ظاہر سے ہے، لیکن ان سب کا گہرا اثر باطن پر واقع ہوتا ہے، اس لیے لباس کو معمولی سمجھ کر نظر انداز نہیں کرنا چاہیے، جو لوگ ایسی باتیں کرتے ہیں ان کو دین کا حقیقی فہم حاصل نہیں، اگر یہ بات نہ ہوتی تو حضور نبی کریم ﷺ لباس کے بارے میں کوئی ہدایت نہ فرماتے، کوئی تعلیم نہ دیتے، لیکن آپ نے لباس کے بارے میں ہدایات دیں، آپ کی تعلیمات اسی جگہ پر آتی ہیں جہاں لوگوں کے بہک جانے اور غلطی میں پڑ جانے کا خطرہ ہوتا ہے، اس لیے ان اصولوں کو اور ان تعلیمات کو اہتمام کے ساتھ سننے کی ضرورت ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۵، ص ۲۶۲]

کیا لباس کے بارے میں علماء تنگ نظر ہیں ؟

لوگ ہمیں یہ کہتے ہیں کہ آپ جو اس قسم کا لباس پہننے سے منع کرتے ہیں، یہ تنگ نظری کی بات ہے ، اور ایسی بات کہنے والوں کو تنگ نظر کہا جاتا ہے، حالانکہ جس قوم کا لباس تم اختیار کر رہے ہو، اس کی تنگ نظری اور اس کی مسلمان دشمنی کا عالم یہ ہے کہ جب اس نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو ہمارے مغل مسلمان بادشاہوں کا جو لباس تھا، یعنی عمامہ اور خاص شلوار قمیص، اس نے وہ لباس اپنے خانساموں کو پہنایا، اپنے بیروں کو پہنایا، اپنے چوکیداروں کو پہنایا، اور اس نے ان کو یہ لباس پہننے پر مجبور کیا، ایسا کیوں کیا؟ صرف مسلمانوں کو ذلیل کرنے کے لیے اور یہ دکھانے کے لیے کہ دیکھو! ہم نے تمہارے بادشاہوں کا لباس اپنے نوکروں کو، اپنے خانساموں کو اور بیروں کو پہنایا، اس قوم کی تنگ نظری کا تو یہ عالم ہے اور ماشاء اللہ ہماری فراخی قلب کا یہ عالم ہے کہ ہم ان کا لباس بڑے فخر سے اور بڑے ذوق وشوق سے پہننے کے لیے تیار ہیں، اب اگر ان سے کوئی کہے کہ یہ لباس پہننا غیرت کے خلاف ہے تو اس کو کہا جاتا ہے کہ تم تنگ نظر ہو:

خرد کا نام جنوں رکھ دیا ، جنوں کا خرد
جو چاہے آپ کا حسن کرشمہ ساز کرے

یہ بات بھی خوب سمجھ لو کہ تم کتنا ہی ان کا لباس پہن لو اور کتنا ہی ان کا طریقہ اختیار کر لو، مگر تم پھر بھی ان کی نگاہ میں عزت نہیں پا سکتے، قرآن کریم نے صاف صاف کہہ دیا ہے کہ:

﴿ولن ترضى عنك اليهود ولا النصارى حتى تتبع ملتهم﴾ [سورۃ البقرۃ: ۱۲۰]

یہ یہود اور نصاری تم سے کبھی بھی راضی نہیں ہوں گے، جب تک کہ تم ان کی ملت کو اختیار نہیں کر لو گے، ان کے نظریات، ان کے ایمان، ان کے دین کو اختیار نہیں کر لو گے، اس وقت وہ تم سے راضی نہیں ہوں گے، لہٰذا اب تم اپنا لباس بدل لو، پوشاک بدل لو، سراپا بدل لو، جسم بدل لو، جو چاہو بدل لو، لیکن وہ تم

سے راضی ہونے کو تیار نہیں، چنانچہ تم نے تجربہ کرلیا اور سب کچھ کر کے دیکھ لیا، سب کچھ ان کی نقالی پر فنا کر کے دیکھ لیا، سر سے لے کر پاؤں تک تم نے اپنے آپ کو بدل لیا، کیا تم سے وہ لوگ خوش ہو گئے؟ کیا تم سے راضی ہو گئے؟ کیا تمہارے ساتھ انہوں نے ہمدردی کا برتاؤ شروع کر دیا؟ بلکہ آج بھی ان کی دشمنی کا وہی عالم ہے، اور اس لباس کی وجہ سے ان کے دل میں تمہاری عزت کبھی پیدا نہیں ہو سکتی۔ [اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۲۹۴]

کیا شریعت نے کوئی لباس مخصوص نہیں کیا؟

شریعت نے لباس کے بارے میں بڑی معتدل تعلیمات عطا فرمائی ہیں، چنانچہ شریعت نے کوئی خاص لباس مقرر کر کے اور اس کی ہیئت بتا کر یہ نہیں کہا کہ ہر آدمی کے لیے ایسا لباس پہننا ضروری ہے لہذا جو شخص اس ہیئت سے ہٹ کر لباس پہنے گا وہ مسلمانی کے خلاف ہے، ایسا اس لیے نہیں کیا کہ اسلام دین فطرت ہے، اور حالات کے لحاظ سے، مختلف ممالک کے لحاظ سے، وہاں کے موسموں کے لحاظ سے، وہاں کی ضروریات کے لحاظ سے لباس مختلف ہو سکتا ہے، کہیں باریک، کہیں موٹا، کہیں کسی وضع کا، کہیں کسی ہیئت کا لباس اختیار کیا جا سکتا ہے، لیکن اسلام نے لباس کے بارے میں کچھ بنیادی اصول عطا فرما دیے، ان اصولوں کی ہر حالت میں رعایت رکھنی ضروری ہے، ان کو سمجھ لینا چاہیے۔

لباس کے چار بنیادی اصول ومقاصد
قرآن وحدیث کی روشنی میں

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے لباس کے بنیادی اصول بتا دیے ہیں فرمایا کہ:

﴿یبنی أدم قد انزلنا علیکم لباسا یواری سوأتکم وریشا ولباس التقوی ذلك خیر﴾ [سورۃ الأعراف:۲۶]

اے بنی آدم! ہم نے تمہارے لیے ایسا لباس اتارا جو تمہاری پوشیدہ اور شرم کی چیزوں کو چھپاتا ہے، اور جو تمہارے لیے زینت کا سبب بنتا ہے، اور تقوی کا لباس تمہارے لیے سب سے بہتر ہے۔

یہ تین جملے ارشاد فرمائے اور ان تین جملوں میں اللہ تعالیٰ نے معانی کی کائنات بھر دی ہے۔

① لباس کا پہلا بنیادی اصول ستر عورت

اس آیت میں لباس کا پہلا مقصد یہ بیان فرمایا کہ وہ تمہاری پوشیدہ اور شرم کی چیزوں کو چھپا سکے، "سوآۃ" کے معنی وہ چیز جس کے ذکر کرنے سے یا جس کے ظاہر ہونے سے انسان شرم محسوس کرے، مراد ہے "ستر عورت"، تو گویا کے لباس کا سب سے بنیادی مقصد "ستر عورت" ہے، اللہ تعالیٰ نے مرد اور عورت کے جسم کے کچھ حصوں کو "عورت" قرار دیا، یعنی وہ چھپانے کی چیز ہے، وہ ستر عورت مردوں میں اور ہے، عورتوں میں

اور ہے، مردوں میں ستر کا حصہ جس کو چھپانا ہر حال میں ضروری ہے وہ ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ہے، اس حصے کو کھولنا بلا ضرورت جائز نہیں، علاج وغیرہ کی مجبوری میں تو جائز ہے، لیکن عام حالات میں اس کو چھپانا ضروری ہے، عورت کا سارا جسم، سوائے چہرے اور گٹوں تک ہاتھ کے سب کا سب ''عورت'' ہے اور ''ستر'' ہے، جس کا چھپانا ضروری ہے اور کھولنا جائز نہیں، لہٰذا لباس کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ شریعت کے مقرر کیے ہوئے ستر کے حصوں کو چھپالے، جو لباس اس مقصد کو پورا نہ کرے، شریعت کی نگاہ میں وہ لباس ہی نہیں، وہ لباس کہلانے کے لائق ہی نہیں، کیونکہ وہ لباس اپنا بنیادی مقصد پورا نہیں کر رہا ہے جس کے لیے وہ بنایا گیا ہے۔

لباس کے تین عیب

لباس کے بنیادی مقصد کو پورا نہ کرنے کی تین صورتیں ہوتی ہیں:

① ایک صورت تو یہ ہے کہ وہ لباس اتنا چھوٹا ہے کہ لباس پہننے کے باوجود ستر کا کچھ حصہ کھلا رہ گیا، اس لباس کے بارے میں یہ کہا جائے گا کہ اس لباس سے اس کا بنیادی مقصد حاصل نہ ہوا، اور کشف عورت ہو گیا۔

② دوسری صورت یہ ہے کہ اس لباس سے ستر کو چھپا تو لیا، لیکن وہ لباس اتنا باریک ہے کہ اس سے اندر کا بدن جھلکتا ہے۔

③ تیسری صورت یہ ہے کہ لباس اتنا چست ہے کہ لباس پہننے کے باوجود جسم کی بناوٹ اور جسم کا ابھار نظر آ رہا ہے، یہ بھی ستر کے خلاف ہے۔

اس لیے مرد کے لیے ناف سے لے کر گھٹنوں تک کا حصہ ایسے کپڑے سے چھپانا ضروری ہے جو اتنا موٹا ہو کہ اندر سے جسم نہ جھلکے اور وہ اتنا ڈھیلا ڈھالا کہ اندر کے اعضا کو نمایاں نہ کرے، اور اتنا مکمل ہو کہ جسم کا کوئی حصہ کھلا نہ رہ جائے، اور یہی تین چیزیں عورت کے لباس میں بھی ضروری ہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج۵، ص۲۶۵]

②دوسرا اُصول زینت اور خوب صورتی

لباس کا دوسرا مقصد اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمایا کہ ''ریشا'' یعنی ہم نے اس لباس کو تمہارے لیے زینت کی چیز اور خوب صورتی کی چیز بنائی، ایک انسان کی خوب صورتی لباس میں ہے، لہٰذا لباس ایسا ہونا چاہیے کہ جسے دیکھ کر انسان کو فرحت ہو، بدہیئت اور بے ڈھنگا نہ ہو، جس کو دیکھ کر دوسروں کو نفرت اور کراہت ہو، بلکہ ایسا ہونا چاہیے جس کو دیکھ کر زینت کا فائدہ حاصل ہو سکے۔

لیکن اگر لباس پہننے سے نہ تو آسائش مقصود ہے اور نہ آرائش مقصود ہے بلکہ نمائش اور دکھاوا مقصود ہے، تاکہ لوگ دیکھیں کہ ہم نے اتنا شاندار کپڑا پہنا ہوا ہے، اور اتنا اعلیٰ درجے کا لباس پہنا ہوا ہے اور یہ دکھانا مقصود ہے کہ ہم بڑی دولت والے بڑے پیسے والے ہیں، اور دوسروں پر بڑائی جتانا اور دوسروں پر رعب

جمانا مقصود ہے، یہ سب باتیں نمائش میں داخل ہیں اور حرام ہیں، اس لیے کہ نمائش کی خاطر جو بھی لباس پہنا جائے وہ حرام ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۵،ص۲۷۶]

③تیسرا اُصول تشبہ سے بچنا

لباس کے بارے میں شریعت نے جو تیسرا اُصول بیان فرمایا، وہ ہے "تشبہ" سے بچنا، یعنی ایسا لباس پہننا، جس کو پہن کر انسان کسی قوم کا فرد نظر آئے اور اس مقصد سے وہ لباس پہنے تاکہ میں ان جیسا ہوجاؤں، اس کو شریعت میں "تشبہ" کہتے ہیں، دوسرے لفظوں میں یوں کہا جائے کہ کسی غیر مسلم قوم کی نقالی کی نیت سے کوئی لباس پہننا، اس سے قطع نظر کہ وہ چیز ہمیں پسند ہے یا نہیں؟ وہ اچھی ہے یا بری ہے؟ لیکن چونکہ فلاں قوم کی نقالی کرنی ہے، بس ان کی نقالی کے پیش نظر اس لباس کو اختیار کیا جارہا ہے، اس کو "تشبہ" کہا جاتا ہے، اس نقالی پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بڑی سخت وعید ارشاد فرمائی ہے، چنانچہ ارشاد فرمایا کہ:

"من تشبّه بقوم فهو منهم" [أبو داود، كتاب اللباس، باب في لباس الشهرة]

یعنی جو شخص کسی قوم کے ساتھ تشبہ اختیار کرے، اسی کی نقالی کرے اور ان جیسا بننے کی کوشش کرے تو وہ انہیں میں سے ہے، گویا کہ وہ مسلمانوں میں سے نہیں ہے، اسی قوم کا ایک فرد ہے، اس لیے کہ یہ شخص انہی کو پسند کررہا ہے، انہی سے محبت رکھتا ہے، انہی جیسا بننا چاہتا ہے، تو اب تیرا حشر بھی انہی کے ساتھ ہوگا، اللہ تعالیٰ محفوظ فرمائے، آمین۔

تشبہ اور مشابہت کی حقیقت اور ان میں فرق

"تشبہ" کے بارے میں یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ یہ تشبہ کب پیدا ہوتی ہے؟ اور کب اس کی ممانعت آتی ہے؟ پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی ایسے کام میں دوسری قوم کی نقالی کرنا جو فی نفسہ برا کام ہے اور شریعت کے اصول کے خلاف ہے، ایسے کام میں نقالی تو حرام ہی ہے، دوسرے یہ کہ وہ کام اگرچہ فی نفسہ برا تو نہیں ہے، بلکہ مباح ہے، لیکن یہ شخص اس غرض سے وہ کام کررہا ہے کہ میں ان جیسا نظر آؤں اور دیکھنے میں ان جیسا لگوں اور اہتمام کرکے ان جیسا بننے کی کوشش کررہا ہے، اس صورت میں وہ مباح کام بھی حرام اور ناجائز ہوجاتا ہے۔

مثلاً ہندو اپنے گلے میں زنار ڈالا کرتے ہیں، اب یہ زنار ایک طرح کا ہار ہی ہوتا ہے، اگر کوئی مسلمان ویسے ہی اتفاقاً ڈال لے تو کوئی گناہ کا کام نہیں ہے، ناجائز اور حرام کام نہیں ہے، بلکہ مباح ہے، لیکن اگر کوئی شخص اس مقصد کے لیے اپنے گلے میں زنار ڈال رہا ہے تاکہ میں ان جیسا لگوں تو یہ ناجائز اور حرام ہے اور تشبہ میں داخل ہے۔

یا مثلاً ہندو عورتیں اپنے ماتھے پر سرخ قشقہ لگاتی ہیں، اب اگر بالفرض ہندو عورتوں میں اس طرح قشقہ لگانے کا رواج نہ ہوتا اور کوئی مسلمان عورت خوب صورتی اور زینت کے لیے لگاتی تو یہ کام فی نفسہ

مباح تھا، کوئی ناجائز اور حرام نہیں تھا، لیکن اب اگر ایک عورت قشقہ اس لیے لگا رہی ہے تا کہ میں ان کا فیشن اختیار کروں اور ان جیسی نظر آؤں تو اس صورت میں یہ قشقہ لگانا حرام ہے، ناجائز ہے، ہندوستان میں مسلمان عورتیں تو ان کی مشابہت اختیار کرنے کے لیے یہ قشقہ لگاتی ہیں، لیکن اب سنا ہے کہ یہاں پاکستان میں بھی عورتوں میں قشقہ لگانے کا رواج شروع ہوگیا ہے، حالانکہ یہاں ہندو عورتوں کے ساتھ معاشرت بھی نہیں ہے، اس کے باوجود مسلمان خواتین اپنے ماتھے پر قشقہ لگاتی ہیں تو یہ ان کے ساتھ تشبہ اختیار کرنا ہے جو حرام اور ناجائز ہے۔

لہذا کوئی عمل جو اگر چہ فی نفسہ جائز اور مباح ہو، مگر اس کے ذریعہ دوسری قوموں کے ساتھ مشابہت پیدا کرنا مقصود ہو اس کو ''تشبہ'' کہتے ہیں جس کو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ناجائز اور حرام قرار دیا ہے۔

اسی مندرجہ بالا اصول کی بنیاد پر یہ کہا جائے گا کہ جو لباس کسی بھی قوم کا شعار بن چکے ہیں، یعنی وہ لباس اس قوم کی امتیازی علامت بن چکا ہے، اگر ان کی نقالی کی غرض سے ایسا لباس اختیار کیا جائے گا تو وہ حرام اور ناجائز ہوگا، اور گناہ ہوگا، مثلاً آج کل مردوں میں کوٹ پتلون کا رواج چل پڑا ہے، اس میں بعض باتیں تو فی نفسہ بھی ناجائز ہیں، چاہے اس میں تشبہ پایا جائے یا نہ پایا جائے، چنانچہ ایک خرابی تو یہ ہے کہ یہ پتلون ٹخنوں سے نیچے پہنی جاتی ہے اور کوئی لباس بھی مردوں کے لیے ٹخنوں سے نیچے پہننا جائز نہیں، دوسری خرابی یہ ہے کہ اگر پتلون ایسی چست ہو کہ اس کی وجہ سے اعضا نمایاں ہوں، تو پھر لباس کا جو بنیادی مقصد تھا، یعنی ''ستر'' کرنا وہ حاصل نہ ہوا تو پھر وہ لباس شرعی لحاظ سے بے معنی اور بے کار ہے، لہذا ان دو خرابیوں کی وجہ سے فی نفسہ پتلون پہننا جائز نہیں، لیکن اگر کوئی شخص اس بات کا اہتمام کرے کہ وہ پتلون چست نہ ہو بلکہ ڈھیلی ڈھالی ہو، اور اس کا اہتمام کرے کہ وہ پتلون ٹخنوں سے نیچے نہ ہو تو ایسی پتلون پہننا فی نفسہ مباح ہے۔

لیکن اگر کوئی شخص پتلون اس مقصد سے پہنے تا کہ میں انگریز نظر آؤں، اور میں ان کی نقالی کروں اور ان جیسا بن جاؤں، تو اس صورت میں پتلون پہننا حرام اور ناجائز ہے، اور تشبہ میں داخل ہے، لیکن اگر نقالی مقصود نہیں ہے، اور اس بات کا بھی اہتمام کر رہا ہے کہ پتلون ٹخنوں سے اونچی ہو اور ڈھیلی ہو، تو ایسی صورت میں اس کے پہننے کو حرام تو نہیں کہیں گے، لیکن فی نفسہ اس پتلون کا پہننا اچھا نہیں، اور پھر بھی کراہت سے خالی نہیں، کیوں؟ اس بات کو ذرا غور سے سمجھ لیں۔

وہ یہ کہ دو چیزیں الگ الگ ہیں، ایک تشبہ اور ایک ہے مشابہت، دونوں میں فرق ہے، تشبہ کے معنی تو یہ ہیں کہ آدمی ارادہ کر کے نقالی کرے، اور ارادہ کر کے ان جیسا بننے کی کوشش کرے، یہ تو بالکل ہی ناجائز ہے، دوسری چیز ہے ''مشابہت''، یعنی اس جیسا بننے کا ارادہ تو نہیں کیا تھا، لیکن اس عمل سے ان کے ساتھ

مشابہت خود بخود پیدا ہوگئی، تو یہ مشابہت جو خود بخود پیدا ہوجائے تو یہ حرام تو نہیں، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے بلا ضرورت مشابہت پیدا ہونے سے بھی بچنے کی تاکید فرمائی ہے، فرمایا کہ اس کی کوشش کرو کہ ان سے امتیاز رہے، مسلمان قوم اور مسلمان ملت کا ایک امتیاز ہونا چاہیے، ایسا نہ ہو کہ دیکھ کر پتہ نہ چلے کہ یہ آدمی مسلمان ہے یا نہیں؟ سر سے لے کر پاؤں تک اپنا حلیہ ایسا بنا کر رکھا ہے کہ دیکھ کر یہ پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہ مسلمان ہے کہ نہیں؟ اس کو سلام کریں یا نہ کریں؟ مباحات کے ذریعہ بھی ایسا حلیہ بنانا پسندیدہ نہیں۔

حضور ﷺ کا دینی امور میں بھی غیروں کی مشابہت سے دور رہنے کا اہتمام

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشابہت سے بچنے کا اتنا اہتمام فرمایا کہ محرم کی دس تاریخ کو عاشورہ کے دن روزہ رکھنا بڑی فضیلت کا کام ہے اور جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے تو ابتدا میں عاشورہ کا روزہ فرض تھا، اور رمضان کے روزے اس وقت تک فرض نہیں ہوئے تھے، اور جب رمضان کے روزے فرض ہو گئے تو عاشورہ کے روزے کی فرضیت منسوخ ہوگئی، اب فرض تو نہ رہا، البتہ نفل اور مستحب بن گیا، لیکن جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ معلوم ہوا کہ یہودی بھی عاشورہ کے دن روزہ رکھتے ہیں، اور یہودیوں کے روزہ رکھنے کی وجہ وہی تھی کہ اس دن میں چونکہ بنی اسرائیل کو اللہ تعالی نے حضرت موسی علیہ السلام کے ذریعہ فرعون سے نجات دی تھی، اس کے شکرانے کے طور پر یہودی اس دن روزہ رکھتے تھے، اب ظاہر ہے کہ اگر مسلمان عاشورہ کے دن روزہ رکھیں گے تو وہ یہودیوں کی نقالی میں تو نہیں رکھیں گے، وہ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع میں رکھیں گے، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر آئندہ سال میں زندہ رہا تو عاشورہ کے ساتھ ایک روزہ اور ملا کر رکھوں گا، یا نویں تاریخ کا روزہ، یا گیارہویں تاریخ کا روزہ، تاکہ یہودیوں کے ساتھ مشابہت پیدا نہ ہو، بلکہ ان سے علیحدگی اور امتیاز ہو جائے۔ [مسند احمد، ج ۱، ص ۲۳۶]

اب دیکھیے کہ روزے جیسی عبادت میں بھی آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے مشابہت پیدا ہونے کو پسند نہیں فرمایا، اس لیے آپ نے فرمایا کہ جب عاشورہ کا روزہ رکھو تو اس کے ساتھ یا تو نویں تاریخ کا روزہ ملا لو، یا گیارہویں تاریخ کا روزہ ملا لو، تاکہ یہودیوں کے ساتھ مشابہت بھی پیدا نہ ہو، لہذا تشبہ تو حرام ہے، لیکن مشابہت پیدا ہو جانا بھی کراہت سے خالی نہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے بھی بچنے کی تلقین فرمائی ہے۔

ایک حدیث میں فرمایا: فرق ما بیننا و بین المشرکین العمائم علی القلانس

[أبو داود، کتاب اللباس، باب في العمائم]

یعنی ہمارے اور مشرکین کے درمیان فرق ٹوپی پر عمامہ پہننا ہے، یعنی یہ مشرکین عمامے کے نیچے ٹوپیاں نہیں پہنتے ہیں، تم ان کی مخالفت کرو، اور عمامے کے نیچے ٹوپی بھی پہنا کرو، حالانکہ بغیر ٹوپی کے عمامہ پہننا

کوئی ناجائز اور حرام نہیں، لیکن ذرا سی مشابہت سے بچنے کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ حکم فرمایا کہ ٹوپی کے اوپر عمامہ پہنو، تاکہ اشتباہ لازم نہ آئے، لہٰذا بلا وجہ کسی دوسری قوم کی مشابہت اختیار کرنا اچھا نہیں ہے، آدمی اس سے جتنا بچے بہتر ہے، اس لیے حضرات صحابہ کرام اس کا بہت اہتمام فرماتے تھے کہ دوسری قوموں کی مشابہت پیدا نہ ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اس ارشاد میں ہمیں ایک سبق اور ملتا ہے، وہ یہ کہ غیر مسلموں کے ساتھ ادنی مشابہت بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پسند نہیں فرمائی، حالانکہ وہ مشابہت کسی برے اور ناجائز کام میں نہیں تھی، بلکہ ایک عبادت میں مشابہت تھی کہ اس دن جو عبادت کررہے ہیں، ہم بھی اس دن وہی عبادت کررہے ہیں، لیکن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس کو بھی پسند نہیں فرمایا، کیوں؟ اس لیے کہ اللہ تعالی نے مسلمانوں کو جو دین عطا فرمایا ہے، وہ سارے ادیان سے ممتاز ہے اور ان پر فوقیت رکھتا ہے، لہٰذا ایک مسلمان کا ظاہر و باطن بھی غیر مسلم سے ممتاز ہونا چاہیے، اس کا طرز عمل، اس کی چال ڈھال، اس کی وضع قطع، اس کا سراپا، اس کے اعمال، اس کے اخلاق، اس کی عبادتیں وغیرہ ہر چیز غیر مسلموں سے ممتاز ہونی چاہیے، چنانچہ احادیث میں یہ احکام جا بجا ملیں گے جس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ غیر مسلموں سے الگ طریقہ اختیار کرو۔

تشبہ اور مشابہت دونوں سے احتیاط

بہر حال! فتوے کی بات تو وہ ہے جو میں نے پہلے عرض کی کہ تشبہ تو ناجائز، حرام اور گناہ ہے، اور تشبہ کا مطلب یہ ہے کہ ارادہ کرکے ان جیسا بننے کی کوشش کرنا، اور مشابہت کے معنی یہ ہیں کہ ان جیسا بننے کا ارادہ تو نہیں تھا لیکن کچھ مشابہت پیدا ہوگئی، یہ گناہ اور حرام تو نہیں ہے، البتہ کراہت سے خالی نہیں، اور غیرت کے تو بالکل خلاف ہے، اس لیے ان دونوں سے بچنے کی ضرورت ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۲۸۷ تا ۲۹۸]

④ چوتھا اُصول تکبر اور بڑائی سے اجتناب

لباس کے بارے میں چوتھا اصول یہ ہے کہ ایسا لباس پہننا حرام ہے جس کو پہن کر دل میں تکبر اور بڑائی پیدا ہو جائے، چاہے وہ لباس ٹاٹ ہی کا کیوں نہ ہو، مثلاً اگر کوئی ایک شخص ٹاٹ کا لباس پہنے اور مقصد یہ ہو کہ یہ پہن کر میں لوگوں کی نظروں میں بڑا درویش اور صوفی نظر آؤں، اور بڑا متقی اور پرہیزگار بن جاؤں، اور پھر اس کی وجہ سے دوسروں پر اپنی بڑائی کا خیال دل میں آجائے، اور دوسروں کی تحقیر پیدا ہو جائے تو ایسی صورت میں وہ ٹاٹ کا لباس بھی تکبر کا ذریعہ اور سبب ہے، اس لیے حرام ہے، حضرت سفیان ثوریؒ فرماتے ہیں کہ تکبر کپڑے پہننے سے نہیں ہوتا، بلکہ دوسروں کی حقارت دل میں لانے سے ہوتا ہے، اس لیے بعض اوقات ایک شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں بڑا تواضع والا لباس پہن رہا ہوں، حقیقت میں اس کے اندر تکبر بھرا ہوتا ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۲۹۸]

مَردوں کے لیے ٹخنے ڈھانکنا جائز نہیں

حضرت عبداللہ بن عمرؓ فرماتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص اپنے کپڑے کو تکبر کے ساتھ نیچے گھسیٹے تو اللہ تعالیٰ قیامت کے روز اس کو رحمت کی نگاہ سے دیکھیں گے بھی نہیں۔

[صحیح بخاری، کتاب اللباس، باب من جر ثوبه من الخیلاء]

دوسری حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ مرد کے زیر جامہ کا جتنا حصہ ٹخنوں سے نیچے ہوگا وہ حصہ جہنم میں جائے گا، اس سے معلوم ہوا کہ مردوں کے لیے ٹخنوں سے نیچے پائجامہ، شلوار، پتلون، لنگی وغیرہ پہننا جائز نہیں، اور اس پر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے دو وعیدیں بیان فرمائیں، ایک یہ کہ ٹخنوں سے نیچے جتنا حصہ ہوگا وہ جہنم میں جائے گا، اور دوسرے یہ کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ایسے شخص کی طرف رحمت کی نگاہ سے دیکھے گا بھی نہیں۔

اب دیکھیے کہ ٹخنوں سے اوپر زیر جامہ پہننا ایک معمولی بات ہے، اگر ایک انچ اوپر شلوار پہن لی تو اس سے کیا آفت اور مصیبت آجائے گی؟ کونسا آسمان ٹوٹ پڑے گا؟ لیکن اللہ تعالیٰ کی ناراضگی سے بچ جاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کی نظر رحمت حاصل ہوگی، اور یہ ایسا گناہ بے لذت ہے کہ جس میں پوری کی پوری قوم مبتلا ہے، کسی کو فکر ہی نہیں۔

اگر دل میں تکبر نہ ہو تو کیا ٹخنے ڈھکنا چھپانا جائز ہے؟

بعض لوگ یہ پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے تکبر کی وجہ سے ٹخنے سے نیچے ازار پہننے کو منع فرمایا تھا، لہٰذا اگر تکبر نہ ہو تو پھر ٹخنوں سے نیچے پہننے میں کوئی حرج نہیں، اور دلیل میں یہ حدیث پیش کرتے ہیں کہ ایک مرتبہ حضرت صدیق اکبرؓ نے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے فرمایا کہ یا رسول اللہ! آپ نے تو فرمایا کہ ازار کو ٹخنے سے نیچے نہ کرو، لیکن میرا ازار بار بار ٹخنے سے نیچے ڈھلک جاتا ہے، میرے لیے اوپر رکھنا مشکل ہوتا ہے، میں کیا کروں؟ تو حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے فرمایا کہ تمہارا ازار جو نیچے ڈھلک جاتا ہے یہ تکبر کی وجہ سے نہیں ہے، بلکہ تمہارے عذر اور مجبوری کی وجہ سے یہ ڈھلک جاتا ہے، اس لیے تم ان میں داخل نہیں۔

[ابو داود، کتاب اللباس، باب ماجاء فی اسبال الازار]

اب لوگ استدلال میں اس واقعے کو پیش کر کے یہ کہتے ہیں کہ ہم بھی تکبر کی وجہ سے نہیں کرتے، لہٰذا ہمارے لیے جائز ہونا چاہیے۔

بات اصل میں یہ ہے کہ یہ فیصلہ کون کرے کہ تم تکبر کی وجہ سے کرتے ہو یا تکبر کی وجہ سے نہیں کرتے؟ ارے بھائی! یہ تو دیکھو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم سے زیادہ تکبر سے پاک کون ہوسکتا ہے! لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے کبھی زندگی بھر ٹخنوں سے نیچے ازار نہیں پہنا، اس سے معلوم ہوا کہ حضرت صدیق اکبرؓ کو جو اجازت دی گئی تھی وہ ایک مجبوری کی وجہ سے اجازت دی گئی تھی، وہ مجبوری یہ تھی کہ ان کے جسم کی بناوٹ

ایسی تھی کہ بار بار ان کا ازار خود بخود نیچے ڈھلک جاتا تھا، لیکن تمہارے ساتھ کیا مجبوری ہے؟ اور آج تک آپ نے کوئی ایسا متکبر دیکھا ہے جو یہ کہے کہ میں تکبر کرتا ہوں! میں متکبر ہوں! اس لیے کہ کسی متکبر کو کبھی خود سے اپنے متکبر ہونے کا خیال نہیں آتا، اس لیے شریعت نے علامتوں کی بنیاد پر احکام جاری کیے ہیں، یہ نہیں کہا کہ تکبر ہو تو ازار کو اونچا رکھو، ورنہ نیچے کرلیا کرو، بلکہ شریعت نے بتادیا کہ جب ازار کو نیچے لٹکا رہے ہو باوجودیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے منع فرمادیا ہے، اس کا صاف مطلب یہ ہے کہ تمہارے اندر تکبر ہے، اس لیے ہر حالت میں ازار نیچے لٹکانا ناجائز ہے۔

اگرچہ بعض فقہا نے یہ لکھ دیا ہے کہ اگر تکبر کی وجہ سے نیچے کرے تو مکروہ تحریمی ہے اور تکبر کے بغیر کرے تو مکروہ تنزیہی ہے، لیکن عام محققین کا صحیح قول یہ ہے اور جس پر ان کا عمل بھی رہا ہے کہ ہر حالت میں نیچے کرنا مکروہ تحریمی ہے، اس لیے کہ تکبر کا پتہ لگانا آسان نہیں ہے کہ تکبر کہاں ہے اور کہاں نہیں؟ اس لیے اس سے بچنے کا راستہ یہ ہے کہ آدمی ٹخنے سے اونچا ازار پہنے، اور تکبر کی جڑ ہی ختم کردی جائے، اللہ تعالیٰ اپنے فضل اور رحمت سے ان اصولوں پر عمل کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

[اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۳۰۲]

"حضور ﷺ کے زمانے میں جو لباس رائج تھا اسے زبردستی دین بنادیا گیا"

آج کل ایک پروپیگنڈہ بہت پھیلایا جارہا ہے اور بہت سے لوگ یہ کہنے لگے ہیں کہ درحقیقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے وہ طریقے اختیار کرلیے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں رائج تھے اور جیسا لباس قریش میں رائج تھا، جیسی وضع قطع رائج تھی اسی کو اختیار کرلیا، اب اگر آج ہم اپنے دور کے رائج شدہ طریقے اختیار کرلیں تو اس میں کیا حرج ہے؟

خوب سمجھ لیجیے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کبھی بھی اپنے زمانے میں رائج طریقوں کو اختیار نہیں فرمایا، بلکہ ان میں تبدیلی پیدا کی، اور ان کو ناجائز قرار دیا، آج لوگ نہ صرف یہ کہ غلط کاری میں مبتلا ہیں، بلکہ بعض اوقات بحث کرنے کو تیار ہوجاتے ہیں کہ اگر ازار ٹخنوں سے ذرا نیچے ہوگیا تو اس میں کیا حرج ہے؟ ارے! حرج یہ ہے کہ یہ حصہ جہنم میں جائے گا اور یہ عمل اللہ تعالیٰ کے غضب کا موجب ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۳۰۰]

فیشن کے نام پر گھٹنے بھی کھول دیے

ہمارے بزرگ تھے حضرت مولانا احتشام الحق صاحب تھانویؒ، وہ ایک تقریر میں فرمانے لگے کہ اب ہمارا یہ حال ہوگیا ہے کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ ٹخنے کھول دو اور ٹخنے ڈھکنا جائز نہیں، تو

اس وقت ہم لوگ ٹخنے کھولنے کو تیار نہیں تھے اور جب انگریز نے کہا کہ گھٹنا کھول دو اور نیکر پہن لو، تو اب گھٹنا کھولنے کو تیار ہو گئے، تو انگریز کے حکم پر گھٹنا بھی کھول دیا اور نیکر پہن لی، اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے حکم پر ٹخنے کھولنے پر تیار نہیں، یہ کتنی بے غیرتی کی بات ہے، ارے! حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کے بھی کچھ تقاضے ہیں، لہذا جب آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس عمل کو ناپسند فرمایا تو ایک مسلمان کو کس طرح یہ گوارا ہو سکتا ہے کہ وہ اس کے خلاف کرے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۳۰۰]

لباس سے متعلق شرعی اصولوں کا خلاصہ

بہر حال! لباس کے یہ چار اصول ہیں:

① پہلا اصول یہ ہے کہ وہ ساتر ہونا چاہیے۔

② دوسرا اُصول یہ ہے کہ حدود شریعت میں رہتے ہوئے اسکے ذریعہ زینت بھی حاصل کرنی چاہیے۔

③ تیسرا اُصول یہ ہے کہ اس کے ذریعہ نمائش اور دکھاوا مقصود نہ ہو۔

④ چوتھا اصول یہ ہے کہ اس کے پہننے سے دل میں تکبر پیدا نہ ہو۔

امانت و خیانت

جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ

افسوس کہ اب جھوٹ میں عام ابتلا ہے، یہاں تک کہ جو لوگ حرام وحلال اور جائز وناجائز کا، اور شریعت پر چلنے کا اہتمام کرتے ہیں، ان میں بھی یہ بات نظر آتی ہے کہ انہوں نے بھی جھوٹ کی بہت سی قسموں کو جھوٹ سے خارج سمجھ رکھا ہے، اور یہ سمجھتے ہیں کہ گویا یہ جھوٹ ہی نہیں ہے، حالانکہ جھوٹا کام کر رہے ہیں، غلط بیانی کر رہے ہیں، اور اس میں دوہرا جرم ہے، ایک جھوٹ بولنے کا جرم، اور دوسرے اس گناہ کو گناہ نہ سمجھنے کا جرم، چنانچہ ایک صاحب جو بڑے نیک تھے، نماز روزے کے پابند، اذکار واشغال کے پابند، بزرگوں سے تعلق رکھنے والے، پاکستان سے باہر قیام تھا، ایک مرتبہ جب پاکستان آئے تو میرے پاس بھی ملاقات کے لیے آگئے، میں نے ان سے پوچھا کہ آپ واپس کب تشریف لے جارہے ہیں؟ انہوں نے جواب دیا کہ میں ابھی آٹھ، دس روز اور ٹھہروں گا، میری چھٹیاں تو ختم ہوگئیں البتہ کل ہی میں نے مزید چھٹی لینے کے لیے ایک میڈیکل سرٹیفکیٹ بھجوادیا ہے، انہوں نے میڈیکل سرٹیفکیٹ بھجوانے کا ذکر اس انداز سے کیا کہ جس طرح یہ ایک معمول کی بات ہے، اس میں کوئی پریشانی کی بات ہی نہیں، میں نے ان سے پوچھا کہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کیسا؟ انہوں نے جواب دیا کہ مزید چھٹی لینے کے لیے بھیج دیا ہے، ویسے اگر چھٹی لیتا تو چھٹی نہ ملتی، اس کے ذریعہ چھٹی مل جائیں گی، میں نے پھر سوال کیا کہ آپ نے اس میڈیکل سرٹیفکیٹ میں کیا لکھا تھا؟ انہوں نے جواب دیا کہ اس میں یہ لکھا تھا کہ یہ اتنے بیمار ہیں کہ سفر کے لائق نہیں، میں نے کہا کیا دین صرف نماز روزے کا نام ہے؟ ذکر شغل کا نام ہے؟ آپ کا بزرگوں سے تعلق ہے، پھر یہ میڈیکل سرٹیفکیٹ کیسا جارہا ہے؟ چونکہ نیک آدمی تھے، اس لیے انہوں نے صاف صاف کہہ دیا کہ میں نے آج پہلی مرتبہ آپ کے منہ سے یہ بات سنی کہ یہ بھی کوئی غلط کام ہے، میں نے کہا کہ جھوٹ بولنا اور کس کو کہتے ہیں؟ انہوں نے پوچھا کہ مزید چھٹی کس طرح لیں؟ میں نے کہا کہ جتنی چھٹیوں کا استحقاق ہے اتنی چھٹی لو، مزید چھٹی لینی ضروری ہو تو بغیر تنخواہ کے لے لو، لیکن یہ جھوٹا سرٹیفکیٹ بھیجنے کا جواز تو پیدا نہیں ہوتا۔

آج کل لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹا میڈیکل سرٹیفکیٹ بنوانا جھوٹ میں داخل ہی نہیں ہے، اور دین صرف ذکر و شغل کا نام رکھ دیا، باقی زندگی کے میدان میں جا کر جھوٹ بول رہا ہو تو اس کا کوئی خیال نہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج ۳، ص ۱۴۰]

جھوٹی سفارش

ایک اچھے خاصے پڑھے لکھے نیک اور سمجھ دار بزرگ کا میرے پاس سفارشی خط آیا، اس وقت میں جدہ میں تھا، اس خط میں یہ لکھا تھا کہ یہ صاحب جو آپ کے پاس آرہے ہیں، یہ انڈیا کے باشندے ہیں، اب یہ پاکستان جانا چاہتے ہیں، لہٰذا آپ پاکستانی سفارت خانے سے ان کے لیے سفارش کر دیں کہ ان کو ایک پاکستانی پاسپورٹ جاری کر دیا جائے، اس بنیاد پر کہ یہ پاکستانی باشندے ہیں، اور ان کا پاسپورٹ یہاں سعودی عرب میں گم ہو گیا ہے، اور خود انہوں نے پاکستانی سفارت خانے میں درخواست دے رکھی ہے کہ ان کا پاسپورٹ گم ہو گیا ہے، لہٰذا آپ ان کی سفارش کر دیں، اب آپ بتایئے! وہاں عمرے ہو رہے ہیں، حج بھی ہو رہا ہے، طواف اور سعی بھی ہو رہی ہے، اور ساتھ میں یہ جھوٹ اور فریب بھی ہو رہا ہے، گویا کہ یہ دین کا حصہ ہی نہیں ہے، اس کا دین سے کوئی تعلق نہیں ہے، شاید لوگوں نے یہ سمجھ رکھا ہے کہ جب قصد اور ارادہ کر کے باقاعدہ جھوٹ کو جھوٹ سمجھ کر بولا جائے تب جھوٹ ہوتا ہے، لیکن ڈاکٹر سے جھوٹا سرٹیفکیٹ بنوا لینا، جھوٹی سفارش لکھوا لینا، یا جھوٹے مقدمات دائر کر دینا یہ کوئی جھوٹ نہیں، حالانکہ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے:

ما یلفظ من قول إلا لدیه رقیب عتید [ق:۱۸]

یعنی زبان سے جو لفظ نکل رہا ہے، وہ تمہارے نامہ اعمال میں ریکارڈ ہو رہا ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۳، ص ۱۴۲]

جھوٹا کیریکٹر (Character) سرٹیفکیٹ

آج کل اس کام عام رواج ہو گیا ہے، اچھے خاصے دین دار اور پڑھے لکھے لوگ بھی اس میں مبتلا ہیں، کہ جھوٹے سرٹیفکیٹ حاصل کرتے ہیں، یا دوسروں کے لیے جھوٹے سرٹیفکیٹ جاری کرتے ہیں، مثلاً اگر کسی کو کیریکٹر سرٹیفکیٹ کی ضرورت پیش آ گئی، اب وہ کسی کے پاس گیا، اور اس سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا، اور جاری کرنے والے نے اس کے اندر یہ لکھ دیا کہ میں ان کو پانچ سال سے جانتا ہوں، یہ بڑے اچھے آدمی ہیں، ان کا اخلاق و کردار بہت اچھا ہے، کسی کے حاشیہ خیال میں یہ بات نہیں آتی کہ ہم یہ ناجائز کام کر رہے ہیں، بلکہ وہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم نیک کام کر رہے ہیں، اس لیے کہ یہ ضرورت مند تھا، ہم نے اس کی ضرورت پوری کر دی، اس کا کام کر دیا، یہ تو باعث ثواب کام ہے، حالانکہ اگر آپ اس کے کیریکٹر سے واقف نہیں ہیں تو آپ کے لیے ایسا سرٹیفکیٹ جاری کرنا ناجائز ہے، چہ جائیکہ وہ سمجھے کہ میں ایک ثواب کا کام کر رہا

ہوں، اور کسی ایسے شخص سے کیریکٹر سرٹیفکیٹ حاصل کرنا جو آپ کو نہیں جانتا، یہ بھی ناجائز ہے، گویا کہ سرٹیفکیٹ لینے والا بھی گناہ گار ہوگا اور دینے والا بھی گناہ گار ہوگا۔

جھوٹی گواہی دینا جھوٹ بولنے سے بھی زیادہ شنیع اور خطرناک ہے، اس لیے کہ اس میں کئی گناہ مل جاتے ہیں، مثلاً ایک جھوٹ بولنے کا گناہ، اور دوسرا دوسرے شخص کو گمراہ کرنے کا گناہ، اس لیے کہ جب آپ نے غلط سرٹیفکیٹ جاری کر کے جھوٹی گواہی دی اور وہ جھوٹا سرٹیفکیٹ جب دوسرے شخص کے پاس پہنچا تو وہ یہ سمجھے گا کہ یہ آدمی بڑا اچھا ہے، اور اچھا سمجھ کر اس سے کوئی معاملہ کرے گا، اور اگر اس معاملہ کرنے کے نتیجے میں اس کو کوئی نقصان پہنچے گا تو اس نقصان کی ذمہ داری بھی آپ پر ہوگی، یا آپ نے عدالت میں جھوٹی گواہی دی اور اس گواہی کی بنیاد پر فیصلہ ہوگیا، تو اس فیصلے کے نتیجے میں جو کچھ کسی کا نقصان ہوا، وہ سب آپ کی گردن پر ہوگا، اس لیے یہ جھوٹی گواہی کا گناہ معمولی گناہ نہیں ہے، بڑا سخت گناہ ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۳، ص ۱۴۴]

اپنے نام کے ساتھ ”سید“ لکھنا

بہت سے لوگ اپنے ناموں کے ساتھ ایسے الفاظ اور القاب لکھتے ہیں جو واقعہ کے مطابق نہیں ہوتے، چونکہ رواج چل پڑا ہے، اس لیے بلاتحقیق لکھنا شروع کر دیتے ہیں، مثلاً کسی شخص نے اپنے نام کے ساتھ ”سید“ لکھنا شروع کر دیا، جب کہ حقیقت میں ”سید“ نہیں ہے، اس لیے کہ حقیقت میں ”سید“ وہ ہے جو باپ کی طرف سے نسب کے اعتبار سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں ہو، وہ ”سید“ ہے، بعض لوگ ماں کی طرف سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اولاد میں سے ہوتے ہیں اور اپنے آپ کو ”سید“ لکھنا شروع کر دیتے ہیں، یہ بھی غلط ہے، لہٰذا جب تک سید ہونے کی تحقیق نہ ہو، اس وقت تک سید لکھنا جائز نہیں، البتہ تحقیق کے لیے اتنی بات کافی ہے کہ اگر خاندان میں یہ بات مشہور چلی آتی ہے کہ یہ سادات کے خاندان میں ہیں تو پھر سید لکھنے میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر سید ہونا معلوم نہیں ہے اور نہ اس کی دلیل موجود ہے تو اس میں بھی جھوٹ بولنے کا گناہ ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۳، ص ۱۵۴]

اپریل فول منانے میں کیا برائی ہے؟

خواہ اپریل فول کی رسم وینس نامی دیوی کی طرف منسوب ہو، یا اسے (معاذ اللہ) قدرت کے مذاق کا ردعمل کہا جائے، یا حضرت مسیح علیہ السلام کے مذاق اڑانے کی یادگار، ہر صورت میں اس رسم کا رشتہ کسی نہ کسی توہم پرستی یا کسی گستاخانہ نظریے یا واقعے سے جڑا ہوا ہے، اور مسلمانوں کے نقطہ نظر سے یہ رسم مندرجہ ذیل بدترین گناہوں کا مجموعہ ہے:

① جھوٹ بولنا ② دھوکہ دینا

③ دوسرے کو اذیت پہنچانا

ایک ایسے واقعے کی یاد منانا جس کی اصل یا تو بت پرستی ہے یا توہم پرستی، یا پھر ایک پیغمبر کے ساتھ گستاخانہ مذاق۔

اب مسلمانوں کو خود فیصلہ کر لینا چاہیے کہ آیا یہ رسم اس لائق ہے کہ اسے مسلمان معاشروں میں اپنا کر اسے فروغ دیا جائے؟!۔ [ذکر و فکر، ص ۷۰]

ملکی قانون کی پابندی کرنا ضروری ہے کیا؟

ایک بات عرض کرتا ہوں، جس کی طرف عام لوگوں کو توجہ نہیں ہے اور اس کو دین کا معاملہ نہیں سمجھتے، میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب قدس اللہ سرہ فرمایا کرتے تھے کہ وعدہ صرف زبانی نہیں ہوتا، بلکہ وعدہ عملی بھی ہوتا ہے، مثلاً ایک شخص ایک ملک میں بطور باشندے کے رہتا ہے تو وہ شخص عملاً اس حکومت سے وعدہ کرتا ہے کہ میں آپ کے ملک کے قوانین کی پابندی کروں گا، لہٰذا اب اس شخص پر وعدے کی پابندی کرنا واجب ہے، جب تک اس ملک کا قانون اس کو کسی گناہ پر مجبور نہ کرے، اس لیے کہ اگر کوئی قانون اس کو گناہ کرنے پر مجبور کر رہا ہے تو پھر اس قانون پر عمل کرنا جائز نہیں ہے، اس لیے کہ اس کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کا صاف ارشاد ہے کہ: لا طاعة لمخلوق فی معصية الخالق

یعنی خالق کی نافرمانی میں کسی مخلوق کی اطاعت نہیں۔

لہٰذا ایسے قانون کی پابندی نہ صرف یہ کہ واجب نہیں، بلکہ جائز بھی نہیں، لیکن اگر کوئی قانون ایسا ہے جو آپ کو گناہ اور معصیت پر مجبور نہیں کر رہا ہے، اس قانون کی پابندی اس لیے واجب ہے کہ آپ نے عملاً اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ میں اس ملک کے قانون کی پابندی کروں گا۔ [اصلاحی خطبات، ج ۳، ص ۱۶۸]

اس کی مثال یہ ہے کہ جو کوئی شخص جس ملک کا باشندہ ہوتا ہے، اور اس کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ عملاً اس بات کا عہد کرتا ہے کہ میں اس ملک کے قانون کی پابندی کروں گا، اب اگر آپ کسی ملک کی شہریت حاصل کرنا چاہتے ہیں اور درخواست دیتے ہوئے یہ کہہ دیں کہ میں آپ کے ملک کی شہریت تو چاہتا ہوں، لیکن آپ کے قانون پر عمل نہیں کروں گا، تو کیا دنیا کا کوئی ملک ایسا ہے جو آپ کو شہریت دینے پر تیار ہو جائے؟ لہٰذا جب کوئی انسان کسی ملک کی شہریت اختیار کرتا ہے تو وہ یا تو زبان سے یا عملاً یہ معاہدہ کرتا ہے کہ میں اس ملک کے قوانین کی پابندی کروں گا، جیسے ہم اس ملک کے اندر پیدا ہوئے ہیں، تو شہریت حاصل کرنے کے لیے ہمیں زبانی درخواست دینے کی ضرورت تو پیش نہیں آئی، لیکن عملاً یہ معاہدہ کر لیا کہ ہم اس ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، لہٰذا شہری ہونے کے ناطے ہم اس ملک کے قانون کی پابندی کرنے کا عہد کر چکے ہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۵، ص ۲۷۲]

ویزہ ختم ہوجانے کے بعد اس ملک میں رکنا کیسا ہے؟

اسی طرح جب آپ ویزہ لے کر دوسرے ملک جاتے ہیں، چاہے وہ غیر مسلم ملک ہو، مثلا ہندوستان، امریکہ یا یورپ ویزہ لے کر چلے گئے، یہ ویزہ لینا عملا ایک وعدہ ہے کہ ہم حتی الامکان اس ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، جب تک وہ قانون کسی گناہ پر مجبور نہ کرے، ہاں! اگر وہ قانون گناہ پر مجبور کرے تو پھر اس قانون کی پابندی جائز نہیں، لہذا جو قوانین ایسے ہیں جو انسان کو کسی گناہ پر مجبور نہیں کرتے، یا ناقابل برداشت ظلم کا سبب نہیں بنتے، ان قوانین کی پابندی بھی وعدہ کی پابندی میں داخل ہے، اس میں مسلمان ملک ہونا بھی ضروری نہیں، بلکہ اگر آپ کسی غیر مسلم ملک کا ویزا لے کر وہاں جاتے ہیں تو ویزا لینے کا مطلب یہ ہے کہ آپ نے اس ملک سے درخواست کی ہے کہ میں آپ کے ملک میں آنا چاہتا ہوں اور آپ کے ملک کے قانون کی پابندی کروں گا جب تک وہ قانون مجھے کسی گناہ پر مجبور نہیں کرے گا، یہ ایک عہد ہے، اس کا نتیجہ یہ ہے کہ جس ملک میں انسان رہتا ہے اس ملک کے قانون کی پابندی بھی اس پر اس کے عہد کی پابندی کی وجہ سے لازم ہوگی۔ [اصلاحی خطبات، ج ۳، ص ۱۷۰]

ٹریفک کے قوانین کی خلاف ورزی کیوں گناہ ہے؟

مثلا ٹریفک کا قانون ہے کہ دائیں طرف چلو، یا بائیں طرف چلو، یا یہ قانون ہے کہ جب سگنل کی لال بتی جلے تو رک جاؤ، اور جب سبز بتی جلے تو چل پڑو، اب ایک شہری ہونے کی حیثیت سے آپ نے اس بات کا وعدہ کیا ہے کہ ان قوانین کی پابندی کروں گا، لہذا اگر کوئی شخص ان قوانین کی پابندی نہ کرے تو یہ وعدہ خلافی ہے اور گناہ ہے، لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ اگر ٹریفک کے قانون کی خلاف ورزی کرلی تو اس میں گناہ کی کیا بات ہے؟ یہ تو بڑی اچھی بات ہے کہ آدمی اپنے بڑا سیانہ اور ہوشیار جتانے کے لیے خلاف ورزی بھی کررہا ہے اور قانون کی گرفت میں بھی نہیں آرہا ہے۔

یاد رکھیے! یہ کئی اعتبار سے گناہ ہے، ایک تو اس حیثیت سے گناہ ہے کہ یہ وعدہ کی خلاف ورزی ہے، دوسرے اس حیثیت سے بھی گناہ ہے کہ یہ قوانین تو اس لیے بنائے گئے ہیں تاکہ نظم وضبط پیدا ہو، اور اس کے ذریعہ سے ایک دوسرے کو نقصان اور تکلیف پہنچانے کے راستے بند ہوں، لہذا اگر آپ نے قانون کی خلاف ورزی کی، اور اس سے کسی کو نقصان پہنچ گیا تو اس نقصان کی دنیا وآخرت کی ذمہ داری آپ پر ہوگی۔

[اصلاحی خطبات، ج ۳، ص ۱۷۰]

غیر مسلم حکومت سے جھوٹ بول کر بے روزگاری الاؤنس لینا

برطانیہ کی حکومت ایک بے روزگاری الاؤنس جاری کرتی ہے، یعنی جو لوگ بے روزگار ہوتے ہیں ان کو ایک الاؤنس دیا جاتا ہے، گویا کہ روزگار ملنے تک حکومت ان کی کفالت کرتی ہے، یہ ایک اچھا طریقہ ہے

،لیکن ہمارے بعض بھائی جو یہاں سے وہاں گئے ہیں، انہوں نے اس بے روزگاری کو اپنا پیشہ بنا رکھا ہے، اب ایسے لوگ رات کو چوری چھپے نوکری کر لیتے ہیں اور ساتھ میں بے روزگاری الاؤنس بھی وصول کرتے ہیں، اچھے خاصے نمازی اور دین دار لوگ یہ دھندا کر رہے ہیں، ایک مرتبہ ایک صاحب نے مجھ سے اس کے بارے میں مسئلہ پوچھا تو میں نے بتایا کہ یہ عمل تو بالکل ناجائز اور گناہ ہے، اول تو یہ جھوٹ ہے کہ بے روزگار نہیں ہو لیکن اپنے کو بے روزگار ظاہر کر رہے ہو، دوسرے یہ کہ تم حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کر رہے ہو، کیونکہ جب تم اس ملک میں داخل ہو گئے تو اب اس ملک کے جائز قانون کی پابندی لازم ہے، ان صاحب نے جواب میں کہا کہ یہ تو غیر مسلم حکومت ہے، اور غیر مسلم حکومت کا پیسہ جس طرح بھی حاصل ہو، اس کو لے کر خرچ کرنا جائز ہے، العیاذ باللہ، ارے بھائی! جب تم اس ملک میں داخل ہوئے تھے اس وقت تم نے یہ وعدہ کیا تھا کہ ہم اس ملک کے قوانین کی پابندی کریں گے، لہٰذا اب اس ملک کے قانون کی خلاف ورزی کرنا جائز نہیں اور جس طرح مسلمان کے ساتھ خلاف ورزی جائز نہیں، کافروں کے ساتھ بھی وعدہ خلافی جائز نہیں، اور اس خلاف ورزی کے نتیجے میں جو پیسہ حاصل ہوگا وہ بھی ناجائز اور حرام ہوگا۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۱، ص ۲۹۸]

ظالم حکومت کے قوانین کی پابندی بھی لازم ہے

بعض لوگ آج کل یہ دلیل بھی پیش کرتے ہیں کہ آج کل ہمارے ملک میں جو حکومتیں ہیں وہ خود ظالم حکومتیں ہیں، رشوت خور ہیں، بدعنوان ہیں، مفاد پرست ہیں، اپنے مفاد کی خاطر پیسے لوٹ رہے ہیں، لہٰذا ایسی حکومت کے قوانین کی پابندی ہم کیوں کریں؟ [اصلاحی خطبات، ج ۱۵، ص ۲۷۷]

خوب سمجھ لیجیے! کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے تو ابوجہل سے کیے ہوئے معاہدے کا بھی احترام کیا، حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہ مشہور صحابی ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے راز دار ہیں، جب یہ اور ان کے والد یمان رضی اللہ عنہ مسلمان ہوئے تو مسلمان ہونے کے بعد حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ آرہے تھے، راستے میں ان کی ملاقات ابوجہل اور اس کے لشکر سے ہوگئی، اس وقت ابوجہل اپنے لشکر کے ساتھ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لڑنے کے لیے جا رہا تھا، جب حضرت حذیفہؓ کی ملاقات ابوجہل سے ہوئی تو اس نے پکڑ لیا اور پوچھا کہ کہاں جا رہے ہو؟ انہوں نے بتایا کہ ہم حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں مدینہ طیبہ جا رہے ہیں، ابوجہل نے کہا کہ پھر تو ہم تمہیں نہیں چھوڑیں گے، اس لیے کہ تم مدینہ جا کر ہمارے خلاف جنگ میں حصہ لوگے، انہوں نے کہا کہ ہمارا مقصد تو صرف حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ملاقات اور زیارت ہے، ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے، ابوجہل نے کہا کہ اچھا ہم سے وعدہ کرو کہ وہاں جا کر صرف ملاقات کرو گے لیکن جنگ میں حصہ نہیں لوگے، انہوں نے وعدہ کر لیا، چنانچہ ابوجہل نے آپ کو چھوڑ دیا، آپ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچے، اس وقت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اپنے صحابہ کرام کے ساتھ غزوہ بدر

کے لیے مدینہ منورہ سے روانہ ہو چکے تھے، اور راستے میں ملاقات ہوگئی۔

اب اندازہ لگایئے کہ اسلام کا پہلا حق و باطل کا معرکہ (غزوہ بدر) ہو رہا ہے، اور یہ وہ معرکہ ہے جس کو قرآن کریم نے ''یوم الفرقان'' فرمایا، یعنی حق و باطل کے درمیان فیصلہ کر دینے والا معرکہ، وہ معرکہ ہو رہا ہے جس میں جو شخص شامل ہو گیا وہ ''بدری'' کہلایا، اور صحابہ کرام میں ''بدری'' صحابہ کا بہت اونچا مقام ہے، اور اسمائے بدریین بطور وظیفے کے پڑھے جاتے ہیں، ان کے نام پڑھنے سے اللہ تعالیٰ دعائیں قبول فرماتے ہیں، وہ ''بدریین'' جن کے بارے میں نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ پیشین گوئی فرما دی کہ اللہ تعالیٰ نے سارے اہل بدر جنہوں نے بدر کی لڑائی میں حصہ لیا، بخشش فرما دی، ایسا معرکہ ہونے والا ہے، بہر حال! جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوئی تو حضرت حذیفہؓ نے سارا قصہ سنا دیا کہ اس طرح راستے میں ہمیں ابوجہل نے پکڑ لیا تھا، اور ہم نے وعدہ کر کے بمشکل جان چھڑائی کہ ہم لڑائی میں حصہ نہیں لیں گے، اور پھر درخواست کی کہ یا رسول اللہ! یہ بدر کا معرکہ ہونے والا ہے، آپ اس میں تشریف لے جا رہے ہیں، ہماری بڑی خواہش ہے کہ ہم بھی اس میں شریک ہو جائیں، اور جہاں تک اس وعدے کا تعلق ہے، وہ تو انہوں نے ہماری گردن پر تلوار رکھ کر ہم سے وعدہ لیا تھا کہ ہم جنگ میں حصہ نہیں لیں گے، اور اگر ہم وعدہ نہ کرتے تو وہ ہمیں نہ چھوڑتے، اس لیے ہم نے وعدہ کر لیا، لیکن آپ ہمیں اجازت دے دیں کہ ہم اس جنگ میں حصہ لے لیں اور فضیلت وسعادت ہمیں حاصل ہو جائے، لیکن سرکار دو عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے جواب میں فرمایا کہ نہیں! تم وعدہ کر کے آئے ہو اور زبان دے کر آئے ہو اور اسی شرط پر تمہیں رہا کیا گیا ہے کہ تم وہاں جا کر محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کرو گے، لیکن ان کے ساتھ جنگ میں حصہ نہیں لو گے، اس لیے میں تم کو جنگ میں حصہ لینے کی اجازت نہیں دیتا، یہ وہ مواقع ہیں جہاں انسان کا امتحان ہوتا ہے کہ وہ اپنی زبان اور اپنے وعدے کا کتنا پاس کرتا ہے، اگر ہم جیسا آدمی ہوتا تو ہزار تاویلیں کر لیتا، مثلاً یہ تاویل کر لیتا کہ ان کے ساتھ جو وعدہ کیا تھا وہ سچے دل سے تو نہیں کیا تھا، وہ تو ہم سے زبردستی لیا گیا تھا، اور خدا جانے کیا کیا تاویلیں ہمارے ذہنوں میں آ جاتیں، یا یہ تاویل کر لیتا کہ یہ حالت عذر ہے، اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ جہاد میں شامل ہونا ہے اور کفر کا مقابلہ کرنا ہے، جبکہ وہاں ایک ایک آدمی کی بڑی قیمت ہے، اس لیے کہ مسلمانوں کے لشکر میں صرف ۳۱۳ نہتے افراد ہیں، جن کے پاس صرف ۷۰ اونٹ، ۲ گھوڑے اور ۸ تلواریں ہیں، باقی افراد میں سے کسی نے لاٹھی اٹھالی ہے، کسی نے ڈنڈے اور کسی نے پتھر اٹھا لیے ہیں، یہ لشکر ایک ہزار مسلح سورماؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے جا رہا ہے، اس لیے ایک ایک آدمی کی جان قیمتی ہے لیکن محمد صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو بات کہہ دی گئی ہے اور جو وعدہ کر لیا گیا ہے اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی۔

یہ جہاد کوئی ملک حاصل کرنے کے لیے نہیں ہو رہا ہے، کوئی اقتدار حاصل کرنے کے لیے نہیں ہو رہا ہے، بلکہ یہ جہاد حق کی سربلندی کے لیے ہو رہا ہے اور حق کو پامال کر کے جہاد کیا جائے؟ گناہ کا

ارتکاب کر کے اللہ تعالی کے دین کا کام کیا جائے؟ یہ نہیں ہوسکتا، آج ہم لوگوں کی یہ ساری کوششیں بے کار جارہی ہیں، اور ساری کوششیں بے اثر ہورہی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم یہ چاہتے ہیں کہ گناہ کر کے اسلام کی تبلیغ کریں، گناہ کر کے اسلام کو نافذ کریں، ہمارے دل ودماغ پر ہر وقت ہزاروں تاویلیں مسلط رہتی ہیں، چنانچہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت کا یہ تقاضا ہے چلو شریعت کے اس حکم کو نظر انداز کردو، اور یہ کہا جاتا ہے کہ اس وقت مصلحت اس کام کے کرنے میں ہے، چلو یہ کام کرلو۔[اصلاحی خطبات، ج۱۵،ص۲۶۰]

کیا ابوجہل سے زیادہ گمراہ کوئی ہوگا؟ ابوجہل سے بڑا کافر کوئی ہوگا؟ لیکن وہ وعدہ جو حضرت حذیفہ بن یمانؓ اور ان کے والد نے ابوجہل سے کیا تھا اور ابوجہل نے زبردستی ان سے وعدہ لیا تھا، رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ تم چونکہ ابوجہل سے وعدہ کر چکے ہو، لہذا اس وعدہ کی خلاف ورزی نہیں ہوگی، معلوم ہوا کہ جس شخص سے آپ عہد کر رہے ہیں وہ چاہے کافر ہی کیوں نہ ہو، چاہے وہ فاسق ہو، بدعنوان ہو، رشوت خور ہو لیکن جب آپ نے اس سے عہد کیا ہے تو اب اس عہد کی پابندی آپ کے ذمے لازم ہوگی، ان کے ظلم اور ان کے فسق وفجور کا گناہ ان کے سر ہے، ان کی بدعنوانیوں کا بدلہ اللہ تعالی ان کو آخرت میں دیں گے، وہ جانیں ان کا اللہ جانے، ہمارا کام یہ ہے کہ ہم نے جو معاہدہ کیا ہے، ہم اس کی پابندی کریں۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۵،ص۲۷۸]

چوری یہ بھی ہے !!

خیانت کی وہ صورتیں جنہیں عموما چوری نہیں سمجھا جاتا

آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے ان ارشادات کو مدنظر رکھتے ہوئے ہم اپنے حالات کا جائزہ لیں تو نظر آئے گا کہ نہ جانے کتنے شعبوں میں ہم شعوری یا غیر شعوری طور پر ان احکام کی خلاف ورزی کر رہے ہیں، ہم چوری اور غصب یہی سمجھتے ہیں کہ بس کوئی شخص کسی کے گھر میں چھپ کر داخل ہو اور اس کا سامان چرائے، یا طاقت کا باقاعدہ استعمال کر کے اس کا مال چھینے، حالانکہ کسی کی مرضی کے خلاف اس کی ملکیت کا استعمال، کسی بھی صورت میں ہو، وہ چوری یا غصب کے گناہ میں داخل ہے، اس قسم کی چوری یا غصب کی جو مختلف صورتیں ہمارے معاشرے میں عام ہوگئی ہیں، اور اچھے خاصے پڑھے لکھے اور بظاہر مہذب افراد بھی ان میں مبتلا ہیں، ان کا شمار مشکل ہے، تاہم مثال کے طور پر اس کی چند صورتیں درج ذیل ہیں:

① ایک صورت تو وہی ہے جس کی طرف حضرت مولانا تھانویؒ کے مذکورہ واقعے میں اشارہ کیا گیا ہے، آج یہ بات بڑے فخر سے بیان کی جاتی ہے کہ ہم اپنا سامان ریل یا جہاز میں کرایہ دیئے بغیر نکال لائے، حالانکہ اگر یہ کام متعلقہ افسروں کی آنکھ بچا کر کیا گیا تو اس میں اور چوری میں کوئی فرق نہیں، اور اگر ان کی رضامندی سے کیا گیا، جبکہ وہ اجازت دینے کے مجاز نہ تھے، تو ان کا بھی اس گناہ میں شریک ہونا لازم آیا، ہاں اگر کسی افسر کو ریلوے یا ایئرلائنز کی طرف سے یہ اختیار حاصل ہو کہ وہ زیادہ سامان بغیر کرائے کے

چھوڑ دے، تو یہ بات دوسری ہے۔

④ ٹیلی فون ایکسچینج کے کسی ملازم سے دوستی گانٹھ کر دوسرے شہروں میں مفت بات چیت نہ صرف یہ کہ کوئی عیب نہیں سمجھی جاتی، بلکہ اسے اپنے وسیع تعلقات کا ثبوت قرار دے کر فخریہ بیان کیا جاتا ہے، حالانکہ یہ بھی ایک گھٹیا درجے کی چوری ہے، اور اس کے گناہ عظیم ہونے میں کوئی شک نہیں۔

③ بجلی کے سرکاری کھمبے سے کنکشن لے کر مفت بجلی کا استعمال چوری کی ایک اور قسم ہے، جس کا رواج بھی عام ہوتا جا رہا ہے، اور یہ گناہ بھی ڈنکے کی چوٹ کیا جاتا ہے۔

④ اگر ہم کسی شخص سے اس کی کوئی چیز مانگتے ہیں، جبکہ ہمیں غالب گمان یہ ہے کہ وہ زبان سے تو انکار نہیں کر سکے گا، لیکن دینے پر دل سے راضی بھی نہ ہوگا، اور دے گا تو محض شرماشرمی اور بادل نخواستہ دے گا، تو یہ بھی غصب میں داخل ہے، اور ایسی چیز کا استعمال حلال نہیں، کیونکہ دینے والے نے خوش دلی کے بجائے وہ چیز دباؤ میں آ کر دی ہے۔

⑤ اگر کسی شخص سے کوئی چیز عارضی استعمال کے لئے مستعار لی گئی اور وعدہ کر لیا گیا کہ فلاں وقت لوٹا دی جائے گی، لیکن وقت پر لوٹانے کے بجائے اسے کسی عذر کے بغیر اپنے استعمال میں باقی رکھا تو اس میں وعدہ خلافی کا بھی گناہ ہے، اور اگر وہ مقررہ وقت کے بعد اس کے استعمال پر دل سے راضی نہ ہو تو غصب کا گناہ بھی ہے۔ یہی حال قرض کا ہے کہ واپسی کی مقررہ تاریخ کے بعد قرض واپس نہ کرنا (جب کہ کوئی شدید عذر نہ ہو) وعدہ خلافی اور غصب دونوں گناہوں کا مجموعہ ہے۔

⑥ اگر کسی شخص سے کوئی مکان، زمین یا دوکان ایک خاص وقت تک کے لئے کرائے پر لی گئی تو وقت گزرنے کے بعد مالک کی اجازت کے بغیر اسے اپنے استعمال میں رکھنا بھی اسی وعدہ خلافی اور غصب میں داخل ہے۔

⑦ اگر مستعار لی ہوئی چیز کو ایسی بے دردی سے استعمال کیا جائے جس پر مالک راضی نہ ہو تو یہ بھی غصب کی مذکورہ تعریف میں داخل ہے، مثلاً کسی بھلے مانس نے اپنی گاڑی دوسرے کو استعمال کرنے کی اجازت دیدی ہے، تو اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ وہ اس کے ساتھ "مال مفت دلِ بے رحم" کا معاملہ کرے، اور اسے خراب راستوں پر اس طرح دوڑائے پھرے کہ اس کے کل پرزے پناہ مانگنے لگیں، اگر کسی نے اپنا فون استعمال کرنے کی اجازت دی ہے تو اس کا ناجائز فائدہ اٹھا کر اس پر طویل فاصلے کی کالیں دیر تک کرتے رہنا یقیناً غصب میں داخل اور حرام ہے۔

⑧ بک اسٹالوں میں کتابیں، رسالے اور اخبارات اس لئے رکھے جاتے ہیں کہ ان میں سے جو پسند ہوں، لوگ انہیں خرید سکیں، پسند کے تعین کے لئے ان کی معمولی ورق گردانی کی بھی عام طور سے اجازت ہوتی ہے، لیکن اگر بک اسٹال پر کھڑے ہو کر کتابوں، اخبارات یا رسالوں کا باقاعدہ مطالعہ شروع کر دیا جائے، جبکہ خریدنے کی نیت نہ ہو، تو یہ بھی ان کا غاصبانہ استعمال ہے، جس کی شرعاً اجازت نہیں ہے۔

یہ چند سرسری مثالیں ہیں جو بے ساختہ قلم پر آ گئیں، مقصد یہ ہے کہ ہم سب مل کر سوچیں کہ ہم کہاں کہاں چوری اور غصب کے گھٹیا جرم کے مرتکب ہو رہے ہیں؟

[ذکر و فکر، ص ۱۲۳]

خیانت کرنے والے کے ساتھ بھی خیانت مت کرو

حدیث شریف میں جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: "ولا تخن من خانك" دو لفظوں کا جملہ ہے، لیکن رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کیسا عظیم اور سنہرا اصول ان دو لفظوں میں بیان فرما دیا، فرمایا کہ جو تم سے خیانت کرے، تم اس کے ساتھ خیانت کا معاملہ مت کرو، وہ اگر خیانت کر رہا ہے، وہ اگر دھوکہ باز ہے، وہ اگر بدعنوان ہے، اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم بھی بدعنوانی شروع کر دو، تم بھی اس کے ساتھ خیانت کرو، تم بھی اس کے ساتھ عہد شکنی کرو، تم بھی گناہ کا ارتکاب کرو، بلکہ ان کا عمل ان کے ساتھ ہے، تمہارا عمل تمہارے ساتھ ہے، لہذا حکومت چاہے کتنی ہی بری کیوں نہ ہو، لیکن اگر آپ نے اس کے ساتھ کوئی معاہدہ کر لیا ہے تو اس معاہدے کی پابندی تمہارے اوپر لازم ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۵، ص ۲۷۸]

بہرحال! میں یہ عرض کر رہا تھا کہ رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے کافروں کے ساتھ بھی عہد کی کس قدر پابندی فرمائی، لہذا مسئلہ یہ نہیں ہے کہ جس کے ساتھ ہم نے عہد کیا ہے وہ کافر ہے یا فاسق ہے، یا بدعنوان ہے یا رشوت خور ہے، جب عہد کر لیا تو اب اس کی پابندی ضروری ہے، ہاں! یہ ضروری ہے کہ ایسے رشوت خور کرپٹ حکام کو ہٹا کر ان کی جگہ دوسرے عادل حکمران لانے کی کوشش اپنی جگہ لازم اور ضروری ہے، لیکن جہاں تک عہد کا تعلق ہے، اگر ان حکام کے ساتھ کوئی عہد کیا ہے تو اس عہد کی پابندی ضروری ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۵، ص ۲۸۱]

اگر تھوک فروش ملاوٹ کرے تو ہمارا اس میں کیا قصور ہے؟

بعض لوگ یہ اشکال پیش کرتے ہیں کہ ہم خوردہ فروش ہیں، ہمارے پاس تھوک فروشوں کی طرف سے جیسا مال آتا ہے، وہ ہم آگے فروخت کر دیتے ہیں، لہذا اس صورت میں ہم ملاوٹ نہیں کرتے، ملاوٹ تو تھوک فروش کرتے ہیں، لیکن ہمیں لامحالہ وہ چیز ویسی ہی آگے فروخت کرنی پڑتی ہے۔

اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ اگر ایک شخص خود مال نہیں بناتا، اور نہ ملاوٹ کرتا ہے، بلکہ دوسرے سے مال لے کر آگے فروخت کرتا ہے تو اس صورت میں خریدار کے سامنے یہ بات واضح کر دے کہ میں اس بات کا ذمہ دار نہیں کہ اس میں کتنی اصلیت ہے اور کتنی ملاوٹ ہے، البتہ میری معلومات کے مطابق اتنی اصلیت ہے اور اتنی ملاوٹ ہے۔

لیکن ہمارے بازاروں میں بعض چیزیں ایسی ہیں جو اصلی اور خالص ملتی ہی نہیں ہیں، بلکہ

جہاں سے بھی لو گے وہ ملاوٹ شدہ ہی ملے گی، اور سب لوگوں کو یہ بات معلوم بھی ہے کہ یہ چیز اصلی نہیں ہے، بلکہ اس میں ملاوٹ ہے، ایسی صورت میں وہ تاجر جو اس چیز کو دوسرے سے خرید کر لایا ہے، اس کے ذمے یہ ضروری نہیں ہے کہ وہ ہر ہر شخص کو اس چیز کے بارے میں بتائے، اس لیے کہ ہر شخص کو اس کے بارے میں معلوم ہے کہ یہ خالص نہیں ہے، لیکن اگر یہ خیال ہو کہ خریدنے والا اس چیز کی حقیقت سے بے خبر ہے تو اس صورت میں اس کو بتانا چاہیے کہ یہ چیز خالص نہیں ہے بلکہ اس میں ملاوٹ ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج۶،ص۱۲۶]

معیشت و تجارت

"سود" کس کو کہتے ہیں؟

سمجھنے کی بات یہ ہے کہ سود کس کو کہتے ہیں؟ سود کیا چیز ہے؟ اس کی تعریف کیا ہے؟ جس وقت قرآن کریم نے سود کو حرام قرار دیا اس وقت اہل عرب میں سود کا لین دین متعارف اور مشہور تھا، اور اس وقت سود اسے کہا جاتا تھا کہ کسی شخص کو دیے ہوئے قرض پر طے کر کے کسی بھی قسم کی زیادہ رقم کا مطالبہ کیا جائے اسے سود کہا جاتا تھا، مثلاً میں نے آج ایک شخص کو سو روپے بطور قرض دیے، اور میں اس سے کہوں کہ میں ایک مہینے کے بعد یہ رقم واپس لوں گا اور تم مجھے ایک سو دو روپے واپس کرنا، اور یہ پہلے سے میں نے طے کر دیا کہ ایک ماہ بعد ایک سو دو روپے واپس لوں گا، تو یہ سود ہے۔

پہلے سے طے کرنے کی شرط اس لیے لگائی کہ اگر پہلے سے کچھ طے نہیں کیا ہے، مثلاً میں نے کسی کو سو روپے قرض دے دیے، اور میں نے اس سے یہ مطالبہ نہیں کیا کہ تم مجھے ایک سو دو روپے واپس کرو گے، لیکن واپسی کے وقت اس نے اپنی خوشی سے مجھے ایک سو دو روپے دے دیے، اور ہمارے درمیان یہ ایک سو دو روپے واپس کرنے کی بات طے شدہ نہیں تھی، تو یہ سود نہیں ہے اور حرام نہیں ہے بلکہ جائز ہے۔

قرآن کریم نے کس سود کو حرام قرار دیا ہے؟

بعض اوقات ہمارے معاشرے میں یہ کہا جاتا ہے کہ جس سود کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا تھا، وہ درحقیقت یہ تھا کہ اس زمانے میں قرض لینے والا غریب ہوتا تھا اور اس کے پاس روٹی اور کھانے کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے، اگر وہ بیمار ہے تو اس کے پاس علاج کے لیے پیسے نہیں ہوتے تھے، اگر گھر میں کوئی میت ہوگئی ہے تو اس کے پاس اس کو کفنانے اور دفنانے کے پیسے نہیں ہوتے تھے، ایسے موقع پر وہ غریب بے چارہ کسی سے پیسے مانگتا تو وہ قرض دینے والا اس سے کہتا کہ میں اس وقت تک قرض نہیں دوں گا جب تک تم مجھے اتنا فیصد زیادہ واپس نہیں دو گے، تو چونکہ یہ ایک انسانیت کے خلاف بات تھی کہ ایک شخص کو ایک ذاتی ضرورت ہے اور وہ بھوکا اور ننگا ہے، ایسی حالت میں اس کو سود کے بغیر پیسے فراہم نہ کرنا ظلم اور زیادتی تھی، اس لیے اللہ

تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا اور سود لینے والے کے خلاف اعلان جنگ کیا۔

لیکن ہمارے دور میں اور خاص طور بینکوں میں جو سود کے ساتھ روپے کا لین دین ہوتا ہے، اس میں قرض لینے والا کوئی غریب اور فقیر نہیں ہوتا، بلکہ اکثر اوقات وہ بڑا دولت مند اور سرمایہ دار ہوتا ہے اور وہ قرض اس لیے نہیں لیتا کہ اس کے پاس کھانے کو نہیں ہے، یا اس کے پاس پہننے کے لیے کپڑے نہیں ہے، یا وہ کسی بیماری کے علاج کے لیے قرض لے رہا ہے، بلکہ وہ اس لیے قرض لے رہا ہے تا کہ ان پیسوں کو اپنی تجارت اور کاروبار میں لگائے اور اس سے نفع کمائے، اب اگر قرض دینے والا شخص یہ کہے کہ تم میرے پیسے اپنے کاروبار میں لگاؤ گے، اور نفع کماؤ گے تو اس نفع کا دس فیصد بطور نفع کے مجھے دو، تو اس میں کیا قباحت اور برائی ہے؟ اور یہ وہ سود نہیں ہے جس کو قرآن کریم نے حرام قرار دیا ہے، یہ اعتراض دنیا کے مختلف خطوں میں اٹھایا جاتا ہے۔

ایک اعتراض یہ اٹھایا ہے کہ یہ کاروباری سود (Commercial Interest) اور یہ تجارتی قرض (Commercial Loan) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں نہیں تھے، بلکہ اس زمانے میں ذاتی اخراجات اور ذاتی استعمال کے لیے قرضے لیے جاتے تھے، لہذا قرآن کریم اس کو کیسے حرام قرار دے سکتا ہے جس کا اس زمانے میں وجود ہی نہیں تھا، اس لیے بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ قرآن کریم نے جس سود کو حرام قرار دیا ہے وہ غریبوں اور فقیروں والا سود تھا، اور یہ کاروباری سود حرام نہیں ہے۔

صورت بدلنے سے حقیقت نہیں بدلتی

پہلی بات تو یہ ہے کہ کسی چیز کے حرام ہونے کے لیے یہ بات ضروری نہیں ہے کہ وہ اس خاص صورت میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں بھی پائی جائے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں اس انداز سے اس کا وجود بھی ہو، قرآن کریم جب کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی ایک حقیقت اس کے سامنے ہوتی ہے اور اس حقیقت کو وہ حرام قرار دیتا ہے، چاہے اس کی کوئی خاص صورت حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں موجود ہو یا نہ ہو، اس کی مثال یوں سمجھیے کہ قرآن کریم نے شراب کو حرام قرار دیا ہے، اور شراب کی حقیقت یہ ہے کہ ایسا مشروب جس میں نشہ ہو، اب آج اگر کوئی شخص یہ کہنے لگے کہ صاحب! آج کل کی یہ وہسکی (Whisky) بیئر (Beer) اور برانڈی (Brandy) حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں تو پائی نہیں جاتی تھی لہذا یہ حرام نہیں ہے، تو یہ بات صحیح نہیں ہے اس لیے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو حرام قرار دے دیا تھا، لہذا اب وہ ہمیشہ کے لیے حرام ہو گئی، اب چاہے شراب کی نئی شکل آجائے اور اس کا نام چاہے وہسکی رکھ دیا جائے یا برانڈی رکھ لو یا بیئر رکھ لو یا کوک (Coke) رکھ لو، نشہ آور مشروب ہر شکل اور ہر نام کے ساتھ حرام ہے۔

اس لیے یہ کہنا کہ کمرشل لون چونکہ اس زمانے میں نہیں تھے بلکہ آج پیدا ہوئے ہیں، اس لیے حرام

نہیں ہیں، یہ خیال درست نہیں۔

کیا شریعت کے احکامات پیغمبر ﷺ کے زمانے کے ساتھ خاص تھے؟

آج کل یہ مزاج بن گیا ہے کہ ہر چیز کے بارے میں لوگ یہ کہتے ہیں کہ صاحب! حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں یہ عمل اس طرح ہوتا تھا، اس لیے آپ ﷺ نے اس کو حرام قرار دے دیا، آج چونکہ یہ عمل اس طرح نہیں ہو رہا ہے لہذا وہ حرام نہیں ہے، کہنے والے یہاں تک کہہ رہے ہیں کہ خنزیروں کو اس لیے حرام قرار دیا گیا تھا کہ وہ گندے ماحول میں پڑے رہتے تھے، غلاضت کھاتے تھے، گندے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی تھی، اب تو بہت صاف ستھرے ماحول میں ان کی پرورش ہوتی ہے اور ان کے لیے اعلی درجے کے فارم قائم کر دیے گئے ہیں، لہذا اب ان کے حرام ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

یاد رکھیے! قرآن کریم جب کسی چیز کو حرام قرار دیتا ہے تو اس کی ایک حقیقت ہوتی ہے، اس کی صورتیں چاہے کتنی بدل جائیں اور اس کو بنانے اور تیار کرنے کے طریقے چاہے کتنے بدلتے رہیں، لیکن اس کی حقیقت اپنی جگہ برقرار رہتی ہے، اور وہ حقیقت حرام ہوتی ہے، یہ شریعت کا اصول ہے۔

کیا زمانہ نبوت میں تجارتی قرض (Commercial Loan) کا رواج نہیں تھا؟

پھر یہ کہنا بھی درست نہیں ہے کہ آنحضرت ﷺ کے عہد مبارک میں تجارتی قرضوں (Commercial Loan) کا رواج نہیں تھا، اور سارے قرضے صرف ذاتی ضرورت کے لیے لیے جاتے تھے، اس موضوع پر میرے والد ماجد حضرت مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ نے ''مسئلہ سود'' کے نام سے ایک کتاب لکھی ہے، اس کا دوسرا حصہ میں نے لکھا ہے، اس حصہ میں میں نے کچھ مثالیں پیش کی ہیں کہ سرکار دو عالم ﷺ کے زمانے میں بھی تجارتی قرضوں کا لین دین ہوتا تھا۔

جب یہ کہا جاتا ہے کہ عرب صحرا نشین تھے، تو اس کے ساتھ ہی لوگوں کے ذہن میں یہ تصور آتا ہے کہ وہ معاشرہ جس میں حضور اقدس ﷺ تشریف لائے تھے، وہ ایسا سادہ اور معمولی معاشرہ ہوگا جس میں تجارت وغیرہ تو ہوتی نہیں ہوگی اور اگر تجارت ہوتی بھی ہوگی تو صرف گندم اور جو وغیرہ کی ہوتی ہوگی، اور وہ بھی دس بیس روپے سے زیادہ کی نہیں ہوگی، اس کے علاوہ کوئی بڑی تجارت نہیں ہوتی ہوگی، عام طور پر ذہن میں یہ تصور بیٹھا ہوا۔

لیکن یاد رکھیے! یہ بات درست نہیں، عرب کا وہ معاشرہ جس میں حضور اقدس ﷺ تشریف لائے، اس میں بھی آج کی جدید تجارت کی تقریبا ساری بنیادیں موجود تھیں، مثلاً آج کل ''جوائنٹ اسٹاک

کمپنیاں'' ہیں، اس کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ یہ چودھویں صدی کی پیداوار ہیں، اس سے پہلے جوائنٹ اسٹاک کمپنی کا تصور نہیں تھا، لیکن جب ہم عرب کی تاریخ پڑھتے ہیں تو یہ نظر آتا ہے کہ عرب کا ہر قبیلہ ایک مستقل جوائنٹ اسٹاک کمپنی ہوتا تھا، اس لیے کہ ہر قبیلے میں تجارت کا طریقہ یہ تھا کہ قبیلہ کے تمام آدمی ایک روپیہ، دو روپیہ لا کر ایک جگہ جمع کرتے اور وہ رقم ''شام'' بھیج کر وہاں سے سامان تجارت منگواتے، آپ نے تجارتی قافلوں (Commercial Carvan) کا نام سنا ہوگا، وہ ''کاروان'' یہی ہوتے کہ سارے قبیلے نے ایک روپیہ جمع کر کے دوسری جگہ بھیجا اور وہاں سے سامان تجارت منگوا کر یہاں فروخت کر دیا، چنانچہ قرآن کریم میں یہ جو فرمایا کہ: ﴿لإيلاف قريش إيلافهم رحلة الشتاء والصيف﴾

وہ بھی اسی بنا پر کہ یہ عرب کے لوگ سردیوں میں یمن کی طرف سفر کرتے تھے اور گرمیوں میں شام کی طرف سفر کرتے تھے اور گرمیوں اور سردیوں کے یہ سفر محض تجارت کے لیے ہوتے تھے، یہاں سے سامان لے کر جا کر وہاں بیچ دیا، وہاں سے سامان لا کر یہاں بیچ دیا، اور بعض اوقات ایک ایک آدمی اپنے قبیلے سے دس لاکھ دینار قرض لیتا تھا، اب سوال یہ ہے کہ کیا وہ اس لیے قرض لیتا تھا کہ اس کے گھر میں کھانے کو نہیں تھا؟ یا اس کے پاس میت کو کفن دینے کے لیے کپڑا نہیں تھا؟ ظاہر ہے کہ جب وہ اتنا بڑا قرض لیتا تھا تو وہ کسی کمرشل مقصد کے لیے لیتا تھا۔

سب سے پہلے چھوڑا جانے والا سود

جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر سود کی حرمت کا اعلان فرمایا تو آپ نے ارشاد فرمایا کہ:

وربا الجاهلية موضوع، وأول ربا أضع ربانا عباس بن عبد المطلب ،فإنه موضوع كله [صحیح مسلم، کتاب الحج، باب حجۃ النبی صلی اللہ علیہ وسلم]

یعنی (آج کے دن) جاہلیت کا سود چھوڑ دیا گیا اور سب سے پہلا سود جو میں چھوڑتا ہوں وہ ہمارے چچا حضرت عباس کا سود ہے، وہ سب کا سب ختم کر دیا گیا، چونکہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ لوگوں کو سود پر قرض دیا کرتے تھے، اس لیے آپ نے فرمایا کہ آج کے دن میں ان کا سود جو دوسرے لوگوں کے ذمے ہیں وہ ختم کرتا ہوں اور روایات میں آتا ہے کہ وہ دس ہزار مثقال سونا تھا، اور تقریباً چار ماشے کا ایک مثقال ہوتا ہے، اور یہ دس ہزار مثقال کوئی سرمایہ (Principal) نہیں تھا، بلکہ یہ سود تھا جو لوگوں کے اصل رقوم پر واجب ہوا تھا۔

اس سے اندازہ لگائیے کہ وہ قرض جس پر دس ہزار مثقال کا سود لگ گیا ہو، کیا وہ قرض صرف کھانے کی ضرورت کے لیے لیا گیا تھا؟ ظاہر ہے کہ وہ قرض تجارت کے لیے لیا گیا ہوگا۔

عہد صحابہ میں بینکاری کی مثال

حضرت زبیر بن عوامؓ جو عشرہ مبشرہ میں سے ہیں، انہوں نے اپنے پاس بالکل ایسا نظام قائم کیا ہوا تھا جیسے آج کل بینکنگ کا نظام ہوتا ہے، لوگ جب ان کے پاس اپنی امانتیں لا کر رکھواتے تو یہ ان سے کہتے کہ میں یہ امانت کی رقم بطور قرض لیتا ہوں، یہ رقم میرے ذمے قرض ہے، اور پھر آپ اس رقم کو تجارت میں لگاتے ، چنانچہ جس وقت آپ کا انتقال ہوا تو اس وقت جو قرض ان کے ذمہ تھا، اس کے بارے میں ان کے صاحبزادے حضرت عبداللہ بن زبیرؓ فرماتے ہیں کہ:

فحسبت ما عليه من الديون فوجدته الفي الف ومائتي الف

یعنی میں نے ان کے ذمہ واجب الادا قرضوں کا حساب لگایا تو وہ بائیس لاکھ دینار نکلے۔

لہذا یہ کہنا کہ اس زمانے میں تجارتی قرض نہیں ہوتے تھے، یہ بالکل خلاف واقعہ بات ہے اور حقیقت یہ ہے کہ تجارتی قرض بھی ہوتے تھے، اور اس پر سود کا لین دین بھی ہوتا تھا، اور قرآن کریم نے ہر قرض پر جو بھی زیادتی وصول کی جائے اس کو حرام قرار دیا ہے، لہذا یہ کہنا کہ کمرشل لون پر انٹرسٹ لینا جائز ہے اور ذاتی قرضوں پر انٹرسٹ لینا جائز نہیں، یہ بالکل غلط ہے۔

سود مرکب اور سود مفرد دونوں حرام ہیں

اس کے علاوہ ایک اور غلط فہمی پھیلائی جارہی ہے ، وہ یہ کہ ایک سود مفرد (Simple Interest) ہوتا ہے اور ایک سود مرکب (Compound Interest) ہوتا ہے، یعنی سود پر بھی سود لگتا چلا جائے ،بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس ﷺ کے زمانے میں مرکب سود ہوتا تھا اور قرآن کریم نے اس کو حرام قرار دیا ہے، لہذا وہ تو حرام ہے، لیکن سود مفرد جائز ہے، اس لیے کہ وہ اس زمانے میں نہیں تھا، اور نہ ہی قرآن نے اس کو حرام قرار دیا ہے، لیکن ابھی قرآن کریم کی جو آیت میں نے آپ کے سامنے تلاوت کی ، اس میں فرمایا کہ:﴿ يا أيها الذين امنوا اتقوا الله وذروا ما بقى من الربا ﴾[البقرة:٢٨٧]

یعنی اے ایمان والوں! اللہ سے ڈرو، اور ربا کا جو حصہ بھی رہ گیا ہو، اس کو چھوڑ دو، یعنی اس کے کم یا زیادہ ہونے کا کوئی سوال نہیں، یا Rate of interest کے کم یا زیادہ ہونے کی بحث نہیں، جو کچھ بھی ہو اس کو چھوڑ دو، اور اس کے بعد فرمایا کہ:﴿ وإن تبتم فلكم رؤوس أموالكم ﴾ [البقرة:٢٨٨]

یعنی اگر تم ربا سے توبہ کر لو، تو پھر تمہارا جو راس المال (Principal) ہے وہ تمہارا حق ہے اور خود قرآن کریم نے واضح طور پر فرمادیا کہ Principal تو تمہارا حق ہے، لیکن اس کے علاوہ تھوڑی سی زیادتی بھی ناجائز ہے، لہذا یہ کہنا بالکل غلط ہے کہ سود مرکب حرام ہے اور سود مفرد حرام نہیں، بلکہ سود کم ہو یا زیادہ سب حرام ہے، اور قرض لینے والا غریب ہو تب بھی حرام ہے اور قرض لینے والا امیر اور مالدار ہو تو بھی حرام ہے، اگر

کوئی شخص ذاتی ضرورت کے لیے قرض لے رہا ہو تو بھی حرام ہے اور اگر تجارت کے لیے قرض لے رہا ہو تو بھی حرام ہے، اس کے حرام ہونے میں کوئی شبہ نہیں۔

ذاتی قرض پر سود میں کیا خرابی ہے ؟

اب ایک بات باقی رہ گئی ہے اس کو بھی سمجھ لینا چاہیے وہ یہ کہ شروع میں جیسا کہ عرض کیا تھا کہ لوگ یہ کہتے ہیں کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں صرف ذاتی ضرورت کے لیے قرضے لیے جاتے تھے، اب اگر ایک شخص ذاتی ضرورت کے لیے قرض لے رہا ہے مثلاً اس کے پاس کھانے کو روٹی نہیں ہے، یا میت کو دفنانے کے لیے کفن نہیں ہے، اس کے لیے وہ قرض لے رہا ہے اور آپ اس سے سود کا مطالبہ کر رہے ہیں یہ تو ایک غیر انسانی حرکت اور ناانصافی کی بات ہے۔

کمرشل لون (تجارتی قرض) پر سود میں کیا خرابی ہے ؟

لیکن جو شخص میرے پیسے کو تجارت میں لگا کر نفع کمائے گا، اگر میں نفع میں اس سے تھوڑا حصہ لے لوں تو اس میں کیا خرابی ہے؟

پہلی بات تو یہ ہے کہ ایک مسلمان کو اللہ کے کسی حکم میں چوں چرا کی گنجائش نہیں ہونی چاہیے، اگر کسی چیز کو اللہ تعالی نے حرام کر دیا، وہ حرام ہوگئی، لیکن زیادہ اطمینان کے لیے یہ بات عرض کرتا ہوں تا کہ بات اچھی طرح دل میں اتر جائے، وہ یہ کہ اگر آپ کسی شخص کو قرض دے رہے ہیں، تو اس کے بارے میں اسلام یہ کہتا ہے کہ دو باتوں میں سے ایک بات متعین کرلو، کیا تم اس کی کچھ امداد کرنا چاہتے ہو؟ یا اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتے ہو؟ اگر قرض کے ذریعہ اس کی امداد کرنا چاہتے ہو تو وہ پھر آپ کی طرف سے صرف امداد ہی ہوگی، پھر آپ کو اس قرض پر زیادتی کے مطالبے کا کوئی حق نہیں، اور اگر اس کے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتے ہو تو پھر جس طرح نفع میں حصہ دار بنو گے اسی طرح نقصان میں بھی اس کا حصہ دار بننا ہوگا، یہ نہیں ہوسکتا کہ تم صرف نفع میں حصہ دار بن جاؤ، نفع ہو تو تمہارا، اور اگر نقصان ہو تو وہ اس کا، لہذا جس کاروبار میں نقصان کا خطرہ (Risk) تو وہ برداشت کرے اور نفع آپ کو مل جائے بلکہ اس صورت میں آپ اس کو قرض نہ دیں، بلکہ اس کے ساتھ ایک جوائنٹ انٹر پرائز (Joint Enterprise) کیجیے، اور اس کے ساتھ "مشارکہ" اور پارٹنرشپ کیجیے، یعنی اس سے معاہدہ کریں کہ جس کاروبار کے لیے تم قرض لے رہے ہو، اس میں اتنا فیصد نفع میرا ہوگا، اور اتنا تمہارا ہوگا، اگر اس کاروبار میں نقصان ہوگا تو وہ نقصان بھی اسی نفع کے تناسب سے ہوگا، لیکن یہ بات بالکل درست ہے کہ آپ تو اس سے یہ کہیں کہ اس قرض پر پندرہ فیصد نفع آپ سے لوں گا، چاہے تمہیں کاروبار میں نفع ہو یا نقصان ہو، یہ بالکل حرام ہے اور سود ہے۔

انٹرسٹ پر مبنی نظام کی خرابی

آج کل انٹرسٹ کا جو نظام رائج ہے، اس کا خلاصہ یہ ہے کہ بعض اوقات قرض لینے والے کو نقصان ہو گیا، تو اس صورت میں قرض دینے والا فائدہ میں رہا، اور قرض لینے والا نقصان میں رہا، اور بعض اوقات یہ ہوتا ہے کہ قرض لینے والے نے زیادہ شرح سے نفع کمایا اور قرض دینے والے کو اس نے معمولی شرح سے نفع دیا، اب قرض دینے والا نقصان میں رہا، اس کو ایک مثال کے ذریعہ سمجھیے۔

ڈیپازیٹر ہر حال میں نقصان میں ہے

مثلا ایک شخص ایک کروڑ روپیہ قرض لے کر اس سے تجارت شروع کرتا ہے، اب وہ ایک کروڑ روپیہ کہاں سے اس کے پاس آیا؟ وہ ایک کروڑ روپیہ کس کا ہے؟ ظاہر ہے کہ وہ روپیہ اس نے بینک سے لیا، اور بینک کے پاس وہ روپیہ ڈیپازیٹرس کا ہے، گویا کہ وہ ایک کروڑ روپیہ پوری قوم کا ہے، اور اب اس نے قوم کے اس ایک کروڑ روپے سے تجارت شروع کی اور اس تجارت کے اندر اس کو سو فیصد نفع ہوا، اور اب اس کے پاس دو کروڑ ہو گئے، جس میں سے ۱۵ فیصد یعنی پندرہ لاکھ روپے اس نے بینک کو دیے، اور پھر بینک نے اس میں سے اپنا کمیشن اور اپنے اخراجات نکال کر باقی ۷ فیصد یا ۱۰ فیصد کھاتہ دار (Depositors) کو دے دیے، نتیجہ یہ ہوا کہ جن لوگوں کا پیسہ تجارت میں لگا تھا، جس سے اتنا نفع ہوا ان کو تو سو روپے پر صرف دس روپے نفع ملا، اور یہ بے چارہ ڈیپازیٹر بڑا خوش ہے کہ میرے سو روپے اب ایک سو دس ہو گئے، لیکن اس کو یہ معلوم نہیں کہ حقیقت میں اس کے پیسوں سے جو نفع کمایا گیا، اس کے لحاظ سے ایک سو کے دو سو ہونے چاہیے تھے، اور پھر دوسری طرف یہ دس روپے جو نفع اس کو ملا، قرض لینے والا اس کو دوبارہ اس سے واپس وصول کر لیتا ہے، وہ کس طرح واپس وصول کرتا ہے؟

سود کی رقم مصارف میں شامل ہوتی ہے

وہ اس طرح وصول کرتا ہے کہ قرض لینے والا ان دس رپوں کو پیداواری اخراجات اور مصارف (Cost of Production) میں شامل کر لیتا ہے، مثلا فرض کرو کہ اس نے ایک کروڑ روپیہ بینک سے قرض لے کر کوئی فیکٹری لگائی، یا کوئی چیز تیار کی تو تیاری کے مصارف (Cost) میں ۱۵ فیصد بھی شامل کر دیے جو اس نے بینک کو ادا کیے، لہذا جب وہ پندرہ فیصد بھی شامل ہو گئے تو اب جو چیز تیار (Produce) ہو گی، اس کی قیمت پندرہ فیصد بڑھ جائے گی، مثلا اس نے کپڑا تیار کیا تھا، تو اب انٹرسٹ کی وجہ سے اس کپڑے کی قیمت پندرہ فیصد بڑھ گئی، لہذا ڈیپازیٹر جس کو ایک سو کے ایک سو دس روپے ملے تھے، جب بازار سے کپڑا خریدے گا تو اس کو اس کپڑے کی قیمت پندرہ فیصد زیادہ دینی ہو گی، تو نتیجہ یہ نکلا کہ ڈیپازیٹر کو جو دس فیصد منافع دیا گیا تھا وہ دوسرے ہاتھ سے اس سے زیادہ کر کے پندرہ فیصد وصول کر لیا گیا، یہ خوب نفع کا سودا ہوا،

وہ ڈیپازیٹر خوش ہے کہ مجھے سو روپے کے ایک سو دس روپے مل گئے، لیکن حقیقت میں اگر دیکھا جائے تو اس کو سو روپے کے ۹۵ روپے ملے، اس لیے کہ وہ پندرہ فیصد کپڑے کی کوسٹ میں چلے گئے، اور دوسری طرف ۸۵ فیصد منافع اس قرض لینے والے کی جیب میں چلے گئے۔

شرکت کا فائدہ

اور اگر شرکت پر معاملہ ہوتا، اور یہ طے پاتا کہ مثلاً ۵۰ فیصد نفع سرمایہ لگانے والے (Financier) کا ہوگا اور ۵۰ فیصد کام کرنے والے تاجر کا ہوگا، تو اس صورت میں عوام کو ۱۵ فیصد کے بجائے ۵۰ فیصد نفع ملتا اور اس صورت میں یہ ۵۰ فیصد اس چیز کی لاگت (Cost) میں بھی شامل نہ ہوتا، اس لیے کہ نفع تو اس پیداوار کی فروخت کے بعد سامنے آئے گا، اور پھر اس کو تقسیم کیا جائے گا، اس لیے کہ سود (Interest) تو لاگت (cost) میں شامل کیا جاتا ہے، لیکن نفع (Profit) لاگت (Cost) میں شامل نہیں کیا جاتا، تو یہ صورت اجتماعی نفع کی تھی۔

نفع کسی کا، اور نقصان کسی اور کا

اور اگر فرض کرو کہ ایک کروڑ روپیہ بینک سے قرض لے کر جو تجارت کی، اس تجارت میں اس کو نقصان ہوگیا، وہ بینک اس نقصان کے نتیجے میں دیوالیہ ہوگیا، اب اس بینک کے دیوالیہ ہونے کے نتیجے میں کس کا روپیہ گیا؟ ظاہر ہے کہ عوام کا گیا، تو اس نظام میں نقصان ہونے کی صورت میں سارا نقصان عوام پر ہے، اور اگر نفع ہے تو سارا کا سارا قرض لینے والے کا ہے۔

بیمہ کمپنی سے کون فائدہ اٹھا رہا ہے؟

قرض لینے والے تاجر کا اگر نقصان ہوجائے تو اس نے اس نقصان کی تلافی کے لیے ایک اور راستہ تلاش کرلیا ہے، وہ ہے انشورنس (Insurance) مثلاً فرض کرو کہ روئی کے گودام میں آگ لگ گئی، تو اس نقصان کو پورا کرنے کا فریضہ انشورنس کمپنی پر عائد ہوتا ہے اور انشورنس کمپنی میں کس کا پیسہ ہے؟ وہ غریب عوام کا پیسہ ہے، اس عوام کا پیسہ ہے جو اپنی گاڑی اس وقت تک سڑک پر نہیں لاسکتے جب تک اس کو انشورڈ (insured) نہ کرالیں، اور عوام کی گاڑی کا ایکسیڈنٹ نہیں ہوتا، اس کو آگ نہیں لگتی لیکن وہ بیمہ کی قسطیں (premium) ادا کرنے پر مجبور ہیں۔

ان غریب عوام کے بیمہ کی قسطوں سے انشورنس کمپنی کی عمارت تعمیر کی گئی، اور غریب عوام کے ڈیپازیٹ کے ذریعہ تاجر کے نقصان کی تلافی کرتے ہیں، لہذا یہ سارا گورکھ دھندا اس لیے کیا جارہا ہے تاکہ اگر نفع ہو تو سرمایہ دار تاجر کا ہو، اور اگر نقصان ہو تو عوام کا ہو، اس کے نتیجے میں یہ صورت حال ہورہی ہے، بینک

میں جو پوری قوم کا روپیہ ہے، اگر اس کو صحیح طریقے پر استعمال کیا جاتا تو اس کے تمام منافع بھی عوام کو حاصل ہوتے، اور اب موجودہ نظام میں تقسیم دولت (Distribuition of wealth) کا جو سسٹم ہے، اس کے نتیجے میں دولت نیچے کی طرف جانے کے بجائے اوپر کی طرف جا رہی ہے، انہی خرابیوں کی وجہ سے حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ سود کھانا ایسا ہے جیسے اپنی ماں سے زنا کاری کرنا، اتنا سنگین گناہ اس لیے ہے کہ اس کی وجہ سے پوری قوم کو تباہی کا نشانہ بنایا جاتا ہے۔

سودی طریقہ کار کا متبادل کیا ہے ؟

ایک دوسرا سوال بھی بہت اہم ہے جو آج کل لوگوں کے دلوں میں پیدا ہوتا ہے، وہ یہ ہے کہ ہم یہ تو مانتے ہیں کہ انٹرسٹ حرام ہے، لیکن اگر انٹرسٹ کو ختم کر دیا جائے تو پھر اس کا متبادل طریقہ کیا ہوگا جس ذریعہ معیشت کو چلایا جائے؟ اس واسطے کہ آج پوری دنیا میں معیشت کی روح انٹرسٹ پر قائم ہے، اور اگر اس کی روح کو نکال دیا جائے تو اس کو چلانے کا دوسرا کوئی طریقہ نظر نہیں آتا، اس لیے لوگ کہتے ہیں کہ انٹرسٹ کے سوا کوئی دوسرا نظام موجود ہی نہیں ہے، اور اگر ہے تو ممکن اور قابل عمل (Practicable) نہیں ہے، اور اگر کسی کے پاس قابل عمل طریقہ موجود ہے تو وہ بتائے کہ کیا ہے؟

اس سوال کا جواب تفصیل طلب ہے اور ایک مجلس میں اس موضوع کا پورا حق ادا ہونا ممکن بھی نہیں ہے، اور اس کا جواب تھوڑا سا ٹیکنیکل بھی ہے، اور اس کو عام فہم اور عام الفاظ میں بیان کرنا آسان بھی نہیں ہے، لیکن میں اس کو عام فہم انداز میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہوں تاکہ آپ حضرات کی سمجھ میں آجائے۔

ضروری چیزوں کو شریعت میں ممنوع قرار نہیں دیا گیا

سب سے پہلے تو یہ سمجھ لیجیے کہ جب اللہ تعالیٰ نے کسی چیز کو حرام قرار دے دیا کہ یہ چیز حرام ہے، تو پھر یہ ممکن ہی نہیں ہے کہ وہ چیز ناگزیر ہو، اس لیے کہ اگر وہ چیز ناگزیر ہوتی تو اللہ تعالیٰ اس کو حرام قرار نہ دیتے، اس لیے کہ قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿لا يكلف الله نفسا إلا وسعها﴾ [البقرة:٢٨٦]

یعنی اللہ تعالیٰ انسان کو کسی ایسی چیز کا حکم نہیں دیتے جو اس کی وسعت سے باہر ہو، لہٰذا ایک مومن کے لیے تو اتنی بات بھی کافی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ نے ایک چیز کو حرام قرار دے دیا تو چونکہ اللہ تعالیٰ سے زیادہ جاننے والا کوئی نہیں ہے کہ کونسی چیز انسان کے لیے ضروری ہے اور کون سی چیز ضروری نہیں ہے، لہٰذا جب اس چیز کو حرام قرار دے دیا تو یقیناً وہ چیز ضروری اور ناگزیر نہیں ہے، اس چیز میں کہیں خرابی ضرور ہے جس کی وجہ سے وہ ضروری اور ناگزیر معلوم ہو رہی ہے تو اب اس خرابی کو دور کرنے کی ضرورت ہے، لیکن یہ کہنا درست نہیں ہے کہ اس کے بغیر کام نہیں چلے گا اور یہ چیز ناگزیر اور ضروری ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۱۴۹ تا ۱۶۴]

سودی نظام کی خرابی

سود کے نظریے کی بنیاد اس بات پر ہے کہ ایک شخص کی آمدنی یقینی اور دوسرے کی آمدنی خطرے میں ہے اور غیر یقینی ہے، مثلا ایک شخص نے کسی سے سود پر قرض لیا، تو اب اس نے جس سے قرض لیا، اس کو تو ایک متعین رقم بطور سود کے ضرور ادا کرنی ہے، اور جس نے قرض لیا ہے وہ اس قرض کی رقم سے جب کاروبار کرے گا تو ہوسکتا ہے اس کو کاروبار میں نفع ہو، اور ہوسکتا ہے کہ اس کو کاروبار میں نقصان ہو جائے، دونوں باتیں ہوسکتی ہیں، اور اب جس صورت میں قرض لینے والا نقصان میں رہا، اس صورت میں بھی ١٦٪ فیصد قرض دینے والے بینک یا ادارے کو ادا کرنا اس کے ذمہ ضروری اور لازم ہے، لہذا قرض لینے والا نقصان میں رہا، اور بعض مرتبہ اس کے برعکس قرض دینے والا نقصان میں ہوتا ہے، اور قرض لینے والا فائدہ میں رہتا ہے۔

مثلا ایک شخص نے بینک سے سود پر دس کروڑ روپیہ قرض لیا اور اس سے کاروبار شروع کیا، بہت سی تجارتیں ایسی ہوتی ہیں کہ ان میں سو فیصد بھی نفع ہوتا ہے، فرض کریں کہ اس شخص کو دس کروڑ پر پچاس فیصد نفع ہوا، اب وہ بینک کو صرف سود کی متعین شرح مثلا ١٥ فیصد اس نفع میں سے بینک کو ادا کرے گا، اور باقی پورا ٣٥ فیصد خود اس کی جیب میں چلا گیا، اب یہ دیکھیے کہ جو اس نے تجارت کی، وہ پیسہ کس کا تھا؟ وہ تو عوام کا تھا، اور اس کے ذریعہ جو نفع کمایا گیا، اس کا ٣٥ فیصد نفع صرف ایک شخص کی جیب میں چلا گیا جس نے تجارت کی، اور صرف ١٥ فیصد بینک کے پاس پہنچا، اور پھر بینک نے اس میں سے اپنا حصہ نکالنے کے بعد بقیہ تھوڑا سا حصہ مثلا دس فیصد تمام ڈیپازیٹر کے درمیان تقسیم کر دیا، نتیجہ یہ نکلا کہ عوام کے پیسے سے جو ٥٠ فیصد نفع ہوا تھا، اس کا صرف دس فیصد عوام میں تقسیم ہوا، اور ٣٥ فیصد صرف ایک آدمی کی جیب میں چلا گیا اور عوام وہ دس فیصد لے کر بہت خوش ہے کہ ہم نے بینک میں سو روپے رکھوائے تھے، اور اب سال بھر کے بعد ایک سو دس ہو گئے، لیکن اس بے چارے کو یہ معلوم نہیں کہ یہ دس روپے پھر واپس اس سرمایہ دار تاجر کے پاس چلے جاتے ہیں، اس لیے کہ اس تاجر نے ١٥ فیصد بینک کو جو سود کی شکل میں دیا تھا، وہ اس کو اپنی پروڈکشن کی لاگت میں شامل کرے گا اور لاگت میں شامل ہو کر اس کی قیمت کا حصہ بن جائے گا، اور وہ قیمت پھر عوام سے وصول کرے گا، لہذا ہر اعتبار سے وہ فائدے میں رہا، پھر اس کو نقصان کا بھی خطرہ نہیں، اور اگر بالفرض اس کو نقصان ہو بھی جائے تو اس کی تلافی کے لیے انشورنس کمپنیاں موجود ہیں، وہ انشورنس کمپنیاں جس میں ان عوام کے پیسے رکھے ہیں جو اپنی گاڑی اس وقت تک سڑک پر نہیں لا سکتے جب تک وہ انشورنس کی قسط (Premium) ادا نہ کرے، ان عوام کے پیسوں سے اس سرمایہ دار کے نقصانات کی تلافی کی جاتی ہے، بہر حال سودی نظام کے ظالمانہ طریقے کی طرف میں نے تھوڑا سا اشارہ کر دیا، لہذا سود کے ذریعہ معیشت میں ناانصافی، ناہمواری پیدا ہونا لازم ہے، اس لیے شریعت نے اس کو منع کیا ہے۔

شرکت اور مضاربت کے فوائد

اب اگر یہی تجارت سود کے بجائے شرکت اور مضاربت کی بنیاد پر ہوتو اس صورت میں بینک اور سرمایہ لینے والے کے درمیان یہ معاہدہ نہیں ہوگا کہ یہ بینک کو ۱۵ فیصد ادا کرے گا، بلکہ یہ معاہدہ ہوگا کہ یہ سرمایہ لینے والا جو کچھ نفع کمائے اس کا آدھا مثلاً بینک کو ادا کرے گا، اور آدھا تجارت کرنے والے کا ہوگا، اب اگر پچاس فیصد نفع ہوا ہے تو پچیس فیصد بینک کو ملے گا اور پچیس فیصد اس کو ملے گا، اس طرح دولت کا رخ اوپر کے بجائے نیچے کی طرف ہوگا، اس لیے کہ بینک کے واسطے سے وہ پچیس فیصد ڈیپازیٹر کو ملے گا، اس سے معلوم ہوا کہ سود کا بُرا اثر تقسیم دولت پر بھی پڑتا ہے اور اس کے نتائج معیشت کی پشت پر نظر آتے ہیں۔

قمار (جُوا) حرام ہے

اسی طرح اسلام نے قمار کو حرام قرار دیا ہے، قمار کے معنی یہ ہیں کہ ایک شخص نے تو اپنا پیسہ لگادیا، اب دوصورتیں ہوں گی، یا تو جو پیسہ اس نے لگایا، وہ بھی ڈوب گیا، یا اپنے ساتھ بہت بڑی دولت لے آیا، اس کو قمار کہتے ہیں، اس کی بے شمار شکلیں ہیں، عجیب بات یہ ہے کہ ہمارے اس مغربی نظام زندگی میں ''جوا'' (Gambling) کو بہت سی جگہوں پر قانون کے اندر ممنوع قرار دیا گیا ہے، لیکن جب (Gambling) مہذب شکل اختیار کر لیتی ہے تو پھر وہ جائز ہوجاتی ہے اور خلاف قانون نہیں رہتی، مثلاً ایک غریب آدمی سڑک کے کنارے ''جوا'' کھیل رہا ہے تو پولیس اس کو پکڑ کر لے جائے، لیکن اگر جوا کو مہذب شکل دے دی جائے اور اس کے لیے کوئی ادارہ قائم کرلیا جائے اور اس کا کوئی دوسرا نام رکھ دیا جائے تو اس کو جائز سمجھا جاتا ہے، اس قسم کا قمار ہمارے سرمایہ دارانہ معاشرے میں پھیلا ہوا ہے، جس کے نتیجہ میں بے شمار انسانوں سے پیسے جوڑ جوڑ کر ایک انسان پر اس کی بارش برسادی جاتی ہے، اس لیے جو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۳، ص ۴۳]

''ہم نے امانت و دیانت سے پیسے کمائے پھر بھی ڈاکہ پڑگیا''

بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے تو بہت امانت اور دیانت کے ساتھ پیسے کمائے تھے، اس کے باوجود ہماری دکان پر بھی ڈاکو آگئے اور لوٹ کر لے گئے، بات یہ ہے کہ ذرا غور کرو کہ اگرچہ تم نے امانت اور دیانت سے کمائے تھے، لیکن یقین کرو کہ تم سے کوئی نہ کوئی گناہ ضرور سرزد ہوا ہوگا، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ یہی فرمارہے ہیں کہ جو کچھ تمہیں مصیبت پہنچ رہی ہے وہ تمہارے ہاتھوں کے کرتوت کی وجہ سے پہنچ رہی ہے، ہوسکتا ہے کہ تم نے کوئی گناہ کیا ہو، لیکن اس کا خیال اور دھیان نہیں کیا، ہوسکتا ہے کہ تم نے زکوۃ پوری ادا نہ کی ہو، یا زکوۃ کا حساب صحیح نہ کیا ہو، یا اور کوئی گناہ کیا ہو، اس کے نتیجے میں یہ عذاب تم پر آیا ہو۔

دوسرے یہ کہ جب کوئی گناہ معاشرے میں پھیل جاتا ہے اور اس گناہ سے کوئی روکنے والا بھی

نہیں ہوتا تو اس وقت جب اللہ تعالیٰ کا عذاب آتا ہے تو عذاب یہ نہیں دیکھتا کہ کس نے اس گناہ کا ارتکاب کیا تھا، اور کس نے نہیں کیا تھا، بلکہ وہ عذاب عام ہوتا ہے، تمام لوگ اس کی لپیٹ میں آجاتے ہیں، چنانچہ قرآن کریم کا ارشاد ہے: ﴿ واتقوا فتنة لا تصيبن الذين ظلموا منكم خاصة ﴾ [سورۃ الانفال:۲۵]

یعنی اس عذاب سے ڈرو جو صرف ظالموں ہی کو اپنی لپیٹ میں نہیں لے گا بلکہ جو لوگ ظلم سے علیحدہ تھے، وہ بھی اس عذاب میں پکڑے جائیں گے، اس لیے کہ اگرچہ یہ لوگ خود تو ظالم نہیں تھے، لیکن کبھی ظالم کا ہاتھ پکڑنے کی کوشش نہیں کی، کبھی ظلم کو مٹانے کی جدوجہد نہیں کی، اس ظلم کے خلاف ان کی پیشانی پر بل نہیں آیا، اس لیے گویا کہ وہ بھی اس ظلم ان کے ساتھ شامل تھے، لہذا یہ کہنا کہ ہم تو بڑی امانت اور دیانت کے ساتھ تجارت کر رہے تھے، اس کے باوجود ہمارے ہاں چوری ہوگئی، اور ڈاکہ پڑ گیا، اتنی بات کہہ دینا کافی نہیں، اس لیے کہ اس امانت اور دیانت کو دوسروں تک پہنچانے کا کام تم نے انجام نہیں دیا، اس کو چھوڑ دیا، اس لیے اس عذاب میں تم بھی گرفتار ہو گئے۔ [اصلاحی خطبات، ج۶، ص۱۳۳]

سودی قرض کا متبادل صرف قرض حسنہ ہی نہیں!

دوسری بات یہ ہے بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں انٹرسٹ جس کو قرآن کریم حرام قرار دیتا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ آئندہ جب کسی کو قرض دیا جائے تو ان کو غیر سودی قرض (Interest Free Loan) دینا چاہیے، اور اس پر کسی منافع کا مطالبہ نہیں کرنا چاہیے، اور اس سے یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جب انٹرسٹ ختم ہو جائے گا تو ہمیں پھر غیر سودی قرضے ملا کریں گے، پھر جتنا قرض چاہیں حاصل کریں، اور اس سے کوٹھیاں بنگلے بنائیں، اور اس سے فیکٹریاں قائم کریں، اور ہم سے کسی انٹرسٹ کا مطالبہ نہیں ہوگا، اور اسی سوچ کی بنا پر لوگ کہتے ہیں کہ یہ صورت قابل عمل (Practicable) نہیں ہے، اس لیے کہ جب ہر شخص کو سود کے بغیر قرض دیا جائے گا تو پھر اتنا پیسہ کہاں سے آئے گا کہ سب لوگوں کو بغیر سود کے قرضہ دے دیا جائے؟

سودی قرض کا متبادل "مشارکت" ہے

یاد رکھیے کہ انٹرسٹ کا متبادل (Alternative) قرض حسنہ نہیں ہے کہ کسی کو ویسے ہی قرض دے دیا جائے بلکہ اس کا متبادل ''مشارکت'' ہے، یعنی جب کوئی شخص کاروبار کے لیے قرضہ لے رہا ہے تو وہ قرض دینے والا یہ کہہ سکتا ہے کہ میں تمہارے کاروبار میں حصہ دار بننا چاہتا ہوں، اگر تمہیں نفع ہوگا تو اس نفع کا کچھ حصہ مجھے دینا پڑے گا، اور اگر نقصان ہوگا تو اس نقصان میں بھی میں شامل ہوں گا، تو اس کاروبار کے نفع اور نقصان دونوں میں قرض دینے والا شریک ہو جائے گا، اور یہ مشارکت ہو جائے گی اور یہ انٹرسٹ کا متبادل طریقہ کار (Alternative System) ہے۔

اور مشارکت کا نظریاتی پہلو تو میں آپ کے سامنے پہلے بھی بیان کر چکا ہوں کہ انٹرسٹ کی صورت

میں تو دولت کا بہت معمولی حصہ کھاتہ دار کو ملتا ہے، لیکن اگر مشارکت کی بنیاد پر کاروبار کیا جائے، اور سرمایہ کاری (Financing) مشارکت کی بنیاد پر ہو تو اس صورت میں تجارت کے اندر جتنا نفع ہوگا اس کا ایک متناسب (Proportionate) حصہ کھاتہ داروں کی طرف بھی منتقل ہوگا، اور اس صورت میں تقسیم دولت کا اوپر کی طرف جانے کے بجائے نیچے کی طرف آئے گا، لہذا اسلام نے جو متبادل نظام پیش کیا وہ مشارکت کا نظام ہے۔

دوسری متبادل صورت اجارہ

اس کے علاوہ اسلام کی صورت میں اللہ تعالی نے ہمیں ایک ایسا دین عطا فرمایا ہے کہ اس میں مشارکہ کے علاوہ بینکنگ اور فائنانسنگ کے اور بھی بہت سے طریقے ہیں، مثلا ایک طریقہ اجارہ (Leasing) کا ہے، وہ یہ ہے کہ ایک شخص بینک سے پیسہ مانگنے آیا، اور بینک نے اس سے پوچھا کہ تمہیں کس ضرورت کے لیے پیسے چاہیے؟ اس نے بتایا کہ مجھے اپنے کارخانے میں ایک مشینری باہر سے منگا کر لگانی ہے، تو اب بینک اس شخص کو پیسے نہ دے، بلکہ خود اس مشینری کو خرید کر اس شخص کو کرایہ پر دے دے، اس عمل کو اجارہ (Leasing) کہا جاتا ہے، البتہ آج کل فائنانسنگ اداروں اور بینک میں فائنانشل لیزنگ کا جو طریقہ رائج ہے، وہ شریعت کے مطابق نہیں ہے، اس ایگریمنٹ میں بہت سی شقیں (Clauses) شریعت کے خلاف ہیں، لیکن اس کو شریعت کے مطابق آسانی کے ساتھ بنایا جاسکتا ہے، پاکستان میں متعدد فائنانشل ادارے ایسے قائم ہیں جن میں لیزنگ ایگریمنٹ شریعت کے مطابق ہیں، اس کو اختیار کرنا چاہیے۔

تیسری متبادل صورت مرابحہ

اسی طرح ایک اور طریقہ ہے، جس کا آپ نے نام سنا ہوگا، وہ ہے ''مرابحہ فائنانسنگ'' یہ بھی کسی شخص سے معاملہ کرنے کا ایک طریقہ ہے جس میں نفع پر وہ چیز بیچ دی جاتی ہے، فرض کیجیے کہ ایک شخص بینک سے اس لیے قرض لے رہا ہے کہ وہ خام مال (Raw material) خریدنا چاہتا ہے، وہ بینک اس کو خام مال خریدنے کے لیے پیسے دینے کے بجائے وہ خود خام مال خرید کر اس کو نفع پر بیچ دے، یہ طریقہ بھی شرعا جائز ہے۔

بعض لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مرابحہ کی یہ صورت تو ہاتھ گھما کر کان پکڑنے والی بات ہوگئی، کیونکہ اس میں بینک سے نفع لینے کے بجائے دوسرے طریقے سے نفع وصول کرلیا، یہ کہنا درست نہیں، اس لیے کہ قرآن کریم نے فرمایا کہ: ﴿وأحل الله البيع وحرم الربوا﴾ [البقرة:٢٧٥]

یعنی اللہ تعالی نے بیع کو حلال کیا ہے اور ربا کو حرام کیا ہے، اور مشرکین مکہ بھی تو یہی کہا کرتے تھے کہ بیع بھی تو ربا جیسی ہے، اس میں بھی انسان نفع کماتا ہے اور ربا میں بھی انسان نفع کماتا ہے، پھر دونوں میں فرق کیا ہے؟ قرآن کریم نے ان کا ایک ہی جواب دیا کہ یہ ہمارا حکم ہے کہ ربا حرام ہے اور بیع حلال ہے، جس کا مطلب

یہ ہے کہ روپیہ کے اوپر روپیہ نہیں لیا جاسکتا، اور روپیہ پر منافع نہیں لیا جاسکتا لیکن اگر درمیان میں کوئی چیز یا مال تجارت آجائے اور اس کو فروخت کر کے نفع حاصل کر کے اس کو ہم نے حلال قرار دیا ہے، اور مرابحہ کے اندر درمیان میں مال آجاتا ہے اس لیے شریعت کے اعتبار سے وہ سودا (Transaction) جائز ہوجاتا ہے۔

پسندیدہ متبادل کونسا ہے ؟

لیکن جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ مرابحہ اور اجارہ مطلوبہ اور پسندیدہ متبادل (Ideal Alternative) نہیں ہیں، اور اس سے تقسیم دولت (Distribution of wealth) پر کوئی بنیادی اثر نہیں پڑتا، البتہ پسندیدہ متبال مشارکہ ہے، لیکن جو آئندہ منفرد (Individual) ادارے قائم کیے جائیں، ان کے لیے آزمائشی اور تجرباتی مدت (Transitory Period) میں مرابحہ اور لیزنگ پر بھی عمل کرنے کی گنجائش موجود ہے، اور اس وقت کچھ فائنانشل انسٹیٹیوشن ان بنیادوں پر کام کر رہے ہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۱۶۴ تا ۱۶۹]

کیا غیر مسلم ممالک میں سودی لین دین جائز ہے ؟

سود سے متعلق ایک مسئلہ اور ہے، جس کی صدائے بازگشت بار بار سنائی دیتی ہے، وہ یہ ہے کہ بعض لوگ یہ کہتے ہیں کہ دارالحرب جہاں غیر مسلم حکومت ہو، وہاں سود کے لین دین میں کوئی قباحت نہیں، وہاں غیر مسلم حکومت سے سود لے سکتے ہیں، اس مسئلہ پر بھی بہت لمبی چوڑی بحثیں ہوئی ہیں، لیکن حقیقت یہ ہے کہ چاہے دارالحرب ہو یا دارالاسلام، جس طرح سود دارالاسلام میں حرام ہے، اسی طرح دارالحرب میں بھی حرام ہے، البتہ اتنی بات ضرور ہے کہ عام آدمی کو چاہیے کہ اپنا پیسہ بینک کے اندر کرنٹ اکاؤنٹ میں رکھے، جہاں پیسوں پر سود نہیں لگتا، لیکن اگر کسی شخص نے غلطی سے سیونگ اکاؤنٹ میں پیسے رکھ دیے ہیں اور اس رقم پر سود مل رہا ہے تو پاکستان میں تو ہم لوگوں کہہ دیتے ہیں کہ سود کی رقم بینک میں چھوڑ دو، لیکن ایسے ملکوں میں جہاں ایسی رقم اسلام کے خلاف کام پر خرچ ہوتی ہے، وہاں اس شخص کو چاہیے کہ وہ سود کی رقم بینک سے وصول کر کے کسی مستحق زکوۃ شخص کو ثواب کی نیت کے بغیر صرف اپنی جان چھڑانے کے لیے صدقہ کر دے اور خود اپنے استعمال میں نہ لائے۔

انشورنس کا ملازم کیا کرے ؟

اس وقت انشورنس کی جتنی صورتیں رائج ہیں، ان میں کسی میں سود ہے، کسی میں جوا ہے، اس لیے وہ سب حرام ہیں، اور اس وجہ سے انشورنس کمپنی میں ملازمت بھی جائز نہیں، البتہ ہمارے بزرگ یہ کہتے ہیں کہ اگر کوئی بینک میں یا انشورنس کمپنی میں ملازم ہو، تو اس کو چاہیے کہ وہ اپنے لیے دوسرا حلال اور جائز ذریعہ معاش تلاش کرے اور اہتمام اور کوشش کے ساتھ اس طرح تلاش کرے جیسے ایک بے روزگار تلاش کرتا ہے اور جب

اس کو دوسرا حلال ذریعہ آمدنی مل جائے تو اس وقت اس حرام ذریعہ کو چھوڑ دے، یہ بات ہمارے بزرگ اس لیے فرماتے ہیں کہ کچھ پتہ نہیں کہ کس کے حالات کیسے ہوں، اب اگر کوئی شخص فوراً اس کو چھوڑ دے تو کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی پریشانی میں مبتلا ہو جائے، پھر شیطان آکر اس کو یہ بہکادے کہ دیکھو تم دین پر عمل کرنے چلے تھے تو اس کے نتیجے میں تم پر یہ مصیبت آگئی، اس لیے ہمارے بزرگ فرماتے ہیں کہ اس حرام ملازمت کو فوراً مت چھوڑو، بلکہ دوسری جگہ ملازمت تلاش کرو، جب حلال روزگار مل جائے تو اس وقت اس کو چھوڑ دینا۔

[اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۲۳۳]

محنت کی ہر کمائی حلال نہیں ہوتی

رزق طلب کرنا فریضہ اس وقت ہے جب طلب حلال کی ہو، روٹی کپڑا اور پیسہ بذات خود مقصود نہیں ہے، یہ نیت نہ ہو کہ بس پیسہ حاصل کرنا ہے چاہے جس طرح بھی حاصل ہو، بعض لوگوں نے وہ ذریعہ معاش اختیار کر رکھا ہے جو حرام ہے اور شریعت نے اس کی اجازت نہیں دی، مثلاً سود کا ذریعہ معاش اختیار کیا ہوا ہے، اب اگر ان سے کہا جائے کہ یہ تو ناجائز اور حرام ہے، اس طریقے سے پیسے نہیں کمانے چاہئیں تو جواب یہ دیا جاتا ہے کہ ہم تو اپنی محنت کا کھا رہے ہیں، اپنی محنت لگا رہے ہیں، اپنا وقت صرف کر رہے ہیں، اب اگر وہ کام حرام اور ناجائز ہے تو ہمارا اس سے کیا تعلق؟

خوب سمجھ لیں کہ اللہ تعالیٰ کے یہاں ہر محنت جائز نہیں ہوتی، بلکہ وہ محنت جائز ہوتی ہے جو اللہ تعالیٰ کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق ہو، اگر اس طریقے کے خلاف انسان ہزار محنت کرلے لیکن اس کے ذریعہ جو پیسے کمائے گا وہ پیسے حلال کے نہیں ہوں گے بلکہ حرام ہوں گے، اب کہنے کو تو ایک ''طوائف'' بھی محنت کرتی ہے، وہ بھی کہہ سکتی ہے کہ میں اپنی محنت کے ذریعہ پیسے کما رہی ہوں، لہٰذا میری آمدنی حلال ہونی چاہیے، اسی طرح آمدنی کے جو ذرائع حرام ہیں ان کو یہ کہہ کر حلال کرنے کی کوشش کرنا کہ یہ ہماری محنت کی آمدنی ہے، شرعاً اس کی گنجائش نہیں ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۱۹۹]

بینک کا ملازم کیا کرے؟

چنانچہ بہت سے لوگ بینک کی ملازمت کے اندر مبتلا ہیں اور بینک کے اندر بہت سارا کاروبار سود پر ہوتا ہے، اب جو شخص وہاں ملازم ہے اگر وہ سود کے کاروبار میں ان کے ساتھ معاون بن رہا ہے تو یہ ملازمت ناجائز اور حرام ہے، چنانچہ علماء کرام فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص بینک کی ایسی ملازمت میں مبتلا ہو اور بعد میں اللہ تعالیٰ اس کو ہدایت دیں اور کو بینک کی ملازمت چھوڑنے کی فکر ہو جائے تو اس کو چاہیے کہ کوئی جائز ذریعہ آمدنی تلاش کرے اور جب دوسرا ذریعہ آمدنی مل جائے تو اس کو چھوڑ دے، لیکن جائز ذریعہ آمدنی اس طرح تلاش کرے جس طرح ایک بے روزگار آدمی تلاش کرتا ہے، یہ نہ ہو کہ بے فکری کے ساتھ بینک کی ناجائز ملازمت میں لگا ہوا ہے اور ذہن میں یہ بٹھا رکھا ہے کہ جب دوسری ملازمت مل جائے گی تو اس کو چھوڑ دوں گا،

بلکہ اس طرح تلاش کرے جس طرح ایک بے روزگار آدمی تلاش کرتا ہے، اور جب دوسری ملازمت مل تو موجودہ ملازمت کو ترک کردے اور اس کو اختیار کرلے چاہے اس میں آمدنی کم ہو۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۰، ص۲۰۰]

رزق کی طلب میں فرائض چھوڑنا جائز نہیں

جس جگہ پر معیشت میں اور اللہ تعالی کے عائد کردہ فرائض کے درمیان ٹکراؤ ہوجائے وہاں پر اللہ تعالی کے عائد کیے ہوئے فرائض کو ترجیح ہوگی، بعض لوگ افراط کے اندر مبتلا ہوجاتے ہیں، جب انہوں نے یہ سنا کہ طلب حلال بھی دین کا ایک حصہ ہے تو اس کو اتنا آگے بڑھایا کہ اس طلب حلال کے نتیجے میں اگر نمازیں ضائع ہورہی ہیں تو ان کو اس کی پرواہ نہیں، روزے چھوٹ رہے ہیں تو ان کو اس کی پرواہ نہیں، حلال وحرام ایک ہورہا ہے تو ان کو اس کی پرواہ نہیں، اگر ان سے کہا جائے کہ نماز پڑھو تو جواب دیتے ہیں کہ یہ کام جو ہم کررہے ہیں یہ بھی تو دین کا ایک حصہ ہے، ہمارے دین میں دین و دنیا کی کوئی تفریق نہیں ہے، لہذا جو کم ہم کررہے ہیں یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے۔

کچھ عرصہ پہلے ایک خاتون نے مجھے بتایا کہ ان کے شوہر ڈاکٹر ہیں، وہ مطب کے اوقات میں نماز نہیں پڑھتے اور جب مطب بند کرکے گھر واپس آتے ہیں تو گھر آکر تینوں نمازیں اکٹھی پڑھ لیتے ہیں، میں ان سے کہتی ہوں کہ آپ نماز کو قضا کردیتے ہیں یہ اچھا نہیں ہے، آپ وقت پر نماز پڑھ لیا کریں، تو جواب میں شوہر کہتے ہیں کہ اسلام نے خدمت خلق سکھائی ہے اور یہ ڈاکٹری اور مطب جو کررہے ہیں یہ بھی خدمت خلق کررہے ہیں اور یہ بھی دین کا ایک حصہ ہے، اب اگر ہم نے خدمت خلق کی خاطر نماز کو چھوڑ دیا تو اس میں کوئی حرج نہیں۔

اب دیکھیے! حلال کمانے کے لیے انہوں نے اولین دینی فریضے کو چھوڑ دیا، حالانکہ حضور اقدس ﷺ یہ فرمارہے ہیں کہ "طلب الحلال فريضة بعد الفريضة" یہ فریضہ تو ہے لیکن بعد الفرائض ہے، لہذا اگر کسب معاش کے فریضے میں اور اولین دینی فرائض کے درمیان ٹکراؤ ہوجائے تو اس وقت دینی فریضہ غالب رہے گا۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۰، ص۲۱۰]

تجارت کو ترقی دینا قناعت کے خلاف نہیں

یہاں ایک اور وضاحت کردوں، وہ یہ کہ لوگ بعض اوقات قناعت کا مطلب یہ سمجھ بیٹھے ہیں اور اس ساری گفتگو کا یہ نتیجہ نکالتے ہیں کہ جو شخص تاجر ہے اس کو آگے تجارت بڑھانے کی کوشش نہیں کرنی چاہیے، قناعت کا یہ مقصد نہیں، میں نے تین الفاظ استعمال کیے:

① ایک یہ کہ مال کمانے کا طریقہ جائز ہو۔ ② دوسرے وہ مال حلال ہو۔

③ تیسرے یہ کہ اعتدال کے ساتھ ہو۔

اس لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا "أجملوا في الطلب وتوكلوا عليه" لہٰذا اعتدال کا مطلب یہ ہے کہ دنیا کمانے کو اپنے اوپر سوار نہ کرو، مال کے خادم نہ بنو، اب اگر ایک شخص جائز طریقے سے اور اعتدال کے ساتھ اپنے کاروبار کو بڑھا رہا ہے تو شریعت نے اس پر نہ صرف یہ کہ پابندی عائد نہیں کی، بلکہ یہ عمل قناعت کے منافی بھی نہیں، لیکن اگر کوئی شخص اپنے کاروبار کو ناجائز اور حرام طریقے سے بڑھا رہا ہے وہ تو بالکل حرام ہے، دوسرا یہ کہ اگرچہ ناجائز کا ارتکاب نہیں ہو رہا ہے، لیکن اعتدال سے بڑھا ہوا ہے، اس لیے کہ دن رات مال بڑھانے کے علاوہ کوئی اور فکر ہی نہیں ہے، یا اس کاروبار کے نتیجے میں دوسروں کے حقوق پامال ہو رہے ہیں، یہ بھی اعتدال سے بڑھنے میں داخل ہے، تیسرے یہ کہ آدمی اس کاروبار میں ایسا مشغول ہو گیا ہے کہ اب اس کو کسی دینی محفل میں جانے کی فرصت نہیں، دین کی بات سیکھنے کی فرصت نہیں، کسی اللہ والے کے پاس جا کر بیٹھنے کی فرصت نہیں، یہ بھی اعتدال سے خارج ہے اور قناعت کے خلاف ہے۔

بہر حال! اعتدال کے ساتھ جائز طریقے سے دنیا کماؤ اور جو ملے اس پر راضی رہو، بس اسی کا نام قناعت ہے، اس دنیا میں قناعت کے علاوہ راحت حاصل کرنے کا کوئی اور طریقہ نہیں، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے ہم سب کو قناعت کی دولت عطا فرمائے، آمین۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۶، ۱۲۱]

کیا انسان ایک معاشی جانور ہے؟

ذرا سی عقل رکھنے والے انسان کو بھی یہ بات سوچنی چاہیے کہ اس کو اپنی جدوجہد اور اپنی زندگی کا بنیادی مقصد اس چند روزہ زندگی کو بنانا چاہیے، یا اس آنے والی دائمی زندگی کو اپنا مقصد بنانا چاہیے؟ ایک مسلمان جو اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے احکام پر ایمان رکھتا ہے، ظاہر ہے کہ اس کی زندگی کا بنیادی مقصد صرف کھا پی کر پورا نہیں ہو جاتا صرف زیادہ سے زیادہ روپیہ پیسہ جمع کر کے پورا نہیں ہو جاتا، کیونکہ اگر ایسا ہو جائے تو پھر انسان اور جانور میں کوئی فرق نہیں رہے گا، انسان کی تعریف میں یہ جو کہا گیا ہے کہ انسان ایک معاشی جانور (Economic animal) ہے، یہ تعریف درست نہیں، اس لیے کہ اگر انسان صرف (Economic animal) ہوتا تو پھر انسان میں اور بیل، گدھے، کتے میں کوئی فرق نہ ہوتا، اس لیے کہ یہ جانور کھانے پینے کے لیے پیدا ہوئے ہیں، اگر انسان بھی صرف کھانے پینے کے لیے پیدا کیا گیا ہے تو انسان اور جانور میں کوئی فرق نہ رہے گا، اللہ تعالیٰ نے سارے جانوروں کے لیے رزق کے دروازے کھولے ہیں، وہ بھی کھاتے پیتے ہیں، لیکن انسان کو جانوروں سے جو امتیاز عطا فرمایا ہے، وہ اس طرح کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو عقل دی ہے اور اس عقل کے ذریعہ وہ یہ سوچے کہ آئندہ آنے والی زندگی ایک دائمی زندگی ہے، اور وہ زندگی اس موجودہ زندگی پر فوقیت رکھتی ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۹، ص۶۷]

امربالمعروف و نهي عن المنكر

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کیا ہے؟

﴿یأمرون بالمعروف و ینهون عن المنکر و یقیمون الصلاة یؤتون الزکوة و یطیعون الله ورسوله﴾

اس آیت کا تعلق امر بالمعروف اور نہی عن المنکر سے ہے، نیک بندوں کا وصف بیان کرتے ہوئے اللہ تعالی نے فرمایا کہ وہ لوگ دوسروں کو نیکی کا حکم دیتے ہیں اور برائیوں سے روکتے ہیں، ''امر'' کے معنی ہیں حکم دینا، اور ''معروف'' کے معنی ہیں نیکی، ''نہی'' کے معنی روکنا اور ''منکر'' کے معنی ہیں برائی، فقہا کرام نے لکھا ہے کہ جس طرح ہر مسلمان پر نماز، روزہ فرض عین ہے، اسی طرح یہ بھی فرض عین ہے کہ اگر وہ دوسرے کو کسی برائی میں مبتلا دیکھے تو اپنی استطاعت کے مطابق اس کو روکے اور منع کرے کہ یہ کام گناہ ہے اس کو نہ کرو۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں افراط وتفریط

لوگوں کو اتنی بات تو معلوم ہے کہ امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض عین ہے، لیکن عام طور پر اس کی تفصیل معلوم نہیں کہ یہ کس وقت فرض ہے؟ اور کس وقت فرض نہیں؟ اور معلوم نہ ہونے کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سے لوگ تو اس فریضہ سے ہی بالکل غافل ہیں، وہ لوگ اپنی آنکھوں سے اپنے بیوی بچوں کو اپنے دوستوں کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ حرام کاموں میں مبتلا ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کو روکنے کی توفیق نہیں ہوتی، ان کو دیکھ رہے ہیں کہ وہ فرائض کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہے ہیں، لیکن ان کو کہنے کی توفیق نہیں ہوتی، اور بعض لوگ اس حکم کو اتنا عام سمجھتے ہیں کہ صبح سے لے کر شام انہوں نے دوسروں کو روکنے ٹوکنے کو اپنا مشغلہ بنا رکھا ہے، اس طرح اس آیت پر عمل کرنے میں لوگ افراط وتفریط میں مبتلا ہیں، وجہ اس کی یہ ہے کہ اس آیت کا صحیح مطلب معلوم نہیں، اس لیے اس کی تفصیل سمجھنا ضروری ہے۔

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے دو طریقے

انفرادی - اجتماعی

پہلی بات یہ سمجھ لیں کہ دعوت وتبلیغ کرنے اور دین کی بات دوسروں تک پہنچانے کے دو طریقے ہیں:

① انفرادی دعوت وتبلیغ ② اجتماعی دعوت وتبلیغ

انفرادی دعوت وتبلیغ کا مطلب یہ ہے کہ ایک شخص اپنی آنکھوں سے دوسرے شخص کو دیکھ رہا ہے کہ وہ فلاں گناہ اور فلاں برائی کے اندر مبتلا ہے، یا وہ شخص فلاں فرض یا واجب کی ادائیگی میں کوتاہی کر رہا ہے، اب انفرادی طور پر اس شخص کو اس طرف متوجہ کرنا کہ وہ اس برائی کو چھوڑ دے اور نیکی پر عمل کرے، اس کو انفرادی دعوت وتبلیغ کہتے ہیں۔

دوسری اجتماعی دعوت وتبلیغ ہوتی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ کوئی شخص ایک بڑے مجمع کے سامنے دین کی بات کہے، ان کے سامنے وعظ وتقریر کرے، یا ان کو درس دے، یا اس بات کا ارادہ کرے کہ میں کسی فوری سبب کے بغیر دوسروں کے پاس جا جا کر ان کو دین کی بات سناؤں گا، اور دین پھیلاؤں گا، جیسے ماشاء اللہ ہمارے تبلیغی جماعت کے حضرات کرتے ہیں کہ لوگوں کے پاس ان کے گھروں پر، ان کی دوکانوں پر جا کر ان کو دین کی بات پہنچاتے ہیں، یہ اجتماعی دعوت وتبلیغ ہے، دعوت وتبلیغ کے ان دونوں طریقوں کے احکام الگ الگ ہیں اور دونوں کے آداب الگ الگ ہیں۔

انفرادی دعوت وتبلیغ فرض عین ہے

انفرادی دعوت وتبلیغ یہ ہے کہ ہم اپنی اپنی آنکھوں سے ایک ایک برائی ہوتی ہوئی دیکھ رہے ہیں، یا ہم یہ دیکھ رہے ہیں کہ کوئی شخص کسی فرض کو چھوڑ رہا ہے تو اسوقت اپنی استطاعت کی حد تک اس برائی کو روکنا فرض کفایہ نہیں، بلکہ فرض عین ہے اور فرض عین ہونے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی یہ سوچ کر نہ بیٹھ جائے کہ یہ کام دوسرے لوگ کرلیں گے، یا یہ تو مولویوں کا کام ہے، یا تبلیغی جماعت والوں کے کرنے کا کام ہے، یہ درست نہیں، اس آیت کی رو سے یہ کام ہر ہر مسلمان کے ذمے فرض عین ہے، لہذا یہ انفرادی دعوت وتبلیغ فرض عین ہے۔

انفرادی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کب فرض ہے؟

دوسری بات یہ سمجھ لیجیے کہ عبادات کی دو قسمیں ہیں:

① ایک عبادت وہ ہے جو فرض یا واجب ہے، جیسے نماز، روزہ، زکوۃ، حج، وغیرہ۔

② دوسری عبادت وہ ہے جو سنت یا مستحب ہے، جیسے مسواک کرنا، کھانا کھانے سے پہلے بسم اللہ پڑھنا، تین سانس میں پانی پینا وغیرہ، اس میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تمام سنتیں داخل ہیں۔

اسی طرح برائیوں کی بھی دو قسمیں ہیں:

① ایک برائی وہ ہے جو حرام اور گناہ ہے، اور قطعی طور پر شریعت میں ممنوع ہے۔

② دوسری برائی وہ ہے جو حرام اور ناجائز نہیں، بلکہ خلاف سنت ہے، یا خلاف اَولیٰ ہے، یا ادب کے خلاف ہے۔

اگر کوئی شخص فرائض یا واجبات کو چھوڑ رہا ہو، یا حرام اور ناجائز کام کا ارتکاب کر رہا ہو تو وہاں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض عین ہے، مثلاً کوئی شخص شراب پی رہا ہے، یا بدکاری کے اندر مبتلا ہے، یا غیبت کر رہا ہے، یا جھوٹ بول رہا ہے، چونکہ یہ سب صریح گناہ ہیں، یہاں نہی عن المنکر فرض ہے، یا مثلاً کوئی شخص فرض نماز چھوڑ رہا ہے، یا زکوۃ نہیں دے رہا ہے، یا رمضان کے روزے نہیں رکھ رہا ہے تو اس کو اس کی ادائیگی کے لیے کہنا فرض ہے۔

کس وقت نہی عن المنکر فرض نہیں؟

اور پھر اس میں بھی تفصیل ہے، وہ یہ ہے کہ یہ اس وقت فرض ہوتا ہے جب اس کو بتانے یا اس کو روکنے کے نتیجے میں اس کے مان لینے کا احتمال ہو، اور اس کو بتانے کے نتیجے میں بتانے والے کو کوئی تکلیف پہنچنے کا اندیشہ نہ ہو، لہذا اگر کوئی شخص گناہ کے اندر مبتلا ہے اور آپ کو یہ خیال ہے کہ اگر میں اس کو اس گناہ سے روکوں گا تو یقین ہے کہ یہ شخص مانے گا نہیں، بلکہ یہ شخص الٹا شریعت کے حکم کا مذاق اڑائے گا، اور اس کی توہین کرے گا، اور اس توہین کے نتیجے میں یہ اندیشہ ہے کہ کہیں کفر میں مبتلا نہ ہو جائے، اس لیے کہ شریعت کے کسی حکم کی توہین کرنا صرف گناہ نہیں، بلکہ یہ عمل انسان کو اسلام سے خارج کر دیتا ہے اور کافر بنا دیتا ہے، لہذا اگر اس بات کا غالب گمان ہو کہ اگر میں اس شخص کو اس وقت اس گناہ سے روکوں گا تو یہ شریعت کے حکم کی توہین کرے گا، تو ایسی صورت میں اس وقت نہی عن المنکر کا فریضہ ساقط ہو جاتا ہے، اس لیے ایسے موقع پر اس کو اس گناہ سے نہیں روکنا چاہیے، بلکہ اپنے آپ کو اس گناہ کے کام سے الگ کر لینا چاہیے، اور اس شخص کے حق میں دعا کرنا چاہیے کہ یا اللہ! آپ کا یہ بندہ ایک بیماری میں مبتلا ہے، اپنے فضل و کرم سے اس کو اس بیماری سے نکال دیجیے۔

گناہ میں مبتلا شخص کو موقع پر روکنا

ایک شخص پورے ذوق و شوق کے ساتھ کسی گناہ کی طرف متوجہ ہے، اس وقت اس بات کا دور دور تک کوئی احتمال نہیں ہے کہ وہ کسی کی بات سنے گا اور مان لے گا، اب عین اس وقت ایک شخص اس کے پاس تبلیغ کے لیے اور امر بالمعروف کے لیے پہنچ گیا، اور یہ نہیں سوچا کہ اس وقت تبلیغ کرنے کا نتیجہ کیا ہوگا؟ چنانچہ اس نے تبلیغ کی، اس نے سامنے سے شریعت کے اس حکم کا مذاق اڑا دیا اور اس کے نتیجے میں کفر کے اندر مبتلا ہو گیا، اس کے کفر کے مبتلا ہونے کا سبب یہ شخص بنا جس نے جا کر اس کو تبلیغ کی، لہذا عین اس وقت جب کوئی شخص گناہ کے اندر مبتلا ہو، اس وقت روکنا ٹوکنا بعض اوقات نقصان دہ ہوتا ہے، اس لیے اس وقت روکنا ٹوکنا ٹھیک

نہیں، بلکہ بعد میں مناسب موقع پر اس کو بتا دینا اور سمجھا دینا چاہیے کہ جو عمل تم کر رہے تھے وہ درست نہیں تھا۔

اگر ماننے اور نہ ماننے کے احتمال برابر ہوں؟

اور اگر دونوں احتمال برابر ہوں، یعنی یہ احتمال بھی ہو کہ شاید یہ میری بات سن کر مان لے اور اس گناہ سے باز آجائے، اور یہ احتمال بھی ہو کہ شاید یہ میری بات نہ مانے، تو ایسے موقع میں بات کہہ دینا ضروری ہے، اس لیے کہ کیا پتہ کہ تمہارے کہنے کی برکت سے اللہ تعالیٰ اس کے دل میں یہ بات اتار دے اور اس کے نتیجے میں اس کی اصلاح ہو جائے، اور اگر تمہارے کہنے کے نتیجے میں اس کی اصلاح ہو گئی تو پھر اس کی آئندہ ساری عمر کی نیکیاں تمہارے نامہ اعمال میں لکھی جائیں گی۔

اگر تکلیف پہنچنے کا اندیشہ ہو؟

اور اگر یہ خیال ہے کہ یہ شخص جو گناہ کے اندر مبتلا ہے، اگر میں اس کو روکوں گا تو یہ شخص اگرچہ شریعت کے حکم کی توہین تو نہیں کرے گا، لیکن مجھے تکلیف پہنچائے گا، تو اس صورت میں اپنے آپ کو اس تکلیف سے بچانے کے لیے اس کو گناہ سے نہ روکنا جائز ہے، اور اس وقت امر بالمعروف اور نہی عن المنکر فرض نہیں رہے گا، البتہ افضل پھر بھی یہ ہے کہ اس سے کہہ دے، اور یہ سوچے کہ اگرچہ مجھے تکلیف پہنچائے گا اور میرے پیچھے پڑ جائے گا، لیکن میں حق بات اس کو کہہ دوں، لہٰذا اس وقت بات کہہ دینا افضل ہے، اور جو تکلیف پہنچے اس کو برداشت کرنا چاہیے۔

بہرحال! مندرجہ بالا تین صورتیں یاد رکھنے کی ہیں، جس کا خلاصہ یہ ہے کہ جس جگہ یہ اندیشہ ہو کہ سامنے والا شخص میری بات سننے اور ماننے کے بجائے شریعت کے حکم کی توہین کرے گا، وہاں امر بالمعروف نہ کرے، بلکہ خاموش رہے، اور جس جگہ دونوں احتمال برابر ہوں کہ شاید میری بات مان لے گا، یا شاید توہین پر اتر آئے گا، اس جگہ پر بات کہنا ضروری ہے، اور جس جگہ یہ اندیشہ ہو کہ وہ مجھے تکلیف پہنچائے گا تو وہاں شریعت کی بات کہنا ضروری نہیں، البتہ افضل یہ ہے کہ شریعت کی بات کہہ دے اور اس تکلیف کو برداشت کرے، یہ خلاصہ ہے جسے ہر شخص کو یاد رکھنا چاہیے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۸، ص ۳۰ تا ۳۶]

امر بالمعروف کرو اور دل بھی مت توڑو

بعض لوگوں کے دل میں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ ایک طرف تو یہ کہا جا رہا ہے کہ امر بالمعروف کرو اور نہی عن المنکر کرو، یعنی لوگوں کو اچھائی کی دعوت دو، اور اگر کوئی غلط کام میں مبتلا ہے تو اس کو بتادو اور اس کو روک دو، اور دوسری طرف یہ کہا جا رہا ہے کہ دوسرے مسلمان کا دل مت توڑو، اب دونوں کے درمیان تطبیق کس طرح کی جائے گی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دونوں کے درمیان تطبیق اس طرح ہوگی کہ جب دوسرے شخص

سے کوئی بات کہوتو خیر خواہی سے کہو، تنہائی میں کہو، نرمی سے کہو، محبت سے کہواور اس انداز میں کہو کہ جس سے اس کا دل کم سے کم ٹوٹے، مثلاً تنہائی میں اس سے کہے کہ بھائی! تمہارے اندر یہ بات قابل اصلاح ہے، تم اس کی اصلاح کرلو، لیکن طعنہ کے انداز میں کہنا یا لوگوں کے سامنے سر بازار اس کو رسوا کرنا، یہ چیز انسان کے دل میں گھاؤ ڈال دیتی ہے، اس لیے حرام ہے اور گناہ ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۱، ص ۹۴]

غلطی بتانے والا لعنت ملامت نہ کرے

اسی حدیث میں دوسرا سبق غلطی بتانے والے کے لیے، اس میں غلطی بتانے والے کو آئینہ سے تشبیہ دی ہے، اور آئینہ کا کام یہ ہوتا ہے کہ جب کوئی شخص اس کے سامنے کھڑا ہوتا ہے تو وہ یہ بتادیتا ہے کہ تمہارے چہرے پر اتنا بڑا داغ لگا ہوا ہے، اور اس بتانے میں نہ تو وہ کمی زیادتی کرتا ہے اور نہ اس شخص پر لعنت ملامت کرتا ہے کہ یہ داغ کہاں سے لگالیا بلکہ صرف داغ بتادیتا ہے، اسی طرح غلطی بتانے والا مؤمن بھی آئینہ کی طرح صرف اتنی غلطی اور عیب بتائے جتنا اس کے اندر واقعۃً موجود ہے، اس کو بڑھا چڑھا کر نہ بتائے اور اس بتانے میں مبالغہ نہ کرے، اور اسی طرح صرف اس کو بتادے کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے، لیکن اس کو اس کے عیب پر لعنت اور ملامت شروع کردے اور لوگوں کے سامنے اس کو ذلیل کرنا شروع کردے، یہ مؤمن کا کام نہیں ہے، اس لیے کہ مؤمن تو آئینہ کی طرح ہے، اس لیے اتنی ہی غلطی بتائے جتنی اس کے اندر ہے اور اس پر لعنت ملامت نہ کرے۔ [اصلاحی خطبات، ج۸، ص ۳۰۲]

غلطی کرنے والے پر ترس کھاؤ

اور جب ایک مؤمن دوسرے مؤمن کو غلطی بتاتا ہے تو اس پر ترس کھاتا ہے کہ یہ بے چارہ اس غلطی کے اندر مبتلا ہوگیا، جس طرح ایک شخص بیمار ہے تو وہ بیمار ترس کھانے کے لائق ہے، وہ غصہ کا محل نہیں، کوئی شخص اس بیمار پر غصہ نہیں کرے گا کہ تو کیوں بیمار ہوگیا؟ بلکہ اس پر ترس کھائے گا اور اس کو علاج کرنے کا مشورہ دے گا، اسی طرح ایک مؤمن غلطی اور گناہ کے اندر مبتلا ہے تو وہ ترس کھانے کے لائق ہے، وہ غصہ کرنے کا محل نہیں ہے، اس کو پیار سے اور نرمی سے بتادو کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے تاکہ وہ اس کی اصلاح کرلے، اس پر غصہ یا لعنت ملامت مت کرو۔

غلطی کرنے والے کو ذلیل مت کرو

آج کل ہم کو اس بات کا خیال بھی نہیں آتا کہ دوسرے مؤمن کو اس کی غلطی پر متنبہ کرنا بھی ایک فریضہ ہے، اگر ایک مسلمان غلط طریقے سے نماز پڑھ رہا ہے اور تمہیں معلوم ہے کہ یہ طریقہ غلط ہے تو تم پر فرض ہے کہ اس کو اس غلطی کے بارے میں بتادو، اس لیے کہ یہ بھی امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے اندر داخل ہے،

اور یہ ہر آدمی پر فرض ہے، آج کل کسی کو اس بات کا احساس بھی نہیں ہوتا کہ اس کو غلطی بتادوں، بلکہ یہ سوچتا ہے کہ غلط پڑھ رہا ہے تو پڑھنے دو، اور اگر کسی کو غلطی بتانے کا احساس ہوتا بھی ہے تو یہ احساس اتنی شدت سے ہوتا ہے کہ وہ اپنے آپ کو خدائی فوج دار سمجھ بیٹھتا ہے، چنانچہ جب وہ دوسروں کو ان کی غلطی بتاتا ہے تو ان پر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتا ہے، اور ان کو دوسروں کے سامنے ذلیل اور رسوا کرنا شروع کر دیتا ہے، حالانکہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ تم آئینہ ہو، تم لعنت ملامت اور ڈانٹ ڈپٹ مت کرو، نہ اس کو ذلیل اور رسوا کرو، بلکہ اس کو ایسے طریقے سے بتاؤ کہ اس کے دل میں تمہاری بات اتر جائے۔ [اصلاحی خطبات، ج۸، ص۳۰۲]

ایک کا عیب دوسرے کو نہ بتایا جائے

حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی ؒ نے اس حدیث کے تحت ایک نکتہ یہ بیان فرمایا ہے کہ آئینہ کا کام یہ ہے کہ جو شخص اس سامنے آئے گا اور اس کے اوپر کوئی عیب ہوگا تو وہ آئینہ صرف اسی شخص کو بتائے گا کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے، وہ آئینہ دوسروں سے نہیں کہے گا کہ فلاں شخص میں یہ عیب ہے، اور نہ اس عیب کا دوسروں کے سامنے تشہیر اور چرچا کرے گا، اسی طرح مؤمن بھی ایک آئینہ ہے، جب وہ دوسرے کے اندر کوئی عیب دیکھے تو صرف اسی کو خلوت میں خاموشی سے بتادے کہ تمہارے اندر یہ عیب ہے، باقی دوسروں سے جا کر کہنا کہ فلاں کے اندر یہ عیب اور یہ غلطی ہے، اور اس غلطی کا دوسروں کے سامنے چرچا کرنا، یہ مؤمن کا کام نہیں، بلکہ یہ تو نفسانیت کا کام ہے، اگر دل میں یہ خیال ہے کہ میں اللہ کو راضی کرنے کے لیے اس کا یہ عیب بتا رہا ہوں تو کبھی بھی وہ شخص دوسروں کے سامنے اس کا تذکرہ نہیں کرے گا، البتہ اگر دل میں نفسانیت ہوگی تو وہاں یہ خیال آئے گا کہ میں اس عیب کی وجہ سے اس کو ذلیل اور رسوا کروں، جبکہ مسلمانوں کو ذلیل اور رسوا کرنا حرام ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۸، ص۳۰۵]

دوسروں کی غلطیوں کے متعلق ہمارا غلط طرز عمل

آج ہم اپنے معاشرے میں ذرا جائزہ لے کر دیکھیں تو ایسے لوگ بہت کم نظر آئیں گے جو دوسروں کی غلطی دیکھ کر اس کو خیر خواہی سے بتادیں کہ تمہاری یہ بات مجھے پسند نہیں آئی، یا یہ بات شریعت کے خلاف ہے، لیکن اس کی غلطی کا تذکرہ مجلسوں میں کرنے والے بے شمار نظر آئیں گے، جس کے نتیجے میں غیبت کے گناہ میں مبتلا ہو رہے ہیں، افتراء اور بہتان کے گناہ میں مبتلا ہو رہے ہیں، مبالغہ اور جھوٹ کا گناہ ہو رہا ہے، اور ایک مسلمان کو بدنام کرنے کا گناہ ہو رہا ہے، اس کے بجائے بہتر طریقہ یہ تھا کہ تنہائی میں اس کو سمجھا دیتے کہ تمہارے اندر یہ خرابی ہے، اس کو دور کرلو، لہٰذا جب کسی مسلمان بھائی کے اندر کوئی عیب دیکھو تو دوسروں سے مت کہو بلکہ صرف اس سے کہو۔ [اصلاحی خطبات، ج۸، ص۳۰۵]

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے آداب

ٹوکتے وقت نیت درست ہونی چاہیے

پھر شریعت کی بات کہتے وقت ہمیشہ نیت درست رکھنی چاہیے، اور یہ سمجھنا نہیں چاہیے کہ ہم مصلح اور بڑے ہیں، اور ہم دین دار اور متقی ہیں، دوسرا شخص فاسق اور فاجر ہے، اور ہم اس کی اصلاح کے لیے کھڑے ہوئے ہیں، ہم خدائی فوج دار اور داروغہ ہیں، اس لیے کہ اس نیت کے ساتھ اگر شریعت کی بات کہی جائے گی تو اس کا فائدہ نہ سننے والے کو پہنچے گا اور نہ تمہیں فائدہ ہوگا، اس لیے کہ اس نیت کے ساتھ تمہارے دل میں تکبر اور عجب پیدا ہوگیا، جس کے نتیجے میں یہ عمل اللہ تعالی کے پاس مقبول نہیں رہا اور تمہارا یہ عمل بے کار اور اکارت ہوگیا اور ساری محنت ضائع ہوگئی، اور سننے والے کے دل میں بھی تمہاری بات کہنے کا اثر نہیں ہوگا، اس لیے روکتے وقت نیت کا درست ہونا ضروری ہے۔

اسی طرح جب بھی دوسرے سے شریعت کی بات کہنی ہو تو صحیح طریقے سے بات کہو، پیار ومحبت اور خیر خواہی کے ساتھ بات کہو، تاکہ اس کی دل شکنی کم سے کم ہو، اور اس انداز سے بات کہو کہ اس کی سبکی نہ ہو، اور لوگوں کے سامنے اس کی بے عزتی نہ ہو۔ [اصلاحی خطبات، ج ۸، ص ۳۶]

امر بالمعروف اور نہی عن المنکر میں تاثیر کیسے پیدا ہو؟

حق بات -حق طریقہ -حق نیت

شیخ الاسلام حضرت علامہ شبیر احمد عثمانی رحمہ اللہ ایک جملہ فرمایا کرتے تھے جو میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ سے کئی بار ہم نے سنا، وہ یہ کہ حق بات، حق طریقے اور حق نیت سے جب بھی کہی جائے گی وہ کبھی نقصان دہ نہیں ہوگی، لہذا جب بھی تم یہ دیکھو کہ حق بات کہنے کے نتیجے میں کہیں لڑائی جھگڑا ہوگیا، یا نقصان ہوگیا، یا فساد ہوگیا تو سمجھ لو کہ ان تین باتوں میں سے ضرور کوئی بات ہوگی، یا تو بات حق نہیں تھی اور خواہ مخواہ اس کو حق سمجھ لیا تھا، یا بات تو حق تھی لیکن نیت درست نہیں تھی، اور بات کہنے کا مقصد دوسرے کی اصلاح نہیں تھی بلکہ اپنی بڑائی جتانی مقصود تھی، یا دوسرے کو ذلیل کرنا مقصود تھا، جس کی وجہ سے بات کے اندر اثر نہیں تھا، یا یہ کہ بات بھی حق تھی، نیت بھی درست تھی، لیکن طریقہ حق نہیں تھا، اور بات ایسے طریقے سے کہی جیسے دوسرے کو لٹھ مار دیا، کلمہ حق کوئی لٹھ نہیں ہے کہ اٹھا کر کسی کو مار دو، بلکہ حق کلمہ کہنا محبت اور خیر خواہی والا کام ہے جو حق طریقے سے انجام پائے گا، جب خیر خواہی میں کمی ہوجاتی ہے تو پھر حق بات سے بھی نقصان پہنچ جاتا ہے۔

لہذا جب کوئی اللہ کا بندہ اپنی نفسانیت کو فنا کر کے اپنے آپ کو مٹا کر اللہ کے لیے بات کرتا ہے اور اس وقت دنیا والوں کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کے سامنے اس کا اپنا کوئی مفاد نہیں ہے اور یہ جو کچھ کہہ رہا

ہے اللہ کے لیے کہہ رہا ہے، تو پھر اس کی بات میں اثر ہوتا ہے، چنانچہ حضرت شاہ اسماعیل شہیدؒ کے ایک ایک وعظ میں ہزار ہا افراد ان کے ہاتھ پر توبہ کرتے تھے، آج ہم لوگوں نے اول تو تبلیغ و دعوت چھوڑ دی، اور اگر کوئی کرتا بھی ہے تو ایسے طریقے سے کرتا ہے جو لوگوں کو برانگیختہ کرنے کا ہوتا ہے، جس سے صحیح معنی میں فائدہ نہیں پہنچتا، اس لیے یہ تین باتیں یاد رکھنی چاہئیں:

① اول بات حق ہو ② دوسرے نیت حق ہو ③ تیسرے طریقہ حق ہو

لہذا حق بات، حق طریقے سے، حق نیت سے کہی جائے گی تو وہ کبھی نقصان دہ نہیں ہوگی بلکہ اس کا فائدہ ہی پہنچے گا۔ [اصلاحی خطبات، ج ۸، ص ۷ ۳، ۱ ۴]

انبیاء کرام کا انداز دعوت وتبلیغ اور ہمارا طرز عمل

میرے والد ماجد رحمہ اللہ فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالی نے حضرت موسی اور حضرت ہارون علیہما السلام کو فرعون کی اصلاح کے لیے بھیجا اور فرعون کون تھا؟ خدائی کا دعویدار تھا، جو یہ کہتا تھا کہ: ﴿أنا ربكم الأعلى﴾ یعنی میں تمہارا بڑا پروردگار ہوں، گویا کہ وہ فرعون بدترین کافر تھا، لیکن جب یہ دونوں پیغمبر فرعون کے پاس جانے لگے تو اللہ تعالی نے فرمایا: ﴿فقولا له قولا لينا لعله يتذكر أو يخشى﴾

یعنی تم دونوں فرعون کے پاس جا کر نرم بات کہنا، شاید کہ وہ نصیحت مان لے یا ڈر جائے، یہ واقعہ سنانے کے بعد والد ماجد رحمہ اللہ نے فرمایا کہ آج تم حضرت موسی علیہ السلام سے بڑے مصلح نہیں ہو سکتے، اور تمہارا مقابل فرعون سے بڑا گمراہ نہیں ہوسکتا، چاہے وہ کتنا ہی بڑا فاسق و فاجر اور مشرک ہو، اس لیے کہ وہ تو خدائی کا دعویدار تھا، اس کے باوجود حضرت موسی اور حضرت ہارون علیہما السلام سے فرمایا جا رہا ہے کہ جب فرعون کے پاس جاؤ تو ذرا نرمی سے بات کرنا، سختی سے بات مت کرنا، اس کے ذریعہ ہمارے لیے قیامت تک یہ پیغمبرانہ طریقہ کار مقرر فرما دیا کہ جب بھی کسی سے دین کی بات کہیں تو نرمی سے کہیں، سختی سے نہ کہیں۔

ایک مرتبہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم مسجد نبوی میں تشریف فرما تھے اور صحابہ کرام بھی موجود تھے، اتنے میں ایک دیہاتی شخص مسجد نبوی میں داخل ہوا، اور آکر جلدی جلدی اس نے نماز پڑھی اور نماز کے بعد عجیب وغریب دعا کی کہ: اللهم ارحمني ومحمدا ولا ترحم معنا أحدا

اے اللہ! مجھ پر رحم فرما اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم پر رحم فرما اور ہمارے علاوہ کسی پر رحم نہ فرما، جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی یہ دعا سنی تو فرمایا کہ تم نے اللہ کی رحمت کو بہت تنگ اور محدود کر دیا کہ صرف دو آدمی پر رحم فرما، اور کسی پر رحم نہ فرما، حالانکہ اللہ تعالی کی رحمت بہت وسیع ہے، تھوڑی دیر کے بعد اسی دیہاتی نے مسجد کے صحن میں بیٹھ کر پیشاب کر دیا، صحابہ کرام نے جب یہ دیکھا کہ وہ مسجد میں پیشاب میں کر رہا ہے تو جلدی سے اس کی طرف دوڑے اور قریب تھا کہ اس پر ڈانٹ ڈپٹ شروع کر دیتے، اتنے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے

فرمایا: "لا تزرموه" [مسلم ،کتاب الطھارة ، باب وجوب غسل البول]

یعنی اس کا پیشاب بند مت کرو، جو کام کرنا تھا، وہ اس نے کرلیا، اور پورا پیشاب کرنے دو، اس کو مت ڈانٹو، اور فرمایا: إنما بعثتم میسرین ، ولم تبعثوا معسرین

یعنی تمہیں لوگوں کے لیے خیر خواہی کرنے والا اور آسانی کرنے والا بنا کر بھیجا گیا ہے، دشواری کرنے والا بنا کر نہیں بھیجا گیا، لہذا اب جا کر مسجد کو پانی کے ذریعہ صاف کر دو، پھر آپ نے اس کو بلا کر سمجھایا کہ یہ مسجد اللہ کا گھر ہے، اس قسم کے کاموں کے لیے نہیں ہے، لہذا تمہارا یہ عمل درست نہیں، آئندہ ایسا مت کرنا۔

اگر ہمارے سامنے کوئی شخص اس طرح مسجد میں پیشاب کر دے تو شاید ہم لوگ تو اس کی تکہ بوٹی کر دیں، لیکن حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے دیکھا کہ یہ شخص دیہاتی ہے اور ناواقف ہے، لاعلمی اور ناواقفی کی وجہ سے اس نے یہ حرکت کی ہے، لہذا اس کو ڈانٹنے کا یہ موقع نہیں ہے بلکہ نرمی سے سمجھانے کا موقع ہے، چنانچہ آپ نے نرمی سے اس کو سمجھا دیا، انبیاء علیہم السلام کی یہی تعلیم ہے، اگر کوئی مخالف گالی بھی دیتا ہے تو انبیاء علیہم السلام اس کے جواب میں گالی نہیں دیتے، قرآن کریم میں مشرکین کا یہ قول نقل کیا گیا ہے کہ انہوں نے انبیاء علیہم السلام سے مخاطب ہو کر کہا کہ: ﴿إنا لنراك في سفاهة وإنا لنظنك من الكاذبين﴾

یعنی ہم آپ کو دیکھ رہے ہیں کہ آپ بے وقوف ہیں اور ہمارے خیال میں آپ جھوٹے ہیں، آج اگر کوئی شخص کسی عالم یا مقرر یا خطیب کو یہ کہہ دے کہ تم بے وقوف اور جھوٹے ہو، تو جواب میں اس کو یہ کہہ دے گا کہ تو بے وقوف، تیرا باپ بے وقوف، لیکن پیغمبر نے جواب میں فرمایا:

﴿يقوم ليس بي سفاهة ولكني رسول من رب العالمين﴾

اے میری قوم! میں بے وقوف نہیں ہوں، بلکہ میں تو رب العالمین کا پیغمبر ہوں، دیکھیے! گالی کا جواب گالی سے نہیں دیا جا رہا ہے، بلکہ محبت اور پیار کا برتاؤ کیا جا رہا ہے، ایک اور قوم نے اپنے پیغمبر سے کہا:

﴿إنا لنراك في ضلال مبين﴾

تم تو کھلے گمراہ نظر آ رہے ہو، جواب میں وہ پیغمبر فرماتے ہیں، اے میری قوم! میں گمراہ نہیں ہوں، بلکہ میں تو اللہ کا رسول ہوں، یہ پیغمبروں کی اصلاح و دعوت کا طریقہ ہے، لہذا ہماری باتیں جو بے اثر ہو رہی ہیں، اس کی وجہ یہ ہے کہ یا تو بات حق نہیں ہے، یا طریقہ حق نہیں ہے، یا نیت حق نہیں ہے، اور اس کی وجہ سے یہ ساری خرابیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج۸، ص۴۰،۳۷]

اجتماعی تبلیغ فرض کفایہ ہے

اجتماعی تبلیغ فرض عین نہیں ہے، بلکہ فرض کفایہ ہے، لہذا ہر ہر مسلمان پر فرض نہیں ہے کہ دوسروں کے پاس جا کر وعظ کہے، یا دوسروں کے گھر پر جا کر تبلیغ کرے، کیونکہ یہ فرض کفایہ ہے، اور فرض کفایہ

ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اگر کچھ لوگ وہ کام کر رہے ہوں تو باقی لوگوں سے وہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے، اور اگر کوئی شخص بھی انجام نہ دے تو سب گناہ گار ہوں گے، جیسے نماز جنازہ فرض کفایہ ہے، اب ہر شخص کے ذمے ضروری نہیں ہے کہ وہ نماز جنازہ میں شامل ہو، اگر شامل ہوگا تو ثواب ملے گا، اور اگر شامل نہیں ہوگا تو گناہ نہیں ہوگا، جب تک کہ کچھ پڑھنے والے لوگ موجود ہوں، لیکن اگر ایک شخص بھی پڑھنے والا نہیں ہوگا تو اس وقت سب مسلمان گناہ گار ہوں گے، اس کو فرض کفایہ کہا جاتا ہے، اسی طرح یہ اجتماعی دعوت فرض کفایہ ہے، فرض عین نہیں ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۸،ص۱۳۱]

اجتماعی تبلیغ کا حق کس کو ہے ؟

اجتماعی تبلیغ یعنی لوگوں کو جمع کر کے کوئی وعظ کرنا، تقریر کرنا یا ان کو نصیحت کرنا، اس کو اجتماعی دعوت وتبلیغ کہتے ہیں، یہ اجتماعی تبلیغ ودعوت فرض عین نہیں ہے، بلکہ فرض کفایہ ہے، لہذا اگر کچھ لوگ اس فریضہ کی ادائیگی کے لیے کام کریں تو باقی لوگوں سے یہ فریضہ ساقط ہو جاتا ہے، لیکن یہ اجتماعی تبلیغ کرنا ہر آدمی کا کام نہیں ہے کہ جس کا دل چاہے کھڑا ہو جائے اور وعظ کرنا شروع کر دے، بلکہ اس کے لیے مطلوب علم کی ضرورت ہے، اگر اتنا علم نہیں ہے تو اس صورت میں اجتماعی تبلیغ کا انسان مکلف نہیں ہے، اور کم از کم اتنا علم ہونا ضروری ہے جس کے نتیجے میں وعظ کے دوران غلط بات کہنے کا اندیشہ نہ ہو، تب وعظ کہنے کی اجازت ہے، ورنہ اجازت نہیں، یہ وعظ وتبلیغ کا معاملہ بڑا نازک ہے، جب آدمی یہ دیکھتا ہے کہ اتنے سارے لوگ بیٹھ کر میری باتیں سن رہے ہیں تو خود اس کے دماغ میں بڑائی آجاتی ہے، اب خود ہی تقریر اور وعظ کے ذریعہ لوگوں کو دھوکہ دیتا ہے، اس کے نتیجے میں لوگ اس دھوکہ میں آجاتے ہیں کہ یہ شخص علم جاننے والا ہے اور بڑا نیک آدمی ہے، اور جب لوگ دھوکے میں آگئے، اب خود بھی دھوکہ میں آگیا کہ اتنی ساری مخلوق، اتنے سارے لوگ مجھے عالم کہہ رہے ہیں، اور مجھے اچھا اور نیک کہہ رہے ہیں، تو ضرور میں کچھ ہوں گا، تبھی تو یہ ایسا کہہ رہے ہیں، ورنہ یہ سارے لوگ پاگل تو نہیں ہیں، بہر حال! وعظ اور تقریر کے نتیجے میں آدمی اس فتنہ میں مبتلا ہو جاتا ہے۔

اس لیے ہر شخص کو تقریر اور وعظ نہیں کرنا چاہیے، ہاں! اگر وعظ کہنے کے لیے کوئی بڑا کسی جگہ بٹھادے تو اس وقت بڑوں کی سرپرستی میں اگر کام کرے، اور اللہ تعالی سے مدد بھی مانگتا رہے تو پھر اللہ تعالی اس فتنے سے محفوظ رکھتے ہیں۔

وعظ اور تقریر پھر بھی ذرا ہلکی بات ہے، لیکن اب تو درس قرآن اور درس حدیث دینے تک نوبت پہنچ گئی ہے، جس کے دل میں بھی درس قرآن دینے کا خیال آیا، بس اس نے درس قرآن دینا شروع کر دیا، حالانکہ قرآن کریم وہ چیز ہے جس کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

من قال فی القرآن بغیر علم فلیتبوأ مقعده من النار

جو شخص قرآن کریم کی تفسیر میں علم کے بغیر کوئی بات کہے تو وہ شخص اپنا ٹھکانہ جہنم بنالے، ایک دوسری حدیث میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: من قال فی کتاب الله عز وجل برأیه فأصاب فقد أخطأ

[ابو داود، کتاب العلم، باب الکلام فی کتاب اللہ بغیر علم]

جو شخص اللہ جل شانہ کی کتاب میں اپنی رائے سے کرے، اگر صحیح بھی کرے تو بھی اس نے غلط کام کیا، اتنی سنگین وعید حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمائی ہے، اس کے باوجود آج یہ حال ہے کہ اگر کسی شخص کو کتابوں کے مطالعے کے ذریعے دین کی کچھ باتیں معلوم ہو گئیں تو اب وہ عالم بن گیا اور اس نے درس قرآن دینا شروع کر دیا، حالانکہ یہ درس قرآن اور درس حدیث ایسا عمل ہے کہ بڑے بڑے علماء اس سے تھراتے ہیں کہ چہ جائیکہ عام آدمی قرآن کریم کا درس دے اور اس کی تفسیر بیان کرے۔ [اصلاحی خطبات، ج۸، ص۱۴۱]

کیا بے عمل شخص وعظ ونصیحت کرنے کا حق نہیں رکھتا ؟

ایک یہ بات مشہور ہے کہ اگر کوئی شخص خود کسی غلطی کے اندر مبتلا ہے تو اس کو یہ حق نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو اس غلطی سے روکے، مثلاً ایک شخص نماز باجماعت کا پوری طرح پابند نہیں ہے، تو یہ کہا جاتا ہے کہ ایسا شخص دوسروں کو بھی نماز باجماعت کی تلقین نہ کرے، جب تک کہ خود نماز باجماعت کا پابند نہ ہو جائے، یہ بات درست نہیں، بلکہ حقیقت میں بات الٹی ہے، وہ یہ کہ جو شخص دوسروں کو نماز باجماعت کی تلقین کرتا ہے اس کو چاہیے کہ وہ خود بھی نماز باجماعت کی پابندی کرے، نہ یہ کہ جو شخص نماز باجماعت کا پابند نہیں ہے کہ وہ دوسروں کو تلقین نہ کرے، عام طور پر لوگوں میں یہ آیت مشہور ہے کہ:

﴿یا أیها الذین أمنوا لم تقولون ما لا تفعلون﴾

یعنی اے ایمان والو! وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں ہو، بعض لوگ اس آیت کا مطلب یہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی شخص کوئی کام نہیں کرتا تو وہ شخص دوسروں کو بھی اس کی تلقین نہ کرے، مثلاً ایک شخص صدقہ نہیں دیتا تو وہ دوسروں کو بھی صدقہ کی تلقین نہ کرے، یا مثلاً ایک شخص سچ نہیں بولتا تو وہ دوسروں کو بھی سچ بولنے کی تلقین نہ کرے، آیت کا یہ مطلب لینا درست نہیں، بلکہ اس آیت کا مطلب یہ ہے کہ جو بات اور جو چیز تمہارے اندر موجود نہیں ہے، تو اس کا دعوی مت کرو کہ یہ بات میرے اندر موجود ہے، مثلاً اگر تم نماز با جماعت کے پابند نہیں ہو تو دوسروں سے یہ مت کہو کہ میں نماز باجماعت کا پابند ہوں، یا تم اگر نیک اور متقی نہیں ہو تو دوسروں کے سامنے یہ دعوی مت کرو کہ میں نیک اور متقی ہوں، یا مثلاً تم نے حج نہیں کیا، تو یہ مت کہو کہ میں نے حج کر لیا ہے، اس آیت کا یہ معنی ہیں، یعنی جو کام تم کرتے نہیں ہو، دوسروں کے سامنے اس کا دعوی کیوں کرتے ہو؟ آیت کے یہ معنی نہیں ہیں کہ جو کام تم نہیں کرتے تو دوسروں سے اس کی تلقین بھی مت کرو، اس لیے کہ بعض اوقات دوسروں کو کہنے سے انسان کو خود فائدہ ہو جاتا ہے، جب انسان دوسروں کو کہتا ہے اور خود عمل

نہیں کرتا تو انسان کو شرم آتی ہے، اور اس شرم کی وجہ سے انسان خود بھی عمل کرنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔

البتہ یہ بات ضرور ہے کہ ایک شخص وہ ہے جو خود تو عمل نہیں کرتا، لیکن دوسروں کو نصیحت کرتا ہے، اور ایک آدمی وہ ہے جو خود بھی عمل کرتا ہے، اور دوسروں کو بھی اس کی نصیحت کرتا ہے، دونوں کی نصیحت کی تاثیر میں فرق ہے، جو شخص عمل کر کے نصیحت کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کی بات میں اثر پیدا فرما دیتے ہیں، وہ بات دلوں میں اتر جاتی ہے، اس سے انسانوں کی زندگیوں میں انقلاب آتا ہے، اور بے عملی کے ساتھ جو نصیحت کی جاتی ہے، اس کا اثر سننے والوں پر بھی کما حقہ نہیں ہوتا، زبان سے بات نکلتی ہے، اور کانوں سے ٹکرا کر واپس آجاتی ہے، دلوں میں نہیں اترتی، لہٰذا عمل کی کوشش ضرور کرنی چاہیے، مگر یہ چیز نصیحت کی بات کہنے سے مانع نہیں ہونی چاہیے۔ [اصلاحی خطبات، ج۸، ص۴۵]

مستحب کے ترک پر نکیر درست نہیں

بہر حال! اگر کوئی شخص فرائض اور واجبات میں کوتاہی کر رہا ہو، یا کسی واضح گناہ میں مبتلا ہو تو اس کو تبلیغ کرنا اور امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کرنا فرض ہے، جس کی تفصیل اوپر عرض کر دی، شریعت کے بعض احکام ایسے ہیں جو فرض و واجب نہیں ہیں، بلکہ مستحب ہیں، مستحب کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی اس کو کرے گا تو ثواب ملے گا، نہیں کرے گا تو کوئی گناہ نہیں، یا شریعت کے آداب ہیں جو علماء کرام بتاتے ہیں، ان مستحبات اور آداب کے بارے میں حکم یہ ہے کہ لوگوں کو ان کی ترغیب تو دی جائے گی کہ اس طرح کر لو تو اچھی بات ہے، لیکن اس کے نہ کرنے پر نکیر نہیں کی جائے گی، اگر کوئی شخص اس مستحب کو انجام نہیں دے رہا ہے تو آپ کے لیے اس کو طعنہ دینے یا ملامت کرنے کا کوئی جواز نہیں کہ تم نے یہ کام کیوں نہیں کیا؟ ہاں! اگر کوئی تمہارا شاگرد ہے، یا بیٹا ہے، یا تمہارے زیر تربیت ہے، مثلاً تمہارا مرید ہے، تو بے شک اس کو کہہ دینا چاہیے کہ فلاں وقت میں تم نے فلاں مستحب عمل چھوڑ دیا تھا، یا فلاں ادب کا لحاظ نہیں کیا تھا، اس کو کرنا چاہیے، لیکن اگر ایک عام آدمی کوئی مستحب عمل چھوڑ رہا ہے تو اس صورت میں آپ کو اس پر اعتراض کرنے کا کوئی حق نہیں، بعض لوگ تو مستحبات کو واجبات کا درجہ دے کر لوگوں پر اعتراض شروع کر دیتے ہیں کہ تم نے یہ کام کیوں چھوڑا؟ حالانکہ قیامت کے روز اللہ تعالیٰ یہ نہیں پوچھیں گے کہ تم نے فلاں مستحب کام کیوں نہیں کیا تھا؟ نہ فرشتے سوال کریں گے، لیکن تم خدائی فوج دار بن کر اعتراض کر دیتے ہو کہ یہ مستحب کام تم نے کیوں چھوڑ دیا؟ یہ عمل کسی طرح بھی درست نہیں۔

مثلاً اذان کے بعد دعا پڑھنا مستحب ہے، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس دعا کی ترغیب ہے کہ ہر مسلمان کو اذان کے بعد یہ دعا پڑھنی چاہیے، یہ بڑی برکت کی دعا ہے، اس لیے اپنے بچوں کو اور اپنے گھر والوں کو اس کی تعلیم دینی چاہیے کہ یہ دعا پڑھا کریں، اسی طرح دوسرے مسلمانوں کو بھی اس دعا کے

پڑھنے کی ترغیب دینی چاہیے، لیکن اگر ایک شخص نے اذان کے بعد یہ دعا نہیں پڑھی، اب آپ اس پر اعتراض شروع کردیں کہ تم نے یہ دعا کیوں نہیں پڑھی؟ اور اس پر نکیر شروع کردیں یہ درست نہیں، اس لیے کہ نکیر ہمیشہ فرض کے چھوڑنے پر یا گناہ کے ارتکاب پر کی جاتی ہے، مستحب کام کے ترک پر کوئی نکیر نہیں ہوسکتی۔

[اصلاحی خطبات، ج۸،ص۴۷]

آداب کے ترک پر نکیر جائز نہیں

بعض اعمال ایسے ہیں جو شرعی اعتبار سے مستحب بھی نہیں ہیں، اور قرآن وحدیث میں ان کو مستحب قرار نہیں دیا گیا، البتہ بعض علما نے اس کو آداب میں شمار کیا ہے، مثلاً بعض علما نے یہ ادب بتایا ہے کہ جب کھانا کھانے کے لیے ہاتھ دھوئے جائیں تو ان کو تولیہ یا رومال وغیرہ سے پونچھا نہ جائے، اسی طرح یہ ادب بتایا کہ دسترخوان پر پہلے تم بیٹھ جاؤ، کھانا بعد میں رکھا جائے، اگر کھانا پہلے لگا دیا گیا، تم بعد میں پہنچے تو یہ کھانے کے ادب کے خلاف ہے، قرآن وحدیث میں یہ آداب کہیں بھی موجود نہیں ہیں، لیکن علما کرام نے یہ کھانے کے آداب بتائے، ان کو مستحب کہنا بھی مشکل ہے، اب اگر ایک شخص نے ان آداب کا لحاظ نہ کیا، مثلاً اس نے کھانے کے لیے ہاتھ دھوکر تولیہ سے پونچھ لیے، یا دسترخوان پر کھانا پہلے لگا دیا گیا اور وہ شخص بعد میں جا کر بیٹھا تو اب اس شخص پر اعتراض کرنا اور اس کو یہ کہنا کہ تم نے شریعت کے خلاف یا سنت کے خلاف کام کیا، یہ بات درست نہیں، اس لیے کہ یہ آداب نہ تو شرعاً سنت ہیں اور نہ مستحب ہیں، اس لیے ان آداب کے ترک کرنے والے پر اعتراض اور نکیر کرنا درست نہیں، ان معاملات کے اندر ہمارے معاشرے میں بہت افراط اور تفریط پائی جاتی ہے اور بعض اوقات چھوٹی چھوٹی بات پر بڑی نکیر کی جاتی ہے جو کسی طرح بھی درست نہیں۔

[اصلاحی خطبات، ج۸،ص۴۹]

خور و نوش

چار زانوں بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے

کھانے کے وقت چارزانوں ہوکر بیٹھنا بھی جائز ہے، ناجائز نہیں، اس میں کوئی گناہ نہیں، لیکن یہ نشست تواضع کے اتنے قریب نہیں ہے، جتنی دوزانوں بیٹھ کر کھانے یا ایک ٹانگ کھڑی کر کے کھانے کی نشست تواضع کے قریب ہے، لہذا اعادت تو اس بات کی ڈالنی چاہیے کہ آدمی دوزانوں بیٹھ کر کھائے، یا ایک ٹانگ کھڑی کر کے کھائے، چارزانوں نہ بیٹھے، لیکن اگر کسی سے اس طرح نہیں بیٹھا جاتا، یا کوئی شخص اپنے آرام کے لیے چارزانوں بیٹھ کر کھانا کھاتا ہے تو یہ کوئی گناہ نہیں، یہ جو لوگوں میں مشہور ہے کہ چارزانوں بیٹھ کر کھانا ناجائز ہے، یہ خیال درست نہیں، لہذا جب چارزانوں بیٹھ کر کھانا جائز ہے تو اسی طرح بیٹھ کر کھانے والے پر نکیر کرنا بھی درست نہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج۸، ص۴۹]

میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا ناجائز نہیں

میز کرسی پر کھانا بھی گناہ اور ناجائز نہیں، لیکن زمین پر بیٹھ کر کھانے میں سنت کی اتباع کا ثواب بھی ہے اور سنت سے زیادہ قریب بھی ہے، اس لیے حتی الامکان انسان کو اس بات کی کوشش کرنی چاہیے کہ وہ زمین پر بیٹھ کر کھانا کھائے، اس لیے کہ جتنا سنت سے زیادہ قریب ہوگا اتنی ہی برکت زیادہ ہوگی، اور اتنا ہی ثواب زیادہ ملے گا، اتنے ہی فوائد زیادہ حاصل ہوں گے، بہرحال! میز کرسی پر بیٹھ کر کھانا بھی جائز ہے، گناہ نہیں ہے، لہذا میز کرسی پر بیٹھ کر کھانے والے پر نکیر کرنا درست نہیں ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۸، ص۵۰]

کیا انگلیاں چاٹ لینا شائستگی کے خلاف ہے؟

آج فیشن پرستی کا زمانہ ہے، لوگوں نے اپنے لیے نئے نئے ایٹیکیٹ بنا رکھے ہیں، چنانچہ اگر دستر خوان پر سب کے ساتھ کھانا کھا رہے ہیں، اس وقت اگر انگلیوں پر لگے ہوئے سالن کو چاٹ لیں تو یہ شائستگی کے خلاف ہے، تہذیب کے خلاف ہے، یہ تو ناشائستگی اور بدتہذیبی ہے، اس لیے اس کام کو کرتے ہوئے شرم

آتی ہے، اگر لوگوں کے سامنے کریں گے تو لوگ ہنسی مذاق اڑائیں گے اور کہیں گے کہ یہ شخص غیر مہذب ہے اور ناشائستہ ہے۔

لیکن یاد رکھو! ساری تہذیب اور ساری شائستگی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی سنتوں میں منحصر ہے، جس چیز کو آپ نے شائستگی قرار دے دیا وہ ہے شائستگی! یہ نہیں ہے کہ جس چیز کو فیشن نے شائستگی قرار دے دیا وہ شائستگی ہو، اس لیے کہ یہ فیشن تو روز بدلتے ہیں، کل تک جو چیز ناشائستہ تھی، آج وہ چیز شائستہ بن گئی، مثلاً کھڑے ہو کر کھانا آج کل فیشن بن گیا ہے، ایک ہاتھ میں پلیٹ پکڑی ہے، دوسرے سے کھانا کھا رہے ہیں، اسی پلیٹ میں سالن بھی ہے، اسی میں روٹی بھی ہے، اسی میں سلاد ہے اور جس وقت دعوت میں کھانا شروع ہوتا ہے اس وقت چھینا جھپٹی ہوتی ہے، اس میں کسی کو بھی ناشائستگی نظر نہیں آتی؟ اس لیے کہ فیشن نے آنکھیں اندھی کر دی ہیں، اس کے نتیجے میں ان کے اندر ناشائستگی نظر نہیں آتی، چنانچہ جب تک کھڑے ہو کر کھانے کا فیشن اور رواج نہیں چلا تھا، اس وقت اگر کوئی شخص کھڑے ہو کر کھانا کھاتا تو ساری دنیا اس کو یہی کہتی کہ یہ غیر مہذب اور بڑا ناشائستہ طریقہ ہے، صحیح طریقہ تو یہ ہے کہ آدمی آرام سے بیٹھ کر کھائے۔

لہٰذا فیشن کی بنیاد پر تو تہذیب اور شائستگی روز بدلتی ہے اور بدلنے والی چیز کا کوئی بھروسہ اور کوئی اعتبار نہیں، اعتبار اس چیز کا ہے جس کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سنت قرار دے دیا اور جس کے بارے میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے بتا دیا کہ برکت اس میں ہے، اب اگر حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کی نیت سے یہ کام کر لو گے تو آخرت میں بھی اجر و ثواب اور دنیا میں بھی برکت حاصل ہوگی اور اگر (معاذ اللہ) ناشائستہ سمجھ کر اس کو چھوڑ دو گے تو پھر تم اس کی برکتوں سے بھی محروم ہو جاؤ گے۔ [اصلاحی خطبات، ج۵،ص۱۹۷]

کھڑے ہو کر پانی پینا ناجائز نہیں

یہ بات بھی سمجھ لیں کہ جب حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے کسی چیز سے منع فرمایا، جبکہ وہ چیز حرام اور گناہ بھی نہیں ہے، تو ایسے موقع پر آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو بتانے کے لیے کبھی کبھار خود بھی وہ عمل کر کے دکھا دیا، تاکہ لوگوں کو معلوم ہو جائے کہ یہ عمل گناہ اور حرام نہیں، چنانچہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم سے کئی مرتبہ کھڑے ہو کر پانی پینا بھی ثابت ہے، ابھی میں نے آپ کو حضرت کبشہؓ کے مشکیزے سے پانی پینے کا واقعہ سنایا، وہ مشکیزہ دیوار کے ساتھ لٹکا ہوا تھا اور آپ نے کھڑے ہو کر منہ لگا کر اس سے پانی پیا، اسی وجہ سے علماء نے فرمایا کہ اگر کوئی جگہ ایسی ہے جہاں بیٹھنے کی گنجائش نہیں ہے، ایسے موقع پر اگر کوئی شخص کھڑے ہو کر پانی پی لے تو کوئی مضائقہ نہیں، بلا کراہت جائز ہے، اور بعض اوقات آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے صرف یہ بتانے کے لیے کھڑے ہو کر پانی پیا کہ کھڑے ہو کر پانی پینا بھی جائز ہے، چنانچہ حضرات نزال بن سبرۃؒ فرماتے ہیں کہ ایک مرتبہ

حضرت علیؓ ''باب الرحبہ'' میں تشریف لائے، باب الرحبہ کوفہ کے اندر ایک جگہ کا نام ہے، وہاں پر کھڑے ہوکر آپ نے پانی پیا اور فرمایا کہ: إني رأيت رسول الله ﷺ فعل كما رأيتموني فعلت

[صحیح بخاری، کتاب الاشربۃ، باب الشرب قائما]

یعنی میں نے حضور اقدس ﷺ کو اسی طرح کرتے ہوئے دیکھا جس طرح تم نے مجھے دیکھا کہ میں کھڑے ہوکر پانی پی رہا ہوں، بہر حال! کبھی کبھار حضور اقدس ﷺ نے کھڑے ہوکر پانی پی کر یہ بتا دیا کہ یہ عمل گناہ نہیں۔

لیکن اپنی امت کو جس کی تعلیم دی اور جس کی تاکید فرمائی اور جس پر ساری عمر عمل فرمایا وہ یہ تھا کہ حتی الامکان بیٹھ کر ہی پانی پیتے تھے، اس لیے یہ بیٹھ کر پانی پینا حضور اقدس ﷺ کی اہم سنتوں میں سے ہے اور جو شخص اس کا جتنا اہتمام کرے گا، ان شاء اللہ اس پر اس کو اجر وثواب اور اس کی فضیلت اور برکات حاصل ہوں گی، اس لیے خود بھی اس کا اہتمام کرنا چاہیے اور دوسروں سے بھی اس کا اہتمام کرانا چاہیے، اپنے گھر والوں کو بتانا چاہیے، اپنے بچوں کو اس کی تعلیم دینی چاہیے اور بچوں کے دل میں یہ بات بٹھانی چاہیے کہ جب بھی پانی پیو تو بیٹھ کر پیو، اگر انسان اس کی عادت ڈال لے تو مفت کا ثواب حاصل ہو جائے گا، اس لیے کہ اس عمل میں کوئی خاص محنت اور مشقت ہے نہیں، اب اگر آپ پانی کھڑے ہوکر پینے کے بجائے بیٹھ کر پی لیں تو اس میں کیا حرج اور کیا مشقت لازم آجائے گی؟ لیکن جب سنت کی اتباع کی نیت کر کے پانی بیٹھ کر پی لیا تو اتباع سنت کا عظیم اجر وثواب حاصل ہو جائے گا۔

[اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۲۳۴]

زمزم کا پانی کس طرح پیا جائے ؟

عن ابن عباس رضی الله عنهما قال : سقيت النبي ﷺ من زمزم فشرب وهو قائم [صحیح بخاری، کتاب الاشربہ]

حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ عنہما فرماتے ہیں کہ میں نے حضور اقدس ﷺ کو زمزم کا پانی پلایا تو آپ نے کھڑے ہوکر وہ زمزم پیا، اس حدیث کی وجہ سے بعض علما کا خیال یہ ہے کہ زمزم کا پانی بیٹھ کر پینے کے بجائے کھڑے ہوکر پینا افضل اور بہتر ہے، چنانچہ یہ بات مشہور ہے کہ دو پانی ایسے ہیں جو کھڑے ہوکر پینے چاہئیں، ایک زمزم کا پانی اور ایک وضو کا بچا ہوا پانی، اس لیے کہ وضو سے بچا ہوا پانی پینا بھی مستحب ہے، لیکن دوسرے علما یہ فرماتے ہیں کہ افضل یہ ہے کہ یہ دونوں پانی بھی بیٹھ کر پینے چاہئیں، جہاں تک حضرت عبد اللہ بن عباسؓ کی اس حدیث کا تعلق ہے کہ اس میں حضور اقدس ﷺ نے زمزم کا پانی کھڑے ہوکر پیا، اس

کی وجہ یہ تھی کہ ایک طرف تو زمزم کا کنواں اور دوسرے اس پر لوگوں کا ہجوم اور پھر کنویں کے چاروں طرف کیچڑ، قریب میں کہیں بیٹھنے کی جگہ بھی نہیں تھی، اس لیے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے کھڑے ہوکر پانی پی لیا، لہٰذا اس حدیث سے یہ لازم نہیں آتا کہ زمزم کا پانی کھڑے ہوکر پینا افضل ہے۔

میرے والد ماجد حضرت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب رحمہ اللہ کی تحقیق یہی تھی کہ زمزم کا پانی بیٹھ کر پینا ہی افضل ہے، اسی طرح وضو کا بچا ہوا پانی بھی بیٹھ کر پینا افضل ہے، البتہ عذر کے مواقع پر جس طرح عام پانی کھڑے ہوکر پینا جائز ہے اسی طرح زمزم اور وضو سے بچا ہوا پانی بھی کھڑے ہوکر پینا جائز ہے۔

عام طور پر لوگ یہ کرتے ہیں کہ اچھے خاصے بیٹھے ہوئے تھے، لیکن جب زمزم کا پانی دیا گیا تو ایک دم سے کھڑے ہوگئے اور کھڑے ہوکر اس کو پیا، اتنا اہتمام کر کے کھڑے ہوکر پینے کی ضرورت نہیں، بلکہ بیٹھ کر پینا چاہیے وہی افضل ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۵، ص ۲۳۷]

فتنہ

"فتنہ" کا معنی اور مفہوم کیا ہے ؟

اب اس کو سمجھنا چاہیے کہ فتنہ کیا چیز ہے؟ کس کو فتنہ کہتے ہیں؟ اور اس فتنہ کے دور میں ہمارے اور آپ کے لیے حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم کیا ہے؟ اور اس میں ہمیں کیا کرنا چاہیے؟ اب یہ لفظ تو ہم صبح وشام استعمال کرتے ہیں کہ یہ بڑے فتنے کا دور ہے، قرآن کریم میں بھی فتنہ کا لفظ کئی بار آیا ہے، ایک جگہ فرمایا:

﴿والفتنة أشد من القتل﴾

یعنی اللہ کے نزدیک فتنہ قتل سے بھی زیادہ شدید چیز ہے۔

☆ فتنہ عربی زبان کا لفظ ہے، لغت میں اس کے معنی ہیں سونے یا چاندی وغیرہ کو آگ پر پگھلا کر اس کا کھرا کھوٹا معلوم کرنا، آگ میں تپا کر اس کی حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ یہ خالص ہے یا نہیں؟ اسی وجہ سے اس لفظ کو آزمائش اور امتحان کے معنی میں بھی استعمال کیا جانے لگا۔

☆ چنانچہ فتنہ کے دوسرے معنی ہوئے آزمائش، لہٰذا جب انسان پر کوئی تکلیف یا مصیبت یا پریشانی آئے اور اس کے نتیجے میں انسان کی اندرونی کیفیت کی آزمائش ہوجائے کہ وہ انسان ایسی حالت میں کیا طرزِ عمل اختیار کرتا ہے؟ آیا اس وقت صبر کرتا ہے یا واویلا کرتا ہے، فرمانبردار رہتا ہے یا نافرمان ہوجاتا ہے، اس آزمائش کو بھی فتنہ کہا جاتا ہے۔

☆ حدیث شریف میں فتنہ کا لفظ جس چیز کے لیے استعمال ہوا ہے وہ یہ ہے کہ کسی بھی وقت کوئی ایسی صورت حال پیدا ہوجائے جس میں حق مشتبہ ہوجائے اور حق و باطل میں امتیاز کرنا مشکل ہوجائے، صحیح اور غلط میں امتیاز باقی نہ رہے، یہ پتہ نہ چلے کہ سچ کیا ہے اور جھوٹ کیا ہے؟ جب یہ صورت حال پیدا ہوجائے تو یہ کہا جائے گا کہ یہ فتنے کا دور ہے۔

☆ اسی طرح معاشرے کے اندر گناہ، فسق و فجور، نافرمانیاں عام ہوجائیں تو اسکو بھی فتنہ کہا جاتا ہے۔

☆ اسی طرح جو چیز حق نہ ہو اس کو حق سمجھنا اور جو چیز دلیل ثبوت نہ ہو اس کو دلیل ثبوت سمجھ لینا بھی

ایک فتنہ ہے، جیسے آج کل صورت حال ہے کہ اگر کسی سے دین کی بات کہو کہ فلاں کام گناہ ہے، ناجائز ہے، بدعت ہے جواب میں وہ شخص کہتا ہے کہ ارے! یہ کام تو سب کررہے ہیں، اگر یہ کام گناہ اور ناجائز ہے تو پھر ساری دنیا یہ کام کیوں کررہی ہے؟ یہ کام تو سعودی عرب میں بھی ہورہا ہے، آج کے دور میں یہ ایک نئی مستقل دلیل ایجاد ہوچکی ہے کہ ہم نے یہ سعودی عرب میں ہوتے ہوئے دیکھا ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ جو کام سعودی عرب میں ہوتا ہو وہ یقینی طور پر حق اور درست ہے، یہ بھی ایک فتنہ ہے کہ جو چیز حق کی دلیل نہیں تھی اس کو دلیل سمجھ لیا گیا ہے۔

☆اسی طرح شہر کے اندر بہت ساری جماعتیں کھڑی ہوگئیں، اور یہ پتہ نہیں چل رہا ہے کہ کون حق پر ہے اور کون باطل پر ہے؟ کون صحیح کہہ رہا ہے اور کون غلط کہہ رہا ہے؟ اور حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنا مشکل ہوگیا، یہ بھی فتنہ ہے۔

☆اسی طرح جب دو مسلمان یا مسلمانوں کی دو جماعتیں آپس میں لڑ پڑیں اور ایک دوسرے کے خلاف برسر پیکار آجائیں، اور ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہوجائیں اور یہ پتہ چلانا مشکل ہوجائے کہ حق پر کون ہے اور باطل پر کون ہے؟ تو یہ بھی ایک فتنہ ہے، ایک حدیث شریف میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا: إذا التقا المسلمان بسیفیهما فالقاتل و المقتول کلاهما فی النار

جب دو مسلمان تلواریں لے کر آپس میں لڑنے لگیں تو قاتل اور مقتول دونوں جہنم میں جائیں گے۔

☆ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

إن من ورائکم أیاما یرفع فیها العلم و یکثر فیها الحرج ، قالوا یا رسول الله ! ما الحرج ؟قال القتل

یعنی لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا جس میں "حرج" بہت زیادہ ہوجائے گا، صحابہ کرام نے پوچھا کہ یہ حرج کیا چیز ہے؟ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ قتل وغارت گری، یعنی اس زمانے میں قتل وغارت گری بے حد ہوجائے گی اور انسان کی جان مچھر مکھی سے زیادہ بے حقیقت ہوجائے گی۔

ایک اور حدیث میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

یأتی علی الناس یوم لا یدری القاتل فیم قتل ؟ولا المقتول فیم قتل ؟فقیل کیف یکون ذلك؟قال الهرج ،القاتل و المقتول فی النار

یعنی لوگوں پر ایک ایسا زمانہ آئے گا کہ جس میں قاتل کو یہ معلوم نہیں ہوگا کہ میں نے کیوں قتل کیا اور مقتول کو یہ پتہ نہیں ہوگا کہ میں کیوں قتل کیا گیا؟ آج کے اس پرفتن دور میں موجودہ حالات پر نظر ڈال لو اور حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ان ارشادات گرامی کو دیکھ کر ایسا لگتا ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اس زمانے کو دیکھ کر یہ ارشاد فرمائے تھے، پہلے زمانے میں تو یہ ہوتا تھا کہ یہ معلوم نہیں ہوتا تھا کہ کس نے مارا، لیکن یہ معلوم

ہوجاتا تھا کہ یہ شخص کیوں مارا گیا؟ مثلاً مال چھیننے کی وجہ سے مارا گیا، ڈاکوؤں نے ماردیا، دشمنی کی وجہ سے ماردیا گیا، مارے جانے کے اسباب سامنے آجاتے تھے، لیکن آج یہ حال ہے کہ ایک شخص ہے، کسی سے نہ کچھ لینا نہ دینا، نہ کسی سیاسی جماعت سے تعلق، نہ کسی سے کوئی جھگڑا، بس بیٹھے بٹھائے مارا گیا، یہ ساری باتیں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صاف صاف بتائے گے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۲۳۲]

فتنوں کے دور میں کیا کرنا چاہیے؟

فتنوں کے دور کے لیے پہلا حکم

ایسی صورت میں ایک مسلمان کو کیا طرز عمل اختیار کرنا چاہیے؟ اس کے بارے میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے پہلا حکم دیا کہ: "تلزم جماعة المسلمين وإمامهم"

پہلا کام یہ کرو کہ جمہور مسلمان اور ان کے امام کے ساتھ ہوجاؤ، اور جو لوگ بغاوت کررہے ہیں ان سے کنارہ کشی اختیار کرلو اور ان کو چھوڑ دو، ایک صحابی نے سوال کیا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! اگر مسلمانوں کی اکثریت والی جماعت اور امام نہ ہو تو پھر آدمی کیا کرے؟ یعنی آپ نے جو حکم دیا وہ تو اس وقت ہے جب مسلمانوں کی متفقہ جماعت موجود ہو، ان کا ایک سربراہ ہو جس پر سب متفق ہوں اور اس امام کی دیانت اور تقوی پر اعتماد ہو، تب تو اس کے ساتھ چلیں گے، لیکن اگر نہ جماعت ہو اور نہ متفقہ امام ہو تو اس صورت میں ہم کیا کریں؟ جواب میں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ایسی صورت میں ہر جماعت اور ہر پارٹی سے الگ ہوکر زندگی گذارو اور اپنے گھروں کے ٹاٹ بن جاؤ، ٹاٹ جس سے بوریاں بنتی ہیں، پہلے زمانے میں اس کو بطور فرش کے بچھایا جاتا تھا، آج کل اس کی جگہ قالین بچھائے جاتے ہیں، مقصد یہ ہے کہ جس طرح گھر کا قالین اور فرش ہوتا ہے، جب ایک مرتبہ اس کو بچھادیا تو اب بار بار اس کو اس کی جگہ سے نہیں اٹھاتے، اسی طرح تم بھی اپنے گھروں کے ٹاٹ اور فرش بن جاؤ، اور بلاضرورت گھر سے باہر نہ نکلو اور ان جماعتوں کے ساتھ شمولیت اختیار مت کرو، بلکہ ان سے کنارہ کش ہوجاؤ اور الگ الگ ہوجاؤ، کسی کا ساتھ مت دو، اس سے زیادہ واضح بات اور کیا ہوسکتی ہے۔

فتنوں کے دور کے لیے دوسرا حکم

ایک حدیث میں فرمایا کہ جس وقت تم لوگوں سے کنارہ کش ہوکر زندگی گذار رہے ہو، اس وقت اگر مسلمان آپس میں لڑ رہے ہوں اور ان کے درمیان قتل وغارت گری ہو رہی ہو تو ان کو تماشہ کے طور پر بھی مت دیکھو، اس لیے کہ جو شخص تماشہ کے طور پر ان فتنوں کی طرف جھانک کر دیکھے گا وہ فتنہ اس کو بھی اپنی طرف کھینچ لے گا اور اچک لے گا: "من استشرف لها استشرفته"

اس لیے ایسے وقت میں تماشہ دیکھنے کے لیے بھی گھر سے باہر نہ نکلو اور اپنے گھر میں بیٹھے رہو۔

فتنوں کے دور کے لیے تیسرا حکم

ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے فرمایا کہ وہ فتنے ایسے ہوں گے کہ اس میں:

"القائم فیھا خیر من الماشی والقاعد فیھا خیر من القائم"

کھڑا ہونے والا چلنے والے سے بہتر ہوگا، اور بیٹھنے والا کھڑے ہونے والے سے بہتر ہو، مطلب یہ ہے کہ اس فتنے کے اندر کسی قسم کا حصہ مت لو، اس فتنے کی طرف چلنا بھی خطرناک ہے، اس سے بہتر یہ ہے کہ بیٹھ جاؤ اور بیٹھنا بھی خطرناک ہے، اس سے بہتر یہ ہے کہ لیٹ جاؤ، گویا کہ اپنے گھر میں بیٹھ کر، اپنی ذاتی زندگی کو درست کرنے کی فکر کرو، اور گھر سے باہر نکل کر اجتماعی مصیبت اور اجتماعی فتنے کو دعوت مت دو۔

فتنوں کے دور کے لیے چوتھا حکم

ایک اور حدیث میں حضور اقدس ﷺ نے ارشاد فرمایا کہ ایک زمانہ ایسا آئے گا کہ اس میں آدمی کا سب سے بہتر مال اس کی بکریاں ہوں گی، جس کو وہ لے کر پہاڑ کی چوٹی پر چلا جائے اور شہروں کی زندگی چھوڑ دے، اور ان بکریوں پر اکتفا کر کے اپنی زندگی بسر کرے، ایسا شخص سب سے زیادہ محفوظ ہوگا، کیونکہ شہروں میں اس کو ظاہری اور باطنی فتنے اچکنے کے لیے تیار ہوں گے۔

ان تمام احادیث کے ذریعہ حضور اقدس ﷺ یہ بتلانا چاہتے ہیں کہ وہ وقت اجتماعی اور جماعتی کام کا نہیں ہوگا، کیونکہ جماعتیں سب کی سب غیر معتبر ہوں گی، کسی بھی جماعت پر بھروسہ کرنا مشکل ہوگا، حق اور باطل کا پتہ نہیں چلے گا، اس لیے ایسے وقت میں اپنی ذات کو ان فتنوں سے بچا کر اور اللہ تعالیٰ کی اطاعت میں لگا کر کسی طرح اپنے ایمان کو قبر تک لے جاؤ، ان فتنوں سے بچاؤ کا صرف یہی ایک راستہ ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج ۷، ص ۲۵۳]

متفرقات

"جابر" یا "جبّار" نام رکھنا کیسا ہے ؟

بعض لوگوں کو شبہ ہوتا ہے کہ ''جابر'' تو ظالم آدمی کو کہتے ہیں، پھر صحابی کا نام ''جابر'' کیسے رکھ دیا گیا؟ اور اللہ تعالی کے نام گرامی ''جبّار'' کے بارے میں بھی یہی شبہ ہوتا ہے اس لیے کہ اللہ تعالی کے ننانوے اسماحسنی میں سے ایک نام ''جبّار'' بھی ہے اور اُردو میں ''جبّار'' کے معنی ہیں بہت ظلم کرنے والا، اس لیے عام طور پر لوگوں کو یہ شبہ ہوتا ہے کہ اللہ تعالی کے لیے ''جبّار'' کا لفظ کیسے استعمال کیا گیا؟

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ عربی زبان میں ''جابر'' کے وہ معنی نہیں ہیں جو اُردو میں ہیں، اُردو میں ''جابر'' کے معنی ظالم کے آتے ہیں، لیکن عربی میں ''جابر'' کہتے ہیں ٹوٹی ہوئی چیز کو جوڑنے والا، ٹوٹی ہڈی جوڑنے کو ''جبر'' کہتے ہیں اور جو شخص ٹوٹی ہڈی کو جوڑے اس کو ''جابر'' کہتے ہیں، تو ''جابر'' کے معنی ہوئے ٹوٹی ہوئی چیز کو جوڑنے والا، اور یہ کوئی غلط معنی نہیں ہیں، بلکہ بہت اچھے معنی ہیں، اسی طرح ''جبّار'' کے معنی ہوئے بہت زیادہ ٹوٹی ہوئی چیزوں کو جوڑنے والا، تو اللہ تعالی کا جو نام ''جبّار'' ہے اس کے معنی - معاذ اللہ - ظلم کرنے والے یا عذاب دینے والے کے نہیں ہیں بلکہ اس کے معنی یہ ہوئے کہ جو چیز ٹوٹ گئی ہو اس کو اللہ تعالی جوڑنے والے ہیں، اسی لیے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے جو بہت سی دعائیں تلقین فرمائی ہیں ان میں سے ایک میں اللہ تبارک وتعالی کو اس نام سے پکارا گیا ہے کہ: "یاجابر العظم الکسیر"

اے ٹوٹی ہوئی ہڈی کو جوڑنے والے! [الحزب الاعظم، ملا علی قاری، ص ۲۲۳]

قہار نام کا کیا مطلب ہے؟

اسی طرح باری تعالی کے اسماحسنی میں ایک نام ''قہار'' ہے، اُردو کی اصطلاح میں ''قہار'' اس کو کہتے ہیں جو لوگوں پر بہت قہر کرے، غصہ کرے اور لوگوں کو بہت تکلیف پہنچائے، لیکن باری تعالی کے اسما گرامی میں جو لفظ ''قہار'' ہے وہ عربی زبان والا قہار ہے، اُردو زبان کا نہیں ہے، اور عربی زبان میں ''قہار'' کے معنی ہیں غلبہ پانے والا، غالب، جو ہر چیز پر غالب ہو، اس کو ''قہار'' کہتے ہیں، یعنی وہ ذات جس کے سامنے ہر چیز

مغلوب ہے اور وہ سب پر غالب ہے۔ [اصلاحی خطبات ج ا،ص ۲۱۰]

ملازمت کی خاطر ڈاڑھی ختم کردینا
"داڑھی بھی گئی اور ملازمت بھی نہیں ملی"

میرے ایک بزرگ نے ایک سچا واقعہ سنایا، جو بڑی عبرت کا واقعہ ہے، وہ یہ کہ ان کے ایک دوست لندن میں تھے اور کسی ملازمت کی تلاش میں تھے، ملازمت کے لیے ایک جگہ انٹرویو دینے کے لیے گئے، اس وقت ان کے چہرے پر داڑھی تھی، جو شخص انٹرویو لے رہا تھا اس نے کہا کہ داڑھی کے ساتھ یہاں کام کرنا مشکل ہے، اس لیے یہ داڑھی ختم کرنی ہوگی، اب یہ بڑے پریشان ہوئے کہ میں اپنی داڑھی ختم کروں یا نہ کروں؟ اس وقت تو وہ واپس چلے آئے اور دو تین روز تک دوسری جگہوں پر ملازمت تلاش کرتے رہے اور کشمکش میں مبتلا رہے، دوسری ملازمت نہیں مل رہی تھی اور بے روزگار اور پریشان بھی تھے، آخر میں فیصلہ کرلیا کہ چلو داڑھی کٹوا دیتے ہیں تاکہ ملازمت تو مل جائے، چنانچہ داڑھی کٹوا دی اور اسی جگہ ملازمت کے لیے پہنچ گئے، جب وہاں پہنچے تو انہوں نے پوچھا کہ کیسے آنا ہوا؟ انہوں نے جواب دیا کہ آپ نے کہا تھا کہ یہ داڑھی کٹوادو تو تمہیں ملازمت مل جائے گی تو میں داڑھی کٹوا کر آیا ہوں، اس نے پوچھا کہ آپ مسلمان ہیں؟ انہوں نے کہا کہ ہاں! اس نے پھر پوچھا کہ آپ اس داڑھی کو ضروری سمجھتے تھے یا غیر ضروری سمجھتے تھے؟ جواب دیا کہ میں اس کو ضروری سمجھتا تھا اور اسی وجہ سے رکھی تھی، اس نے کہا کہ جب آپ جانتے تھے کہ یہ اللہ کا حکم ہے اور اللہ کے حکم کے تحت داڑھی رکھی تھی اور اب آپ نے صرف میرے کہنے کی وجہ سے اللہ کے حکم کو چھوڑ دیا، اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ اللہ کے وفادار نہیں اور جو شخص اپنے اللہ کا وفادار نہ ہو وہ اپنے افسر کا بھی وفادار نہیں ہوسکتا، لہٰذا اب ہم آپ کو ملازمت پر رکھنے سے معذور ہیں۔

﴿خسر الدنیا والآخرۃ﴾

''داڑھی بھی گئی اور ملازمت بھی نہ ملی''، صرف داڑھی نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ کے جتنے احکام ہیں، ان میں کسی کو یہ سوچ کر چھوڑنا کہ لوگ اس کا مذاق اڑائیں گے، یہ بسا اوقات دنیا و آخرت دونوں کی تباہی کا سبب بن جاتا ہے۔ [اصلاحی خطبات ج ا،ص ۱۷۴]

ضروریات زندگی میں اسراف اور کشادگی (فراخ دلی) میں فرق کس طرح کیا جائے؟

بعض لوگوں کے دلوں میں یہ خلجان رہتا ہے کہ شریعت میں ایک طرف تو فضول خرچی اور اسراف کی ممانعت آئی ہے اور دوسری طرف یہ حکم دیا جارہا ہے کہ گھر کے خرچ میں تنگی مت کرو، بلکہ کشادگی سے کام لو،

اب سوال یہ ہے کہ دونوں میں حد فاصل کیا ہے؟ کونسا خرچہ اسراف میں داخل ہے اور کونسا خرچہ اسراف میں داخل نہیں؟

اس خلجان کے جواب میں حضرت تھانویؒ نے گھر کے بارے میں فرمایا کہ ایک گھر وہ ہوتا ہے جو قابل رہائش ہو، مثلاً جھونپڑی ڈال دی یا چھپر ڈال دیا، اس میں بھی آدمی رہائش اختیار کر سکتا ہے، یہ تو پہلا درجہ ہے جو بالکل جائز ہے۔

دوسرا درجہ یہ ہے کہ رہائش بھی ہو اور ساتھ میں آسائش بھی ہو، مثلاً پختہ مکان ہے، جس میں انسان آرام کے ساتھ رہ سکتا ہے، اور گھر میں آسائش کے لیے کوئی کام کیا جائے تو اس کی ممانعت نہیں ہے اور یہ بھی اسراف میں داخل نہیں، مثلاً ایک شخص ہے وہ جھونپڑی میں بھی زندگی بسر کر سکتا ہے اور دوسرا شخص جھونپڑی میں نہیں رہ سکتا اس کو تو رہنے کے لیے پختہ مکان چاہیے، اور پھر اس مکان میں بھی اس کو پنکھا اور بجلی چاہیے، اب اگر وہ شخص اپنے گھر میں پنکھا اور بجلی اس لیے لگاتا ہے تا کہ اس کو آرام حاصل ہو تو یہ اسراف میں داخل نہیں۔

تیسرا درجہ یہ ہے کہ مکان میں آسائش کے ساتھ آرائش بھی ہو، مثلاً ایک شخص کا پختہ مکان بنا ہوا ہے، پلاستر کیا ہوا ہے، بجلی بھی ہے، پنکھا بھی ہے، لیکن اس مکان پر رنگ نہیں کیا ہوا ہے، اب ظاہر ہے کہ رہائش تو ایسے مکان میں بھی ہو سکتی ہے لیکن رنگ وروغن کے بغیر آرائش نہیں ہو سکتی، اب اگر کوئی شخص آرائش کے حصول کے لیے مکان پر رنگ وروغن کرائے تو شرعاً وہ بھی جائز ہے۔

خلاصہ یہ ہے کہ رہائش جائز، آسائش جائز، آرائش جائز، اور آرائش کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی انسان اپنے دل کو خوش کرنے کے لیے کوئی کام کر لے تا کہ دیکھنے میں اچھا معلوم ہو، دیکھ کر دل خوش ہو جائے تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، شرعاً یہ بھی جائز ہے۔

اس کے بعد چوتھا درجہ ہے ''نمائش''، اب جو کام کر رہا ہے اس سے نہ تو آرام مقصود ہے، نہ آرائش مقصود ہے، بلکہ اس کام کا مقصد صرف یہ ہے کہ لوگ مجھے بڑا دولت مند سمجھیں، اور لوگ یہ سمجھیں کہ اس کے پاس بہت پیسہ ہے، اور تا کہ اس کے ذریعہ دوسروں پر اپنی فوقیت جتاؤں اور اپنے آپ کو بلند ظاہر کروں، یہ سب ''نمائش'' کے اندر داخل ہے اور یہ شرعاً ناجائز ہے اور اسراف میں داخل ہے۔

یہی چار درجات لباس اور کھانے میں بھی ہیں، بلکہ ہر چیز میں ہے، ایک شخص اچھا اور قیمتی کپڑا اس لیے پہنتا ہے تا کہ مجھے آرام ملے اور تا کہ مجھے اچھا لگے اور میرے گھر والوں کو اچھا لگے، اور میرے ملنے جلنے والے اس کو دیکھ کر خوش ہوں، تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں، لیکن اگر کوئی شخص اچھا اور قیمتی لباس اس نیت سے پہنتا ہے تا کہ مجھے دولت مند سمجھا جائے مجھے بہت پیسے والا سمجھا جائے اور میرا بڑا مقام سمجھا جائے تو یہ نمائش ہے اور ممنوع ہے، اسی لیے حضرت تھانویؒ نے اسراف کے بارے میں ایک واضح حد فاصل کھینچ دی کہ اگر ضرورت پوری کرنے کے لیے خرچ کیا جا رہا ہے، یا آسائش کے حصول کے لیے یا اپنے دل کو خوش کرنے کے

لیے آرائش کی خاطر کوئی خرچہ کیا جارہا ہے وہ اسراف میں داخل نہیں۔

میں ایک مرتبہ کسی دوسرے شہر میں تھا اور واپس کراچی آنا تھا، گرمی کا موسم تھا، میں نے ایک صاحب سے کہا کہ ائیر کنڈیشن کوچ میں میرا ٹکٹ بک کرادو، اور میں نے ان کو پیسے دے دیے، ایک دوسرے صاحب پاس بیٹھے ہوئے تھے، انہوں نے فوراً کہا کہ صاحب! یہ تو آپ اسراف کررہے ہیں، اس لیے کہ ائیر کنڈیشن کوچ میں سفر کرنا تو اسراف میں داخل ہے، بہت سے لوگوں کا یہ خیال ہے کہ اگر اوپر کے درجے میں سفر کرلیا تو یہ اسراف میں داخل ہے، خوب سمجھ لیجیے! اگر اوپر کے درجے میں سفر کرنے کا مقصد راحت حاصل کرنا ہے، مثلاً گرمی کا موسم ہے، گرمی برداشت نہیں ہوتی، اللہ تعالی نے پیسے دیے ہیں تو پھر اس درجے میں سفر کرنا کوئی گناہ اور اسراف نہیں ہے، لیکن اگر اوپر کے درجے میں سفر کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جب میں ائیر کنڈیشن کوچ میں سفر کروں گا تو لوگ یہ سمجھیں گے کہ یہ بڑا دولت مند آدمی ہے، تو پھر وہ اسراف اور ناجائز ہے، اور نمائش میں داخل ہے، یہی تفصیل کپڑے اور کھانے میں بھی ہے۔

ہر شخص کی کشادگی کا معیار اس کی ضروریات کی وجہ سے الگ ہے

میرے حضرت مولانا مسیح اللہ خان صاحبؒ ایک مرتبہ بیان فرماتے ہوئے کہنے لگے کہ بھائی! ایک آدمی ایسا ہے جس کا نہ کوئی آگا نہ پیچھا، یعنی نہ کوئی اس کا رشتہ دار ہے، نہ کوئی عزیز واقارب ہے اور نہ کوئی دوست ہے، اگر ایسا شخص اپنے گھر میں ایک بستر، ایک رکابی، ایک ڈونگا رکھ لے تو بس! اس کے لیے یہ برتن کافی ہیں، اب اگر اور زیادہ برتن جمع کرے گا تو اس کا مقصد سوائے نمائش کے اور کچھ نہ ہوگا، اور اسراف ہوگا، لیکن ایک دوسرا آدمی جس کے مہمان آتے ہیں، جس کے تعلقات وسیع ہیں، جس کے عزیز واقارب بہت زیادہ ہیں، اس کی ضرورت اور کشادگی کا معیار اور ہے، اب اگر ایسے شخص کے گھر میں بعض اوقات برتنوں کے سوسیٹ بھی ہوں یا سو بستر بھی ہوں تب بھی ان میں سے ایک برتن اور ایک بستر بھی اسراف میں داخل نہیں ہوگا، اس لیے کہ یہ سب اس کی ضرورت میں داخل ہیں، اس لیے فرمایا کہ ہر آدمی کا کشادگی کا معیار الگ ہوتا ہے۔

دوسرے یہ کہ ہر آدمی کی ضرورت اس کے حالات کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے، لہذا کشادگی کا معیار بھی ہر انسان کا الگ ہے، اب جو شخص کم آمدنی والا ہے، اس کی کشادگی کا معیار اور ہے، اور جو متوسط آمدنی والا ہے اس کا معیار اور ہے، اور جو زیادہ آمدنی والا ہے اس کی کشادگی کا معیار اور ہے، اس لیے ہر شخص کی آمدنی کے معیار کے اعتبار سے کشادگی ہونی چاہیے، لہذا انسان کو چاہیے کہ اپنی آمدنی کو مدنظر رکھتے ہوئے کشادگی سے کام لے۔ [اصلاحی خطبات ج ۲، ص ۵۵ تا ۶۰]

بھائیوں میں حساب کتاب کی کیا ضرورت ہے؟

آج کل یہ وبا بھی عام ہے کہ چند بھائیوں کا مشترک کاروبار ہے، لیکن حساب کتاب کوئی نہیں،

کہتے ہیں کہ ہم سب بھائی ہیں، حساب کتاب کی کیا ضرورت ہے؟ حساب کتاب تو غیروں میں ہوتا ہے، اپنوں میں حساب کتاب کہاں؟ اب اس کا کوئی حساب کتاب، کوئی لکھت پڑھت نہیں کہ کس بھائی کی کتنی ملکیت اور کتنا حصہ ہے؟ ماہانہ کس کو کتنا منافع دیا جائے گا؟ اس کا کوئی حساب نہیں، بلکہ الل ٹپ معاملہ چل رہا ہے، جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ دنوں تک تو محبت و پیار سے حساب چلتا رہتا ہے، لیکن بعد میں دلوں میں شکوے شکایتیں پیدا ہونی شروع ہوجاتی ہیں، کہ فلاں کی اولاد تو اتنی ہے، وہ زیادہ رقم لیتا ہے، فلاں کی اولاد کم ہے، وہ کم لیتا ہے، فلاں کی شادی پر اتنا خرچ کیا گیا، ہمارے بیٹے کی شادی پر کم خرچ ہوا، فلاں نے کاروبار سے اتنا فائدہ اٹھالیا، ہم نے نہیں اٹھایا وغیرہ بس، اس طرح کی شکایتیں شروع ہوجاتی ہیں۔

یہ سب کچھ اس لیے ہوا کہ ہم نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے بتائے ہوئے طریقے سے دور چلے گئے، یاد رکھیے، ہر مسلمان پر واجب ہے کہ اگر کوئی مشترک چیز ہے تو اس مشترک چیز کا حساب و کتاب رکھا جائے، اگر حساب و کتاب نہیں رکھا جارہا ہے تو تم خود بھی گناہ میں مبتلا ہو رہے ہو اور دوسروں کو بھی گناہ میں مبتلا کر رہے ہو، یاد رکھیے! بھائیوں کے درمیان معاملات کے اندر جو محبت و پیار ہوتا ہے وہ کچھ دن چلتا ہے، بعد میں وہ لڑائی جھگڑوں میں تبدیل ہوجاتا ہے، اور پھر وہ لڑائی جھگڑا ختم ہونے کو نہیں آتا، کتنی مثالیں اس وقت میرے سامنے ہیں۔

ملکیت میں امتیاز ہونا ضروری ہے، یہاں تک کہ باپ بیٹے کی ملکیت میں اور شوہر بیوی کی ملکیت میں امتیاز ہونا ضروری ہے، حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی دو بیویاں تھیں، دونوں کے گھر الگ الگ تھے، حضرت والاؒ فرمایا کرتے تھے کہ میری ملکیت اور میری دونوں بیویوں کی ملکیت بالکل الگ الگ کر کے بالکل امتیاز کر رکھا ہے، وہ اس طرح کہ جو کچھ سامان بڑی اہلیہ کے گھر میں ہے وہ ان کی ملکیت ہے اور جو سامان چھوٹی اہلیہ کے گھر میں ہے وہ ان کی ملکیت ہے، اور جو سامان خانقاہ میں ہے وہ میری ملکیت ہے، آج اگر دنیا سے چلا جاؤں تو کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں، الحمدللہ سب امتیاز موجود ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج۵، ص۱۷۹]

دل نہ چاہتے ہوئے بھی تعلق کس طرح نبھایا جاسکتا ہے؟

مومن کا کام یہ ہے کہ جب اس کا کسی کے ساتھ تعلق قائم ہو تو اب حتی الامکان اپنی طرف سے اس تعلق کو نہ توڑے بلکہ اس کو نبھاتا رہے، چاہے طبیعت پر نبھانے کی وجہ سے گرانی بھی ہو، لیکن پھر بھی اس کو نبھاتا رہے، اور اس تعلق کو بدمزگی پر ختم نہ کرے، زیادہ سے زیادہ یہ کرے کہ اگر کسی کے ساتھ تمہاری مناسبت نہیں ہے تو اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا زیادہ نہ کرے لیکن ایسا تعلق ختم کرنا کہ اب بول چال بھی بند اور علیک سلیک بھی ختم، ملنا جلنا بھی ختم، ایک مومن کے لیے یہ بات مناسب نہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج۱۰، ص۱۰۰]

لیکن نباہ کرنے کے معنی سمجھ لینا چاہیے، نباہ کرنے کے معنی یہ ہیں کہ اس کے حقوق ادا کرتے رہو اور اس سے تعلق ختم نہ کرو، لیکن نباہ کرنے کے لیے دل میں مناسبت کا پیدا ہونا اور اس کے ساتھ دل کا لگنا اور

طبیعت میں کسی قسم کی الجھن کا باقی نہ رہنا ضروری نہیں، اور نہ یہ ضروری ہے کہ دن رات ان کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا باقی رہے اور ان کے ساتھ ہنسنا بولنا اور ملنا جلنا باقی رہے، نباہ کے لیے ان چیزوں کا باقی رکھنا ضروری نہیں بلکہ تعلقات کو باقی رکھنے کے لیے حقوق شرعیہ کی ادائیگی کافی ہے، لہذا آپ کو اس بات پر کوئی مجبور نہیں کرتا کہ آپ کا دل تو فلاں کے ساتھ نہیں لگتا، لیکن آپ زبردستی اس کے ساتھ جا کر ملاقات کریں یا آپ کی ان کے ساتھ مناسبت نہیں ہے تو اب کوئی اس پر مجبور نہیں کرتا کہ آپ طبیعت کے خلاف ان کے پاس جا کر بیٹھیں، بس صرف ان کے حقوق ادا کرتے رہیں اور قطع تعلق نہ کریں، حدیث "إن حسن العهد من الإيمان" کے یہی معنی ہیں، یعنی کسی کے ساتھ اچھی طرح نباہ کرنا بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۱۰۶]

جائز تفریح کی اجازت ہے

یہ جو فضول قسم کی مجلس آرائی ہوتی ہے، جس کو آج کل کی اصطلاح میں گپ شپ کہا جاتا ہے، کوئی دوست مل گیا تو فوراً اس سے کہا کہ آؤ ذرا بیٹھ کر گپ شپ کریں، یہ گپ شپ لازماً انسان کو گناہ کی طرف لے جاتی ہے۔ ہاں! شریعت نے ہمیں تھوڑی بہت تفریح کی بھی اجازت دی ہے، بلکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ: روّحوا القلوب ساعة فساعة [کنز العمال، ۵۳۵۴]

یعنی دلوں کو تھوڑے تھوڑے وقفے سے آرام بھی دیا کرو۔ نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات پر قربان جایئے کہ ہمارے مزاج، ہماری نفسیات اور ہماری ضروریات کو ان سے زیادہ پہچاننے والا اور کون ہوگا، وہ جانتے ہیں کہ اگر ان سے کہا گیا کہ اللہ کے ذکر کے علاوہ کچھ نہ کرو، ہر وقت ذکر اللہ میں مشغول رہو، تو یہ ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اس لئے کہ یہ فرشتے نہیں ہیں، یہ تو انسان ہیں، ان کو تھوڑے سے آرام کی بھی ضرورت ہے، تھوڑی سی تفریح کی بھی ضرورت ہے، اس لئے تفریح کے لئے کوئی بات کرنا، خوش طبعی کے ساتھ ہنس بول لینا، نہ صرف یہ کہ جائز ہے بلکہ پسندیدہ ہے اور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی سنت ہے، لیکن اس میں زیادہ منہمک ہو جانا کہ اسی میں کئی کئی گھنٹے برباد ہو رہے ہیں، قیمتی اوقات ضائع ہو رہے ہیں، تو یہ چیز انسان کو لازمی طور پر گناہ کی طرف لے جانے والی ہے۔ اس لئے فرمایا جا رہا ہے کہ تم باتیں کم کرنے کی عادت ڈالو۔ اور یہ بھی "مجاہدہ" ہے۔ [اصلاحی مجالس، ج ۲، ص ۱۶۷]

کیا مذاق اور خوش طبعی کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہے؟

بہت سے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جھوٹ اسی وقت ناجائز اور حرام ہے جب وہ سنجیدگی سے بولا جائے اور مذاق میں جھوٹ بولنا جائز ہے، چنانچہ اگر کسی سے کہا جائے کہ تم نے فلاں موقع پر یہ بات کہی تھی وہ تو ایسی نہیں تھی، تو جواب میں وہ کہتا ہے کہ میں تو مذاق میں یہ بات کہہ رہا تھا، گویا کہ مذاق میں جھوٹ بولنا کوئی بری بات ہی نہیں، حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مومن ایسا ہونا چاہیے کہ اس کی زبان سے خلاف واقعہ بات

نکلے ہی نہیں، حتیٰ کہ مذاق میں بھی نہ نکلے، اگر مذاق اور خوش طبعی حد کے اندر ہو تو اس میں کوئی حرج نہیں، شریعت نے خوش طبعی اور مذاق کو جائز قرار دیا ہے، بلکہ اس کی تھوڑی سی ترغیب بھی دی ہے، ہر وقت آدمی خشک اور سنجیدہ ہر کر بیٹھا رہے کہ اس کے منہ پر کبھی تبسم اور مسکراہٹ ہی نہ آئے یہ بات پسندیدہ نہیں، خود حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا مذاق کرنا ثابت ہے لیکن ایسا لطیف مذاق اور ایسی خوش طبعی کی باتیں آپ سے منقول ہیں جو لطیف بھی ہیں اور ان میں کوئی بات خلاف واقعہ بھی نہیں ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ سے روایت ہے کہ حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا کوئی بندہ اس وقت تک کامل مومن نہیں ہوسکتا جب تک وہ مذاق میں بھی جھوٹ بولنا نہ چھوڑے اور بحث و مباحثہ نہ چھوڑے، چاہے وہ حق پر ہو، اس حدیث میں دو چیزیں بیان فرمائیں کہ جب تک آدمی ان دو چیزوں کو نہیں چھوڑے کا اس وقت تک آدمی صحیح طور پر مومن نہیں ہوسکتا، ایک یہ کہ مذاق میں بھی جھوٹ نہ بولے اور دوسرے یہ کہ حق پر ہونے کے باوجود بحث و مباحثہ میں نہ پڑے۔

ہم لوگ محض مذاق اور تفریح کے لیے زبان سے جھوٹی باتیں نکال دیتے ہیں، حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذاق میں بھی جھوٹی باتیں زبان سے نکالنے سے منع فرمایا ہے، چنانچہ ایک حدیث میں ارشاد فرمایا کہ افسوس ہے اس شخص پر، یا سخت الفاظ میں اس کا صحیح ترجمہ یہ کرسکتے ہیں کہ اس شخص کے لیے دردناک عذاب ہے جو محض لوگوں کو ہنسانے کے لیے جھوٹ بولتا ہے۔ [اصلاحی خطبات، ج ۱۰، ص ۱۲۱، ۱۲۲]

متبنیٰ (منہ بولے بیٹے) کو حقیقی باپ کی طرف منسوب کرنا ضروری ہے

ایک مسئلہ یہ بھی ہے جس پر قرآن کریم نے آدھا رکوع نازل کیا ہے وہ یہ کہ بعض اوقات کوئی شخص دوسرے کے بچے کو اپنا "مُتَبنّٰی"، "لے پالک" بنالیتا ہے، مثلاً کسی شخص کی کوئی اولاد نہیں ہے، اس نے دوسرے کا بچہ گود لے لیا اور اس کی پرورش کی اور اس کو اپنا "متبنی" بنالیا، تو شرعاً متبنی بنانا اور کسی بچے کی پرورش کرنا اور اپنے بیٹے کی طرح اس کو پالنا تو جائز ہے، لیکن شرعی اعتبار سے وہ "متبنی" کسی بھی حالت میں اس پالنے والے کا حقیقی بیٹا نہیں بن سکتا، لہٰذا جب اس بچے کو منسوب کرنا ہو تو اس کو اصل باپ ہی کی طرف منسوب کرنا چاہیے کہ فلاں کا بیٹا ہے، پرورش کرنے والے کی طرف نسبت کرنا جائز نہیں، اور رشتے کے جتنے احکام ہیں وہ سب اصل باپ کی طرف منسوب ہوں گے، یہاں تک کہ جس شخص نے اس کو اپنا منہ بولا بیٹا بنایا ہے اور جو عورت منہ بولی ماں بنی ہے اگر وہ نامحرم ہے تو اس بچے کے بڑے ہونے کے بعد اس سے اسی طرح پردہ کرنا ہوگا جس طرح ایک نامحرم سے پردہ ہوتا ہے۔

حضور اقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت زید بن حارثہ کو اپنا بیٹا بنالیا تھا، اس کے بعد سے حضور اقدس

صلی اللہ علیہ وسلم ان کے ساتھ بیٹے جیسا ہی سلوک فرماتے، تو لوگوں نے بھی ان کو زید بن محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) کہہ کر پکارنا شروع کر دیا، جس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے باقاعدہ آیت نازل ہوئی کہ:

﴿ادعوهم لاباءهم هو اقسط عند الله﴾ [الاحزاب:۵]

یعنی تم لوگوں نے متبنیٰ کا جو نسب بیان کرنا شروع کر دیا ہے، یہ درست نہیں، بلکہ جو بیٹا جس باپ کا ہے اس کو اسی حقیقی باپ کی طرف منسوب کرو، کسی اور کی طرف منسوب کرنا جائز نہیں، اور دوسری جگہ یہ آیت نازل فرمائی: ﴿ماکان محمد ابا احد من رجالکم ولکن رسول الله وخاتم النبیین﴾

[الاحزاب:۴۰]

یعنی محمد صلی اللہ علیہ وسلم تم میں سے کسی مرد کے حقیقی باپ نہیں ہیں، لیکن وہ اللہ کے رسول ہیں اور خاتم النبیین ہیں، اس لیے ان کی طرف کسی بیٹے کو منسوب مت کرو اور آئندہ کے لیے یہ اصول مقرر فرما دیا کہ کوئی متبنیٰ آئندہ اپنے منہ بولے باپ کی طرف منسوب نہیں ہوگا بلکہ حقیقی باپ کی طرف منسوب ہوگا۔

حضرت زید بن حارثہؓ کے علاوہ ایک اور صحابی حضرت سالم مولیٰ حذیفہؓ تھے، ان کو بھی متبنیٰ بنایا گیا تھا، ان کے بارے میں بھی حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم نے حکم فرمایا کہ یہ منہ بولے باپ کی طرف منسوب نہیں ہوں گے اور جب یہ اپنے منہ بولے باپ کے گھر میں داخل ہوں تو پردے کے ساتھ داخل ہوں۔

یہ سب احکام اس لیے دیے گئے کہ شریعت نے نسب کے تحفظ کا بہت اہتمام فرمایا ہے کہ کسی کی نسبت غلط نہ ہو جائے، اس کی وجہ سے مغالطہ پیدا نہ ہو جائے، اس لیے جو شخص اپنا نسب غلط بیان کرے وہ حدیث کی وعید کے اندر داخل ہے اور وہ جھوٹ کے دو کپڑے پہننے والے کی طرح ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج۱۰، ص۲۶۵]

سنت کا مذاق اڑانے والوں کی پرواہ مت کریں

بسا اوقات جب آدمی اتباعِ سنت کی طرف قدم بڑھاتا ہے تو اس کو طعنے بھی دیے جاتے ہیں، اس پر فقرے بھی کسے جاتے ہیں، بعض اوقات اس کا مذاق بھی اڑایا جاتا ہے، ان فقروں اور طعنوں کی وجہ سے بعض لوگ کمزور پڑ جاتے ہیں، حالانکہ قرآن کریم نے ایسے لوگوں کی تعریف کی ہے کہ:

﴿یجاهدون فی سبیل الله ولا یخافون لومة لائم﴾ [المائدة:٥٤]

یعنی یہ لوگ اللہ کے راستے میں محنت کرتے ہیں، اور کسی ملامت کرنے والے کی ملامت کی پرواہ نہیں کرتے، دنیا والے لوگ جو چاہیں کہا کریں، چاہے وہ ہمیں "دقیانوس" کہیں، یا ہمیں "رجعت پسند" کہیں، یا "جاہلانہ اسلام والے" کہیں، ارے یہ طعنے تو اللہ کے راستے پر چلنے والے کا ہار ہیں، یہ طعنے تو انبیاء علیہم السلام کو دیے گئے، ان کو "بے وقوف" کہا گیا، اور ان انبیاء کے متبعین سے کہا گیا کہ:

﴿أنؤمن كما آمن السفهاء﴾ [البقرة:١٣]

کیا ہم بھی اسی طرح ایمان لے آئیں جس طرح یہ بے وقوف ایمان لائے، یہ سارے طعنے انبیاء علیہم السلام کو بھی ملے ہیں، اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی ملے ہیں، ان کو "پاگل" کہا گیا، ان کو "گمراہ" کہا گیا، لیکن درحقیقت اللہ تعالیٰ کے راستے میں یہ طعنے پڑتے ہیں تو ایک مومن کے لئے تمغہ ہے، کہاں تک دنیا والوں کی زبانیں روکو گے؟ کب تک ان کی پرواہ کرو گے۔

لہٰذا جب نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اتباع کے راستے پر چلو تو طعنوں سے بے نیاز ہو جاؤ، کمر کس کر تیار ہو جاؤ، اور یہ سوچو کہ جو طعنہ ہمیں اس راستے میں ملے گا وہ ہمارے لئے اللہ تعالیٰ کی طرف سے باعث اعزاز ہے، لیکن قرآن کریم کا کہنا یہ ہے کہ:

﴿فاليوم الذين آمنوا من الكفار يضحكون﴾ [التطفيف:٣٤]

کہ آج وہ وقت آگیا کہ آج ایمان والے ان منکرین پر ہنسیں گے، وہ وقت آکر رہے گا، اس کے آنے میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ لہٰذا دنیا والوں کے طعنوں سے بے نیاز ہو جاؤ، اگر تم اللہ کے راستے پر چلنا چاہتے ہو:

جس کو ہو جان و دل عزیز
اس کی گلی میں جائے کیوں

جب اس راستے پر چلے ہو تو ان طعنوں کو برداشت کرنا پڑے گا، اللہ تعالیٰ اپنے فضل وکرم سے اور اپنی رحمت سے ہم سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

[اصلاحی مجالس، ج۶، ص۱۸۳]

کیا مذاق اڑائے جانے کے ڈر سے فرض یا واجب کو چھوڑنا یا گناہ کرنا جائز ہے؟

یہ بات یاد رکھو کہ اگر کوئی گناہ کا کام ہے تو پھر چاہے کوئی مذاق اڑائے یا ہنسی اڑائے، اس کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے، اس لیے کہ لوگوں کے مذاق اڑانے کی وجہ سے گناہ کا کام کرنا جائز نہیں، لوگوں کے مذاق اڑانے کی وجہ سے کوئی فرض یا واجب کام چھوڑنا جائز نہیں، لیکن اگر ایک طرف جائز اور مباح کام ہے اور دوسری طرف اولی اور افضل کام ہے، اب اگر لوگوں کو گناہ سے بچانے کے لیے افضل کام چھوڑ دو، اور اس کے مقابلے میں جو جائز کام ہے، اس کو اختیار کرلو تو اس میں کوئی مضائقہ نہیں ایسا کرنا درست ہے۔

[اصلاحی خطبات، ج۵، ص۱۸۹]

کیا اولاد کی نافرمانی پر حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی دلیل دینا صحیح ہے ؟

اللہ تعالی نے فرمایا کہ اپنے آپ کو اور اپنے گھر والوں کو آگ سے بچاؤ، درحقیقت اس میں ایک شبہ کے جواب کی طرف اشارہ فرمایا جو شبہ عام طور پر ہمارے دلوں میں پیدا ہوتا ہے، وہ شبہ یہ ہے کہ آج جب لوگوں سے یہ کہا جاتا ہے کہ اپنی اولاد کو بھی دین کی تعلیم دو، کچھ دین کی باتیں ان کو سکھاؤ، ان کو دین کی طرف لاؤ، گناہوں سے بچانے کی فکر کرو، تو اس کے جواب میں عام طور پر بکثرت لوگ یہ کہتے ہیں کہ ہم نے اولاد کو دین کی طرف لانے کی بڑی کوشش کی، مگر کیا کریں کہ ماحول اور معاشرہ اتنا خراب ہے کہ بیوی بچوں کو بہت سمجھایا، مگر وہ مانتے نہیں ہیں اور زمانے کی خرابی سے متاثر ہو کر انہوں نے دوسرا راستہ اختیار کر لیا ہے اور اس راستے پر جارہے ہیں، اور راستہ بدلنے کے لیے تیار نہیں ہیں، اب ان کا عمل ان کے ساتھ ہے، ہمارا عمل ہمارے ساتھ ہے، اب ہم کیا کریں؟ اور دلیل میں یہ پیش کرتے ہیں کہ حضرت نوح علیہ السلام کا بیٹا بھی تو آخر کافر رہا اور حضرت نوح علیہ السلام اس کو طوفان سے نہ بچا سکے، اسی طرح ہم نے بہت کوشش کر لی ہے وہ نہیں مانتے تو ہم کیا کریں؟

چنانچہ قرآن کریم نے آیت میں ''آگ'' کا لفظ استعمال کر کے اس اشکال اور شبہ کا جواب دیا ہے، وہ یہ کہ یہ بات ویسے اصولی طور پر تو ٹھیک ہے کہ اگر ماں باپ نے اولاد کو بے دینی سے بچانے کی اپنی طرف سے پوری کوشش کر لی ہے تو ان شاء اللہ ماں باپ پھر بری الذمہ ہو جائیں گے اور اولاد کے کیے کا وبال اولاد پر پڑے گا، لیکن دیکھنا یہ ہے کہ ماں باپ نے اولاد کو بے دینی سے بچانے کی کوشش کس حد تک کی ہے؟ اور کس درجے تک کی ہے؟ قرآن کریم نے ''آگ'' کا لفظ استعمال کر کے اس بات کی طرف اشارہ کر دیا کہ ماں باپ کو اپنی اولاد کو گناہوں سے اس طرح بچانا چاہیے جس طرح ان کو آگ سے بچاتے ہیں۔

فرض کریں کہ ایک بہت بڑی خطرناک آگ سلگ رہی ہے، جس آگ کے بارے میں یقین ہے کہ اگر کوئی شخص اس آگ کے اندر داخل ہو گیا تو زندہ نہیں بچے گا، اب آپ کا نادان بچہ اس آگ کو خوش منظر اور خوب صورت سمجھ کر اس کی طرف بڑھ رہا ہے، اب بتاؤ تم اس وقت کیا کرو گے؟ کیا تم اس پر اکتفا کرو گے کہ دور سے بیٹھ کر بچے کو نصیحت کرنا شروع کر دو کہ بیٹا! اس آگ میں مت جانا، یہ بڑی خطرناک چیز ہوتی ہے، اگر جاؤ گے تو جل جاؤ گے اور مر جاؤ گے؟ کیا ماں باپ صرف زبانی نصیحت پر اکتفا کریں گے؟ اور اس نصیحت کے باوجود اگر بچہ اس آگ میں چلا جائے تو کیا وہ ماں باپ یہ کہہ کر بری الذمہ ہو جائیں گے کہ ہم نے تو اس کو سمجھا دیا تھا، اپنا فرض ادا کر دیا تھا، اس نے نہیں مانا اور خود ہی اپنی مرضی سے آگ میں کود گیا تو میں کیا کروں؟ دنیا میں کوئی ماں باپ ایسا نہیں کریں گے، اگر وہ اس بچے کے حقیقی ماں باپ ہیں تو اس بچے کو آگ کی طرف بڑھتا ہوا دیکھ کر ان کی نیند حرام ہو جائے گی، ان کی زندگی حرام ہو جائے گی اور جب تک اس بچے کو گود میں اٹھا کر اس آگ سے

دور نہیں لے جائیں گے اس وقت تک ان کو چین نہیں آئے گا۔

اللہ تعالی یہ فرما رہے ہیں کہ جب تم اپنے بچے کو دنیا کی معمولی سی آگ سے بچانے کے لیے صرف زبانی جمع خرچ پر اکتفا نہیں کرتے تو جہنم کی وہ آگ جس کی حد و نہایت نہیں، اور جس کا دنیا میں تصور نہیں کیا جا سکتا، اس آگ سے بچے کو بچانے کے لیے زبانی جمع خرچ کو کافی کیوں سمجھتے ہو؟ لہذا یہ سمجھنا کہ ہم نے انہیں سمجھا کر اپنا فریضہ ادا کر لیا یہ بات آسانی سے کہنے کی نہیں ہے۔

حضرت نوح علیہ السلام کے بیٹے کی جو مثال دی جاتی ہے کہ ان کا بیٹا کافر رہا، وہ اس کو آگ سے نہیں بچا سکے، یہ بات درست نہیں، اس لیے کہ یہ بھی تو دیکھو کہ انہوں نے اس کو راہ راست پر لانے کی نو سو سال تک لگاتار کوشش کی، اس کے باوجود جب راہ راست پر نہیں آیا تو اب ان کے اوپر کوئی مطالبہ اور کوئی مواخذہ نہیں، لیکن ہمارا حال یہ ہے کہ ایک دو مرتبہ کہا اور پھر فارغ ہو کر بیٹھ گئے کہ ہم نے تو کہہ دیا، حالانکہ ہونا یہ چاہیے کہ ان کو گناہوں سے اسی طرح بچاؤ جس طرح ان کو حقیقی آگ سے بچاتے ہو، اگر اس طرح نہیں بچا رہے ہو تو اس کا مطلب یہ ہے کہ فریضہ ادا نہیں ہو رہا ہے، آج تو یہ نظر آ رہا ہے کہ اولاد کے بارے میں ہر چیز کی فکر ہے، مثلاً یہ تو فکر ہے کہ بچے کی تعلیم اچھی ہو، اس کا کیریئر اچھا بنے، یہ فکر ہے کہ معاشرے میں اس کا مقام اچھا ہو، یہ فکر تو ہے کہ اس کے کھانے پینے اور پہننے کا انتظام اچھا ہو جائے لیکن دین کی فکر نہیں۔ [اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۲۷]

والدین کی وفات کے بعد ان کی خدمت کی تلافی کی صورت کیا ہو؟

اکثر و بیشتر یہ ہوتا ہے کہ والدین کے مرنے کے بعد اولاد کو اس بات کا احساس ہوتا ہے کہ ہم نے کتنی بڑی نعمت کھو دی اور ہم نے اس کا حق ادا نہ کیا، اس کے لیے بھی اللہ تعالی نے ایک راستہ رکھا ہے، فرمایا کہ اگر کسی نے والدین کے حقوق میں کوتاہی کی ہو اور ان سے فائدہ نہ اٹھایا ہو تو اس کی تلافی کے دو راستے ہیں:

① ایک ان کے لیے ایصال ثواب کی کثرت کرنا، جتنا ہو سکے ان کو ثواب پہنچائیں، صدقہ دے کر ہو یا نوافل پڑھ کر ہو، یا قرآن کی تلاوت کے ذریعہ ہو، اس کے ذریعہ اس کی تلافی ہو جاتی ہے۔

② دوسرے یہ کہ والدین کے اعزہ اقربا دوست احباب ہیں، ان کے ساتھ حسن سلوک کرے اور ان کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کرے جیسا کہ باپ کے ساتھ کرنا چاہیے، اس کے نتیجے میں اللہ تعالی اس کوتاہی کی تلافی فرما دیتے ہیں، اللہ تعالی مجھے اور آپ سب کو اس کی توفیق عطا فرمائے، آمین۔

[اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۷۳]

بھئی ! کھا سنا معاف کردینا

یہ جملہ کہ ''کہا سنا معاف کر دینا'' یہ ہمارے بزرگوں کا چلایا ہوا کتنا حکیمانہ جملہ ہے، جب سے ہم نے ہوش سنبھالا ہے اس وقت سے بڑوں سے یہ سنتے چلے آرہے ہیں کہ جب دو چار آدمی کچھ دن ساتھ رہنے کے بعد جدا ہونے لگتے ہیں تو اس وقت ایک دوسرے سے یہ جملہ کہتے ہیں کہ بھائی! ہمارا کہا سنا معاف کر دینا، اس لیے کہ جب سفر یا حضرت میں دو چار آدمی ساتھ رہتے ہیں تو کچھ نہ کچھ ایک دوسرے کی حق تلفی ہونے کا احتمال ہوتا ہے، لہذا جدا ہونے سے پہلے ان حقوق کو معاف کرالو، اگر یہ معاف نہ کرایا اور بعد میں کچھ عرصہ کے بعد خیال آیا کہ ہم نے تو فلاں کی حق تلفی کی تھی، تو اس وقت کہاں ڈھونڈتے پھروگے؟ بعد میں معلوم نہیں کہ ملاقات ہو یا نہ ہو، معافی مانگنے کا موقع ملے یا نہ ملے، لہذا جدا ہوتے وقت ہی یہ کام کر لینا چاہیے، اس جملہ میں غیبت بھی خود بخود داخل ہو جائے گی اور غیبت سے بھی معافی ہو جائے گی۔

[اصلاحی مجالس، ج۱، ص۱۷۷]

اللہ کی محبت غیر اختیاری ہونے کے باوجود اس کا حکم کیوں دیا گیا ؟

اس ملفوظ میں حضرت والا نے ایک اشکال کا جواب دیا ہے، اشکال یہ پیدا ہوتا ہے کہ آپ نے تو یہ اصول بیان فرمایا کہ اختیاری امر مامور بہ ہے اور غیر اختیاری کا انسان مکلف نہیں، اور اللہ تعالیٰ کی محبت کا دل میں پیدا کرنا جو مامور بہ ہے، اسی طرح حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت مامور بہ ہے، یہاں تک کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ ارشاد فرمایا کہ:

لا یؤمن احدکم حتی اکون احب الیہ من والدہ وولدہ والناس اجمعین

[صحیح بخاری کتاب الایمان، باب حب الرسول ﷺ من الایمان]

تم میں سے کوئی شخص اس وقت تک مسلمان نہیں ہوگا جب تک کہ میں اس کے نزدیک اس کے والدین سے اور اسکی اولاد سے اور تمام لوگوں سے زیادہ محبوب نہ ہو جاؤں۔ لہٰذا خیال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جب محبت غیر اختیاری چیز ہے تو اس کو زبردستی کیسے اپنے دل میں پیدا کریں؟

اس کا جواب حضرت والا نے اس ملفوظ میں دیدیا کہ جو محبت مامور بہ ہے وہ محبت طبعی نہیں، بلکہ محبت عقلی ہے، یعنی جب عقل سے وہ سوچے گا کہ اس کائنات میں سب سے زیادہ محبت کے لائق کون ہونا چاہئے؟ تو اس کی عقل اس کو اس نتیجے پر پہنچائے گی کہ اس کائنات میں سب سے زیادہ محبت اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے ہونی چاہئے، چاہے دل میں طبعی طور محبت کے جذبات اس طرح امڈتے ہوئے

محسوس نہ ہوں جس طرح والدین اور اولاد کے لئے محبت کے جذبات دل میں امڈتے ہوئے محسوس ہوتے ہیں۔ اگر بالفرض کسی کا یہ حال ہو تو وہ یہ نہ سمجھے کہ میں کافر ہوگیا، بلکہ وہ سوچے کہ الحمدللہ مجھے اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت عقلی حاصل ہے، اگرچہ محبت طبعی اس درجے کی نہیں ہے۔

[اصلاحی مجالس، ج ۲، ص ۲۸۵]

سال گرہ کی حقیقت

کسی نے خوب کہا کہ:

ہو رہی ہے عمر مثل برف کم
چپکے چپکے رفتہ رفتہ دم بدم

جس طرح برف ہر لمحے پگھلتی رہتی ہے، اسی طرح انسان کی عمر ہر لمحے پگھل رہی ہے اور جارہی ہے ، جب عمر کا ایک سال گذر جاتا ہے تو لوگ سالگرہ مناتے ہیں، اور اس میں اس بات کی بڑی خوشی مناتے ہیں کہ ہماری عمر کا ایک سال پورا ہوگیا، اور اس میں موم بتیاں جلاتے ہیں، اور کیک کاٹتے ہیں اور خدا جانے کیا کیا خرافات کرتے ہیں، اس پر اکبر الہ آبادی مرحوم نے بڑا حکیمانہ شعر کہا ہے، وہ یہ کہ:

جب سالگرہ ہوئی تو ''عقدہ'' یہ کھلا
یہاں اور ''گرہ'' سے ایک برس جاتا ہے

''عقدہ'' بھی عربی میں ''گرہ'' کو کہتے ہیں، مطلب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے گرہ میں زندگی کے جو برس دیے تھے، اس میں ایک اور کم ہوگیا، ارے! یہ رونے کی بات ہے یا خوشی کی بات ہے! یہ تو افسوس کرنے کا موقع ہے کہ تیری زندگی کا ایک سال اور کم ہوگیا۔

میرے والد ماجد قدس اللہ سرہ نے اپنی عمر کے تیس سال گذرنے کے بعد ساری عمر اس پر عمل فرمایا کہ جب عمر کے کچھ سال گذر جاتے تو ایک مرثیہ کہا کرتے تھے، عام طور پر لوگوں کے مرنے کے بعد ان کا مرثیہ کہا جاتا ہے، لیکن میرے والد صاحب اپنا مرثیہ خود کہا کرتے تھے اور اس کا نام رکھتے ''مرثیہ عمر رفتہ'' یعنی گذری ہوئی عمر کا مرثیہ، اگر اللہ تعالیٰ ہمیں فہم عطا فرمائیں تب یہ بات سمجھ میں آئے کہ واقعہ یہی ہے کہ جو وقت گذر گیا، وہ اب واپس آنے والا نہیں، اس لیے اس پر خوشی منانے کا موقع نہیں ہے، بلکہ آئندہ کی فکر کرنے کا موقع ہے کہ بقیہ زندگی کا وقت کس طریقے سے کام میں لگ جائے، خلاصہ یہ نکلا کہ اپنی زندگی کے ایک ایک لمحے کو غنیمت سمجھو، اور اس کو اللہ کے ذکر اور اس کی اطاعت میں صرف کرنے کی کوشش کرو، غفلت، بے پرواہی اور وقت کی فضول خرچی سے بچو، کسی نے خوب کہا ہے کہ:

یہ کہاں کا فسانۂ سود وزیاں
جو گیا سو گیا، جو ملا سو ملا
کہو دل سے کہ فرصت عمر ہے کم
جو دلا تو خدا ہی کی یاد دِلا

[اصلاحی خطبات، ج ۴، ص ۲۱۵، ۲۲۹]